کملیشور نمبر

فن اور شخصیت

میں

ہندوستان کی

تمام زبانوں کے فنکاروں کو

یکجا کرنے پر

مبارکباد

Forwarded with com

The Department

GOVERNMENT

بی، آر، چوپڑہ

فن اور شخصیت
کنیشور نمبر
بنٹی انٹرپرائزس
کی شاندار پیشکش
دھرنا
ایسٹمین کلر
ستارے: سنیل دت۔ فیروز خان، پروین بابی ساتھ ہیں مدنپوری
بھارت بھوشن، راجمہرہ، شیوراج، مردولا، بیربل۔ سجن اور پریمناتھ
کو میلا ورک۔ پریتی سپرو۔ لیلی چکرورتی
فلمساز
ایم ایس گولاٹی
قلمکار ہدایت کار
کوشل بھارتی
موسیقی
کلیان جی آنند جی
گیت
اندیور
عکاسی
سدرشن ناگ

کو پہلی بار اُردو میں،

پیش کرنے پر

دِلی مُبارکباد!

سُنیل دت

کملیشور جی

کے

لئے

شُبھ کامنائیں

ہیما مالنی

خوبصورت زبان اُردو میں

خوبصورت کہانی کار

کملیشور

کو پیش کرنے پر میری دلی مبارکباد

•

دھرمیندر

آندھی و موسم
کے خالق
اور
اپنے عزیز دوست
کملیشور
کے لئے
ہدیۂ خلوص
گلزار

کلیشور

سے اُردو میں پیش کر کے آپ

لسانی اور جذباتی ہم آہنگی

کا خوشگوار فرض انجام دے رہے ہیں

نیک خواہشات کے ساتھ

منوج کمار

قوم پھر ہمّت سے آگے بڑھنے لگی ہے

1975-76ء

دیہات میں نئی زندگی

- ★ مکان تعمیر کرنے کی 65 لاکھ سے زیادہ جگہیں الاٹ کی گئیں، جن میں سے 3,68,000 تعمیر کے لئے بالکل تیار کر کے دی گئی ہیں۔
  2,46,000 مکانوں کی تعمیر کا کام پورا ہو گیا۔
- ★ تقریباً 47,000 افراد جن سے جبری مزدوری لی جا رہی تھی، آزاد کرائے گئے ہیں۔
- ★ زمین کی ملکیت کی حد مقرر کرنے کے قوانین پر عملدرآمد سے 16,67,000 ایکڑ زمین فاضل قرار دی گئی جس میں سے اب تک 24,000, 4 ایکڑ زمین الاٹ کی جا چکی ہے۔ اس سے تقریباً 1,80,000 افراد کو فائدہ پہنچا ہے۔
- ★ 19 دیہی بنک قائم کئے جا چکے ہیں۔ 1976-77ء میں مزید ایسے 50 بنک قائم کرنے کی تجویز ہے۔ قرض دینے والے کوآپریٹیو اداروں کو مضبوط بنانے کے اقدامات کئے گئے ہیں۔

76/88

●

اپنے پیارے دوست
اور
مقبول کہانی کار
کملیشور
کو نذرانۂ خلوص
شکتی سامنت

ایسٹ اینڈ ویسٹ موویز کی بہت ہی اہم فلم
جو بہت تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے

جس میں جلوہ گر ہو رہے ہیں

منوج کمار
(عوامی شاعر کے رول میں)

ہیما مالنی

شترو گھن سنہا

اور

راکھی گلزار

موسیقی
لکشمی کانت پیارے لال

پروڈیوسر ڈائرکٹر
بلبیر کمار

کہانی، منظر نامہ اور مکالمہ
کملیشور

فوٹوگرافی
نریمن اے۔ ایرانی

آرٹ
دیش مکھرجی

جاری کردہ: **ایسٹ اینڈ ویسٹ موویز**
سبھاتا بلڈنگ (یونین بینک کے سامنے)، جوہو تارا روڈ۔ جوہو۔ بمبئی ۴۰۰۰۵۴ فون ۵۴۶۸۸۱

منفرد کہانی کار

کملیشور

کے
لئے

نیک خواہشات

گنیش بہاری طرز

میں

کملیشور

کا

پرانا مداح ہوں!

جیون پرکاش

فلم

گھڑی کے دو ہاتھ

کے

خالق

کملیشور

کی

نذر

خلوص و محبت کے ساتھ

ساحر لدھیانوی

وی۔ ڈی۔ کالرا

بی۔ آر۔ چوپڑہ

تلک مووِیز کی انوکھی پیشکش

پُنرجنم کی ایک دلکش کہانی
جو پُوری کی پُوری راجستھان میں فلمائی گئی

تمہارے لئے

☆ اشوک کمار۔ سنجیو کمار۔ وِدیا سنہا۔ نیلم مہرہ۔ اندرانی مکھرجی۔
اے کے ہنگل۔ وِنیش ہنگو۔ سریش چٹوال اور زرینہ وہاب (مہمان اداکارہ)

پروڈیوسر
راج تلک

منظر نامہ، ڈائیلاگ اور ڈائریکشن — باسو چٹرجی
موسیقی — جے دیو
گیت — نقش لائلپوری
کیمرہ — کے مہاجن
صدابندی — نریندر سنگھ
آرٹ — بنسی چندر گپت

ایڈیٹر
وی۔ این۔ مائیکر

عنقریب پورے ہندوستان میں ریلیز ہو رہی ہے

جاری کردہ: آنند وِلا۔ ۳۸۔جی۔ پندرھواں راستہ۔ سانتا کروز، بمبئی ۵۴ ... ۴۰۰
فون: ۵۳۱۵۵۱ / ۵۳۸۱۳۴

کملیشور
کے
لئے
نیک خواہشات
کے
ساتھ
انند بخشی
گیت کار

قوم پھر ہمّت سے آگے بڑھنے لگی ہے

1975-76ء

کالے دھن کے خلاف مہم

★ اسمگلروں کی مجرمانہ سرگرمیوں کا قلع قمع کر دیا گیا۔ خاص اسمگلر جیل میں ڈال دیے گئے۔ 42 اسمگلروں کو مفرور قرار دیا گیا اور ان کی جائداد ضبط کر لی گئی۔

★ خالی شہری زمین کی ملکیت کی حد مقرر کر دی گئی۔ مقررہ حد کے اندر بھی منتقلی ممنوع قرار دی گئی۔

★ رہائشی مکانوں کے رقبہ کی حد مقرر کر دی گئی۔ ٹیکس چوروں کو گرفت میں لینے کے لئے عالیشان و آراستہ مکانوں کی ملکیت کا تعین کیا گیا۔ جولائی 1975ء سے ٹیکسوں کی چوری کے سلسلے میں چھاپے مارے گئے، چھاپوں کے نتیجے میں براہ راست ٹیکسوں کی وصولی میں 27.4 فیصد کا اضافہ ہوا۔

★ 2,50,000 افراد نے رضاکارانہ انکشاف کی اسکیم کے تحت 1,587 کروڑ روپے سے زیادہ دولت اور آمدنی کا انکشاف کیا۔ اس سے 249 کروڑ روپے ٹیکس کی صورت میں حاصل ہوئے۔

76/90

فن اور فنکار کی فخریہ پیشکش

اردو میں ایک نئی ادبی صنف کا اضافہ

برصغیر کی منفرد ادیبہ

قرۃ العین حیدر

کی

لازوال تخلیق

کارِ جہاں دراز ہے

اردو کا پہلا سوانحی ناول جس کے سارے کردار حقیقی اور بیشتر آپ کی جانی پہچانی ہستیاں ہیں — پچھتر نایاب تصاویر کے ساتھ — ہندوستان کی کسی زبان میں آج تک اس نوعیت کا ناول نہیں لکھا گیا۔

جلد اوّل : قیمت پچاس روپے

جلد دوم (پچھتر عمدہ تصاویر کے ساتھ) : زیرِ طبع

تقسیم کار : علوی بُک ڈپو - ۹/۱۰ محمد علی روڈ ، بمبئی ۳

کملیشور
نمبر
مُدیر
صابر دت
نگراں
کشمیری لال ذاکر
17

رسالہ "فن اور شخصیت" ہر سال آپ کی خدمت میں دو شاہکار پیش کرتا ہے ۔ ان فنکاروں اور شخصیتوں کے بارے میں جنہوں نے ادب، فلم، سائنس، سیاست، مصوری یا زندگی کے کسی بھی شعبے میں انسانیت کے فلاح و فروغ کے لئے کوئی کارنامہ انجام دیا ہے۔

ادارہ

سرپرست

اندر کمار گجرال (ماسکو)
کنہیا لال پوسوال
قرۃ العین حیدر
رامانند ساگر
سُنیل دت
نوشاد
نرگس دت
پریم جی
آنند بخشی
پریم رتن وہرہ

سرورق

نریندر سیم

حُسن کار

ساجد رشید

زیر اہتمام

جوذروارا والا

منتظم اعلیٰ

قریش وارا والا

مجلس مشاورت

خواجہ احمد عباس
علی سردار جعفری
خلیق انجم
فکر تونسوی
پرکاش پنڈت
حسن کمال
احسن خان
سُکھدیو پرشاد
سریندر ناتھ ورما

مارچ سنہ ۱۹۷۷ء
جلد ۳ • شمارہ ۴/۵

موجودہ شمارہ
25 روپے
•
عام شمارہ
10 روپے
•
تقسیم کار
علوی بکڈپو
محمد علی روڈ۔ بمبئی ۳
•
اردو گھر
راؤز ایوینیو، نئی دہلی

مُدیر
صابر دت

معاون مدیر
محمود ایوبی

پبلشرز
فن اور فنکار
۴۹ - محمد علی روڈ - بمبئی ۳ ۴۰۰۰۰۳
فون:- ۳۲۰۲۰۴

کملیشور کے قلم سے

'فن اور شخصیّت' کے لئے

اُردو کو لے کر اِس ملک میں عجیب ماحول ہے۔ کلپنا کروں تو ایسا لگتا ہے کہ اُردو بولنے والوں کا ایک طبقہ بہت بڑی سی حویلی میں بند کر دیا گیا ہے اور اس کے دروازے پر کچھ ایک چُنے ہوئے پہریدار شاعر اور ادیب کھڑے ہیں۔ یہ پہریدار اندر منہ کر کے کہہ دیتے ہیں۔ "ہندوستان میں اُردو کی یہ آخری صدی ہے۔" اندر سے آواز آتی ہے۔" اُردو کی یہ آخری صدی ہے۔" پھر کوئی دوسرا پہریدار آواز لگا دیتا ہے۔" اُردو مر رہی ہے۔" اندر سے گونج آتی ہے" اُردو مر رہی ہے۔"

کچھ لوگ جو حویلی کے باہر بنچوں پر بیٹھے ہیں وہ یہ آوازیں سُن کر فوراً سرکار کی طرف بھاگتے ہیں۔ جنتا انہیں روکتی ہے، کہتی ہے .... "ہمیں بتاؤ ہماری اُردو کو کیا ہوا؟"۔ پر وہ سرپٹ سرکار کی طرف بھاگتے چلے جاتے ہیں اور وہاں جا کر خبر دیتے ہیں .. "حضور اُردو مر رہی ہے ... کچھ کیجئے۔"

سرکار انہیں اکاڈمیاں، انسٹی ٹیوٹس، ادارے تھما دیتی ہے جنہیں وہ لوگ جیبوں میں ڈال کر لوٹ جاتے ہیں۔ دروازوں پر کھڑے لوگوں کو بتا دیتے ہیں کہ سرکار نے کہا ہے۔ ..."ہم اُردو کو نہیں مرنے دیں گے۔" پہریدار یہ خبر اندر دے دیتے ہیں اور اندر سے آواز آتی ہے ... "سرکار اُردو کو نہیں مرنے دے گی۔"

اُردو اور سرکار کا رشتہ پہریداروں اور بنچوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کے ذریعے طے ہو جاتا ہے۔ خبر پھیلا دی جاتی ہے ... "اُردو جی رہی ہے۔"

کچھ اسی طرح اُردو کے جینے مرنے کی افواہیں آتی رہتی ہیں۔ لکھنؤ میں "غیر مسلم لیکھکوں" کی کانفرنس کی جاتی ہے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کرشن چندر اور رگھوپتی سہائے فراق ہندو ہیں اور منٹو اور فیض مسلمان — ہندو اور مسلمان کا تو ہمیں پتہ چلتا ہے، پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ہماری اُردو زبان کا کیا حال ہے۔

کچھ لوگوں نے اُردو کو صرف سرکار کی مہربانی پر جینے والی بھاشا بنا دیا ہے۔ یہ لوگ بھول گئے ہیں کہ اسی بھاشا میں دیش اب تک بولتا ہے۔ دیش کے بھیتر جن حالات نے ایک اور دیش بنا لیا ہے ... وہ اُردو بولتے ہیں نہ ہندی۔ جنتا جو بھاشا بولتی ہے اسے لیپی کی بنیاد پر الگ نہیں کیا جا سکتا۔ سمیر پور گاؤں کے انگوٹھا چھاپ چمن میاں اور رام داس کی لیپی انگوٹھا ہے۔ پر ان کی بھاشا ایک ہے، ان کے دکھ درد ایک ہیں۔ بھاشا کی ایکتا اور لیپی کی انیکتا کو ہمیں منظور کرنا چاہیئے۔ لیپی صرف ماضی کی وراثت نہیں ہے۔ لیپی مستقبل کا پل بھی ہے۔ اردو کا رسم الخط ہمیں پاکستان افغانستان ایران اور تمام عرب ملکوں سے جوڑتا ہے۔ سیاست اور جغرافیہ کی سرحدوں سے ہمیں ہماری بھاشا اور لیپی ہی اوپر اٹھاتی ہے۔ ساہتیہ کی لڑائیاں لڑنے والے لوگ بھول جاتے ہیں کہ ساہتیہ بڑا نہیں ہے۔ بھاشا ساہتیہ سے بڑی ہے۔ ادب مر سکتا ہے بھاشا نہیں۔ اس لیے جو اردو کے مرنے کی باتیں کرتے ہیں وہ عدالتوں کے باہر بیٹھے ہوئے سرکاری گواہ ہیں .... جنتا کے چشم دید گواہ نہیں۔

صابر دت نے جب مہندر ناتھ اور جان نثار اختر نمبر نکالے تو حیرت ہوئی کہ یہ آدمی تو "غیر مسلم اُردو لکھکوں" کے سمیلن میں تھا نہیں، یہ شخص تو سرکار کے دروازے پر دستک دے نہیں رہا تھا۔ یہ نہ حویلی کے دروازے پر تھا، نہ باہر کی بینچوں پر بیٹھا تھا۔ یہ کیسا اُردو والا ہے جو کہہ رہا ہے کہ ..."اُردو زندہ ہے، اُردو زندہ ہے۔" اور اپنے رسالے کے نمبر نکال کر اکاڈمیوں اور اداروں کو بتا رہا ہے کہ تم مرتی ہوئی زبان کے وارث نہیں تم زندہ زبان کے مالک ہو۔ پتہ نہیں کس طرح پچھلے دروازے سے یہ اُردو کے مہندر ناتھ اور جاں نثار اختر کو اُردو والوں تک پہنچانے آیا۔ اور ایک روز پائپ پیتا ہوا یہ میرے پاس آیا اور اس نے مجھے محنت کا چور دروازہ دکھایا۔ اس طرح میں "فن اور شخصیت" میں آیا۔ تعجب ہے ابھی دیش کے اردو رسالوں پرچوں سے یہ پتہ نہیں لگتا کہ اُردو میں "فن اور شخصیت" جیسا بہترین رسالہ نکلتا ہے۔ پر دیش کی سبھی بھاشاؤں میں یہ جانا پہچانا اور منظور کیا جاتا ہے۔ صابر دت کا یہ ضخیم رسالہ ادب سے ادیبوں کو بھاشا کو بھاشاؤں سے جوڑتا ہے۔ ہماری اُردو کو محنت کا یہ چور دروازہ مبارک ہو۔

اپنے بارے میں کیا کہوں؟ جو کچھ ہے آپ کے سامنے ہے۔ اس احساس کے ساتھ کہ بھاشا ہمیشہ ساہتیہ سے بڑی ہوتی ہے، اپنی اس بڑی بھاشا کے ساتھ اگر میری تحریر سے کوئی زیادتی یا بدسلوکی ہو گئی ہو تو معاف کر دیا جائے۔

کملیشور

ہماری آئندہ پیشکش

غزل نمبر

ہندوستان میں اپنی نوعیت کا پہلا نمبر

ولی سے لیکر عصرِ حاضر تک کے تمام اہم اور منفرد غزل گو شاعروں کا بھرپور انتخاب، جائزہ اور تعارف

جاں نثار اختر مرحوم کے مطالعے کا نچوڑ

علی سردار جعفری کی نگرانی میں

نومبر ۱۹۷۷ء کو منظرِ عام پر آرہا ہے۔

☆

فیض احمد فیض نمبر

پاکستان میں فیض کی شاعری کی گولڈن جوبلی تقریب کے موقع پر

برصغیر کے ہردلعزیز ادیب، نقاد اور شاعر

فیض

کے متعلق ایک اہم دستاویز جو ہندوستان میں پہلی بار "فن اور شخصیت" پیش کر رہا ہے۔

مارچ ۱۹۷۸ء میں

نگراں

حسن کمال

کوئی مضمون بلا اجازت شائع نہ کیا جائے

سرحدوں کے ٹکڑے

شگوفے

جائزے

فن اور فنکار

کملیشور کا غیر ملکی سفر

آئینہ خانے میں

بکھرے سپنے

ڈائری کے چند اوراق　　کملیشور

ٹکڑوں میں بٹا ہوا آدمی

زبانِ خلق

محمد طفیل مدیر نقوش، لاہور۔ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی۔ ڈاکٹر محمد حسن۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ۔ ڈاکٹر قمر رئیس۔ ضمیر نیازی۔ شہزاد منظر۔ شاذ تمکنت۔ وارث علوی۔ پرکاش پنڈت۔ سریندر ناتھ ورما۔ پریم وار برٹنی۔ ڈاکٹر ذکیہ انجم۔ عابد علی خاں۔ غیاث احمد گدی۔ بل کرشن اشک۔ حامد حسن حامد۔ پاکستانی ادب، کراچی۔ اردو بلٹز، بمبئی۔ انقلاب، بمبئی۔ اردو ٹائمز، بمبئی

صابر دت ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۳ نوروجی اسٹریٹ ٹھاکردوار بمبئی ۲ اور اجمل پریس، بے جے ہسپتال کماٹی پورہ بمبئی ۳ سے چھپوا کر ۱۵، چھپرا بلڈنگ مادھوداس پاستہ روڈ بمبئی ۴ سے شائع کیا۔

میرا صفحہ

پڑھنے والوں کے نام

ہاں تو آپ نے میرا جاں نثار اختر نمبر دیکھا، خریدا اور پڑھا بلکہ بہتوں نے خرید کر تحفوں کے طور پر پاکستان میں اپنے دوستوں کے پاس بھیجا جس کی مجھے بہت خوشی ہے ۔ مجھے کام کرنے کی طاقت ملی۔

اب کی بار میں آپ کو ایک ایسی شخصیت سے متعارف کرا رہا ہوں جسے آپ اکثر ہر منگل کی رات کو نو بجکر دو منٹ پر بمبئی ٹی وی پر دیکھتے ہیں، ہر پندرہ روز کے بعد اس کا مرتب کیا ہوا کہانیوں کا خوبصورت جریدہ ساریکا پڑھتے ہیں، ہر دوسرے تیسرے روز اسے ملک کے کسی کونے میں تقریر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس شخصیت کا نام ہے کملیشور۔

کملیشور کا اس وقت جدید ہندی ادب (بقول اس کے ہندوستانی ادب) میں بہت بڑا نام ہے۔ اس نے ہندی کہانی کو نیا موڑ دے کر اپنی انفرادیت کا لوہا منوا لیا ہے ۔ آپ کو اس کی کہانیوں میں آج کے انسان کا دکھ درد، زندگی کی جدوجہد، اس کے اپنے مسائل، بیوروکریسی سے اس کی لڑائی ملے گی۔ اس کی کہانیاں پڑھتے وقت آپ محسوس کریں گے کہ آپ اپنے ہی خاندان، رنگ اور نسل کے لوگوں سے متعارف ہو رہے ہیں ۔ راتیں، بیان، اتنے اچھے دن، سانپ، نیلی جھیل، مانس کا دریا، کتنے پاکستان ۔ اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

کملیشور بہ یک وقت بہت سارے کام کرتا ہے۔ کام کرنے کا اتنا اسٹیمنا میں نے اب سے پہلے کسی دوسرے ادیب میں نہیں دیکھا۔ وہ فلمیں لکھتا ہے، ٹی وی اسکرپٹ پر کام کرتا ہے، میگزین ایڈٹ کرتا ہے سنسر بورڈ میں بیٹھ کر فلم دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنی کسی کہانی کے پلاٹ کے نوٹ بھی لیتا ہے۔ ان سب کے باوجود اس نے ہندی ادب میں جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ ہے کہ اس نے نئے لکھنے والوں کی ایک کھیپ تیار کی ہے صرف ہندی ہی میں نہیں، ملک کی تمام علاقائی زبانوں میں ایک نسل تیار کی ہے۔ ان سب کو وہ اپنے رسالے ساریکا میں چھاپتا ہے تاکہ دیو قامت ہندوستانی ادب وجود میں آسکے جو اس کا خواب ہے۔

نئے لکھنے والے اسے اسی طرح پیار کرتے ہیں جس طرح روس کے نوجوان ادیب میکسم گورکی کو کیا کرتے تھے۔ وہ واحد ادیب ہے جس نے اپنے پبلشروں کو یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ کسی بھی انعام یا سرکاری اعزاز کے لیے اس کی کتاب پیش نہ کی جائے۔

آپ کے دلوں میں اپنے لیے اتنی محبت دیکھ کر فن اور شخصیت ، کملیشور کو اردو میں پہلی بار بھرپور

طریقے سے پیش کرنے کی ہمت کر رہا ہے تاکہ اردو زبان و ادب کا دامن اور وسیع ہو سکے۔

ہندی ہمارے ملک کی قومی زبان ہے یعنی میری ماں ہے کیونکہ ماں نے مجھے یہ زبان پڑھائی تھی تاکہ میں روٹی کمانے کے قابل ہو سکوں۔ اور اردو میرے لئے میرے باپ کی طرح ہے کیونکہ بچپن میں پانچ چھ جماعتیں کشمیر میں میں نے اردو ہی پڑھی تھی۔ ۱۹۴۷ء میں باپ کو اپنے سامنے قتل ہوتے ہوئے دیکھا۔ اس کے بعد جب جوان ہوا تو اپنے باپ کی زبان کو قتل ہوتے ہوئے دیکھا تو میں نے اسی زبان میں کام کرنا شروع کر دیا کیونکہ میں ابھی تک اپنے باپ کے قتل کو نہیں بھولا۔

کملیشور پریم چند اور منٹو کا شکر گذار ضرور ہے، وارث نہیں۔ اگر پریم چند کو تاریخ نے پیدا کیا ہے تو کملیشور کو وقت نے۔ مجھے امید ہے آپ میرے اس نمبر کو بھی پسند کریں گے۔

ہاں تو میں **محمود ایوبی** صاحب سے آپ کو تو ملانا بھول ہی گیا، جنہوں نے ۱۹۵۸ء میں علیگڈھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور اپنی ذہانت اور زندگی کا بڑا حصہ روزانہ اخبارات کی سرخیوں کی نذر کر دیا۔ کملیشور نمبر کو آپ تک پہنچانے میں میرے ساتھ ان کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

خدا حافظ

آپ کا

مبارک

مکرّر یہ کہ میں مشہور افسانہ نگار **کشمیری لال ذاکر** کا بھی بے انتہا مشکور ہوں جو اپنی بے پناہ دفتری مصروفیتوں کے باوجود چندی گڈھ سے بمبئی آئے اور کملیشور کا شخصی خاکہ "ٹکڑوں میں بٹا ہوا آدمی" لکھا۔ اُردو میں ادبی سوانح عمری کی یہ اپنی مثال آپ ہے۔ ابن کا اس لئے بھی ممنون ہوں کہ انہوں نے "فن اور شخصیت" کا نگراں بن کر اس رسالے کو ادبی سیاست سے بچا لیا۔

ص - د

محبت
نامے

کرشن چندر ——— بمبئی
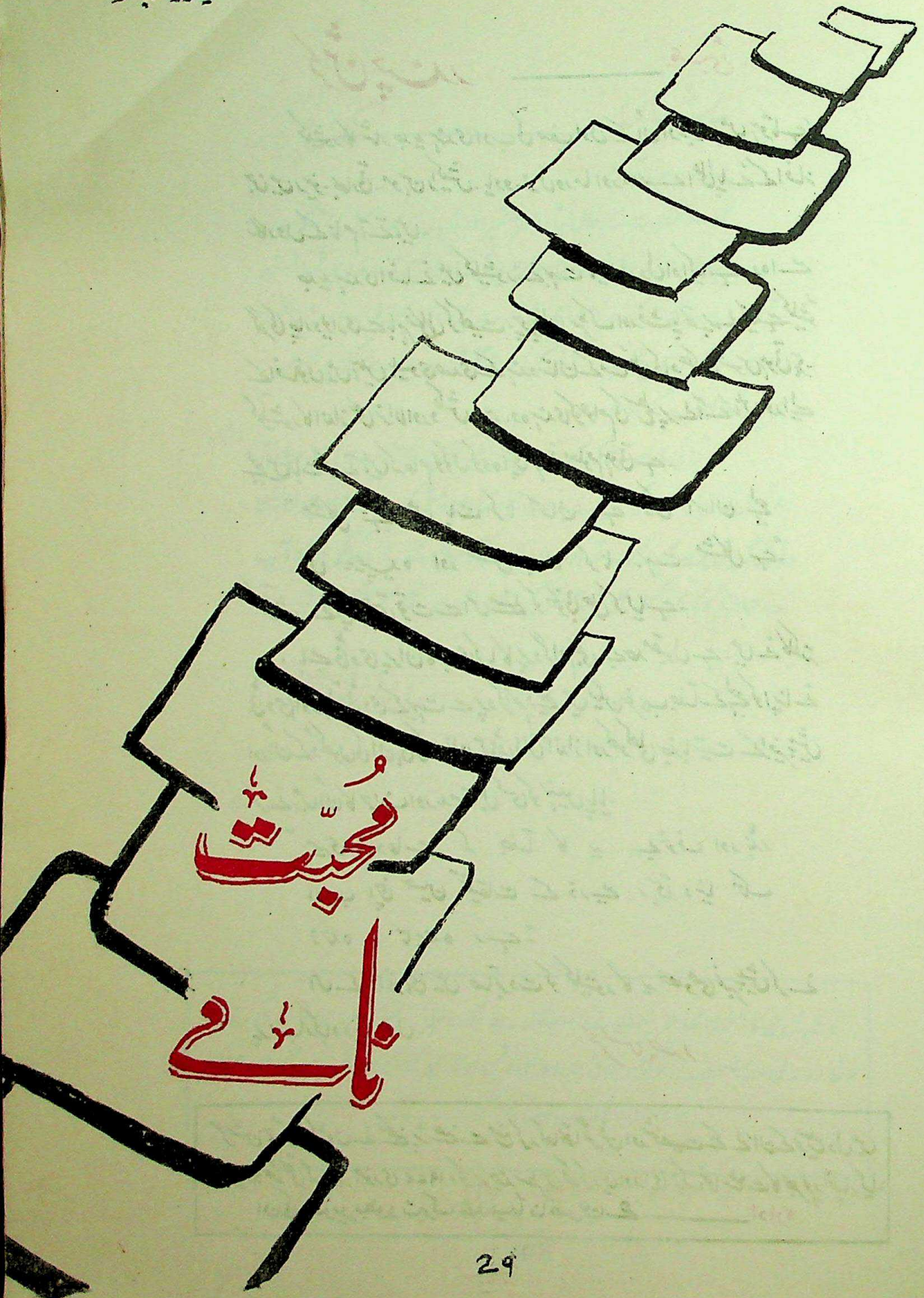
کملیشور کا شمار جدید ہندی ادب کی صفِ اول کے اُن ادیبوں میں ہوتا ہے جن میں رینو۔ بھارتی۔ موہن راکیش۔ یادو۔ نرمل ورما اور دوسرے اعلیٰ پائے کے افسانہ نگاروں کے نام آتے ہیں۔

جدید ہندی افسانے میں کملیشور نے بہت نمایاں رول ادا کیا ہے۔ وہ اسے گھر کی چار دیواری سے باہر نکال کر کھیت، چوپال، سڑک اور فٹ پاتھ پر لے آیا ہے۔ کملیشور کے افسانوں میں ہمیں بیسویں صدی کے ہندوستان کے مسائل کی دھمک محسوس ہوتی ہے۔ کملیشور کا انداز بھی نرالا اور دلکش ہے۔ وہ ہندی کو عوام کی سطح پر لے آئے ہیں اور ایسے لہجے میں بات کرتے ہیں کہ عام لوگوں کو وہ اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

"مشکل لہجے میں بات کرنا آسان ہے لیکن آسان لہجے میں پیچیدہ اور مشکل بات کرنا بہت مشکل ہے۔"

کملیشور نے اپنی حسّی قوت سے اس مسئلے کو بخوبی حل کر لیا ہے۔

بامبے ٹی وی پر اُن کا پری کرما کا پروگرام بھی بے حد مقبول ہے۔ میں نے کلکتہ ٹی وی اور دہلی ٹی وی کے بہت سے پروگرام دیکھے ہیں لیکن غریب جنتا کے لہجے کو اپنانے اور اُن کے دکھوں کی اُن ہی کی زبان میں ڈرامائی انداز اور کھوکھلی جذباتیت کے بغیر پیش کرنے میں اُن کا حریف اور مدِ مقابل کسی کو نہیں پایا۔

"میری دلی دعا ہے کہ جنتا کا یہ بے خوف اور نڈر ادیب اپنی حسین تخلیقات کے ذریعے رہتی دنیا تک زندہ و تابندہ رہے۔"

اس کے ساتھ ہی میں صبا بردت کو کملیشور کا یہ خصوصی نمبر پیش کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

کرشن چندر

کرشن جی کو ڈاکٹروں نے لکھنے پڑھنے سے منع کر رکھا تھا مگر فن اور شخصیت کے لئے ان کے وسیع دل میں اتنی زیادہ جگہ تھی کہ ۲۴ر جنوری ۱۹۷۷ء کو یہ چند سطریں لکھ کر دیں اور اپنی نیک خواہشات کا بھرپور اظہار کیا۔ ان کی تحریر بطورِ تبرک ہدیۂ ناظرین ہے ——— ادارہ

یشپال ——— لکھنؤ

پیارے صابر دت

فن اور شخصیت کے جاں نثار اختر نمبر اور آپ کے خط کے لئے شکریہ۔

آپ اُردو رسم خط میں قارئین کو برصغیر کی زبانوں کے تعارف اور ثقافتی سرگرمیوں سے روشناس کرانے کا جو اہم کام کر رہے ہیں، اس کے لئے میری سراہنا قبول فرمائیے۔ اس کام میں اپنی پیرانہ سالی کے باعث عملی تعاون نہ دے سکنے پر بھی میرا بھرپور تعاون آپ کے ساتھ ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ آپ تیسرا نمبر کلیشور جی پر نکال رہے ہیں۔ وہی بات پھر کہوں گا کہ اپنی صحت کی خرابی کے باعث عملی تعاون پیش کرنے سے قاصر ہوں لیکن دل کی گہرائیوں سے آپ کے ساتھ ہوں اور آپ کی کامیابی کے لئے دُعاگو ہوں۔ آپ کے اس اہم کام میں کسی بھی طرح شریک ہونے پر مجھے خوشی ہوگی۔

यशपाल

یشپال جی کا آخری خط جو انہوں نے اسپتال سے لکھا تھا۔ افسوس ان کی زندگی نے وفا نہ کی ورنہ فن اور شخصیت اُن کی رہنمائی میں اور بھی وسیع ہوتا۔ پھر بھی آخر دم تک ان کے اندر جو حوصلہ تھا وہ بذات خود ایک بےمثال چیز تھی ——— (ادارہ)

اندر کمار گجرال ——— سفیر ہند مقیم ماسکو

پیارے صابر دت

کملیشور نے ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ آپ ان پر خاص نمبر نکال رہے ہیں، جس کے لئے میں آپ کو داد دیتا ہوں۔

اُمید ہے دہلی میں جلد ہی آپ سے ملاقات ہو گی۔

مخلص

اندر کمار گجرال

خشونت سنگھ ——— ایڈیٹر السٹریٹیڈ ویکلی۔ بمبئی

کملیشور کی رنگا رنگ شخصیت کے دو ہی پہلو میری نظر میں ہیں۔ بحیثیت ساریکا کے ایڈیٹر اور بحیثیت ٹیلی ویژن آرٹسٹ۔

دونوں ہی حیثیتوں سے انہوں نے ہندوستانی ادب کو مالا مال کیا ہے۔

تعیش پسند طبقے کے لئے کملیشور نے ٹی وی پر عام آدمی اور اس کے مسائل کو پیش کر کے ہمارے شعور کو نئی جہت سے روشناس کیا ہے۔

Khushwant Singh

گلاب داس بروکر ——— بمبئی

ڈیر صابر دت

"فن اور شخصیت" کے لئے میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جو ہندوستانی زبان و ادب کی بیش بہا خدمت انجام دے رہا ہے۔

میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ آئندہ برسوں میں دیگر زبانوں کے ادیبوں کو بھی اسی طرح اردو میں روشناس کر کے نوازیں گے۔

Gulabdas Broker.

قرۃ العین حیدر ——— بمبئی

Kamleshwar is a pioneer of the New Story movement [in Hindi] which began in the mid-fifties. The New Story concerned itself with the genuineness of experience, and the degradation of human values.

Kamleshwar, who is today one of the leading writers in Hindi, is known for his readable style. He does not use an artificial or contrived "literary Hindi" and writes about the ordinary lives led by ordinary people in small towns and suburbs...

QURRATULAIN HYDER

(Extract from the preface to the anthology "Stories from India".)

راجندر سنگھ بیدی ———— بمبئی

اردو اور ہندی دونوں زبانیں تعصب کی شکار ہیں۔ دونوں جب اپنے آپ سے خفا ہوتی ہیں تو بچے کی طرح سے اپنی ماں سنسکرت اور فارسی کی گود میں دوڑتی ہیں اور ان کی خفگی سمجھ میں نہیں آتی۔

ہندوستان کے مصنفین میں کملیشور ہی واحد شخصیت ہیں جو ہندی کے ادیب ہوتے ہوئے بھی بڑی فصاحت اور بلاغت سے اردو کا استعمال کرتے ہیں اور جن کی بات ہر آدمی کی سمجھ میں آتی ہے۔ ان کا کہانی لکھنے کا انداز بھی ان کی گفتگو کی طرح سے سلجھا ہوا اور صاف ہے۔ ہندی لپی کو آسانی سے نہ پڑھ پانے کی وجہ سے میں نہیں کہہ سکتا کہ میں نے کملیشور کو مستقل پڑھا ہے۔ لیکن جب بھی ترجمے کی صورت میں کہانی چھپی ہے، میں نے اسے پڑھا اور جی جان سے سراہا۔

کملیشور بلا شک و شبہ ہندوستان کے سربراہ ادبا میں سے ہیں اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اردو زبان میں اگر ہمارے سرحد پار کے ساتھی بھی کملیشور کی تحریر کی اُپج اور افتاد سے واقف ہوں گے اور جی جان سے اُسی سراہیں گے۔

راجندر سنگھ بیدی

سردار جعفری ———— بمبئی

کملیشور ہندی زبان کے اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار اور ادیب ہیں۔ وہ روشن خیال ہیں، ترقی پسند ہیں اور فنی اعتبار سے ہندوستان کے ادیبوں کی صف اول میں اپنا مقام رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات اس قابل ہیں کہ اُن کا ہندوستان کی ہر زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ اسی طرح دوسری زبانوں کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات ہندی اور اردو میں آنی چاہئیں۔

صابر دت مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنے مشہور جریدے "فن اور شخصیت" کا ایک خاص نمبر کملیشور کی زندگی اور تخلیق کے لئے وقف کر دیا ہے اور اس طرح اردو تک ہندی کی اس دولت کو پہونچانے کا انتظام کیا ہے جس کو ہندی تک محدود نہ رہنا چاہیئے۔

ایک اور اعتبار سے بھی 'فن اور شخصیت' کا کملیشور نمبر اہم ہے۔ ادھر اردو زبان، اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے ہندی تخلیقات کے اتنے ترجمے شائع نہیں کر رہی ہے جتنے اردو کے تراجم ہندی میں شائع ہو رہے ہیں۔ یہ تبادلہ ان دونوں زبانوں کے لئے مفید ہے۔ زبانیں جو الگ الگ ہونے کے باوجود اتنی قریب ہیں۔ میں اس خاص نمبر کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

سردار جعفری
۱۸ فروری

چودھری محمد نعیم ——— شکاگو (امریکہ)

مکرمی صابر دت صاحب۔ تسلیمات۔

نوازش نامہ ملا۔ گذشتہ جولائی میں میں ہندوستان گیا تھا اور وہاں آپ کے رسالے کا "جاں نثار اختر نمبر" نظر سے گذرا تھا بلکہ اس کی ایک کاپی خرید کر سمندری ڈاک سے بھجوائی تھی۔ دانش محل والوں کے ذمے یہ کام تھا۔ وہ پارسل ابھی تک نہیں پہنچا۔ اب آپ کا تحفہ دیکھیے کب پہنچتا ہے۔ اس عنایت خاص کے لئے آپ کا ممنون ہوں۔ دوسری کاپی آ گئی تو کسی اور کے کام آ جائے گی۔ اس سفر کے دوران بمبئی جانا نہ ہو سکا ورنہ ملاقات ضرور ہوتی۔

یہ بات واقعی لائق ستائش ہے کہ آپ نے اگلا شمارہ کملیشور جی کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ ہندی داں طبقہ اردو ادب سے جس حد تک واقف ہے اس کا عشر عشیر بھی اردو داں لوگ ہندی کے بارے میں نہیں جانتے۔ نہ صرف یہ کہ نہیں جانتے بلکہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔ چلئے آپ کے رسالے کے ذریعے کملیشور سے تو واقف ہو جائیں گے۔ خدا آپ کی کوشش کو کامیاب کرے۔ آپ نے مجھ سے پیغام مانگا ہے یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ میں اردو کا ادنیٰ طالب علم اور معلم ہوں۔ اگر امریکہ میں نہ ہوتا تو کسی گمنامی کے گوشے میں پڑا ہوتا۔ میں کیا اور میرا پیغام کیا۔ چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ آپ کے ڈاک وغیرہ پر اتنے پیسے خرچ ہو گئے یہی میرے لئے حجاب کیا کم ہے۔

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

والسلام، نیازمند

نعیم

ڈاکٹر خالد حسن قادری ——— لندن

مکرمی صابر دت صاحب۔ آداب

فن اور شخصیت کے ذریعے آپ اردو ادب کی جو گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں وہ لائق صد تحسین تو ہے ہی، قابلِ رشک بھی ہے بلکہ رشک سے زیادہ اس سے غبطہ کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ ہر کارے و ہر مردے والی بات ہے اور ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

مہندر ناتھ اور جاں نثار اختر کے بعد کملیشور نمبر شائع کر کے واقعی آپ نے صحیح سمت میں نیا قدم اٹھایا ہے۔ جناب کملیشور جدید ہندی ادب میں ایک منفرد مقام کے حامل ہیں، ان کی خدمات واقعی اس قابل ہیں کہ انہیں زیادہ سے زیادہ سراہا جائے۔ اس شمارے کے ذریعے اردو ادب کے ایوان میں بھی ایک نیا دریچہ کھل جائے گا اور ہم جیسے غریب الدیار و دور افتادہ بھی ہمعصر ہندی ادیبوں کی کاوشوں سے روشناس ہو سکیں گے۔

خالد حسن قادری

پروفیسر اینزو توربیانی ــــــــــ اٹلی

کلیشور ہندوستان کے ایک عظیم افسانہ نگار اور قصہ گو ہیں۔ ان کے متعلق میں اپنے تاثرات بھیج رہا ہوں۔ شاید آپ کو پسند آئے۔ ابھی اردو پر مجھ کو اتنی قدرت نہیں ہے اس لئے میری تحریر میں بہت سی غلطیاں ہو سکتی ہیں۔ لہذا میری غلطیوں کو نظر انداز کیجئے گا۔ جلد ہی میں اردو پر مہارت حاصل کر لوں گا۔

کملیشور کو آپ اردو میں پیش کر کے ایک بڑا کام کر رہے ہیں۔ جس کے لئے میں آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خدا آپ کو اپنے عظیم مقصد میں کامیابی بخشے۔

Enzo Turbiani

مرزا ظفر الحسن ــــــــــ مدیر غالب کراچی (پاکستان)

بد قسمتی سے میں ہندی زبان سے واقف نہیں ہوں اسی باعث اس زبان کے ممتاز ادیب کملیشور کی تخلیقات سے استفادہ نہیں کر سکا مگر یہ جانتا ہوں کہ موصوف نہایت معروف صاحبِ کتاب اور اہلِ قلم ہیں اور ایک سے زیادہ اہم اصنافِ سخن پر عبور رکھتے ہیں۔

ایشیائی ممالک اور بالخصوص برصغیر ہند و پاک میں اپنے نامور شاعروں اور ادیبوں اور فنکاروں کو ان کے جیتے جی وہ مقام اور اعزاز نہیں دیا جاتا جس کے وہ مستحق ہیں، جسے میں ادبی المیہ سمجھتا ہوں۔

ادارۂ فن اور شخصیت قابلِ مبارکباد ہے کہ اس نے کملیشور صاحب کے اعزاز میں ایک خاص نمبر نکالنے کا اہتمام کیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ہندوستان کے محترم ادیب ادارے سے ہر ممکن اشتراک کریں گے اور ادارہ ایک شایانِ شان نمبر نکال کر کملیشور کی خدمت میں اپنی محبت کا نذرانہ پیش کرے گا۔ میں ادارے کی کامیابی کا متمنی ہوں۔

لکھنؤ رنگ

اختر جمال ــــــــــ اسلام آباد (پاکستان)

عزیز بھائی صابر دت

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ آپ کملیشور نمبر شائع کر رہے ہیں۔ اس طرح اردو داں طبقہ بھی کملیشور کی شخصیت اور فن سے متعارف ہو سکے گا۔

افسوس ہے کہ میں نے اب تک کملیشور جی کی کوئی چیز نہیں پڑھی۔ ان کے ناول اور کہانیاں پڑھنے کا اشتیاق ہے۔ ہم لوگ صرف ان ہی ادیبوں کو جانتے ہیں جنہیں تقسیم سے پہلے پڑھا ہے یا جو پاکستانی

پرچوں میں چھپتے ہیں۔ دونوں ممالک کے دوستانہ تعلقات کے لئے یہ بھی ایک اچھا قدم ہے کہ ہندی ادب کے اچھے تراجم ہوں اور اردو ادب جس میں پاکستانی ادب بھی شامل ہے، دیوناگری میں شائع کیا جائے۔ دونوں جگہ رسائل کا تبادلہ بھی آسانی سے ہونا چاہیئے۔

میں دعا کرتی ہوں کہ آپ کے سابقہ نمبروں کی طرح اس نمبر کو بھی مقبولیت حاصل ہو۔

احسن آپ کو سلام کہتے ہیں اور کملیشور نمبر کے لئے نیک تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں۔

آپ نے نمبروں کی ایک شاندار روایت قائم کی ہے۔ خدا کرے یہ روایت برقرار رہے اور آپ ایک سے ایک بڑھ کر شاندار نمبر نکالیں۔

مخلص رضیہ جمال

وارث علوی ———— احمد آباد

برادرم صابر دت۔

نوازش نامہ ملا۔ کملیشور نمبر کا خیال بہت اچھا ہے۔ ایک بات کا خیال رکھئے کہ کملیشور کی زیادہ سے زیادہ تخلیقات کو پرچہ میں جگہ ملے۔ کم از کم تمام مشہور کہانیاں تو شامل ہونی ہی چاہئیں۔ آپ کا ایما رہے تو کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش ضرور کروں گا حالانکہ امید نظر نہیں آتی کہ کچھ لکھ سکوں گا۔ وجہ یہ ہے کہ میں ہندی ٹھیک سے نہیں پڑھ سکتا۔ اردو میں جن کہانیوں کے تراجم ہوئے ہیں انہیں حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔

وارث علوی

شمس الرحمٰن فاروقی ———— لکھنؤ

برادرم صابر دت صاحب

میں آپ کے خطوں پر اس لئے خاموش تھا کہ جاں نثار نمبر پر تبصرہ کرنے کے بعد لکھوں گا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبصرے میں بہت دیر لگ جائے گی۔ اس لئے مختصراً عرض کرتا ہوں کہ نمبر ہر لحاظ سے شاندار اور بھاری بھرکم ہے۔ آپ نے اچھے مضامین جمع کر لئے۔ یہ بڑا کارنامہ رہا۔

کملیشور نمبر میں شریک ہونے سے قاصر ہوں۔ میں ہندی واجبی جانتا ہوں۔ کملیشور سے جو کچھ ادبی رسم و راہ ہے وہ ان کے ترجمہ شدہ افسانوں کے سہارے سے ہے۔ ایسی صورت میں اظہار خیال کرنا فضول ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں اصولاً اس بات کے حق میں نہیں ہوں کہ غریب اردو زبان کا کوئی پرچہ کملیشور یا اس طرح کے کسی اور زبان کے ادیب پر اتنا سرمایہ صرف کرکے نمبر نکالے۔ ہندی کا کوئی پرچہ اردو کے بڑے سے بڑے ادیب

حتیٰ کہ غالب یا ہمارے زمانے میں فراق و فیض و راشد پر بھی نمبر نکالنے کی وسیع النظری نہیں رکھتا تو ہم لوگ ان پر نمبر کیوں نکالیں۔ کیا سارِیکا کسی اردو افسانہ نگار پر فن و شخصیت جیسا بھاری بھرکم نہ سہی لیکن متوسط حجم کا بھی تعریفی اور سوانحی نمبر نکالنے کی جرأت رکھتا ہے؟

جاں نثار مرحوم پر اپنے مضمون میں ایک جگہ میں نے یہ لکھ دیا ہے کہ سردار جعفری نے آزاد نظم کو اردو شاعری کے چہرے پر بدنما داغ کہا ہے۔ یہ درست نہیں ہے۔ میں نے یہ بیان سہواً سردار جعفری سے منسوب کر دیا ہے۔ معاملہ یوں ہے کہ ڈاکٹر سلامت اللہ نے، جو ترقی پسند نقاد بھی ہیں، آزاد نظم پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اس کو اردو شاعری پر بدنما داغ کہا تھا اور کہا تھا کہ سردار جعفری جیسے ہوش مند شعرا کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ آزاد نظم کہنے لگے ہیں۔ میں نے بے خیالی میں سردار جعفری سے وہ بات منسوب کر دی جو اُن کے بارے میں ڈاکٹر سلامت اللہ نے اپنے مضمون میں کہی تھی۔ اس سہو کے لئے میں معذرت چاہتا ہوں۔

آپ کا : شمس الرحمٰن فاروقی

ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی ——— ایڈیٹر دھرم یگ۔ بمبئی

اُردو پڑھنے والوں کے لئے ہندی کے جدید کتھا ساہتیہ کی عظمت اور بلندی کی نمائندگی کے لئے کملیشور سے بہتر اور کوئی نام نہیں ہو سکتا۔ آج سے لگ بھگ ۲۵ سال پہلے ان کی کہانیوں نے ہندی کے افسانوی ادب کو ایک نیا موڑ دیا تھا۔ راجہ نربنسیا اور نیلی جھیل جیسی کہانیوں نے ہندی کہانی میں انہیں اونچا مقام دلایا۔ تب سے وہ برابر ہندی ادب میں اپنا منفرد مقام بنائے ہوئے ہیں۔

زبان کے معاملے میں وہ ہندی اور اُردو دونوں زبانوں کے کٹر پنتھیوں کی مخالفت کرتے رہے ہیں جس کے کارن انہیں کبھی کبھی دونوں طرف کی مخالفتیں برداشت کرنی پڑی ہیں۔ لیکن انہوں نے اپنے نظریہ کو کبھی بدلا نہیں۔ میرے لئے وہ دوست اور بھائی سے بھی بڑھ کر عزیز اور اپنے ہیں۔ میں صابر دت کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اس اعزاز کے لئے ایک صحیح شخصیت کا انتخاب کیا ہے۔

(دستخط)

حسن کمال ——— ایڈیٹر اُردو بلٹز، بمبئی

صابر!
کملیشور نمبر نکال کر تم نہ صرف اُردو داں عوام کو اُنکی تازہ و توانا فکر اور حقیقت پسندانہ ادب سے روشناس کرا رہے ہو بلکہ اُردو اور ہندی کی خلیج کو پاٹنے کی بھی ایک اہم کوشش کر رہے ہو جس کے لئے میں تمہیں داد دیتا ہوں۔
عدیم الفرصتی کے باعث مفصل مضمون نہ لکھنے کا مجھے افسوس ہے۔

(دستخط)

فکر تونسوی ——— دہلی

میاں صابردت

تم چاہتے ہو ٹیلی گرام بھیجوں یا ٹیلی پرنٹر کے ذریعے پیغام۔ وہ سبھی میرے قریب رکھی ہوئی تپائی کی زینت بنتے جائینگے وہ تپائی، جس پر میرے لئے دوائی کی شیشیاں اور کیپسول وغیرہ رکھے ہوئے ہیں ـــــ ایش ٹرے اٹھا دی گئی ہے البتہ ٹیگور کی گیتانجلی رکھنے کی اجازت دے دی گئی ہے، شاید اس لئے کہ روح کی شدھی اس مرحلے پر زیادہ لازمی ہے۔ جسم تو ایک لطیفہ ہے جو سنتے سنتے باسی ہو چکا ہے۔ میرا نروس سسٹم گنجلک ہو گیا ہے۔ اعصاب صحیح سالم ہوتے تو کملیشور کے متعلق اپنے عشق کے چند نمکین قطرے اپنے قلم سے ٹپکا دیتا۔ ہاں، کملیشور سے مجھے عشق ہے۔ اس عشق کا رنگ سانولا سلونا ہے، کملیشور کی طرح، اسکی کہانیوں کی طرح، اس کے قہقہے کی طرح، جسمیں قوسِ قزح کی سی چمک دمک بھی ہوتی ہے اور اس کی نچلی تہوں میں سرسراتی ہوئی سنجیدگی بھی۔ کیونکہ وہ سماج کے عام انسانی کرداروں کے سکھ اور دکھ کے بارے میں بڑی ذمہ دارانہ سنجیدگی کا مالک ہے۔ وہ ان کے لئے روتا بھی ہے، تڑپ بھی اٹھتا ہے اور انکی ایک خوبصورت اور نفیس زندگی کے خواب بھی دیکھتا ہے۔ ڈاکٹر اجازت دیتا تو میں کملیشور کے بارے میں بہت کچھ لکھ دیتا۔

فکر تونسوی

ندا فاضلی ——— بمبئی

صابر صاحب!

تم سے جب میں پہلی بار ملا تھا تو یہ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم اپنے قد سے بڑا کام کرنے کے بھی قابل ہو۔ لیکن تم نے میرا اندازہ غلط ثابت کر دیا ... مہندر ناتھ اور جاں نثار اختر کے انتقال نے جب سائنسی فکر کے مبلغ تمام ترقی پسندوں کو موت کے خوف نے گھیر لیا اور وہ تمہاری پیہم درخواست پر بھی اپنا نمبر نکالنے کی اجازت نہیں دے رہے تھے تو یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ تم لسانی تفریق کی اس لمبی چوڑی خلیج کو پاٹ دو گے جو ہمارے بزرگوں نے دانستہ اپنے مفاد کے لئے بنا رکھی ہے۔ اردو کی بزرگ پیڑھی کے لسانی تعصب نے اردو کو کتنا نقصان پہنچایا ہے شاید اس کا انہیں علم ہوگا۔ شکر ہے اردو کی نئی نسل اپنے بزرگوں کی طرح اپنے ذہن کی کھڑکیاں بند کرکے اپنے نام کے وظیفے کا ورد نہیں کرتی رہتی ہے، وہ کھلی فضا میں سانس لینا چاہتی ہے۔ ہندی اور اردو ایک دوسرے کی طاقت ہیں۔ کسی ایک کی نفی کر کے دوسری کو مضبوط نہیں بنایا جا سکتا۔

کملیشور کے ادب پر تمہارا یہ نمبر ہمارے بزرگوں کی غلطی کی تلافی بھی ہوگا اور دو زبانوں کے درمیان رسم الخط کی جو خلیج حائل ہے اس پر بھی کوئی پل تعمیر کرنے کا کام کرے گا۔

بزرگوں کی سمجھداری سے بچئے
بنا پیروں کے سر چلتے نہیں ہیں۔

میں خوش ہوں اس بار بھی تم نے میرے اندازہ کو غلط ثابت کر دیا۔

محمود ایوّبی

یہ جاننا ضروری ہے کہ ..

چھوٹے سے قد مگر بلند مرتبے والے ایک آدمی کا نام ہے کملیشور۔

مرتبے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے کوئی سرکاری یا سیاسی مرتبہ حاصل کر رکھا ہے۔ اس کا مرتبہ ادبی ہے جسے اس نے کڑی محنت، لگن اور ریاض کے بعد حاصل کیا ہے اور اپنے فن کے ذریعے اپنے اِرد گرد کے معمولی اور حقیر لوگوں کو بھی ایک اونچا مقام دلا دیا ہے۔

۱۹۳۲ء کی چھٹی جنوری کو یو۔پی کے ایک قصبے مین پوری میں پیدا ہونے والے اس شخص نے زندگی کے بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ مگر اس سفر میں اس نے کبھی اپنی ہمت نہیں ہاری ہے۔ ٹوٹے اور بکھرے ہوئے زمیندارانہ ماحول میں جنم لینے والے کملیشور کی ابتدائی زندگی بڑی عسرت میں گذری۔ باپ کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا اس لئے وہ باپ کی تصویریں دیکھ کر ان کے بارے میں ایک خیالی پیکر تراشتے اور جگہ جگہ انہیں آواز دیتے پھرتے تھے۔

اس سنسان اور اداس زندگی میں ہمت والی ماں محنت مشقت کر کے ان کی پرورش و پرداخت کر رہی تھیں۔ زندگی کی سختیوں کو انہوں نے جس طرح ہنس ہنس کر جھیلا اس کی چھاپ کملیشور پر بھی پڑی۔

کالستھ گھرانے میں نوکری ہی ذریعۂ معاش ہوتی ہے اس لئے کملیشور اپنی خداداد ذہانت کے سہارے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایسی حالت میں جب فیس کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے اور کورس کی کتابیں نہیں ملتی تھیں۔ امتحان کے وقت نہ کوئی پیٹھ ٹھپکنے والا تھا اور نہ اچھے رزلٹ پر مٹھائی تقسیم کرنے والا۔

اُن دنوں سائنس کا مول تھا اس لئے کملیشور نے انٹر سائنس کیا مگر اُن کا رجحان تو ادب کی طرف تھا اس لئے پھر آرٹس میں آگئے اور ۱۹۵۴ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ کچھ دنوں کے لئے پی ایچ ڈی بھی جوائن کی تھی۔ مگر انہیں نہ تو یونیورسٹی کی نوکری کرنی تھی اور نہ سرکار کی۔ انہوں نے تو دِقتوں اور دشواریوں بھرا ادب کا راستہ چنا تھا جسمیں بقول پریم چند ساری عمر شمع کی صورت گھل گھل کر روشنی بکھیرنی پڑتی ہے۔ کملیشور نے اپنی زندگی کو چمکیلی اور روشن بنانے کے بجائے اپنے اِرد گرد کے لوگوں کی زندگیوں میں روشنی کی جوت، زندگی کی تب و تاب اور مستقبل کی آس جگانے کے لئے اپنا قلم سنبھالا۔

کملیشور نے افسانے، ناول، ڈرامے، ڈائریاں، سفرنامے اور تنقیدی مضامین سب ہی کچھ لکھے ہیں اور ایک مقصد کے تحت لکھے ہیں۔ مقصد کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے ادب کو نرا پروپیگنڈہ بنا دیا۔ ادب کے ذریعے زندگی کی

ترجمانی ضرور کی مگر ادبی اور فنکارانہ انداز میں۔

آج سے ۲۵، ۳۰ سال پہلے انہوں نے افسانہ نویسی کے میدان میں قدم رکھا تھا اور ۲۲ سال کی عمر میں ہی راجہ نربنسیا لکھ کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد دیوا کی ماں، قصبے کا آدمی، نیلی جھیل، ماس کا دریا، راتیں وغیرہ کہانیوں کی تخلیق کر کے ہندی ہی میں نہیں بلکہ دنیا کے افسانوی ادب میں اضافہ کرتے رہے اور آج وہ بقول ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی "ہندی کے کتھا ساہتیہ کی عظمت اور بلندی کی نمائندگی کرتے ہیں۔" انہوں نے انتہائی ویران ماحول، مین پوری کے پسماندہ قصبہ، وہاں کے خستہ حال اور قابل نظر انداز لوگوں کو ایسا داستانی رنگ دے دیا ہے کہ عام اور معمولی آدمی کی معمولی زندگی بھی قابل ذکر ہو گئی ہے۔ پھر ان باتوں کو اتنی ہمدردی سے بیان کرتے پر صاف پتہ چلتا ہے کہ کملیشور کو صرف عام آدمیوں کی کہانیوں ہی سے تعلق نہیں ہے بلکہ ان کے لئے وہ اپنے دل میں نرم گوشہ اور گرمی بھی رکھتے ہیں۔ کملیشور نے ہر میڈیا سے سنگین حقائق سے آنکھیں چرانے یا ناواقف رہنے والوں کو جتا دیا ہے کہ زندگی کا ایک دکھ بھرا پہلو یہ بھی ہے جس میں بہت سارے لوگ مبتلا ہیں۔ اس سے نظریں نہ چراؤ۔ محل نشینوں کے لئے یہ نئی بات ہوتی ہے مگر کملیشور اپنی بات فرض سمجھ کر کہتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ادب کی تخلیق ہو، ٹی وی اور فلم کی اسکرپٹ ہو یا صحافتی مضامین اور تقریریں جیسے وہ ہر زمانے میں ایک ساتھ اپنا فرض سمجھ کر کرتے آئے ہیں اور صلہ و ستائش کی تمنا کے بغیر۔ بچپن میں جس طرح انہوں نے کسی کی پیٹھ ٹھونکے بغیر اپنی تعلیم حاصل کی اسی شغف سے آج اپنے ادب کی تخلیق کر رہے ہیں۔

کہانی کے میدان میں جب اترے تو نئی کہانی کا شور تھا۔ انہوں نے جب یہ دیکھا کہ یہ تو زندگی سے کٹ کر من کی اندھیری گپھاؤں میں کھو جانے کا انداز ہے تو اس ڈگر سے ہٹ گئے۔ انہوں نے ادب کا جو صحیح راستہ چنا اس پر چلنے والوں کا ایک کارواں بھی تیار کیا ہے جو ادب اور زندگی کے باشعور سپاہیوں پر مشتمل ہے۔ یہ کام بھی انہوں نے ایک فرض جان کر کیا ہے۔ جو عام زندگی سے قریبی تعلق رکھنے والی سمانتر ادبی تحریک کہلاتی ہے۔

انتہائی مصروفیت کے باوجود ان کے ماتھے پر نہ بل آتا ہے اور نہ مزاج میں تلخی پیدا ہوتی ہے۔ ان کی بذلہ سنجی ان کے لئے طاقت اور دوستوں کے لئے رحمت ہے مگر ناخوشگوار واقعات یا افراد پر وہ طنز کے تیر برسانا بھی نہیں بھولتے۔ وہ کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ نوکری اور روزی کی قیمت پر بھی نہیں۔ انہوں نے انقلابی تحریک سے بھی اپنا عملی رشتہ جوڑا تھا۔ وقت کے ہاتھوں یا عطیات و نوازشات کے سہارے جانے کتنوں نے اپنا راستہ بدل دیا مگر کملیشور اپنے چنے ہوئے راستے پر اٹل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ لوگ ڈر سے بدلیں یا لالچ میں آ کر، دونوں ہی بزدلی ہے۔ اسی لئے 'جارج پنجم کی ناک' لکھنے پر جب انہیں ٹی وی سے ہٹایا جانے لگا تو ہٹنا منظور کیا مگر جھکے نہیں، اسی طرح حالیہ سیاسی تبدیلی کے بعد بڑے بڑے سورماؤں نے کیچلی بدلی مگر کملیشور نہ صرف

اپنے اصولوں پر قائم رہے بلکہ برملا آر ایس ایس کی تنگ نظری، تعصب اور رجعت پسندی کو ہدفِ ملامت بنایا اور کہا کہ اس گمراہ کن تنظیم پر کسی حال میں بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ کملیشور کا یہ جرأت مندانہ بیان پڑھ کر خواجہ احمد عباس نے بڑی بے ساختگی سے لکھا —— "موتیا بند کی تکلیف کے باوجود میں نے آر ایس ایس پر آپ کا فکر انگیز اور دل کو چھو لینے والا مضمون پڑھا اور آپ کی وسعت نظری اور سیکولرزم کا پہلے سے بھی زیادہ قائل ہو گیا۔ یقیناً آر ایس ایس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نے اس جماعت کے قول و فعل کا جو حقیقت پسندانہ تجزیہ کیا ہے اس کو پڑھ کر سوشلسٹوں، مارکسٹوں، کمیونسٹوں اور مسلمانوں کو ہوشیار ہو جانا چاہیے۔"

کملیشور اپنی صاف گوئی کے باعث مفاد پرستوں کے حلقے میں ناپسندیدہ آدمی بن جاتے ہیں۔ اُن جیسا انسانیت پرست آدمی مذہب اور زبان کی بنیاد پر انسانیت کو خانوں میں بٹتا نہیں دیکھ سکتا۔ مذہب کی بنیاد پر منافرت کی دیوار کھڑی کرنے والوں کی انہوں نے جو خبر لی ہے وہ اوپر درج ہے۔ زبان کے معاملے میں ان کا خیال ہے کہ —— "جنتا جو بھاشا بولتی ہے اسے لپی کی بنیاد پر الگ نہیں کیا جا سکتا، ان کی بھاشا ایک ہے ان کے دُکھ درد ایک ہیں۔ بھاشا کی ایکتا اور لپی کی انیکتا کو ہمیں منظور کرنا چاہیے۔ اُردو کا رسم الخط ہمیں پاکستان، افغانستان، ایران اور تمام عرب ملکوں سے جوڑتا ہے۔ سیاست اور جغرافیہ کی سرحدوں سے ہمیں ہماری بھاشا اور لپی اوپر اُٹھاتی ہے۔"

کملیشور کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اُن کے آٹھ افسانوی مجموعوں (راجہ نربنسیا، کھوئی ہوئی دشائیں، ماس کا دریا، زندہ مُردے، بیان، آدھی دنیا، سمانتر کہانیاں اور میری پریہ کہانیاں)، سات ناول (بدنام بستی، لوٹے ہوئے مسافر، تیسرا آدمی، ڈاک بنگلہ، سمندر میں کھویا ہوا آدمی، کالی آندھی اور اگامی اتیت)، سفرنامہ (کھنڈت یاترائیں)، تین ڈرامے (ادھوری آواز، ریگستان اور چارولتا)، بچوں کے تین ناٹک (پانی کا پیڑ، سمندر کی چکی اور دوستی)، تین تنقیدی مجموعوں (نئی کہانی کی بھومیکا، نئی کہانی کے بعد، میرا پنّا اور سمانتر سوچ)، پانچ مرتب کردہ کتابیں اور آٹھ فلم اسکرپٹوں (امانش، آندھی، موسم، پھر بھی، تمہاری قسم، گھڑی کے دو ہاتھ، آنند آشرم اور ڈاک بنگلہ) وغیرہ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ان کے ادبی نظریہ اور شخصی حالات کو جاننے کے لئے ان کا افسانوی سفر اور کشمیری لال ذاکر کا لکھا "ٹکڑوں میں بٹا آدمی" بھی پڑھنے کی چیزیں ہیں جو اسی شمارے کی زینت بنی ہیں۔ باقی آپ خود پڑھئے۔ میں کیوں حائل رہوں۔

سنتانو اچاریہ
ڈپٹی ڈائرکٹر شعبۂ تعلیم (سائنس) اڑیسہ

ہندوستان کا گورکی

کملیشور کو ذاتی طور پر جاننے کا اتفاق مجھ کو ۱۹۷۱ء میں اس وقت ہوا جب بنگلہ دیش کی تحریک عروج پر تھی۔ مہاراشٹر کے سابق گورنر ہرے کرشن مہتاب کی دعوت پر وہ "وشوملن" کی سہ روزہ تقریب کے آخری اجلاس کے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے بلائے گئے تھے۔

اڑیسہ کی ادبی اور ثقافتی انجمن "پرجاتنتر پرچار سمیتی" ہر سال ایک تقریب منعقد کرتی ہے جس میں ادیبوں شاعروں اور آرٹسٹوں کو مل بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ اس موقع پر ادیبوں کے اعزاز میں تہنیتی جلسے بھی ہوتے ہیں۔ کملیشور اسی ادبی اجتماع میں شرکت کرنے کٹک آئے تھے اور ان کے آنے کی خبر بہت پہلے پھیل گئی تھی۔ جو لوگ کملیشور کو جانتے تھے اور جن کی تعداد کافی بڑی ہے، وہ بڑی بے چینی اور اشتیاق کے ساتھ ان کا انتظار کر رہے تھے، بلکہ ہندوستان کے اس ممتاز ادیب کے لئے فرشِ راہ تھے۔

لیکن جو کملیشور کو نہیں جانتے تھے وہ مطمئن اور پرسکون نظر آتے تھے مگر پھر بھی ان کی نظریں ڈائس پر بیٹھے ہوئے لوگوں میں اس ممتاز شخص کو ڈھونڈتی تھیں جس کے نام کے ساتھ "ایشور" کا لفظ جڑا ہوا تھا۔

اپریل کے مہینے میں سہانی صبح کے وقت جلسے کی کاروائی شروع ہوئی مگر کملیشور کہیں دکھائی نہیں دیئے حالانکہ وہ اس جلسے کے مہمان خصوصی تھے۔ لیکن پتہ نہیں کس وجہ سے وہ حاضر نہیں ہوئے۔ منتظمین نے بھی یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی، بلکہ خاموشی کے ساتھ کملیشور کے بدلے کسی اور کو صدر نشیں بنا دیا۔

عام نگاہوں سے یہ حقیقت پوشیدہ تھی اس لئے لوگ برابر ڈائس پر کملیشور کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اس شخص کو دیکھنے کے لئے بے قرار تھے جو ان کے تصورات کے مطابق کوئی لمبی چوڑی ہستی ہوگا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ "ایشور" نام رکھنے والا اسی نمایاں جگہ پر کہیں ہوگا۔

کملیشور کے آنے میں تاخیر، ان کی تجسس پسند طبیعت کی وجہ سے ہوئی تھی۔ بمبئی سے وہ ڈاکٹر مہتاب کی دعوت پر اڑیسہ آرہے تھے مگر کلکتہ پہنچ کر کٹک آنے والے طیارے پر سوار ہونے کی بجائے چپکے سے ہندوستان اور سابق مشرقی پاکستان کی سرحد پر پہنچ گئے تھے۔ ۱۹۷۱ء میں ہندوستان اور پاکستان کی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور بنگلہ دیش کی سرحد جھلس رہی تھی۔ مگر کملیشور اپنے دل کی آواز سن کر ادھر چلے گئے تھے۔

ان کے اندر ایسے ہی پُر اسرار اور اتھاہ جذبات موجزن رہتے ہیں جن کی جھلک ان کی تخلیقات میں ملتی ہے اور جس کی بدولت ان کا جدید ہندوستان کے ممتاز کہانی کاروں میں شمار ہوتا ہے نیز ان کے مداح یہ کہنے میں حق بجانب

فن اور شخصیت

ہیں کہ کلیشور کسی معمولی شخص کا نہیں بلکہ ایک غیر معمولی ہستی کا نام ہے۔

کلیشور کا تخلیقی سرمایہ ہندی میں ہے اور اس زبان سے میری واقفیت واجبی سی ہے۔ اپنی اس کمی کے باعث مجھے کلیشور کا بھرپور مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا ہے، ہاں اُڑیہ میں اُن کی جو تخلیقات منتقل ہوئی ہیں اُن کے سہارے میں نے انہیں جاننے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نیلی جھیل، راجہ نربنسیا، مانس کا دریا اور ناگمنی جیسی لازوال کہانیوں کا اُڑیہ میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

کلیشور کو چند کہانیوں کو پڑھ کر ان کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنا یا تنقیدی محاکمہ کرنا مناسب نہیں ہے پھر بھی میں ان کی جن خوبیوں اور فنی صلاحیتوں کو سمجھ پایا ہوں انہیں مختصراً یہاں اُجاگر کرنے کی کوشش کروں گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کلیشور کے سینے میں ایک شاعر کا دل دھڑکتا ہے جو اپنے تمام تجربات یہاں تک کہ غیر مرئی حقیقتوں کو بھی الفاظ، کردار اور حالات کے ذریعے پیش کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ ان کے نازک اور پُر معنی جذبات اور تجربات کہانیوں کی شکل میں ڈھلتے ہیں۔ اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کی بدولت قصہ گوئی کا جو فن انہیں معلوم ہے اس کی وجہ سے وہ نئی کہانی کی تحریک کے جنم داتاؤں میں گنے جاتے ہیں اور ۱۹۶۰ء کے بعد ہندی ادب کا جو موڑ آیا ہے اس میں انہیں ممتاز مقام حاصل ہے۔

دوسری جنگ عظیم، بلکہ آزادی کے بعد کے شاعروں اور دردمند دل رکھنے والوں میں ہوتے ہوئے بھی کلیشور کی پرواز اور مشاہدہ بے پناہ ہے۔ وہ کبوتروں کی طرح پربستہ ہیں اور نہ صرف زمین کے باشی بلکہ شاہین کی طرح انتہائی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے نیلے آکاش کی بھی خبر لا سکتے ہیں اور دھرتی کی بھی خبر رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں کے کردار اسی دھرتی کے باشی، نہایت معمولی اور خاک نشیں لوگ ہوتے ہیں۔

کلیشور کی ہندی اور اڑیہ کی جدید کہانیوں میں ایک مطابقت بلکہ برادرانہ قربت ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ آزادی کے بعد فکر و نظر میں ایک وسعت آئی ہے اور علاقائیت کی بجائے قومی سطح پر تخلیق کا عمل شروع ہوا ہے۔ قومی ادب کے اس سرمایے میں کلیشور کا بھی بہت بڑا حصہ ہے جس کی بدولت ہندوستانی ادب کی تاریخ میں ان کا نام اس طرح چمکے گا جس طرح روسی ادب میں گورکی کا۔

آخر میں یہ کہنے میں مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ کلیشور کی دوستی قابل فخر بات ہے لیکن کون جانے وہ اندرونی جذبے سے متاثر ہو کر کب چھلاوے کی طرح کہیں چلے جائیں اور لوگ ان کے انتظار میں چشم براہ رہیں جس طرح ۱۹۷۱ء کی اپریل کی اس صبح کو ہوا تھا جب اڑیسہ کے ایک ادبی جلسے میں وہ بطور مہمانِ خصوصی آنے والے تھے اور یہاں آنے کی بجائے جنگ سے جھلسی ہوئی سرحد پر چلے گئے تھے۔

ترجمہ: سعود الیوبی۔

ڈاکٹر آر۔ ایس۔ میگریگر

شعبۂ مطالعات شرقی۔ کیمبرج یونیورسٹی

کملیشور — نئی کہانیوں کا رہبر

نئی کہانی کی ترقی و تکمیل میں کملیشور کی کیا خدمات ہیں، اس کے متعلق دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اس بات کی آڑ میں ایک اور سوال چھپا ہوا ہے اور وہ سوال ہے کملیشور کے ادبی تعلقات کا۔ ممکن ہے اس پر کچھ اختلاف ہو۔ کملیشور کے ادب کی بنیاد کس طرح کی سمجھنی چاہیئے؟ یہاں مجھ کو صرف نئے دور کی کہانیوں اور افسانہ نویسوں کی مجموعی خصوصیات سے ہی سروکار ہے۔ اس سے ذرا بھی کم نہیں۔ یہ کہنا کہاں تک مناسب ہوگا کہ ان افسانوں کا ماحول اور ان افسانہ نویسوں کا نقطۂ نظر نیا ہونے پر بھی' پرانے ادبی ماحول اور روایات کا ہی عکس دے رہا ہے؟ اگر ایسا ہے بھی تو اس سے کملیشور کی تخلیقات اور ادبی سرگرمیوں پر کس حد تک روشنی پڑتی ہے؟ ان باتوں کے جواب اور وضاحت کے بغیر کملیشور کے ادب کے روشن پہلوؤں، اس کی قدر و قیمت اور اہمیت کا صحیح طور پر اور قطعیت کے ساتھ اندازہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔

میں اپنی اس تحریری کاوش میں مندرجۂ بالا نقطۂ نظر سے کملیشور کے بعد کے افسانہ نویسوں سے کملیشور کے اپنے ادبی رشتے کا تقابل کرنا چاہتا ہوں۔ کل کا نیا ادب آج روایت پذیر ہو سکتا ہے۔ لیکن روایتی ہونے کے اپنے فائدے تو ہوتے ہی ہیں۔ جیسے جیسے ہم نئی کہانی کے ابتدائی دور سے آگے بڑھتے ہیں، اور کملیشور کے بعد کے افسانہ نویسوں کی نسل تک پہنچتے ہیں، ہمارا یقین مضبوط ہوتا جاتا ہے کہ نئی کہانی کے بنیادی معماروں میں کملیشور کا حصہ اکہرا نہیں دوہرا ہے۔ ایک طرف ان کی ادبی صلاحیتیں ہیں تو دوسری طرف ان کی ادبی بنیادیں، جو انہوں نے رکھی ہے' پرانے زمانے کا بہت سا سامان ہے، جس کی وجہ سے یہ بنیاد کملیشور کے بعد کے افسانہ نویسوں کے لئے مستحکم تر ثابت ہوگی۔

آزادی کے دس سال پہلے کے کئی افسانہ نویسوں میں ہم اس نقطۂ نظر کا ایک اہم پہلو آج بھی دیکھ سکتے ہیں جو کملیشور کے دور کے مصنفوں کے لئے مخصوص ہے۔ مثال کے طور پر واتسیاین کے "جیون شکتی" افسانے کو لے لیجئے' جس میں یہ صاف ظاہر ہے کہ مصنف کا تمام تر رشتہ آدمی سے ہی ہے، معاشرے میں آدمی کے مقام و مرتبہ سے نہیں بلکہ خود آدمی سے۔ آدمی کے بٹے ہوئے معاشرے میں مصیبت کتنی ہی کیوں نہ پیدا ہو جائے، لیکن معاشرے کا جب ہم بغور جائزہ لیتے ہیں تو آدمی شریف اور بے گناہ نظر آتا ہے! مجھے ایسا لگتا ہے کہ کملیشور کا بھی یہی بنیادی نقطۂ نظر ہے۔ معاشرے میں مصیبتیں کتنی بھی ہوں، آدمی میں شرافت برقرار و بحال رہتی ہے۔ تاہم کملیشور کی نگاہ میں آدمی کی ایک اور اہمیت ہے۔ زندگی نے میری طرح کے کتنے لوگوں کو کس بری طرح مصیبت میں جکڑ رکھا ہے۔ یہی خیال کملیشور کے نقطۂ نظر کا ایک اہم حصہ بن جاتا

ہے اور شاید اس خیال سے جو آزادی کے پہلے کی کہانی سے تعلق رکھتا ہے اور جس کا سلسلہ آگے کی کہانیوں میں بھی ملتا ہے، نئی کہانی پیدا ہوئی۔

یہ قدرتی امر تھا کہ آزادی کے فوراً بعد اسی طرح کی ترقی ادب میں ہوئی۔ دوسری قدرتی بات یہ بھی تھی کہ مصنفوں کا دھیان معاشرے کے اسی گروہ پر گیا جس کے وہ خود فرد تھے۔ مغرب میں بھی ناول کی ترقی کی تاریخ میں یہی بات پائی جاتی ہے۔ پہلے پہل انگریزی ناول نگار ان ہی کرداروں اور معاشرتی ماحول کو بیان کیا کرتے تھے جس سے خود ان کی زندگی کا براہِ راست تعلق تھا۔ جیسے جیسے ناول رومانس کی منزل سے آگے بڑھ کر ترقی پذیر ہونے لگا، ناول نگاروں کا یہی جھکاؤ، جو اسکاٹ جیسے رومانس کاروں میں بھی پایا جاتا ہے، ظاہر ہوتا گیا۔ ہندی ناول کی ابتدا ہی رومانس سے ہوئی۔ جب یہاں ناول کی ترقی پر ہندوستان کے سیاسی حالات کا بھی اثر پڑا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناول نگاروں کا دھیان آدمی کی معاشرتی اور سیاسی زندگی اور ماحول کی طرف مغرب کے مقابلے میں جلد چلا گیا۔

اس نقطۂ نظر کو کملیشور نے آگے بڑھا کر اسے نئے زمانے کے موافق ایک نئی ضروری راہ پر موڑ لیا۔ ہندی کہانی نویسی کی ترقی میں ان کی یہ خصوصیت بہت اہم رہی ہے کہ انہوں نے اس ترقی کو مستقل روپ دے دیا افسانوں اور ناولوں کے جو انسانی اور معاشرتی موضوع ہیں، انہیں نئے تقاضوں کے مطابق نئی شکل دے کر انہوں نے اپنے بعد کے مصنفوں کو وراثت میں سونپ دیا۔ چنانچہ اگر وہ یہ چاہیں، تو ان کا بھی ادبی تعلق ان لیکھکوں سے بنا رہ سکے گا، جن کے ادب میں آج کے ہندی نثر کی روایتیں ڈھل گئی ہیں۔ ساتھ ہی زندگی کی باریکیوں کے لئے کملیشور کی تیز اور نازک نگاہ اور اس نگاہ کی ترجمانی کرنے کے لئے ان کی صلاحیت قابلِ فکر ہے۔ آج کی دنیا میں آزاد ہندوستان کی بدلتی زندگی کے کملیشور انہیں صلاحیتوں کے ذریعے ایک باہوش اور ذی فہم ترجمان بنے ہوئے ہیں۔

پروفیسر اینزو توربیانی (اٹلی)

ہندوستانی تہذیب کا علمبردار

کملیشور جی ہمارے زمانے کے سب سے بڑے ناولوں اور قصّہ نویسوں میں گنے جاتے ہیں۔ ابھی ان کا نام ہندوستان میں مشہور ہے لیکن جلد ہی ولایت کی زبانوں میں بھی ان کی تصانیف کا ترجمہ ضرور کیا جائے گا۔ اس طرح ادب کے میدان میں آپ آفاقی بن جائیں گے۔

اگست ۱۹۷۶ء میں ماریشس کے خوبصورت جزیرے میں دوسرے وشو ہندی سمّیلن کے موقع پر ان سے میری ملاقات ہوئی۔ ہماری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے :

"آپ کون سے دیس سے اِدھر آئے ہیں ؟" انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"اطالیہ (Italia) سے"۔ میں نے جواب دیا۔

"خوبصورت ملک تو ہے، وہاں ہندی کا پرچار ہوتا ہے ؟"

"افسوس میرے وطن میں صرف تھوڑے سے لوگ بھارتی زبانوں کا مطالعہ کرتے ہیں"۔

میں نے یہ بھی بتایا کہ غالباً آئندہ پریم چند کی زبان اطالیہ میں بھی سب جامعوں میں پڑھائی جائے گی۔

شری کملیشور بہت ملنسار اور رحمدل ادیب ہیں۔ وہ تو فوراً میں سمجھ گیا تھا۔ گفتگو البتہ مفصّل نہیں ہوئی تھی مگر مجھے لگا تھا جیسے مدّت کے بعد ہماری ملاقات ہوئی ہو۔ چونکہ میں ایک عظیم و معروف ادیب سے ملا تھا اس لئے بہت خوش تھا۔

شری کملیشور آج کی ہندوستانی تہذیب کے علمبردار ہیں۔ "راجہ نربنسیا" سے لے کر (جس کا دیباچہ خاص طور پر اہم ہے) "تیسرے آدمی" تک انہوں نے اپنی ہم عصر زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی انہوں نے انسان کی نفسیاتی پیچیدگیوں کو بیان کیا ہے اور اپنے زمانے کی قدروں کی کھوج بھی کی ہے۔

اُن کی کتابوں میں، کہانیوں اور افسانوں کے کرداروں کی شکل میں جن لوگوں کو پیش کیا گیا ہے وہ روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھنے والے سادھارن لوگ ہیں۔ ان کے پاس یا تو تیز طنز ہے یا پھر جوش۔ ان کی کہانیوں میں کسی قسم کا تعصب نہیں مگر بغاوت کی آواز گونجتی ہے اور گونجتی رہے گی۔

پرکاش پنڈت

تین ملاقاتیں

کملیشور سے میں صرف تین بار ملا ہوں۔

دِلّی میں جب وہ 'نئی کہانیاں' کے سمپادک تھے اور اپنی ایک کتاب کی اشاعت کے سلسلے میں وہ ہند پاکٹ بکس میں آئے تھے اور ان کے پاؤں میں گھسی ہوئی چپل تھی۔

دوسری بار بمبئی میں جب میں اپنے گلے کے کینسر کا چیک اپ کرانے بمبئی گیا تھا اور ساحر لدھیانوی کے یہاں مقیم تھا اور وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں ساحر سے ملنے آئے تھے۔ اُس دن وہ بڑی عمدہ سینڈل پہنے ہوئے تھے اور انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ہندی رسالہ 'ساریکا' (جس کے وہ ایڈیٹر ہیں) کے لئے اردو ادیبوں سے متعلق ایک کالم لکھوں۔

اور تیسری بار پھر بمبئی میں جب ساریکا کے سمپادن کے ساتھ ساتھ وہ فلم جگت کو عمدہ سے عمدہ اسکرپٹ دے رہے تھے اور لوگ باگ حیران تھے کہ یہ شخص ہفتے دس دن میں پورا اسکرپٹ پروڈیوسر کو تھما دیتا جبکہ دوسرے فلمی لیکھک 'دھانسو' سین لکھنے کے نام پر صرف وہ سین ڈائریکٹر کو دیتے جس کی اگلے دن شوٹنگ ہونے والی ہوتی۔

یہ ملاقات ان کے ذاتی فلیٹ ورسووا میں ہوئی تھی جس کے کمپاؤنڈ میں اُن کی کار کھڑی تھی۔ بچے سامنے بالکنی سے نظر آ رہے سمندر میں نہا رہے تھے اور ہم بالکنی میں بچھے گدّے دار تخت پر بیٹھے سمندر کی شائیں شائیں کی آوازیں سن رہے تھے ـــــ یہاں انہوں نے پھر مجھ سے ساریکا کے کالم 'گستاخیاں' کو از سرِ نو شروع کرنے کا اصرار کیا۔

یہ تینوں ملاقاتیں بمشکل آدھے آدھے گھنٹے کی ملاقاتیں تھیں لیکن تینوں بار جو ایک خاص چیز میں نے دیکھی وہ تھی ان کی کام کرنے کی لگن بلکہ تڑپ ـــــ کام، کام، دن رات کام اور وہ خلوص جو نام اور دام کما چکنے والوں میں خال خال ہی نظر آتا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ کبھی کملیشور نے بہت بُرے دن دیکھے تھے۔ اقتصادی اعتبار سے بھی اور فنی اعتبار سے بھی۔ کوئی دوسرا ہوتا تو ان حالات کی تاب نہ لا کر بہت جلد ٹوٹ جاتا اور واپس اپنے وطن الٰہ آباد لوٹ جاتا لیکن اِس مردِ مجاہد نے نہ صرف ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کیا بلکہ حالات کو اپنے حق میں ڈھلنے پر مجبور کر دیا۔

آج وہ نام اور دام کا محتاج نہیں رہا لیکن کام کا آج بھی محتاج ہے کیونکہ کام اور مسلسل کام ہی وہ چیز ہے جو اس انسانی خلوص کو مرنے نہیں دیتا جو انسان کو دیوتاؤں سے ورثے میں ملا ہے ـــــ میں اس پُر خلوص انسان کو سلام کرتا ہوں۔

'...In fact the younger Hindi writers have the same sort of respect and love for **Kamleshwar** as the young Russian writers had for **Maxim Gorky**'

— from a citation
All India Excellence Awards

ٹکڑوں میں بٹا ھوا آدمی
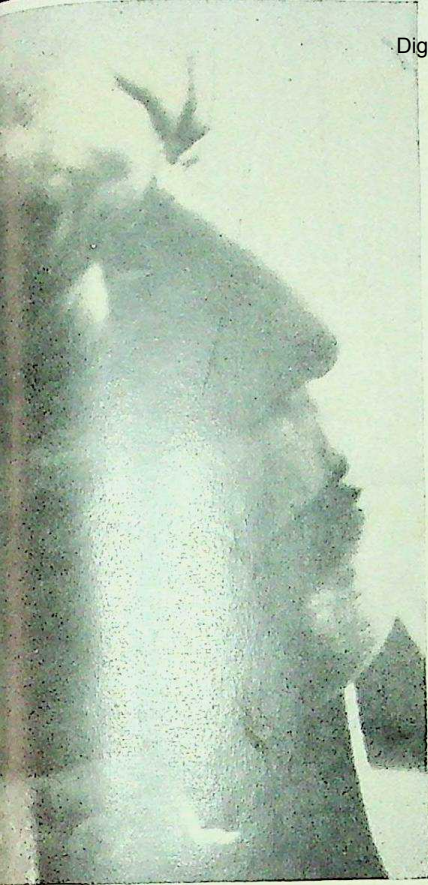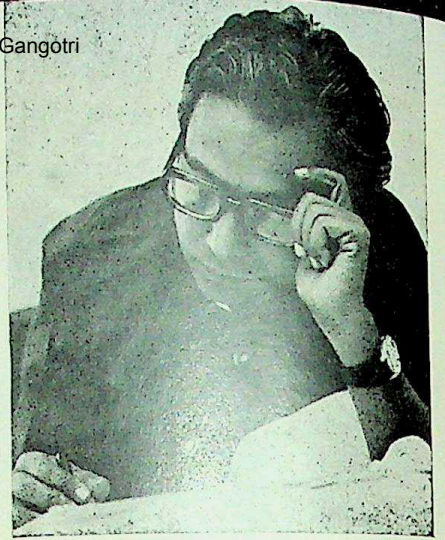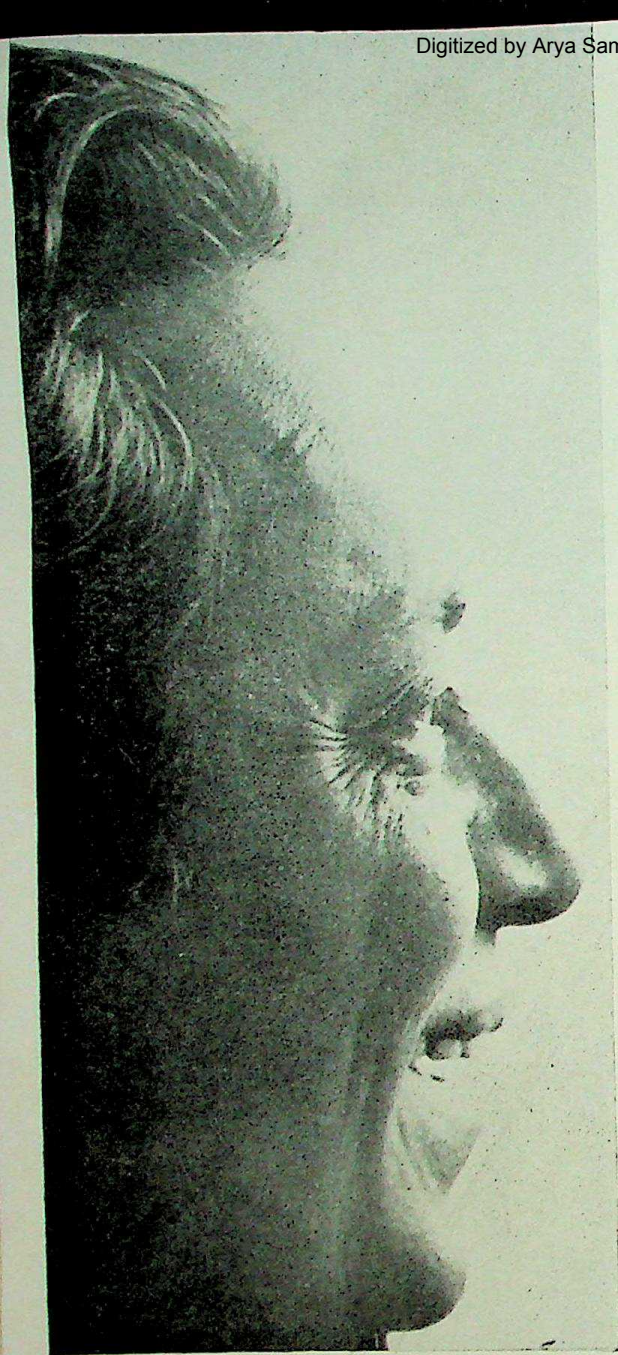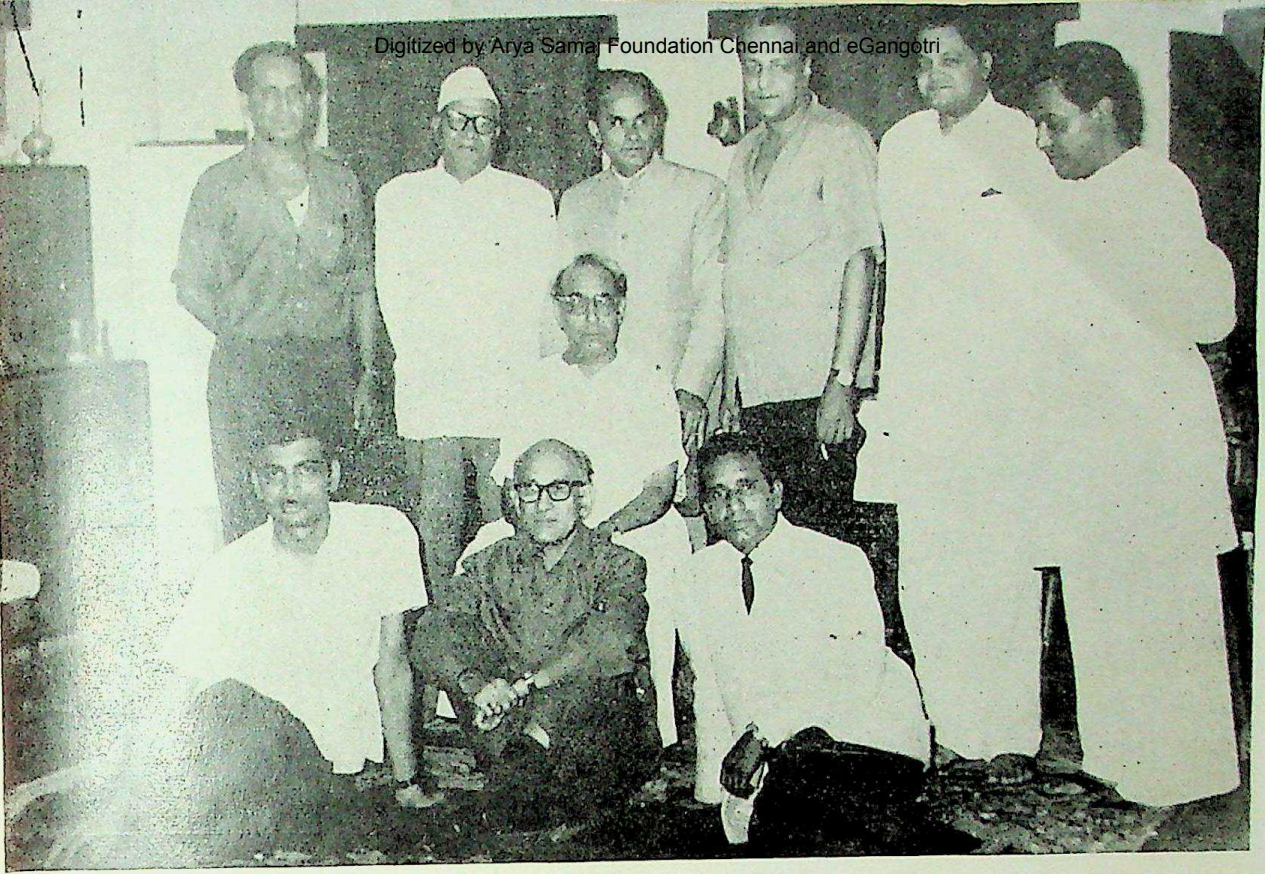
ایک یادگار لمحہ کملیشور (دائیں سے) اندر راج آنند، اندر کمار گجرال، مہندر ناتھ (مرحوم) کرشن چندر (مرحوم)
اور خواجہ احمد عباس کے ساتھ جشنِ کرشن چندر کے موقع پر۔

قہقہوں میں ڈوبی شام باقر مہدی کے مکان پر (دائیں سے) وارث علوی، کملیشور، ڈاکٹر ظ انصاری، حسن کمال،
باقر مہدی، اصغر علی انجینئر، شیام کشن نگم اور فضیل جعفری کے ساتھ۔
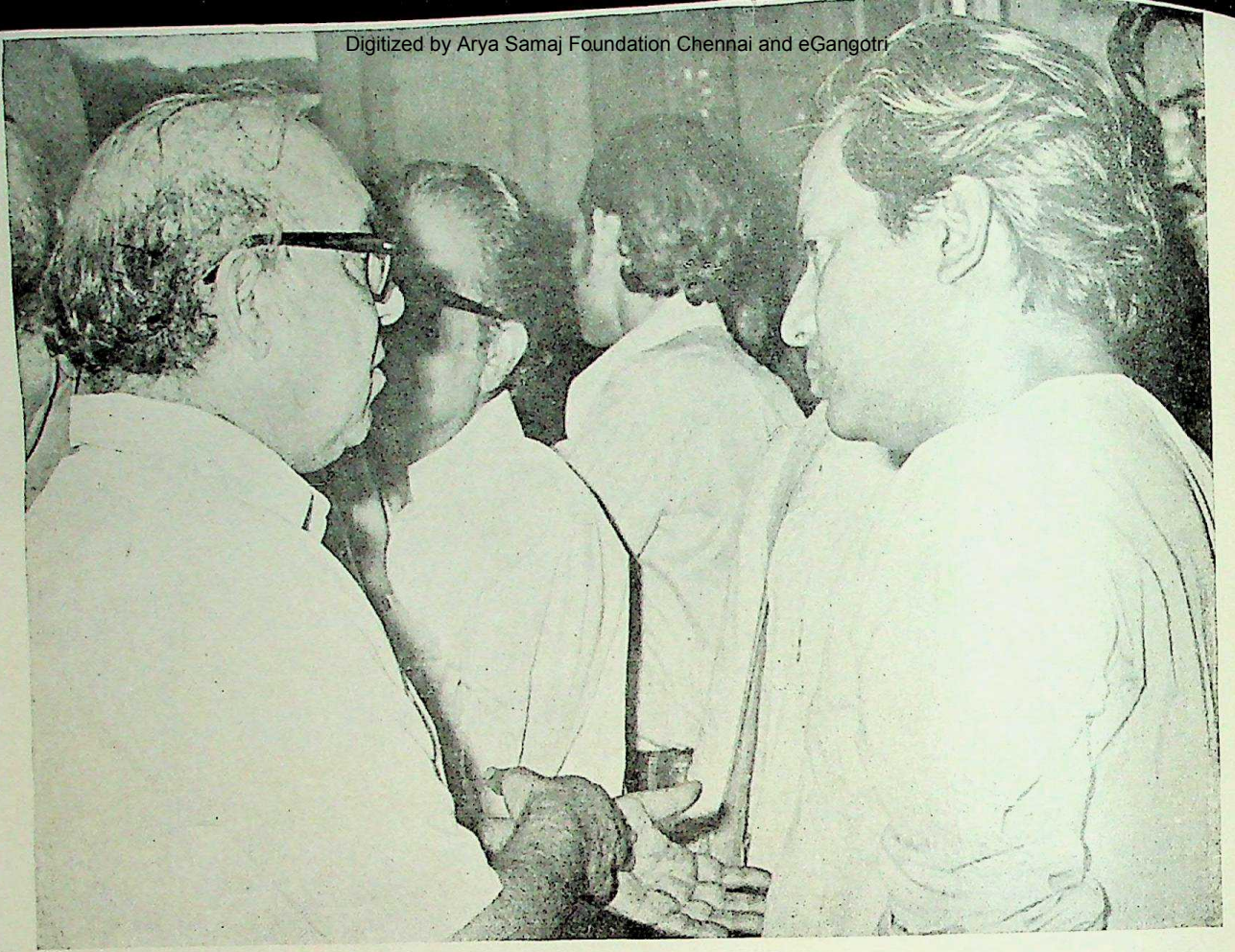
کچھ راز و نیاز کی باتیں کرشن چندر (مرحوم) کے ساتھ
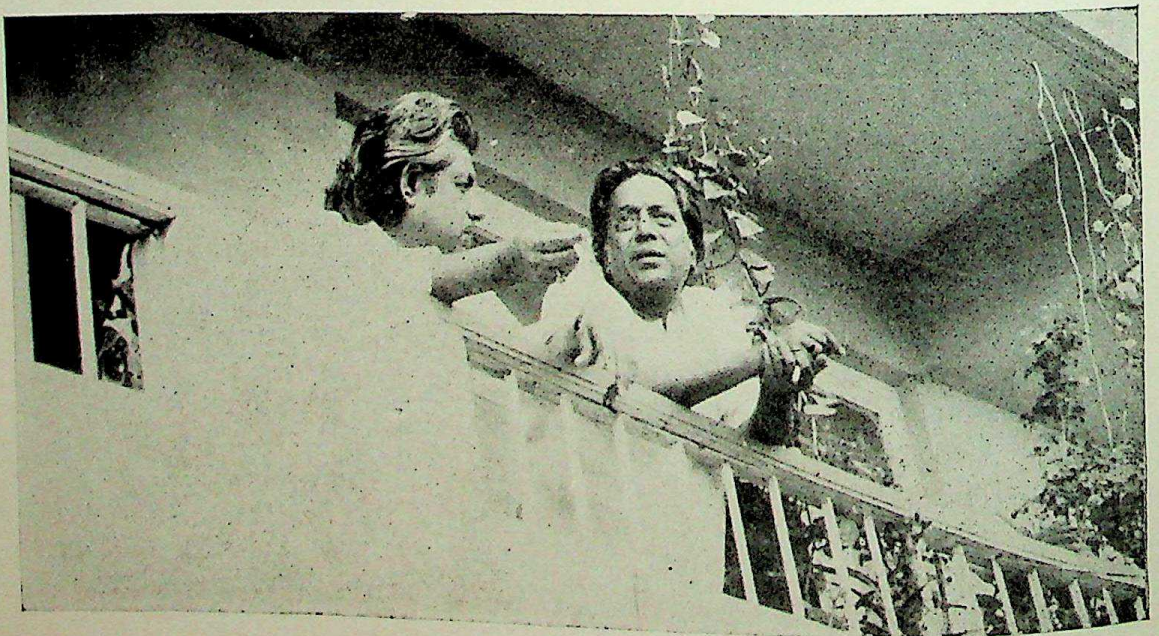
کملیشور کشمیری لال ذاکر کے ساتھ جنھوں نے کملیشور کا شخصی خاکہ لکھا۔ جو اسی پرچے میں شامل ہے

چنڈی گڑھ میں "نئی کہانی کا سنگھرش" کے موضوع پر بولتے ہوئے کملیشور، ساتھ میں ڈاکٹر اندرناتھ مدان، ڈاکٹر ہزاری پرساد دویدی، ڈاکٹر نامور سنگھ (پیچھے) ڈاکٹر ومل، پرشیں، پریاگ شکل اور رویندر کالیہ
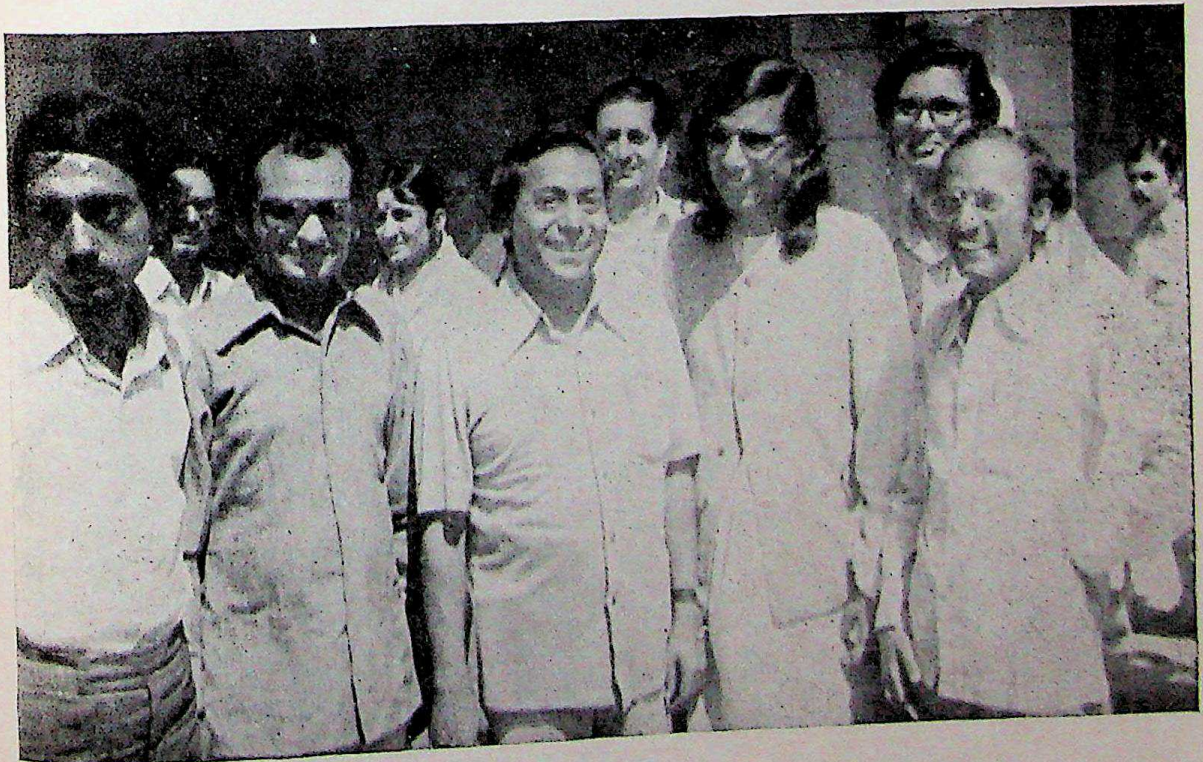
بمبئی میں اکھل بھارتیہ ساہتیہ سمیلن کے موقع پر (بائیں سے دائیں) پربھو جوشی، من موہن سرل، کملیشور، فنیشور ناتھ رینو، ڈاکٹر رام بچن رائے اور اُدر بھرانت کے ساتھ۔

(دائیں سے بائیں) مہاویرا دھیکاری، واتسائن، جی بشنکر کرُپ، شریمتی رما جین، دھرم ویر بھارتی، کملیشور۔
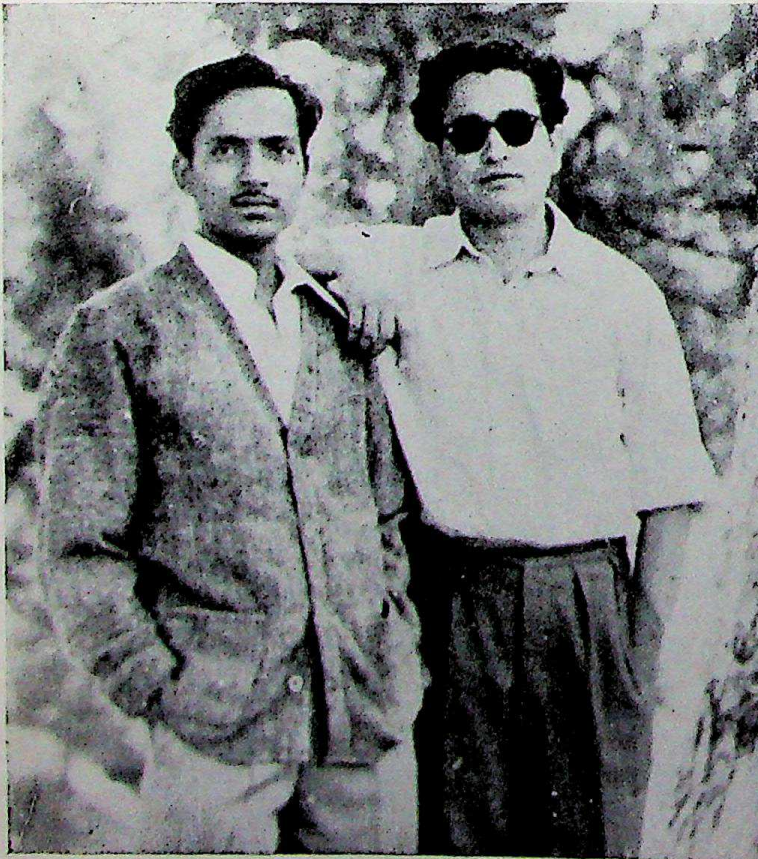
نئی ہندی کہانی کے دو
سُتون!
موہن راکیش (دائیں) اور
کملیشور، پہل گام، کشمیر
سنہ ۱۹۵۶ء میں

" نئی کہانی سنگھرش کی آخری لڑائی " اس سمینار میں (بائیں سے) امرت لال ناگر، جنیندر کمار، بھگوتی چرن ورما
اور نئی پیڑھی کے دوسرے ادیبوں کے ساتھ۔

بھارتیہ سمانتر ٹیکنک - انجمار (کچھ) میں کملیشور ہندستانی زبانوں کے نئے لکھنے والوں کے ساتھ - ادب کے نئے سوال
بابوراؤ باگل، دیا پوار، ڈاکٹر جتیندر بھاٹیہ، کامتاناتھ، دنیش پالی وال، لوین کمار، ڈاکٹر کملا پرساد وغیرہ کے چہرے دیکھے جاسکتے ہیں
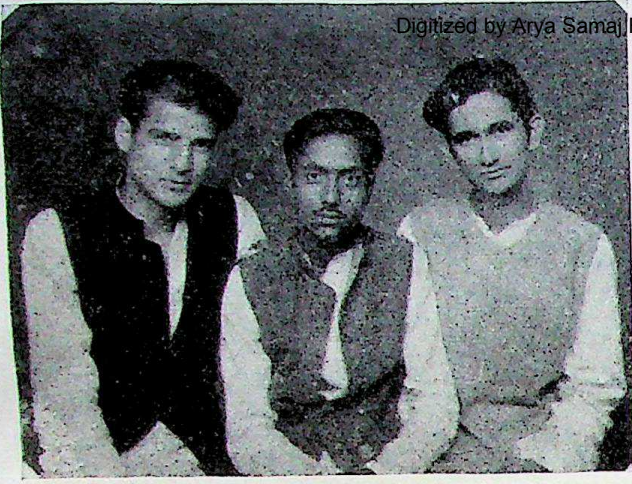
ادبی سفر کے پہلے تین ساتھی (دائیں) مارکنڈے ، کملیشور اور دشینت کمار
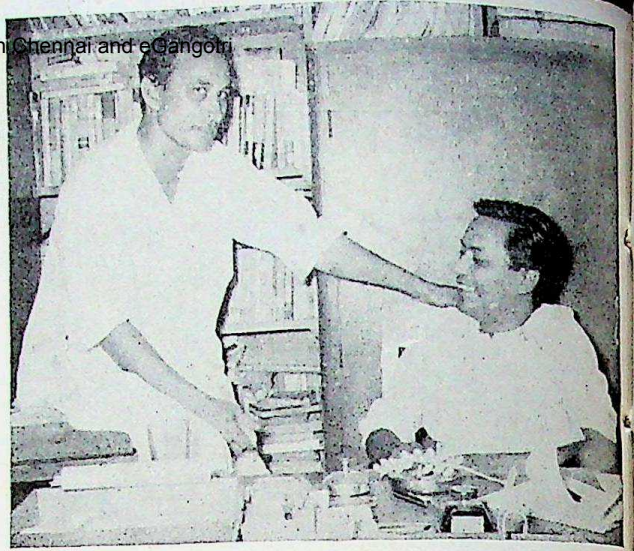
ہندی کے مشہور طنز نگار ہری شنکر پرسائی کے ساتھ

مشہور کہانی کار یشپال (مرحوم) کے ساتھ

گلاب داس بروکر (درمیان میں) اور چندر کانت بخشی کے ساتھ
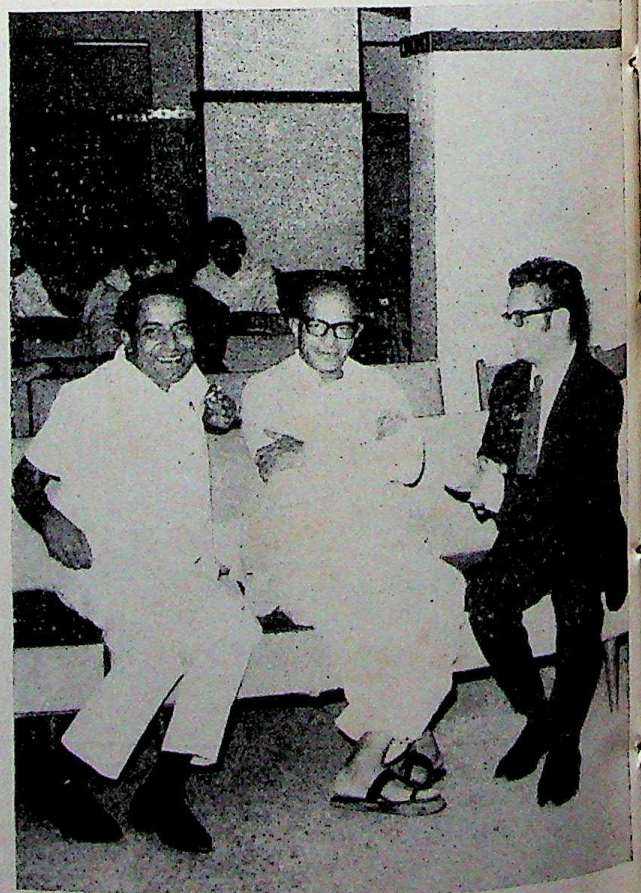
ہم ہندوستان کے ان ممتاز فوٹو گرافرز
راہل، ودیا ورت، جے پی سنگھل
پریم کپور، وشواس ٹھاکر، دیا رام چاوڑہ
اور عباس صباحت کے ممنون ہیں جن کی تصویریں
اِس نمبر کی زینت بنیں۔

(مدیر)

کملیشور روم میں
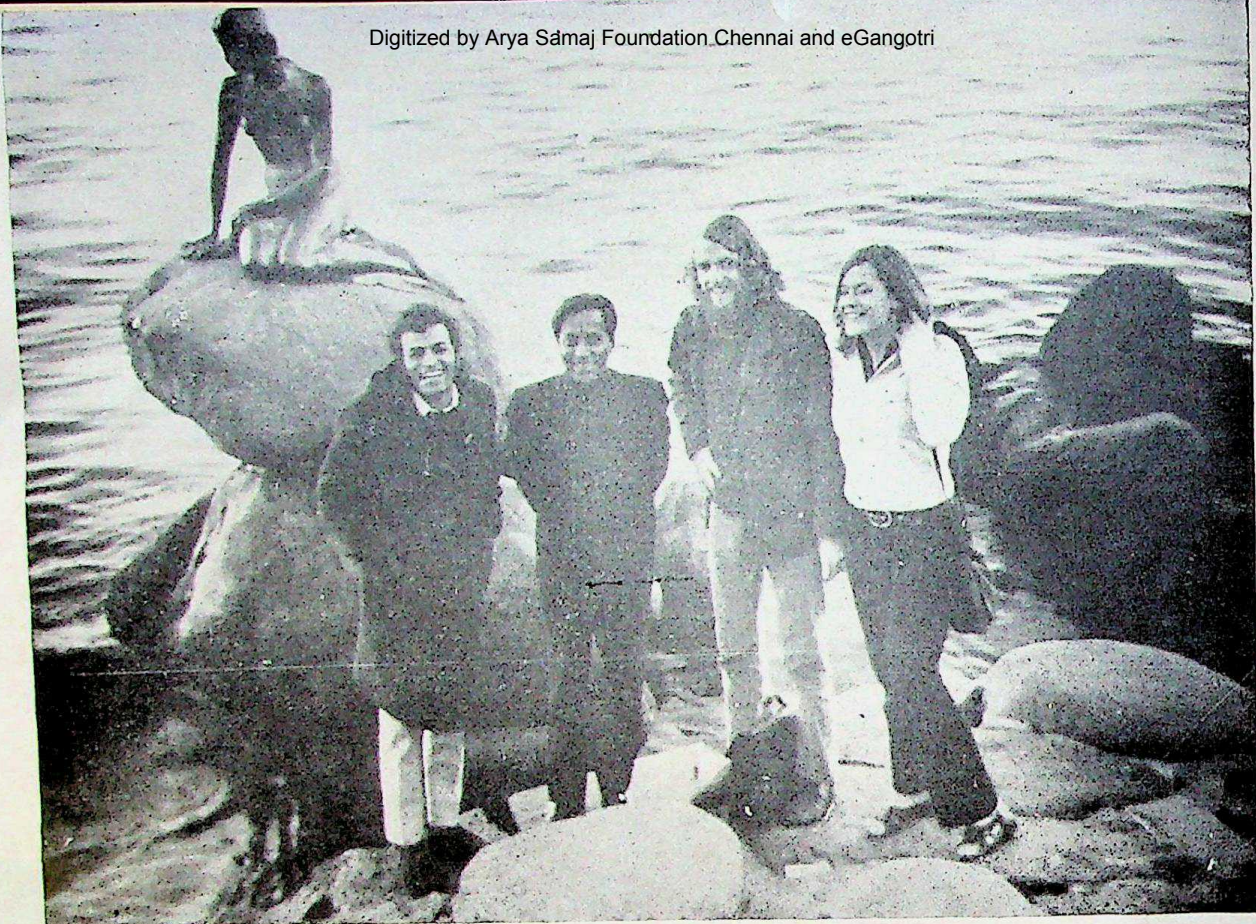
کملیشور کوپن ہیگن (ڈنمارک) میں

کملیشور ایمسٹرڈم (ہالینڈ) میں

شریکِ حیات گائتری کے ساتھ (۱۹۷۶ء بمبئی)

(بمبئی ۷۵)
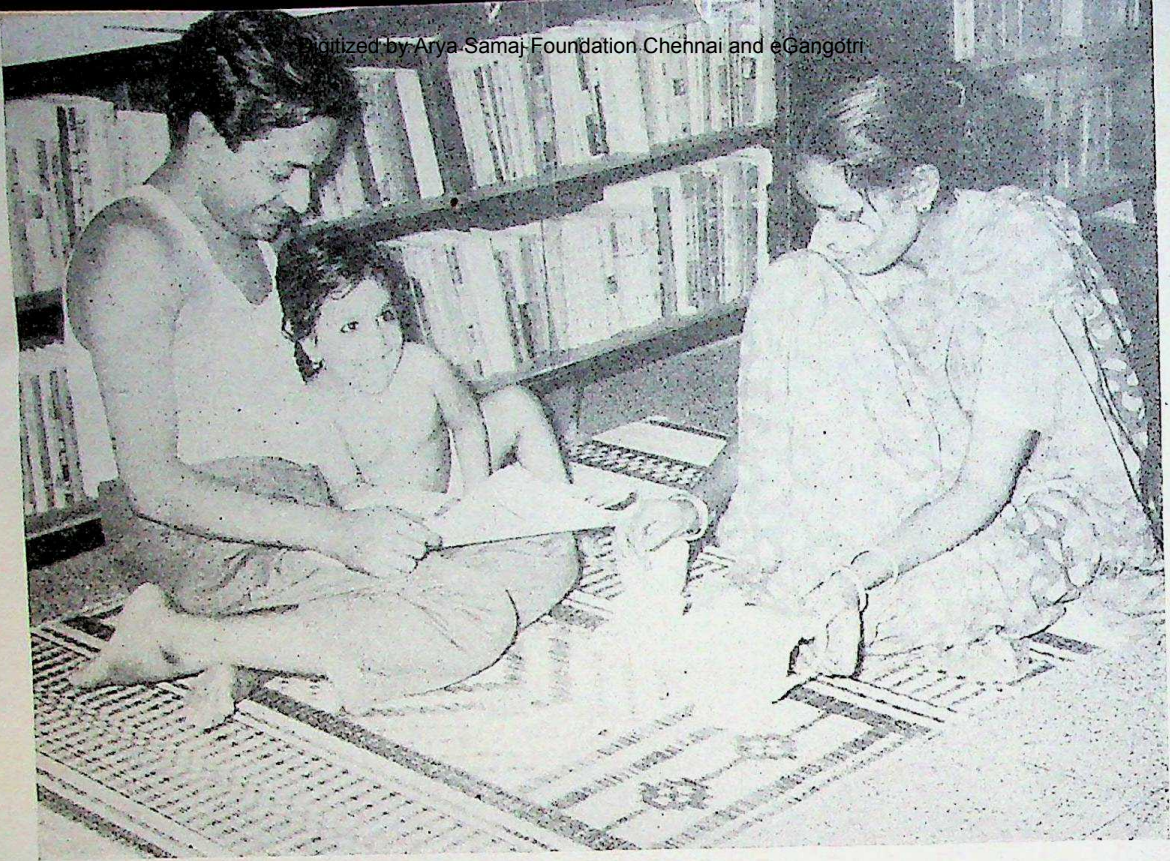
اپنی بیٹی مانو اور گایتری کے ساتھ (۱۹۶۳ء) دہلی۔
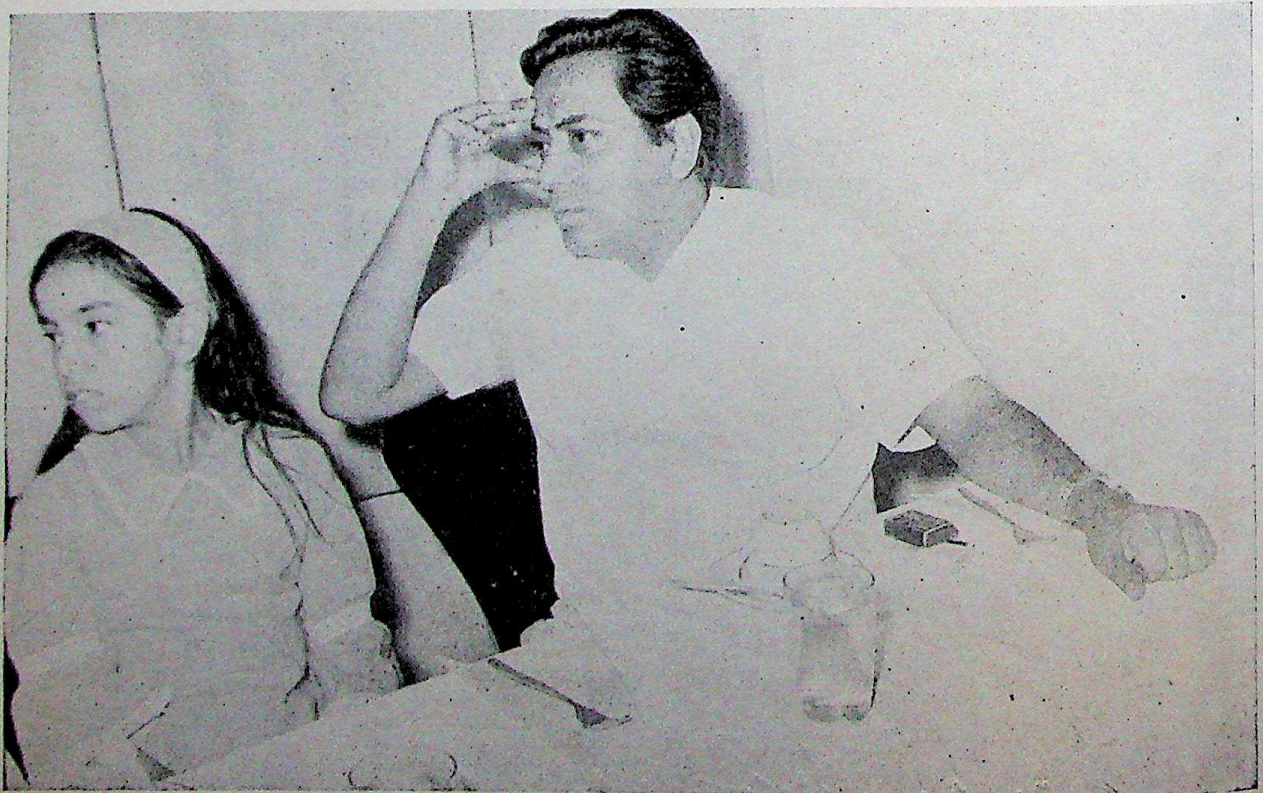
اپنی بیٹی مانو کے ساتھ (بمبئی ۱۹۷۲ء)
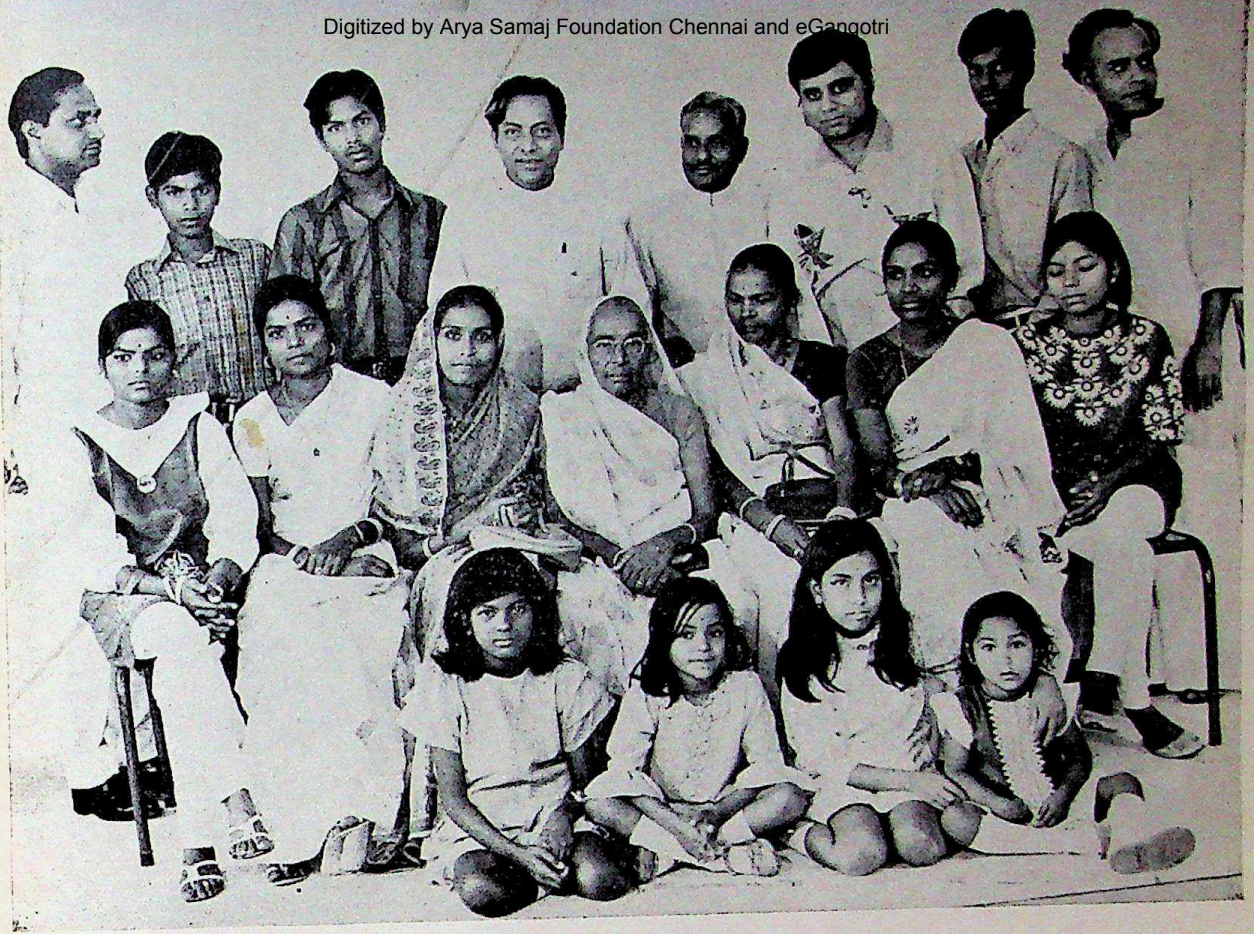
بڑے بھائی مہیشوری پرساد، ماں، بھابی اور خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ۔
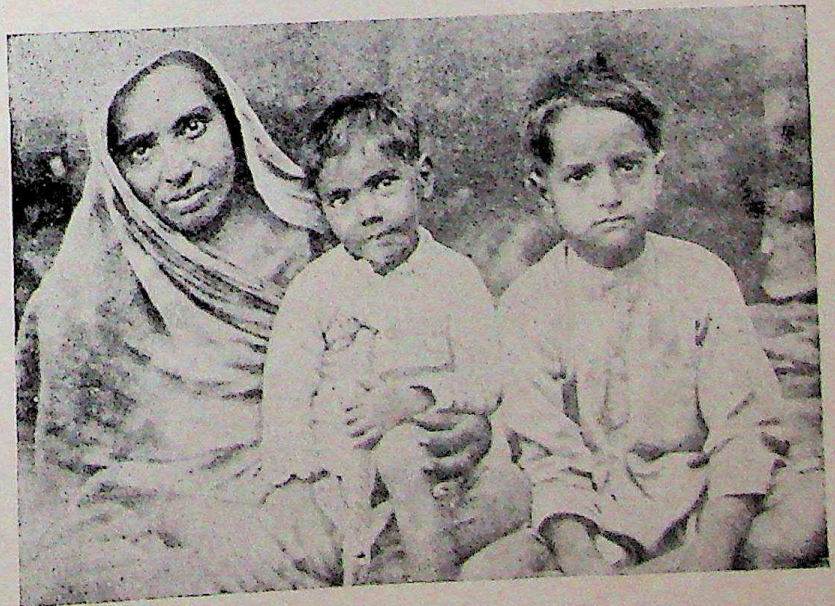
ماں کے بیوہ ہونے کے بعد (۱۹۳۴ء) ماں کی گود میں کملیشور (گھر کا نام کیلاش) اور بڑے بھائی سدھارتھ کے ساتھ جس کا ذکر بار بار افسانوی سفر میں آیا ہے۔

گلاب داس بروکر

سمریس باسو

ہمارے لکھنے والے

بمل متر
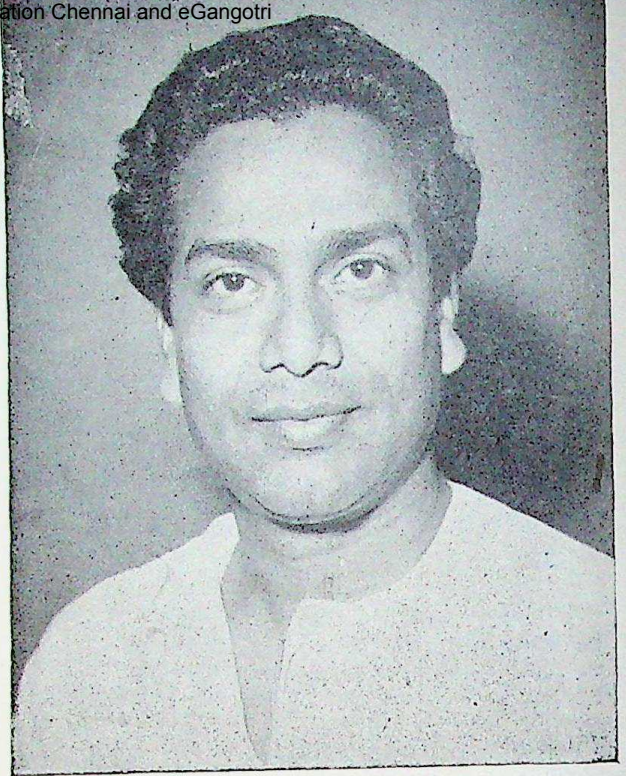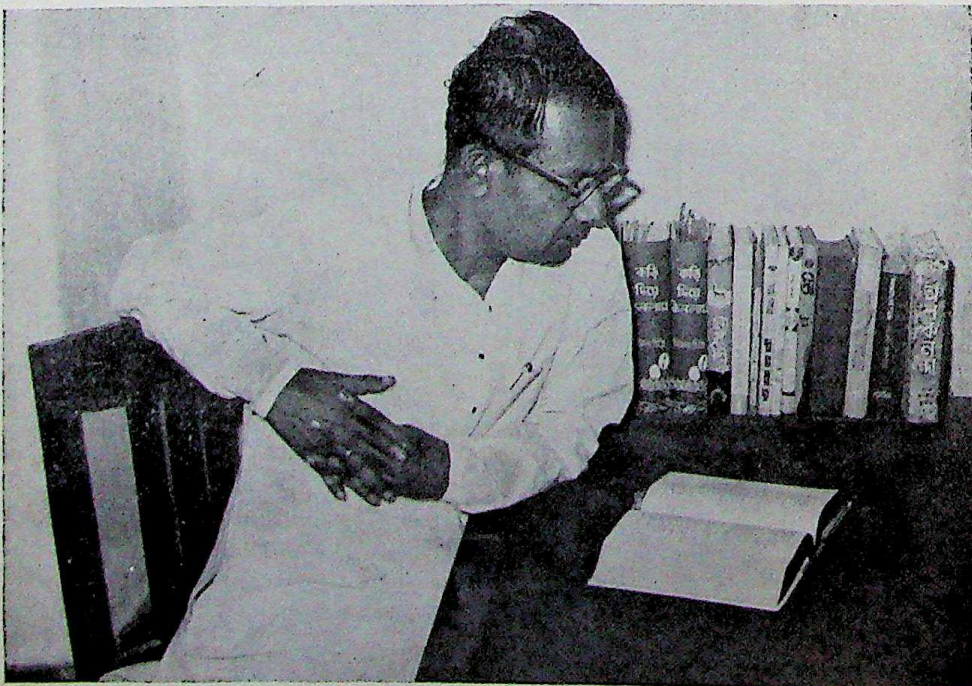
شوری راجن

سنتانو آچاریہ
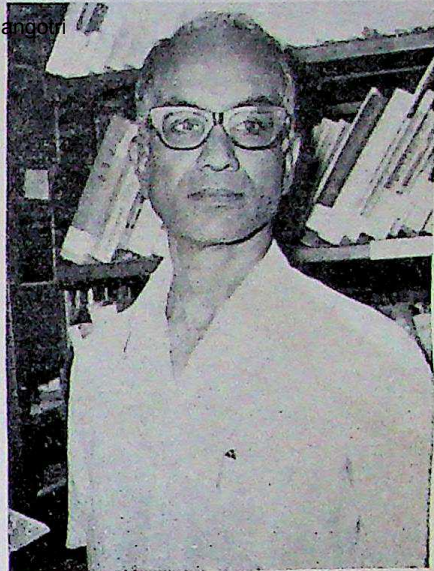
عابد سُورتی

ہری کرشن کول

ڈاکٹر منوجل پانڈھی
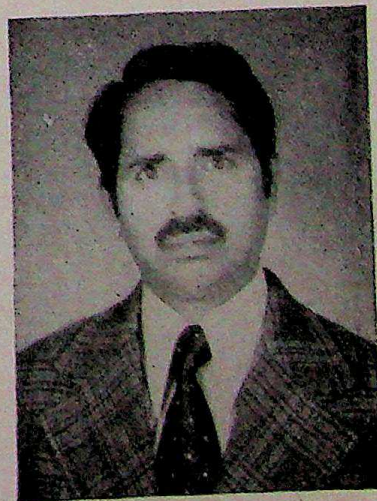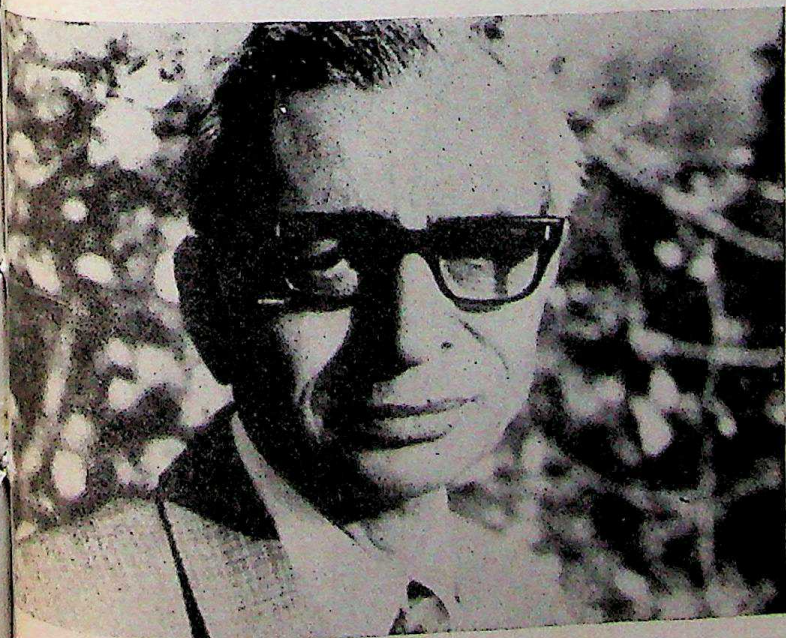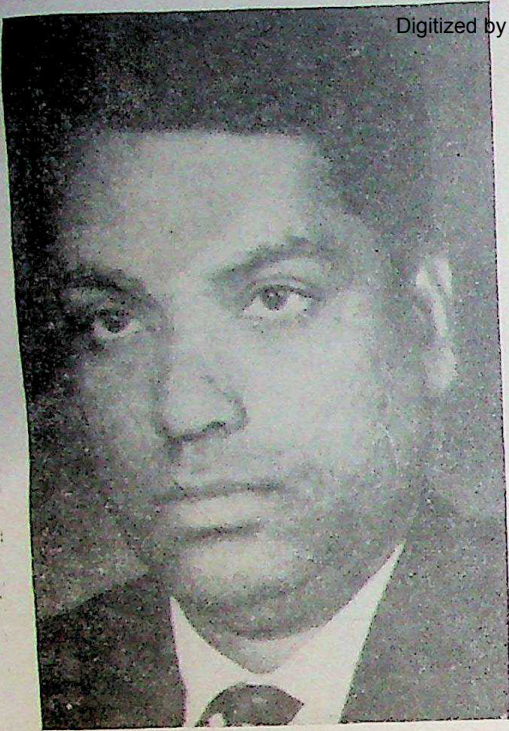
ڈاکٹر عالم شاہ خان

کومیلا وردھن

ڈاکٹر آر۔ ایس۔ میگریگر
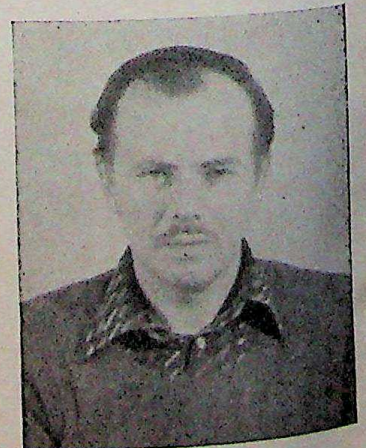
چندر کانت بخشی

پروفیسر اینزو تورہ بیانی

اوم گوسوامی

ڈاکٹر کرشن پرساد مصرا

پی۔ این۔ بھناتیری
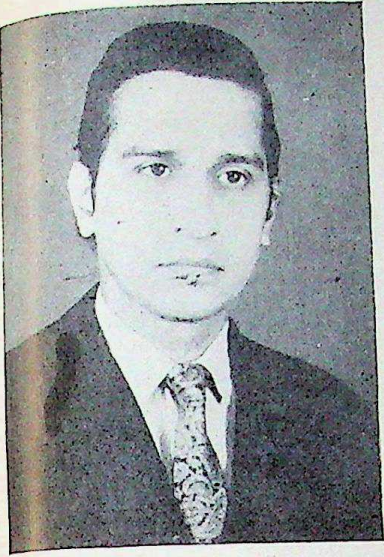
جسونت سنگھ وِردی

سلیم جاوید (سرپرست اعلیٰ)
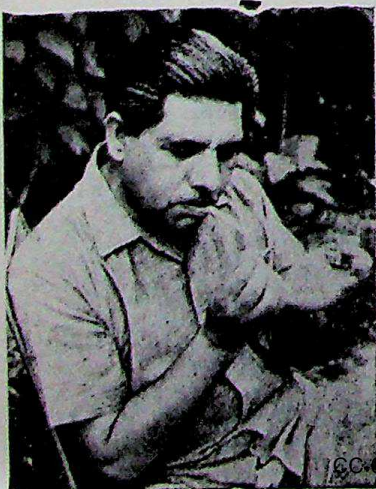
کشمیری لال ذاکر (نگراں)

قرۃ العین حیدر
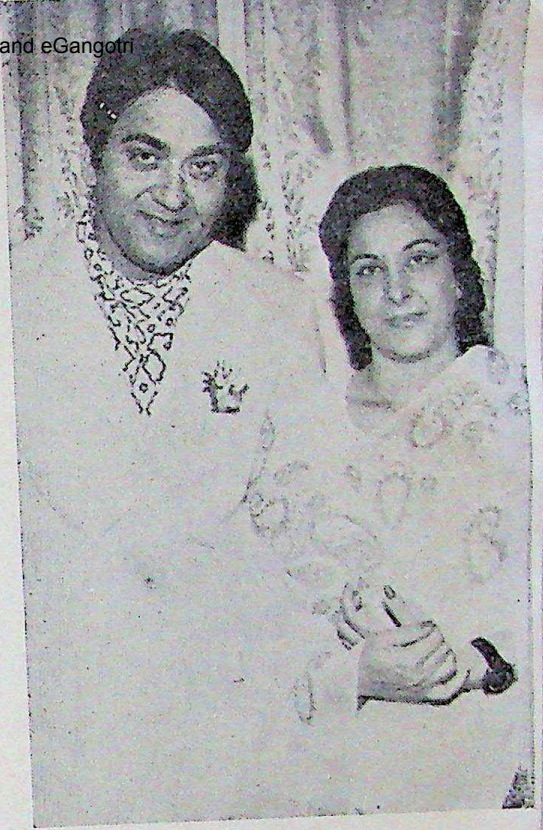
سنیل دت نرگس

فن اور شخصیت کے سرپرست

اندر کمار گجرال

کنہیالال پوسوال

نوشاد

رامانند ساگر

آنند بخشی

پریم جی

پریم رتن دہرہ
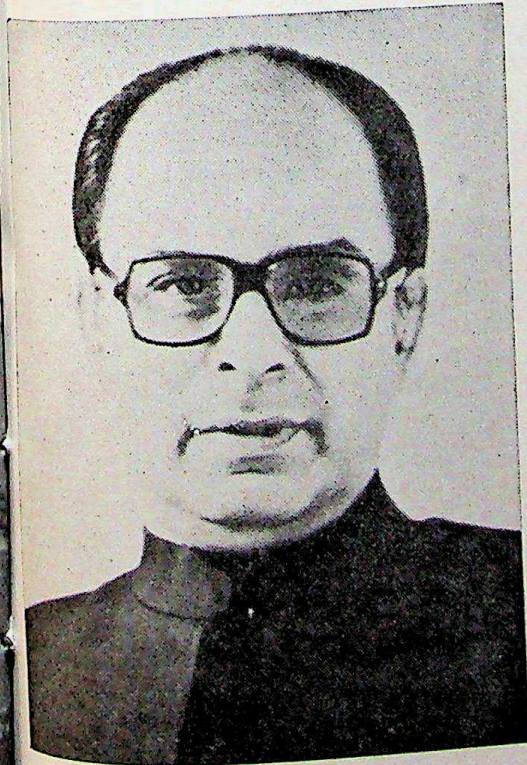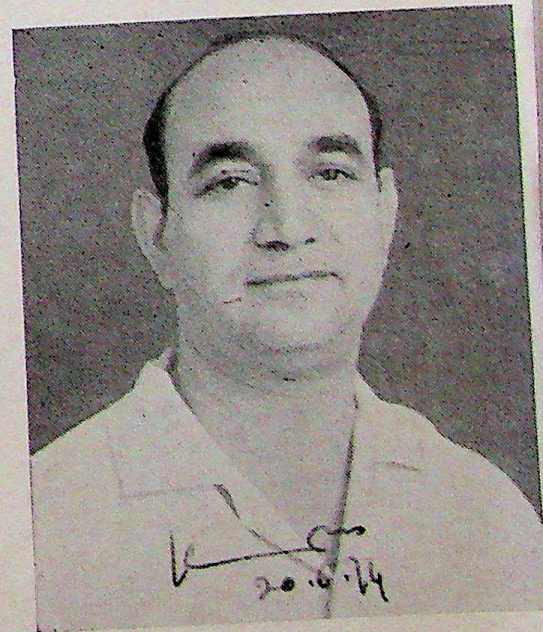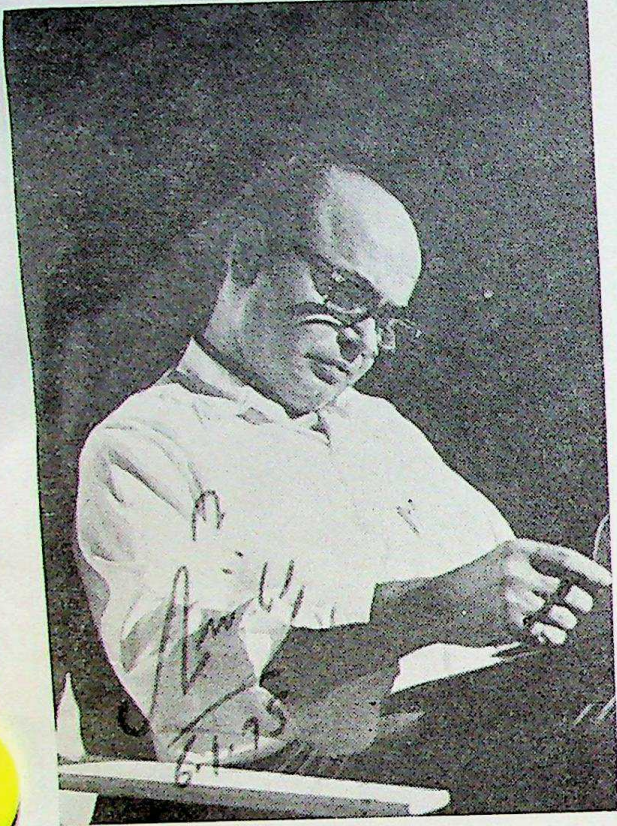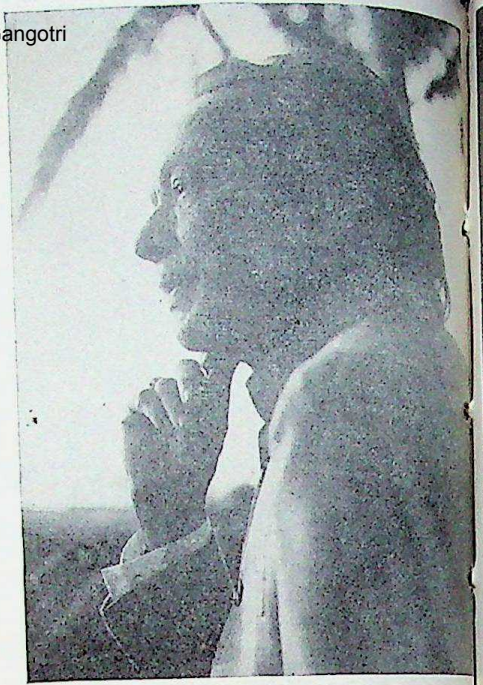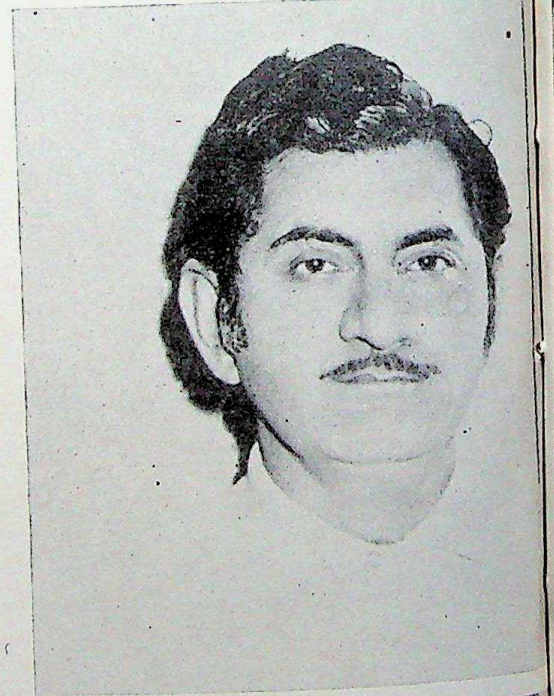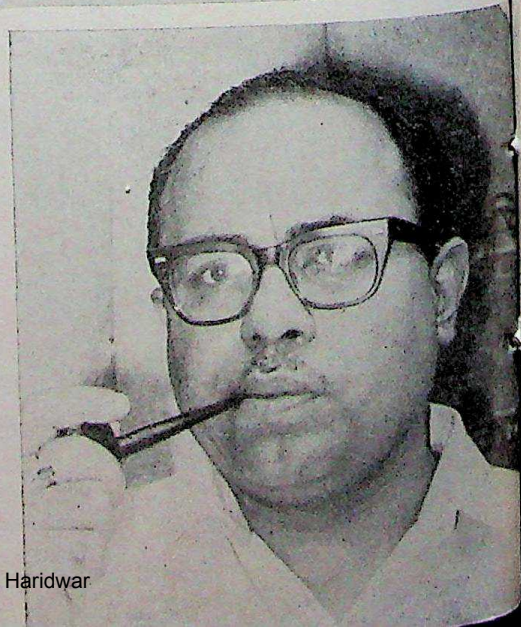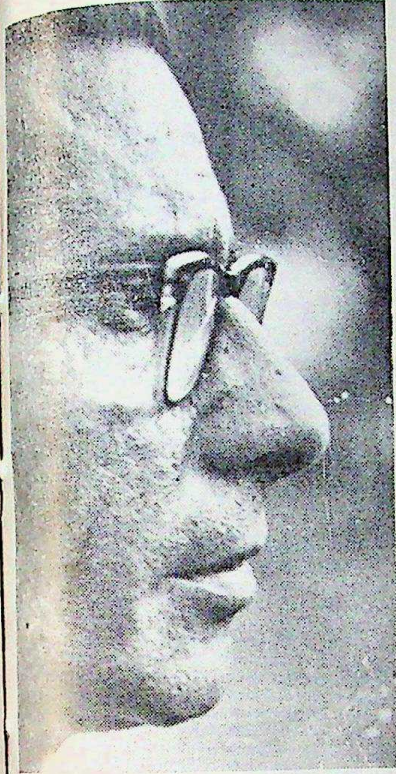
فکر تونسوی
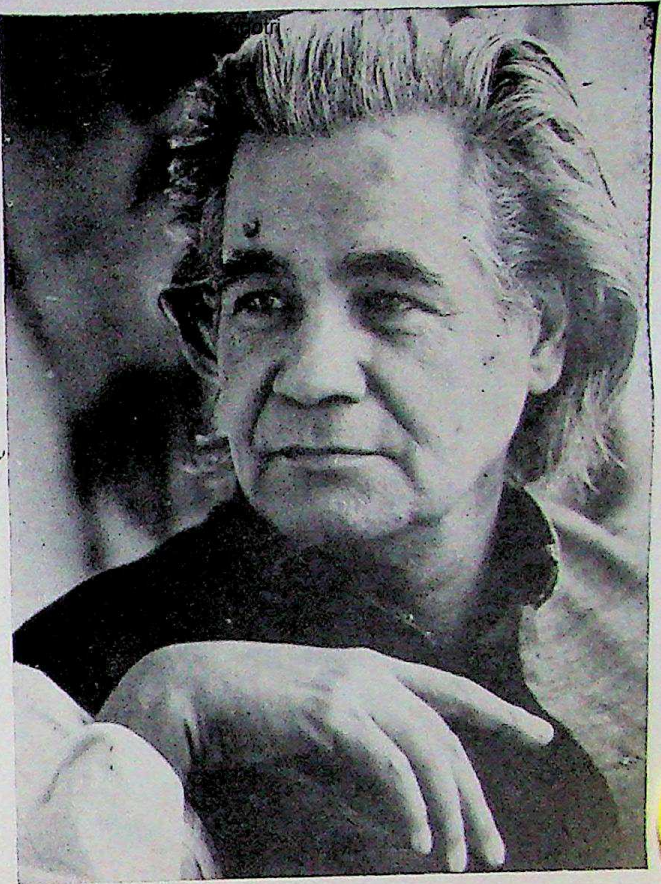
علی سردار جعفری

فن اور شخصیت کے مشیر
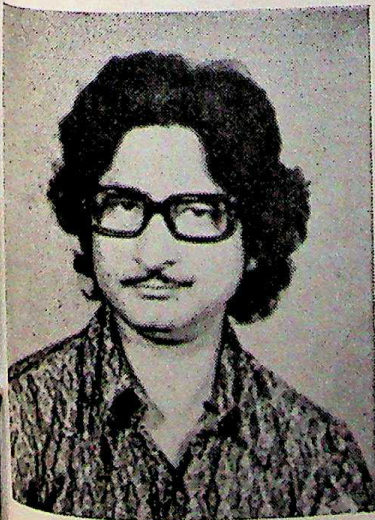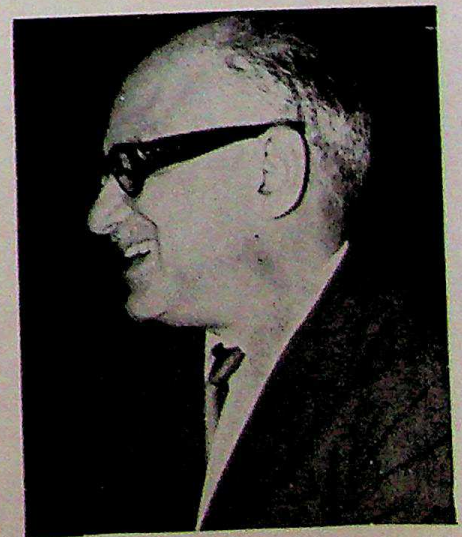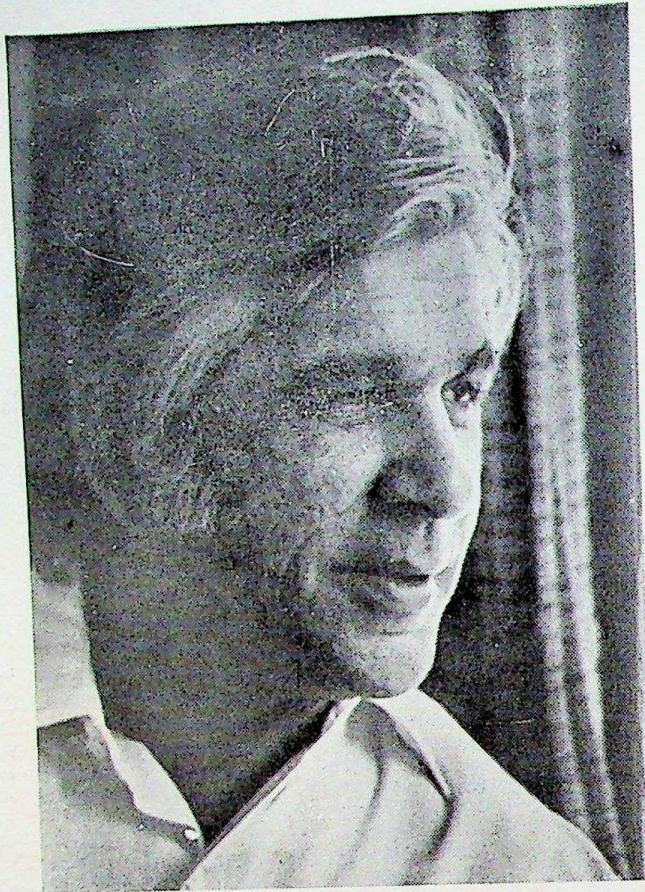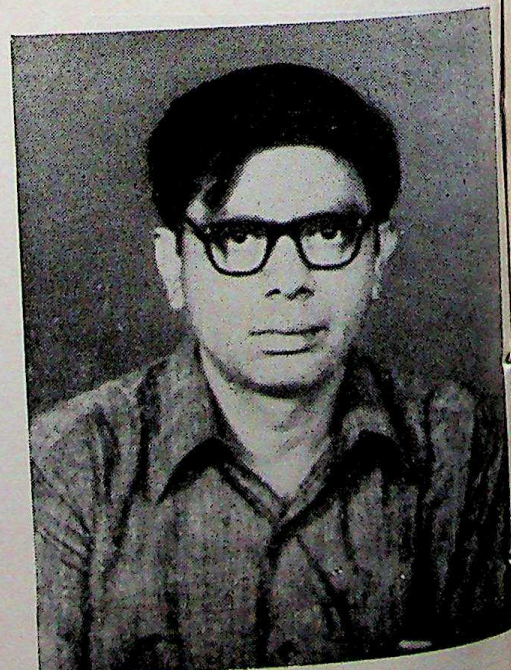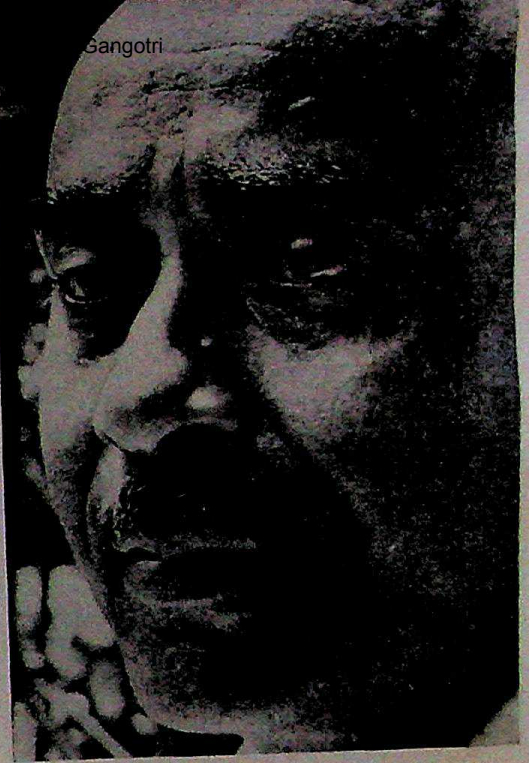
خواجہ احمد عباس

حسن کمال

احسن خان

خلیق انجم

سریندر ناتھ ورما

محمود ایوبی

اقبال زاہد

مُعاونین

شمیم طارق

مسعود ایوبی

مُنتَظِمِین
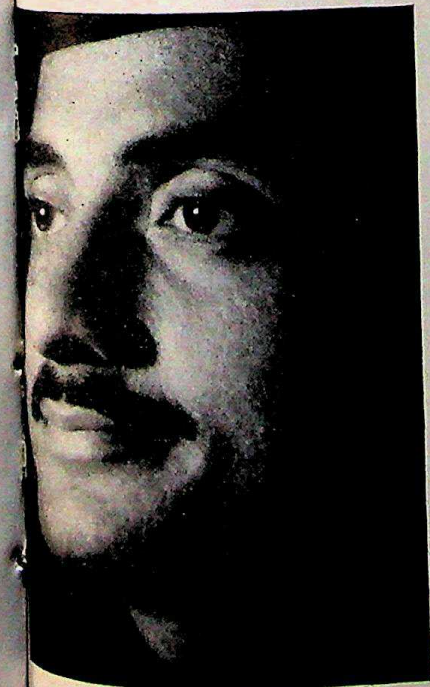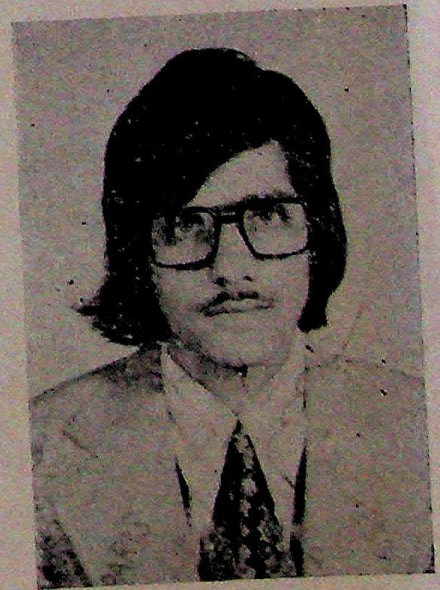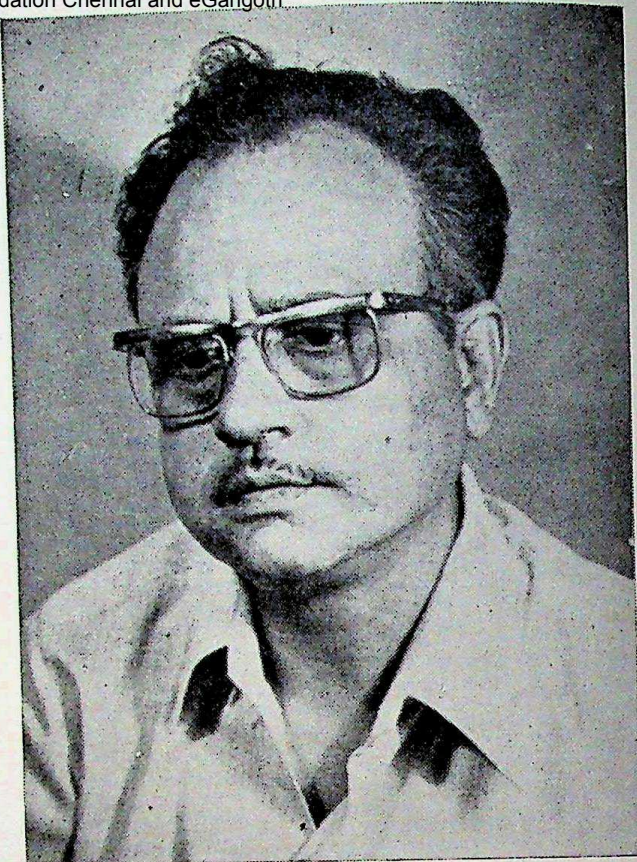
جوہر دارا والا
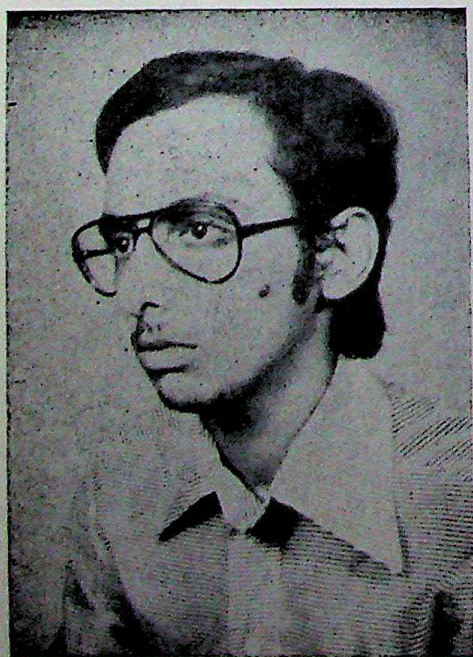
قریشی دارا والا
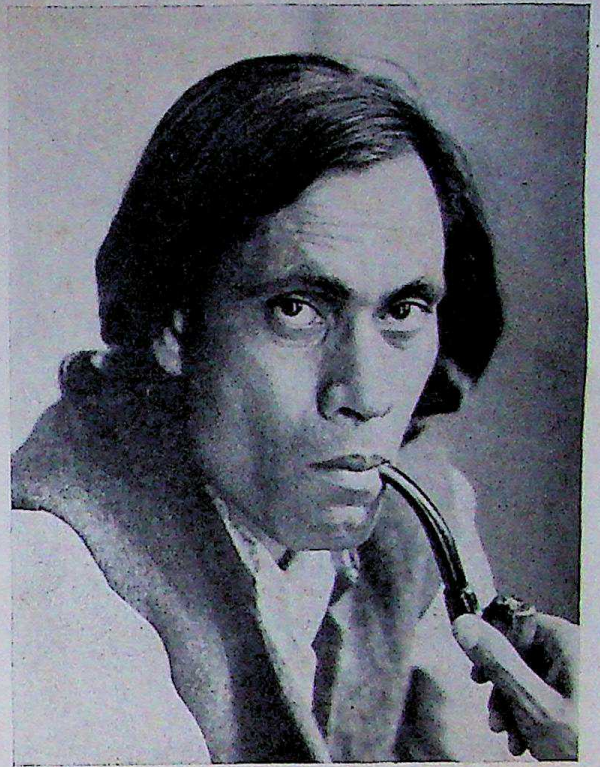
صبا برِدت
مدیر "فن اور شخصیت"

محوِ حیرت مسٹر کملیشور مجسّم سوال ہے کہ بھلا اردو میں میرا نمبر، صبا بردت کو تک رہے ہیں اور دونوں کی خاموشی گویا ہے ع من تو شدم تو من شدی

اور

اردو زبان

☆ اردو اور ہندی - ہندوستان کے عوام کی
زبانیں ہیں
اردو اور ہندی - ایک ہی پیڑ کی دو شاخیں
ہیں - ہوا چلنے سے ان کی پتیاں آپس میں ملتی ہیں
تو کیا حرج ہے - پتیوں اور ٹہنیوں کو تراشنے کی
کیا ضرورت ہے - ٹہنیاں تراشنے والوں کو میں پسند نہیں کرتا

اردو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پاکستان اور دوسرے
عرب ملکوں کو بھی ہمارے قریب لانے میں مدد پہنچاتی
ہے - اس کے ذریعے فیض، قاسمی، ہاجرہ، خدیجہ،
طفیل اور مرزا ادیب سے بھی ہمارا رشتہ مضبوط ہوتا
ہے -

اس لئے میں ہمیشہ اردو رسم الخط کو باقی رکھنے
کا حامی رہا ہوں — کملیشور

سیّد ظہیر علی

کملیشور۔ مشترکہ ہندوستانی تہذیب کے وارث

وہ گولڈ فلیک کا دھواں منہ سے اگلتے ہوئے ادب اور اس کے مسائل پر مسلسل کہے جا رہا تھا۔ اس کی آواز میں ایک قسم کی کشش تھی جو سننے والوں کو محو کئے دے رہی تھی لہجہ اتنا پُر اثر اور بنیا تُلا تھا کہ الفاظ اپنے معنی کھوتے جا رہے تھے۔ کملیشور کی کہانی جتنی دلچسپ ہوتی ہے ان کی بات چیت بھی اتنی دلچسپ اور پُر اثر ہوتی ہے۔ پچھلے دنوں کملیشور اورنگ آباد آئے ہوئے تھے۔ یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس اور جوگیندر پال کے مکان پر ان سے بات چیت کا موقع ملا۔ کملیشور کے علاوہ معین شاکر، جوگیندر پال، بھگت سنگھ راجور کر اور دوسرے افراد نے بات چیت میں حصّہ لیا۔

کملیشور کو گھنٹوں سننے کے بعد بھی لبوریت کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ فطری طور پر وہ بڑی لطیف گفتگو کرتے ہیں۔

اردو طبقہ میں کملیشور کے بارے میں کئی طرح کی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ کملیشور اردو کے مخالف ہیں۔ وہ فارسی رسم الخط کے بھی مخالف ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اس سلسلے میں جوگیندر پال نے ان سے بڑا سیدھا سوال کیا کہ وہ ان غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے ایک مثبت قسم کا بیان دیں انہوں نے کہا کہ مجھ پر اردو دشمنی کا الزام سراسر بہتان ہے۔ کملیشور نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں سیٹھ گوبند داس قسم کے ادیبوں کی کمی نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ کو اردو کا ایسا ادیب سمجھتے ہیں جو دیوناگری رسم الخط میں لکھتا ہے۔

دیوناگری رسم الخط میں لکھنے کے لئے وہ مجبور رہیں۔ اس لئے کہ وہ جس معاشرے میں پلے بڑھے ہیں وہاں دیوناگری رسم الخط ہی اہمیت کا حامل تھا۔ انہوں نے کہا کہ ان پر اردو دشمنی کا الزام عائد کرنے کی ایک وجہ ہے۔ دہلی میں ایک کانفرنس بلائی گئی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ اردو کو دہلی کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ پریم ساگر گپتا نے اس کانفرنس کا اہتمام کیا تھا۔ طے یہ ہونا تھا کہ ہندی (جو دہلی کی پہلی سرکاری زبان مانی جاتی ہے) کے بعد اردو کو دوسرا درجہ ملنا چاہیئے۔ کملیشور نے کہا اس کانفرنس میں جو بنیادی غلطی کی ہے وہ یہ کہ ہندی کو دہلی کی سرکاری زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا ہے۔ دہلی کی پہلی سرکاری زبان صرف پنجابی ہو سکتی ہے۔ دوسری زبان اردو ہوگی اور ہندی کو تیسرا درجہ ملنا چاہیئے

انہوں نے کہا کہ پہلے پنجابی کو اس کا صحیح مقام دلانے کی کوشش کیجئے تب کہیں اردو کے درجہ کی بات کی جا سکتی ہے۔ ان کے اس بیان کو لوگوں نے توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کیا جس سے ظاہر ہو کہ کملیشور اردو دشمن ہیں۔ فارسی رسم الخط کے سلسلے میں انہوں نے کہا کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ فارسی رسم الخط زندہ رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے سندھی زبان کی طرف اشارہ کیا جس میں بحث چل رہی ہے کہ آیا سندھی زبان کا فارسی رسم الخط برقرار رکھا جائے یا اسے دیوناگری رسم الخط میں لکھا جائے۔ کملیشور کا کہنا ہے کہ انہوں نے اس بات کی مخالفت کی تھی کہ سندھی زبان کا رسم الخط بدل دیا جانا چاہیئے۔

جوگیندر پال نے ایک اور اہم سوال یہ پوچھا کہ اردو کی ترقی کے لئے کیا اس کا کوئی علاقہ ہونا چاہیئے اور کیا کملیشور یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح اب تک اردو کے ساتھ کی جانے والی ناانصافیوں کا کسی حد تک ازالہ ہو سکے گا؟

کملیشور نے کہا کہ زبان کے مسائل کو سیاسی نقطۂ نگاہ سے حل کرنے کا رویہ بدبختانہ ہے۔ لیکن اس سے فرار بھی ممکن نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس دن اردو کا کوئی علاقہ مقرر کر دیا جائے گا اس دن اردو اپنی قومی اہمیت کھو دے گی۔ کملیشور اس بات کو مانتے ہیں کہ اگر اردو کا کوئی علاقہ مقرر کر دیا جائے تو اس علاقہ میں اسے کسی حد تک معاشی قوت نصیب ہو گی لیکن ساتھ ہی قومی سطح پر اس کے کردار پر ضرب پڑے گی۔ وہ مختلف علاقوں کی ہندی کے فرق کو بھی بہت زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اتر پردیش بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، ہماچل پردیش اور ہریانہ میں بولی جانے والی ہندی ایک دوسرے سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ لیکن بول چال کی وہ زبان جسے ہندوستان کے ہر علاقہ کا آدمی اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لئے استعمال کرتا ہے ایک مختلف زبان ہے۔ اب، آپ اسے ہندی ہندوستانی یا اردو کسی بھی نام سے پکار دیجئے۔ کملیشور کا کہنا ہے کہ ہندی اور اردو والے سب سے بڑی غلطی یہ کرتے ہیں کہ وہ برج بھاشا کو اپنی زبانوں کا ماخذ قرار دیتے ہیں یہ تاریخی بددیانتی ہے۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی ابتدا حیدرآباد کی اس زبان سے ہوتی ہے جسے قلی قطب شاہ اور حضرت بندہ لواز رح نے استعمال کیا تھا اور جو بعد میں دکنی کہلائی۔

زبان اور اس کے مسائل کے بعد ادب کی بات چھڑی۔ جوگیندر پال نے کہا کہ وہ ادب کو زبان کے دائرے میں مقید کرنے کے خلاف ہیں۔ ہندی ادیب، اردو ادیب، یا مراٹھی ادیب کی اصطلاحات بے معنی اور غیر عقلی ہیں۔ ایک شخص یا تو ادیب ہو گا یا ادیب نہیں ہو گا۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ کملیشور ہندی میں ادب کی تخلیق کر رہے ہیں۔ ہندی زبان سے ان کا رابطہ ایک حادثہ ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کا ادیب یا فن کار ہونا اتفاق کی بات نہیں۔ اگر وہ ہندی نہیں جانتے ہوتے تو کسی اور زبان میں تخلیقی کام کرتے اور یہی بات ہر فنکار کے تعلق سے کہی جا سکتی ہے۔ کملیشور نے کہا کہ...... صوفیوں اور سنتوں کے دیئے ہوئے لٹریچر کے علاوہ ایسا کوئی ادبی مواد نہیں ہے جسے پورا ملک اپنا ورثہ سمجھتا ہو۔ صرف صوفی ادب میں ہی ہمیں نثر کر ہندوستانی احساس ملتا ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس احساس کو زندہ رکھا جاتا۔ لیکن صوفیوں اور سنتوں کے بعد کے ادب میں اس طرح کا احساس مفقود ہے کیا بات ہے کہ

کبیر یا سور داس کے کہے ہوئے دوہے آج بھی کیرالا کے آدمی کو متاثر کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم اپنی کھڑکیاں اور دروازے ایک دوسرے پر بند کر رہے ہیں۔ ہندی اور اردو مختلف زبانیں ہو سکتی ہیں لیکن انسانی احساسات مختلف نہیں ہو سکتے۔ انسانی تجربات ایک طرح ہی کے رہتے ہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ مشترکہ فروغ پذیر تجربات common cumulative experiences کو ادبی شہ پاروں کی بنیاد بنایا جائے۔ زندگی کے تعلق سے کملیشور کا رویہ بڑی حد تک ان کے شخصی تجربات پر مبنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایک وقت وہ تھا جب وہ معاشی طور پر بہت پریشان تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی بچی سے تھوڑی دیر پیار کر لیں۔ اسے گلے سے لگا لیں لیکن تلاش معاش کی مصروفیات نے انہیں اس بات کا موقع نہیں دیا۔ آج ان کے پاس بہت کچھ ہے۔ وہ ہندی کے صف اول کے ادیب ہیں۔ ٹیلی ویژن کے ایک اہم فن کار ہیں۔ فلم کی کہانیاں لکھتے ہیں اور سارکا جیسے اہم پرچے کے مدیر ہیں۔ ان کی معاشی حالت بھی بہت اچھی ہے۔ لیکن آج بھی وہ اپنی بیٹی کو محبت سے گلے نہیں لگا سکتے کیوں کہ اب وہ بچی نہیں رہی بلکہ جوانی کے اوائل برسوں میں قدم رکھ چکی ہے۔ آج جب وہ اسے گلے لگانا چاہتے ہیں تو وہ شرما کر نکل جاتی ہے۔ اور کملیشور ایک عجیب طرح کی نا آسودگی کا مجسمہ بنے کھڑے رہ جاتے ہیں۔ ان کی بیٹی میں جوانی کے تمام complexes آ چکے ہیں اور وہ اپنے باپ سے گلے لگتے شرماتی ہے۔

کملیشور نے کہا کہ کون سا ادب، کون سی زبان یا کون سا نظام حکومت انہیں اپنی بیٹی کا پیار دے سکتا ہے۔ یہ ایک طرح کا خواب تھا جو اب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا۔ اور یہی کملیشور کا کرب ہے جو بے پایاں ان کی کہانیوں میں کہیں نہ کہیں نمودار ہوتا رہتا ہے۔

معین شاکر نے کملیشور کی توجہ ان کے تعلق سے حالیہ مباحث کی طرف مبذول کروائی۔ پچھلے دنوں کملیشور نے سماناتر کے نام سے کچھ ہندی کہانیوں کو مرتب کیا تھا جسے حکومت ہند کی طرف سے شائع کیا جانے والا تھا لیکن اس دوران دہلی کے ایک ہفت روزہ New wave میں آر پی سنگھ کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں لکھا گیا تھا کہ کملیشور سماناتر کے نام سے ایک چلا رہے ہیں۔ اس کے بعد کملیشور نے حکومت ہند سے اپنی درخواست واپس لے لی تھی اور اس مضمون کے خلاف کہیں بھی کچھ نہیں کہا۔ اس واقعہ کو ایک طرح سے کملیشور کی شکست تسلیم کیا جا رہا ہے۔ شاکر صاحب نے کہا کہ وہ اس پورے قضیہ پر روشنی ڈالیں۔ کملیشور نے کہا کہ ادب میں کسی بھی طرح کی تحریک اجارہ میں غلط فہمیوں سے دوچار ہوتی ہے۔ ہندوستانی ادبی فضا کچھ لوچیل قسم کی روایات کی شکار ہے۔ یہاں پر فن کار کو ایک کینوس، دو برش اور کچھ رنگ دے دیا جاتا ہے اور اس پر فن کار سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ کینوس پر ایک گلدستہ بنائے۔ تمام گلدستوں میں جو سب سے خوبصورت گلدستہ ہو گا اسے مقبولیت ملتی ہے۔ اب اگر کوئی فن کار گلدستہ کے بجائے کینوس پر گھوڑا بنا دے تو یہ کہا جائے گا کہ گھوڑا بنانا مقابلے میں شامل نہیں تھا۔ سماناتر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ معترضین کا کہنا تھا کہ یہ تحریک لوگس اور بے معنی ہے۔ ادب کا ہر نیا تجربہ اہمیت کا حامل نہیں ہو سکتا لیکن جو تجربہ یا تحریک اپنے اندر خوبیاں لئے ہوتی ہے وہ تمام تر اعتراضات اور مخالفتوں کے باوجود

اپنا اثر چھوڑتی ہے۔ اچھے اور برے ادب کی پرکھ تو (Time factor) وقت کے ساتھ جڑی ہوتی ہے۔ اب یہ وقت ہی بتائے گا کہ سمانتر Racket تھا یا حقیقی ادبی تجربہ۔

بات ادب سے ہوتی ہوئی آزادی تحریر و تقریر کی طرف آئی تو کملیشور نے کہا کہ ایمرجنسی کے نفاذ کے فوری بعد شلپی یترن کی طرف سے ہندوستان کی مختلف زبانوں کے سات ادیبوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی اور ان ادیبوں سے یہ کہا گیا تھا کہ وہ ایمرجنسی کے حالات میں آزادی تحریر و تقریر کا جائزہ لیں۔ کملیشور نے اس میٹنگ میں کہا تھا کہ اگر ایمرجنسی کا مطلب سماجی اور معاشی انقلاب لانا ہے تو اس طرح کی ایمرجنسی ہندوستانی ادیبوں نے آزادی کے فوری بعد ہی اپنے اوپر عائد کر لی تھی۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ادیب سیاست کے تعلق سے جتنا جانتے ہیں اتنا ہمارے سیاستداں ادب کے تعلق سے نہیں جانتے ہیں۔ آزادی تحریر و تقریر ان لوگوں کو چاہیے جن کے پاس کہنے کے لئے کچھ ہوتا ہے۔

کملیشور سے بات چیت کرنے کا موقع حاصل ہونا ایک خوشگوار تجربہ ہے ان کا لہجہ بڑا شاداب ہوتا ہے۔ اور باتیں اتنی سیدھی کہ کبھی کبھی احساس ہونے لگتا ہے جیسے کملیشور مسائل کو (over simplify) سہل ممتنع بنا رہے ہیں انہیں اس بات کا دکھ ہے کہ تقسیم ہند نے ہمارے مشترکہ ادبی سرمائے اور تہذیب پر مصنوعی پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ ان کا احساس پاکستان کے رئیس امروہوی کے احساس سے مختلف نہیں وہ جانتے ہیں کہ عربی اور ایرانی تہذیبوں نے ہندوستانی تہذیب کو جلا بخشی ہے۔ وہ مشرق وسطیٰ سے ایک مضبوط رشتہ قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس رشتہ کو قائم رکھنے کی وجہ سیاسی یا معاشی ہرگز نہیں۔ بلکہ ان کا کہنا ہے کہ اس رشتہ کے بغیر ہماری تہذیب نامکمل رہ جائے گی۔

ہری دلش رائے کا بچن کس تہذیب یا معاشرے کی دین ہیں؟ کملیشور نے بڑے جوشیلے انداز میں سوال کیا۔ تھوڑے وقفہ کے بعد خود ہی نے اس کا جواب بھی دیا کہ بچن کو ایران اور ہندوستان کی ملی جلی تہذیب نے پیدا کیا ہے۔

کملیشور نے کہنا بند کر دیا تو کمرے میں ایک بوجھل سی اداسی چھا گئی۔ سب نظریں نیچی کئے قالین کے نقوش کو گھور رہے تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ ان نقوش کے نیچے چھپے ہوئے بدصورت فرش کو اس کی پوری عریانی میں دیکھ رہے ہوں۔ کملیشور نے کہا کہ سچائی ہر حساس آدمی کو اداس کر دیتی ہے۔ غمگین وہی ہوتے ہیں جو ہوش مندی اور حق پرستی کی باتیں کرتے ہیں۔ دروغ گو اور بھانڈ کبھی غمگین نہیں ہوا کرتے۔ وہ ہمیشہ خوش رہتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین

کملیشور سے بات چیت

کہانی تحریک سے لیکر زبان کی تلاش تک

دو سال پہلے بمبئی میں ہندی مزاح نگاروں کا ایک اجتماع منعقد ہوا تھا اس اجتماع میں مجھے مدعو کیا گیا تھا۔ چوپاٹی سے قریب ایک مقام پر سارے مزاح نگار غیر رسمی بات چیت کے لئے جمع تھے۔ کچھ امیر قسم کے اصحاب بھی موجود تھے بلکہ وہی میزبانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مزاح نگاروں کی بڑی آؤ بھگت ہو رہی تھی۔ میں اور ہندی کے مشہور مزاح نگار شرد جوشی اس محفل کے ایک کونے میں لنکا کی طرح بیٹھے باتیں کم کر رہے تھے اور قہقہے زیادہ لگا رہے تھے۔ کہ اچانک کسی نے میرا تعارف ایک صاحب سے کروا دیا کہ ان سے ملئے یہ کملیشور ہیں۔ میں نے اپنے قہقہے کو روک کر ان سے مصافحہ کیا۔ انہیں یہ اطلاع دی کہ ان سے مل کر بڑی خوشی ہوئی اور پھر بقیہ آدھا قہقہہ لگانے کو شرد جوشی کی جانب متوجہ ہو گیا۔ کملیشور اس محفل میں نہ صرف یہ کہ مالدار قسم کے اصحاب کے ساتھ بیٹھے تھے بلکہ انہوں نے لباس بھی کافی امیرانہ پہن رکھا تھا لہٰذا میں یہ کیسے جان سکتا تھا کہ یہ وہی کملیشور ہیں جو ہندی کے چوٹی کے افسانہ نگار مانے جاتے ہیں جنھوں نے کئی معرکتہ الآرا ناول لکھے ہیں اور جو "سارِیکا" جیسے معیاری رسالے کے ایڈیٹر ہیں۔ میں نے تو یہی سمجھا تھا کہ جن کملیشور صاحب کا تعارف مجھ سے کروایا گیا ہے وہ یا تو ٹائروں کا کاروبار کرتے ہیں یا کسی تجارتی کمپنی کے مینجنگ ڈائرکٹر ہیں۔ مگر جب محفل میں بات چیت شروع ہوئی تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تاجر صاحب بڑی ذہانت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور بات بات پر چبھتے ہوئے فقرے کس رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ اگر اس ملک کے سارے تاجر بھی اتنے ذہین اور باشعور ہوں تو پھر ملک میں سوشلزم کا آنا یقینی ہے میں ابھی سوشلزم کے مستقبل سے مطمئن ہونے کی کوشش کر رہی رہا تھا کہ کملیشور کسی صاحب کے ساتھ چلے گئے میں نے اپنے میزبان سے پوچھا کہ یہ سیٹھ جی جو بڑی دلچسپ باتیں کر رہے تھے آخر کونسی کمپنی کے مالک ہیں؟ میرے میزبان نے کہا کہ ارے صاحب آپ تو غضب کرتے ہیں۔ یہ کملیشور ہیں کملیشور، سارِیکا والے۔ ہندی کے مہان لیکھک آپ انہیں نہیں جانتے؟

میں نے کہا کہ میں کہانیوں والے کملیشور کو تو جانتا ہوں۔ لیکن آپ نے پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ یہ وہی کملیشور ہیں جو ٹائروں کا کاروبار نہیں بلکہ الفاظ کا کاروبار کرتے ہیں۔ کملیشور نکل کر جا چکے تھے۔ اور میں صرف لکیر کو پیٹ رہا تھا۔ میں یہی سوچتا رہا کہ انہوں نے نہ جانے میرے بارے میں کیا رائے قائم کی ہو۔ کیونکہ میں نے

ان کے ساتھ واقعی بڑی بے نیازی برتی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی مکھی کھا لی ہو۔ دو سال سے اس مکھی کو نکالنا چاہتا تھا لیکن کوئی موقع نہ ملا۔ گزشتہ ہفتہ تلگو ادیبوں کی کل ہند کانفرنس میں کملیشور مہمان خصوصی کی حیثیت سے حیدرآباد بلائے گئے تھے۔ مجھے مناسب موقع ہاتھ آیا۔ میں اسی ارادے سے کملیشور صاحب کے پاس گیا تھا کہ چند منٹ ان سے ملوں گا اور زندگی میں کبھی انہیں تاجر سمجھنے کی معافی مانگ لوں گا ——— مگر یہ ملاقات اتنی طویل اور دلچسپ رہی کہ کملیشور نے اپنے سارے پروگرام منسوخ کر دیئے۔ اس گفتگو میں جو ہوٹل "ہردوار" کے کمرے سے نکل کر حیدرآباد کی سڑکوں پر چہل قدمی کے دوران بھی جاری رہی ادب کے کئی دلچسپ اور غیر دلچسپ موضوعات زیر بحث آئے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کملیشور سے اپنی اس بات چیت کو قلمبند کر لوں تاکہ سند رہے ضرورت کے وقت کام آئے۔ اس بات چیت کا آغاز بڑے خوش گوار انداز میں ہوا۔ ہوٹل ہردوار، میں میرے پہنچتے ہی کملیشور نے شکایت کے انداز میں کہا کہ "بھئی! حیدرآباد بہت اچھا شہر ہے۔ لیکن ایک شکایت یہ ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں میں گرم چائے اور ٹھنڈا کوکا کولا پینے کے لئے ترس گیا ہوں جب کبھی چائے منگائی تو وہ ٹھنڈی نکلی اور جب بھی کوکا کولا منگوایا تو وہ گرم نکلا۔

میں نے پوچھا "اس وقت آپ کیا پینا چاہتے ہیں؟

بولے "ٹھنڈا کوکا کولا"

میں نے فوراً بیرے کو آواز دی اور کہا کملیشور جی کے لئے چائے لے آؤ۔

بولے "یہ کیا بات ہوئی؟"

میں نے کہا "بہت سیدھی سی بات ہے جب آپ کو کاکولا پینا چاہیں تو چائے منگوائیں کیوں کہ یہ ٹھنڈی ہوا ہے۔ آپ کو تو سردی اور گرمی سے مطلب، ٹھنڈا پینا ہے چائے اور کوکا کولا سے نہیں"۔

کملیشور نے قہقہہ لگایا اور کوکا کولا یعنی چائے پینے میں مصروف ہو گئے۔

میں نے پوچھا کملیشور جی! یہ بتایئے (Anti-story) تحریک یعنی "ناکہانی" تحریک کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیونکہ جب کہانی میں کہانی نہ ہو تو پھر کیا ہو؟ اور یہ ایسی ہی بات ہے کہ جیسے آدمی تاجر تو ہو مگر اس میں بے ایمانی موجود نہ ہو"

کملیشور بولے "ہندوستان میں Anti-story تحریک کو ہمیشہ غلط سمجھا گیا مغرب میں جب یہ تحریک چلی تو وہاں اس کے لئے ایک پس منظر موجود تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد جو تہذیب سامنے آئی تھی یعنی "جنگ کی تہذیب" اس کی نفی کرنے کے لئے وہاں کے ادیبوں نے یہ تحریک شروع کی تھی کیوں کہ وہاں رشتے منتشر ہو گئے تھے۔ زندگی کے دھارے کے بہاؤ کے لئے ایک ربط کی جو ضرورت ہوتی ہے وہ مفقود ہو چکا تھا۔ یہ مغرب کے معاشرے میں خود فرد کی پہچان دشوار ہو گئی تھی افراد کے خونی رشتے تک مشکوک ہو گئے تھے۔ جنگ نے باپ اور بیٹے کی پہچان کو بھی مسخ کر دیا تھا۔ ایسے میں احتجاج کا ایک شدید رجحان ادیبوں اور فنکاروں میں پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعہ جنگ کی بے ہنگم تہذیب کا انحراف کرنا چاہتے تھے۔ اور اسی انتشار نے (Anti-story) تحریک کو جنم دیا۔ ادیبوں نے ایک متوازی دنیا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس تحریک میں جو شدید انتشاری رجحان ملتا ہے وہ مغرب کے سیاسی اور معاشرتی حالات

کے خلاف ایک فطری احتجاج کی حیثیت رکھتا ہے ہندوستان کے ادیبوں نے جب اس تحریک کو اپنانے کی کوشش کی تو ان کے پاس وہ سیاسی اور سماجی حالات نہیں تھے جو مغرب میں موجود تھے لہٰذا ہمارے بہت سے نئے ادیبوں نے اپنے اس انتشاری رجحان کا رخ "ہویت" کی طرف موڑ دیا اور نتیجہ میں Anti-story تحریک بڑی حد تک Anti-Human یعنی غیر انسانی بن گئی۔ کملیشور نے کہا کہ "وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ادیب کو اپنے انتشاری رجحان کے اظہار کی آزادی ملنی چاہیئے بشرطیکہ یہ رجحان کسی شدید فطری جذبہ کی پیداوار ہو زندگی کے رویئے ہر جگہ مختلف ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کا رویہ اپنے ڈرائینگ روم میں مختلف ہوتا ہے اور یہی آدمی جب باتھ روم میں جاتا ہے تو اس کا رویہ بدل جاتا ہے۔ اس رویہ کا اظہار بھی ہونا چاہیئے۔

میں نے بات کاٹ کر کہا "تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ ادب میں "باتھ روم" کے لئے بھی گنجائش فراہم کی جائے۔

وہ بولے "جب گھر میں باتھ روم ہوتا ہے تو پھر ادب میں کیوں نہیں ہونا چاہیئے؟"

میں نے کہا "مگر ایسے ادیبوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے جو ہمیشہ ادب کے "باتھ روم" میں رہنا پسند کرتے ہیں اور پانچ دس منٹ کے لئے ادب کے ڈرائینگ روم میں چلے آتے ہیں۔

کملیشور نے کہا "ایسے ادیبوں پر ترس کھانا چاہیئے۔ اس کے سوائے کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا "مگر کملیشور جی! بہت سے نئے ادیب اور شاعر ایسے ہیں جو جان بوجھ کر انہیں گندگی اور غلاظت کو اچھالنا چاہتے ہیں۔ کملیشور ہنستے ہوئے بولے۔ "سچ پوچھئے تو ایسے ادیبوں کے مسائل کا تعلق ادب سے نہیں ہوتا بلکہ ہمیں چاہیئے کہ ہم ایسے ادیبوں کا پتہ میونسپل کارپوریشن والوں کو بتلا دیں کہ گندگی اور غلاظت کو ہٹانے کا کام اسی محکمہ کے تفویض ہوتا ہے۔ میری نظر میں تو ان سے نپٹنے کا یہی ایک طریقہ ہے"۔

میں نے کہا کہ میونسپل کارپوریشن والے جب سڑکیں ہی ٹھیک ڈھنگ سے صاف نہیں کرتے تو پھر ادب کی صفائی کا مزید بوجھ اس محکمہ پر ڈالنا بیکار ہے۔

کملیشور نے کہا "بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے بہت سے ادیب ایسے ہیں جو کوئی سماجی اور سیاسی شعور نہیں رکھتے انہیں یہ تک نہیں معلوم کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے وہ یہ نہیں جانتے کہ حکومت آئے دن جو قوانین بناتی جا رہی ہے وہ کس طرح عوام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مغرب کا ادیب اپنے حالات اور ماحول سے یوں بے نیاز نہیں رہتا۔ ہمارے کئی نوجوان ادیب صرف (Intellectual snobs) بننا چاہتے ہیں وہ ایک مخصوص سی فضا میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ایک قسم کی رومانیت پسندی کو اپنے سارے وجود پر مسلط کر لیتے ہیں۔ بال بڑھا لیں گے بہت دھیرے سے وہ بولیں گے مخصوص انداز میں وہ چلیں گے یوں ظاہر کریں گے جیسے وہ سب سے الگ تھلگ سا ہیں۔ یہ اصل میں لبادے اوڑھے ہوئے لوگ ہوتے ہیں

میں نے پوچھا کہ آپ ایسے ادیبوں کو کہاں تک برداشت کر سکتے ہیں؟

کملیشور بولے "انہیں ایک حد تک ضرور برداشت کرنا چاہیئے کیونکہ ایسے ادیب جب ادب میں ناکام ہو جاتے ہیں تو ادب کے اچھے قاری بن جاتے ہیں اور کسی ادب کی ترقی کے لئے صرف اچھے ادیب ہی سب کچھ نہیں ہوتے بلکہ اچھے قارئین کا ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔

اس طویل بات چیت کے بعد کملیشور ذرا سی تھکن محسوس کرنے لگے۔ انہوں کہا ہمیں اب ٹھنڈا کوکا کولا پینا چاہیئے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

اور میں نے بیرے کو بلا کر پھر چائے لانے کا آرڈر دیدیا کملیشور غالباً جان گئے تھے کہ میں اب الٹے وہ سوال کرنے والا ہوں جس کا جواب دینے سے وہ بچنا چاہتے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے آپ کو ترو تازہ کرنا ضروری سمجھا۔

ہندی اور اردو مسئلہ: میں نے پوچھا کملیشور جی! اب میں ہندی اور اردو کے جھگڑے کے بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتا ہوں ویسے آپ اطمینان رکھیں کہ زبانوں کا جھگڑا کم از کم اس وقت ہم دونوں کے جھگڑے کا سبب نہیں بنے گا۔ کملیشور ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اور زیر لب مسکراتے ہوئے بولے، میں زبانوں کے مسئلہ پر اظہار خیال کرنے سے پہلے ایک لطیفہ سنانا چاہتا ہوں تاکہ بات چیت کی فضا ہلکی پھلکی رہ سکے۔ ویسے یہ صرف لطیفہ ہے اور اسے آپ اتنی ہی اہمیت دیں جتنی کہ ایک لطیفہ کو دے سکتے ہیں۔ ایک بار کرشن چندر بچوں کے ہندی رسالہ "پراگ" کے دفتر پہنچے تو اتفاق سے میں بھی وہاں موجود تھا۔ کرشن چندر بڑے منہ مرے آدمی ہیں۔ کسی کو "نہ" کہنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔ پراگ کے ایڈیٹر نے ان سے کبھی خواہش کی تھی کہ وہ بچوں کے لئے کوئی مضمون لکھیں اور کرشن چندر نے محض شرافت میں "ہاں" کہہ دی تھی۔ کرشن چندر جب پراگ کے دفتر آئے تو پراگ کے ایڈیٹر نے انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا اور یہ بھی کہا اگلے شمارے کے لئے ان کے مضمون کا ملنا نہایت ضروری ہے کیونکہ ان کے نام کا اعلان ہو چکا ہے۔ کرشن چندر بہت سٹپٹائے اور بولے "بھئی! سچ بات تو یہ ہے کہ بچوں کے لئے لکھنا میرے لئے بہت مشکل ہے میں تو صرف بڑوں کے لئے لکھتا ہوں۔

کرشن جی کی حیرانی دیکھ کر میری رگ ظرافت پھڑک اٹھی اور میں نے کہا، کرشن جی آپ فکر نہ کریں۔ اردو میں آپ بڑوں کے لئے جو کچھ وہ لکھتے ہیں وہی "پراگ" کو دیجیئے وہ جب ہندی میں ترجمہ ہو کر چھپے گا تو خود بخود بچوں کے لئے لکھی گئی تحریر بن جائے گا۔"

یہ کہہ کر کملیشور نے زبردست قہقہہ لگایا مگر میرا قہقہہ کہیں دب کر رہ گیا۔ میرے ہونٹوں پر اس وقت مسکراہٹ نہیں بلکہ صرف شرافت کھیل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ کملیشور نے جو لطیفہ فضا میں تلخی کو ختم کرنے کو سنایا ہے اس سے تلخی میں شاید اضافہ ہو گیا ہے کیونکہ اردو سے ہٹ کر خود کرشن چندر میری کمزوری بن چکے ہیں۔ کملیشور نے غالباً میرے پوشیدہ جذبات بھانپ لئے۔ خود ہی مسکرا کر بولے اجی صاحب لطیفہ کو صرف لطیفہ سمجھیئے ایک لطیفہ صرف زبانوں کے مقام کا تعین نہیں کر سکتا۔ میں نے تو یونہی یہ لطیفہ سنا دیا ہے۔ سچ پوچھیئے تو میں اردو کا بہت بڑا مداح ہوں۔ میں ایک کائستھ گھرانہ میں پیدا ہوا جس کا سارا ماحول اردو کے خمیر سے بنا ہے۔ میرے والدین اور میرے سارے بزرگ آج بھی مجھے اردو میں خط لکھتے ہیں ایک میں ہی کافر ہوں۔" میں نے کہا۔ گویا لطیفہ کی رو سے آپ اپنے بڑوں کے بزرگ اور آپ کے بڑے آپ کے چھوٹے ہیں۔

کملیشور بولے آپ تو اس لطیفہ کے بارے میں خواہ مخواہ سنجیدہ ہو گئے۔ میں نے کہا اچھا چلیئے!

میں اسے لطیفہ مان لیتا ہوں، کملیشور نے اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ میرا شخصی نظریہ تو یہ ہے کہ ایک تخلیقی ادیب کو زبانوں کے جھگڑے سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیئے۔ زبانوں کا مسئلہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جو زبانوں کو سیاست چلانا چاہتے ہیں۔ میرے لئے تو زبان صرف اظہار کا ایک ذریعہ ہے مجھے تو یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ میں ہندی کا ادیب ہوں ہاں البتہ جب کوئی یہ کہتا ہے کہ میں اردو کا ادیب ہوں تو اس وقت مجھے یاد آتا ہے کہ میں ہندی کا ادیب ہوں اردو بڑی جاندار زبان ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اردو کی قدیم اور جدید شاعری ہندی سے کافی آگے ہے۔ کہانیوں کے معاملے میں بھی اردو پیچھے نہیں ہے۔ مزاح نگاری کے میدان میں بھی اردو کا ستارہ عروج پر ہے۔ لیکن اردو زبان کی بدقسمتی یہ ہے کہ اس کا تعلق سیاست اور مذہب سے پیدا کیا گیا حالانکہ کسی بھی زبان کا صحیح جائزہ سیکولر اور غیر جانبدار انداز میں لیا جانا چاہیئے اردو کے مسئلے کو پیش کرنے میں پہلی غلطی تو اس وقت ہوئی جب اسے اقلیت کی زبان کی حیثیت سے پیش کیا گیا حالانکہ اسلام کی زبان اردو نہیں ہے بالکل اسی طرح جیسے ہندومت کی زبان ہندی نہیں ہے۔ اسی نقطۂ نظر کی وجہ سے اکثریت میں خواہ مخواہ "ضد" اور "ہٹ" پیدا ہو گئی جب تک اردو کو اقلیت کی زبان سمجھا جاتا رہے گا اس وقت اکثریت اس کی مخالفت کرتی رہے گی۔

میں نے پوچھا کیا آپ اس مخالفت کو جائز سمجھتے ہیں؟ وہ بولے "اس مخالفت میں بعض ہندی والوں نے جو شدید رویہ اختیار کیا ہے میں اسے بھی ناپسند کرتا ہوں یہی وجہ ہے کہ زندگی میں کئی مواقع آنے کے باوجود میں نے کبھی سیٹھ گووند داس سے ملاقات نہیں کی اس لئے کہ وہ ہندی کے کٹر حامی بن کر خود ہندی کو نقصان پہونچا رہے ہیں۔

میرا خیال ہے کہ سارے ملک کے لئے ایک مشترکہ رسم الخط ہونا چاہیئے اور اس رسم الخط کو علاقائی زبانیں بھی اپنائیں کیونکہ اس طرح ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

رسم الخط:- میں نے پوچھا آپ کون سے رسم خط کو مشترک رسم الخط بنانا چاہتے ہیں۔ وہ بولے میں رومن رسم الخط کو ملک کے مشترکہ رسم الخط کے طور پر قبول کرنے کے لئے تیار ہوں چاہے وہ فارسی رسم الخط ہی کیوں نہ ہو۔ ایک رسم الخط ہوگا تو لوگ دوسری علاقائی زبانیں بھی پڑھ سکیں گے۔ اور دوسری زبانوں کے الفاظ سے بھی واقف ہوتے جائیں گے۔ میری مثال لیجئے کہ میں دو دن سے تلگو ادیبوں کی کانفرنس کے جلسے میں شرکت کر رہا ہوں۔ مجھے تلگو مطلق نہیں آتی۔ لیکن دو دن تک لگاتار اس زبان کو سننے کے بعد میرے کان اس کے الفاظ سے مانوس ہوتے جا رہے ہیں اگر مشترکہ رسم الخط ہو تو میں شاید صرف پڑھ کر اس زبان کو سیکھ لوں"

میں نے کہا "کملیشور جی! دیوناگری رسم الخط اور ہندی ادب کے بارے میں فراق صاحب کے نظریات کے تعلق سے آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ بولے میں فراق صاحب کی بہت عزت کرتا ہوں وہ جب شاعر کے روپ میں سامنے آتے ہیں تو بہت بڑے آدمی نظر آتے ہیں لیکن جب وہ ماہر لسانیات کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں تو بہت، چھوٹے بن جاتے ہیں۔"

حضرت فراق :-

میں نے کہا، "مگر فراق جیسے مفکر اور فن کار کی رائے صرف تعصب تو نہیں ہو سکتی؟"

کملیشور بولے "سچ تو یہ ہے کہ فراق جس مرصع اور سجی دھجی والی اردو کی آج حمایت کر رہے ہیں وہ اردو آج باقی نہیں رہی ہے۔ فراق کے ذہن میں جس اردو کی حفاظت کا خیال ہے وہ وہی اردو ہے جو میر اور غالب کی نکھری ستھری زبان رہ چکی ہے مگر آج جو اردو بول چال اور ادب میں استعمال کی جاتی ہے وہ اس اردو سے مختلف ہے جو فراق کے ذہن میں محفوظ ہے۔"

میں نے کہا مگر فراق پر لیا الزام لگانا مناسب نہیں ہے کیوں کہ فراق نے اردو شاعری کی زبان میں کئی تجربے کئے ہیں اور اردو شاعری کو ہندوستان کے مزاج سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی ہے اسی کوشش میں انہوں نے کئی ہندی الفاظ بھی اپنی شاعری میں بلا تکلف استعمال کئے۔ سچ پوچھئے تو اردو شاعری کا رشتہ انہوں نے ایران سے جوڑنے کی بجائے ہندوستان کی سرزمین سے جوڑا ہے۔"

کملیشور بولے۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں میں اس معاملہ میں فراق سے کہیں زیادہ علامہ اقبال کی شاعری کے (CONTRIBUTION) دین کو مانتا ہوں۔ علامہ اقبال کے سیاسی نظریات سے اختلاف کے باوجود میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ انہوں نے ہندوستان سے اپنی محبت کے پیغام کو اور ہندوستان کی تہذیب کو بہت دور تک پہونچایا تھا۔ یوں کہیے کہ اقبال نے اپنی اردو اور فارسی شاعری کے ذریعہ ہندوستان کو ایران تک پہونچایا تھا جب کہ فراق نے اردو شاعری کو صرف گھورکھپور تک پہنچانے کی کوشش کی۔ میں علامہ اقبال کی اس دین کو کھلے دل سے تسلیم کرتا ہوں۔ حالانکہ فراق نے اردو شاعری میں ہندوستان کے مزاج کو داخل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نظیر اکبرآبادی بہت پہلے یہ کر چکے تھے۔ رہی اردو شاعری میں ہندی الفاظ کو داخل کرنے کی بات تو اس سلسلہ میں میری عرض یہ ہے کہ "زبان کی تلاش"، فطری ہونی چاہیئے ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبان میں زبردستی ٹھونسنے کا عمل فطری نہیں ہو سکتا۔ یہ تو صرف شعبدہ بازی ہوگی۔

ایک لطیفہ :-

اس بات پر مجھے ایک لطیفہ یاد آگیا کہ ڈاکٹر گوپال ریڈی جب وزیر اطلاعات تھے تو انہوں نے آل انڈیا ریڈیو کے عہدیداروں کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ اردو نیوز بلیٹنوں میں اردو الفاظ استعمال کریں تاکہ ان دونوں زبانوں کو قریب لایا جاسکے اور ان دونوں کو مشکل الفاظ سے پاک کیا جائے۔ انہیں دنوں دلّی کے چاندنی چوک علاقہ میں کوئی حادثہ ہو گیا۔ ہندی والوں نے جب اس خبر کا ترجمہ شروع کیا تو انہوں نے محسوس کیا کہ حادثہ کے لئے "درگھٹنا" کا لفظ کافی ثقیل رہے گا۔ اسی لئے انہوں نے خبر نشر کی کہ "چاندنی چوک" میں آج ایک حادثہ ہو گیا۔ دوسری طرف اردو والوں نے ترجمہ کے وقت سوچا کہ "حادثہ" کا لفظ کافی ثقیل رہے گا۔ اسی لئے انہوں نے یہ خبر اس طرح نشر کی کہ چاندنی چوک میں آج ایک درگھٹنا ہوئی۔ یہ صرف الفاظ کا الٹ پھیر ہے۔ زبان کو فطری طور پر پروان چڑھنا چاہیئے میں ہندی اور اردو کو دور دور رکھنے کا قائل نہیں ہوں اسی لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ دونوں ہی زبان کی تلاش میں کام شروع ہونا چاہیئے اور یہ کام صرف ادیب ہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں عوام کی بول چال کی زبان کو ادب میں جگہ دینی چاہیئے۔ کتابی زبان زیادہ دیرپا نہیں ہوتی۔ زبان کی تلاش ہی ایک دن اردو اور ہندی کے درمیان حائل خلیج کو دور کر دے گی۔

کملیشور نمبر

انہوں نے مثال دیتے ہوئے کہا کہ راجندر سنگھ بیدی نے "ایک چادر میلی سی" میں جس زبان کی تلاش کی ہے وہ ایک سچی اور فطری کوشش ہے۔

ہم لوگ بڑی دیر سے بحث کر رہے تھے اور کملیشور اپنے ایک پروگرام کی منسوخی کے بعد دوسرے پروگرام کے لئے بھی کافی لیٹ ہو چکے تھے۔ پھر انہیں صبح کے طیارے سے بمبئی بھی جانا تھا۔ اس لئے میں نے کملیشور جی سے کہا۔ "اچھا اب اجازت دیجئے میں چلتا ہوں۔" وہ بولے "بیٹھو ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" میں نے کہا "میں زبان کی تلاش میں فوراً یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

کملیشور نے قہقہہ لگایا اور پھر اس کے بعد ہم دونوں بڑی دیر تک حیدر آباد کی سڑکوں پر زبان کی تلاش میں پھرتے رہے۔ پتہ نہیں کملیشور کو اس تلاش میں کیا ملا مگر اتنا ضرور جانتا ہوں کہ میں نے کملیشور جی کو تلاش کیا اور کملیشور نے مجھے تلاش کیا اور یوں سارا حساب بے باق ہو گیا۔

کملیشور کو میں ہندی کا صفِ اول کا ادیب اور دانشور سمجھتا ہوں۔ کملیشور نمبر نکال کر آپ بہت بڑا کام انجام دے رہے ہیں۔ افسوس ہے کہ میں اتنی ہندی نہیں جانتا کہ ان کے بارے میں کچھ لکھوں۔ آپ ان کی کہانیوں کا انتخاب پہلے چھاپ دیجئے اور اس کی ایک کاپی مجھے بھیج دیجئے تو میں ضرور آپ کو مضمون بھیج دوں۔ ——— ڈاکٹر قمر رئیس

کملیشور

صحیح زبان کی تلاش

اُردو کے خلاف جو سب سے بڑی بات جاتی ہے وہ ہے اس کے پاس اپنے علاقہ کا نہ ہونا۔ دلّی یا دوسری ریاستوں میں اسے علاقائی زبان قرار دینے کے لیے جو تحریکیں چلائی گئیں وہ اصل میں علاقہ حاصل کرنے کے لئے تھیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اردو کے پاس واقعی اس کا کوئی مخصوص علاقہ نہیں ہے۔ دہلی، لکھنؤ بھوپال، رام پور، حیدر آباد وغیرہ کچھ ایسے شہر ہیں جن کی چہار دیواری میں "اردو" پابند ہے انہیں شہروں سے پانچ سات میل کے فاصلہ پر اندر جایا جائے تو "اردو" لاپتہ ہو جاتی ہے ـــ اور غائب ہو جانے والی یہ "اردو" وہ ہے جس کا رسم خط فارسی ہے۔ وہ "اردو" جس کی رسم خط فارسی نہیں ہے بہت بڑے اور وسیع تر علاقہ کی زبان ہے اور کچھ میلوں کے فاصلہ پر وہ لاپتہ نہیں ہوتی بلکہ اپنے صحیح رنگ اور لہجہ میں موجود ملتی ہے۔

تو سوال یہی ہے کہ ہم کس اردو کی حمایت کرنا چاہتے ہیں؟ ایک علمی اردو ہے۔ اور دوسری عام فہم اردو ہے۔ جیسی اردو ہر پانچ میل پر کھو جاتی ہے، عام فہم اردو میلوں اور صدیوں کے فاصلوں میں پھیلی ہوئی ہے، صدیوں کے فاصلوں میں جو اردو پھیلی ہوئی ہے۔ اسی سے کھڑی بولی ہندی کا آغاز ہوا ہے۔ اور ہمیں یہ مان لینے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے کہ اردو، ہندی کی شیلی (اسلوب) نہیں، کھڑی بولی ہندی اردو کی شیلی ہے۔

ادبی حلقہ میں فرقہ پرست عناصر نے ہندی اور اردو کی خلیج کو برابر وسیع کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان لوگوں نے بھی جو ادب اور ادبی زبان میں ہم آہنگی چاہتے رہے ہیں یہ دیکھنے کی کوشش کبھی نہیں کی کہ اردو اور ہندی کا ادب شعور کے ایک ہی چشمہ سے نکلتا اور سیراب ہوتا ہے۔ انہوں نے اس سارے ادبی مسئلہ کو تاریخی پس منظر میں نہیں دیکھا بلکہ سیاسی نظریات کے تابع کر کے محدود کر دیا اور سیاسی علاحدگی کے واسطے اس دوری کو باقی رکھا۔ نہیں تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ زبان اور حقیقت پسندی کی بات کرتے ہوئے ہندی اردو کے سرمایہ کو ایک ساتھ نہیں دیکھا جاتا۔

بہر حال اردو کی تحریک چلانے والے بھی اس غلطی کو دہرا رہے ہیں اور وہ پریم چند اور ان کے بعد کے ہندی ادب کے اس دور کے کام کو قطعی نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں جس دور میں عام فہم اردو ہی دیوناگری لپی میں لکھی گئی ہے اور اسی عام فہم اردو کو ہی ہندی کے روپ میں بھی جانا جاتا ہے کیوں کہ وہی زندہ زبان ہے جس میں آدمی روتا ہے، ہنستا ہے اور اپنے درد کو بیان کرتا ہے ـــ مسئلہ

"ہمی کی زبان کا ہے یا، کسی کی زبان کا؟ سوال حقیقت پسندی کا ہے یا انفس پسندی کا؟

"دہلی سے شائع ہونے والے ہفتہ وار رسالہ "انگت" مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۶۵ء کے شمارے سے ماخوذ"

کملیشور میری برادری کے آدمی ہیں۔ مشہور اور خوش نصیب آدمی ہیں۔ میں ان کی برادری کا ایک معمولی ممبر ہوں۔ ان کی قدر کرتا ہوں کہ ان سے برادری کا نام اونچا ہوا ہے۔ وہ ہندی میں لکھتے ہیں اس لئے ان کی چیزیں پڑھنے کے مواقع نہیں ملے۔ کبھی ایک کہانی پڑھ لی، کبھی کہیں دوسری۔ کوئی خیال منظم طور پر نہیں بن پایا ہے۔ مگر جو بھی کہانی پڑھی، اچھی لگی اور ایسا لگا کہ فنکار کا اضطرار اور اضطراب ان کے یہاں بے انتہا ہے۔ دریافت کی تڑپ اس فنکار کے یہاں اتنی ہے کہ اس نے اپنے معاصرین کو ڈرایا بھی ہے اور کئی تو ڈر کر روپوش بھی ہو گئے۔

--- کلام حیدری

مدیر "مورچہ"

کملیشور

برائے مہربانی عام آدمی کی تکلیف کو

ہندی اور اردو کے خانوں میں تقسیم نہ کیجیے

ابھی ۱۰، ۱۱ رنومبر ۱۹۷۳ء میں لکھنؤ میں ہندو ادیبوں کا ایک اجتماع ہوا تھا۔ ان ہندو ادیبوں کا جو اردو میں لکھتے ہیں۔ ان میں زیادہ چالیس مسلمان ادیب بھی شاہد کی حیثیت سے شریک ہوئے جو اردو میں لکھتے ہیں۔ یہ کانفرنس ان لوگوں نے بلایا تھا جس کی مادری زبان اردو نہیں پنجابی ہے۔ پنجابی زبان والے اردو کے ان ہندو اور چالیس مسلمان ادیبوں نے یہ طے کیا کہ اردو کو ہندی ریاستوں کی دوسری علاقائی زبان قرار دیا جائے۔

میں جانتا ہوں کہ میرے ان تمام دوستوں کو جو اس کانفرنس میں شریک ہوئے اس بات پہ سخت اعتراض ہوگا کہ یہ بات میں نے اس طرح کیوں کہی؟ لیکن کیا کیا جائے، انہیں دوستوں نے خود اپنی شکلوں کو سمیٹ کر یہ صورت بنالی ہے۔ مجھے اب ہندی کے سیٹھ گوبند داس اور اردو کے سیٹھ گوبند داس میں کوئی فرق نظر نہیں آتا سوائے اس فرق کے کہ ہندی کے سیٹھ گوبند داس کی مادری زبان ہندی ہے اور اردو کے سیٹھ گوبند داس مسٹر گیان چندر کی مادری زبان پنجابی ہے۔

اردو کے سوال پر میں ان دونوں .... گوبند داسوں سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ حق مجھے اس لئے ہے کہ میں اس زبان میں بولتا اور لکھتا ہوں جس کا بندر بانٹ کرنے میں یہ دونوں سیٹھ ...... داس کم نہ ہوئے ہیں۔ یہ حق مجھے اس لئے بھی ہے کہ یہ سوال براہ راست میرے اس طبقے سے جڑا ہوا ہے جو ہندی ریاستوں میں رہتے اور اپنی روٹی روزی کی لڑائی میں لہولہان ہوئے جا رہے ہیں۔ جس کے لئے "روزی" اردو نہیں ہے اور "روٹی" ہندی نہیں ہے۔ جب لفظ "روزی" اور .... "روٹی" گوبند داس نے نہیں دیا ہے۔ یہ الفاظ عوام نے ان لوگوں کو دیئے ہیں۔ زبان کی کوئی ذات نہیں ہوتی۔ عوام اپنے جذبات، ضرورتوں، جدوجہد کے لئے زبان کو جنم دیتے اور استعمال کرتے اور اسی کے لئے جیتے اور مرتے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہے کہ ہندی ریاست کے عوام کے جذبات، ضرورتوں اور جدوجہد کو وہ نام نہاد اردو قطعی پورا نہیں کرتی جس کی حمایت اردو کے یہ ہندو مسلمان ادا کر رہے ہیں۔

وہ "اردو" کون سی ہے جس کے یہ ۱۱۰ ادبا خود ہم خیال نہ ہوتے ہوئے بھی جھنڈے لے کر اٹھے ہیں؟
ان ایک سو دس ادیبوں میں سب کے سب یہ تو مانتے ہی ہیں کہ نام نہاد اردو اور ہندی کے قواعد ایک ہیں، افعال ایک ہیں اور اسی فیصد الفاظ بھی مشترک ہیں اور اس ریاست کا وہ آدمی جو نہ ناگری لپی جانتا ہے اور نہ فارسی رسم خط، وہ ایک زبان بولتا ہے، چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان یا عیسائی یا سکھ اور اس جنتا کی زبان ایک ہے۔
اور اس کی زندگی کی ضرورتوں کے الفاظ ایک ہیں — ہل، بیل، دیا باتی، کھیت کھلیان، بیج، جتائی، نرائی، لوائی، مینڈھ، کام، مزدور، چھٹی، تنخواہ، گیہوں، دھان، کھتی، دودھ، چھپر، چبوترہ، گلی، سڑک، دین، دھرم، مندر، مسجد، اماں، بیا، ابا، بابو، کرائی، تھاجن، دھندہ، ڈھولس، دھاندلی، کالا دھندہ، جوتا، بکھری، سنہی، رسی، تیل، گھی، کبڈی، پتنگ، لٹو، ٹھیلہ، چوکر، بھوسہ، چکی، پہیہ، پگھا، جھنڈا، ڈھول، تمرھی، نفیری، سارنگی، کرتال، بجرا، ڈھولک، مہندی، سورج، چاند، چندرما، بھنسار، سانجھ، رات، دوائی، روٹی، ترکاری، سپیا، درد، چوٹ، بھوک، سوکھا، سالن، کروٹ، درد، تکلیف، خون، پسینہ اور آنسو۔
اسی فیصد یہ زبان ہے میرے علاقے کی۔ اب جھگڑا یا گروہ بندی اس بیس فیصد کے لئے جو عوام کی زبان نہیں ہے جس کی حمایت میں جلسے اور کانفرنسیں ہوتی ہیں اور لوگ دانت پیستے ہیں۔ یعنی یہ جھگڑا اس اردو زبان کے لئے ہے جسے گونڈہ کی چینی مل کا مزدور ابن اور کیراولی قصبہ کا کسان سوامی نہیں بولتا بلکہ اس زبان کے لئے ہے جو حیدر آباد کے تعلقہ دار کے صاحبزادے شیخ صاحب جناب برکت اللہ رات کے کھانے کے بعد شعر و شاعری کی شکل میں سنتے ہیں اور جسے بمبئی کے کرشن چندر صاحب اور کشمیری آنند نرائن ملا صاحب لکھتے ہیں اس کے بولنے والے نہ تو حیدر آباد کے برکت اللہ صاحب ہیں نہ بمبئی کے کرشن چندر صاحب اور نہ دہلی کے ملا صاحب۔
تو زبان کا یہ مسئلہ اسی فیصد بولنے والوں کے حق میں طے ہوگا یا بیس فیصد میں سے بھی بچے ہوئے ایک فیصد سے بھی بہت کم لکھنے والوں کے حق میں؟ لکھنے والے چاہتے ہیں کہ ان کی اس تحریری زبان کو ۹۹ فیصد لوگوں پر مسلط کیا جائے کہ وہ ان کی لکھی زبان کو زندہ رکھیں اور اپنی زبان کو طاق پر رکھ دیں یعنی اصل مسئلہ یہ ہے کہ اس تحریری اور جاگیردارانہ زبان کو، ان کے شاعروں اور ادیبوں کے لئے زندہ رکھا جائے۔
جواب سمجھتے کم اور سیاست زیادہ کرتے ہیں۔ یعنی تحریری ہندی اور تحریری اردو کو مشترکہ وراثت نہ بننے دی جائے جس میں انشا، غالب، حالی، میر، انیس، کبیر، جائسی، تلسی، بھارتیندو، سرشار، پریم چند، یشپال، ناگر شامل ہو سکیں اور ہمارے عوام راہی، راکیش، بھیشم ساہنی، نرمل، رینو، امرت رائے، بھارتی، ناگارجن، مہرالنساء، کانتا ناتھ، جتیندر، ابراہیم شریف، گیان رنجن، پرچھائی، قرۃ العین حیدر، کاریاشی، سدیپ، اصغر وجاہت، انور گیان، ظہیر نیازی، عالم شاہ خان، مدھوکر سنگھ، عتیق حنفی وغیرہ کو ایک ساتھ پڑھ سکے، اور کرشن چندر کی ہانگ سو گم تی کی حسینہ، رکی سجائے، راہی کے فقیہہ غازی پور کیا ان معیبت زدہ لوگوں سے مل سکے جو سیاست کے مارے ہوئے آج بھی بے حالی اور بے گھر گھوم رہے ہیں۔ اگر اسے اپنی وراثت پہچاننی ہے تو قرۃ العین حیدر کے گوتم نیلامبر سے مل سکے اور اپنے سے باہر شخص اور ندے کو پہچاننا ہو تو "پشاور ایکسپریس" کی اس سچائی

ے بات جو ایک ادیب کرشن چندر نے کبھی لکھی تھی۔ ادیب ادیب ہوتا ہے، نہ وہ غیر ہندو ہوتا ہے نہ غیر مسلم۔ وہ ہندو۔ مسلمانوں کے لیے غیر ہوتا ہے اور عام لوگوں کے لیے ان کی اپنی آواز۔

⁂ ⁂ ⁂

آج جبکہ پورے ہندی ریاست کی جنتا، خاص طور سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہندی ریاست کی جنتا۔ بھیانک پسماندگی، معاشی بدحالی، غربت، بدحالی اور بیکاری میں جکڑی ہوئی ہے تب اس جنتا کی معاشی اور عوامی جدوجہد سے کترا کر ہمارے یہ ۱۰۔۱۱ ادیب جنتا کا کس طرح ساتھ دینا چاہتے ہیں؟ وہ بوڑھا اکرم جو چاہتا ہے کہ اس کا بیٹا حمید ایک ہی دن میں بڑھ کر جوان ہو جائے جس کی عمر راتوں رات سات سے سترہ سال ہو جائے اور وہ حمید ان سیاہ جلتے کرتوتوں کے جو اس کے گھر پریوار کو گھیرے ہوئے ہے آنسو وقت ہمارے یہ ادیب اس کی عمر کو بڑھنے سے روک کے رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ آج کی لڑائی میں وہ آٹھ سال بعد شریک ہو جب تک وہ دسویں تک اردو اور پڑھ لے۔ یا مجھے یہ بتا دیجئے کہ آپ کی نام نہاد اردو والے اپنی معاشی جدوجہد میں زیادہ موثر ہتھیار دے رہی ہے؟ وہ ہتھیار جو اس کی موجودہ زبان کے پاس نہیں ہے۔ اس کی موجودہ زبان ہندی ہے اور میں یہ پوری ذمہ داری سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ جسے یہ نام نہاد اردو والے ہندی زبان کہتے ہیں، وہ اس نام نہاد اردو سے زیادہ جدید موثر اور تیز طرار ہے۔ اردو ایک گلدستہ ہے ...... اسے دلی کے ملا صاحب بمبئی کے کرشن چندر صاحب اور حیدر آباد کے جج صاحب اپنے ڈرائنگ روموں میں سجا لیں ...... مجھے اعتراض نہیں کیوں کہ میرے اس دور میں کچھ لوگ روپیہ بھی سجائے بیٹھے ہیں۔

میرے دور کے ادیبوں اور میرے وقت کی مظلوم اور بدحال جنتا کو دغا دینے کا انہیں کوئی حق نہیں ہے کیونکہ ہمارے دور اور ہماری جنتا کی لڑائی کچھ اور ہے۔ یہ اردو اور ہندی بولنے والوں کی لڑائی ہے۔ ان اردو پرستوں کو جاننا چاہیے کہ یہ لڑائی زبان کی نہیں بلکہ معاشی سماجی اور بنیادی حقوق کی لڑائی ہے اور یہ لڑائی ہر زمانہ اور وقت میں لڑی جاتی ہے۔ صرف چناؤ کے وقت سیاسی حکمرانوں، سرمایہ داروں اور اقتدار پسندوں کے سامنے دم ہلا کر اور پنڈال میں قراردادیں پڑھ کر نہیں لڑی جاتی، یہ مشترکہ لڑائی ہے اور مشترکہ زبان میں لڑی جا سکتی ہے۔

اردو اور ہندی کا ادبی مسئلہ ...... سیٹھ گووند داسوں اور آنند نرائن ملاؤں کے ذریعہ اب حل نہیں ہوگا۔ اسے ہندی اور اردو کے ادیبوں نے بڑی حد تک سلجھا لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راہی، کرشن چندر سے بہتر سیٹھ گووند داس کی ہندی جانتے ہیں اور یہ سائی سیٹھ گووند داس سے بہتر کرشن چندر کی اردو جانتے ہیں یہ وقت اس نسل کا ہے جو ایک دوسرے کی ادبی زبان نہیں جانتی۔ اگر کرشن چندر ہندی جانتے ہوتے تو ان کی تخلیقات کے گمنام مترجم نہ ہوتے اور سیٹھ گووند داس اردو جانتے ہوتے تو اتنے متعصب نہ ہوتے۔

بہر حال کہنے کا مقصد یہ ہے کہ نئی نسل کے ذریعہ ادبی زبان کے دونوں روپوں کی قربت اور ایکتا کا جو دور چل رہا ہے اور نئی نسل جن عوامی نظریات اور جدوجہد کے لیے اپنی زبان کا استعمال کر رہی ہے اس کے بارے میں اب وہ لوگ بولنا بند کریں جن کے اپنے مفاد اور اپنی مجبوریاں نہیں

اور پڑھ چڑھ کر لپسنے کے لئے مجبور کرتی ہے اور جو اردو کو گلدستہ بنا کر رکھنا چاہتے ہیں اسے ہندوستان کی دوسری زندہ اور متحرک زبان کی دھارا سے الگ کاٹ کر اپنے نہلانے کے لئے بارڑی میں بند کر لینا چاہتے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ ایسے لوگ ادبی اردو کا زیادہ نقصان کر رہے ہیں۔ یعنی میرے ادب کا نقصان کر رہے ہیں۔

٭ ٭ ٭

اردو عربی یا فارسی خاندان کی زبان نہیں ہے۔ بلکہ اردو سنسکرت گھرانے کی زبان ہے لیکن آج اردو اور ہندی کی ادبی زبان نظریات میں وہی فرق ہے جو کیشو اور تلسی کی زبان اور نظریات و نقطۂ نظر میں ہے۔ تلسی نے عوام کے لئے لکھا اور کیشو نے رجواڑوں اور جاگیرداروں کے لئے اور آج اردو اور ہندی کے ادبی اسلوب کو لے کر بیس فیصد کا جھگڑا ہے وہ جھگڑا کیشو اور تلسی کی زبان میں بھی ہے لیکن اس سے کیشو اور تلسی دو زبانوں کے شاعر نہیں ہو سکتے۔ مجھے یہ کہنے کے لئے بھی معاف کیا جائے کہ غالب فارسی کے چاہے جتنے بڑے شاعر رہے ہوں غالب کی فارسی شاعری کا اثر نہ تو برصغیر ہند پر ہے اور نہ فارسی کے وطن ایران پر۔ وہ آج بھی ہندوستان کے اردو شاعر کی حیثیت سے دنیا میں جانے جاتے ہیں .... اور اسی کلام کے لئے جانے جاتے ہیں جو انہوں نے "ہندی" میں لکھا۔

اور یہ بات بھی ذہن میں رکھ لی جائے کہ جس اردو کی حمایت کے لئے آج جو یہ چند غیر مسلم ادیب کھڑے ہوئے ہیں اس کا استعمال وہ خود نہیں کر پائیں گے بلکہ ان کے ذریعہ ہوگا جو ہندو فرقہ پرست ہیں اور تحریری اردو کا استعمال دھڑلے سے کر رہے ہیں اور ان کے ذریعہ بھی ہوگا جو مسلم فرقہ پرستی میں آج بھی یقین رکھتے ہیں۔

اگر ہم اس دلیل کو بھی سامنے رکھیں کہ ہندوستانی اقلیت کے مذہب کی زبان اردو ہے اور اسے تسلیم کیا جائے تو یہ بھی غلط ہے کیونکہ اسلام کی بنیادی زبان اردو نہیں، عربی ہے۔ مذہب اسلام جب ترکی، فارسی، ہسپانوی، چینی اور منگولیں ختم نہیں ہوتا تو اس ہندی میں جس میں اردو شامل ہے کیسے ختم ہو جائے گا۔

اس بات کو بھی پرکھا جائے کہ تحریری اردو ہندوستانی اقلیتوں کی ثقافتی ضرورتوں کو پورا کرتی ہے تو یہ بھی اس لئے غلط ثابت ہوتا ہے کہ کیرل کے مسلمانوں کی ثقافتی ضرورت اردو نہیں ملیالم پوری کرتی ہے۔ کرناٹک کے مسلمانوں کی ضرورت کنڑ پورا کرتی ہے اور مہاراشٹر کے مسلمانوں کی مراٹھی، اتنا ہی نہیں کشمیر جیسی ریاست میں، جہاں اردو سرکاری زبان ہے وہاں غالب اکثریت مسلمانوں کی ثقافتی ضرورت کو کشمیری پورا کرتی ہے، اردو نہیں۔

ہاں اگر آپ یعنی یہ چند تحریری اردو والے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اردو الگ الگ ریاستوں میں آباد اور انہیں ریاستوں کی زبانیں بولنے والوں کے لئے الگ سے ایک قومی زبان کا رول ادا کرتی ہے تو صاف صاف کہیے کہ بھارت میں بھارتیہ قوم ہی نہیں ایک اور قوم بھی رہتی ہے اور اس کی قومی زبان اردو ہے۔ تب علاقوں کا جھگڑا کیوں اٹھاتے ہیں۔ سیدھے سیدھے دوسری قوم کا مسئلہ اٹھائیے اور صاف ہو کر سامنے آئیے کہ اردو لو انڈر میندار مسلمانوں اور نوابی دور میں عوام کا خون چوس کر رئیس بنے

والے کائستھوں اور کھتریوں کی ایک الگ اردو قوم ہے۔

آج جبکہ تحریری اردو اپنے صحیح گھرانے میں شامل ہو رہی ہے جب وہ عالم شاہ خان کے ذریعہ راجستھان کی بولیوں، راہی کے ذریعہ اودھی، مہرالنساء پرویز اور ستائی کے ذریعہ بستر کی بولیوں اور ظہیر نیازی کے ذریعہ بھوجپوری، اصغر وجاہت کے ذریعہ برج قنوجی اور حبیب تنویر کے ذریعہ چھتیس گڑھی سے اپنی ادبی توانائی اور الفاظ و محاورات لینے لگی ہے تب تحریری اردو کے حامی یہ زمیندار اور جاگیردار کس سرچشمہ سے اردو کا رشتہ جوڑنا چاہتے ہیں اور کس اردو کی وکالت وزراء اعلیٰ اور وزیر اعظم کے پاس جا جا کر کرتے ہیں؟ صاف طور سے کہئے کہ ہم اپنی بولیوں اور دوسری ہندوستانی زبانوں کے الفاظ قبول نہیں کریں گے۔ ہم الفاظ کے اسی ذخیرہ سے کام چلائیں گے جس میں فارسی اور عربی کے الفاظ ہیں اور یہ کہ ہمیں عوام کی روحانی، سماجی، معاشی اور سیاسی جدو جہد سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، ہم ماضی ہی میں رہیں گے۔ حال میں قدم نہیں رکھیں گے اور مستقبل سے نظریں نہیں ملائیں گے...... اور جہاں تک ہمارا زور چلے گا ہم اردو کے نام پر اس پسے ہوئے اقلیتی گروہ کو اپنی سیاست کا ادنیٰ مہرہ بنا کر وزیروں اور بادشاہوں کی خاطر پٹواتے رہیں گے۔ اور یہ شاہی کھیل چلتا رہے گا۔ میں ان کھیلنے والوں سے درخواست کروں گا کہ میری بات بری لگے تو پریم چند کی "شطرنج کے کھلاڑی" کہانی ایک بار پڑھ لیں۔

ہندی اور اردو کا یہ مسئلہ بہت حد تک نئے ادب نے سلجھا دیا کیونکہ وہ اور عوامی شعور کا آئینہ دار ہے جس طرح اجارہ داروں پونجی پتیوں اور نیتاؤں نے ہندوستان کے اندر اپنا ایک اور ہندوستان بنا رکھا ہے۔ کچھ اس طرح "انگریزی مفاد پرست" طبقہ کے انداز سے یہ "اردو مفاد پرست" طبقہ نمودار ہوا ہے۔ جو صرف بکھرتے اور لوٹتے ہوئے درمیانہ طبقہ کے لئے اردو کی وکالت کرتا ہے بغیر سوچے ہوئے کہ اس سے ہمارے عام آدمی کا کتنا نقصان ہو رہا ہے......... ہمارے محنت کش اور کسان طبقہ کو کس قدر نقصان پہونچ سکتا ہے۔

وہ عوام جس عوامی زبان کو فطری طور پر پروان چڑھا رہے ہیں اور اپنی بولیوں سے توانائی حاصل کر کے ہندی کو سرکاری ہندی اور ہندی پنڈتوں سے بچاتے ہوئے ایک زیادہ صحت مند اور قدرتی زبان کو جنم دے رہے ہیں، ایسے ہی ادبی اردو کا بھی وسیلۂ اظہار بننا چاہئے۔ ادبی ہندی اسے اپنانے میں پہل کر چکی ہے۔ ہندی کا نیا ادب ــ شاعری اور کہانی ــ اس کی مثال ہے۔ اب سوال ــ بنارس، الہ آباد، لکھنؤ، دلی، بھوپال، رامپور، حیدرآباد جیسے شہری ہندی یا اردو زبان کی صفائی اور لہجہ کا نہیں رہا ہے...........................

.... یہ وقت زبان کو بچانے کا نہیں، زبان کو جنتا کی آواز سے جوڑ دینے کا ہے۔ اور انجام کار یہ مان لینے کا ہے کہ ادیب زبان نہیں بناتا، زبان کو جنتا بناتی ہے۔ ادیب اس کا استعمال عوام کے حق میں کرتا ہے اور جب ادیب اس قدر انانیت پسند ہو جاتا ہے کہ وہ جنتا کو زبان دینے لگتا ہے تو عوام اپنے نئے ادیب پیدا کرتے رہیں اور زبان کے جمود کو توڑتے ہیں۔

کملیشور نمبر

اپنے اردو کے ان پرانے ادیب دوستوں سے میری درخواست ہے کہ جنتا کے لئے زبان کی مانگ نہ کریں، اپنے لئے جنتا سے زبان مانگ کر لائیں۔ جن ہندی والوں نے سرکار سے ہندی بھاشا مانگی تھی ان کے ہاتھ کون سی ہندی آئی ہے۔ اس پر بھی غور کر لیں۔ ڈاکٹر رام بلاس شرما کے ایک مضمون "ہندی کا سنسکرتی کرن" سے ایک مثال دینی کافی ہوگا۔ اس ہندی کا جو سرکاری عنایات سے بنائی گئی ہے جس کے الفاظ کی ترتیب ڈاکٹر رام بلاس شرما نے دی ہے۔ ایک "ابھیرجنت" ویکتی اپنے "ابھیر جکب" پر "ابھیوگ لگاتا ہے اور "ابھیر جکب" کا متر "اپچے" کرتا ہے۔ آپ عدالت میں "پرتیا کھیان" کرتے ہیں، وکیل "اپیئے" کی "ابھی یوکتی" کرتا ہے، اتنے میں ہی ایک "اپ نیلں" کا مقدمہ پیش ہوتا ہے لیکن مقدمے کا "نپٹن" ہو جاتا ہے یا "ویکر لشیٹ" ہو جاتا ہے۔ آپ کا "ابھی کرتا" شپتھ پتر دیتا ہے جس سے پھر ونیت ویکرشن" ہوتا ہے۔"

یہ بھی صحیح ہے کہ ہندی جنتا نے اس ہندی کو قبول نہیں کیا ہے اور یہ بھی طے کیا کہ اگر سرکار کسی دن ہندی کو اپنے کام کاج کی بھاشا کے روپ میں مانے گی تو اسے وہی بھاشا لینی ہوگی جو جنتا طے کرے گی ہمارے اردو کے احباب ہندی کے اس تجربے سے بھی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے اتنا اگرچہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

ہمارے یعنی پورے ہندی پردیش کی ایک بھاشا ہے جس کے ادبی روپوں کو عام جنتا کے حق میں مستحکم ہونا ہے۔ اگر اس ضرورت سے اردو کے ہندو یا مسلمان ادیب انکار کرنا چاہتے ہیں تو دوسری بات ہے۔ میں بہت ہی عاجزی سے یہ کہنا چاہوں گا کہ ایسے نام نہاد ادیبوں کی پرواہ ہندی اور اردو کی وہ نئی نسل نیا عوامی ادب نہیں کرتا۔ جو ایک صحیح راستے پر کافی آگے نکل چکا ہے......اور یہ راستہ آج سے نہیں بہت پہلے سے طے ہو چکا ہے اس وقت سے جب غالب نے اردو کی صنعت گری کی روایات کو توڑا، جیسے حالی نے پروان چڑھایا، جب تلسی نے عوامی زبان میں تخلیق کی، جب نظیر نے (حالی سے بھی پہلے) اپنے عوام کی زبان میں بات کی، جب میر نے کہا ہے

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے مائی

آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی ـــــ

اور حالی کے ساتھ ساتھ بھارتیندو، پرتاپ نارائن مشرا اور بال مکند گپت نے ایک صحیح وراثت دی، پریم چند تک آتے آتے یہ مسئلہ تحریری اور ادبی کاوشوں کی سطح پر بہت حد تک صاف ہو گیا تھا کہ ہندی پردیش کی جنتا کی بھاشا کیا ہوگی اور اس کی طاقت کا منبع کیا ہوگا۔

(آج کی ہندی، باوجود کچھ ہندی ادیبوں کے ترقی پذیر شکل ہے جو بھارتیندو اور پریم چند، ناگر، ناگارجن سے ہوتی ہوئی آج کی نئی پود کے باصلاحیت اور توانا ادیبوں تک آتی ہے۔

جس خوفناک سیاسی اور سرمایہ دارانہ سازش کا شکار پورے ملک کے عوام ہوئے ہیں، خاص طور سے جس کے شکنجہ میں ہندی پردیش کا عام آدمی تڑپ رہا ہے اس عام آدمی کے دکھ درد کی ترجمانی اور اظہار کے لئے ہمیں وہ زبان چاہیے جو ان کی تکلیف کو ہندی اور اردو تکلیف میں نہ بانٹ دے بلکہ دکھ درد سے کراہتے لوگوں کی ایک زبان میں بولنے کی تاریخی ضرورتوں کو پورا کرے۔ اردو کے نام پر خود غرض اور خود پسند زمینداروں جاگیرداروں

کی خاطر سنگوفے نہ چھوڑیئے۔ آتش بازی نہ کیجئے .... اردو کے اکیلے چراغ کی بات نہ کیجئے ....
آپ اگر صحیح محنت کش عوام کے ساتھ ہیں تو ان کے پاس چلئے اور دیکھئے کہ انہیں کس زبان کی ضرورت ہے،
انہوں نے کونسی زبان وضع کی ہے۔
اپنے اکبر الہ آبادی کے چند اشعار یاد آتے ہیں۔

پڑا ہے قحط بشر مر رہے ہیں فاقوں سے
خوشی ہو کیا مجھے شبرات کے پٹاخوں سے
بجھی ہوئی ہے طبیعت، یہ روشنی ہے فضول
اتار لیجئے صاحب چراغ طاقوں سے

⁘ ——— ⁘ ——— ⁘

--- یہ سیاست بڑی گھٹیا چیز ہے۔ اس میں صرف چیزوں کو بخوبی استعمال کیا جاتا ہے۔ باڑھ آتی ہے تو اسے استعمال کیا جاتا ہے، سوکھا پڑتا ہے تو اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ کہیں کوئی لڑکی بھاگ جائے تو اسکے بھاگنے کو استعمال کیا جاتا ہے ... کوئی مر جاتا ہے تو اس کی موت کو استعمال کیا جاتا ہے —
حد تو یہ ہے کہ ان سیاست دانوں نے آدمی کے آنسوؤں اور جذبات تک کو نہیں چھوڑا، اس کی امیدوں اور خوابوں تک کو نہیں بخشا۔
اس سے زیادہ گھٹیا بات اور کیا ہو سکتی ہے ... کملیشور

کہانی
اور
کہانی کار

★ مجھے جن تکلیفوں نے ستایا ہے، انھیں لے کر
جب جب میں نے جو کچھ لکھ پانے کی کوشش کی ہے
وہی مجھے صحیح لگتا ہے اور جو کچھ صحیح ہے، وہی
عزیز بھی ہے۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ تکلیف
اور کرب کے ان لمحوں کو "عزیز" کہنا پڑتا ہے

مجھے کردار نے کبھی کہانی نہیں دی ہے۔ مجھے ہمیشہ ان کے حالات
نے ہی کہانیاں دی ہیں۔ اگر کوئی کیریکٹر کہانی ہو گئی ہے
تو وہ میری تحریر کا عجز ہے۔ لیکن جان بوجھ کر اپنے
کرداروں کو میں نظر انداز بھی نہیں کرتا۔

کیونکہ سچائیاں اتنی اکہری نہیں
ہیں۔

کملیشور

بمل متر

ہندی کا ڈیکنس

بمل متر بنگلہ کے معروف و مستند ادیب ہیں۔ آپ کی کلکتہ میں، ۱۹۱۲ء میں ہوئی۔ وہیں سے آپ نے بنگلہ ادب میں ایم اے کیا۔ لکھنا پڑھنا ہی آپ کا مشغلہ ہے۔ تیس ۳۰ سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

کہانی کے معاملے میں بمل متر نے بنگلہ ادب کو ایک نیا رُخ دیا ہے۔ ۱۹۶۴ء میں آپ کو رابندر ادبی ایوارڈ کا انعامات سے نوازا گیا ★

ادیب کملیشور کو میں شروع سے جانتا ہوں۔ ان کو میں نے مختلف روپوں میں دیکھا ہے۔ کلکتہ کے ایک ادبی اجتماع میں ان کی تقریر کو سن کر میں بے خود ہو گیا۔ اس وقت میں ایک معمولی اخبار کا ایڈیٹر تھا۔ میں نے ان کی ایک کہانی کا بنگالی زبان میں ترجمہ کر کے شائع کرنے کی غرض سے ان کی اجازت حاصل کرنے کے لئے خط لکھا۔ اس کہانی کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ ادیب لکیر کا فقیر نہیں ہے بلکہ اس کا اپنا ایک الگ طریقہ ہے ایک ایسا طرزِ فکر ہے جو سب سے جداگانہ ہے۔ بحیثیت ایڈیٹر "ساریکا" جب وہ کلکتہ آئے تو مجھ سے ادب سے متعلق بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو ہوئی۔ ان کی گفتگو سے مجھے ایسا لگا کہ ہندی ادب میں اب تک جو طرزِ فکر رائج ہے، کملیشور میں اسے نیا رخ دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسی وجہ سے میں انھیں باغی ادیب مانتا ہوں۔ جسے انگریزی میں voice of dissent کہتے ہیں۔ کملیشور رسم و روایات کے مخالف (جو ادب کے لئے فالِ نیک ہے) اور موجودہ تہذیب و تمدن سے مطمئن نہیں ہیں۔

"Dissatisfaction in a writer, is always an element of talent."

جس طرح کملیشور بذاتِ خود متحرک ہیں اسی طرح ان کا ادب بھی ہے۔ ان کے یہاں تحریر میں صرف ایک تصور نہیں ہوتا ہے۔ میں ادب کو ادب ہی مانتا ہوں۔ جس طرح فرنچ کیمسٹری، جرمن کیمسٹری، انگلش کیمسٹری، بنگلہ کیمسٹری یا ہندی کیمسٹری کوئی الگ چیز نہیں ہوتی۔ ویسے ہی فرانسیسی ادب، جرمن ادب، انگریزی ادب، بنگلہ ادب یا ہندی ادب کوئی الگ الگ چیزیں نہیں۔ اس لئے میں نے لکھا کہ ادب، ادب ہی ہوتا ہے۔ اسی ادبی زاویۂ نگاہ کی بنیاد پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ کملیشور، حقیقتاً صرف ہندی کے ادیب نہیں ہیں بلکہ عالمی ادیب ہیں۔ مجھے ان کی تمام تصانیف پڑھنے کا موقعہ نہیں مل سکا ہے۔ دنیا میں دو قسم کے ادیب ہوتے ہیں ایک Prophet اور دوسرے Preacher۔ شکسپیئر کو Prophet کہا جاتا ہے اور ڈیکنس کو Preacher ــــــ رابندر ناتھ ٹیگور کو بنگلہ کا Prophet کہا جاتا ہے جبکہ سرت چندر Preacher ہیں۔ پانچ چھ صدیوں میں کوئی ایک Prophet ظاہر ہوتا ہے، جیسے تلسی داس اور ٹالسٹائی وغیرہ۔ لیکن پریم چند ایک صدی میں دو تین پیدا ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک کملیشور جی

ادب کے ڈکینس ہیں۔ ان کی تحریر میں کسی بات کی تکرار نہیں پائی جاتی ہے۔

آفتاب ایک ہونے کے باوجود ہر صبح اس کی نئی زندگی ہوتی ہے۔ کملیشور ایک ہی ہونے کے باوجود بھی ہر کہانی میں ایک نیا کملیشور نظر آتا ہے۔

پچھلے تین ہفتوں سے میں اپنی علالت کی وجہ سے ڈاکٹروں کی قید میں ہوں۔ الفاظ و خیالات میرے ہیں اور قلم دوسرے کا ہے۔ اگر زندگی نے موقع دیا تو مستقبل میں کملیشور کے سلسلے میں اور کچھ لکھوں گا

ترجمہ :۔ ظہیر عباس رضوی۔

کملیشور صاحب کی میں نے جتنی کہانیاں پڑھی ہیں، انہوں نے مجھے چونکا دیا ہے، اور بہت متاثر کیا ہے۔ ان کے فن میں بڑی تازگی اور گہرائی ہے۔ کملیشور کی اور نئی کہانیاں پڑھ کر ان کے فن کے بارے میں لکھنا چاہتی تھی۔ آپ ان پر اتنا بڑا کام کر رہے ہیں جو کملیشور کے چاہنے والوں کیلئے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کملیشور کے فن اور شخصیت کو خراج تحسین پیش کرنے والوں میں مجھے بھی شامل کر لیجئے

جیلانی بانو

شوری راجن

صرف ہندی کا ادیب نہیں

شوری راجن، تمل کے منفرد ادیب ہیں۔ جنہوں نے اوریجنل اور طبعزاد لکھنے کے علاوہ ترجمے بھی کئے ہیں۔ آپ کی تخلیقات میں گھریلو اور سماجی کشمکش کی جھلک ملتی ہے۔

★

ایک تجربہ کار شاعر نے بہت پہلے کہا تھا "سچی بات چاہو تو کہہ لو۔ میٹھی بات بھی خوشی سے بولا کہو۔ لیکن بھول کر بھی کڑوی سچائی ظاہر نہ کرو"۔

اس دنیاوی نصیحت کا کمٹیڈ رائٹروں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ کڑوی سچائی کسی بھی قیمت پر ظاہر ہی کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ یہی ان کی بدنامی کی وجہ ہے۔ زیادہ بدنام ہونا آج کل اچھے مضمون نگار کی شناخت ہے۔ کچھ بقلم خود لوگوں نے جو اپنے آپ کو ادیب کہتے ہیں یا سمجھتے ہیں نیز ادیبوں جیسی شکل و شباہت بنائے پھرتے ہیں، دوسروں کو بدنام کرنے کا بیڑا اٹھالیا ہے۔ راہل۔ سنکر تائن۔ مکتی بودھ۔ یشپال جیسے ادیبوں کے ساتھ اسی قسم کی بدسلوکی ہوئی ہے اور اب "کملیشور جیسے عوامی، ترقی پسند اور انقلابی ادیبوں کے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ کملیشور سے کڑھنے کی صرف یہی وجہ نہیں ہے بلکہ اور دوسری وجوہات بھی ہیں۔ مثلاً وہ تیز طرار اور ہرفن مولا بھی ہیں۔ اعلےٰ درجے کے ادیب کی پہچان اس کے صحیح افکار و نظریات، انسانی برادری کے لئے اپنے دل میں درد لئے اور عوام کے مفاد کے لئے خوبصورتی سے اس فکر و نظریئے اور پیغام کو سماج کے سامنے پیش کرنے سے ہوتی ہے۔ اسے زبان پر کافی عبور حاصل ہے، اپنے زمانے کا شعور، ماضی کے بارے میں غیر متزلزل رائے اور مستقبل کے بارے میں فیصلہ کن رجحان ہے، وہ اپنے ہم سفروں کی آرام طلبی سے مفاہمت نہیں کرتا۔ بلکہ اعتماد اور استقلال کے ساتھ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا ہے۔ افسانوی ادب کی تخلیق کو نیا رخ دیتا ہے، اس کا ہر قدم نیاپن اور مثال پیش کرتا ہے، وہ اپنے اندر مختلف روپ کو جذب کرتا ہوا اور ہر روپ میں کامیاب ہوتا ہوا بڑھ رہا ہے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر کملیشور کے دوست، دوست نہ رہے، دشمن، دشمن نہ رہے، ساتھی ساتھی نہ رہے۔ وہ ایک پہیلی ہیں تو دوسری طرف صاف ستھرا ورق ہیں۔ ان کی تخلیق ایک ایماندار، ہوشیار اور ہر دلعزیز ادیب کی طرح شالی ہے کملیشور اپنے طرز فکر میں نرالے ہیں، پچھلے کی پرواہ نہیں کرتے اور مقابلے میں اتنا کس بل نہیں کہ اس کا سامنا کریں، آنکھیں ملائیں۔

بحیثیت ادیب کملیشور کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کی مشہور کہانی "راجہ نربنسیا" شائع ہوئی تھی۔ تبھی سے میں ان کا مطالعہ کرتا آرہا ہوں۔

نقالوں کے چہروں پر پڑی نقاب کو ہٹایا۔ عیاش مردوں کو دفن کر دیا۔ قدامت پرستوں کی کمر توڑی اور ساتھ ہی بہترین کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ اچھے ناولوں کے ساتھ ساتھ سفر نامہ میں چار چاند لگائے "پیرلینا" کھول کر رکھ دیا۔ فلمی چمک بھی دکھائی۔

انھیں روبرو دیکھنے اور پہچاننے کا موقع چار سال پہلے ملا۔ اس کے بعد اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں بارہا ساتھ ہی قیام بھی ہوا، گپ شپ اور ادبی بحث و مباحثہ کی محفلیں گرم ہوئیں۔

جب کبھی کملیشور کو دیکھتا ہوں وہ مجھے کسی دکھنی کسان کا جوان بیٹا معلوم ہوتا ہے۔ ویسی ہی زندہ دلی، محنت پرستی، سادگی، چالاکی، جذباتیت، حوصلہ مندی، خود اعتمادی، خوش مزاجی اور تہذیب کا پیکر نظر آتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ صرف ایک افسانہ نگار ہی ہے لیکن آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ کسی بھی موضوع پر گفتگو کر کے دیکھئے۔ صرف ادب ہی نہیں ادب کی بات ہی چھوڑیئے۔ باورچی خانوں میں بننے والے انواع و اقسام کے کھانوں کے بارے میں پوچھئے۔ دیکھئے طرح طرح کے کھانوں کی خاصی بڑی فہرست آپکے سامنے رکھ دینگے۔ اس کے علاوہ آپ جس موضوع پر بات کریں گے یعنی عدالتی، موجودہ سائنسی ترقی، کھیت، کھلیانوں، خوبصورتی غیر ملکی سیاست، فلمی دنیا، کھیل کود وغیرہ۔ کسی موضوع کو بھی چھیڑیئے گے، آپ کو بور کئے بغیر دو تین گھنٹے آسانی سے گزار دینے کی ان میں صلاحیت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قلم کے کسان کملیشور صرف ہندی کے ادیب کہہ کر ٹالے نہیں جا سکتے۔ ویسے ان کی تخلیقات دوسری ہندستانی زبانوں میں بھی منتقل ہو چکی ہیں اور شائع ہو رہی ہیں۔ تمل میں ان کے افسانوں کے مجموعے کی اشاعت کا میں نے ذمہ لیا ہے۔ مستقبل میں ہر زبان کملیشور کو پا کر فخر کریگی۔

کملیشور جیسے عوامی، کمیٹیڈ، ترقی پسند، انقلابی اور مجاہد ادیب کی کوئی حد نہیں ہوتی، نہ زبان کی، اور نہ علاقوں کی، وہ ہر ایک کا ہر جگہ کا ادیب ہے۔

ترجمہ: ظہیر عباس رضوی

پی این بھٹاتیری

انفرادیت کے ساتھ "بہت کچھ"

ملیالم زبان کے ادیب ہیں مگر انھیں بیک وقت تمل، کنڑ، ہندی اور اردو پر بھی دسترس حاصل ہے اس لئے ساہتیہ اکاڈمی اور نیشنل بک ٹرسٹ کی ایما پر آپ مندرجہ بالا زبانوں کے ادب پاروں کو ایک دوسری زبانوں میں منتقل کرتے رہتے ہیں۔ بھٹاتیری کئی زبانوں کے ماہر ہیں اس لئے انھیں کیرلا ہندی پرچار سبھا کے سیکریٹری اور انتظامیہ کے منتظم بھی ہیں۔ اس سبھا کے ثقافتی اور ادبی جریدہ، بھارت وانی کی ادارت کی ذمہ داریاں بھی آپ ہی کے سپرد ہیں۔

بھائی کملیشور ماہر کہانی نویس ہیں، اعلیٰ درجہ کے ناول نگار ہیں، با اثر ادیب ہیں، باصلاحیت ایڈیٹر ہیں اور ٹی وی کے کامیاب پروڈیوسر ہیں... ہاں وہ ویسے "بہت کچھ" ہیں۔ ویسے "بہت کچھ" رائے تو اور بھی ہیں۔ کسی کتب خانہ میں جائیے گا، کسی جلسے اور ادبی اجتماع میں جھانکئے گا تو ان "بہت کچھ" والوں کی نمائش سے بچ نکلنا آپ کے لئے ناممکن ہوگا، مشکل ہوگا۔ مگر بھائی کملیشور، "بہت کچھ" ہونے کے ساتھ ساتھ "اور کچھ بھی ہیں۔ یہی اور "کچھ" نہیں -------"بہت کچھ" والوں سے ان کو الگ صرف الگ نہیں -- ایکدم الگ کھڑا کر دیتا ہے۔

کملیشور ایک آئیڈیالوجی کا۔ اصول کو نیا جنم دینے کا نام ہے، یہ کوئی غیر مرئی اصول نہیں، ایکدم مرئی، اسی دھرتی سے جڑا ہوا اصول ہے۔ اس کی روشنی چمک گئی تھی۔ بزرگ پریم چند کے زمانے میں۔ اسے آگے لے جانے کی کوشش بھی بھرپور ہوئی تھی۔ مگر اسے دبوچ لیا۔ بیرونی ملکوں سے آئے بیمار اصولوں نے پھر کیا تھا۔ بہت دنوں تک ان ہی کا بول بالا رہا (آج بھی ہے) نئے ادیب... انجانے میں ہی ان کی بنائی ہوئی لکیروں پر انگلی پھیرنے لگے۔

شعور کی رو، دہشت پسندی، انفرادیت پسندی کے، کامپلکس کے نہ جانے ایسے کتنے ہی نگیٹو اور منفی نظریات کے شکار ہوکر، بھولے بھٹکے اندھیرے میں ٹٹولتے پھر رہے ہیں، وہ گویا اپنی منزل اور سمت گنوا بیٹھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انھیں گمراہ کر دیا گیا۔ وہ سمجھ نہیں پائے کہ ان کی بنیادی وجوہات کچھ اور تھیں، جب تک سماج میں وہ اسباب موجود رہینگے۔ کامپلکسیز اور انفرادیت کا جال پھیلا رہیگا۔ یہ عناصر نہ صرف باقی رہینگے بلکہ پھولتے پھلتے رہینگے۔ کچھ خاص عناصر چاہتے بھی یہی ہیں۔ یہ نہیں چاہتے کہ ادیبوں کی نئی پود جاگے، بنیادی اسباب کو پہچانے اور ان کو مٹانے کے لئے لڑے۔

مگر ایسے ہی خطرناک موڑ پر بھائی کملیشور میدان میں اترے اور نئی نسل کی صحیح رہنمائی کی۔ خوف، گھٹن، دہشت پسندی کو لے کر صرف رونے اور بلکنے سے کام نہیں چلیگا بلکہ ایسے حالات پیدا کرنے والوں کو بے نقاب کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہ عناصر سماج کے ہر طبقے میں اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کر رہے

رہی۔ اسی لئے شروع میں کہا گیا کہ بھائی کملیشور ایک آئیڈیالوجی اور ایک اصول کو نئی زندگی دینے کا نام ہے اور یہی انھیں اور بہت کچھ "والوں سے منفرد بنا دیتا ہے۔ اس کی زندہ مثال سماتنتر کی ادبی تحریک کی شکل میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔ جس کے ذریعے نئے ادیبوں کی ایک ایسی فوج تیار ہو گئی ہے' جو گرتی، لڑھکتی یا روتی نہیں، بلکہ اٹھتی' لڑتی اور بڑھتی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔ یہی چیز بھائی کملیشور کی سب سے بڑی دین مانی جائیگی۔

راقم الحروف' بھائی کملیشور کا کہانی کے زمانے سے ہی تعاقب کر رہا ہے لیکن وہ اب

جو رول ادا کر رہے ہیں وہی ہمیں سب سے زیادہ اہم لگتا ہے۔

کچھ لوگ ناراض بھی ہونگے۔ کیونکہ وہ بھولے بھالوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ انھیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو۔ یہ سماتنتر تحریک ایک گروہ ہے اور جانبدار ہے۔ ہونے دو' مفاد پرستوں کا گروہ ہو سکتا ہے تو اس کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں کی گروہ بندی کیوں نہیں ہو سکتی؟ ۔ ان کی جانبداری اچھی اور ان کی اتنی بری؟ ایسا کیوں؟ ایسے میں سماتنتر ادیبوں کی ذمہ داریاں بڑی ہیں۔ مناسب موقع ملنے پر بھائی کملیشور اور ان کے تمام ساتھیوں کی ذمہ داریاں بھی بڑھی ہیں۔

اب تک بھائی کملیشور کی نگرانی میں' ملک کے الگ الگ مراکز میں ادیب یکجا ہوئے اور کسی ٹھوس نتیجے پر بھی پہنچے۔ یہ کم اہم بات نہیں ہے۔ اس کے لئے زبردست تنظیمی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہاں بھائی کملیشور' تمہارا راستہ صحیح ہے' آگے بڑھتے رہو' اپنے نیم فوجی ساتھیوں کو لیکر۔ ہمیں پورا بھروسہ ہے کہ آپ کے ہاتھ کا قلم بیساکھی نہیں ایک تیز تلوار ہے۔

ترجمہ: سعود الیوبی

جسونت سنگھ وردی

آئس برگ

جسونت سنگھ وردی

(پیدائش ۷ مئی ۱۹۱۴)

پنجابی کے مشہور کہانی کار ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں اپنے دور کی صحیح ترجمانی کی ہے اور اپنے عہد کے لوگوں کے دکھ کو اپنا دکھ بنا کر اپنی کہانیوں اور ناولوں میں پیش کیا ہے جو اردو اور ہندی میں بھی چھپتے ہیں ★

جہاں کہیں بھی قہقہہ سب سے اونچا ہو وہ کملیشور ہی ہوتا ہے، وہ صرف قہقہہ ہی نہیں ایک دھڑکن بھی ہے۔

یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ کملیشور کا قد کتنا ہے، مگر اسے چھوٹے قد کا نہیں کہا جا سکتا۔ ہمارے یہاں ایک کہاوت مشہور ہے کہ "لمبے آدمی کی پرچھائیں چھوٹی ہوتی ہے"۔ اور چھوٹے قد کے بارے میں؟

صاحب کملیشور جتنا زمین کے اوپر ہے اس سے تین گنا سے بھی زائد وہ زمین میں ہے اور اس طرح کے لوگ زمین پر کبھی بھی پھسلتے نہیں، ان کے قدم بھی نہیں اکھڑتے۔ بلکہ اور بہت سے لوگ ان کے تیور کو دیکھ کر اعتماد کی روشنی حاصل کرتے ہیں... بس کملیشور ایسا ہی انسان ہے۔

کئی بار جب تند طوفانوں میں نیلا سمندر میری آنکھوں کے سامنے تھرکتا ہے تو اس کے اوپر چمکتا ہوا آئس برگ کا چہرہ... مجھے تو کملیشور کا ہی چہرہ نظر آتا ہے... جو لوگوں کی خاطر، ادیبوں کے لئے تل تل کر کے گھر رہا ہے... مگر اس کا احساس۔

کملیشور نے مجھے سوچ میں ڈوبا ہوا دیکھ کر کہا... کیا سوچ رہے ہو؟ پھر ہنس کر کہنے لگا۔ "میں تو یہ جانتا ہوں کہ وہ لمبا آدمی ہمارے برخلاف سورج کے زیادہ قریب ہوتا ہے، اس لئے وہ جلدی سے پگھل جاتا ہے"۔

قہقہے اور قہقہے۔

اس وقت کملیشور کا مخصوص قہقہہ پوری فضا میں بکھر کر رہ گیا تھا۔

★★★

میں دیکھ رہا ہوں کہ کملیشور جلدی میں رہتا ہے، بھیڑ میں چلتا ہوا بھی وہ جلدی سے اپنا راستہ بناتا آگے بڑھتا جا رہا ہے، جیسے بھیڑ اس کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی ہو۔ اس لئے اسے لاکھوں کی بھیڑ میں بھی پہچانا جاتا ہے۔ کہانی میں بھی وہ منفرد ہے مگر اس کی کہانی میں معجزاتی یا حیرت انگیز واقعہ یا انہونی بات بالکل نہیں ہوتی۔ پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ کملیشور اپنے ہم وطنوں کی دھڑکنوں

میں کہیں گہرائی میں سمایا ہوا ہے، میں ان دھڑکنوں کو محسوس کرنے کے لئے بڑی شدت سے احساس دلا رہا ہے۔ اس کی کہانیوں میں ہندستانی زندگی کا عکس ہی نہیں بلکہ ان کہانیوں میں لوگوں کی روح روحانی تڑپ اور دل کا درد میں سمایا ہوا ہے۔

★ ★ ★

اس دن میرے پڑوس کی لڑکی توشی جب کملیشور کی کتاب "بیان" لوٹا کر گئی تو میں نے دیکھا کہ کتاب کے حاشیہ پر جگہ جگہ رائے لکھی گئی ہے۔ "فیصلہ" کہانی پر اس نے لکھا تھا۔ کملیشور اپنے کرداروں کو بلیک اینڈ وہائٹ میں پیش کرتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح حقیقی زندگی میں ہوتے ہیں۔ کہانی "راتیں" کے حاشیہ پر لکھا تھا فیشن ایبل چیزیں جلد بک جاتی ہیں... وہ دلکش بھی دکھائی دیتی ہیں... مگر لوگوں کے تئیں سچا رہنا میرے نزدیک... کملیشور کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

پہلے ایک دن توشی نے "نیلی جھیل" پڑھ کر مجھ سے کہا تھا "کملیشور کی تخلیقات انسان کی فطرت کو اچھی طرح سمجھنے میں مدد پہنچاتی ہیں... ایک لمحہ کے توقف کے بعد وہ مسکرائی اور پھر بڑی سنجیدگی سے کہا" اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے"۔

میں نے صرف اتنا ہی کہا تھا۔ "توشی! یہ کہانیاں، رومانس کی بھول بھلیاں نہیں بلکہ تلخ حقیقت کی خاموش آوازیں ہیں جو باہر کی بجائے اندر پہنچ کر زیادہ جھنجھوڑتی ہیں کہ ہم کچھ کر کیوں نہیں پاتے... اس لئے انھیں پڑھنا دلیروں کا کام ہے۔

★ ★ ★

یہی وجہ ہے کہ ہندی کہانی کی دنیا میں پچھلے بیس برسوں میں اتنی آندھیاں اور طوفان چلے ہیں۔ مگر کملیشور کسی زلزلہ میں بھی نہیں ہلے۔ کیونکہ بنیادی طور پر وہ عوام سے تعلق رکھنے والا افسانہ نگار ہے۔ عوام کے قریب رہنے والے ادیب کو موضوع کی کمی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیوں میں بھرپور تنوع اور رنگارنگی ہے۔

اور زبانوں کے بارے میں میں کم جانتا ہوں، مگر میں نے دیکھا ہے کہ کملیشور ہندی کی طرح پنجابی میں بھی مقبول ہے۔ کچھ رسالے کملیشور کی کہانی کے ترجمے، مترجم کے نام کے بغیر چھاپ دیتے ہیں جس سے ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ کملیشور اب ہندی کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی لکھنے لگا ہے۔ ہندی کے کچھ ادیب جو پنجابی بھی پڑھتے ہیں، پوچھتے ہیں "بھئی کملیشور ہندی کا ادیب ہے یا پنجابی کا؟" اس طنز کے پیچھے ان کی تنگ نظری جھلکتی ہے۔

★ ★ ★

میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ کملیشور کی کہانیوں میں بڑا تیز طنز ہے جسے سمجھنے کے لئے بڑے شعور کی ضرورت ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دنیا بھر کے اسلحے لوگوں کو تباہ کرنے کے لئے ہیں، مگر طنز کا ہتھیار لوگوں کو زندگی بخشنے کے لئے ہے۔ یہ سچائی ہر ادیب کو میسر نہیں ہوتی، مگر کملیشور اس دولت سے مالامال ہے۔ اب اسے کسی اور بینک بیلنس کی ضرورت نہیں ہے۔

★ ★ ★

کملیشور اپنے یا اپنی کہانیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ وجہ؟ لوگ مجھ سے ملینگے، مجھے جان لینگے اور اپنی کہانی کے بارے میں میں کیا کہوں؟ پڑھ کر دیکھ لیجئے۔

مگر جب میں نے اسے کچھ نہ کچھ کہنے کے لئے مجبور کیا تو اس نے کہا۔ "کہانی لکھنا میرا پیشہ نہیں، ایمان ہے، زندگی کے جھمیلوں کو ایک کلرک یا دوکاندار بن کر بھی جھیلا جا سکتا تھا (جو کسی اعتبار سے کمتر نہیں تھا) لیکن میں ادیب اس لئے ہوں کہ زندگی کو جھیلنے کے ساتھ اسے ڈھکیل بھی سکتا ہوں۔

جب وہ سنجیدہ باتوں کے دوران بھی مسکراتا ہے تو صرف اس کی موٹی موٹی آنکھیں ہی نہیں بلکہ اس کا سارا وجود گمبھیر مسکراہٹ سے کِھل اُٹھتا ہے۔ اس نے پھر کہا "کہانی لکھنا میری مجبوری نہیں بلکہ ان حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں کہانیاں لکھتا ہوں اور یہاں مجبوری اسی وقت ہوتی ہے جب میری الجھنیں دوسروں کی الجھنیں بن جاتی ہیں اور دونوں مل کر جب ناقابل برداشت ہو جاتی ہیں یا میرا اپنا درد دوسروں کے درد سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

اس وقت میرے سامنے بیٹھا تھا وہ ادیب جو راجہ نربنسیا سے لے کر مان سرو ور کے ہنس تک کے افسانوں کے سفر کو بڑی جرأت مندی سے طے کر گیا مگر پھر بھی یہ تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی منزل آ گئی ہے۔

اس نے پھر کہا:- کہانی مجھے اوروں سے جوڑتی ہے یا یہ کہوں کہ بہتوں سے جڑنے کا بنیادی عمل ہی کہانی کی شروعات ہے۔ میری زندگی تاریخ کے ساتھ ہے، اس کی تمام آویزشوں اور تضادات کی شاہد ہے۔ مزدور اور سماج دونوں کا۔"

اس وقت میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ بیان، جوکھم، گرمیوں کے دن، بدنام بستی، راتیں، مانسرو ور کے ہنس، راجہ نربنسیا اور متعدد کہانیوں میں کملیشور کے گہرے تاریخی شعور کو دیکھا پرکھا جا سکتا ہے۔

کملیشور نے لمحہ بھر کے لئے اپنے اندر جھانک کر پھر کہا۔ جہاں فرد کی انا سماجی حقیقتوں کو تسلیم نہیں کرتی ہے وہاں آج کی کہانی یعنی نئی کہانی یا سمانتر (متوازی) کہانی نہیں ہو سکتی۔ زندگی سے قریبی رشتہ جوڑنا ضروری ہے کیونکہ تب ہی ادب آگے بڑھانے اور حوصلہ بخشنے کا خوبصورت ذریعہ یا ہتھیار بن سکتا ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اور بھی بہت سے ادیب زندگی کی قربت کے دعوے کرتے ہیں مگر جب بھی انھیں چھوٹا موٹا لالچ دیا گیا بڑی نوکری، خوبصورت بیوی یا دولتمند بیوہ عورت کا سر دیا ر۔ تو وہ لوگ اپنی منزل کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ مگر یہ کملیشور کس مٹی کا بنا ہوا ہے؟

"اسی ٹوٹتے، شکستوں سے دوچار ہوتے اور پریشان آدمی کی گرمیٔ حیات پر میرا اعتماد ہے"۔۔۔ لمحہ بھر توقف کے بعد اس نے پھر کہا۔ "جن کی جیت ہوتی جائیگی وہ بے تعلق ہوتے جائینگے اس لئے مجھے تو لگتا ہے میں ہمیشہ "ہارے ہوؤں" کے درمیان رہنے کا پابند ہوں اور یہ اس وقت تک ہوتا رہیگا جب تک کہ سب جیت نہیں جائینگے اور میں بالکل اکیلا نہیں رہ جاؤنگا۔"

پھر کیا ہوگا؟ میں نے پوچھا

پھر؟ مجھے نہ کسی اعتماد کی ضرورت رہیگی، نہ نوشواش کی۔ اور ..."

اور کیا؟

اور نہ لکھنے ہی کی۔"

وہ پھر مُسکرایا، وہ بہت گمبھیر تھا اور اس کے لہجہ میں بڑا عزم تھا۔۔ ساتھ ہی ماں کے دودھ جیسی بکی۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ اگر زندگی میں کملیشور کو سکھ ہی سکھ ملے ہوتے تو اس میں کبھی بھی اتنا عزم پیدا نہیں ہوتا۔۔۔ مگر زمانہ نے اسے کافی توڑنے کی کوشش کی ہے۔

اور کامیابی؟

کامیابی کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے؟

کملیشور کی کہانیوں میں انسانی فطرت کی نازک گہرائیاں ہیں۔ وہ قصبے کے بارے میں لکھ رہا ہو یا شہر کے بارے میں، اس کے کردار بڑے جاندار، انوکھے اور اپنی تمام خصوصیات (عیب و محاسن سمیت) کے ساتھ اور صحیح رنگ روپ میں، ہمارے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ پریم چند کے بعد راجندر سنگھ بیدی کے علاوہ میری نظر سے بہت کم ادیب گزرے ہیں جن کی تخلیقی صلاحیت اتنی زبردست ہو۔ اسی لئے میں کملیشور کا اتنا مداح ہوں۔

* * *

میں سمجھتا ہوں کہ ہندستانی کہانیوں کا "ٹوٹل امیج" بنانے میں کملیشور نے بہت کام کیا ہے۔ اس کے لئے کوئی صوبہ غیر نہیں، کوئی گھر پرایا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب پنجابی یا مراٹھی کہانی کی جگہ ہندستانی کہانی کا زیادہ چرچا ہوتا ہے۔

* * *

دسمبر کا سرد موسم تھا۔

ہم لوگ سمندر کے ساحل پر کھڑے تھے، سورج ڈوب رہا تھا اور اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ کملیشور کا سانولا تانبے کے رنگ والا چہرہ (جیسے زمانہ قدیم کا کوئی بُت ہو) روشنی میں چمک رہا تھا۔ لیکن پھر بھی اس وقت وہ اداس دکھائی دے رہا تھا۔ اس سُرمئی اندھیرے میں الگ تھلگ رہا تھا جیسے وہ سمندر ہی کا ایک حصہ ہو جو آکاش کی اور ابھرا ہوا ہے۔۔۔ اور باقی حصہ۔۔۔ ریزہ ریزہ ہو کر سمندر ہی میں کھو رہا۔۔۔

"کملیشور بھائی کیا بات ہے؟"

"یار! یہ زندگی کا ساگر بہت گہرا ہے۔"

میں بھی سنجیدہ ہو گیا۔ بات کتنی صحیح اور سچی تھی۔ اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ زندگی اور ادب کا رشتہ واقعی بڑا مضبوط ہوتا ہے۔۔۔۔ یہ بہت بڑی بات ہے جو کملیشور کے "امیج" میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔

پھر اس نے میرا شانہ ہلا کر کہا۔ "مگر میں کچھ اور کہنا چاہتا ہوں کہ۔۔۔ ایک لمحے کے لئے وہ رکا اور پھر اس کی آنکھوں میں اور بھی چمک آگئی۔۔۔ "پنجابی میں آپ اسے کہتے ہیں کہ۔۔۔

اس کا مدعا سمجھ کر میں نے کہا:۔ "دل دریا سمندروں ڈونگھے۔ کون دلاں دیاں جانے"

"بس دل کی بات جاننے سے ہی شروعات ہوتی ہے" اس نے پھر سنجیدہ ہو کر کہا۔" اور پھر احساس ہوتا ہے کہ زندگی ایک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔"

اس وقت وہ خود بھی لاوے کی طرح دہک رہا تھا۔

بہت ہی سنگین صورتحال تھی۔۔۔ کیا کہتا؟

اب اور کیا کہوں؟

کملیشور میرا دوست ہے اور دوست کے بارے میں جو کچھ بھی کہا جائے لوگ اس کو برداشت نہیں کرتے۔ ہاں کبھی کبھی دل میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ اتنے پرخلوص دوست کو بندہ مار ہی دے... یا خود اس پر نثار ہو جائے۔"

(ترجمہ :- سعود ایوبی)

ہر شادی شدہ جوڑا پچیس سے پینتیس

تک عورت اور مرد کی طرح رہتا ہے۔ پینتیس

سے پینتالیس تک میاں بیوی کی طرح، پینتالیس سے

پچپن تک دوستوں کی طرح، پچپن سے پینسٹھ تک

بھائی بہن کی طرح اور پینسٹھ کی عمر کے پار کرتے

ہی ماں اور بیٹے کی طرح ہو جاتا ہے۔ رُوحانی ملاپ

کی بات پینسٹھ کے بعد ہی آتی ہے۔

--- کملیشور

کماری جیوتی

روح کو متاثر کرنیوالا شخص

کماری جیوتی بمبئی یونیورسٹی سے ایم اے اور جرنلزم کی سند حاصل کی ہے اور بمبئی کے انگریزی روزنامہ فری پریس اور انڈین اکسپریس کے لئے فری لانس کام کرتی ہیں۔ ★

[کملیشور کے پرستاروں کے خطوط بڑی تعداد میں آتے رہتے ہیں، ان سے ملاقات کرنے والوں کا تانتا آدھی رات تک بندھا رہتا ہے۔ وہ جہاں بھی جاتے ہیں، انھیں ان کے چاہنے والے گھیر لیتے ہیں۔ یہ ان کے ٹی۔وی۔ اسٹار ہونے کا ثمرہ ہے۔ ہماری نوجوان نامہ نگار، جیوتی کو ان کا انٹرویو مکمل کرنے کے لئے ۲۶ گھنٹے صرف کرنے پڑے ہیں۔

اب تک کملیشور نے اپنے ہفت روزہ پروگرام میں مزدور، کسان، مصنف، گلوکار، خوانچے والے، قلی، ٹھیلے والے، نائی، موچی، ٹیکسی ڈرائیور، ہوٹل کے بیرے، جھوپڑپٹی میں رہنے والے، کلینر، ہوٹل ملازمین، برتن صاف کرنے والی ملازمائیں، اندھے، مفلوج، شرابی جواری، مظلوم، مجبور لوگوں کو لے کر جو دنیا پیش کی ہے، اس نے بمبئی جیسے شہر میں ہاتھی دانت کے میناروں میں رہنے والوں کی نیند حرام کردی ہے۔ ان کے پروگرام کو کوئی پسند کرے یا نہ کرے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی "پریکرما" پروگرام کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ایڈیٹر ٹی۔وی۔ ٹائمز]

اس دن سڑک پر دو بچوں نے بھیڑ میں کملیشور کو پہچان لیا تھا اور اس خطا پر انھیں اپنی ماں کا تھپڑ سہنا پڑا تھا کہ سرِ راہ ان کی طرف اشارہ کیوں کیا تھا، اور کملیشور نے محسوس کیا تھا کہ "پریکرما" کا اثر سماج کے تمام طبقوں پر ہے۔ بمبئی کے مختلف طبقوں کے لوگ "پریکرما" میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ لوکل ٹرینوں میں بیشتر لوگ اب تاش کھیلنے کی بجائے، گذشتہ "پریکرما" پروگرام سے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ پان والے یا مزدور کے متعلق گفتگو کرنے میں ایک دوسرے کے اور قریب آجاتے ہیں۔ یہی ایک موضوع ایسا ہے جو مختلف الخیال اشخاص کو ایک ڈور میں باندھتا ہے۔

لیکن یہ اتحاد ہے کہاں؟ ہندوستانی قومیت اور اس کو سمجھنے کا احساس کس میں ہے؟ جو لوگ ہندوستانی ثقافت کو اتنا ہی سمجھتے ہیں جتنا ان کے Interior Decorator انھیں سمجھاتے ہیں۔ اُن سے میں پوچھونگا کہ انسان میں قوتِ برداشت کیوں ہے؟ وہ جدوجہد کیوں کرتا ہے؟ انھیں میں اس دوسری ثقافت سے آگاہ کرونگا جس کے باعث انسان انسانیت سے دور ہوگیا ہے تاکہ وہ اس سماجی نظام سے نفرت کرنے لگے۔ کملیشور فوراً جواب دیتے ہیں ہماری تمام منصوبہ بندیاں عام لوگوں کے نام سے ہیں، میں اسی عام آدمی کو عوام کے سامنے

نانا چاہتا ہوں ۔ میرے لئے اپنی توانائی اتنی اہم نہیں جتنی اہمیت چپڑن بیچنے والے کے احساس کی ہے ۔ سماجی، معاشی اور ثقافتی محاذ پر مسلسل محرومیوں نے انھیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا ہے ۔ وہ اسٹوڈیو میں کہنا تو سب کچھ چاہتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ اس سے حاصل کیا ہوگا ؛ وہ سماجی انقلاب کے بارے میں پُر امید نہیں ہیں ۔ اس لئے میں انھیں سہارا دیتا ہوں اور تماش بین سمجھتے ہیں کہ ان کی زبان سے میں بولتا ہوں ۔ ان لوگوں کے پاس زبان نہیں ہے ، جسے میں سمجھتا ہوں، اور مدد کرتا ہوں ۔ کبھی کبھی پروگرام کے بعد میں سیدھے گھر جاتا ہوں اور تھکا ماندہ سو جاتا ہوں ۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی اپنے تماش بینوں سے بگڑ جانے کو جی چاہتا ہے ، لیکن میں پھر خود پر کنٹرول کر لیتا ہوں ۔

کملیشور کی زندگی میں بہت سی متضاد باتیں ملتی ہیں ۔ وہ اتر پردیش کے ایک چھوٹے سے گاؤں مین پوری میں پیدا ہوئے جہاں سے لوگ خوشی خوشی ، تلاشِ معاش میں شہروں کا رُخ کرتے ہیں اور ناامید ہو کر واپس لوٹ جاتے ہیں ــــ

کملیشور کے گھر کا ڈھانچہ کبھی سکڑتا جا رہا تھا ۔ جب وہ صرف ۱۲ سال کے تھے ، ان کے ۱۸ سالہ بھائی سدھارتھ دنیا سے اٹھ گئے ۔ دادا اور دادی تو بہت پہلے ہی انتقال کر چکے تھے ، والد کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب کملیشور ۳ سال کے تھے ، ان کی والدہ گھر کی عزت رکھنے کے لئے اپنے سوتیلے لڑکے پر خوب خرچ کرتی تھیں اور کیلاش (کملیشور کا گھریلو نام) سے مجبوراً کنجوسی سے کام لیتی تھیں ۔ کملیشور جب اپنے ساتھیوں کو خرچ کرتے اور موج اڑاتے دیکھتے تو اندر ہی اندر رو پڑتے ، لیکن وہ ہر امتحان میں اول آتے تھے اور وظیفہ حاصل کرتے تھے جس کی انھیں سخت ضرورت تھی ۔

آخر میں وہ تنہائی پسند اور کافی کم سخن ہو گئے تھے ، الہ آباد یونیورسٹی میں ان کے انقلابی سوشلسٹ پارٹی کے ساتھیوں نے انھیں پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے لئے اکیلا چھوڑ دیا تھا ۔ آزادی کے بعد اس جماعت کے کانگریس میں ضم ہو جانے سے بھی وہ کافی رنجیدہ تھے ۔ اس کے بعد تو وہ اکیلے ہوتے چلے گئے ، ان کی محبوبہ نے یہ کہہ کر دوسرے سے شادی کر لی تھی کہ تمھیں تو الیکشن لڑنا ہے ، تم زندگی میں کچھ نہیں کر سکتے ۔ اس کے بعد انھوں نے بھارتیندو ہریشچندر اور پریم چند کو اپنے ادبی رشتہ دار کے طور پر منتخب کر لیا اور شادی پر تحریر و تصنیف کو اولیت دے دی ۔

آپ ایسے حالات میں پروردہ شخص سے یہ توقع نہیں کر سکتے کہ وہ ۵۰ سال کی عمر میں ہی ہر موضوع پر کھل کر گفتگو کر سکتا ہے ۔ جو خوش مزاجی اور مردانہ وجاہت میں اپنی مثال آپ ہے ، جسمیں حد درجہ خود اعتمادی ہے ، جس سے صبح ۱/۲ ۸ بجے سے قبل ہی ملا جا سکتا ہے ، وہ بھی گھر پر ۔ ۔ ۔

اس شخص کے پاس آپ سے گفتگو کے لئے ایک گھنٹہ سے زیادہ وقت نہیں ہے ، اس انٹرویو کے لئے اس کے پاس درجن سے زائد مرتبہ فون کرنے پڑے اور ۲۶ گھنٹے سے زیادہ صرف ہوئے ، کبھی وہ آفس میں ملے ، کبھی میک اپ روم میں ، کبھی ٹی وی سنٹر پر ۔ ۔ ۔ وہ ایک ایسا شخص ہے جو ایک وقت میں ایک جگہ زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا ، اسے تنہائی پسند ہے ۔ وہ سنسان سڑکوں پر ٹہلنا زیادہ پسند کرتا ہے اور باہر جانے پر ڈاک بنگلے میں ٹھہرنے کو ترجیح دیتا ہے اس لئے کہ وہ بالکل سنسان ہوتے ہیں ۔

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ کملیشور نے ۱۵ سال کی عمر میں ایک نہایت بھیانک منظر دیکھا تھا ۔ ایک مجبور عورت کو کچھ انگریز سپاہی ننگا ناچنے پر مجبور کر رہے تھے ۔ اس نے متاثر ہو کر انھوں نے اپنی کہانی " مانس کا دریا " لکھی تھی ۔ جب وہ ۲۰ سال کے تھے ، رات گئے تک اپنے قصبے میں ہندستانی اور غیر ملکی ادب کا مطالعہ کرتے رہتے تھے ، انھیں محسوس ہوا کہ یہ ادب انسانی سچائیوں سے ہم آہنگ نہیں کرتا ۔ دنیا کے بڑے ادیب و دانشور غریب کو نصیحت کرنے کے لئے گرو تو بن سکتے ہیں لیکن غریب

کے احساسات کو سمجھنے والے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ خیالی دنیا میں تو عظیم ہو سکتے ہیں لیکن حقیقت کی دنیا میں نہیں۔

تنہائی پسندی اور بے اعتمادی کے بعد انھوں نے سوچا کہ ادب کے اس تصور کو بدلنا چاہئے اور انھوں نے اپنی کہانی "راجہ نربنسیا" کی تخلیق کی، اس وقت ان کی عمر ۲۲ سال تھی۔

ساتھ ہی انھوں نے ہندی ادب کی چہار دیواری کو توڑا۔ "اشک" اگے "یشپال" اور "جینندر" کے ہاتھوں سے باہر نکالا "نئی کہانی" تحریک کی قیادت کی اور ہندی کہانی کے تصور کو ہمیشہ کے لئے بدل دینے کے ساتھ کہانی کو ادب کی خاص صنف قرار دیا۔

۱۹۶۸ء سے برابر کملیشور اعلان کر رہے ہیں کہ میں اپنے طبقہ کو فریب نہیں دے سکتا۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا جس سے نئی کہانی کار مجھے الزام دیں۔

وہ اپنی ادبی تخلیقات کو سرشن کی شکل میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ انھوں نے کوئی کہانی ادبی ذوق کی تسکین کے لئے نہیں لکھی، جو کچھ لکھا پورے اعتماد سے لکھا اور بمبئی ٹیلیویژن اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ "پریکرما" پروگرام کے توسط سے برابر اپنے طبقے سے جڑے ہوئے ہیں، جسکے ساتھ انھوں نے جد وجہد کی ہے۔

کملیشور اگر چاہتے تو اپنے پروگرام میں سیٹھوں، وزیروں اور با اثر عورتوں کو پیش کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ہمیشہ معمولی لوگوں کو پیش کیا۔ اس کے دکھ درد کو بانٹا۔ یہی وجہ ہے کہ بمبئی کے اعلیٰ طبقہ کے لوگ کملیشور کو اچھا نہیں سمجھتے اور متوسط طبقے کے لوگ انھیں دیکھتے ہی گھیر لیتے ہیں۔

ایک طالب علم جس نے بھوکے پیاسے رہ کر محنت کی، جو مادی آسائشوں سے ہمیشہ محروم رہا۔ ۱۹۶۸ء سے ایک ادارے سے متعلق ہے۔ ان کی بیوی کے مطابق جب انھوں نے دہلی کو خیر باد کہا۔ ان کے پاس کپڑوں کا صرف ایک سوٹ کیس تھا، اس میں صرف سات جوڑے تھے۔

کہنے کے لئے تو وہ ایک کاروباری رسالے کے مدیر ہیں، جس کا مقصد صرف عورتوں کو خوش رکھنا اور اپنے طبقہ کے مقابلے میں اپنی نوکری ترجیح دینا ہوتا ہے۔

کملیشور ان الزامات کو مذاق میں ٹال جاتے ہیں، دراصل یہ الزامات ان کی غیر معمولی شہرت سے حسد ہے، بعض لوگ حسد ہی کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ کملیشور کے بقول تخلیقی عمل ضمیر کو مطمئن کرنے کے لئے ہوتا ہے، دنیا سے کچھ پانے کے لئے نہیں وہ لڑکا جو کبھی نئی چپل اور کاپی کے لئے برسوں اپنے بھائی کا انتظار کرتا تھا۔ آج بمبئی کے سب سے زیادہ مصروف انسانوں میں ہے۔ بمبئی کے ایک پبلیشر کے مطابق اس وقت صرف ان کی لکھی کتابوں کی رائلٹی ہزار ڈیڑھ ہزار ماہوار ہے

کملیشور بہت مصروف شخص ہیں اور نئے لکھنے والوں سے بحث و مباحثہ کر کے اپنے علم بڑھانے کے خواہش مند بھی۔ اس طرح برابر وہ اپنی ترقی کر رہے ہیں،

هارڈن روڈ کے ایک کرایہ کے فلیٹ میں وہ رہتے ہیں، ایک نئی گاڑی ہے، ورسووا پر بھی ان کا ایک فلیٹ ہے، ایک ایماندار نوکر "دلیپ" بھی ہے جوان کو موزے جوتے پہنانے میں راحت محسوس کرتا ہے، ایک خوبصورت اسسٹنٹ ہے جو لوگوں کو فون پر جواب دیتی ہے۔ انھیں خوشی ہے کہ آج عام لوگ انھیں جانتے ہیں، صحیح یا غلط، کسی بھی شکل میں۔ اس سے بھی زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ بہت بڑی تعداد میں ان کی عورتوں سے قلمی دوستی ہے، آدھی رات کے بعد ہمیشہ ان کے فون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے وہ جہاں بھی جاتے ہیں، ان کی آنکھوں اور مسکراہٹوں کو پسند کرنے والی عورتیں انھیں گھیر لیتی ہیں کچھ نے تو ان کے تمام "پریکرما" پروگرام

نوٹ کرتے ہیں) اور اپنے دوستوں کی توجہ ان کی جانب مبذول کراتی ہیں۔

کبھی کبھی ان کی بیوی انھیں چڑھاتی بھی ہیں۔ لیکن وہ حاسد نہیں ہیں، وہ جانتی ہیں کہ کملیشور اس قسم کی زندگی گزارنے کے عادی نہیں۔ وہ یہ بھی جانتی ہیں کہ لڑکیوں کا ساتھ انھیں پسند ہے لیکن اگر وہ کسی کو ساتھ لے جائیں تو اسے کیا دے سکتے ہیں؟ وہ لکھنے میں مصروف ہو جائیں گے۔ لکھنا ہی ان کی زندگی کا مشن ہے۔

حالانکہ میں خوبصورت لفظوں سے عورتوں پر جادو کرنے کا فن جانتا ہوں، مگر یہ میرے لئے وقت کی بربادی ہوگی۔ شکوک و شبہات کا جواب دینا میں غیر ضروری سمجھتا ہوں، میری زندگی خود اس کا جواب ہے۔

کملیشور جب ہندی کے رومانی ادیبوں کی باتیں کرتے ہیں تو آپ ہنسے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انھیں وہ دلّی اور الٰہ آباد سے جانتے ہیں، وہ لوگ خیالی دنیا میں رہتے ہیں جس سے انھیں نفرت ہے۔ تاہم وہ اپنے رکھ رکھاؤ میں کافی احتیاط برتتے ہیں۔ ایک دن میں ایک درجن سے بھی زائد ملاقاتیوں کا سلسلہ رہتا ہے، مگر نہ تو وہ گھبراتے ہیں نہ تھکتے ہیں۔ انھیں ایک ہی چیز سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ بقول ان کے :-

"جب کوئی چیز ویسی نہیں ہو پاتی جیسی میں چاہتا ہوں تو میں پریشان ہو جاتا ہوں"۔

ٹی۔وی کے میک اپ روم میں آئینہ کے سامنے کھڑے کملیشور کو آپ عجیب عجیب قسم کا منہ بناتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں، خصوصاً پروگرام سے آدھ گھنٹہ قبل جب ان کی اسسٹنٹ انھیں پروگرام میں شریک ہونے والے سے ملاتی ہے۔ اس کے باوجود ہر پروگرام ایک تاریخ بن جاتا ہے۔ بقول پروفیسر نسیم ایریکیل، کملیشور کی خوبی یہ ہے کہ وہ ٹی۔وی پر پروگرام میں زندگی پیش کرتے ہیں۔

ترجمہ :- شمیم طارق

کامیاب آدمی صرف دوڑتا رہ جاتا ہے اور دوڑنا ہی اس کی کامیابی بن جاتی ہے۔ کیونکہ دوڑتے دوڑتے وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اس نے دوڑنا کیوں شروع کیا تھا۔ کامیابی بذاتِ خود، منزل ہے۔ مگر سیاست میں جو سب سے بڑا عیب ہے وہ یہی ہے کہ دوڑنے والا ہمیشہ کہتا رہتا ہے۔ ہم تمہارے لئے دوڑ رہے ہیں

کملیشور

کملیشور

میرا افسانوی سفر

ایک امیر کہے جانے والے گھر میں غریب کی طرح رہنا، کھانا کھا کر بھی بھوکا اٹھنا، پریشانیوں میں بھی ہنسنا، نوعمری میں بھی بالغوں کی طرح فیصلہ کرنا، یہ میری عادت نہیں مجبوری تھی۔

ایک دن بیٹھک میں لگی دو تصویروں کو دکھلاتے ہوئے میرے بڑے بھائی سدھارتھ نے کہا تھا —
"یہ تصویر بابا کی ہے اور یہ بابوجی کی۔ تجھے کچھ یاد ہے بابوجی کا؟"

میں نے چپ چاپ سر ہلا دیا تھا۔ "نہیں"۔ تب میں چوتھے درجے میں پڑھتا تھا۔ سدھارتھ ہی نے بتایا تھا۔ "بابوجی کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا... تب تو بہت چھوٹا تھا... بابا کو میں نے بھی نہیں دیکھا..."

گھر میں بہت سی تصویریں تھیں... اور گھر میں ہر آدمی ایسا تھا جس نے کسی ایک کو دیکھا تھا اور باقی کی تصویریں ہی دیکھی تھیں۔ جب میں سمجھدار ہوا تو مجھے صرف وہ تصویریں ہی دیکھنے کو ملیں، جو بیٹھک کی دیواروں پر قرینے سے لٹکی ہوئی تھیں۔ ان تصویروں کے ذریعہ ہی مجھے اپنے خاندان والوں کا تعارف ہوا تھا... حافظہ سے اتر جانے والے افرادِ خاندان کا تعارف — ہر بارش میں وہ تصویریں سیلن سے دھندلی پڑ جاتی تھیں۔ میرے بابا کی تصویر بہت دھندلی پڑتی جا رہی تھی — بھارتندو ہریشچندر کی تصویر کی طرح۔ تب مجھے بھارتندو ہریشچندر کا پتہ نہیں تھا اور میرے بڑے بھائی سدھارتھ نے دیوار سے بابا کی تصویر اتار کر اس کے سہارے ان کی ایک نئی تصویر بنانی شروع کی تھی۔

سدھارتھ سے میرا جیتا جاگتا رشتہ تھا۔ لیکن بابا سے بہت ٹھنڈا، دور کا اور عقیدت کا رشتہ تھا۔ کئی دنوں تک سدھارتھ وہ تصویر بناتے رہے تھے۔ انھوں نے ہو بہو ہی بنالی تھی اور جڑوا کر پھر دیوار سے لٹکا دی تھی۔

گھر بیتے ہوئے اور آگے آنے والے دنوں کے بیچ جی رہا تھا۔ حال انھیں دو دھاروں کے سہارے لٹکا ہوا تھا۔ جو بیت گیا تھا وہ بڑا قابلِ فخر اور اہم تھا۔ مستقبل بہت اچھا، خوشنما اور آرام دہ ہوگا، کیونکہ سدھارتھ بہت ہونہار تھا۔

تب ہی سدھارتھ اس دنیا سے سدھار گیا اور امیر کہے جانے والے گھر میں غریب کی طرح رہنا، کھانا کھا کر بھی بھوکا اٹھنا، پریشان کن ماحول میں بھی ہنس سکنا، نابالغ ہوتے ہوئے بھی بالغوں کی طرح فیصلہ کرنا میری مجبوری بن گئی۔

سدھارتھ کی بس تصویر رہ گئی اور مستقبل سے ہمارا رشتہ ٹوٹ گیا۔ سدھارتھ سے بڑے بھائی خوشگوار مستقبل کی تلاش میں پہلے ہی اس چھوٹے سے قصبے سے نکل چکے تھے اور حالات سے دست و گریباں تھے۔

* * *

وہ لڑائی کا زمانہ تھا۔ جاگیردارانہ ماحول ختم ہو رہا تھا۔ نوکر چاکر رخصت ہو چکے تھے۔ گلے بھینسوں

کو زندہ رکھنے کے لئے انھیں گاؤں بھیج دیا گیا تھا۔ لیکن ہم لوگوں کے اپنے زندہ رہنے کی کوئی شکل نظر نہیں آتی تھی۔ ماں رات ڈھائی تین بجے اٹھ کر ہاتھ میں کپڑا لپیٹ لپیٹ کر چکی چلاتیں، برتن دھوتیں اور صبح ہوتے ہوتے نہا دھوکر "پرانے زمیندار گھرانے" کی بوڑھی غریب اور لوٹے ہوئے محلہ والوں کے زخموں پر مرہم لگاتیں اور رات کو سونے کے کمرے میں بیٹھ کر چپ چاپ رویا کرتیں۔

مستقبل کے فاتح سپاہی کے کپڑوں کے بخیے میں خود بیٹھ کر ادھیڑا کرتا تھا تاکہ ماں کو دقت نہ ہو۔ ہولی، دیوالی پر ماں اپنی کوئی پرانی، حفاظت سے رکھی ہوئی سلک کی ساڑھی نکال لاتیں اور گھنٹوں ایک ایک کترن کا اندازہ لگاتیں۔ اگر آستین چھوٹی کردوں تو ... دو کرتے بن جائینگے، ایک تیرا، ایک منا کا، منی کی فراک کا گھیر بھی نکل آئیگا۔

اور حالات سے الجھنے والے بڑے بھائی سال بھر بعد جب گھر آتے تھے تو ہمیں پتہ چلتا تھا کہ بازاروں میں بہت سی چیزیں بکتی ہیں ... کچھ وہ ہمارے لئے لاتے ہی تھے جنہیں "کل" کے لئے بکسوں میں بند کر دیا جاتا تھا اور گھر سے نوکری پر واپس جاکر وہ بڑے بھائی اپنا دودھ اور اخبار بند کر دیا کرتے تھے ... آخر خرچ کہاں سے آئیگا۔

بازار میں جہاں میرے شوق کی چیزیں بکتی تھیں، میرے لئے نہیں تھے۔ بڑے بھائی جب اپنا پیٹ کاٹ کر کچھ روپے بچاتے تھے تو ان بازاروں کی ایک نہایت سنکری کھڑکی میرے لئے کھلتی تھی اور پھر سال بھر کیلئے بند ہو جاتی تھی۔

منڈی میں غلہ، گھی، گڑ، آلو، کپاس سب کچھ تھا، پر ماں کی دھوتی کے آنچل میں ایک دو نوٹ اور کچھ سکے تھے ... اور جب میں غلہ لینے جاتا تھا، خود دوکاندار بڑا ترازو پیچھے سرکا کر سب سے چھوٹے ترازو سے میرے لئے چیزیں تولتا تھا۔

دنیا کے اس سلوک سے میری ہتک ہوتی تھی، میری بہت اچھی ماں اور سنگھرش کرنے والے بھائی کی ہتک ہوتی تھی۔ لیکن وہ دونوں دنیا دار تھے جو میں نہیں تھا۔

سدھا رتھ کے کپڑے پہن پہن کر میں مستقبل کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ مستقبل کو تابناک بنانے کی جدوجہد بہت ہی محدود تھی۔ ماں کے لئے چشمہ، اپنے لئے زین کی گیند اور نئی کتابیں، بھائی کے لئے نئی چپل ... اس بار آئے تھے تو جوتا بہت گھس گیا تھا۔

* * *

لیکن میری ماں کے ویشنوی اصول مجھے بغاوت کرنے سے روکتے رہے اور یہ دبی ہوئی بغاوت بہت ہی غیر فطری انداز سے ابھرنے لگی۔ وہ ایک بڑا غمناک دور تھا اور اس دور میں میرے مددگار تھے میرے ہم جماعت پڑھنے کی طرف سے میرا دھیان ان ماسٹر صاحب نے ہٹا دیا تھا جو مین پوری کی تمباکو کھا کر غصہ ہوتے تھے تو منہ سے پھوارسا نکلنے لگتا تھا اور پیٹتے پیٹتے وہ بے حال کر دیتے تھے۔

میں ہمیشہ قمیص کے نیچے چھوٹی کرسی کی رگدی باندھ کر جایا کرتا تھا اور کا بھی ماسٹر کو مار ڈالنے کی سازشیں کیا کرتا تھا۔

* * *

قصبے کے اسکول میں بدچلن مولوی اور محلے کے چبوتروں پر بیٹھے بدمعاش اور آوارہ پہلوان تھے ... موٹر اڈوں پر بدمعاش ڈرائیور اور کلینر تھے اور تھا اندھیرا جو سرِ شام چھانے لگتا تھا۔ پورا قصبہ اندھیرے کی چادر میں لپٹ جاتا تھا اور لڑائی کے زمانے میں پڑھنے کے لئے بھی ہمیں مٹی کا تیل میسر نہیں ہوتا تھا۔ تب ہم کچھ دوست شیشیاں اور کپ

لے کر رات کو میونسپلٹی کی لالٹینوں سے تیل چرانے کے لئے نکلتے تھے۔

مجھے آج تک افسوس ہے کہ میں اپنے پڑھنے کے لئے کبھی نئی کتابیں نہیں خرید پایا۔ جب میرے ساتھ کے لڑکے اپنے والد یا بڑے بھائی کے ساتھ کتابوں کی دکانوں پر جا کر کورس کی نئی نئی کتابیں کاپیاں خریدتے تھے تو میری آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ میرے ساتھ کوئی نہ ہوتا تھا۔

چوٹیں لگتی تھیں تو میں درد سے کراہتا اور راستے میں بیٹھ بیٹھ کر اکیلا اسپتال پہنچا کرتا تھا اور مجھے اکیلا دیکھ کر وہ ظالم کمپاؤنڈر بڑی بے رحمی سے زخم کو دبا دیا کرتا تھا۔ میں درد سے بلبلا کر سہارے کے لئے کبھی اس کے بازو پکڑ لیتا تو وہ میرا ہاتھ بری طرح سے جھٹک کر ڈانٹتا تھا اور میں اپنے آنسو دبائے مرہم پٹی کروا لیتا تھا۔ وہاں سے نکل کر میں املی کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر رو رو کر اپنا دل ہلکا کر لیا کرتا تھا۔

گرمی کی چھٹیوں کے بعد جب اسکول کھلتا تھا تو وہاں جانے کا کوئی حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ پرانی کتابیں وہ بھی پوری نہیں۔ کاپیاں خریدنے کو پیسے نہیں ہوتے تھے، اس لئے بھائی صاحب کے آنے کا انتظار رہتا تھا، کہ وہ آئینگے تو سرکاری کاغذ کے دستے دو دستے ساتھ لائیں گے اور تب میری بے ناپ کی کاپیاں بنینگی۔ ماں اپنی پھٹی دھوتیوں کی کناریاں لپیٹ لپیٹ کر رکھتی رہتی تھیں اور اسکول کھلتے ہی میرے لئے ان کناریوں کا نیا بستہ سی دیتی تھیں۔

ایک آنے کی ربڑ یا پٹری کے لئے ماں سے پیسے مانگتے ہوئے مجھے وحشت ہوتی تھی کیونکہ ماں بے بسی میں جھنجھلایا کرتی تھیں۔ تین تین دن میں جغرافیہ کی کلاس میں نہیں جا پاتا تھا، کیونکہ رام بابو جین کی دکان سے دنیا کا نقشہ خریدنے کے لئے ماں سے کچھ بھی کہنے کی میری ہمت نہیں پڑتی تھی۔

اور جب کوئی منچلا ساتھی بتاتا تھا کہ پچھلی دیوالی پر رام بابو کتاب والا پانچ سو روپے جوئے میں ہار گیا تھا تو مجھے بڑی راحت ملتی تھی۔

قصبے میں جو افسر آتے تھے وہ بڑی ٹھسک سے رہتے تھے۔ ان کے لڑکے گلدستوں کی طرح سجے ہوئے درجے میں آتے تھے اور سرکاری اسکول کے ہمارے ماسٹر انھیں ہمیشہ مانیٹر بنایا کرتے تھے۔ یہ تب ہوتا تھا جب میں اپنی ساری مایوسیوں اور محرومیوں کے باوجود، درجے میں زیادہ تر اوّل آیا کرتا تھا۔ یہ صورتحال میرے لئے ناقابل برداشت ہوتی تھی۔

ریسس میں سب لڑکے بیاؤ کے پاس لگے رام بھروسے کے خوانچے پر پہنچ جایا کرتے تھے اور دبا کر چاٹ مٹھائی کھایا کرتے تھے۔ آلو کی سکتی ہوئی ٹکیاں دیکھ کر میرا جی بہت للچاتا تھا لیکن پیاس ہوتے ہوئے بھی میں ادھر رخ نہیں کرتا تھا۔ ریسس کے بعد جب ٹکیاں ختم ہو جاتی تھیں تو میں پانی پینے جاتا تھا اور خوانچے میں کچی ہوئی چیزوں پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر لوٹ آتا تھا۔

اسکول میں میرے انعام دوسروں کو دے دیئے جاتے تھے اور فیس کے لئے مجھے بہت بے عزت کیا جاتا تھا۔

جب تک سدھارتھ تھے، میری فیس آدھی معاف ہو جاتی تھی۔ لیکن ان کے چلے جانے کے بعد پھر کبھی میری عرضی منظور نہیں ہوئی۔ آخر سدھارتھ نے میرے دل میں ایک ارادے اور عزم کو جگایا تھا اور میں نے امتحان میں اوّل آ کر وظیفہ لینے کی ٹھانی تھی۔ کیونکہ میں شش ماہی میں تو اوّل آجاتا تھا مگر سالانہ میں تحصیلدار، کوتوال صاحب یا انسپکٹر کا لڑکا ہی اوّل آیا کرتا تھا۔ اوّل آنا میرے لئے پڑھائی کے نقطۂ نظر سے اتنا ہی اطمینان بخش تھا جتنا اقتصادی اعتبار سے ــــ

آخر میں اوّل آیا، اور وظیفے کے روپیوں کے لئے سدھارتھ مجھ سے مرتے مرتے بھی خط لکھ کر پوچھتے رہے کہ ملا یا نہیں۔ لیکن ان کے مرنے تک مجھے میرا وظیفہ نہیں مل پایا تھا اور جب ملا تھا تو "وار فنڈ" میں آدھے روپے کاٹ لئے گئے تھے۔

ان چھوٹی چھوٹی دقتوں نے جو اس وقت میرے ننھے سے وجود کے لئے بہت بڑی تھیں، مجھے نحیف و ناتواں بنا ڈالا تھا۔ سائیکل والے نے میری سائیکل چھین لی تھی کیونکہ میں مرمت کا پیسہ نہیں چکا پایا تھا۔

اور میری ماں ان چھوٹے چھوٹے کرایہ داروں پر بگڑتی رہتی تھیں جو پچیس پچیس سال سے دو، دو، تین تین روپے ماہوار پر مکان یا دوکانیں لئے بیٹھے تھے، جن پر دو دو سال کا کرایہ بقایا تھا اور جو ہر بار ماں کی جھڑکیوں سے ہار کر ہر بار یہی کہا کرتے تھے۔

"مالکن اب اس عمر میں ہم پر رحم کرو۔۔۔ اسی دروازے سے ارتھی اٹھیگی"

اور وہ سب کرایہ دار ایسے تھے جن کے لڑکے کام کی تلاش میں آگرہ، فیروز آباد یا کانپور کی طرف چلے گئے تھے، جن کا اپنے بوڑھے باپوں یا بیوہ ماؤں سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا۔

* * *

برسات کے آنے پر ماں بہت پریشان رہنے لگتی تھیں۔ پتہ نہیں کس کرایہ دار کی چھت بیٹھ جائے، کون سی دیوار ڈھئے جائے۔ کہنے کو ہماری جائداد تھی، پر جائداد میں ایک اینٹ تک بدلوانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ برسات میں کچھ کرایہ دار اپنے پیسوں سے مکانوں کی مرمت کرا لیا کرتے تھے اور تب چار چار مہینوں تک آمدنی بالکل بند ہو جایا کرتی تھی اور ہمارے جاڑوں کے کپڑے ہر سال بنتے بنتے رک جایا کرتے تھے۔

اور دھیرے دھیرے ماں کی آنکھوں کے آنسو بالکل ختم ہو گئے تھے۔ وہ نپٹ سونی آنکھوں سے سپاٹ دیواروں اور اندھیرے سونے کمروں کو دیکھتی رہتی تھیں اور انھیں دل کے دورے پڑنے لگے تھے۔

پھر بھی وہ کچھ نہیں کہتی تھیں۔ گلی محلے کی ہر آفت مصیبت میں اوروں کے ساتھ کھڑی ہوتی تھیں اور الہ آباد میں رہنے والے بھائی صاحب کے بچوں اور بھابھی کے لئے دھیرے دھیرے چیزیں بنا کر رکھتی تھیں، جب بھائی آتے تھے تو وہ سب کے لئے کچھ نہ کچھ بھیجتی تھیں۔۔۔ "دلہن کے لئے دھوتی، منّی کے لئے فراک اور کچھ کیری پاپڑ ہیں۔۔ موسم پر اچار ڈال لیا تھا۔ یہ گدا بنا لیا ہے بچے کے لئے۔۔ ایک کپڑا پڑا تھا"۔

بھائی کا آنا بہت ہی خوشی کا اور ان کا لوٹ کر جانا سب سے زیادہ دکھ کا موقعہ ہوتا تھا۔ میں اور بھی اکیلا پن محسوس کرنے لگتا تھا۔

پر ماں تھیں کہ سب کچھ چپ چاپ جھیلتی جاتی تھیں، کہیں سُبکی نہ ہو' اس کا انھیں ہمیشہ خیال رہتا تھا اور اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر بھی کسی پوتے یا نواسے کے لئے سوغاتیں بھیجتی رہتی تھیں۔ سنکرات اور دوسرے تہواروں پر پنڈت جی کے لئے تھال بھر بھر کر غلہ بھیجتی تھیں اور شادی بیاہ میں "اپنے پرانے گھر کی شان کے مطابق" بیہار کے جوڑے یا روپے بھجواتی تھیں۔ ساون میں میکے آنے والی محلے کی بیاہتا لڑکیوں کے لئے لمبے برآمدے میں جھولا ڈالتی تھیں اور انھیں بچیوں کی طرح کھلاتی پلاتی اور وداع کرتی تھیں

میں گھر میں، ایک دم اکیلا ہی رہتا تھا۔ کوئی میرا ہم عمر نہیں تھا۔ اپنے نپٹ اکیلے پن میں مجھے یکایک اپنے سے بڑی عمر کی ایک لڑکی کی قربت ملی اور میں ۲۴ گھنٹے اس کے دھیان میں ڈوبا رہنے لگا۔ اس کی کوٹھی میں ملنے کے لئے جاتے ہوئے مجھے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔۔ خاص طور پر اس لئے کہ کوٹھی کے عقب میں جنگلی جھاڑیاں تھیں اور سانپوں کے بل تھے۔

شام کے اترتے اندھیرے میں اس سے ملنے جانا، جان پر کھیلنے کے برابر تھا، کیونکہ مجھے سانپوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔۔۔ وہاں جاتے ہوئے میں ہمیشہ چڑیوں کی آوازوں پر دھیان دیتا تھا، کیونکہ چڑیاں سانپ کی موجودگی کا جلد احساس کر لیتی ہیں اور مل کر شور مچانے لگتی ہیں۔ جب جب چڑیاں چیختی ہوتیں میں وہیں نالے والی پگڈنڈی پر ٹھٹھک جاتا تھا اور کچھ دیر بعد واپس لوٹ جاتا۔ تیسرے چوتھے دن جب ملاقات ہوتی اور وہ لڑکی شکایت کرتی تو میں سماج کو برا بھلا کہتا ۔۔۔۔ کہ یہ سماج بہت ظالم ہے جو ہمیں ملنے نہیں دیتا۔۔۔ تب ہمیں صرف اتنا پتہ تھا کہ سماج نام کی کوئی بے رحم چیز ہوتی ہے جو عاشقوں اور معشوقوں کو نہیں ملنے دیتی۔۔۔ سانپ کا اس میں کیا دخل ہے؟

اور دو تین سال بعد جب میری اس محبوبہ کی شادی ہوئی تو میں اتفاق سے الہ آباد سے مین پوری پہنچ گیا تھا۔ گھر پہنچتے ہی ماں نے حجام کو بلا کر میرے بال چھوٹے کروا دیئے تھے کیونکہ انھیں لمبے پٹوں سے چڑھ تھی اور اس لڑکی کے بہت چاہنے پر بھی کہ میں شادی سے پہلے اس سے مل لوں، میں اپنے ترشے ہوئے بالوں کی وجہ سے ملنے نہیں جا پایا تھا۔

★ ★ ★

"زیادہ پڑھانے سے لڑکے ہاتھ سے نکل جاتے ہیں"۔ یہ میرے سب سے بڑے سوتیلے بھائی کا لفظ تھا۔ گرچہ وہ گھر سے الگ تھے، پر گھر میں پھر بھی ان کا کافی رعب داب تھا۔ مجھے دسویں کے بعد آگے پڑھایا جائے، یہ انھیں منظور نہ تھا۔

ان دنوں وہ کانپور چھاؤنی میں "یورپین انسٹی ٹیوٹ" میں مینیجر تھے۔ وہ انسٹی ٹیوٹ انگریز اور امریکی سپاہیوں کی عیش گاہ تھا۔ زمانہ دوسری جنگ عظیم کا تھا۔ نشے میں دھت فوجی جب آپس میں لڑتے ہوئے بار کے گلاس اور بوتلیں چلانے لگتے تھے تو میری روح فنا ہو جاتی تھی اور میں بار کاؤنٹر کے نیچے رکھی پیٹیوں کے پیچھے دبک جاتا تھا۔

اندر ڈانس ہال میں آرکسٹرا بجتا رہتا تھا۔ برآمدوں میں ہوزی یاری چلتی۔ سنگیت، ناچ، گالیوں، چیخوں اور کراہوں سے وہ پوری عمارت گونجتی رہتی تھی۔ لڑکیوں کے ساتھ وے فوجی، جانوروں کی طرح پیش آتے تھے۔ لڑکیوں کو اپنی، میزوں پر ننگا کر دیتے تھے یا میدان میں خود ننگے ہو کر لڑکیوں کا تعاقب کیا کرتے تھے۔

مجھے باربرا کا واقعہ یاد ہے۔ وہ ہندستانی عیسائی تھی اور سب سے خوبصورت تھی۔ اسے ان فوجیوں نے اتنا کاٹا پیٹا تھا کہ وہ محاذ سے لوٹے ہوئے بدحال فوجیوں کی طرح لگتی تھی۔ ایک رات اس کی جانگھ پر کسی ٹامی نے ٹوٹا ہوا گلاس مار دیا تھا۔۔۔۔ بہت خون بہا تھا۔۔۔۔ پر اگلی رات وہ بینڈیج کروا کے پھر ناچنے آئی تھی، اور میں نے اسے عمارت کے باہر میدان میں گھرے زخمی خرگوش کی طرح بھاگتے دیکھا تھا۔۔۔۔ تین ٹامی اس کا تعاقب کر رہے تھے۔

رات کی سیاہ چادر۔۔۔۔ آسمان میں۔ "غوں۔۔ غوں" کرتے ہوئے ہوائی جہاز، چھاؤنی کے سنتریوں کے بوٹوں کی آوازیں۔۔۔۔ ملٹری ٹرکوں اور جیپوں کی زوں۔۔۔ زوں۔۔۔ شراب، سنگیت اور مانس کے دریا میں غوطے لگاتے ہوئے فوجی۔۔۔ بلیک آؤٹ کے ریہرسل اور ڈراؤنی آوازوں میں چیختے ہوئے سائرن۔

مجھے لگتا تھا کہ یہ دنیا میری نہیں ہے۔ ہر راستے پر "نو انٹری" کے بورڈ تھے اور ہر قدم پر خاردار تاروں کے گھیرے تھے۔

میں بھاگ کھڑا ہوا تھا اپنے چھوٹے سے قصبے کی طرف، جہاں ساری ذہنی ہتک اور بے عزتی کے باوجود، لوگوں کی آنکھوں میں جان پہچان دکھائی دیتی تھی۔

برانچ لائن کی ریل گاڑی۔۔۔ چھوٹے چھوٹے اداس اسٹیشن اور بنجر پیڑ، کھیت، تاروں پر بیٹھی ہوئی چڑیاں

سونے پلیٹ فارم پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے آوارہ کتے اور اکیلا اسٹیشن ماسٹر۔

میں گھر لوٹ رہا تھا۔ برانچ لائن کی گاڑی کو لھے ہلاتی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ کھڑکی سے میں سونے پلیٹ فارم کو دیکھتا ہوں، تو ایک ڈبے کے باہر "ہنسیا ہتھوڑے" کا لال جھنڈا لگا نظر آتا ہے۔ پلیٹ فارم پر اتر کر میں تجسس بھری نظروں سے اس ڈبے کے مسافروں کو دیکھتا ہوں... میں لڑنے کے لئے اس ڈبے میں گھس جاتا ہوں۔ میرے ہندو عقائد اس کو برداشت نہیں کر پاتے۔ اندر پہنچ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ "جھنڈا" انقلابی سوشلسٹ پارٹی کا ہے... بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد کی پارٹی کا۔

اس ڈبے میں یوگیش چٹرجی اور یوپی پارٹی کے سکریٹری کیشو مشر سفر کر رہے تھے۔ میں اناپ شناپ سوال پوچھتا ہوں، ان سے جھگڑتا ہوں۔ پتہ چلتا ہے کہ وہ لوگ کسی میٹنگ کے سلسلے میں میرے شہر جا رہے ہیں۔ یوگیش چٹرجی مجھ سے میرے گھر کا پتہ لے لیتے ہیں اور تیسرے دن گھر پر دستک ہوتی ہے۔

مجھے لڑائی کا ایک مورچہ نظر آتا ہے، جس پر میرے ساتھ بہت سے ساتھی تعینات ہیں اور الہ آباد جا کر میں انقلابی سوشلسٹ پارٹی کا تھوڑا بہت کام کرنے لگتا ہوں۔ ساتھ میں پڑھائی جاری ہے۔ تمام کتابیں اور پرچے ہر روز ملتے ہیں، جن میں ہندستان کا ایک نیا نقشہ ہے... ہندستان کے باہر کے ملکوں میں چلنے والی عوامی لڑائی کی خبریں ہیں... ان افریقی اور غلام ملکوں کی خبریں ہیں، جہاں جنتا اپنی کھوئی ہوئی آزادی کے لئے لڑ رہی ہے۔

الہ آباد کے چوک میں گھنٹہ گھر کے پاس ہے پارٹی کا دفتر، جس پر وہ جھنڈا لہرا رہا ہے جہاں دور دراز سے لوگ سائیکلوں پر آتے ہیں اور کاغذوں، اخباروں کے بنڈل دبا کر لوٹ جاتے ہیں... سب کی آنکھوں میں کامیابی کی چمک ہے... دل میں آگ ہے۔

غازی پور میں کسانوں پر ظلم ڈھائے گئے ہیں۔ کانپور کے چمڑا کارخانوں کے مزدوروں کی چھٹنی ہوئی ہے چنگی کے صفائی داروغہ نے نوجوان ہتر انی کی عزت لوٹی ہے۔ دلی کی غیر ملکی سرکار نے عوام کی مرضی کے خلاف فرمان جاری کیا ہے۔ قومی نیتا آج صبح گرفتار کر لئے گئے۔ جنوبی افریقہ میں گوری سرکار نے گولی چلائی ہے۔

اور اسی تیزی سے قراردادیں منظور ہو رہی ہیں... مخالفت، احتجاج، ہڑتال، آندولن، تقریریں، پارٹی کا وہ چھوٹا سا کمرہ پارے کی طرح تھر تھراتا رہتا تھا۔

"جن کرانتی" اخبار نکلتا ہے اور میں اس میں انقلابیوں کے حالات زندگی لکھتا ہوں، وہیں پارٹی کے دفتر میں بیٹھ کر تمام کتابیں پڑھتا ہوں اور اپنی اصلی لڑائی کو پہچانتا ہوں۔ زندگی میں سب کچھ ہے، صرف پیسے نہیں ہیں۔ لیکن اب پیسوں کی کمی اتنی نہیں کھلتی۔ اس زندگی میں یہ دقتیں اٹھانی ہی پڑتی ہیں۔ ہم میں سے کسی کے پاس پیسہ نہیں ہے، کپڑا نہیں ہے، جوتے نہیں ہیں، بستر نہیں ہیں۔ تجاویز ہیں، تقریریں ہیں، تحریکیں ہیں، اس لئے سب کچھ ہے۔

⋆ ⋆ ⋆

تب ہی ملک آزاد ہوتا ہے اور شرنارتھیوں کی ٹرینیں الہ آباد پہنچتی ہیں۔ تقسیم کا زخم کھائے ہوئے لٹے پٹے، تھکے اور اجڑے ہوئے لوگ بدحواس آنکھوں سے چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ وطن میں قتل ہونے والوں کے غم کا بوجھ دل پر ہے... سب کچھ کھو کر بھی وہ ہارے نہیں ہیں... بازو لوٹ گئے ہیں، پیر کٹ گئے ہیں، آنکھوں میں بھیانک خوں آشامیوں کی پرچھائیاں ہیں، پر آدمی ہے کہ اپنے آپ سے عاجز نہیں آیا ہے۔

میں دوسرے رضاکاروں کے ساتھ دن رات ٹرکوں پر رسد اور دوسرا سامان لدوا کر گنگا پار شرنارتھیوں کے کیمپوں میں جاتا ہوں ... وہاں فوجیوں کی وہی بیرکیں ہیں جو کانپور چھاؤنی میں تھیں لیکن اب خالی ہیں، خستہ حال ہیں۔ ان ہی میں کیمپ کھلتے ہیں اور اجاڑ، ڈراؤنی، بیرکوں میں شرنارتھی ایک نئی زندگی شروع کرتے ہیں۔

وہ کنکریلی زمین صاف کر کے سبزیوں کی کیاریاں بنا لیتے ہیں۔ کوئی جنگلی پھولوں کے پودے بھی لگا لیتے ہیں۔ ہر صبح جب ہم رضاکاروں کے مرکز لیوہال سے ٹرکوں پر سامان لاد کر چلتے ہیں تو ان لوگوں کی شکلیں یاد آتی ہیں جو وہاں ویرانے میں پڑے ہماری راہ دیکھ رہے ہونگے۔ ہمارا ٹرک پہنچتے ہی وہ آپس میں لڑنے لگتے تھے، لیکن بعد میں ہر شخص کا حصہ خود لڑ جھگڑ کر دلواتے تھے اپنے چھوٹے ہوئے گھروں اور بچھڑے ہوئے لوگوں کو یاد کر کے رو پڑتے تھے۔

وہ بے چارے موت کا دریا پار کر کے آئے تھے۔

اور ایک دن سامان تقسیم کرنے کے بعد جب لوٹنے لگے تھے تو ایک ادھیڑ عورت ہمارے ٹرک کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ "بھراجی، ہمیں اسپتال پہنچا دو، بڑی مہربانی ہوگی"۔

اس عورت کا کوئی نہیں تھا۔ سب گھر والے مارے گئے تھے۔ وہ اکیلی ہی بھر موت کا وہی دریا پار کر کے آئی تھی اور دوسرے دن اس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا۔

* * *

"جن کرانتی" اخبار برابر نکل رہا تھا۔ اس میں کچھ زیادہ ہی لکھنے لگا تھا۔ اپنے آدرشوں سے اور بھی لگاؤ بڑھ گیا تھا ساتھیوں کا پختہ عزم، میرے ارادوں میں بھی پختگی لا رہا تھا۔ پارٹی کے دفتر میں ایک دن میں اکیلا تھا اور حکم ملا تھا کہ میں وہاں سے ہٹ کر نہ جاؤں۔ ہماری پارٹی کے نیتا، کانگریس کے لیڈروں سے کسی اہم مسئلے پر بات چیت کرنے دلّی گئے تھے۔

اس کے بعد لوٹ کر کوئی نہیں آیا۔ پارٹی کے ذمہ دار لوگوں نے کانگریس میں شامل ہونا منظور کر لیا تھا۔ ان کے بیانات اخبارات میں چھپے تھے۔ جنہوں نے حکومت میں ملنا منظور نہیں کیا تھا، وہ مایوس ہو کر اپنے گاؤں گھر لوٹ گئے تھے۔

میں دفتر میں بیٹھا لوگوں کی واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن کوئی نہیں آیا۔ ساری دستاویزیں، قراردادیں اور تقریریں ایک دن غلط ثابت ہوئیں۔

اور انتظار کرتے رہنے کے بعد جب گھبرا کر میں اپنے ٹوٹے آدرشوں کو لے کر سڑک پر آیا تو دنیا پھر بدل گئی تھی ایک خونخوار دنیا۔ مجھے بھوکے بھیڑیے کی طرح گھور رہی تھی۔

* * *

ادھر کالج کے امتحان میں، جھوٹا الزام لگا کر، دو سال تک شریک ہونے سے روک دیا گیا تھا اور میں اپنے سے ہارنے لگا تھا کہ تبھی کسی نے بہت اپنے پن سے کہا تھا ... سرکہ، پیاز اور روٹی بھی مل جائیگی تو بھی ہم کتنے خوش رہینگے گھبرانے کی کیا بات ہے؟۔

اور تب پھر سے پڑھائی شروع کرتے ہوئے میں الہ آباد کی لائبریری میں پہنچا تھا۔ وہاں دیواروں پر ویسی ہی تصویریں لگی ہوئی تھیں جیسی میری بیٹھک میں لگی تھی اور ایک لمحے کے لئے لگا تھا کہ جیسے اتنے برسوں کے بعد سدھارتھ انہیں تصویروں کو دکھاتے ہوئے مجھے بتا رہے ہوں — "یہ تصویر بابا کی ہے اور یہ بابو جی کی ہے"۔ جب بابو جی مرے تھے تب تو بہت چھوٹا تھا... بابا کو میں نے بھی نہیں دیکھا"۔

اور بھارتیندو ہریشچندر کی تصویر مجھے بابا کی تصویر کی طرح ہی دھندلی لگی تھی۔ ۔ ۔ اور پھر تھی، پریم چند کی تصویر، جب وہ مرے تب میں بہت چھوٹا تھا۔

اُسی دن سے میرا خاندان بدل گیا تھا۔

★ ★ ★ ★ ★

میرا ادبی سفر اس دن سے شروع ہوتا ہے جس دن میرا خاندان بدلا تھا، میں ایک ٹوٹتا ہوا زمیندار گھرانا چھوڑ کر پریم چند، یشپال، امرت لال ناگر کے گھرانے میں آ گیا تھا۔ مگر میرے گھرانے کے بدلنے کی خبر کسی کو نہیں ماں کو کچھ احساس ہو گیا تھا، وہ مجھ سے کبھی کبھی پوچھتی تھیں کہ پریم چند کون ہے؟ میں ان سے یہ پوچھتا تھا۔ یہ جن کی بیٹھک میں تصویر لگی ہے، یہ میرے کون ہیں؟

ماں کی آنکھیں بھر آتی تھیں میری بھی آنکھیں بھر آتی تھیں ۔ ۔ یہ سوچ کر کہ والد کا پیار ملا ہوتا تو شاید میرے ادھ کچرے بچپن اور ابتدائی عمر کا سناٹا کچھ کم ہو جاتا، مجھے کوئی بتاتا کہ یہ دنیا کیا ہے ۔ ۔ اس دنیا کا دستور کیا ہے ۔ ۔ ۔ والد کے ساتھ میلے میں جانے سے کیا سُکھ ملتا ہے ۔ ۔ ۔ ان سے پیسوں کے لئے جھگڑنے میں کیسی خوشی ہوتی ہے۔

مین پوری کا وہ بڑا سا مکان۔ مئی جون کی سائیں سائیں کرتی دوپہریا۔ اڑتی ہوئی دھولیں ۔ ۔ ۔ جلتی ہوئی دنیا ان دوپہروں میں نپٹ اکیلا میں، والد کو ڈھونڈتے ہوئے اس نکڑ والے کنوئیں پر جاتا تھا، جس کی پٹیا پر بیٹھ کر ان کی موت ہوئی تھی۔ اوپر چھیدرا سا نیم کا پیڑ ۔ ۔ ۔ سامنے بہتا گندہ نالہ ۔ ۔ بغل سے جاتی کنکر کی سڑک پر جاتا ہوا کوئی کھڑکھڑاتا یکّہ ۔ ۔ ۔ ہانپتا ہوا گھوڑا۔ دیوی کے استھان تک گاتی ہوئی جانے والی سہاگنوں کی ٹولی ۔ ۔ ۔

اے گورا میا ۔ ۔ ۔ اے درگا دیوی

ماتھا ٹیکوں، تہارے دوار

اے میا میری، ہم کو لیو بِسار

دھیرے دھیرے دور کنکر کی سڑک پر سہاگنوں کی ٹولی جلتی دھوپ میں پارے کی طرح کانپ کر کھو جاتی۔ ان کی آواز ڈوب جاتی۔ ہانپتا ہوا گھوڑا اڈے پر پہنچ کر رک جاتا۔ پھر سناٹا چھا جاتا۔

اور تب میں کنوئیں کی تپتی جگت پر چڑھ کر جھلملاتے پانی میں والد کا عکس ڈھونڈتے ہوئے آواز لگاتا۔

بابوجی ۔ ۔ ۔ بابوجی۔

آواز اینٹوں کے گول گھیرے سے ٹکراتی ہوئی نیچے پتلے ہوتے پاتال سے ٹکراتی، پانی کی جھلملاہٹ کچھ اور تیز ہوتی اور کنوئیں سے ٹھنڈی آواز آتی ۔ ۔ ۔ کون؟ کون؟

" بابوجی ۔ ۔ ۔ میں "

لیکن کنواں پھر خاموش ہو جاتا۔ نیم کی جھڑتی پتیاں چکراتی ہوئی اس اندھے کنوئیں میں کھو جاتیں۔ دوپہر کی سائیں سائیں بڑھ جاتی ۔ ۔ ۔ پھر لوٹ کر کوئی آواز نہیں آتی ۔ ۔ ۔

کئی بار اکیلا میں والد کو آواز لگانے گیا، پر وہ نہیں بولے۔ تب سے اپنا دل و دماغ وہ اندھا کنواں بن گیا ہے جس میں، میں مسلسل آواز لگاتا ہوں ۔ بابوجی! کوئی آواز پوچھتی ہے ۔ ۔ ۔ کون؟ اور جب میں کہتا ہوں ۔ ۔ ۔ بابوجی میں ۔ ۔ تو پھر کوئی جواب نہیں آتا۔

گھوڑے کے لئے اکّے والا تھا۔ سہاگنوں کے لئے گورامیّا تھیں، پر میرے لئے تو کوئی نہیں تھا۔ بابوجی میرے لئے تو سائیں سائیں کرتی دوپہری تھی۔۔۔ میں یہ بھی نہیں سوچ پاتا تھا کہ کہیں جانا پڑا تو ان کے بغیر کیسے جاؤں گا۔ پتنگ کے لئے کس سے کہوں گا۔۔ صبح جب بین کے بابو جلیبیاں لائیں گے تو میں کس سے کہوں گا — بابوجی۔۔ جلیبی کھائیں گے۔۔۔۔!

مجھے اچھی طرح یاد ہے، امتحانوں کے دنوں میں رمیش کے بابو شیاما چرن، بین کے بابو بینچے لال اور مُنّوا کے ابا مختار صاحب، اپنے بیٹوں کے لئے پنسلوں کی نوک بنا بنا کر دیا کرتے تھے۔۔ اور چبوترے تک بیٹھ ٹھونکتے ہوئے اپنے بچوں کو پہنچا جاتے تھے۔ جہاں سے ہم ٹولی بنا کر امتحان دینے اسکول جاتے تھے۔۔۔ تب میری انگلیوں میں خون سے رنگی پٹیاں بندھی ہوتی تھیں، کیونکہ تیز بلیڈ سے میں اپنی پنسلیں خود چھیلتا تھا۔ دھول ملا پسینہ جب کٹی انگلیوں میں جا کر چرچراتا تھا تو کاپی پر "سن آف جگدمبا پرساد" لکھتے لکھتے آنکھیں چھلک آتی تھیں۔۔۔ اور والد کا لکھا ہوا وہ نام کنوئیں میں جھلملاتے پانی کی طرح جاگ کر چپ ہو جاتا تھا۔

جب بابوجی اتنے پتھر دل ہو گئے تو میں نے خاندان بدل لیا اور ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔ ایک بار لکھا تو ان سے پورا بدلہ لے لیا۔ "سمندر میں کھویا ہوا آدمی" میں انھیں میں نے اپنے بیٹے کا انتظار کرتے اور تڑپتے اسی طرح دیکھا۔ جس طرح میں حقیقی زندگی میں انتظار کرتا اور تڑپتا رہا ہوں۔ پر یہ تو بہت بعد کی بات ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔۔۔ رام لیلا میں راون دہن ہو چکا تھا۔۔ میرے سب دوست میلے سے اپنے اپنے والد کے ساتھ گھر لوٹ گئے تھے۔ راون کے پتلے کی جلی ہوئی کھپچی سے میرا پیر جل گیا تھا اور میں بلبلاتا ہوا وہیں گر پڑا تھا، تب اس اندھیرے میں ایک آواز آئی تھی، کون؟

اور میں نے دیکھا تھا — کرادلی کے موٹر اڈے پر چاٹ مٹھائی کا ٹھیلہ لگانے والا حلوائی مجھ سے کہہ رہا تھا — "کیوں بیٹا، پیر جل گیا۔۔۔۔ چچ چچ۔۔۔"

اکھڑتے میلے سے لوٹتے ہوئے اس نے اپنے تھال کو سرکا کر سائیکل ٹھیلے پر میرے لئے جگہ بنا دی تھی اور اس میں بٹھا کر تین میل چل کر گلی کے نکڑ تک مجھے چھوڑ گیا تھا۔ راستے میں اس نے بہت باتیں کی تھیں۔ ان میں سے ایک ہی اب تک یاد ہے۔ "بیٹا! اس دنیا کا کوئی باپ نہیں ہے۔۔۔ چاہے جتنے راون جلاؤ، چاہے جتنے رام جی سجاؤ"

مجھے نہیں معلوم کہ میلے میں میرے پیر جل جانے پر میرے والد جگدمبا پرساد کیا کہتے، لیکن اس باپ نے جو کہا تھا، شاید اسی کہانی کا روالد ڈھونڈتے رہے تھے۔

میں یہاں بہت ہی انکساری سے عرض کرنا چاہوں گا کہ پریم چند کی روایات کے دعویداروں سے مجھے کوئی پرہیز نہیں ہے، کیونکہ وہ پریم چند کی روایات کے دعویدار ہیں اور میں صرف پریم چند کے نقطۂ نظر کا ایک ادنیٰ پیروکار ہوں۔ جو پریم چند کی روایات کے مقلد ہیں وہ واتسایئن کے جنسی انداز فکر کو سراہ سکتے ہیں، علیٰحدہ اور شکستہ حال انفرادیت پسندی میں اپنی تسکین کا سامان پا سکتے ہیں اور بڑے بھولے پن سے کہہ سکتے ہیں، آندولن میں اچھی کہانی نہیں لکھی جاتی۔ اچھی کہانی گہرے فکر و احساس کی بدولت جنم لیتی ہے اور پھر وہی لوگ آسان کہانی کا میرل آندولن چلاتے ہیں۔

میرے لئے میرا پریم چند وہ کرادلی کے موٹر اڈے کا حلوائی ہے جو کہتا ہے، "اس دنیا کا کوئی باپ نہیں ہے۔۔۔ چاہے جتنے راون جلاؤ، چاہے جتنے رام جی سجاؤ۔" صحیح ادبی نظر اگر مجھے پریم چند سے ملتی ہے تو صحیح زندگی کی نظر مجھے چاٹ مٹھائی لگانے والے سے ملتی ہے۔۔۔ میرا پریم چند وہ ٹھیلے

والا ہے، یہی میں نے پریم چند سے سیکھا ہے اور یہی پریم چند کی دین ہے۔

اوپر سے طرہ یہ کہ وہ معصوم ادیب بڑے بھولپن سے کہتے ہیں — لیکن برائیاں ہیں تو بس دو۔ ایک تو یہ کہ اس دھندے میں کہانی بدنام ہو جاتی ہے اور دوسری یہ کہ جہاں دوچار ہوشیار کھلاڑی، شعبدہ بازی دکھا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں، وہاں پچاسوں نئے لکھنے والے، جن کی حوصلہ افزائی کی جاتی اور ڈھنگ سے رہنمائی کی جاتی تو وہ کچھ اچھی چیزیں بھی دے سکتے تھے۔ مگر وہ بیچارے ہمیشہ کے لئے بھٹک جاتے ہیں۔

انھیں معصوم ادیبوں کو اگر یاد دلاؤں تو شاید بھائی جان تلملا اٹھیں گے، کہ جب سن ساون اٹھاون میں ایک کملیشور نام کے نئے ادیب کا دوسرا افسانوی مجموعہ "قصبے کا آدمی" آ رہا تھا تو انھوں نے اپنے پرانے افسانوی مجموعے "ترنگے کفن" کا نام بدل کر "قصبے کا ایک دن" کر دیا تھا۔ یہ شاید شعبدہ بازی نہیں تھی بلکہ ادبی فریضہ تھا کیونکہ آزاد ہندوستان میں "ترنگے کفن" سے خطرہ تھا اور ادب میں قصبے کی کہانی، گاؤں کی کہانی، برفپوش پہاڑیوں کی کہانی، شہری کہانی وغیرہ چل نکلی تھی۔ اس لئے قصبے کا ایک دن، عنوان ادبی فریضہ بن گیا تھا۔

دوسری طرف ہمارے کٹر مذہبی ہندو رائٹر ہیں جو کہتے ہیں۔ "انسان کے دل میں دست دعا اٹھانے کی خواہش ہی پرمیشر کی پہچان ہے"۔ یہ لوگ برابر ذاتی طور پر خطوط لکھ کر ادیب کے دل میں جذبہ عبودیت کی کھوج لگاتے رہتے ہیں۔ مگر ظاہری طور پر "اپنے معبودوں" کو یہ سمجھاتے رہتے ہیں کہ ان کے دل میں بغاوت کے شعلے بھی لپکتے رہے ہیں۔ اپنے ادبی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے اس قسم کا جو دورخہ کھیل کھیلا جاتا ہے اس سے میرا کوئی سروکار نہیں رہا ہے۔ تاریخ ادب میں باقی رہنے کے لئے جو لوگ سانس لے رہے ہیں انھیں ادب اور ادب کی تاریخ مبارک ہو۔ میں اپنے زمانہ میں ساری دشواریوں، بدصورتیوں اور تمناؤں کے ساتھ جی رہا ہوں۔ .. اس لئے نہ میں ایشور کو آواز دے سکتا ہوں نہ "نارائنوں" کا ساتھ دے سکتا ہوں۔ میں اپنے ہم عصر آدمی کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا ... کیونکہ میرے دور میں ہر باپ اپنے باپ کو کھوج رہا ہے۔ اس لئے میری تنہا کھوج اگر کوئی اہمیت رکھتی ہے تو اس اجتماعی کھوج کے پس منظر ہی میں۔ من کے اندھے کنویں میں اب کملیشور کے والد کو ڈھونڈنا بے معنی لگتا ہے۔ کیونکہ عام آدمی کی تکلیف کا پتہ لگانا زیادہ اہم اور ہمہ گیر ہے۔

یہاں سے ان کہانیوں کی شروعات ہوتی ہے، جنھیں کچھ برسوں بعد ہندی کے افسانوی ادب میں "قصبے کی کہانیاں" کہا گیا۔ میرا گھرانہ اسی وقت یکایک بہت بڑا ہو گیا تھا۔ پورا مین پوری قصبہ، اس کے لوگ، اس کے پیڑ، سڑکیں، گلیاں، کتے، نالے، گھاس، کنویں، چوراہے، سب کی درد بھری داستانیں میری ہو گئی تھیں۔ چبوترے پر بیٹھ کر کھانستے ہوئے سید علی پینٹر، چنگی کے چوراہے پر چائے کی ٹین شیڈ دکان لگائے چائے بابو، مین پوری کی تمباکو کھاتے جوہری دید جی، اپلیٹ آئے بس اڈے پر کام کرتے ہوئے کلینر اور ڈرائیور، سب کی کہانیاں میری ہو گئی تھیں۔

سچ مچ وہ زمانہ بڑا تکلیف دہ مگر بے مثال تھا۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا تھا کہ ان کی داستانیں صرف مجھے معلوم ہیں۔ .. حیرت کی بات یہ تھی کہ ان تمام لوگوں کی چوٹ لگنے کا درد تو ہوتا تھا، تپ دق، بخار، دمہ سے ہونے والی تکلیف کا بھی پتہ تھا۔ مگر انھیں اپنی بے بسی، بدحالی، انتہائی غربت اور خستہ حالی زندگی کے اسباب کا احساس تک نہیں تھا۔ انھیں ایک بنی بنائی زندگی کا ڈھرہ دے دیا گیا تھا، جس میں عورت بچے پیدا کرنے کی مشین اور مرد کی ہوس کی تسکین کا ذریعہ تھی۔ بھنگی، غلاظت اور گندگی صاف کرنے کے لئے تھے، مہرن برتن مانجھنے کے لئے تھی۔ سپیرے صرف سانپ کا کھیل دکھانے کے لئے تھے، حجام پشت در پشت حجامت بنانے کے لئے تھے۔ منڈی کے آڑھتئے صرف منڈی کے لئے تھے۔ چاٹ والے بس

خوانچے لگاتے تھے۔ سائیکل ریپئر کرنے والے صرف سائیکلیں سنبھالتے تھے، چاقو، چھریوں پر سان چڑھانے والے تاعمر صرف سان چڑھانے والا چکر کھینچتے تھے، مختار، مختار ہی رہ جانے کے لئے تھے، منیم منیم بنے رہنے کے لئے مجبور تھے۔۔۔

سب کچھ رکا ہوا تھا۔۔ جن کو میں نے سواریوں کا انتظار کرتے اور اسٹیشن پر اپنا یکہ لگائے بوڑھا ہوتے ہوئے دیکھا لگا تھا کہ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے بوڑھا ہو گیا ہے۔ وہ چائے بابو جو شروع شروع میں بڑے دم خم سے قصبے میں چائے، سوڈا، لیمن کی دکان لگا کر بیٹھے تھے، اسی ٹین کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے بیت گئے، کرم چند، چھینٹ اور گنجی کا کپڑا ناپتے ناپتے ہی پوپلے ہو گئے۔ ڈاکڑ دوبے کے کمپاؤنڈر کنجی بابو، مکسچر کی شیشیوں پر خوراکوں کے نشان چپکاتے چپکاتے، ہی تپ دق کے مریض ہو گئے۔ رحمانی کنس اور راون کے پتلے بناتا کر اسی کچے گھر میں سانپ کاٹنے سے مرگیا، اور رحمان کا سوتیلا بیٹا پتلے بنانے لگا اور وہ گھر ویسا ہی اور وہیں رہا، سانپوں کا ڈر کبھی ختم نہیں ہوا غفورا لکڑیاں کاٹتے کاٹتے اور تاڑی پی پی کر ایک دن کلہاڑی سے سر کٹائے یوں ہی سوتا سوتا چلا گیا۔ رمیش کی بواجی اسی طرح دریاں بنتی بنتی نیم پاگل ہو گئیں۔ کوئی لڑکا قصبہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ کوئی بھاگا ہوا مار کھا کر پھر لوٹ آیا۔

اور املی کے پیڑ موسم پر اسی طرح پھولتے رہے۔ کالی آندھیاں اسی طرح آتی رہیں۔ تیج، تہوار اپنی تاریخوں پر لوٹتے رہے کچہریوں میں مقدمے چلتے رہے۔ پرانے ڈاک بابو کی جگہ نئے ڈاک بابو ٹرانسفر ہو کر آتے رہے۔ فرخ آباد کے کوتوال مین پوری میں آگئے۔ مین پوری کے کوتوال آگرہ چلے گئے۔ پسینجر گاڑیوں سے دیر سویر لوگ آتے رہے۔ بسوں سے اتر کر لوگ سرائے اور منڈیوں میں خرید فروخت کرتے رہے۔ مگر میری مین پوری کا آدمی وہیں رہا، ویسا ہی رہا، اس کے لئے کہیں کچھ نہیں بدلا۔ اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ کہیں کچھ بدلتا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ کہیں کچھ بدلنا چاہئے۔

اسی ماحول میں میرے افسانے "گرمیوں کے دن، راجہ نربنسیا، مُردوں کی دنیا، دیوا کی ماں، قصبے کا آدمی، ایک سڑک ستاون گلیاں (ناول) بھٹکے ہوئے لوگ، بیکار آدمی اپنی آنکھیں کھولنے اور سانس لینے کے لئے مجبور تھے۔

یہ دن انقلابی اور سماج وادی پارٹی کے ساتھ کے دن تھے، یہی دن میرے بھائی سدھارتھ کی موت کے دن تھے۔ جن پر ٹوٹے ہوئے خاندان کی ساری امیدیں لگی ہوئی تھیں۔ کیونکہ سدھارتھ کے لائق ہوتے ہی ہمارے گھر کی حالت سدھر جاتی۔ یہ دن بڑے بھائی سنادادا کی جدوجہد کے دن تھے، جب وہ اٹھارہ روپے ماہوار کی تنخواہ سے پورا گھر کسی طور چلا رہے تھے، یہی دن میری ماں کے دکھوں کے دن تھے۔ جب وہ مجھے آگے پڑھانے کیلئے بھیج رہی تھیں اور میری مین پوری مجھ سے چھوٹ رہی تھی۔ ٹین کے چھوٹے سے سوٹ کیس میں میری تین قمیصیں، ایک کرتہ اور تین پائجامے رکھ کر ماں نے مجھے بن باس دے دیا تھا اور خود جیسے گندھاری کی طرح آنکھوں پر آنسوؤں کی پٹی باندھ کر، سکھ دکھ سے الگ ہو کر وہ اس مین پوری والے گھر میں بالکل اکیلی رہ گئی تھیں، جگن ناتھ ٹیلر ماسٹر کو اسٹیشن بھیج کر انھوں نے پہلے ہی الہ آباد تک کا ریل کا کرایہ دریافت کر لیا تھا جو انھوں نے دھیرے دھیرے جوڑا تھا۔ چلتے وقت ریل کرائے کے ساتھ راستے کے خرچ کے لئے انھوں نے بارہ آنے اور دو پیسے رکھے، یکے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ پیسے بھی نہیں تھے اس لئے بچپن کے دوست بین اپنی سائیکل لئے کھڑے تھے۔ چلتے چلتے ماں نے میری ہتھیلی میں تانبے کا ایک پیسہ تھما دیا تھا اور کہا تھا " راستے میں ندی پڑے گی اس میں چڑھا دینا "۔۔۔

ڈگمگاتی سائیکل پر جب اپنا چھوٹا سا ٹین کا سوٹ کیس سنبھالے میں کیریئر پر بیٹھ کر چلا تھا تو میں نے وہی آنسوؤں کی پٹی آنکھوں پر باندھے اپنی گندھاری ماں کو پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ گلی کے لوگوں سے کہہ رہی تھیں " کیلاش آگے پڑھنے جا رہا ہے۔"

ہاتھ میں ٹین کا بکس تھا، بائیں بازو سے جب میں نے آنکھیں پونچھیں تو بین کی سائیکل ڈگمگا گئی تھی۔

وہیں نالے کی نیچی دیوار پر بیر لٹکا کر بن نے سانس لی تھی۔ "یار کیلاش تو بی اے، ایم اے کر لے گا تو سمجھو لنگا میں نے کر لیا۔ ہمیں تو جولائی میں نوکری مل جائیگی۔۔۔ تم الہ آباد سے آنا تو سائیکل کی گدی کے لئے ایک کور لیتے آنا۔۔۔ یہ سالی اسپرنگ بہت کاٹتی ہے"

بن نے مجھے اسٹیشن پہنچا دیا تھا اور پسنجر گاڑی سے شکوہ آباد ہوتا ہوا میں الہ آباد پہنچ گیا تھا۔

مین پوری کی یادوں سے بھاگنے کے لئے باہر دیکھنا بہت ضروری تھا۔ راستے بھر میں ندی، نالے، کھیت، پیڑ، طرح طرح کی گھاسوں اور چڑیوں کو دیکھتا، اپنے میں ڈوبتا ابھرتا چلا آیا تھا۔ پھر تو اتنی بار الہ آباد اور مین پوری کے درمیان سفر کیا کہ قریب قریب ہر شہر آنے کا پتہ کوئی خاص پانی کی ٹنکی، کوئی خاص پیڑ، کوئی خاص آواز یا کوئی چڑیوں کا جھنڈ اس جگہ کی بھنک دیتی تھی۔

الہ آباد پنت، نرالا اور مہادیوی کا شہر تھا، یہ مجھے بہت بعد میں پتہ چلا تھا۔ میرے لئے الہ آباد محتشم گنج تھا، ہیویٹ روڈ تھا، بادشاہی منڈی تھا، زیرو روڈ تھا، بہادر گنج تھا اور چوک تھا۔ میری دنیا پنت، نرالا اور مہادیوی کی دنیا نہیں تھی۔ میری دنیا میں اس وقت بیڑی بنانے والے، دودھ دینے والے، پنڈے، موتی محل سینما کے گیٹ کیپر، نانبائی، اے جی آفس میں کام کرنیوالے، اگروال کالج کے سامنے اخبار بیچنے والے، ہنس پرکاشن کے سامنے رات کو پراٹھے سبزی کے خوانچے لگانے والے اور چیٹرجی ٹیلر کے اوپر جو تھے ملے پر انقلابی پارٹی میں کام کرنیوالے ساتھی تھے۔ سب ہی پریس کے کمپوزیٹر وغیرہ۔۔۔ اور تھے راجہ آرٹسٹ جو بعد میں مایا کے لئے اسکیچز بنانے لگے تھے۔۔۔ اور تھے یوسف بھائی جو 'راجہ سائن آرٹ' کے نام سے الہ آباد کی دکانوں کے لئے سائن بورڈ پینٹ کیا کرتے تھے۔

ان سب میں لگاتار دو باتیں نظر آتی تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ سب ہی لوگ کہیں نہ کہیں اپنے عقائد اور روایات سے جڑے ہوئے تھے، ہر ایک کے من میں ندی میں پیسہ چڑھانے کا دستور تھا اور دوسرے یہ کہ ہر ایک کی سیٹ کی کوئی نہ کوئی اسپرنگ کہیں پر کاٹ رہی تھی۔

یہ سب ہی لوگ بڑے دھاردار تھے۔ انتہائی انسان، لیکن ساتھ ہی بدکار، من موجی، بدمعاش، غصیلے، خود غرض، فیاض اور نرم دل۔ عجیب تھی یہ دنیا۔۔۔ ہر ایک کے پاس ایسا کچھ تھا جو دوسرے کے پاس نہیں تھا۔ لیکن ایسا کچھ بھی تھا جو سب ہی کو ایک سا کاٹ رہا تھا۔

نام نہاد ادب کی دنیا سے تو میری ملاقات بہت بعد میں ہوئی۔ میں تو اپنی یہ دنیا لے کر آیا تھا۔ اسی دنیا کے لئے مجھے لڑنا تھا۔ لڑائی کہیں بھی ہوتی، میں اسی کے لئے لڑتا۔ پر ہوا یہ کہ یہ لڑائی مجھے ادبی حلقہ میں لڑنی پڑی۔ یہ طاقت مجھے اس بات سے ملی تھی کہ مجھ سے پہلے تمام لوگ یہی لڑائی لڑنے کا تہیہ کر چکے تھے۔ یہ مجھے اس وقت پتہ چلا جب میں نے ادب کا مطالعہ شروع کیا۔ ورنہ میں تو سائنس کا طالبعلم تھا، مجھے ادب وَدب سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ سچ پوچھئے تو مجھے اگر حقیقت پسند ادیبوں کی صحتمند اور توانا روایات نہ ملتیں تو میں ریلوے کا گارڈ یا انجینئر ہوتا اور وہاں ان لوگوں کے ساتھ مل کر لڑ رہا ہوتا۔

لیکن مجھے توانا روایات کے ساتھ ساتھ ملے دشینت، جتندر، اوم پرکاش سرلواستو، امرکانت، اونکار، اجیت، بریندر، ہندی دتا، مارکنڈے، ستیش پانڈے، رام کمار ورما، دھرم ویر بھارتی، امرت رائے، اوپندر ناتھ اشک، بلونت سنگھ جیسے لوگ، جن سے بحثیں بھی ہوئیں، لڑائیاں بھی لڑی گئیں اور اپنے پن کی بے حد خوبصورت گھڑیاں بھی گزریں۔

اس کے بعد تو گھمسان سنگرام کا دور ہے۔

نئی کہانی آندولن ۔۔۔۔ الہ آباد کا ادبی اجتماع اور ترقی پسند ادیبوں کی محفلیں، دلی، علی گڑھ، میرٹھ، چنڈی گڑھ، ناگپور اور پھر وہ کلکتہ کا "کتھا کار سمیلن"۔۔۔ چھوٹے چھوٹے قصبے میں ادبی محفلیں، موہن راکیش، راجندر یادو کے ساتھ لمبی لمبی ملاقاتیں اور بحثیں۔

دلی کے وہ دن ۔ نریش بیدی، جینت گڈکر، پردومن سنگھ اور وقفے وقفے سے ملتے رہنے والے اردو کار

کھوئی ہوئی دشائیں، اپنے دیش کے لوگ، دلی میں ایک موت، مانس کا دریا، جارج پنجم کی ناک، نیلی جھیل، کچھ نہیں کوئی نہیں، جو لکھا نہیں جاتا، پرایا شہر، ڈاک بنگلہ، لوٹتے ہوئے مسافر، تیسرا آدمی ۔۔۔ لکھے جانے کے دن۔

اور پھر بمبئی میں سمانتر فکر کا ایک وسیع اسٹیج جس میں سب ہی زبان کے ادیب شامل ہیں ۔۔۔ جنھوں نے مجھے نظر عطا کی۔

یہ سب تو آپ کے سامنے ہیں۔ ان ہی دنوں لکھی گئیں ۔ جو کھم، راتیں، اتنے اچھے دن، نا گمنی بیان، مان سرور کے ہنس، لاش، ہوا ہے ہوا کی آواز نہیں ہے، کتنے پاکستان، کالی آندھی، اگامی اتیت وغیرہ۔

یہ سب میرے قارئین کے لئے ہیں۔ مجھے تو سب سے بڑا سنتوش ہے وہ یہ کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ لفظ لفظ پوری طرح پڑھا گیا، اس لئے زندگی چھوڑ کر تاریخ میں جانے کی ضرورت مجھے اب تک محسوس نہیں ہوئی۔

آخر میں اتنا کہ "میں" میں "نہیں ہوں ۔ میں صرف ایک فرد ہوں اور میرے زمانے کے لوگ ۔ عام لوگ اور میرے زمانہ کے سمانتر اور وابستہ اور کا میٹیڈ ادیب مجھے لگاتار پورا کرتے ہیں۔

(ترجمہ ۔ سعود الیوبی)

کملیشور

راتیں

شاردا بائی، سُندری بائی اور تارا بائی کی کہانی تم نے نہیں سُنی؟ تو تم تھے کہاں؟ کس ملک میں رہ رہے تھے؟ اگر ان تینوں کی داستان الگ الگ سنو گے تو شاید کسی انجام پر نہ پہنچو گے، کیونکہ طوائف طوائف ہی ہوتی ہے۔ طوائف بنی رہنے کے علاوہ کچھ کر بھی نہیں سکتی۔ اگر ان کو یہ بتا دیا جائے کہ وہ اونچے گھرانے کی ہیں تو اُن میں ایک قدرتی فخر آجاتا ہے۔

شاردا بائی ویسے ہی مشہور تھی جیسے متھرا کی باسوّدتا رہی تھی۔ شاردا بائی کے روپ، حسن اور شباب کی کہانیاں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ آل انڈیا طوائف بازار میں یہ بات زور پکڑتی جا رہی تھی کہ شاردا بائی جیسی حسینہ صرف ایک ہی بازار میں اپنا تمام وقت نہ گذار دے۔ اُس کو ملک کے دوسرے بازاروں میں بھی آکر رہنا چاہیئے تاکہ جگہ جگہ کے بازار جی اٹھیں۔

طوائف منڈی کے عالموں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ طوائف کی جگہ بدل بدل کے پیشہ کرنے کی روایت شاردا بائی سے ہی شروع ہوئی۔

وہ اپنے اس عالم و فاضل کی عزت کرتے ہیں جس نے یہ نیا منصوبہ بتایا کہ طوائفیں بھی نقل مکانی کرتی رہیں اور نئی جگہوں کی سیر و تفریح کرتی رہیں۔

اس منصوبے کے تحت طوائفوں کے پیشہ میں ایک انقلابی تبدیلی آئی عورتیں بھی کچھ نہ کچھ کمانے کے قابل ہو گئیں۔ بہر حال یہ مسئلہ دوسرا ہے بات شاردا بائی کی ہو رہی تھی۔

شاردا بائی جب پندرہ سال کی ہوئی تو اس کے حسن کا ڈنکا بجنے لگا۔ اُستاد موسیقی اور عالمِ رقص میں یہ مقابلہ ہونے لگا کہ شاردا بائی کو موسیقی کون سکھلائے اور کون رقص۔ سبھی کو بھروسہ تھا کہ شاردا بائی قیامت ڈھائے گی اور استاد کا نام روشن کرے گی۔ آخر کار شاردا بائی کے خاندانی استاد کی ہی جیت ہوئی کیونکہ شاردا بائی کی ماں نے اپنی روایت توڑنے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔

آخر کار جب شاردا تمام صلاحیتوں میں پوری ہو گئی تو ایک دن اُس کی پہلی رات کا اصولاً اعلان کیا گیا۔ بسنت کا دن منتخب کیا گیا۔ تمام شہر میں یہ بات آناً فاناً پھیل گئی۔ کہ شاردا بائی کی پہلی رات بسنت کی رات ہو گی۔ شہر سے باہر بھی یہ خبر پھیل گئی اور اس حسینہ کی پہلی رات کے لئے طرح طرح کے روڑے اٹکائے گئے اور نئی نئی خبریں اڑیں۔ کبھی کہا جاتا کہ کسی جہاراجہ نے اسکی پہلی رات خرید لی ہے کبھی کسی راجکمار کا نام لیا جاتا۔ یہ خبر تو یہاں تک پھیل گئی کہ

کملیشور نمبر

ایک مہاراجہ اور اس کے خزانچی میں جھگڑا ہوگیا اور خزانچی نے مہاراجہ کو روپے دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ خود بھی
رات خریدنا چاہتا تھا۔

نوابوں، راجاؤں، مہاراجوں، راجکماروں، امیروں، زمینداروں جاگیرداروں کے درمیان
اندر ہی اندر یہ رسہ کشی چل رہی تھی کہ شاردا بائی کس کو ملتی ہے۔ ایک طرح سے یہ عزت کا سوال بن گیا تھا جوں جوں
بسنت کا دن قریب آ رہا تھا قیاس آرائیاں بڑھتی جا رہی تھیں مسلسل یہی ذکر چلتا رہتا کہ شاردا بائی کی ماں نے فلاں
راجہ یا نواب کی بات ٹھکرا دی ہے یا فلاں تعلقہ دار کے آدمیوں کو گھر میں نہیں گھسنے دیا۔

آخرکار ایک روز سب کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں جب پتہ چلا کہ تمام نوابوں اور راجاؤں کی کوششیں
بیکار ہو گئی ہیں۔ ان کے بجائے ایک ۱۸ سالہ جوشیلے نوجوان نے بازی جیت لی ہے۔ اس کا نام ہے مگن لال جھگن لال دارو والا
یہ نوجوان اپنے کروڑپتی باپ کے پیسوں پر ہی عیش کر رہا تھا۔ خاندان بہت اونچا تھا۔ طرح طرح کے کام دارو والا
کے ہاں ہوتے تھے۔ آسام اور نیل گری کے چائے کے باغات میں خاصہ حصہ بھی ان کے پاس تھا۔ بنگال کے پٹ سن
بازار میں اس گھرانے کا اجارہ تھا۔ کپاس بازار میں اس گھرانے کا طوطی بولتا تھا۔ امریکی تیسر بازار بھی دارو والا
خاندان کی خرید و فروخت پر نظر رکھتا تھا۔ کئی بینکوں میں اس کی حصہ داری تھی۔ جاوا، سماترا اور ادھر افریقہ کے
بازاروں کے بیوپار میں ان کا پچپن پیسے کا حصہ تھا۔

ان تمام باتوں کا بھی لوگوں کو آہستہ آہستہ تب پتہ چلا جب ایک ایک کر کے مہاراجوں میں مقابلہ
شروع ہوا تھا۔ ورنہ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ دارو والا نام کا خاندان اتنا پُرعظمت اور بڑا ہے۔ خبریں پھیلتی گئیں اور
مگن لال جھگن لال دارو والا کا نام گونجنے لگا اور شاردا بائی کی قسمت کی تعریف ہونے لگی۔ آخر بسنت کا دن
آیا۔ سہیلیوں نے شاردا بائی کا ہار سنگار کیا۔ مگن لال جھگن لال دارو والا کی دلچسپیوں کا پتہ لگا کر عطر اور پھولوں کا
انتخاب کیا گیا، بال سنوارے گئے اور پوری دھوم دھام کے ساتھ شاردا بائی کو دار جلنگ والی کوٹھی میں شام سے
پہلے پہنچایا گیا اور شاردا بائی نے اپنی پہلی رات گزار دی۔

اس وقت شاردا بائی سولہ سال کی تھی اور مگن لال جھگن لال دارو والا اٹھارہ سال کا۔

یہ وہی وقت تھا جب جاپان نے روس پر فتح پائی تھی اور ہندوستانی سیاست میں ایک نیا موڑ
آیا تھا۔ ۱۹۱۴ء کی کڑاکے کی سردی میں فلینڈرز اور فرانس کے میدانوں میں ہندوستانی فوجیں مقابلہ کر رہی
تھیں۔ سریندر ناتھ بنرجی اور اینی بیسنٹ قومی افق پر نمودار ہوئے تھے۔

انہی دنوں گوکھلے کا دیہانت ہوا۔ تلک مانڈلے جیل سے رہا ہوئے۔ لالہ لاجپت رائے نے امریکہ
میں جلا وطنی کا وقت گزارا۔ ہوم رول لیگ کا قیام ہوا۔ لکھنؤ کا کانگریس اجلاس ہوا۔ ہندوستانیوں نے ذمہ دار
حکومت کا مطالبہ کیا۔ انگریزوں نے پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست دی۔ ہندوستان میں انگریزوں کے
خلاف جہاد تیز ہوا۔ رولٹ بل پیش ہوا۔

گاندھی جی نے ستیہ گرہ ختم کیا۔ جلیانوالا میں قتل عام ہوا۔ عدم تعاون کا عزم اور حمیاوِن ستیہ
گرہ کی بنیاد رکھی گئی۔ گاندھی جی کا اپنڈیسائٹس کا اپریشن ہوا۔ موتی لال نے سوراج کی بات اٹھائی۔ سائمن
کمیشن کا بائیکاٹ کیا گیا۔ لاہور کانگریس میں جواہر لال نہرو نے نئی امنگ سرایت کی۔ ڈانڈی یاترا اور نمک

ستیہ گرہ ہوا۔ موتی لال نہرو سورگباش ہوئے۔ بہار میں خوفناک بھونچال کی وجہ سے بیس ہزار لوگ مارے گئے دس لاکھ گھر برباد ہوئے۔

غرض کہ اٹھارہ سال گزر گئے۔ اس درمیان اور بہت کچھ ہوا۔ شاردا بائی نے اپنی پہلی رات گزار کے درمیانہ طبقہ کے ساتھ اپنا پیشہ شروع کیا۔ پھر مگن لال جھگن لال دارو والا کو فرصت نہ ملی کہ وہ شاردا بائی کی یاد دل میں لاتے۔ ایک رات تھی سو گزر گئی۔ شاردا بائی اپنے دھندے میں لگ گئی۔

اس دوران مگن لال جھگن لال نے اپنے اپنے گھر کا کاروبار سنبھالا ——

—— ایک کروڑپتی گھرانے میں ان کی شادی ہوئی۔ باپ کا دیہانت ہوا اور وہ تمام دولت کے مالک بن گئے۔

ان دنوں، شاردا بائی کی بیٹی سندر بائی کی دھوم بازار میں شروع ہوئی۔ کہتے ہیں کہ بیٹی نے حسن میں اپنی ماں کو بھی دس قدم پیچھے چھوڑ دیا۔ سندر بائی کی خوبصورتی کا مقابلہ شاردا بائی اپنی جوانی میں بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ابھی سندر بائی سترہ سال کی ہی تھی لیکن اس کے روپ اور حسن کا چرچا جگہ جگہ ہونے لگا تھا۔ آخر شاردا بائی نے اپنی بیٹی سندر بائی کی پہلی رات کا اعلان کیا۔

پھر نوابوں، راجاؤں، مہاراجوں، زمینداروں، امیروں میں مقابلہ ہوا۔ سندر بائی کی پہلی رات خریدنے کے لئے پھر بسنت کی پہلی رات طے ہو گئی۔

آخر کار وہ دن بھی آیا کہ سب کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ جب معلوم ہوا کہ سب راجاؤں مہاراجوں کی کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ ان کی بجائے ۳۵ سالہ ایک دولت مند نے بازی جیت لی ہے۔ اس دولت مند کا نام بھی لوگوں کو معلوم ہوا۔ سیٹھ مگن لال جھگن لال دارو والا۔

شاردا بائی نے اپنی تقدیر کو سراہا۔ اپنی بیٹی سندر بائی کو سیٹھ کی تمام عادتوں اور نزاکتوں سے آگاہ کیا۔ طرح طرح کی نصیحتیں کیں اور اس کے تابناک مستقبل کے لئے نیک خواہشات ظاہر کیں۔ اسے یہ بھی بتایا کہ آدمی کو جو عادتیں جوانی میں پڑ جاتی ہیں وہ برقرار رہتی ہیں۔ لہذا سیٹھ سے گھبرانے یا ڈرنے کی ضرورت نہیں، وہ بہت نازک مزاج اور حسن پرست و رسیلا آدمی ہے۔

پوری طرح تیار ہو کر سندر بائی نے اپنی ماں شاردا بائی سے وداع لی۔ اس مرتبہ پہلی رات کا انتظام دارو والا کے اوٹی والے بنگلے میں کیا گیا۔ اور سندر بائی نے اوٹی بنگلہ میں مگن لال دارو والا کے ساتھ اپنی پہلی رات گزاری۔

اس وقت سندر بائی سولہ سال کی تھی اور سیٹھ مگن لال دارو والا پینتیس سال کے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کوئٹہ کا بھونچال آیا۔ اٹلی نے ابی سینیا پر حملہ کیا اور ہندوستان میں شہری آزادی تقریباً ختم کر دی گئی تھی۔ جارج پنجم کی موت ہوئی اور ایڈورڈ ہشتم شاہی تخت پر بیٹھا۔ روس کے کریملن محل میں دو ہزار چالیس نمائندے نئے آئین پر سوچ بچار کے لئے جمع ہوئے۔ فیض پور میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ جواہر لال نہرو نے خان عبدالغفار خان اور ایم این رائے کا سواگت کیا۔ اور [illegible] عظیم

چھڑ جانے کے امکان پر ملک کو تیار کیا۔ انتخاب ہوئے اور پانچ صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہوئی دو کروڑ اسی لاکھ لوگوں نے ووٹ ڈالے ..... کانگریس نے صوبائی حکومتیں بنائیں۔ ہری پورہ میں کانگریس کے نئے سبھاش چندر بوس نئے پردھان منتخب ہوئے۔ دنیا میں فاشسٹ جنگ کے بادل منڈلانے لگے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی ناگاساکی اور ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے گئے، جناح صاحب نے پاکستان کا مطالبہ کیا۔ سن ۴۲ کی کرانتی ہوئی۔ ہندوستان آزاد ہوا اور عوام کی حکومت شروع ہوئی گاندھی جی کا قتل ہوا ہندوستان جمہوری حکومت کا اعلان کیا گیا۔ جنتا راج شروع ہوا۔

اور طوائف بازار میں شاردا بائی کے گھرانے کا خوب نام ہوا۔ وہ ایک ایسی طوائف تھی جس کے خاندان میں ہر مرتبہ بیٹی ہی پیدا ہوتی تھی اور وہ اپنی ماں سے زیادہ خوبصورت۔ اس بیچ سیٹھ مگن لال چھگن لال نے بھی بہت نام کمایا، چائے کے باغات، پٹ سن۔ بینک، کپاس منڈیاں اور غیر ملکی کاروبار کے علاوہ انہوں نے کئی صنعتوں میں ہاتھ ڈالا۔ جہاں انہوں نے ہاتھ ڈالا وہیں سونا برسنے لگا سیٹھ دارو والا نے کپڑے کے کارخانے لگائے۔ اور اپنی عظمت کو سات سمندر پار تک پہونچا دیا اب اُن کا نام بھی سیٹھ ایم سی دارو والا ہو گیا۔ سرکاری صنعتی کمیٹیوں میں اُن کی آواز کی قدر شروع ہو گئی اور وہ سال کا تین چوتھائی حصہ غیر ملک میں گذارنے لگے۔

اس دوران سندر بائی کی بیٹی تارا بائی سولہ سال کی ہوئی اور اس کے حسن کے افسانے پھیلنے لگے۔ تارا بائی کی جب پہلی رات کا اعلان ہوا تو ہلچل مچ گئی۔ اب امیر، امراء۔ راجے، نواب زمیندار، مہاراجے نہیں رہ گئے تھے۔ چنانچہ سبھی کسی نئے رئیس کی خبر سننے کے لئے بے قرار تھے۔

آخر کار وہ دن بھی آیا اور سب کی آنکھیں کھلی رہ گئیں جب پتہ چلا کہ تمام نئے نئے رئیسوں لیڈروں، صنعتی شیئر بازاروں کے راجاؤں محکمہ انکم ٹیکس کے نوابوں ٹھیکے داروں، بزرگوں، وزیروں اور ان کے رشتہ داروں وغیرہ کی کوششیں فیل ہو گئی ہیں ان کے بجائے ۵۱ سالہ کروڑ پتی سیٹھ نے بازی جیت لی ہے اس کروڑ پتی کا نام بھی لوگوں تک پہنچا سیٹھ ایم سی دارو والا۔

اب شاردا بائی اور سندر بائی نے اپنے اپنے تجربوں کی ہدایتیں اپنی بیٹی تارا بائی کو دیں اور اس مرتبہ پہلی رات گذارنے کا انتظام سری نگر کی کوٹھی میں کیا گیا۔

اور سری نگر میں ایم سی دارو والا کے ساتھ تارا بائی نے پہلی رات گزار دی۔

اس وقت تارا بائی سولہ سال کی تھی اور سیٹھ ایم سی دارو والا (۵۱) سال کے

یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ اور روس میں کشمکش چل رہی تھی۔ ایٹم بموں کے ٹیسٹ ہو رہے تھے۔ فرانس میں انقلاب آیا۔ ہندوستان میں تعمیری کام شروع ہوئے۔ بانڈونگ کانفرنس ہوئی۔ دنیا کی غیر جانبدار قوموں میں بیداری آئی اور پنچ شیل کی بنیاد رکھی گئی۔ تبت میں تباہی آئی۔ کشمیر پر حملہ ہوا۔ ویت نام کی آزادی کی جدوجہد نے نیا موڑ لیا۔ چین نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ پردھان منتری نہرو کی موت ہوئی۔ پاکستانی حملہ بھی ہوا۔ تاشقند میں لال بہادر شاستری کا دیہانت ہوا۔ اندرا گاندھی وزیر اعظم ہوئیں۔ کئی صوبوں میں اپوزیشن پارٹیوں کی سرکاریں بنیں۔ بہار اور راجستھان میں قحط پڑے۔ گجرات میں سیلاب آیا۔

اور تب تک تارا بائی کی بیٹی گیتا بائی جوان ہوئی وہ ابھی پندرہ سال کی ہی تھی کہ اس کی پہلی رات کا اعلان کیا گیا۔ اور تب لوگوں نے زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اُن کو معلوم تھا کہ کیا ہونے والا ہے اور یہ رات کہاں اور کس کے ساتھ گزرنے والی ہے۔

.... جب جب اس نے مجھے بانہوں میں لے کر پیار سے پوچھا ہے ــــ اپرا تم ابھی تک کہاں تھیں ؟ تم نے کسی کو پیار کیوں نہیں کیا ؟ شاید تم میرے لئے ہی تھیں .. تب تلک ... تب میں نے ہمیشہ سب کچھ بتا ڈالنے کی کوشش کی تھی اور یہ سمجھا تھا کہ وہ میری ساری خامیوں کے ساتھ زندگی بھر ساتھ دیگا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا ... میں بار بار اکیلی رہ گئی۔ بڑے گہرے گہرے گھاؤ لگے ہیں مجھے۔ اور ان گھاؤوں کا خون چٹانوں کی طرح جم گیا ہے۔ آج میں ان خونی چٹانوں پر کسی کو بھی سلا سکتی ہوں۔ لیکن کمزوری یہ ہے کہ آدمی کے سوا میں کسی کو پیار نہیں کر سکتی۔

(کملیشور کے ناول "ڈاک بنگلہ" سے)

کملیشور

بیان

اس سے زیادہ میں کیا بتا سکتی ہوں ! ایک آدمی عورت کے درمیان جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ ہوتا ہے۔ اس کے تعلقات کی بنیاد صرف انہیں میں نہیں ہوتی ....

جی میں بہک نہیں رہی ہوں۔ سننا ہے تو پوری بات سنئے۔ ٹکڑے ٹکڑے باتوں سے میرا جی بہت گھبراتا ہے۔ اگر آپ صرف میری شادی سے کچھ قبل کی۔ کچھ درمیان کی اور آخر کی باتیں ہی جاننا چاہتے ہیں تو میں مشین کی طرح بتاتی جاؤں گی۔ کیونکہ مجھے بتانی پڑیں گی۔ خاموش رہ کر میں نہ آپ کے قانون سے بچ سکتی ہوں نہ لوگوں کی حقارت سے اور نہ اپنی بچی کی سوالوں سے .....

سوائے میری زندگی کے کوئی اور جواب میرے پاس نہیں ہے جو کچھ ہر وہ میری زندگی میں ہی بکھرا ہوا ہے۔ وہ جسے جنہیں میں کبھی بکھرنے نہیں دیتی۔ وہ بھی اب یادوں سے چھٹکارا گئے ہیں یا چھٹک رہے ہیں۔ اب مجھے چھپانا کیا ہے؟ کس کے لئے اور کیوں ؟۔

جی ...... ہاں۔ یہ سچ ہے ! شادی سے قبل میں لشن کو چاہتی تھی، لیکن اس کا اس معاملے سے کیا لینا دینا ہے۔ جھوٹ سچ کے قلابے مت ملائیے میں بھگوان کا واسطہ دے سکتی ہوں ...... اس کا کوئی تعلق اس حادثے سے نہیں ہے۔ بھگوان کے لئے مجھے ذلیل مت کیجئے ....

مجھے نہیں معلوم لشن اب کہاں ہے۔ یہ تو بائیس سال قبل کی بات ہے بلکہ اس سے بھی ایک آدھ برس قبل کی۔ نہیں۔ ہم نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ نہیں نہیں۔ وہ میری شادی کے وقت موجود بھی نہیں تھا۔ اس نے کوئی دھمکی نہیں دی تھی۔ لشن اس طرح کا لڑکا نہیں تھا۔ وہ بہت سمجھ دار سنجیدہ اور ذہین تھا.....

جی۔ غلط مطلب کیوں لگاتے ہیں؟ ان الفاظ کے استعمال سے آپ کو لگتا ہے کہ میں آج بھی اس کو چاہتی ہوں ! آپ جو چاہیں سمجھیں میں کیا کہہ سکتی ہوں لیکن کیا مجھے یہ حق نہیں کہ میں اچھے کو اچھا اور برے کو برا کہہ سکوں ؟

نہیں۔ میرا لشن سے بس اتنا ہی پیار تھا جتنا کہ بائیس تئیس برس قبل کوئی بھی لڑکی کسی بھی لڑکے سے کر سکتی تھی میں کب انکار کر سکتی ہوں کہ وہ مجھ سے نہیں ملا۔ لیکن میرا اعتبار کیجئے ...... شادی کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گیا.......... سچ !

دیکھئے پھر غلط بات کہی جا رہی ہے میں آتما کی گہرائیوں سے کہتی ہوں کہ میرے شوہر نے مجھے بے انتہا

پیار کیا۔ انہوں نے مجھے کبھی تنگ نہیں کیا۔ میں ؟ اس کی گواہی تو صرف وہی دے سکتے ہیں اگر وہ ہوتے۔

یہ سراسر غلط ہے...... آپ لوگ غلط اور بے کار سوالوں سے صحیح نتیجے تک کیسے پہنچ سکیں گے! ان سب فضول کی باتوں سے آپ ان کی موت کی وجوہات نہیں تلاش کر سکتے۔ شادی سے پہلے کا بادل کے ٹکڑے کی طرح تیر کے گزرا ہو عشق...... اس پریم کی کالی پرچھائیاں...... میاں بیوی کا جھگڑا گھر والوں سے تناؤ یا پڑوسیوں سے خفگی۔ یہ سب بڑی معمولی باتیں ہیں آپ ابھی تک انہیں کے سہارے حقیقت تک پہنچنے میں لگے ہیں۔ اس سے کچھ کبھی حاصل نہیں ہوگا۔

ان کے ساتھ میری آخری رات! اگر کہئے تو کچھ اس طرح بتا دوں کہ آپ کا اندھا اور بہرہ قانون کسی نتیجے تک پہونچ جائے لیکن اس رات میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ ہمیشہ کی طرح ہماری وہ رات بھی بہت معمولی تھی۔ ایک ایسی رات جو اوسط آدمی کی رات ہو سکتی ہے۔

میں نے...... میں نے کوئی طعنہ نہیں دیا۔ وہ غصے میں قطعی نہیں تھے ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو سمجھا لیتے تھے۔ گزشتہ کئی برسوں سے ہماری راتیں یوں ہی گزرتی تھیں۔ ہمارے پاس اور تھا ہی کیا؟ سوائے ایک دوسرے کے...... سوائے پریشانیوں کے......

بچی! وہ ہمارے پاس ایک چھوٹی سی کھاٹ پر سوتی تھی۔ جی! صرف دو کمرے ہیں۔ ایک کمرہ بیٹھک کا کام دیتا ہے۔ شام کو وہ گھومنے گئے تھے۔ کبھی کبھی وہ شام کو لوٹتے تھے۔ لیکن اس دن وہ بروقت لوٹ آئے تھے۔ بچی کے لئے چار ٹافیاں بھی لائے تھے۔ دو انہوں نے اس کو دیدی تھیں۔ دو دوسرے دن کے لئے کاغذ کے نیچے رکھ دی تھیں۔

جی۔ اس سے قبل وہ ایک سرکاری جریدہ میں تھے۔

ہاں۔

جی ہاں! فوٹو گرافر ہی تھے۔ انہوں نے اپنا دھندہ کبھی نہیں بدلا۔ انہیں بھروسہ تھا کہ ایک دن وہ بہت بڑے فوٹو گرافر بنیں گے۔ ان کی زندگی کا یہی مقصد تھا۔

کبھی نہیں...... انہوں نے کبھی ماڈل فوٹو گرافی نہیں کی۔ اگر وہ کرتے تب بھی ہمارے درمیان کوئی بال نہیں آتا۔ ان کے لئے دنیا میں سب سے زیادہ خوبصورت عورت۔ بیوی۔ لڑکی جو کچھ تھی میں ہی تھی۔

آپ اسکر ایئے...... آپ کو میں بہت معمولی ہی لگوں گی۔ لیکن مجھے میرے شوہر کی نظروں سے دیکھنے کی کوشش کیجئے...... تبھی آپ میری بات کو سمجھ پائیں گے۔ کیمرہ اور میں...... بس...... ان کے لئے یہی دو چیزیں تھیں...... یا پھر ہماری بچی کبھی کبھی میں ان کے سینہ پر سر رکھ لیتی تھی تو ان کی انگلیاں میرے کان کی لوؤں پر اس طرح تھرتھراتی تھیں جیسے کسی اوجھل ہو جانے والے لمحے کو پکڑنے کے لئے کیمرے پر کانپتی تھیں۔ میری انگلیوں کے پور وہ یوں دباتے رہتے تھے جیسے شٹر دبا رہے ہوں...... ہمارے پیار کے سب سے زیادہ خوبصورت لمحے یہی ہوتے تھے۔

ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ نجی باتوں سے آپ کا کیا لینا دینا لیکن میں سمجھ نہیں پاتی کہ تب پھر

وجوہات کو کہاں سے تلاش کریں گے؟ میری زندگی کی مٹیالی روشنی سے ہی آپ کو وجہ تلاش کرپانے میں آسانی رہے گی۔ اگر وہ لمحے نہ ہوتے تو میری زندگی میں تھا ہی کیا؟ بائیس برسوں کا ایک ویران سفر! بیکار بہتے جانا اور ہر کنارے پر سر پٹختے جانا۔

خیر میں خاموش ہو جاتی ہوں۔

لیکن آپ ہی تو کہتے ہیں کہ ان باتوں کو رہنے دیجئے۔ ان کے سوا میرے پاس اور کچھ نہیں ہے مجھ سے بولنے کو کہیں گے تو میں یونہی بولوں گی۔ آپ چاہیں تو ٹکڑے ٹکڑے سوال پوچھ لیجئے۔

جی ہاں۔ سرکاری جریدے میں فوٹوگرافر کے طور پر منسلک ہونے سے قبل وہ سرکار کے پریس انفارمیشن بیورو میں تھے۔ فوٹوگرافر ہی تھے۔ میں نے کہا نا۔ انہوں نے اپنا دھندہ کبھی نہیں بدلا۔ شروع شروع میں جب وہ مجھے ذراسی آنکھ دبا کر دیکھتے تھے تو مجھے بڑی گدگدی ہوتی تھی۔ یہ شادی کے بعد شروع دنوں کی بات ہے۔ مجھے گدگدی اس لئے ہوتی تھی کہ ایک آنکھ دبا کر دیکھنا...... آپ تو جانتے ہی ہیں۔ مجھے اب بھی ہنسی آتی ہے۔ لیکن یہ ان کی عادت بن گئی تھی۔ جی ہاں بڑی بچکانی معلوم ہوتی ہے یہ حرکت...... لیکن کیمرے کی وجہ سے وہ مجبور تھے۔ بعد ازاں مجھے ان کی اس عادت سے کبھی کبھی چڑ ہوتی تھی لیکن پھر کچھ دنوں بعد میں نے جانا۔ جب کبھی وہ ایک آنکھ دبا کر مجھے دیکھتے تھے، تو صرف مجھے ہی دیکھ رہے ہوتے تھے۔

میں معافی چاہتی ہوں۔ کیا کروں۔ لوٹ لوٹ کر انہیں لمحوں پر پہنچ جاتی ہوں۔ دکھ تو اب اُٹھانا ہی ہے جو ہو سکا، دونوں نے مل کر اٹھایا...... لیکن اب تو ہم دونوں کے وہی لمحے باقی ہیں جو بھولے بھٹکے کبھی آجاتے تھے...... ہنسی خوشی کے ایک آدھ لمحے۔

پریس انفارمیشن بیورو میں وہ قریب پانچ سال رہے تھے۔

قریب چھ سال ایک اشتہاری کمپنی میں۔

جی ہاں! انہوں نے ہار کر نوکری چھوڑ دی تھی۔ یا کہئے کہ چھڑوا دی گئی تھی۔ انہوں نے کوئی غیر واجب کام نہیں کیا تھا۔

ہاں! وہ سب معلومات تو آپکے پاس ہوگی۔ سرکاری ملازمت کی رپورٹ بھی سرکار سے آگئی ہوگی ٹھیک ہے۔ ان کی دفتری زندگی کے بارے میں مجھے زیادہ معلوم نہیں ہے سوائے اس کے کہ شادی کے بعد شروع کے سالوں میں وہ بہت جوش و خروش میں رہتے تھے۔

جی۔ تصویروں کو لے کر!

تصویریں اور کیسی؟ وہ سرکاری فوٹوگرافر تھے۔ پندرہ اگست۔ شاندار دعوتیں۔ آنے والے غیر ملکی مہمان لال قلعہ میں جشن استقبال۔ شاہی سواری۔ سنگ بنیاد رکھنے اور افتتاح۔ انہیں سب کی تصویریں ہوتی تھیں۔

پھر جس سال سے ۲۶ جنوری کا جشن شروع ہوا تب سے ضرور کچھ لڑکیوں ورکیوں کی تصویریں بھی لینے لگے تھے۔ لوک ناچوں کی جھانکیوں کی نیوی کے بلینڈ کی۔ راشٹرپتی کی سواری کی اور سلامی کی۔ طرح طرح کی تصویریں ہوتی تھیں۔

کملیشور نمبر

ایک بات غور کرنے کی ہے۔ جب سے وہ سرکاری جریدے سے خاص طور سے جوڑ دیے گئے تو وہ لہلہاتی کھیتی۔ باندھ، بجلی گھر، فیکٹریوں۔ ملوں، نئی ریلوے لائنوں، پلوں کے افتتاح۔ اسکولوں وغیرہ کی ہی تصویریں لیتے تھے۔ وہ بہت خوش ہوتے تھے..... کہتے تھے۔ آزادی کا یہی سُکھ ہے۔ لیکن کئی برس بعد ان کا یہ جوش نہ جانے کہاں کھو گیا۔ ان کے دل میں کوئی بات چبھتی رہتی تھی۔ ایک بار بولے تھے ان تصویروں سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں خود کہیں اندر سے چھوٹا پڑتا جا رہا ہوں شاید کچھ دنوں بعد میں کسی سے یہ بھی نہیں کہہ پاؤں گا کہ تصویریں سچی ہوتی ہیں۔

جی ہاں! اس دن پہلی مرتبہ میں نے ان کی آنکھیں بے حد سُرخ دیکھی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں میں خون اتر آیا ہو۔ میں نے تربھلا کا پانی بہانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن ان کی آنکھوں کی سُرخی نہیں گئی۔

انہی دنوں ایک واقعہ ہو گیا تھا۔ تھار کے ریگستان کو روکنے کے متعلق کسی وزیر نے کوئی بیان دیا تھا شاید یہ کہا گیا تھا کہ میلوں جنگل سیراب کر کے ریگستان کا پورب کی جانب بڑھنا روک دیا گیا ہے۔ یہ اس جنگل کی جو تصویریں لائے ان میں جنگل کہیں نہیں تھا۔ ریگستان ہی ریگستان تھا۔ درخت ضرور لگائے گئے تھے لیکن وہ سب سوکھ گئے تھے۔ غلطی سے وہ تصویریں شائع ہو گئی تھیں۔ مخالف پارٹی کے کسی فرد نے ان تصویروں کا حوالہ دے کر کچھ مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ یہ سب شاید لوک سبھا میں ہی ہوا تھا۔ وزیر صاحب کا بیان ان کی تصویروں سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ آدمی سے غلطی ہو جاتی ہے۔ ان سے بھی ہو گئی تھی لیکن اس غلطی پر انہیں بہت ڈانٹا پھٹکارا گیا وزیر صاحب نے انہیں ملازمت سے برطرف کرنے کا آرڈر کر دیا تھا۔ ان دنوں یہ بہت پریشان تھے۔ بس۔ اس کے بعد ان کا وہاں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔

تب میں نے ان کی سُرخ سُرخ آنکھوں سے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ رات بھر وہ چھٹپٹاتے رہے تھے صبح اُٹھے تو ان کا تکیہ خون کے قطروں سے رنگا ہوا تھا۔

جی ہاں۔ خون! میں نے بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ نہ کبھی سنا تھا لیکن یہ ہوا تھا۔

ہمارے گھر کی حالت خستہ ہو گئی تھی۔

جی ہاں! اس کے بعد ملازمت سے یہ الگ ہو گئے تھے۔ ایک طرح سے مجبوراً انہیں برطرف ہونا پڑا تھا۔ تب انہوں نے ایک اشتہار کمپنی میں کام کر لیا تھا۔ دو تین گھنٹے کے لئے جاتے تھے۔ کام کیا۔ ایک بہانہ تھا۔ بہ مشکل گرہستی چلتی تھی۔ تبھی بچی پیدا ہو گئی۔

بچی کی آمد سے ہم کچھ دنوں کے لئے تازہ دم ہو گئے تھے۔

نہیں! شراب انہوں نے کبھی نہیں پی۔

اشتہار کمپنی میں بھی نہیں پی!

ماڈل ساڈل لے کر کبھی گھر نہیں آئے۔

جی ہاں! کبھی گھر سے باہر نہیں رہے۔ ہر رات گھر ہی گذاری۔

جی نہیں قسمت کے لئے کبھی الزام نہیں دھرا۔

بہت اچھی طرح پیش آئے تھے۔

تصویریں! کوئی چار چھ ہزار ہوں گی۔ لیکن سب سرکاری تصویریں ہیں۔

ہاں! وہ بہت تکلیف کے دن تھے

دو سو روپیہ ملتا تھا۔

جی بالکل! انہیں دنوں مجھے ملازمت کرنا پڑی۔

اسکول میں!

منیجر کبھی کبھی آتے تھے۔

انہوں نے کبھی منع تو نہیں کیا۔

جی ہاں۔ کبھی کبھی یہ پہو نچانے جاتے تھے۔

بچی انہیں کے پاس رہتی تھی یہ زیادہ تر گھر پر ہی رہتے تھے۔

جی نہیں! اشتہار کمپنی کی ملازمت ختم ہو جانے کے بعد جی۔

پھر انہوں نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ جی نہیں! ادھر ادھر اخباروں کو تصویریں بھیجتے تھے۔ گھر کے باتھ روم میں ڈارک روم بنا لیا تھا بچی کی بھی بہت سی تصویریں لی تھیں۔ کچھ اخباروں میں بھی شائع ہوئی تھیں، مگر ان سے آمدنی کوئی خاص نہیں تھی۔ گھر کا خرچہ میری ملازمت سے نکلتا تھا۔

بھگوان کے لئے مجھے پھر ذلیل مت کیجئے۔ میں منیجر کے گھر جاتی تھی۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ...... میں یہاں بھی تو حاضر ہوتی ہوں!

آپ کہتے ہیں تو میں اپنے اس جملے کے لئے معافی مانگ لیتی ہوں۔ کیا کروں! دل میں ٹیس اٹھتی ہے تو یہی کچھ منھ سے نکلتا ہے۔ جی! مجھے۔ جی...... معاف...... جی! کیا جائے...... جی! جملہ...... جی! واپس لیتی ہوں......

میری عمر...... اس وقت...... اب اٹھائیس ہے۔ اس وقت بتیس رہی ہوگی......

منیجر صاحب۔ وہ ساٹھ کے قریب تھے۔ ہاں! کہا تھا۔ ایک بار میں نے انہیں بتا بھی دیا تھا کہ منیجر تمہارا صبح و شام اسکول میں آنا پسند نہیں کرتے تھے لڑکیوں کا اسکول ہے اس لئے شاید انہیں کچھ برا لگا ہو۔ ہو سکتا ہے۔

لیکن میں پھر آپ سے کہتی ہوں۔ ان باتوں پر مت جائیے یہ اصل وجہ قطعی نہیں ہیں۔ قصے کہانی کی باتیں دوسری ہوتی ہیں یہ میری زندگی کی حقیقتیں ہیں۔ اس طرح مخول مت اڑائیے۔ میرے اچھے دنوں کو گندہ مت کیجئے۔ تکلیفوں کے دن سہی۔ مگر ہم عادی ہو گئے تھے ہمارے لئے وہی اچھے دن تھے۔ میرا محبوب...... یا منیجر...... یا وہ مدیر جو بعد ازاں ان کے ساتھ میرے گھر آنے لگا تھا۔ وہ سب اس کام دھام کی زندگی میں کبھی سے ٹکرائے ہیں۔ کہیں وہ وکیل۔ دوست اور افسر ہو سکتے ہیں...... لوگ تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کوئی بھی تین یا چار یا دس ہو سکتے ہیں لیکن اس سے آپ کیا مطلب نکالنا چاہتے ہیں؟ زندگی اور موت کا فیصلہ ان معمولی وجوہات سے کیجئے گا؟ خواہ مخواہ کے داغ لگایئے گا!

اوہ! میں معافی چاہتی ہوں!

مدیر! وہ ایک ایسے ہی معمولی اخبار کا تھا۔

اپنے کام دھام کے سلسلے میں ہی ان کی جان پہچان ہوئی تھی۔

جی! گرمیوں کی چھٹیوں کی تنخواہ اسکول سے نہیں ملتی تھی۔ چھٹیوں میں ہمیں برطرف کر دیا جاتا تھا۔ سیشن شروع ہونے پر پھر رکھ لیا جاتا تھا۔ چھٹی کے ان دو مہینوں میں ہماری حالت بہت خراب ہو جاتی تھی۔ بچی بھی سامنے تھی۔

یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ اس مدیر کی وجہ سے میں نے ملازمت چھوڑی۔ اس مدیر کا کوئی جھگڑا صاحب سے نہیں ہوا تھا۔ میری وجہ سے بالکل نہیں۔ میں کیوں وجہ بنتی ان کے جھگڑے کی۔ وہ مدیر ایسا تھا ہی ان کے اخبار سے سب گھبراتے تھے۔ جھگڑے کی وجہ وہ اخبار تھا......

نہیں...... نہیں...... نہیں...... میرے بے قصور شوہر پر الزام مت لگائیے۔ میں جانتی ہوں آخر کار یہی الزام گھوم پھر کے مجھ پر آئے گا۔ میری بھری پوری زندگی کا بخیہ ادھیڑے گا۔ میں بخوبی جانتی ہوں آپ لوگ سب مجھے کہاں دھکیل رہے ہیں۔ کیا قانون کا کام صرف ثبوت جمع کر کے کسی کو ذلیل کر دینا ہے؟ میں اپنے شوہر کی موت کی ذمہ دار کیسے ہو سکتی ہوں؟

آپ مجھے کانٹوں میں کیوں گھسیٹ رہے ہیں؟ جی ہاں۔ اس مدیر سے میرے شوہر کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ ٹھیک ہے۔ آپ خاص خاص الفاظ کو نوٹ کر لینا چاہتے ہیں۔ ضرور کر لیجئے۔ لیکن لفظوں سے آپ سچائی تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ سچائی ہمیشہ کئی طرح کی باتوں پر منحصر ہوتی ہے۔ انسان کا ماضی، حالات، ماحول، کسی خاص لمحہ کی حقیقت اور سب سے زیادہ اس کی اپنی اندرونی اذیتوں کی ٹیس پر۔ شوہر کے دکھوں یا اس کے سکھوں کی وجہ صرف بیوی نہیں ہوتی، یہ رائے بالکل غلط ہے دونوں ایک دوسرے کو بے طرح چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے آزاد بھی ہوتے ہیں............ وابستہ ہوتے ہوئے بھی جدا ہوتے ہیں۔ پانی کی لہروں کے مانند

جی نہیں۔ میں فلسفہ نہیں پڑھتی۔ کچھ لفظ سمجھ میں نہیں آئے؟ تو لیجئے۔ حالات۔ اذیت۔ آزاد۔ ان کے معنی میں نہیں بتا سکتی۔ آپ براہ مہربانی اردو۔ انگریزی ڈکشنری میں دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے۔ لکھے ہوئے معنی میرے لفظوں کی گہرائی تک نہ پہنچ پائیں۔ خیر۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔ جی نہیں میں تقریر نہیں کروں گی صرف واقعات بیان کرتی جاؤں گی۔

خاصی دوستی! یہ دوستی۔ ضرورت پر بھی قائم تھی۔ ہاں وہ مدیر گھر پر کھانا کھانے بھی آتا تھا۔ میرے شوہر ہی بلاتے تھے۔ میں اس کے ساتھ کہیں نہیں جاتی تھی۔ اس کی نظروں میں بھی کوئی خاص گندگی مجھے نہیں معلوم ہوتی تھی جس کو آپ شاید گندگی کہنا چاہیں گے۔ وہ سب کی نظروں میں ہوتی ہے۔ اس کو آپ مرد عورت کے درمیان کا معمولی تناؤ کہہ سکتے ہیں...... اور اس تناؤ کو اگر گندہ اوچھا یا برا نہ مانا جائے تو وہ بڑی معمولی سی چیز ہے۔ اپنے کو شیشے میں دیکھتے رہنے کی طرح۔ ہر آدمی ہر عورت کے آئینہ میں اپنے کو دیکھتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں عمر یا تعلقات کا ہاتھ ہو۔

یہ خبر آپ کو غلط دی گئی ہے۔ چھٹیاں ختم ہونے کے بعد مجھے اسکول میں پھر رکھ لیا گیا تھا۔ جی نہیں!

میں نے مدیر اور منیجر کے جھگڑے کی وجہ سے ملازمت نہیں چھوڑی .... یہ سراسر غلط ہے۔
اس کے اخبار میں بھانڈا پھوڑ قسم کی رپورٹیں شائع ہوا کرتی ہیں۔

مدیر نے منیجر کے کارناموں کو لے کر کوئی رپورٹ نہ تو لکھی تھی۔ نہ چھاپی تھی۔ اس نے بلیک میل نہیں کیا تھا آپ اس کو میرا رجحان کیسے کہہ سکتے ہیں؟ مدیر کو بچانا یا اس کی نیت کو صاف بتانا صرف ایک سچائی ہے۔ اس کو آپ میرے دل کی کمزوری کیسے کہہ سکتے ہیں؟ یوں عورت کا دل ہر کمزوری کی جانب اگر زیادہ ہوتا ہے یہ کہنا سراسر غلط ہے کہ میرے شوہر نے کسی طرح کا سمجھوتہ کر لیا تھا۔ آپ ان کی موت کے اصلی وجوہات کو اتنی چھوٹی اور بیہودہ باتوں سے کیوں وابستہ کر رہے ہیں؟ اگر آپ سمجھ سکیں تو میں کچھ ان کے بارے میں بیان کروں ......

میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ان کی آنکھیں سرخ رہنے لگی تھیں۔ غلط تصویریں شائع کئے جانے کے بعد ان کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا۔ اس کو وہ برداشت نہیں کر پائے تھے۔ ان کا یقین اپنے کام سے اٹھ گیا تھا۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ جب آدمی کا یقین اپنے کام سے اٹھ جائے تو اس کی کیا حالت ہوتی ہے۔ وہ تصویریں جو انہیں یقین دلاتی تھیں یکایک ان کا یقین توڑ گئی تھیں، کیونکہ ان کو سچائی سے کاٹ دیا گیا تھا۔ وہ وہی کہہ سکتے تھے جو دوسرے چاہتے تھے۔ اس نتیجہ پر پہونچنے کے بعد ان کی آنکھوں سے خون کے قطرے پہلی بار گرے تھے۔

آپ چاہتے ہیں تو آنسو کہہ لیجئے لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے میں قطعی بڑھا چڑھا کر نہیں کہہ رہی ہوں۔ سچ سچ وہ خون کے قطرے تھے۔ جی ہاں! کبھی کبھی کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو نہ پہلے دیکھی ہوئی ہوتی ہیں۔ نہ سنی ہوئی۔ وہ بس عجیب ہوتی ہیں۔

خیر ...... ان دنوں میں کام پر جانے لگی تھی۔ یہ گھر میں بچی کے ساتھ وقت گزارا کرتے تھے۔ اس دن اتوار تھا انہوں نے بچی کو پڑوس میں کھیلنے کو بھیج دیا تھا۔ نہیں جھگڑے کی کوئی بات نہیں تھی۔ الٹے اس دن وہ بہت پیار میں بھرے ہوئے تھے۔ بہت دنوں بعد انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انگلیوں کو شرٹ کی طرح دبایا تھا۔

انہوں نے مجھ سے برقعہ اتارنے کو کہا تھا۔ میں تھوڑا ہچکچائی تھی۔ دن کا وقت تھا۔ وہ کیمرہ لئے بیٹھے تھے پھر انہوں نے مجھے وائل کی پتلی ساڑی پہننے کو کہا تھا۔ مجھے طرح طرح سے بٹھایا اور لٹایا تھا اور تصویریں لی تھیں۔ اس وقت ان کی ایک آنکھ حسب معمول کانپ رہی تھی۔ میں سمجھ گئی تھی۔ وہ صرف مجھے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت جب وہ کام میں محو تھے ...... جی یعنی اپنے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تب بھی آٹھ دس بار ان کی آنکھوں سے خون کے قطرے ٹپکے تھے۔ انہوں نے مجھے بری طرح تھکا دیا تھا۔ خود بھی بے طرح تھک گئے تھے۔ اس کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئے تھے۔ اور چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے تکتے رہے تھے۔ میں کپڑے پہن کر انہیں چائے دینے آئی تھی تو ان کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا اس وقت مجھے ڈر بھی لگا تھا کہ کہیں اگر انہوں نے پیار سے دیکھنے کے لئے پلکیں جھپکائیں تو تھا ہوا خون بہہ جائے گا۔ چائے میں نے سرہانے تپائی پر رکھ دی تھی وہ وہیں رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

کھانا کھاتے وقت وہ کہہ رہے تھے کہ کچھ کمائی ہو جائے تو ایک ٹیلی لینس خریدنا چاہتے ہیں تاکہ بازار کے لائق کام کر سکیں اسی کے لئے انہیں کچھ روپے کی ضرورت تھی۔ یوں گھر میری تنخواہ سے گھسٹ بھر رہا تھا۔ ضرورت تو تب بھی پڑتی تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ کارٹر سٹی کمنٹر۔ سٹانش۔ اسٹینڈ۔ ولسن۔ سمتھ۔ ادیرون، پال۔ کاشی ناتھ

یا مدیحہ وغیرہ کے نام برابر لے رہے تھے۔

نہیں - نہیں - غلط مت سمجھئے - یہ میرے دوستوں یا جاننے والوں کے نام نہیں ہیں - آپ لوگ ہمیشہ غلط رشتے جوڑتے ہیں ...... ہمیشہ آدمی کے وجود پر شک کرتے ہیں ...... وجود! ...... جی! یہ آدمی کی اپنی زندگی کے قانون کا لفظ ہے - یہ آپ کو کتابوں میں نہیں ملے گا - خیر ...... شام کو ہی انھوں نے فلم ڈیولپ کر کے پرنٹ بنا لئے تھے - پرنٹ دیکھتے ہوئے وہ کافی سنجیدہ تھے - مجھے نہیں معلوم - ان کو کیا ہوا تھا میری وہ تصویریں لے کر وہ شیشے کے سامنے کھڑے تھے - تصویریں دیکھتے تھے اور اپنا منہ آئینے میں دیکھتے جاتے تھے۔

بس - اسی وقت ان کی آنکھوں سے خون کی دھار بہنے لگی تھی، اس شام سے جو خون ٹپکنا شروع ہوا پھر نہیں رکا - جب تک وہ زندہ رہے مسلسل خون ٹپکتا رہا۔

مدیحہ نے میری دو تصویریں اگلے دن چھاپی تھیں - بس یہیں سے ہنگامہ شروع ہوا تھا - میری وہ نیم عریاں تصویریں اسکول کے منیجر تک بھی پہونچی تھیں - انہوں نے فوراً طے کیا تھا کہ اس طرح کی عورت کا اسکول میں رہنا ایک لمحہ کے لئے بھی ممکن نہیں ہے - مجھے اسی وقت کلاس سے بلا لیا گیا اور کھڑے کھڑے حساب کر دیا گیا تھا۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اسکول سے نکالے جانے کی وجہ کیا تھی! مدیحہ اور منیجر کا کوئی جھگڑا نہیں تھا - مجھ سے کر ان میں کوئی دشمنی نہیں تھی - میرے اور مدیحہ کے تعلقات کو لے کر بھی کچھ سوچنا یا سمجھنا قطعی غیر ضروری ہے - ان کی موت کی وجہ ان سطحی وجوہات میں مت تلاش کیجئے۔

جی - خون کی دھار کی وجہ میں کیا بتا سکتی ہوں؟ جو باتیں میرے بس میں نہیں ہیں - ان کے نتیجوں کو میں صرف دیکھ سکتی ہوں ...... کیا کر سکتی ہوں اگر بہت معمولی طرح سے سوچئے تو وجوہات میں ہو سکتی ہوں - وہ خود ہو سکتے ہیں - وہ تصویریں بھی ہو سکتی ہیں اور وہ آئینہ بھی ہو سکتا ہے جس میں بار بار وہ اپنی شکل دیکھ رہے تھے نتیجوں اور وجوہات تک پہونچنے کا یہی سب سے آسان طریقہ ہو سکتا ہے کہ ساری ذمہ داری ان چار چیزوں پر تھوپ دی جائے میں، وہ تصویریں اور آئینہ اسے صحیح ثابت کرنے کے لئے ضرورت پڑے تو میرے نام نہاد محبوب یا شن منیجر صاحب یا مدیحہ کو ضرورت کے مطابق جوڑ لیا جائے بس اور کیا کہہ سکتی ہوں؟ مجھے مجرم ٹھہرا دیجئے۔

جی میں اس وقت گھر میں نہیں تھی۔

بچی - بچی انہیں بہت پیار کرتی تھی - جی ہاں! بچی نے بھی ان کی آنکھوں سے لگاتار خون کی دھار گرتی دیکھی تھی - وہ بہت ڈر گئی تھی - اس نے مجھ سے پوچھا تھا ممی پاپا کی آنکھوں سے خون کیوں گرتا ہے؟ میں نے پیار سے سمجھا دیا تھا - بیٹے تیرے پاپا کی طبیعت اچھی نہیں رہتی - ان کو کچھ بیماری ہو گئی ہے۔

بچی میری بات سے مطمئن نہیں تھی - اس نے ان سے پوچھا تھا انہوں نے بھی یہی کہا تھا میری طبیعت اچھی نہیں ہے - اس دن سے بچی کا ڈر ختم ہو گیا تھا - خون کی دھار گرتی رہتی تھی اور وہ ان کی گود یا گلے میں لپٹ کر پیار کرتی رہتی تھی کبھی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے بہتے ہوئے خون کو پونچھ دیتی تھی۔

میں نے بتایا نا - میں ایک جگہ کام تلاش کرنے کے سلسلے میں گیارہ بجے سے گئی تھی - بچی پڑھنے اسکول گئی تھی - وہ گھر پہ تنہا تھے۔

جی ہاں ملازمت چھوٹنے کے دوسرے دن کی بات ہے - مجھ کو اس حادثہ کا کوئی احساس نہیں تھا

جب میں گئی تھی تب خون ذرا زیادہ ہی گر رہا تھا لیکن یہ تو معمول اور روزانہ کی بات تھی۔

جی۔ انہوں نے چھت کے کڑے سے لٹک کر پھانسی لگائی تھی۔ رسی۔ رسی کہاں تھی؟ چادر تھی۔

مجھ کو کوئی خبر نہیں ملی۔ کوئی مجھ کو کہاں خبر دیتا؟ میں چار بجے کے قریب واپس آئی تب سب کچھ ہو چکا تھا۔ پولیس آچکی تھی۔ ان کی لاش کو اتار کر پلنگ پر لٹا دیا گیا تھا۔ جی نہیں! جس چادر سے انہوں نے پھانسی لگائی تھی وہ وہیں لٹکی ہوئی تھی۔ ان کو دوسری چادر اڑھا دی گئی تھی۔ پاس پڑوس کے لوگ جا چکے تھے۔ صرف ایک پڑوسی پریشان سے گھوم رہے تھے جب میں آئی تو پولیس کا ایک آدمی پہرے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر بھی میں کچھ نہیں سمجھ پائی تھی میں نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ کبھی یہ بھی ہو سکتا ہے۔

سب سے پہلے کس نے بتایا؟ میری بچی نے۔ جی ہاں وہ اسکول سے دو بجے آجاتی ہے۔ وہ مجھ سے پہلے آگئی تھی۔ وہ باہر کھڑی تھی۔ حسب معمول۔ مجھ کو دیکھتے ہی وہ دوڑ کے آئی تھی۔ اور میری ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔ میں نے اس کو پیار کیا تھا۔ لیکن وہ کچھ بات کہنے کے لئے بیتاب تھی۔ وہ ایک دم چہک کر بولی تھی۔ "ممی! ممی! پاپا کی طبیعت اچھی ہو گئی، وہ آرام سے لیٹے ہیں ...."

جی۔ بچی نے سب سے پہلے بتایا تھا۔ میں کمرے میں پہونچی تو سب سمجھ میں آگیا تھا۔ میں دیوار سے سر پٹک دینے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔

وہ بے حس و حرکت دراز تھے۔ ناخن اور ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ بدن پیلیا کے مریض کی طرح پیلا پیلا تھا ہاں! آنکھیں بند تھیں اور بالکل سوکھی ہوئی۔ ان میں خون کیا نمی تک نہیں تھی۔ رنگت میں پڑی سیب کی طرح۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا ...... اس کی تفصیل آپ کے پاس ہے ہی۔ خودکشی سے پہلے کی جو باتیں تھیں وہ میں نے سامنے رکھ دی ہیں۔

فیصلہ کچھ تو ہوگا ہی۔ اور وہ آدمی کے خلاف ہی ہو سکتا ہے۔ جی! آدمی یعنی اکیلا آدمی۔ جیسے اکیلی میں .... یا آپ یا آپ ....

کملیشور

ماس کا دریا

پورے معائنے کے بعد ڈاکٹر نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے کوئی پوشیدہ مرض نہیں ہے۔ لیکن تپ دق کے آثار ضرور رہیں۔ اس نے ایک پرچہ بھی لکھ دیا تھا اور غذا کے لئے کچھ ہدایتیں بھی دی تھیں۔

کمیٹی پہلے ہی پیشے پر پابندی لگا چکی تھی۔ سب اپنی اپنی جگہ پریشان و فکر مند تھیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ ڈاکٹری معائنے نے بہتوں کے پیشے کو اور بھی ٹھپ کر دیا تھا۔ اس سے قبل ابراہیم ٹھیکیدار نے جنہیں الگ چھانٹ لیا تھا وہ سب پاس ہو گئی تھیں ان کے ناز و نخرے بہت بڑھ گئے تھے۔ اور وہ بڑے فخر و غرور سے اپنے خاندانوں کا ذکر کیا کرتی تھیں۔

ابراہیم نے جسمانی اعتبار سے چست و درست لڑکیاں چھانٹ لی تھیں۔ رفتہ رفتہ وہ شہر کے نسبتاً بہتر علاقوں میں رہائش پذیر ہو چکی تھیں۔ ابراہیم ان کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا اور جس ٹھیکے سے جتنی لڑکیاں لے گیا تھا، ان کی رقم مہینے کے مہینے بے باق کر جاتا تھا۔

ایک بار جب جگنو زیادہ پریشان تھی تو اس نے بھی ابراہیم سے منت کی تھی کہ کسی ٹھور ٹھکانے پر بٹھا دے لیکن ابراہیم نے دو ٹوک جواب دے دیا تھا۔ شادی بیاہ تو ہے نہیں کہ کسی کے آنکھ میں دھول جھونک کے گلے منڈھ دوں! جو آئے گا وہ تو بوٹی بوٹی دیکھ کر آئے گا،،۔ اور وہ کترا کر چلا گیا تھا۔

اس روز اس کے دل پر پہلی بار گہری چوٹ لگی تھی۔ اب وہ اس لائق بھی نہیں رہی؟ دوسری چوٹ تب لگی تھی جب ساتھ کے برآمدے سے شہناز نے ہاتھ مٹکاتے ہوئے گالی دی تھی۔ "ارے اللہ تجھے وہ دن بھی دکھلائے گا جب گاہک تیری سیڑھیوں پر قدم تک نہ رکھیں گے"

شہناز کی اس بات پر محلے میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا۔ یہ گالی تو بری سے بری کو بھی نہیں دی جاتی ..... سب کے گاہک جیتے جاگتے رہیں۔ خدا مردوں کو روزی دے ...... ہاتھ پاؤں میں طاقت دے۔

اور اسی دن پہلی بار جھجکتا ہوا وہ آیا تھا۔ فتے اسے لایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا تھیلا تھا۔ خاکی پتلون اور نیلی قمیض میں ملبوس تھا۔ کانوں کے روؤں اور بھوؤں پر دھول کی ہلکی پرت تھی۔ کمرے میں جا کر جگنو کھاٹ پر خود بیٹھ گئی تھی، تو وہ گھبرایا گھبرایا سا کھڑا رہ گیا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنا تھیلا کہاں رکھ دے۔ تبھی جگنو نے بڑی نرمی کے ساتھ تھیلا اس کے ہاتھ سے لے کر سرہانے رکھ دیا تھا۔ وہ چپ چاپ کھاٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ قدرے توقف کے بعد جگنو نے کہا تھا

جوتے اتار لو"..... اس نے کرسچ کے جوتے اتارے تھے تو بدبو کا ایک بھبکا سا اٹھا تھا..... کچھ کچھ ویسا ہی جیسا کہ بہتوں کے کپڑے اتارنے پر اٹھا کرتا تھا..... خاص طور سے اس منسو کرانی سے پھوٹتا تھا۔ جو رات گیارہ کے بعد ہی آیا کرتا تھا۔ اور فارغ ہونے کے بعد کمر میں درد کے سبب پتھر کی طرح بیٹھارہ جاتا تھا۔ تب جگنو اسے اٹھاتی تھی اور وہ رانیں کھجلاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ یا پھر کنور جیت ہوٹل والے کی طرح جو بدبودار تو تھا ہی اور اٹھنے سے قبل کھاٹ پر بیٹھ کر اڈن اوں کر کے ڈکاریں لیتا تھا۔

وہ بھبک اس سے برداشت نہ ہو سکی تو بولی۔" جوتے پہن لو"

وہ جوتے پہن کر پھر بیٹھ گیا تھا۔ تب اسے بڑی کوفت ہوتی رہی تھی، پھر چڑھ کر بولی تھی۔" یہ گھر کی بیٹھک نہیں ہے ..... فارغ ہو کر اپنا راستہ نا پو"

اس نے اس جملے میں اپنی ہتک محسوس کی تھی اور خود کو سنبھالتے ہوئے سٹ پٹا کر بولا تھا۔" تمہارا نام کیا ہے"

" جگنو!" وہ بولی تھی۔

" کہاں کی ہو"؟

" تم اپنا کام کرو۔ وہ پھر چڑ گئی تھی۔

اور تب اس نے سبھوں کی طرح ہی پوچھا تھا۔" تمہیں یہ پیشہ پسند ہے"؟

" ہاں! تمہیں نہیں ہے؟" کہتے ہوئے وہ لیٹ گئی تھی۔ اس نے ساری رانوں تک کھینچ لی تھی۔ وہ بھی لیٹ گیا تھا اور بلاؤز کے اندر ہاتھ ڈالنے کی جھجکتے ہوئے کوشش کی تھی۔

" پریشان نہ کرو تو اچھا ہے"..... اس نے کہا تھا۔" کیوں کھولتے ہو"

اب اس کے لئے کچھ بھی کر سکنا ممکن نہیں رہ گیا تھا۔ جگنو کے چہرے پر سستے پاؤڈر کی ڈوریاں سی بن گئی تھیں، ہونٹوں پر خون سوکھ کر چپک گیا تھا۔ کانوں کے آویزے مینڈک کی آنکھوں کے مانند ابھرے ہوئے تھے۔ بال تیل سے بھیگے تھے۔ تکیہ نہایت غلیظ تھا۔ اور چادر کچلے ہوئے چنبیلی کے پھول کی طرح میلی تھی۔

تنگ کوٹھری میں عجیب سی بدبو بھری ہوئی تھی۔ ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا تھا اور تام چینی کا ایک ڈبہ۔ کونے میں کچھ چیتھڑے بھی پڑے ہوئے تھے۔

وہ پڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ جگنو کے سرہانے ہی چھوٹی سی الماری تھی۔ اس کا پتھر تیل کے چکنے دھبوں سے اٹا ہوا تھا۔ ایک ٹوٹا ہوا کنگھا، سستی نیل پالش کی شیشی اور جوڑے کے کچھ پن اس میں پڑے ہوئے تھے۔ الماری کی لپاٹ پر پنسل سے کچھ نام اور پتے تحریر تھے۔ فلمی گانوں کی کچھ کتابیں ایک کونے میں رکھی تھیں۔ انہی کے پاس مردہ سانپوں کے مانند نقلی بالوں کی کچھ چوٹیاں پڑی تھیں۔ یہ سب دیکھتے دیکھتے اسے کراہت سی ہونے لگی تھی۔ اپنا دھیان بٹانے کے لئے اس نے جگنو کی ران پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ جو باسی مچھلی کی طرح پلپلی اور کھدر کی طرح کھردری تھی۔ جگنو کے نیم برہنہ جسم سے کھٹے کی سی مہک آرہی تھی۔ اس نے ہاتھ ہٹایا تو ران سے ہو کر نیچے چادر پر آگیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ جیسے چادر بھیگی ہوئی ہو.......

" یہی تو کمائی کا وقت ہے۔ اتنے میں چار خوش ہو گئے ہوتے!" جگنو نے کہا، اور دونوں باہنوں میں کس کر اسے بھینچ لیا تھا۔

اور جب وہ اٹھ کر بیٹھا تو جگنو نے مذاق میں اس کا تھیلا کھول لیا تھا۔" بہت روپیہ بھر کر چلتے ہو"

وہ سمجھا شاید مذاق کے بہانے وہ ایک آدھ روپیہ اور میٹھا نا چاہتی ہے۔ تھیلے میں کاغذ، اخبار اور ردی دیکھ کر وہ خفیف ہو گئی تھی۔

"وہ پھر کبھی آنا تو پوچھ لینا۔ سید ھے آؤ گے نا؟" جگنو نے کوٹھری سے باہر نکلتے نکلتے کہا تھا۔ تب اس نے جگنو کو پہلی بار غور سے دیکھا تھا اور چپ چاپ چلا گیا تھا۔

جب بھی جگنو بازار سے گزرتی تو سر پر پلو ڈال کر۔ وہ اتنی چھچھوری بھی نہیں تھی کہ اس پر کوئی آوازیں کستا۔ سب اسے ایسے دیکھتے گویا اس پران کا پورا پورا حق ہو۔ وہ راہ چلتے کنکھیوں سے ان لوگوں کو ضرور دیکھ لیتی تھی جنہیں وہ بخوبی پہچانتی تھی اور جو اس کے مردوں کی طرح اس کے پاس آتے جاتے تھے۔ تبھی وہ ایک دن دکھائی دیا تھا۔ وہی تھیلے والا آدمی۔ ایک عمارت کی پہلی منزل کی گیلری پر کہنیاں ٹیکے وہ بیڑی پی رہا تھا۔ وہی قمیض پہنے ہوئے تھا۔ عمارت پر لال جھنڈا لگا ہوا تھا جس کا سایہ اس کے کندھوں پر لرز رہا تھا۔

لوٹتی ہوئی چپل کی مرمت کے لئے وہ وہیں رک گئی تھی۔ وہ شاید اندر چلا گیا تھا۔

رات کو وہ آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب شناسائی تھی۔ اس بار وہ گھبرا نہیں رہا تھا۔ کھاٹ پر بیٹھے بیٹھے جگنو نے پوچھا تھا۔ "تم کیا کام کرتے ہو۔"

"کچھ نہیں۔" اس نے کہا تھا۔ "مزدوروں میں کام کرتا ہوں۔"

"وہ ہمارا بھی کام کر دیا کرو۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم بھی مزدور ہیں۔"

"تمہیں دیر نہیں ہو رہی ہے۔" اس نے کہا تھا۔

"وہ آج طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" جگنو السا تے ہوئے بولی تھی۔

"کیا ہوا؟"

"کمر بہت دکھ رہی ہے۔ سارا بدن پھوڑا ہوا جا رہا ہے۔" جگنو نے کہا تھا "پتہ نہیں کیا ہو گیا ہے۔۔۔۔۔! تارا کو بلا دوں۔۔۔۔۔ بہت شرافت سے پیش آئے گی۔۔۔۔۔ سمجھدار عورت ہے۔"

اس نے منع کر دیا تھا۔ کچھ دیر بیٹھ کر جب وہ رخصت ہونے لگا تھا تو صرف اتنا ہی بولا تھا۔ "میں ایسے ہی چلا آیا تھا۔" اور پھر چپ چاپ اندھیری سیڑھیوں میں اتر گیا تھا۔

جگنو خاموشی سے آ کر کھڑکی پر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس نے سوچا شاید وہ کسی اور زینے پر چڑھ جائے گا۔ گلی میں زیادہ آمد و رفت نہ تھی۔ تھوڑی تھوڑی دور پر آدمیوں کی تین چار ٹولیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے علاحدہ ہو کر کبھی کوئی کسی مکان میں گھس پڑتا تھا۔ نانبائی کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔۔۔۔ وہ اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ کہیں رکا نہیں دھیرے دھیرے گلی پار کر کے سڑک کی جانب مڑ گیا تھا۔ اسی سڑک پر جہاں وہ عمارت واقع تھی، جس میں وہ رہتا تھا۔ جگنو کو اس کا یوں لوٹ جانا بہت اچھا لگا تھا۔ ہلکی سی مسرت ہوئی تھی اسے۔ کوٹھری میں پلنگ پر آ کر وہ لیٹ رہی تھی کوٹھری میں بہت سیلن تھی اور گھٹی گھٹی سی بدبو۔ دروازہ اس نے بند کر لیا تھا اور فلمی گانوں کی کتاب اٹھا کر دل ہی دل میں پڑھتی رہی تھی۔

تبھی دروازہ پر دستک ہوئی اور اماں کی آواز سنائی دی تھی۔ "جگنو بیٹے! مر گئی! ہوا بے ہوش تو نہیں ہو گیا!"

"یہاں کوئی نہیں ہے اماں۔"۔۔۔۔۔

"تو برآمدے میں نکل آ بیٹے..... بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے..... گلی میں رونق بھی ہے،" کہتے ہوئے اماں نے دروازہ کھول دیا تھا۔ "طبیعت تو ٹھیک ہے۔"

"کچھ گڑبڑ ہے اماں!"

"تو ایک گلاس دودھ پی لو بٹیا..... ابھی تو وقت ہے، کوئی آ گیا تو"..... اور وہ اُٹھ آئی تھی۔ اس کی گردن پر ہتھیلی رکھتے ہوئے اماں نے پیار سے دیکھا اور کمر کے اوپر پیٹھ کے گوشت کی لوٹتی ہوئی سلوٹیں دیکھ کر بولی تھی: "صحت کا خیال چھوڑ دیا ہے تو نے۔ کمر پر کتنی موٹی پرتیں گرنے لگی ہیں۔ تھوڑی سی ورزش کر لیا کر"..... کہتے ہوئے وہ دوسری کوٹھری میں چلی گئی تھی۔ دوسری کوٹھری سے کچھ تیز تیز آوازیں آ رہی تھیں۔ اور اماں بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی تھی: "یہ چڑیل بنا لڑے لگام نہیں ڈالنے دیتی..... کسی دن اس کوٹھری میں قتل ہو گا۔"

یہ روز کا معمول تھا..... بلقیس کو اماں یونہی کوستی تھی۔ خود بلقیس کا کہنا تھا کہ اس کے پاس سے کوئی بنا کمر کرے واپس نہیں جا سکتا۔ بلقیس کو اس میں لطف بھی ملتا تھا۔ گاہک کو رخصت کرتے ہی وہ دروازے پر آ کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ اور اسے شکست خوردہ جاتے دیکھ کر تالیاں بجا کر بڑی اونچی آواز میں ہنستی تھی: "اری او مردار زبیدہ! ذری دیکھ..... رستم جا رہا ہے! بڑا آیا تھا پہلوان کا بچہ! یہ مرد واسوئے گا عورت کے ساتھ!"

ایک روز ایک گاہک بگڑ اٹھا تھا: "کیا بکتی ہی ہے!"

"ارے جا جا چمار کی اولاد، لے یہ چونی لے جا، چھٹانک بھر ملائی کھا لینا!"

اور وہ آدمی پٹا ہوا سا سیڑھیاں اتر گیا تھا۔ پورے کوٹھے میں بلقیس کے وجود سے دہشت چھائی رہتی تھی۔ پتہ نہیں کب جھگڑا ہو جائے!

جگنو کو دیکھ کر بلقیس ہمیشہ طعنہ دیتی تھی: "تو تو کسی کے گھر بیٹھ جا!"..... لیکن جگنو کسی سے لڑتی نہیں تھی وہ جانتی تھی کہ بلقیس بڑی منہ پھٹ ہے۔ اماں تک کا لحاظ نہیں کرتی اور اماں تھی کہ سب کے تن بدن کا خیال رکھتی تھی۔ بدن سڈول و سجل رکھنے کے لئے وہ ہمیشہ چنچتی ہی رہتی تھی: "بھینس کی طرح پھیلتی جا رہی ہے۔ ساٹن کا پیٹی کوٹ پہنا کر آ لو کھانا بند کر کلموہی!"

پیٹ پر ڈھلان آتے ہی وہ زبیدہ کے لئے اندر صندوق میں سے پیٹی نکال لائی تھی: "دن میں اسے باندھا کر! چاول پینا کم کر۔" اور اس نے زین کی ہر ناپ کی انگیا لا کر رکھ دی تھی۔ "میرا بس چلے تو عمر روک دوں تم لوگوں کے لئے۔"

دوپہر میں اماں بڑے پیار سے کبھی کسی کے بال سنوارنے بیٹھ جاتی۔ کبھی شام کے لئے ساریوں پر استری کرتی اور بسنت کے دن تو وہ سب کے لئے بسنتی جوڑا رنگتی تھی۔ فتے کے لئے رومال رنگنا بھی نہ بھولتی۔ عید، بقر عید، ہولی، دیوالی بڑے حوصلے سے مناتی اور کبھی کبھی کملا کی یاد کر کے نمناک آنکھوں سے کہتی: "اس جیسی لڑکی تو ہزار کو کہیں بھی نہیں جن پائیں گی..... خدا نے کیا حسن بخشا تھا۔ ہاتھ لگاتے ہی میلی ہوتی تھی..... اسے تو پیسے والوں کی نظر کھا گئی۔ زہر دے دیا کتوں نے..... بہت چھٹپٹائی تھی بیچاری۔ ہائے میں تو اسپتال بھی نہ لے جا پائی۔"

جگنو برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ آتے جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔ بھیڑ دھیرے دھیرے ہلکی ہو رہی تھی پھول بکرے والے ٹھٹھر کر جا رہے تھے۔ اور اس نے دیکھا تھا..... حسب معمول آج بھی منو مالی نے گزرتے ہوئے ایک گجرا کلاوتی کی کھڑکی میں پھینکا تھا اور کلاوتی نے روز کی طرح مسکرا کر گالیاں دی تھیں۔ بنے قلعی والا ڈھلی ہوئی تہمد اور جالی دار بنیائن پہنے آیا تھا

اور سید سے شہناز کے کوٹھے پر چڑھ گیا تھا۔

شنکر مینو اڑی کے سامنے چبوترے پر نیم پاگل چنی لال نے اپنا بوریا بچھا لیا تھا۔ اور تمام چینی کے مگ میں چائے پیتے ہوئے بڑبڑا رہا تھا "ارے ظالم اسی دن ہاتھ قلم کروالے جس دن غلط سر نکل جائے! یہیں اتر کر آئے گی ...... اسی بوریئے پر سہاگ رات ہوگی ...... ارے ظالم!" اور تبھی ایک لمحے کے لئے گلی کے موڑ پر جگنو کو اس نیلی قمیص والے کا شک ہوا تھا۔ شاید وہ پھر لوٹ کر آیا ہے اور چپکے سے کہیں چڑھ جائے گا۔ لیکن اسے دھوکہ ہوا تھا۔ وہ نہیں تھا۔ کوئی اور آدمی تھا۔

پھر بہت دنوں بعد وہ آیا تھا۔ اور جگنو کی کوٹھری میں آتے ہی گھر کی طرح کھاٹ پر دراز ہو گیا تھا۔ لیکن جوتے اتارنے کی پھر بھی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

"تم اپنا نام تو بتا دو؟" جگنو نے بغل میں لیٹتے ہوئے پوچھا تھا۔

"مدن لال ...... کیوں۔"

"ایسے ہی ...... یہاں نہیں تھے کیا؟"

"جیل میں تھا ...... گرفتاریاں ہو رہی تھیں، اسی میں چلا گیا تھا"......

"کیوں؟"

"ہڑتال چل رہی تھی ...... مالکوں نے بند کروا دیا تھا۔ بڑی مشکل سے رہا ہوا۔"

"اس ہڑتال وڑتال سے کچھ ہوتا بھی ہے؟ کاہے کو کی تھی؟"

"بغیر نوٹس برخاستگی ہوئی تھی۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا اور بھی بہت سارے مسئلے تھے۔"

"جوتے اتار لوں۔" مدن لال نے ہچکچاتے ہوئے کہا تھا۔

"اتار لو۔" اور کرمچ کے جوتوں اور پسینے میں بھیگے ہوئے پیروں سے جو بھبک اٹھی تھی، اس سے جگنو پر کوئی خاص رد عمل نہیں ہوا تھا ...... دھیرے دھیرے وہی بو جیسے اس کے چاروں طرف پھیل گئی تھی ...... اور پھر اس کے بدن میں بھر گئی تھی۔

مدن لال تو چلا گیا تھا، لیکن اس کی وہ مخصوص بو رہ گئی تھی، اور انہی دنوں تمام طوائفوں کو ڈاکٹری معائنے کے حاضر ہونا پڑا تھا اور ڈاکٹر نے اتنا ہی کہا تھا کہ اسے کوئی پوشیدہ مرض نہیں، لیکن تپ دق کے آثار ضرور ہیں دیکھتے دیکھتے کھانسی نے شدت اختیار کر لی تھی۔ بخار رہنے لگا۔ اماں ہسپتال لے جا کر دکھا آئی تھی لیکن مرض تھمنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے کام کے لائق بھی نہ رہی۔ ایک دن خون تھوکا تو بلقیس نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ارے اسے ڈلواؤ کہیں باہر یہیں مرنا ہے کیا؟ تو اماں نے اسے زور سے ڈانٹا تھا لیکن اندر سے وہ بھی دہل گئی تھی، طرح طرح سے اس نے جگنو کو سمجھایا کہ وہ اپنی صحت کی خاطر کہیں اور چلی جائے۔ ضرورت کے لئے سو پچاس روپے لیتی جائے۔ لیکن اس طرح لاپرواہی نہ کرے۔

لیکن جگنو حیران تھی کہ وہ کہاں چلی جائے۔ پیسہ بھی پاس نہیں اور سو دو سو کتنے دن کفالت کر سکتے ہیں۔ آخر ہار کر وہ سینی ٹوریم میں داخل ہو گئی تھی۔ دھیرے دھیرے اماں کی دی ہوئی اور جمع شدہ رقم بالکل ختم ہو گئی تھی۔ چار ماہ مسلسل اسی سینی ٹوریم میں رہنا پڑا تھا۔ اس کے بعد بھی اسے رخصت نہیں ملی تھی، ہاں کہیں تھوڑی بہت دیر کے لئے آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ وہاں سے نکل کر وہ دو چار بار اماں کے پاس آئی تھی تو اماں نے کہا تھا

"کسی کو بتانا مت بیٹے کہ کہاں تھی...... میں نے تو سب لوگوں سے کہا ہے کہ رامپور چلی گئی ہے، اپنی بہن کے پاس، کچھ دنوں کے بعد واپس آجائے گی...... یہ موا داروغہ بہت پریشان کرتا تھا...... اسے شک تھا کہ یہیں کہیں بیٹھنے لگی ہے......"

اماں کی آنکھوں میں اپنائیت اور خلوص پاکر اسے بڑا سہارا ملا تھا۔ اور اماں اس کی حالت دیکھ کر دکھی ہو رہی تھی۔ حقیقتاً جگنو کا بدن جھلس سا گیا تھا...... بال بہت جھینے ہو گئے تھے اور چہرے کی سرخی یکسر غائب ہو گئی تھی۔

جگنو جب شیشے میں اپنی شکل دیکھتی تو گھبرا اٹھتی تھی۔ اب کیا ہوگا؟ کیسے بیتے گی یہ پہاڑ سی بیار زندگی! سہارا...... بھی تو نہیں، کوئی ہنر بھی نہیں......

پیشے پہ پابندی لگ جانے کے باوجود کئی نئی لڑکیاں لکھنؤ، بنارس سے آگئی تھیں اور انہوں نے بازار بگاڑ رکھا تھا۔ سنا تھا شہناز کی حالت بھی خراب ہو گئی تھی۔ اور کلاوتی کے تو بھوکوں مرنے کے دن آ گئے تھے۔

یہ سب جان کر جگنو کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

چلنے سے قبل اس نے اماں سے کچھ مانگے تھے تو وہ اپنا رونا رونے لگی تھی اور اپنی زبوں حالی کا شکوہ کرنے لگی تھی، اس کی حالت بھی خستہ تھی۔

اور وہاں سے سینی ٹوریم واپس ہوتے وقت اس نے اُن سب کی جانب پُر امید نگاہوں سے دیکھا تھا، جن سے اس کی آشنائی تھی، جو اس کے پُر شباب دور میں اس آتے جاتے رہے تھے۔

منو کرانی کو دکان پر بیٹھا دیکھ کر اس کا دل نفرت سے بھر اُٹھا تھا...... اس کا کمر پکڑ کر بیٹھ جانا اور رانیں کھجلاتے ہوئے جیسے تیسے کوٹھری سے باہر جانا......

کنور جیت ہوٹل والا میلا پاجامہ پہنے نوٹ گن رہا تھا۔ اٹھنے سے پہلے ہمیشہ اوں — اوں کی ڈکاریں لیتا تھا تو جگنو کا جی متلانے لگتا تھا۔

جگنو نے اوروں کو بھی دیکھا تھا...... جن سے تھوڑی بہت میل ملاقات رہی تھی۔

سینی ٹوریم میں اور زیادہ دن رکنا نہیں ہوا۔ آخر آنا تو تھا ہی، لیکن وہ سبھوں کی شکر گزار تھی کہ انہوں نے مصیبت کے دنوں میں آنکھیں نہیں پھیری تھیں۔

اور اس نے جو کچھ جس سے لیا تھا اسے نسخے کی پشت پر ہی لکھ لیا تھا۔ اتنے دنوں میں خاصا قرضہ چڑھ گیا تھا۔ کنور جیت ہوٹل والے نے بڑا احسان جتا کر سینتالیس روپے دیئے تھے۔ منو نے اتنا احسان تو نہیں جتایا تھا لیکن روپے جلد از جلد لوٹا دینے کی تاکید کر دی تھی۔ پچیس روپے سے جیسے اس کا کاروبار رکا جا رہا تھا۔ سنت رام قرنے بیس روپے دیئے تھے اور چلتے چلتے پراگندہ مذاق کیا تھا۔ "سود میں ایک رات...... ٹھیک ہے نا......" لیکن اس مذاق سے اسے اتنا اندازہ ہوا تھا کہ مرد کی آنکھ اب بھی اس پر ٹکتی ہے۔ بدن اتنا گیا گزرا نہیں ہوا ہے جتنا کہ وہ شاید سمجھ رہی ہے۔

بدحالی کے ان دنوں میں اس نے ایک روز مدن لال سے بھی مل کر تیس روپے لئے تھے۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا "یہ چندے کی رقم ہے جلد دیدو گی تو ٹھیک ہوگا۔ میرے پاس بھی اتنا نہیں ہوتا کہ خود بھر سکوں!" لیکن اس کے لہجے میں بڑی بے چارگی تھی۔ حد درجہ مجبوری ظاہر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا "جگنو اسے غلط نہ سمجھے...... اس کی اتنی اوقات نہیں ہے۔" اور پھر مزید کچھ کہے بغیر وہ پارٹی کے دفتر میں چلا گیا تھا!

اور اب جب سے وہ سینی ٹوریم سے لوٹی تھی۔ پولیس والے الگ پریشان کر رہے تھے۔ سات ماہ کا بقیہ انہیں

نہیں ملا تھا۔ اس کو ٹھے پر انہوں نے سب سے الگ الگ رقم باندھ رکھی تھی۔

لوٹ کر آنے کے بعد سے وہ اندر اندر بڑی نقاہت سی محسوس کرتی تھی۔ بدن اب اتنا سہہ نہیں پاتا تھا۔ کوئی زیادہ چھیڑتا چھاڑتا تو ہلکی کھانسی شروع ہو جاتی تھی...... اور پانچ پانچ ...... سات سات منٹ کے اندر سینہ دم پھولنے لگتا تھا ...... اور لوگ تھے کہ سینے پر بھی سارا وزن رکھ دیتے تھے۔

بالوں کی ایک پرانی چوٹی وہ سات روپے میں کلاوتی سے خرید لائی تھی اور چھاتیوں پر بھی "کپس" لگانے لگی تھی ہر بار انہیں نکالنے اور لگانے میں بڑی الجھن کبھی ہوتی تھی۔ کلف لگی دھوتیاں پہننے سے اسے ہمیشہ چڑ رہی تھی، لیکن کلف لگی ہی پہنتی تھی۔ بدن ذرا گداز لگتا تھا، اتنا سب کرنے کے باوجود آمدنی تسلی بخش نہیں تھی۔ کوئی کوئی رات تو خالی ہی چلی جاتی تھی اور اپنی کوٹھری میں تنہا لیٹے لیٹے اس پر بڑی گھبراہٹ طاری ہو جاتی تھی۔ یہ طویل طویل زندگی ...... دن بدن ٹوٹتا ہوا جسم۔

سرد موسم کے لوگوں نے اسے بے حد پریشان ہونا پڑتا تھا۔ وہ حد سے زیادہ پریشان کرتے تھے...... بوٹی بوٹی ٹٹولتے رہتے تھے اور جوش آنے کے انتظار میں بہت ستاتے تھے۔ اچانک یہاں وہاں ہاتھ ڈال دیتے تھے اور طرح طرح کی گندی فرمائشیں کرتے تھے۔

ان سے بہتر تو وہ تھے، جو بھری بندوق کی مثال آتے تھے ...... اور اپنا کام کر کے چلتے بنتے تھے۔ نہ زیادہ بکواس کرتے تھے نہ زیادہ ستاتے تھے۔ لیکن پھر بھی آمدنی اتنی نہیں تھی کہ گذر بسر ہو سکے۔ قرضہ اتنے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ نسخے کی پشت پر سبھوں کے روپے لکھے تھے ...... لیکن اتنی رقم ہاتھ ہی نہ آتی تھی کہ انہیں ادا کر سکے۔

آخر اور کوئی ذریعہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ رانوں کے جوڑوں پر نکلا پھوڑا دکھلانے کے لئے جب جگنو جراح کے پاس جا رہی تھی تو راستے میں منسو نے ٹوک دیا تھا "بہت دن ہو گئے ہیں۔ اب تو دھندا بھی چل رہا ہے۔"

چلتے چلتے وہ ایک طرف کو آگئے تھے، تب بڑی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے اس نے منسو سے کہا تھا "ایک پیسہ نہیں بچتا۔ کیا کروں ...... تم نے تو آنا جانا بھی چھوڑ دیا ہے۔"

"ہم نے تو گنگا جلی اٹھائی ہے ...... رنڈی بازی نہیں کریں گے۔ تلسی کی کنٹھی پہن لی ہے، یہ دیکھو" منسو بولا۔ تو جگنو کو ہلکی سی ہنسی آگئی اور وہ آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ گیا تھا۔

رانوں کے جوڑ پر نکلے ہوئے پھوڑے کی وجہ سے چلنے میں جگنو کو کافی تکلیف ہو رہی تھی۔ وہ ٹانگیں پھیلا پھیلا کر چل رہی تھی ...... منسو کا من ڈول رہا تھا۔ گلی کے موڑ پر آکر منسو نے دھیرے سے کہا تھا "تو پھر بتایا نہیں تم نے ...... کب تک انتظام کرو گی۔"

"طاقت ہو تو وصول کر لے جاؤ!" جگنو نے ایک بے بسی کو چھپاتے ہوئے بظاہر شوخی سے کہا تھا اور گلی میں مڑ گئی تھی۔ اپنی ہی بات پر اسے بڑی شرم آئی تھی ...... پھر احساس ہوا کہ ٹھیک ہی تو کہا اس نے ...... خواہ مخواہ کی عزت کا کیا مطلب؟ اور پھر کسی کا قرضہ لے کر کیوں مریں؟ جو اتر جائے سو بہتر ہے۔

جراح نے بتایا تھا کہ ابھی پھوڑا پکنے میں کچھ روز لگیں گے۔ بازار ہٹنے کے لئے پولٹس دیدی تھی جب وہ لوٹی تو دوپہر ہو چکی تھی۔ سب اپنے اپنے چبوتروں پر بیٹھی ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ یہ وقت ہوتا ہے، جب سب جاگ کر اٹھ جاتی ہیں اور شام کی تیاری سے قبل مل بیٹھ لیتی ہیں، گلی سے کمسن لڑکوں کی ٹولی گذر رہی تھی وہ فحش اشارے کر کے

عورتوں کو چڑا رہے تھے۔ اور بائیوں کو دی جانے والی گالیوں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ آوارہ لڑکے روز گزرتے تھے ...... اور ان کا روز کا یہی شغل تھا، ڈھلتی عمر کی عورتیں گندے اشارے دیکھ کر ان کے بالوں کو نت نئی گالیوں سے نوازا کرتیں۔ اور نوجوان عورتیں مسکراتی رہتی تھیں کبھی کبھی بنواری یا لنگڑا اماتادین ان لڑکوں کو ڈرا بھی دیتے تھے تب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچ کر گالیاں دیتے تھے اور نیکر یا گھٹنا اٹھا اٹھا کر بے ہودہ حرکتیں کرتے تھے۔ لڑکوں کی یہ ٹولی مسجد کی پیچھے والی گلی سے آیا کرتی تھی۔

دوپہر ہی میں دنیا جہان کی باتیں ہوا کرتی تھیں، اپنے دُکھ، اپنے سکھ، اس کی بُرائی اُس کی اچھائی۔ ان سب باتوں کا مرکز زیادہ تر ان کی ذات ہوا کرتی تھی جو اس محلے کو خیر باد کہہ کر شریفوں کی بستیوں میں بس گئی تھیں ..... جنھیں چھانٹ چھانٹ کر ابراہیم لے گیا تھا۔

شام ہوتے ہی گلی گرمانے لگتی تھی۔ پھول ہار والے آجاتے تھے بنواڑیوں کی دکانیں سج جاتیں اور غفور کی دکان پر ایک حوالدار آکر بیٹھ جاتا تھا...... اس کے بیٹھتے ہی غفور کھلے عام بوتلیں فروخت کرنا شروع کر دیتا تھا۔

جگنو شام کو پوٹلیں ہٹا دیتی تھی اور بڑی بے دلی سے بناؤ سنگھار کر کے بیٹھ جاتی تھی۔ پھوڑا اگانٹھ بن کر رہ گیا تھا، درد بہت کرتا تھا۔ پھر بھی وہ جیسے تیسے ایک آدھ کو نپٹا دیتی تھی۔

برآمدے میں بیٹھے بیٹھے جب وہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں سوچتی تو بے شمار اندیشے اسے گھیر لیتے، تب وہ بے انتہا پریشان ہو جاتی۔ آخر کیا ہوگا؟ وہ تو دانے دانے کو محتاج ہو جائے گی۔ لنگڑی گھوڑی کی زندگی آخر وہ کیسے جی پائے گی؟ ...... کیا اسے بھی مسجد کی سیڑھیوں پر برقعہ پہن کر بیٹھنا ہوگا اور سبھوں کے سامنے دست سوال دراز کرنا ہوگا؟ اختری کی طرح ...... بتو اور چمپا کی طرح ...... یہ سب سوچ سوچ کر جب اس کا دل بہت گھبرانے لگتا تو وہ زہر کھانے کی بات سوچتی یا ڈوب مرنے کی۔

سینکڑوں مرد آئے اور گئے ...... لیکن کوئی ایسا مرد نہیں جس کی پرچھائیں تلے عمر کٹ جائے۔

ذرا زیادہ جان پہچان انہی سے تھی جن سے روپے لئے تھے۔ مگر آسرا وہاں بھی نہ تھا۔ کسی کا کیا بھروسہ ...... کون کہاں چلا جائے! عمر کے ساتھ سب لوٹ جاتے ہیں۔ جہاں بال بچے بڑے ہوئے کہ ان کا آنا جانا بند۔ جہاں عمر ڈھلی کہ آدمی نے دوسرا شوق دوسرا مشغلہ ڈھونڈا ...... تب کون آئے گا؟ پرانی شناسا شکلیں بھی نہیں دکھائی دیں گی۔ تب کتنا عجیب اور تنہا تنہا سا سب کچھ محسوس ہوگا ...... بیتے ہوئے لمحات میں بیٹھ کر جلنا کتنا اذیت ناک ہوگا ......!

گذشتہ دنوں میں اس کے لئے بس یہی ایک بات تسکین کا باعث بنی کہ سبھی قرضے دار اپنی اپنی رقم وصولنے اس کے پاس آتے رہے ہیں ...... اسے اُمید تھی کہ ملنو ضرور آئے گا، وہ اپنا پیسہ ضرور وصول کرے گا ...... اور وہ آیا تھا منیہ کے جسم سے ویسا ہی بھبکا اٹھتا تھا۔ اور وہ آیا بھی گیارہ کے بعد ہی تھا اور نیٹ چکنے کے بعد کمر پکڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ جگنو بھی بے حس و حرکت پڑی ہوئی تھی۔ پھوڑے پر دباؤ پڑنے کی وجہ سے وہ بلبلا اٹھی تھی اور اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ملنو کو اُٹھا کر دروازے تک پہنچا آئے تاکہ وہ حسب معمول راہیں کھجلاتا ہوا چلا جائے۔

ملنو کی اکڑی کمر جب ڈھیلی پڑی تو اس نے کہا تھا۔ "یاد رکھنا" جگنو نے "اچھا" کہا تھا اور ملنو کو سہارا دے کر اٹھا دیا تھا۔ رات زیادہ ہو گئی تھی اور اسی جگہ پڑی پڑی کوٹھری کی دیواروں کو دیکھتی رہی تھی لیکن ان میں دیکھنے لائق

کلیشور نبیر

کوئی چیز نہ تھی۔ مٹ میلی بھدی دیواریں، جن پر کبھی اس نے ردی رسالوں سے کاٹ کاٹ کر فلمی ستاروں کی تصویریں چپکائی تھیں۔ کونے کی کیل پر ایک ڈوری، جس پر پرانی چوڑیوں کا ایک گچھا اٹک رہا تھا۔ کھاٹ کے نیچے گدڑی تھی اور ٹین کا بکس۔ بکس میں بارہ برس پہلے کا ایک خط پڑا ہوا ہے جس کے حروف بھی اڑ چلے ہیں۔۔۔۔۔۔ اب اس خط کا کوئی مطلب نہیں رہ گیا ہے۔ مکتوب اپنی زندگی کھو چکا ہے۔ اور اب کون جاتا ہے واپس۔۔۔۔ اور کون بلاتا ہے واپس۔۔۔۔ زندگیوں کے درمیان وقت کا دریا کاٹتا ہوا نکل گیا۔۔۔۔ کہیں کوئی نہیں ہے۔۔۔۔ کوئی کہیں نہیں ہے۔

صبح اٹھی تو بدن ٹوٹ رہا تھا پھوڑے میں بے حد تکلیف تھی۔ ران کا جوڑ پھٹا جا رہا تھا۔ اس نے پھر پلٹس باندھ لئے تھے اور شام جیسے تیسے تیار ہو گئی تھی۔ کوٹھری میں جا کر سب کا حساب جوڑنے لگی۔ الماری کی دیوار پر اس نے نشان لگا رکھے تھے کہ کون کتنی بار آیا تھا۔ اور کتنے روپے بیباق ہو چکے تھے۔ سنت رام واقعی بڑی بدتمیزی سے پیش آیا تھا بیس روپے کے عوض وہ چار بار آ چکا تھا اور پانچویں بار جب جانے لگا تھا تو جگنو نے بڑی آہستگی سے کہا تھا "یونہی جا رہے ہو"

"کیوں" سنت رام کی نگاہوں میں کمینگی تھی۔

"تمہارے روپے تو پچھلی بار ہی پٹ گئے تھے" اس نے بہت جھجکتے ہوئے لیکن صاف لہجے میں کہا تھا۔

"ایک بار ہی سود کی!" سنت رام نے بڑے گندے لہجے میں کہا تھا "پھوکٹ کا پیسہ نہیں آتا سمجھی" اور کوٹھری سے نکل کر تیز تیز سیڑھیاں اتر گیا تھا۔

جگنو بھونچکی سی دیکھتی رہ گئی تھی، اوروں کی طرح وہ جھگڑا کبھی نہیں کر پاتی تھی۔ چیخ چلا بھی نہیں سکتی تھی اور گاہک کو ذلیل کرنا بھی اسے پسند نہیں تھا۔

کنور جیت ہوٹل والے کے سب سے زیادہ روپے چڑھے ہوئے تھے وہ صرف تین بار آیا تھا اور کل پندرہ روپے تھے۔ ہلکی راحت کا احساس ہوا تھا کہ تبھی پھوڑے میں شدت کی ٹیس اٹھی۔ وہ ٹانگیں پھیلا کر وہیں بستر پر لیٹ گئی تھی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تو دیکھا کہ مدن لال تھا۔ اسے دیکھتے ہی ایک لمحے کے لئے اندر ہی اندر جھلا اٹھی تھی گویا ایک اور سود خور سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔۔۔۔۔ اپنی وصولیابی کے لئے۔

مدن لال ابھی دو دن نہیں آیا تھا۔ اس کا اس وقت آنا جگنو کو گراں گزرا تھا۔ پھر بھی بے چارگی کے عالم میں اس نے اندر بلا لیا تھا۔۔۔۔۔ مدن لال کھاٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ اپنا تھیلا اس نے سرہانے سرکا دیا تھا۔ جگنو خاموشی سے تھیلے کو ٹٹولنے لگی تھی۔ اس میں کچھ پوسٹر تھے اور تہہ شدہ ایک جھنڈا۔ اور چند پرانے رجسٹر بھی تھے۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں وہ اپنے پیسوں کا مطالبہ نہ کر بیٹھے۔ پھوڑا الگ اذیت دے رہا تھا۔

مدن لال وہی پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا اور وہی جوتے۔ پسینے کی بوبو کوٹھری میں بھر گئی تھی۔

"بہت دنوں بعد آنا ہوا" بڑی ہمت کر کے جگنو نے پوچھا تھا۔

"جوتے اتار لوں" مدن لال نے آہستگی سے کہا۔

"اتار لو"

"دروازہ بند کر دوں۔"

"آج بے حد تکلیف ہے۔۔۔۔۔ ران کے جوڑ پر پھوڑا نکلا ہوا ہے۔ سیدھی تو لیٹ بھی جاؤں لیکن ٹانگیں موڑتے ہی جان نکل جاتی ہے" جگنو نے کہا تو مدن لال تسمے کھولتے کھولتے ٹھٹک گیا تھا دل بیٹھ سا گیا تھا۔ جگنو بھی

کچھ عجیب سا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن مدن لال نے جلد ہی گفتگو شروع کر کے اسے اس کیفیت سے نجات دلادی تھی۔ وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا تھا، لیکن ہر لمحہ جگنو کو ڈر لگا رہتا کہ کہیں بات گھوم پھر کر روپیوں پر نہ آجائے۔

"اچھا تو چلتا ہوں......" مدن لال کپڑے سمیٹ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے بہت بھری بھری نظروں سے جگنو کو دیکھا تھا..... جیسے آج لوٹنے سے اسے دکھ ہو رہا تھا۔

اور ساری باتوں کے باوجود جگنو اب دوبارہ اس سے رکنے کو کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ بہت ہچکچاتے ہوئے اس نے کہا تھا: "وہ تمہارے روپے........"

"ان کے لئے نہیں" مدن لال نے کہا "تمہارے لئے آیا تھا۔"

اس کی بغلوں کے نیچے ابھرا ہوا سینہ سیاہی کے دھبوں کی مانند چمک رہا تھا یا زدوؤں کی اُبھری ہوئی رگیں پسیج رہی تھیں۔ اس نے پسیجے ہاتھوں سے جگنو کا ہاتھ پکڑا تھا جیسے ہتھیلی میں ملائم و خستہ روٹی کی ہلکی سی تپش سما گئی ہو۔

"میں پھر آؤں گا"... کہہ کر مدن لال چلا گیا تھا۔ جگنو سیڑھے برآمدے میں آگئی تھی۔ دل میں کہیں افسوس بھی تھا کہ اسے ایسے ہی لوٹ جانا پڑا۔ مدن لال کو وہ دیکھتی رہی...... وہ گلی میں بنئیے یا گھر والے کر کے کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کا گلی میں رکنا جیسے اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ پھر وہ اوپر برآمدے پر ایک نظر ڈال کر پانچویں کوٹھی کی سیڑھیاں چڑھ گیا تھا۔ پتہ نہیں کیسی تلملاہٹ ہوئی تھی۔ پھوڑے میں زور کی ٹیس ہوئی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے جلن گھٹنے لگی تھی اگر اس نے روکا ہوتا تو شاید نہ جاتا...... آخر اسے بھی تو...... جلن برداشت ہونے لگی تھی۔ وہ تو صرف اس کی تکلیف کا خیال کر کے لوٹ گیا تھا۔ اب اس کے پسیجے ہاتھ کی گرماہٹ میں کسی قسم کا فریب نہ تھا۔

تبھی کنور جیت آگیا تھا۔ اچانک اسے ایسا لگا جیسے کوئی غیر گھر میں گھس آیا ہو لیکن خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا تھا۔

بلقیس ادھر کونے میں کھڑی کسی پہلوان سے بات کر رہی تھی۔ جگنو چپ چاپ کنور جیت کو لے کر کوٹھری میں چلی گئی تھی دروازے بند کر لئے تھے۔ کنور جیت نے کنڈی چڑھا دی تھی۔

"آج بہت تکلیف ہے۔ پھوڑا پک گیا ہے۔" جگنو نے عاجزی سے سمجھایا تھا۔

"ابھی تک ٹھیک نہیں ہوا؟" کنور جیت نے پوچھا تھا۔

"ہوں۔ شاید ایک دو دن میں پھوٹ جائے۔!" جگنو نے گویا معذرت چاہی تھی۔

"بالکل تکلیف نہیں ہونے دوں گا...... بہت آسانی سے"...... کہتے ہوئے کنور جیت کھاٹ پر لیٹ گیا تھا۔

"آج......" جگنو نے کہا، تو اس نے بڑی نرمی سے اسے بغل میں لٹا لیا تھا۔ اور بولا تھا "ذرا بھی تکلیف نہیں ہونے دوں گا۔"

جگنو بہت مجبور ہو گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیسے سمجھائے، تبھی اس نے اس کی چھاتیوں پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ دھیرے سے کروٹ بدل کر جگنو نے لائٹ بجھا دی تھی اور بلاؤز میں ہاتھ ڈال کر کلپس نکالے اور کھاٹ کے نیچے سرکا دیئے تھے۔

کئی بار اس نے کراہ دبائی اور کنور جیت کو روکا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا اور دباؤ پڑتے

ہی ران پھٹنے لگی تھی۔ کنور جیت تین چار بار کا پھر جیسے اس پر شیطان سوار ہو گیا۔

"ارے رک تو......"۔ وہ چیخا تھا اور جگنو کی ٹانگیں دبا کر حاوی ہو گیا تھا۔

"ارے اماں رے...... مار ڈالا..."...! وہ درد سے بے قابو ہو کر پوری آواز میں چیخی تھی جیسے کوئی اسے قتل کر رہا ہو اور پھر جھپٹ پٹا کر بے ہوش سی ہو گئی تھی۔

"سالی"، ہانپتے ہوئے کنور جیت نے کہا اور اسے چھوڑ کر نڈھال سا بیٹھ گیا تھا۔

چند لمحے بعد جگنو کو کچھ ہوش آیا تھا۔ درد کچھ کھا تھا تو اس کے ہاتھ پیر ہلے تھے۔ تکئے کے نیچے سے کپڑا نکال کر اس نے لائٹ جلائی تھی تو پوری جانگھ پھوٹے ہوئے پھوڑے کے مواد سے لت پت تھی اور کنور جیت اس سے بالکل الگ بیٹھا اوں...... اوں کر کے ڈکاریں لے رہا تھا۔

"پھوٹ گیا نا"...... اس نے جانگھ پر سے ساری کھسکالی تھی۔

"دھیان رکھنا، چوکھی بارہ ہوئی!" کنور جیت نے کہا اور کنڈی کھول کر کوٹھری سے باہر نکل گیا تھا۔

ساری کھسکا کر وہ مواد پونچھنے لگی تھی۔ یک لخت دل بڑا گھبرا اٹھا تھا۔ اس نے دھیرے سے فتے کو آواز دی تھی۔ فتے آیا تو اس نے گھڑے سے پانی نکلوایا اور کپڑا بھگو کر مواد پونچھتے ہوئے بولی تھی۔ "دیکھ فتے...... ادھر بلا کے گھر ایک آدمی گیا ہے۔ چلا نہ گیا ہو تو ذرا بلا لا۔ نیلی قمیض پہنے ہے۔ تھیلا ہے اس کے پاس۔

"گاہک آدمی ہے؟" فتے نے بولا تھا۔

"نہیں آپس کا آدمی ہے!" جگنو نے کہا۔ "ذرا سا پانی اور دیدے۔"

فتے گھڑے سے پانی نکال کر لایا تو پھر کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ "رہنے دے...... تو اپنا کام کر، وہ کہہ گیا ہے، آجائے گا کبھی......" کہتے کہتے اس نے آہستہ سے پھوڑے کو دبایا تو کچھ اور مواد نکل پڑا۔ اور درد سے پھر چہرے پر پسینہ چھلکنے لگا تھا۔

کملیشور

مان سرور کے ہنس

انّا، اب خطوں میں کچھ لکھنے کو رہ نہیں گیا ہے، پھر ان کا فائدہ بھی کیا؟ تمہیں خط لکھتا ہوں اور سمندر میں پوسٹ کر آتا ہوں، معلوم نہیں تمہیں ملتے بھی ہیں یا نہیں۔ ایسے خطوں کا کیا مقصد جو کہیں پہنچیں ہی نہیں کہانیاں اور خط لکھنا ایک سی بات ہے، ایک ہی بات تو کہنی ہوتی ہے۔ سب کی تکلیفیں الگ الگ ہیں، مگر جدوجہد تو سب کی ایک سی ہے۔ معلوم نہیں اب تم ان میٹنگوں میں جاتی ہو یا نہیں، تمہارے سب ساتھی کہاں ہیں۔ ایک دن اخبار میں پڑھا تھا، کوئی اریسٹ (گرفتار) ہوا تھا۔ شاید اب سب بکھر گئے ہیں۔ تم کتنا بکھر گئی ہو، اس کا بھی کچھ اندازہ نہیں، بس وہی ایک بات بار بار یاد آتی ہے۔ جتنا سا وقت ہمیں ملتا ہے اس میں اور کچھ کے لئے جگہ کہاں ہے؟ اس اور کچھ سے بہت زیادہ بڑی فکریں ہی اتنے سے وقت میں نہیں نپٹ پاتیں۔۔۔۔۔۔ کتنے دھوکے چاروں طرف طاری ہیں۔ کہاں تک جائے گی یہ جدوجہد۔۔۔۔۔۔؟

شاید تمہیں یاد ہو، تم نے ہی ایک خط میں لکھا تھا۔ بارش میں سب کچھ زیادہ یاد آتا ہے۔ یادوں میں نہا کر من آزاد ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ بارش کی ہی رات تھی وہ۔ میں مین پوری میں تھا۔ وہی گرد و غبار بھرا چھوٹا سا شہر۔ بڑے شہروں اور چھوٹے شہروں کی بارش میں بہت فرق ہوتا ہے انّا۔ چھوٹے شہروں میں گرتی ہوئی بجلی صاف دکھائی دے جاتی ہے۔ بڑے شہروں میں عمارتیں اسے پی جاتی ہیں۔ تم نے کالی اور پیلی آندھیاں دیکھی ہیں؟ میرے اس چھوٹے سے شہر میں بارش آنے سے قبل کالی یا پیلی آندھی آتی ہے، چھوٹا سا شہر ایک تاریک سرنگ میں بند ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی ٹڈیوں کی آندھی بھی آتی ہے۔ پورا آسمان کالا پڑ جاتا ہے۔ کھیت لرزنے لگتے ہیں، کہیں ٹڈیاں بیٹھ نہ جائیں۔

ایک بار تم کو بھی میں اپنے اس چھوٹے سے شہر میں لاؤں گا۔ ضرور سب کچھ تم کو دکھانا چاہتا ہوں خاص طور پر ایک چیز۔۔۔۔۔۔۔ سوکھے کے دنوں میں جب جانور مرتے ہیں تو گدھوں کے جھنڈ آتے ہیں۔ میں نے کھنڈروں کھڑے رہ کر گدھوں کو دیکھا ہے۔ کتنا عجیب ہے یہ کہ ہر برس گدھوں کا وہی جھنڈ آتا ہے۔ تم کبھی دیکھنا، جانور کوئی بھی مرے لگر گدھ وہی آتے ہیں۔

وہ بارش کی رات تھی جس کا میں ذکر کر رہا تھا۔ سب کچھ زیادہ یاد آرہا تھا، رات کچھ سیاہ تھی پرانا مکان تھا جو تم نے اب تک نہیں دیکھا۔ میں چھوٹا سا لیمپ جلائے بیٹھا تھا کہ دیکھا زنگ لگی سلاخوں کے باہر ایک بھیگا سا سایہ کھڑا ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھا۔ میں سمجھ نہیں پایا۔ دروازہ کھول کر میں نے اس سائے کو

دیکھا۔ وہ ایک بوڑھا تھا۔ سنیاسی کی طرح نظر آنے والا ایک نہایت گیا گذرا بوڑھا بجھا بجھا سا، جیسے کوئی جلا ہوا مردہ راکھ کی ڈھیری میں سے اُٹھ کر آ گیا ہو۔

سنو، اس طرح کا احساس مجھے کئی بار ہوا ہے، میرے جتنے ساتھی گولیاں کھا کر گھائل ہوئے اور مرے، بہت بار وہ اپنی چتاؤں سے اُٹھ کر میرے ساتھ آئے ہیں، لیکن وہ بوڑھا آدمی پہچانا ہوا نہیں تھا۔ وہ جلدی میں بھی نہیں تھا، بات کرنے یا کچھ پوچھنے کی جلدی بھی اس میں نہیں تھی۔ سیلن بھری دیواروں کو دیکھ کر بہت آہستہ سے اس نے پوچھا تھا۔ "یہ جگدیپ داد اکا مکان یہی ہے"؟

تمہیں تعجب ہوگا، مگر یہ سچ ہے کہ اپنے پتا کا نام سنکر بھی کچھ لمحوں کے لئے میں یہ یاد نہیں کر پایا کہ میرے پتا کا نام یہی تھا۔ مجھے ان کی ذرا بھی یاد نہیں۔ میں نے ان کو دیکھا ہوگا اس چھوٹی عمر میں جس کی کوئی یاد باقی نہیں رہتی۔

کچھ لمحوں بعد جب میں نے پتا کا نام یاد کیا تو اچانک بولا "جی یہی ہے، آپ کہاں سے آئے ہیں"؟

"تبت سے"، انہوں نے یوں کہا جیسے سامنے والی گلی سے آئے ہوں، پھر انہوں نے اتنی ہی جوش بھری آواز میں پوچھا "تم کون ہو"؟

سوال مجھے بے معنی معلوم ہوا، مگر ان کے پوچھنے کے انداز میں کوئی رعب نہیں تھا۔ انہیں ایک بار غور سے دیکھ کر میں نے کہا "میں ان کا سب سے چھوٹا لڑکا ہوں"

انہوں نے اس رشتے کی جانب کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ آہستگی سے پھر بولے "گھر میں اور کوئی ہے"؟

"اماں ہیں" میں نے کہا۔

"ان کو بلا دوگے"؟ وہ بولے،

اور اماں کے آنے کے بعد سب کچھ ایک منٹ میں ہی واضح ہو گیا۔ وہ بوڑھا شخص میرے چچا تھے، سیناپتی چچا! جو قریب بتیس سال بعد تبت سے آئے تھے۔ وہ وہیں بودھی ہو گئے تھے۔ دلائی لامہ کے ساتھ جو لوگ تبت سے بھاگ کر آئے تھے اسی قافلہ میں وہ بھی وطن لوٹے تھے، اپنی پرانی یادوں کو ساتھ لئے۔ شاید بارش میں ان کو بھی سب کچھ یاد آیا ہو!

وہ ایک غیر ملکی شہری تھے، لیکن اب نہ ان کا کوئی ملک تھا نہ گھر، وہ نہ کچھ دینے آئے تھے نہ لینے، صرف چھوٹا ہوا دیکھنے آئے تھے۔ فلاسفروں کی طرح باتیں کرتے تھے۔ ستر سے زیادہ عمر ہو جانے کے باوجود وہ قطعی ضعیف و لاغر نہیں تھے۔ وہ ہارے ہوئے نہیں پچھتاوے کے مارے ہوئے تھے۔

اب مجھے معلوم ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی بھی شکست خوردہ نہیں ہیں۔ میں اور میرے ساتھی بھی ہارے ہوئے نہیں ہیں۔ ہم ستائے ہوئے ہیں، یہ گولیاں، گرفتاریاں اور زیادتیاں! چاروں طرف سیلن کی طرح بنیادوں میں سمایا ہوا یہ چھل فریب، سیاہ آندھی کی طرح گھر گھر میں گھس گیا یہ اندھیرا! کیسے کیا ہوگا انا؟ مجھے نہیں معلوم تم کہاں ہو۔ کس حال میں ہو، تم کو یاد ہے وہ لمحے، جب میں کمزور پڑ گیا تھا تب تم ہی نے

کہا تھا۔ دل تو ضرور کرتا ہے کہ اپنے پیار کو بھی جی لیا جائے مگر پیار کرتے ہوئے کتنا اوچھا پن لگتا ہے، دل خوش نہیں ہوتا، جسم آزاد نہیں ہوتا، جب جدوجہد کے لئے ہم نے خود کو سونپ دیا ہو، اس کے درمیان یہ باہمی سکھ اٹھا لینا بھی چوری کرنے جیسا ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے ہم کو یہ حق نہیں ہے۔

کیوں انا، ہم سب بھی غیر شہریوں کی طرح ہی مارے جائیں گے...... یہ سب کیا ہے؟ کیا ہم کہیں کے بھی، کسی کے بھی کچھ ہو کر نہیں مر پائیں گے؟

سیناپتی چچا کی کہانی سنو گی تو دہل جاؤ گی۔ یوں کوئی مشابہت نہیں ہے۔ ایشی اور ان کی کہانی میں، اپنے وقت اور ان کے وقت میں، مگر ان کی کہانی میں کچھ ایسا ضرور ہے جو غصے سے بھر دیتا ہے جو کہیں ہمیں ہمارے معصوم ذوق کو آگاہ کرتا ہے کہ وشواس گھات اسی کے ساتھ ہوتا ہے جو وشواس کرتا ہے!

تم کو شاید معلوم نہیں، آزادی سے قبل میرا یہ چھوٹا سا شہر ایک نیم غلام علاقہ تھا، پولیٹکل گورنر کے زیر حکومت۔ لیکن حکومت کو ہمیشہ یہ شبہ رہتا تھا کہ یہ چھوٹا سا علاقہ کہیں کسی دن بغاوت اور آزادی کی مشعل لے کر کھڑا نہ ہو جائے۔ انقلابی گیندالال ڈکشت کی شیواجی سمیتی اس وقت سرگرم تھی۔ یوں پوری انقلابیوں کی سرزمین بن گئی تھی۔ ماتر ویدی، اور شیواجی سمیتی، کے رکن اس وقت وہی سب کچھ کر رہے تھے جو آج ہم اور تم کر رہے ہیں، یا ہمارے ساتھی کر رہے ہیں۔ انگریزوں کو جب ان سازشوں کا پتہ چلا اور سوم دیو انگریز بہادر کا گواہ بن گیا تو رام پرشاد بسمل فرار ہو گئے۔ اور گیندالال ڈکشت کوٹہ کی طرف بھاگ گئے تو تب اس علاقہ پہ بجلی گری۔

اس وقت سیناپتی چچا علاقے کی فوج میں حوالدار تھے، لوجی تو وہ بعد میں ہوئے تھے۔

انگریزوں کی فوج نے قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ لڑائی ہوئی تھی۔ اور راجہ صاحب لڑتے لڑتے بنارس کی طرف فرار ہونے لگے۔ میرے بابا راجہ صاحب کی چھوٹی سی وفادار ٹکڑی میں تھے۔ آخر وہ مارے گئے اور راجہ صاحب قید ہو گئے تھے۔ چھوٹی رانی صاحبہ نے انگریزوں سے فوراً سمجھوتہ کر لیا اور چچا انگریزوں سے مل گئے تھے۔

وہ سیاہ آندھی کے دن تھے انا! قلعہ میں انگریزوں کی خاطر تواضع اور مبارک آمد کے جشن چل رہے تھے۔ علاقے کی پوری فوج کے ہتھیار انگریزوں نے رکھوا لئے تھے۔ چھوٹی رانی کو راج کاج چلانے کا حق دیدیا تھا، اور سو جوانوں کی ایک ٹکڑی قلعہ کی حفاظت اور رانی کے دکھاوے کے لئے چھوڑ دی تھی ____ دراصل سو سپاہیوں کی یہ فوج صرف ایک نمائشی فوج تھی جسے میرے علاقے کی جنتا نے "سلامی فوج" کا نام دیا تھا۔ اس سلامی فوج کے سیناپتی بنے تھے میرے چچا! اور تب ایک دن چچا اپنے انگریزی تمغوں اور بیٹوں کے ساتھ گھر آئے تھے، ان کو زمینداریاں ملی تھیں، قلعے کے قریب والی حویلی ملی تھی، اور چھوٹی رانی کا خاص ڈوبا ہوا بستر ملا تھا۔

وہ دور بہت بھیانک تھا، سیناپتی چچا بغیر تلک کے راجہ بن گئے تھے۔ مگر ان کا گھر آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ آخر وہ گھر بابا کا تھا۔ جو انگریزوں کے خلاف لڑتے لڑتے مارے گئے تھے۔

مجھے یاد ہے انا، گھر میں سیناپتی چچا کا کبھی کسی نے نام تک نہیں لیا۔ ان کے لئے اگر کہیں کچھ تھا، تو نفرت! یہ سب تو ماں نے بتایا، اس رات جب سیناپتی چچا بارش میں بھیگتے ہوئے آئے تھے۔

اماں کے چہرے پر ندامت بھی تھی اور افسوس بھی۔ تیس سال کے عرصے نے انہیں سنجیدہ بنا دیا تھا۔ پھر بھی طنز سے ماں نے یہی سوال کیا تھا: "تمہارے وہ میڈل اور تلواریں کہاں گئیں، جو انگریزوں نے دی تھیں،" سیناپتی چچا نے ایک بار بھی آنکھوں سے اماں کی طرف نہ دیکھا تھا۔ اور سر جھکا کر بیٹھ گئے تھے۔

اماں نے پھر طنز سے کہا تھا "تم کو معلوم ہے سیناپتی، انگریز اب چلے گئے ہیں مگر تمہارا یہاں کوئی نہیں ہے۔ تمہارے لوگ دلی لکھنؤ میں ہیں جو اب راج چلا رہے ہیں۔ تم غائب نہ ہوئے ہوتے تو شاید تم بھی راج کاج میں ہاتھ بٹا سکتے تھے۔ تم چلے کیوں گئے، یہاں کیا ہے؟"

اماں کا ان سے یہ سلوک میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ان کے غائب ہونے کی داستان بھی مجھے معلوم نہیں تھی، مگر بعد میں سب کچھ معلوم ہو گیا تھا۔

"یہ تمہارا سب سے چھوٹا بھتیجہ ہے سیناپتی،" اس گھر کی روایت ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ یہ بھی سر پر کفن باندھے گھوم رہا ہے۔ حکومت بدلنے سے کیا ہوتا ہے......؟" اماں کہہ رہی تھیں اور مجھے لگ رہا تھا کہ اماں میں یہ خودداری اور صحیح علم کہاں سے آ گیا تھا۔ وہ تو کبھی بات ہی نہیں کرتی تھیں۔

"بھابی" سیناپتی چچا نے کہا تھا "سب کچھ کہہ لو، سب سنتا جاؤں گا۔ اگر یہ دل اس طرح مضطرب اور بے سکون نہ ہوا ہوتا تو ماں سرور سے لوٹ کر نہ آیا ہوتا؟ بودھی کیوں ہوتا، اور اب اتنے برسوں بعد دلائی لامہ کے ساتھ بھاگ کر اپنے وطن کیوں آتا۔ ؟ گیانی وہی ہے جو آزاد ہو کر جینا چاہتا ہے۔ بھابی وہ شہری ہوتا ہے سب کا! وہ حکومت کا نہیں ہوتا، سرکار کا بھی نہیں ہوتا وہ صرف اصول کا ہوتا ہے۔"

میں پوری طرح الجھ گیا تھا، سیناپتی چچا کا سلامی فوج کا سپہ سالار ہونا۔ رانی کے ساتھ گمنام شوہر کا رول ادا کرنا پھر ماں سرور رہ جانا اور ماں سرور سے غائب ہو کر تبت میں کھو جانا، بودھی ہونا اور چینیوں کے حملے اور گھیرا بندی کے بعد تبت سے دلائی لامہ کے ساتھ بھاگ کر پھر دیش لوٹنا.......... یہ ایک طویل داستان ہے اماں!...... چھل فریب، تیاگ، شدید محبت، بیراگ اور گیان کی! جو ہر دور میں دہرائی جاتی ہے اور ہم کو فریب دیتی ہے۔

ہم ماں سرور کے ہنس ہیں اماں! جن کو سیناپتی چچا نے فریب دیا تھا۔ فریب دینے کے بعد کوئی بودھی ہو جائے یا سنیاسی..... کیا ہوتا ہے،،؟

یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب انقلابی اپنی جان پر کھیل رہے تھے اور سیناپتی چچا رانی کے محل میں رنگ رلیاں منا رہے تھے انگریز گورنر یا کلکٹر کے آنے پر سو آدمیوں سلامی فوج کو سجا کر کھڑے ہوتے تھے اور سلوٹ دیتے تھے انقلابیوں کو تلاش کر کے مار دیتے تھے اور عوام کو یقین دلاتے تھے کہ انہیں ہر طرح سے خوش حال اور سکھی دکھا جائے گا۔ انگریز بہادر آہستہ آہستہ ہم کو اپنے پیروں پر کھڑا کر کے الگ ہو جائیں گے اور ہم خود مختار ہو جائیں گے۔ حق ان کو ملے گا جو حق دار ہیں۔ انقلابی اس خود مختار ہونے کے عمل میں خلل ڈال رہے ہیں۔

اور میرے علاقے کے معصوم عوام کو فریب دیا جا رہا تھا، اسی طرح جیسے ماں سرور کے ہنسوں کو سیناپتی چچا نے فریب دیا تھا۔

یہ ایک خوفناک واقعہ ہے انّا...... فریب کرنے کے بعد پھر باقی کیا رہ جاتا ہے۔ پھر چاہے کنارہ کر دیا
کچھ اور ..... ہنس تو پھر زندہ نہیں رہتے۔

چھوٹی رانی کو گٹھیا ہو گیا تھا۔ سیناپتی چچا اپنی شدید محبت کا ثبوت دینا چاہتے تھے۔ راج وید نے
بتایا کہ اگر ہنسوں کا گوشت مل جائے تو ان کا مرض جڑ سے جا سکتا ہے۔ گٹھیا اور ہنسوں کا گوشت! کچھ سمجھ میں نہیں
آتا ہے انّا!

اور سیناپتی چچا چھ سپاہیوں کو لے کر مان سرور کے طویل سفر پر نکل گئے تھے۔ کئی مہینوں بعد
وہ جھیل پر پہنچے تھے۔ وردیوں اور بندوقوں سے لیس! مان سرور میں برف کے ٹکڑے ہنسوں کی طرح تیر رہے
تھے اور ہنس برف کے ٹکڑوں کی طرح۔

مگر ان کو مارنا آسان تھا، پکڑنا مشکل۔ سلامی فوج کے سات باوردی فوجی بہت دیر تک مانسرور
کے کنارے پر چکر کاٹتے رہے۔ ہنسوں کو بہلاتے پھسلاتے رہے مگر ہنس جھیل کے درمیان تیرتے رہے۔ سپاہیوں
نے بندوقیں تانیں تو وہ درمیان میں ایک جھنڈ میں سمٹ گئے، اور اپنی نرم نرم گردنیں پھیلا پھیلا کر معصوم آنکھوں
سے سپاہیوں کو خوف سے دیکھتے رہے۔

"گولی چلانا بیکار ہوگا"، سیناپتی چچا نے کہا تھا۔

"کیوں"؟ ایک سپاہی نے پوچھا تھا۔

"وہ جھیل کے بیچ مر جائیں گے، لینے کون جائے گا"؟

"تب"؟

اور مایوس ہو کر ساتوں فوجی لوٹ آئے تھے۔ پڑاؤ پر آرام کرتے ہوئے وہ سوچتے رہے اور دوسرے دن
صبح وہ پھر مان سرور کی جانب گئے تھے۔

ہنس اسی طرح جھیل کے درمیان تیرتے رہے تھے۔

ساتوں وہیں کنارے پر بیٹھ گئے تھے اور کچھ دیر بعد انہوں نے دیکھا تھا کہ اپنے وشواس کو لیے ہوئے
ہنس کنارے کی جانب تیرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ کنارے تک آ کر اپنے پر پھڑپھڑانے اور نرم گردنیں پھیلانے لگے تھے کہ
ساتوں نے ہنسوں کو پکڑ لیا تھا۔ اور ان کی گردنیں مروڑ کے رانی کی گٹھیا کا علاج کرنے کے لیے گوشت حاصل کر لیا تھا۔
اس بار وہ فوجیوں کی وردی میں نہیں بلکہ سادھوؤں کے بھیس میں آئے تھے اور ہنس فریب
کھا گئے تھے۔

اس کے بعد سیناپتی چچا وہیں سے غائب ہو گئے تھے اور تبت میں جا کر بودھ بھی ہو گئے تھے اور تیس سال
بعد غیر ضروری ہو کر لوٹے تھے۔ وہ میرے چچا بھی تھے ...... وہ پچھتاوے کے مارے ہوئے بھی تھے۔ کنارہ کر پاکیزگی کا لبادہ
اوڑھے ہوئے۔ اس سے کیا ہوتا ہے انّا! یہ تو بالکل دوسری کہانی ہے۔ جو کوئی روایتی انسان پرست، حسن پرست،
افسانہ نگار کبھی بھی تم کو سنائے گا۔ وہ نہ میرے بس کی بات ہے اور نہ میرے زمانے کی۔ .. .. ..

کملیشور

تلاش

اس نے بہت آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا۔ وہ اندر سے بند تھا۔ جب تک وہ سوئی تھی تب تک دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ کمرے سے آوازیں بھی آتی رہی تھیں اور بھڑے ہوئے دروازے کی دراز سے روشنی کا ایک آڑا سا گر رہا تھا۔ روشنی مومیا کا فذ سی جھلملاتی رہی تھی...... اور اس دھیمی لکیر میں سگریٹ کا دھواں طرح طرح کے پیٹرن بنا رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ ان عکسوں کو دیکھتی رہی تھی......

اپنا دروازہ کھول کر وہ برآمدے میں نکل آئی۔ اس نے ان کے کمرے کے باہر والے دروازے کو ہلکے سے چھوا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ خاموشی سے وہ زینے میں اتری۔ گلی کا دروازہ بھی بند نہیں تھا۔ اسے کچھ شک ہوا ممی بغیر کچھ کہے اتنا سویرے کہاں نکل گئیں۔ ممی کے پاس کام بھی بہت تھا۔ ماسٹر چند راکئی رجسٹر لے کر آئے تھے۔ دس یا ساڑھے دس بجے تو اس نے دونوں کو کافی پلائی تھی۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے وہ خود سوئی تھی۔ وہ پیالے لے جانے کے انتظار میں کچھ دیر وہیں کمرے میں رکی رہی تھی، تو ممی نے کہا تھا — "تو سو جا سمی۔ ہمیں تو ابھی دو تین گھنٹے لگ جائیں گے......"

زینے سے وہ پھر اوپر برآمدہ میں آگئی۔ اس نے آہستہ سے ان کے کمرے کا دروازہ کھولا۔ نیچے قالین پر رجسٹر بکھرے پڑے تھے۔ لال نیلی پنسلیں پڑی ہوئی تھیں۔ کاربن کا ڈبہ پڑا تھا۔ نیلی اور لال دواتیں و قلم رکھے تھے۔ کافی کے ایک پیالے میں جلی ہوئی تیلیاں، راکھ اور سگریٹوں کے بدرنگ ٹکڑے پڑے تھے۔

ممی شاید بہت تھک گئی تھیں وہ پلنگ پر بے خبر سو رہی تھیں۔ جوڑے کے پن سرہانے رکھے ہوئے تھے۔ داہنی طرف ڈھلکے تکیے پر ایک ہلکا سا گڑھا تھا۔ پلنگ کی سرہانے والی پٹی پر ایک سگریٹ دبا کر بجھائی گئی تھی۔ ٹکڑا نیچے پڑا تھا۔

ان کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ اتنا ہی دھلا دھلایا سا چہرہ تھا۔ جتنا صبح اٹھ کر منہ دھونے کے بعد نکھر آیا کرتا تھا۔ ساتھ ساتھ چلتے بیٹھے وقت وہ اکثر بڑے لگاؤ سے ان کے چہرے کو دیکھا کرتی تھی...... اوس میں دھلے ہوئے کمل سی تازگی ابھر آیا کرتی ہے...... ممی کے چہرے پر! معلوم نہیں ایسا کیا تھا ممی کے چہرے میں کہ وہ ڈبڈبائی سے دیکھتی رہ جاتی تھی۔

وہ چپ چاپ ان کے کمرے میں سے نکل آئی تھی اپنے کمرے میں آ کر ان کے جاگنے کا انتظار کرتی رہی کچھ ہی دیر بعد ان کے کمرے میں کچھ آہٹ ہوئی تھی۔ اور اس کو لگا کہ ممی نے برآمدہ والے دروازہ کی چٹخنی

بہت آہستہ سے بند کی تھی اور اتنے دھیمے سے بیچ والے دروازے کی چٹخنی کھولی تھی کھولنے کے بعد وہ ایک دم اس کے کمرے میں نہیں آئی تھیں۔ کچھ لمحوں تک خاموش وہیں کھڑی رہیں پھر انہوں نے ہلکے سے آواز دی تھی: "سمی جاگ گئی؟" اور وہ کمرہ سے ہوتی ہوئی باتھ روم کی طرف چلی گئی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی کمرہ میں ایک ٹھنڈا سا جھونکا آیا تھا...... شیتل سی خوشبو پھیل گئی تھی...... جیسے وہ بستر سے نہیں غسل خانے سے نہا کر نکلی ہوں۔

جب تک وہ باتھ روم سے آئیں، سمی نے چائے تیار کر لی تھی۔ وہ ہر روز کی طرح ہی چائے پینے کے لئے بیٹھی تھیں۔ ساڑی انہوں نے ضروری شالزں سے کہنیوں تک لپیٹ رکھی تھی، سلوٹیں کچھ زیادہ ہی تھیں۔ ساڑی کے نیچے ان کی بھری بھری سنگ مرمری باہیں جھلملا رہی تھیں۔ آنکھوں میں اتھاہ گہرائیاں تھیں۔ ان کے بیٹھنے میں ہر روز جیسا پھیلاؤ نہ تھا۔ ہلکا سا تناؤ تھا۔

"شاید مجھے دو روز کے لئے باہر جانا پڑے۔ گرانٹ باقی پڑی ہے۔ سال ختم ہونے سے قبل سائنٹفک انسٹرومینٹس خریدنے ہیں۔" ممی نے نہایت آسانی سے کہا تھا۔

"میں یہیں رہوں گی...... آپ ہو آئیے گا۔" سمی نے دوسرا پیالہ بنا کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔

کسی دائی سے کہہ دوں گی وہ یہاں سو جایا کرے گی۔ دو دن کی بات ہے،" انہوں نے کہا، تو سمی نے اتنی ہی آسانی سے منظور کر لیا۔ "جیسا آپ ٹھیک سمجھیں۔ دن میں تو کوئی دقت نہیں ہے۔ آفس سے آتے ہی میں شام کے چھ بج جاتے ہیں۔"

"اس معاملہ میں یہ گھر بہت سیف ہے،" انہوں نے کہا، تو سمی نے جوش سے کہا، "یہ تو صحیح ہے۔ ڈر بالکل نہیں لگتا۔"

ادھر وہ دونوں اپنے کام پر جانے کے لئے تیار ہونے لگی تھیں اپنے کپڑے نکالتے ہوئے وہ دیکھ رہی تھی کہ ممی کچھ پریشان ہیں۔ بار بار وہ بلاؤز کو نکال کر دیکھ رہی تھیں۔ آخر انہوں نے بازو والا بلاؤز نکال لیا تھا۔ ان کے پاس وہ شاید اکلوتا تھا اس کے ساتھ کی کوئی ساڑی کبھی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ سلیولیس ہی پہنتی تھیں جیسے تیسے انہوں نے کنٹراسٹ بنا لیا تھا اس کو کچھ اٹپٹا سا لگا۔ ممی کی کھلی ہوئی باہیں واقعی بڑی خوبصورت اور سڈول لگتی تھیں۔ کبھی کبھی تو اس کو خود ان کی باہوں سے حسد ہوتا تھا۔

پھر وہ ڈریسنگ ٹیبل پر چلی گئیں اور اس نے دیکھا تھا کہ وہ ایک سمت سے بیٹھ کر باہوں کی پچھلی جانب ایک نشان پر بیس کریم لگا رہی تھیں۔ شاید باہر پر نیل تھا اور انہوں نے بازوؤں والا بلاؤز پہن لیا تھا۔

ایک لمحہ کے لئے سمی کو وہ کچھ زیادہ عمر کی نظر آئی تھیں لیکن وہ ٹوکنا نہیں چاہتی تھی۔ تیار ہو کر وہ بس کے آنے کا انتظار کرنے لگی تھیں۔ کالج کی بس میں اسٹاف کے لوگ بھی جایا کرتے تھے۔ وہ بالکنی پر کچھ اس طرح کھڑی انتظار کر رہی تھیں جیسے اسکول کے بچے کرتے ہیں۔

سمی یہ سب دیکھتی رہی۔ وہ جب چھوٹی تھی تب بھی اس کو اپنی ممی بہت خوب صورت لگتی تھیں۔ ان کے سڈول ہاتھ پاؤں، تراشے ہوئے نقش، ان میں ایسی تازگی تھی جو عمر کے ساتھ کھلتی آئی تھی۔ اس کی کسی دوست نے انہیں دیکھ کر ماں نہیں سمجھا۔ زیادہ سے زیادہ بڑی بہن ہی مانا تھا ان کا رکھ رکھاؤ بھی ایسا تھا کہ اپنے بدن کو انہوں نے بگڑنے نہیں دیا تھا اس میں وہی لوچ اور نرمی تھی جو سمی کو اپنے میں لگتی تھی۔ ان کے بدن سے ایسی خوشبو نکلتی تھی جو سب کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔

کملیشور نمبر

مہینہ میں ایک دفعہ ان کا بدن اتنا تیز مہکتا تھا کہ ممی بار بار کسی نہ کسی بہانہ سے ان کے کندھوں پر اپنا سر رکھ دیتی تھی تب جیسے خوشبو کا چشمہ بہنے لگتا تھا۔

دو کمروں کا گھر اس وادی سا مہکنے لگتا تھا جس میں کستوری مرگ (ہرن) آ گیا ہو پھر دو تین دنوں بعد وہ خوشبو دھیرے دھیرے ڈوبنے لگتی تھی۔

........بس آئی اور ممی چلی گئیں۔ ممی انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی، جس میں اسٹاف کے کچھ لوگ تھے اور کالج کی کچھ لڑکیاں تھیں۔

ان کے جانے سے وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ یکایک اس کو لگا تھا جیسے ممی ہی باہر چلی گئی تھی۔ اور وہ ممی کی طرح گھر میں رہ گئی ہو۔ اچانک اس نے عجیب طرح کی ذمہ داری محسوس کی اور ان کے کمرہ میں جا کر اس نے سب سامان قرینے سے لگانا شروع کر دیا تھا۔ رجسٹر اور کتابیں اکٹھا کر کے ایک جانب چھوٹی میز پر رکھ دیئے۔ بستر جھاڑ کر کور کر دیا تھا۔ بستر جھاڑتے وقت ضرور اس کو ایک نامعلوم سی تکلیف ہوئی تھی۔ اور لگا تھا کہ ممی کی چیزیں چھونے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے .... پھر کمرے میں کھڑے کھڑے فریم میں لگی وہ تصویر دیکھتی رہی تھی جس میں پاپا اور ممی کے ساتھ ننھی سی وہ خود بھی بیٹھی ہوئی تھی نہ جانے کیوں اس تصویر کو وہ اٹھا لائی اور اس کو اپنے کمرے میں رکھ کر اس کی جگہ ممی کے کمرہ میں وہ تصویر رکھ آئی تھی جس میں ساگر امڈ رہا تھا اور اونچے آسمان میں آبی پرندے اڑ رہے تھے۔

اس کو وقت کا خیال بھی نہیں رہا تھا۔ ایک ایکا کھول کر اس نے پاپا کی وہ ڈائری نکالی۔ جس میں وہ ہر اہم واقعہ نوٹ کیا کرتے تھے۔ اسی میں رشتہ داروں کے کچھ پتے۔ کچھ حساب اور کچھ تاریخ پیدائش لکھی ہوئی تھیں۔ ممی کی تاریخ پیدائش بھی لکھی تھی اور اس کی بھی .... دیکھا تو یکایک دیکھتی رہ گئی۔ ممی کل انیس برس بڑی ہیں، وہ بیس کی اور انتالیس کی ممی

ممی کی سالگرہ تب سے منائی ہی نہیں گئی .... واقعی ممی کو کتنا سونا لگتا ہوگا آٹھ برس نکل گئے لیکن لگتا ہے کہ پاپا ابھی ابھی اٹھ کر چلے گئے ہوں لیکن حادثہ میں ان کے مرنے کی خبر اب بہت پرانی سی لگتی ہے ایک گزری ہوئی بات کی طرح لوگ بکھر جاتے ہیں لیکن کچھ باتیں ہیں جو بیت جاتی ہیں .... پاپا کی باتیں تو جیسے بیت گئی ہیں۔ پر وہ خود ابھی تک رکے ہوئے تھے۔ لیکن اب کچھ یوں لگتا ہے جیسے پاپا ڈگمگا گئے ہوں اور خاموش گھر سے چلے جانا چاہتے ہوں جیسے وہ اپنی غلطی محسوس کر رہے ہوں یوں چپ چاپ آٹھ برس تک خاموش بیٹھے وہ کر انہوں نے اچھا نہیں کیا۔

وہ آہستہ سے پاپا کو اٹھا کر اپنے کمرہ میں لے آئی بہت دیر وہ چپ چاپ بیٹھی رہی وہ خاموش تھے، انہوں نے کچھ نہیں کہا۔

شام کو ممی پہلے لوٹ آتی ہیں۔ وہ واپس آئی تو انہوں نے چائے بنائی تھی۔ گھر آ کر ممی نے ساڑی تو بدلی تھی لیکن بلاؤز نہیں دل میں آیا تھا کہ پوچھ لے۔ لیکن لگا تھا کہ بلاؤز نہ بدلنے والی بات پوچھنے کا حق صرف پاپا کو ہے پر وہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے

"ممی تم کہیں گھوم آیا کرو تم نے تو اپنے کو ایک دم باندھ دیا ہے۔ اتنا کام کرتی ہو۔" ممی بولی، تو اپنی ہم آواز بہت بوڑھی سی معلوم ہوئی۔

ممی نے اس کو غور سے تاکا تھا واقعی اس کا وہ مطلب نہیں تھا۔ اپنی بات کو قدرتی بنانے کے لئے اس نے اس کا اضافہ کر دیا تھا۔ "تمہارے ساتھ میں بھی نکل چلا کروں گی۔ کبھی کبھی جی بہت اکتا جاتا ہے۔"

ممی کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آگئی تھی۔

"چل آج پکچر دیکھ آئیں۔ وہیں کھا پی لیں گے۔" ممی نے کہا تھا۔

اس نے تجویز منظور کر لی تھی۔ ممی پھر ساڑی کے انتخاب میں الجھ گئیں۔ تو اس نے اپنی ساڑی ان کے سامنے رکھ دی: "یہ پہن لو ممی، بہت اچھی لگے گی۔" ایک لمحہ کی جھجک کے بعد انہوں نے سمی کی ساڑی باندھ لی تھی اور تتلی کی طرح تیار ہو گئی تھیں۔

گھر سے نکلتے وقت سمی نے روشنیاں گل کیں اور تالا لگایا تھا۔ زینہ سے اترتے وقت ممی نے آہستہ سے کہا تھا۔ "شاید بجلی کا بل ابھی تک پڑا ہوا ہے۔"

"میں کل جمع کرا دوں گی۔"

اور پھر دھیرے دھیرے اس نے سب حساب کتاب سنبھال لیا تھا۔ انڈے والے نے اس دفعہ جب اس سے پوچھا تھا، "میم صاحب کریم تو نہیں چاہیئے؟" تو اس کو کچھ اٹپٹا سا معلوم ہوا تھا۔

گھر کے خرچے کی ساری پرچیاں بل اور کیش میمو اس کے کمرہ میں جمع ہو گئے تھے۔ دھوبی کی کتاب اس کی الماری میں آگئی تھی۔ دودھ والے کی پرچی اس کے پرس میں پہنچ گئی تھی اس کی چار ساڑیاں اور ایک بلاؤز ممی کے پہر لے میں چلے گئے تھے۔

وہ ہر صبح ممی کے تیار ہونے کی راہ دیکھتی۔ انہیں جو چپل پہننی ہوتیں پہن لیتی۔ اس کے بعد وہ کوئی سی بھی چپل پہن کر چلی جاتی۔

وہ خود ضد کر کے بھی ممی کو پہناتی تھی۔ اس نے زبردستی ان کی شال اتروا کر کارڈیگن پہنا دیا تھا۔

"یہ کیا تماشا کرتی ہے سمی.......... تو کیا پہنے گی بتا.........؟" ممی نے پیار سے جھڑکتے ہوئے کہا تھا۔

"میرے پاس کوٹ ہے۔" سمی بولی۔

"وہ پرانا.......؟"

"اتنی جلدی کپڑے پرانے نہیں ہوتے.......کل ڈرائی کلین کروا لیا تھا ایک دم نیا نکل آیا ہے۔" وہ بولی تھی۔

"بڑی بوڑھی ہو گئی ہے؟" ممی نے پیار سے کہا تھا۔

...

اور شام کو جب وہ لوٹی تو ممی کے کمرہ میں پھر رجسٹر اور کاپیاں پھیلی تھیں۔ ٹرے میں چائے کے خالی برتن پڑے تھے۔ لال نیلی دواتیں تھیں۔ پنسلیں تھیں اور ایک پلیٹ میں سگریٹ کے ٹکڑے، راکھ اور تیلیاں تھیں۔ ممی بالکونی پر جھکی ہوئی دور کہیں دیکھ رہی تھیں۔ شاید کچھ ایسا جو سڑک کی بھیڑ میں انہیں قطعی الگ نظر آرہا تھا۔

سمی کا آنا انہیں معلوم نہ ہوا، کچھ لمحوں بعد بالکونی میں ہی وہ کچھ سوچتی سی کھڑی ہو گئی تھیں۔

"ممی چائے پی لو۔" اس نے پکارا تو وہ چونک سی گئیں۔

"مجھے پتہ بھی نہیں چلا تو کب آگئی اور چائے بھی بنالی۔ میں کچھ تھک گئی تھی۔ آج کل کالج میں بہت کام بڑھ گیا ہے۔ ایک گھنٹہ بھی فری نہیں ملتا۔ ڈیمانسٹریٹر بھی چھٹی پر ہے۔" تمام ٹوٹی پھوٹی باتیں کہتی ہوئی وہ سمی کے کمرے میں آگئی تھیں۔

اُن کی پیشانی پر لال روشنائی سے ایک گول بندی بنی ہوئی تھی۔ روشنائی کی کناریاں سوکھ کر گوٹے کی لکیر کی مانند جھلملا رہی تھیں، ممی اتنی ہی سندر معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن بندی ہی اسکو کھل کر انہیں دیکھنے سے روک رہی تھی شاید ممی کو کچھ الجھن ہونے لگے یا وہ برداشت نہ کر پائیں۔

"مجھے آج بہت کام کرنا ہے" سمی نے آہستہ سے کہا تھا۔

"کچھ میں کروا دوں۔" ممی نے سہارا دیا تھا۔

"ہمارے یہاں ایک اور ایکسچینج کھل رہا ہے" کوڈ میسیج" کے لئے اس کی کلاسیز شروع ہوئی ہیں۔ اور ان ہی لیسنز کو دہرانا ہے" سمی نے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔

"تو تو اپنا کام کر...... کھانا میں بنا لیتی ہوں۔"

سوپ بنا لو ممی۔ زیادہ بھوک بھی نہیں ہے۔ بہلا ٹوسٹ تل لیں گے بس ہو جائے گا۔"

"اچھا" کہہ کر وہ اُٹھ گئی تھیں۔

"پھر خاموشی طاری ہو گئی تھی۔ دونوں کمرے دو الگ الگ دنیاؤں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اس کے کمرے میں پاپا۔ اب بھی رُکے ہوئے تھے۔ ممی شاید ان سے کچھ بات کرنا چاہتی تھیں۔ شاید انہیں لگ رہا تھا کہ پاپا کی طرف سے اب سمی ہی بات کر سکتی ہے اور سمی کو لگا کہ یہاں سے نکل کر اگر چل دے تو پاپا بھی نہیں رک پائیں گے۔ وہ اس کے ساتھ پیچھے پیچھے چلے آئیں گے۔ خاموشی سے۔

اپنے کمرے میں جا کر ممی نے پرانے کاغذوں اور سامان کو الٹنا پلٹنا شروع کر دیا تھا۔ انہیں میں کچھ پاپا کے پرانے خط نکل آئے تھے۔ کچھ دیر بعد اس نے ممی کو باتھ روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ لوٹ کر وہ آئیں تو منہ دُھلا ہوا تھا۔ بندی مٹی ہوئی تھی۔ چہرہ بہت تازہ اور شگفتہ لگ رہا تھا۔

"سمی ذرا ادھر والی الماری کھسکانا ہے اس کے پیچھے کچھ کاغذ گر گئے ہیں آنا تو ذرا......" ممی نے کہا تو وہ اُٹھ کر گئی تھی۔ الماری کھسکائی تو کاغذوں کا ایک انبار اتار پڑا تھا۔ اور وہ چھڑی بھی جو پاپا نے پہاڑ پر خریدی تھی۔ ایک دفعہ اُن کے پیر میں موچ آ گئی تھی۔ دھول کا ایک بگولہ گرے ہوئے کاغذوں سے اُٹھا تھا۔ اور ممی بے طرح کھانسنے لگی تھیں۔

"تم نے اپنے کمرے میں کیا کیا جمع کر رکھا ہے ممی۔ اتنے سامان کے بیچ دم نہیں گھٹتا؟ کچھ اُدھر زینہ والی الماری میں رکھ دیتی ہوں۔" اس نے کہا تو انہوں نے تردید نہیں کی۔ دونوں نے مل کر بہت سامان الماری میں لگا دیا۔

چھڑی میں اپنے کمرے میں رکھوں گی۔" سمی نے کہا تو بات میں ایک عجیب سی بے تعلقی نظر آئی۔

لیکن وہ آہستہ سے پھر بولی، "کبھی کبھی رات میں بلّی آتی ہے"؟

اور ممی جب سوپ بنانے کے لئے چلی گئیں تو زینہ والی الماری سے وہ پاپا کی فائلیں چپ چاپ اُٹھا لائی اور انہیں پلنگ کے نیچے رکھ دیا تھا۔

پاپا کا وہ بچا کھچا سامان جیسے ہر وقت ادھر اُدھر چلتا رہتا تھا وہ چھڑی اور وہ سامان اپنا ٹھکانا نہیں ڈھونڈ پا رہے تھے۔ تیسرے دن اس نے سارے سامان کو میز کے نیچے والی پٹری پر سنبھال کر رکھ دیا تھا لیکن صفائی کرتے وقت وہ وہاں سے بھی لڑھک پڑا۔ الماری کے اندر وہ بڑی بڑی فائلیں کسی بھی سمت سے سماتی نہیں تھیں الماری بہت تنگ تھی۔ ہار کر اس نے ایک گٹھری باندھ لی اور اس کو پھر پلنگ کے نیچے رکھ لیا تھا۔ پاپا بھی رکے ہوئے تھے۔

. . . . . .

اسی دن ممی نے کہا تھا۔ "میں آج رات کی گاڑی سے جاؤں گی۔ کالج کے لئے سامان خریدنا تھا۔ مارچ ختم ہونے سے قبل پے منٹ کرنا ہوگا .... تیسرے دن آجاؤں گی۔ دائی سے میں نے کہہ دیا ہے۔ وہ رات کو ہوسٹل سے آجائے گی۔ یہی دس ساڑھے دس بجے۔"

"تمہاری گاڑی کس وقت جاتی ہے؟"

"آٹھ بج کر پانچ منٹ پر۔"

"پھر اسی آنے گا نا؟" سمی نے کہتے ہوئے اپنی غلطی بھانپ لی تو اس کو ٹھیک کر لیا۔ "تمہارا سامان ٹھیک کر دوں ......؟"

"دو دن کی تو بات ہے۔ کوئی بہت سا سامان لے جانا ہے۔" ممی نے کہا اور وہ سوٹ کیس خالی کرنے لگیں۔

سمی نے منتخب کر کے اپنی ساڑیاں اور پرس انہیں دے دیا تھا۔ وہ اپنے کمرہ میں کپڑے تبدیل کرنے کے لئے چلی گئیں۔ سمی نے رومالوں کا ایک سیٹ رکھنے کے لئے سوٹ کیس کھولا تو جیب میں چپٹا سا پیکٹ پڑا دیکھ کر اسے بے حد ندامت ہوئی تھی۔ سوٹ کیس بند کر کے اس نے رومال اوپر رکھ دیئے تھے۔

ممی ساڑی تبدیل کر کے آئیں تو ان کے بدن سے خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ لیکن ان کے شانوں پر بکھرے لٹکتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی۔ تب ایک لمحہ کے لئے اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ خوشبو پچھلے دو تین دن سے گھر بھر میں سمائی ہوئی تھی۔

ٹھیک سوا سات بجے نیچے ٹیکسی کا ہارن بجا۔ ممی یکایک گھبرا سی گئیں اور جلدی بازی میں وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر خود ہی سیڑھیاں اُترنے لگیں۔ تبھی ٹیکسی والا سردار اوپر آگیا تھا۔ سمی نے بستر اس کے پیروں لڑھکا دیا تھا، اور ان کے ہاتھ سے سوٹ کیس لینا چاہا تو انہوں نے بڑی آسانی سے کہا تھا "وہ لے جائے گا۔"

جب تک ٹیکسی والا سردار دوبارہ نہیں آیا وہ وہیں سیڑھیوں پر رک کے اس سے باتیں کرتی رہیں "دائی ضرور آجائے گی ادھر کا دروازہ بند رکھنا .... روپے ہیں نا؟ دائی سے کہنا وہ شام کا کھانا بھی پکا دے گی۔"

وہ ذرا تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی تھیں۔ سمی بالکنی پر آگئی۔ ٹیکسی کی کھڑکی سے انہوں نے اوپر دیکھتے ہوئے

آہستہ سے اپنا ہاتھ ہلایا تھا۔ ٹیکسی چل پڑی۔ اُدھر والی کھڑکی سے سگریٹ کا ایک سلگتا ہوا ٹکڑا اسٹرک پر گرا تھا۔ سمی وہیں کھڑی کھڑی اس ٹکڑے کو تاکتی رہی تھی۔

بہت سی پیٹیوں میں سامان آیا تھا۔ ممی رات کو واپس آئی تھیں۔ اس لئے پیٹیاں گھر پر ہی لائی گئی تھیں وہ بہت خوش تھیں۔ "ہمارے کالج میں جو جو انسٹرومینٹس اب آگئے ہیں کسی بھی کالج کی لیب میں نہیں ہیں" اور گندے کپڑے نکال لینے کے لئے جب انہوں نے ہولڈال کھولا تھا تو سب سے پہلے رومال نکال کر سمی کو دیئے تھے: "ایک بھی نہیں کھویا۔ پانچ یہ رہے۔ ایک پرس میں ہے! ٹھیک ہے نا....."

میلے رومالوں میں اٹر اسینٹ مہک رہا تھا۔ ایک ساڑی کے ساتھ اونی موزہ جھانک رہا تھا۔ تو ممی نے وہ ساڑی ہولڈال کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا تھا "پھر نکال لیں گے۔ جب دھوبی آئے گا" اور اس کو لپیٹ کے پلنگ کے نیچے سرکا دیا تھا۔

ان دونوں کے درمیان پانی کا ایک ریلا آ گیا تھا وہ صرف کناروں کی مانند متوازی کھڑی رہ گئی تھیں۔ اور کبھی کبھی ممی اس کو دیکھ کر یوں گھبرا اٹھتی تھیں جیسے پاپا آگئے ہوں اور وہ ممی کو دیکھ کر یوں مضطرب ہوتی تھیں جیسے پاپا چلے گئے ہوں۔ لیکن پاپا کتے کو نہ آتے تھے۔ نہ جاتے تھے...... وہ صرف لٹکے ہوئے تھے

آخر سمی نے دل سخت کر کے ایک دن کہہ ہی دیا تھا۔ "یہاں سے مجھے آفس بہت دور پڑتا ہے۔ اگر دو تین مہینے میں تمہیں کالج کا ٹیچر مل گیا تو آفس اور بھی دور ہو جائے گا۔ اس وقت ورکنگ گرلز ہوسٹل میں جگہ مل سکتی ہے اگر تم کہو تو میں وہاں سیٹ لے لوں۔

ممی یکایک سنجیدہ ہو گئی تھیں انہوں نے غور سے سمی کو دیکھا تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر کہیں پریشانی نہیں تھی آنکھوں میں کوئی دوسرا رنگ نہیں تھا اور لہجہ میں بھی تلخی نہیں تھی۔ سب کچھ بہت آسان تھا۔

"وہاں تمہیں دقت ہو گی۔" ممی کے لہجہ میں پیار تھا۔

"تو گھر بھاگ آؤں گی۔" سمی کے لہجہ میں بھولاپن تھا۔ بات بہت آسان سی رہ گئی تھی اس میں کوئی پیچ و خم نہیں تھا۔

پہلی تاریخ کو سمی ہوسٹل میں پہونچ گئی۔ ممی اس کے ساتھ آئیں اور کمرہ میں سامان آراستہ کر گئی تھیں۔ کچھ چیزیں خرید کر دے گئیں۔ بہت سی ہدایتیں بھی دے گئیں۔ شروع شروع میں کچھ دنوں تو وہ ہر شام کچھ دیر کے لئے آتی رہیں، کبھی سمی جاتی رہی پھر آہستہ آہستہ ٹیلی فون پر ملاقات ہونے لگی اور پھر اس میں بھی وقفہ پڑنے لگا۔

یہ بہت اچھا ہوا تھا کہ پاپا اس کے ساتھ چلے آئے تھے۔ اب اس کو پاپا پر بھی اتنا ترس نہیں آتا تھا وہ ممی کے محتاج نہیں رہ گئے تھے۔ اس نے انہیں آزاد کر لیا تھا۔ لیکن ہوسٹل کی تنہائی اسے کاٹنے کو دوڑتی تھی سنکی لڑکیوں کے درمیان دم گھٹتا تھا۔ لگتا کہ وہ سب بھی پاپا کی طرح ہی کہیں نہ کہیں رکی ہوئی تھیں۔

ایک دن وہ بالکل تنہا تھی تو پاپا کے کاغذ پتر کھول کر بیٹھ گئی۔ ڈائری کھولی تو دیکھتے دیکھتے نظر پڑی۔ ممی کی تاریخ پیدائش پر۔ پاپا نے بڑے پیار سے ممی کے بارے میں کچھ لکھا تھا۔ زندگی بھر سکھ دینے کا عہد کیا تھا گیارہ برس قبل انہوں نے وہ سب لکھا تھا۔ اس کو بڑا سکون ملا تھا۔ پاپا کی طرف سے اس نے انہیں کی

خواہش پوری کر دی تھی۔ اس نے تاریخ دیکھی۔ تین دن بعد ہی ممی چالیس کی ہو رہی تھیں۔

اور وہ ممی کی سالگرہ پر صبح سویرے ہی نرگس کے پھولوں کا گچھا لے کر پہونچی تھی۔ وہاں پہونچکر یکایک وہ کشمکش و پیچ میں پڑ گئی تھی۔ اس وقت آکر اس نے اچھا نہیں کیا۔ شاید ممی کو الجھن ہو۔ اس کا اس طرح آنا کمل جاتا اس کو کل فون کر دینا چاہیئے تھا۔ لیکن لوٹتے بھی نہیں بن رہا تھا۔

اس نے آہستہ سے دروازہ پر دستک دی۔

"آئی۔ ممی کی آواز تھی۔"

انہوں نے دروازہ کھولا تو سمی نے نرگس کے پھول لئے لئے ہی انہیں پیار سے بازوؤں میں کس لیا تھا پھر پھول ہاتھوں میں تھما دیئے تھے۔

ممی نے ایک بار سمی کو دیکھا تھا، پھر پھولوں کو، اور سوچتی ہوئی بولی تھیں "تیرے پاپا بھی یہی پھول لاتے تھے۔"

پھر اپنے کو سنبھالتے ہوئے وہ جلدی جلدی گئیں اور چائے بنا لائی تھیں۔ پیالہ بنا کر انہوں نے سمی کے آگے بڑھا دیا تھا۔ چائے پیتے ہوئے دونوں ہی اپنی اپنی جگہ بہت الگ الگ سی ایک دوسرے کو دیکھ لیتی تھیں۔ آخر ممی نے آہستہ سے پوچھ ہی لیا تھا "سمی وہاں کوئی دقت تو نہیں؟"

"نہیں ممی..... بس، کبھی کبھی بہت سناٹا سا لگتا ہے۔"

"یہاں بھی بہت لگتا ہے۔" ممی نے کہا تھا۔ پھر وہ کچھ ندامت سے دیکھتی رہی تھیں اور اپنے میں الجھتی ہوئی بولی تھیں۔ "گھر میں ناشتہ بھی تو نہیں ہے...... تجھے کیا کراؤں؟"

"انڈے والا ابھی نہیں آیا؟"

"اس کو چھڑا دیا تھا" ممی کی آنکھیں شاید ہلکے سے نم ہو آئی تھیں، وہ ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ پھر اپنے پر ہی ہنستی ہوئی سی اٹھی تھیں۔ کچھ اور سہارا نہ پا کر میز پر رکھے کلینڈر کو دیکھنے لگی تھیں۔ ہنستے ہنستے ہی بولی تھیں۔ "جب سے تو گئی۔ تاریخ ہی نہیں بدلی۔ خیال ہی نہیں رہا۔"

اور سمی چلتے ہوئے بھی کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ اس کو لگ رہا تھا کہ چلنے کے لئے اٹھنے سے قبل وہ زیادہ سے زیادہ پوچھ پائے گی تو یہی کہ ممی کتنا بج گیا ہے۔

لوٹ :- اس کہانی پر فلم "پھر بھی" بن چکی ہے۔

کملیشور

نیلی جھیل

بہت دور سے ہی وہ نیلی جھیل نظر آنے لگتی ہے، سپاٹ میدانوں کے کنارے پر درختوں کے جھرمٹ کے عقب میں ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے دھرتی ایک دم ڈھلوان ہو کر چھپ گئی ہو۔ لیکن بغور دیکھنے پر اونچے اونچے درختوں کے درمیان سے ایک بہت بڑا شیشہ نظر پڑتا ہے۔

یہی وہ جھیل ہے۔

اور اسی جھیل پر آبی پرندوں کے شکار کے لئے آئے ہوئے انگریز کلکٹر نے کہا تھا: "کتنی خوبصورت ہے یہ جھیل! جیسے زمین میں ہیرا جڑا ہو...... جھیل تک پہونچنے کے لئے پکا راستہ ہونا چاہیئے۔"

یہ تیس سال پہلے کی بات ہے۔

اور نیب بستی سے جھیل تک راستہ بنانے کے لئے آئے ہوئے مزدوروں کی ٹولی میں وہ بھی آیا تھا۔ اور انگریز صاحب کی میم کی آنکھوں کو دیکھ کر اس نے کہا تھا کتنی خوبصورت ہے میم! اس کی آنکھیں نیلی جھیل کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔"

ٹھگڑے اور بدصورت مزدوروں نے تب آنکھیں بچا کر گندے اشارے کئے تھے اور گہری اور بھیگی زمین میں کار کے پہیئے پھنستے ہی وہ سب سے پہلے دوڑ کر اس جانب دھکا لگانے کے لئے جٹ گیا تھا جدھر میم بیٹھی تھی...... اس کا دل چاہا کہ بہانے سے ہاتھ بڑھا کر بھول سی میم کو چھو لے لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی اور مزدوروں کو اس کی اس سینہ زوری پر بڑا غصہ آیا تھا اور وہ جی ہی جی میں چاہتے تھے کہ اس کی مرمت ہو جائے۔

رات کو جب درخت تلے اکٹھی کی ہوئی لکڑیوں کے ساجھے چولہے جلے اور اس ویرانے میں مزدوروں کے چہرے آگ کی لو میں شیطانوں کی طرح چمکنے لگے تو بھجوستے نے بغل سے تمباکو کا بٹوا نکالتے ہوئے کہا۔

"اس سالے کو میٹ سے کہہ کر نکلوا دیا جائے۔ میم جان جاتی تو کھال کھینچ لیتی!......... سالا آسک بنتا ہے!"

"بننے دو تمہارا کا لیتا ہے؟" بھوک سے بے چین اور جلدی جلدی باٹیاں سینکتے ہوئے بھوری نے بات کاٹ دینی چاہی۔

"ہم سب کی روزی جائے گی۔" آگ کریدتے ہوئے ایک اور مزدور نے کہا۔

تبھی دوسرے درخت تلے سے بڑی بھدی اور موٹی آواز میں ایک گیت کا بول ابھرا۔

"ہوئے میمیا توری انکھیاں بڑو جلم ڈھایو ری...."

اور پیتل کی تھالی ٹھنک اٹھی، جھیسا شیطان کی طرح ناچ رہا تھا۔ باٹیاں بکاتے ساتھیوں کی ہنسی اور واہ واہ سے شور برپا کیا تھا۔ بھوکے اور تھکے مزدوروں کی آنکھوں میں ایک وحشی چمک آگئی تھی اور ایک لمحہ کے لئے جیسے دن کا درد بھول گئے تھے۔ جھیسا گا گا کر کچھ دیر ناچتا رہا...... درختوں کی پتیاں آگ کی دمک میں تانبے کی طرح معلوم ہو رہی تھیں اور ان کے کالے بپوٹے دار تنے اژدہوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ آسمان سیب کی پیٹھ کی طرح دھندلا اور کالا تھا اور جھیل کی جانب سے عجیب طرح کی سونی سونی آوازیں آ رہی تھیں۔

اسی وقت ایک تیز آواز میں چیختا ہوا ایک سارس گزر گیا۔ اس کے بڑے بڑے پروں سے آہیں سی نکل رہی تھیں۔ سارس کی چیخ کی بازگشت کچھ لمحے تک آتی رہی اور جھیسا کا سوانگ رک گیا۔

" اب سیدھا ہو کر بیٹھ روٹی کھالے،، کالے میٹ کی آواز تھی یہ۔

ناراض ساتھیوں کو میٹ کا اس طرح اپنے پن سے بولنا اچھا نہیں معلوم ہوا۔ کھجنو نے آہستہ سے کہا بدمعاش نے میٹ کو خوش کر لیا ہے۔

" کانا بھی عیبی ہے نا۔ اُسے بھی مجا آتا ہے۔"

گوبھی دار باٹیاں اور اُڑد کی پکی ہوئی دال کی مہک سے سب کی بھوک چمک اٹھی تھی۔ دیر تک باتوں کے درمیان کھانا چلتا رہا۔ آہستہ آہستہ چولھوں کی آگ راکھ میں دبک گئی اور درختوں کا اندھیرا گہرا ہو گیا۔

صبح کام شروع ہوتے ہی سیاحوں کی ایک پارٹی وہاں آکر رک گئی۔ کچھ ہندوستانی صاحب تھے اور ساتھ میں کچھ اچھی اچھی عورتیں۔ عورتوں کے شانوں پر کیمرے لٹک رہے تھے۔ اور صاحبوں کے کندھوں پر ایرگن اور کارتوس کی پیٹیاں۔ کھانے پینے کا سامان کانڈیوں میں تھا۔ اور وہ بوجھ ان سے چل نہیں رہا تھا۔ عورتوں کے خوبصورت چہرے پسینہ سے شرابور تھے۔ اور ساڑیوں کے پلو کمر میں کسے ہوئے تھے۔ دھول سے بچانے کے لئے ساڑیاں ایک طرف سے کچھ اونچی کر لی گئی تھیں۔ انھیں دیکھتے ہی مزدوروں نے رکنے کا مطلب بھانپ لیا تھا اور وہ اپنے کام میں اتنے مشغول ہو گئے تھے کہ جیسے ان لوگوں کی موجودگی کا انہیں احساس ہی نہ ہو۔ لیکن جھیسا ہاتھ روک کر پھینٹا کسنے کے بہانے کنکھیوں سے انہیں تاک رہا تھا۔ وہ اسی انتظار میں معلوم ہو رہا تھا کہ ابھی ان میں سے کوئی عورت سامان اُٹھانے کے لئے کہے گی اور وہ میٹ کی مرضی دیکھ کر یقیناً اس کی مدد کے لئے تیار ہو جائے گا۔

صاحب لوگ بھی کسی مزدور سے آنکھ ملانے کی تاڑ میں تھے۔ مزدور سب آنکھ بچا رہے تھے۔ بس جھیسا آنکھ ملانے کے لئے آتا ولا تھا لیکن صاحبوں سے نہیں جیسے اس نے یہی طے کیا تھا کہ نیلی ساڑی والی عورت اگر کہے گی تو وہ پھاوڑا چھوڑ کر سامان اُٹھا لے گا۔ وہ بار بار اس کو ہی حسرت سے تاک رہا تھا کہ نیلی ساڑی والی عورت نے موقع پا کر بوجھیسی میٹھی آواز میں کہا تھا " کوئی مزدور مل جائے گا یہاں پر؟"

جھیسا کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ مزدور ہی چاہتی ہے تو تلاش کر لے۔ اس نے ٹھسک سے کہا " ہم سرکاری گینگ کے آدمی ہیں" کچھ اس طرح جیسے سرکار سے روپیہ پا کر مزدوری کرنا کچھ اونچی بات ہو۔

" ارے ذرا سی مدد چاہیے...... یہ سامان جھیل تک پہنچانا ہے"۔ اسی نیلی ساڑی والی کی میٹھی آواز تھی۔

جھیسا کا دل بہک اُٹھا۔ بڑے پن اور شان سے بولا۔ " مدد مل سکتی ہے ایسے ولیے

مہیسا کے حقیر سے فخر کی جانب اشارہ کر کے وہ آہستہ سے ہنسی اور مہیسا ایک لمحہ کے لئے ٹکٹکی لگائے اس کے صاف دانتوں کو دیکھتا رہا۔ پھر دوڑ کر میٹ کے پاس پہنچا اور سامان اٹھانے کی اجازت مانگ کر چلا آیا۔

آتے ہی اس نے فخر سے اُن کا سامان اٹھایا اور نیلی ساڑی والی کے شانے میں لٹکے تھرمس کو مانگنے کے بہانے سے بولا۔ "یہ بوتل بھی دیدیجئے۔"

میٹھی آواز والی عورت نے کچھ جواب نہیں دیا لیکن وہ اسے ماننے والا نہیں تھا۔ چلتے چلتے اس نے پھر پوچھا۔ "آپ لوگ شکار کے لئے آئے ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟"

لیکن وہ نیلی ساڑی والی عورت ایک آدمی سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہی تھی۔ مہیسا کو یہ بھلا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک عجیب طرح کی پریشانی اس کو ہو رہی تھی۔ کچھ دور تو اس نے برداشت کیا پھر اس کا جی چاہا کہ سامان پٹک کر اس آدمی سے کہے کہ اٹھائیے اپنا تام جھام! میں مجبور نہیں ہوں! لیکن اس کے ساتھ چل سکنا بھی اس کو کم بھلا نہ لگ رہا تھا...... اس کو بولنے کا پھر موقع ملا۔ غلط راستے پر مڑتے دیکھ کر وہ لپک کر نیلی ساڑی والی کے پاس پہنچا اور ایک دم اس کی ناواقفیت پر جیسے چیخ پڑا! "آپ لوگوں کو راستہ نہیں معلوم۔ ہمارے ساتھ آئیے۔ ادھر سے دلدل پڑے گا۔"

"دلدل! اوہ!" نیلی ساڑی والی کچھ زیادہ چونک گئی۔ اس کا یہ چونکنا مہیسا کو بہت اچھا معلوم ہوا۔ اس کو ناقابل بیان سکھ سا ملا تھا...... کانپور میں مل سے چھٹی پاتے ہی وہ چوراہے والے کونے پر رک کر اس طرح عورتوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

جھرمٹ کے قریب پہونچتے ہی سب لوگ رک گئے۔ سامان وہیں اتروا لیا گیا۔ سبھی عورتیں ہوا کی ٹھنڈک میں اپنے بالوں کی لٹیں اوپر کرتی ہوئی یا ساڑیاں سنبھالتی ہوئی بے فکری سے بیٹھ گئیں۔

ہلکی ہلکی ہوا جھیل کی جانب سے آ رہی تھی اور سایہ میں کچھ خنکی بھی تھی۔ جھیل کے پانی کے اندر بادل تیر رہے تھے اور نرکل آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے...... دور سے جدھر پانی اتھلا تھا۔ ولوہنسوں، مرغابیوں اور پتاری کے جھنڈوں کے چہکنے اور پر پھڑپھڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ولوہنس شاید آبی کیڑے کھا رہے تھے اور مرغابی گھونگھے اور کیکڑے ڈھونڈنے میں مشغول تھے۔ درختوں پر چڑیاں چہک رہی تھیں۔

اچانک نیلی ساڑی والی نے جھیل کے پانی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے حیرت سے کہا۔ "پانی کا سانپ! سانپ تیر رہا ہے۔"

سبھی اشتیاق سے دیکھنے لگے۔ مہیسا کھل کھلا کر ہنس پڑا کیسے سمجھائے۔ ان صاحبوں کو وہ اتنا بھی نہیں جانتے! وہ صرف نیلی ساڑی والی کو ہی بتانا چاہتا تھا۔ ایک دم بولا۔ "پانی کا سانپ نہیں ہے ایک چڑیا ہے وہ!"

"چڑیا؟ بکتے ہے!" نیلی ساڑی والی نے پیار سے کہا۔

"نہ مانیں تو دیکھتی رہیں۔" پھر ادھر ادھر نظر دوڑا کر بولا۔ "وہ اس پانی میں ٹھونٹھ کو دیکھ رہی ہے؟ وہ...... اس پر جو کالی چڑیا بیٹھی ہے اس کا ساتھی ہے یہ سرپ پاکھی

"وہ کالی چڑیا!" وہ نیلی ساڑی والی اس سے بات کر رہی تھی اور وہ دل لگا کر اس کو بتا رہا تھا۔
"ہاں! ہاں! وہی سرپ پنکھی! تیرنے کا بہت شوقین ہوتا ہے۔ بس بھلے سی کالی چونچ نکال کر تیرتا رہتا ہے۔"
"کھاتا کیا ہے؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔
"مچھلی۔" اس کی آنکھوں میں چمک آتی جا رہی تھی۔ بات جاری رکھنے کے لئے اس نے بات جوڑ دی۔ "ابھی جب تھک جائے گا تو کسی ٹھونٹھ پر بیٹھ کر اور دم پھیلا کر سکھائے گا"
"ابھی نکلے گا؟" نیلی ساڑی والی کا منہ کھلا رہ گیا۔
اور اسکے سفید دانتوں کو جھبیا تاکتا رہا، بگلوں کے سفید پروں کی طرح کھلے ہوئے، ہکلا را اس کا جی جانے کو نہیں ہو رہا تھا لیکن سیٹھ نے کہا تھا جلدی لوٹنا اور پھر ساتھیوں کے کلیجے پر سانپ لوٹ رہا ہوگا۔
تبھی ایک صاحب کو بندوق سنبھالتے ہوئے دیکھ کر اس کا جی اچاٹ ہو گیا۔ وہ ساڑی والی بھی اب بندوق کی طرف زیادہ توجہ دے رہی تھی۔
ان کے ساتھ کے ایک صاحب نے اس کو کچھ پیسے دیئے اور ابھی ایک لمحہ قبل کا جھبیا اپنی ساری دلچسپی بھول کر چل پڑا۔ اس کا من بھاری ہو آیا تھا۔ رہ رہ کر اس کی آنکھوں کے سامنے وہ بندوق گھوم رہی تھی اور کانوں پر چڑیوں کا شور سمایا ہوا تھا۔ ہر آواز پہچانتا تھا ان پرندوں کی جو سال بھر اسی جھیل کے کنارے رہتے تھے اور ان کی بھی جو اس موسم میں دور پہاڑوں سے اتر کر کچھ دنوں کے لئے مہمانوں کی طرح آتے تھے۔ ان کی ہر آواز کا مطلب وہ سمجھتا تھا۔ وہ لڑ رہے ہیں یا مسرت سے گا رہے ہیں یا ساتھیوں کو خطرے کا بگل سنا رہے ہیں۔ جھیل کے پانی میں کلیلیں کرتے ہر پرندہ کے پروں کی سرسراہٹ کا احساس ہے اسے چاہے وہ مرغابی ہو۔ سرخاب، جنگلی بطخ، چہا، بگلا، سارس، بختا، ریتی، سرپ پنکھی یا سونا، پتری ان کی سیٹیوں کی مدھر آوازیں اس کے کانوں میں بسی ہوئی ہیں...... اور تب اس کا دل اس بندوق کے خیال سے دھڑکنے لگا۔
ادھر بندوق چلی تھی اور گولی کی ٹوٹتی ہوئی آواز بادلوں میں گونج گئی تھی اور اس کے بعد پرندوں کا مضطرب شور! دل پر چوٹ سی لگی تھی اس کا دل اداس ہو آیا تھا۔ کچھ فاصلے پر ساتھی مزدور کام میں لگے نظر آ رہے تھے ایک لمحہ ٹھٹھک کر اس نے پیچھے دیکھا۔ دلدل خاموش تھا اور اوپر سے اڑ کر بھاگتی ہوئی چڑیوں کی خوفزدہ آواز کو صبر سے پیتا جا رہا تھا...... مڑ کر وہ تیز قدموں سے لوٹ آیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔
رات کو جب درختوں کے نیچے سلگتے چولہے جلے تو جھبیا نہیں تھا۔ گاؤں سے پیاز اور مصالحہ لانے والے چرن سنگھ نے بتایا "وہ بدمعاش گھی کی چپڑی روٹی کھائے گا آج۔"
"کہاں؟ گاؤں میں ہے؟" جھبن نے حیرانی سے پوچھا۔
"وہاں پنڈت بابو کے گھر ہے۔ چبوترے پر بیٹھا چونچلے کر رہا تھا لگائی سے...... اور وہ ناس ماری مسکرا کر باتیں کر رہی تھی چھپلے دار لال کاڑھے اور زیور پہنے ساتھ بیٹھی تھی... مرا سالا!" چرن سنگھ نے چڑ سے تھوکا۔ اور پیاز کی گانٹھ چھیل کر کھانے لگا۔
"اس سے کیسے آشنائی ہو گئی؟" جھبن نے تسلے میں آٹا سنبھالتے ہوئے رازدارانہ آواز میں پوچھا۔

"چاہے تو تو کر لے! کون مشکل ہے لیکن اس نرک میں کون کودے؟..... وحشت تھا جب ہمارے پیچھے پڑ گئی تھی...... عادت کے مطابق چرن سنگھ بات اپنے پاس سے بنا رہا تھا۔

"گڑا نہ ہوتا تو شاید بیاہ رچا لیتی!" ہوری نے جیسے چرن سنگھ کے کہے پر نکھرا وار کیا۔ "بیٹھ جا یہ بھی طرح — ہوں! .... تیرے پیچھے لگ گئی تھی! گاؤں کے کھاٹ کر نے جان دے دی، پر نظر نہیں ملائی اس نے!"

"اصل میں اس کو پیسے کا غرور ہے۔" بھجنو نے روٹی گرم توے پر ڈالتے ہوئے کہا: "دس گاؤں میں ایسی عورت نہیں ملے گی! کا روپیہ ہے اور کا کاٹھی ہے رام کسم!"

چرن سنگھ نے مسکاری بھری اور بھجنو کی بات کا مطلب واضح ہو گیا۔ چولھے کی آنچ میں اس کا کیڑا پن کدو کی طرح لگ رہا تھا۔ ہوری کی آنکھ کے نیچے لٹکا ہوا بڑا سا گوشت کا لوتھڑا سوجا ہوا تھا۔ کیڑے نے کاٹ لیا۔ کہتے ہوئے اس نے بھرے ہاتھ سے آنکھ کے نیچے سہلایا اور بولتا گیا۔ "گھی میوہ کھاتی ہے ٹھسک سے رہتی ہے پنڈتائن۔"

"چالیس کی لگتی ہے۔" بھجنو نے روٹی پلٹی۔

جھیسا کی عمر کتنی ہوگی؟ اس نے دریافت کیا۔

"ہوگا پچیس چھبیس کا" چرن سنگھ بولا۔

"پھرتی..... " کہہ کر ہوری شیطانی سے ہنس پڑا۔

جھیل تک سا ڈیڑھ سڑک تو پوری نہیں بن پائی۔ لیکن جھیسا گنگ سے بچھڑ گیا۔ بیوہ پنڈتائن نے اس سے شادی کر لی تھی۔ لوگوں نے طرح کی باتیں کہیں........ کسی کا کہنا تھا کہ جوان دیکھ کر پنڈتائن نے پھانس لیا اور کوئی کہتا کہ جھیسا روپیہ پیسہ دیکھ کر لڑھک گیا...... جو بھی ہو دونوں طرح سے لوگوں کو یہ اچھا نہیں لگا تھا۔ کیونکہ کسی کو برا دیکھ کر لوگ برداشت نہیں کر پاتے اور اچھا دیکھنا ان سے سہا نہیں جاتا۔ لیکن جھیسا نے کسی کی پروا نہیں کی۔ پنڈتائن پھر سے سہاگن ہوئی تھی اور اتنے دنوں بعد جب اس کی مانگ میں سیندور اور گورے ماتھے پر پھیلے دار بالوں کے درمیان بندیا چمکائی تو اس کا روپ دُگنا ہو گیا۔ دوہرے بدن کی پنڈتائن جب چاندی کی کردھنی باندھ کر چلتی اور پیروں میں جھانجھیں جب چھن چھن بولتیں تو لوگوں کے دل دہل جاتے۔

راستہ میں ساتھ چلتے جھیسا سے پاربتی پنڈتائن کہتی۔ "تمہیں تو ذرا بھی شعور نہیں ہے مرد گھر والی کے آگے آگے چلتا ہے ساتھ نہیں ..... لوگ کیا کہیں گے؟ ...... آگے چلو!"

اور سر پر صافہ باندھے جھیسا کہتا۔ "بڑی شرم آ گئی ہے! شہر میں میم لوگ اسی مافک چلتی ہے بلکن باہر میں ہاتھ پھنسا کے۔" اور بستی کے بازار سے خریدا، چمکدار کیلاسن کا جمپر جھلملاتا دیکھ کر اس کا ماتھا فخر سے اٹھ جاتا۔ پاربتی کتنی خوبصورت ہے۔

اور ایک دن دیویوں کی پوجا کرنے کے لئے جب پاربتی نے دہا ور لگایا تو چپ میں گھلا لال رنگ انگلی میں لیکر اس نے پاربتی کے لبوں پر لگا دیا۔ پاربتی چھڑانے لگی تو اس نے ...... اپنی قسم دے دی اور نمائش سے لائے شیشہ کو اس کے سامنے کر دیا۔ پاربتی نے شرماتے ہوئے اپنے لال ہونٹوں کو دیکھا۔ لیکن اپنی خوبصورتی کی شوخی سے بھر کر بولی۔ "تم تو میم سے شادی کرتے! لالی پاؤڈر والی سے۔" اور وہ جیسے خود کسی میم سے کم نہیں سمجھتی تھی!

تبھی جھیلا نے اس کی گداز کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔ "تم کدھر سے کم ہو!" اور پاربتی کے اُجلے دانتوں کو دیکھ کر اس کا دل کھل گیا...... پاربتی کے دانت ٹھیک ویسے تھے جیسے اس نے کبھی دیکھے تھے۔ ہنس کے پروں کے مانند دُھلے ہوئے پاربتی کے کہنے سے اس نے قلمیں بڑی بڑی رکھوا لی تھیں۔ میلے تماشے پر جانے کے لئے بیلوں کی ایک جوڑی اور چھوٹی سی مجولی بھی خرید لایا تھا۔ بیلوں کو خوب سجا کر رکھتا تھا۔ ان کے گلے میں چالیس گھنگھروؤں کی مالا تھی اور سینگوں پر پیتل مجولی کی چھت کے لئے رنگین جھالر پاربتی نے سی تھی اور تکیاں وہ درزی سے بنوا لایا تھا۔ پہیوں کے اوپر رتھ کی طرح ہاتھ لگوایا تھا اور بیس کی پہیں، سوت کی رنگین ڈوریوں سے کنارے بنوائے تھے۔ ست رنگی مجولی تھی جھیلا کی پر ایک دفعہ دوڑ میں دا ہو لگا آیا تھا اور پاربتی کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ "تم ساتھ نہیں بیٹھو گی تو دوڑ میں نہیں جاؤں گا۔" اور اس نے بہت سمجھایا تھا۔ "ہمارا تماشہ دکھاؤ گے؟..... بہت لڑکپن ہے تم میں...؟"

جھیلا ہنس پڑا تھا۔ "اور تم بوڑھی ہو گئی ہو نا! اسی سے نہیں آتی ہمارے سامنے کہتے؟..... بتیا بچھری سے دانت ہیں۔ بات بڑی بوڑھیوں کی طرح کرو گی!"

اور میلے کی دوڑ کے لئے سہلاتے جاتے جب بنجر زمین سے رتھ گزر رہا تھا تو پاربتی نے چالاکی سے اس کو منا لیا تھا اور من میں ملال لائے بغیر جھیلا میلہ دکھا کر بغیر دوڑ میں حصہ لیے لوٹ آیا تھا۔

بستی میں ہر دم جھیلا اور پاربتی کی بات ہوتی لیکن دونوں کو کسی کی فکر نہیں تھی۔ پاربتی روپے کا لین دین کرتی اور سب کی چوٹی اپنے پاؤں کے نیچے رکھتی۔ بستی میں کون ایسا تھا جس کو وقت بے وقت چار پیسے کی ضرورت نہیں پڑتی اس لئے وہ لوگ بھی جو پیٹھ پیچھے پاربتی اور جھیلا کو کوستے۔ سامنے آ کر چکنی چپڑی باتیں کرتے۔

اس کا احساس دونوں کو تھا۔ لیکن دونوں اتنے فراخ دل تھے کہ کبھی انہوں نے دل نہیں جلایا جھیلا اب بے فکر ہو گیا تھا۔ کام دھام کرنے کی اس کو ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ لیکن اب بھی جب وہ سیاح لوگوں کو جھیل کی جانب جاتے دیکھتا اور ان کے ساتھ کوئی خوبصورت عورت ہوتی تو وہ اپنے کو روک نہ پاتا پیچھے پیچھے چلا ہی جاتا اور چاہتا کہ وہ عورت اس سے بات کرے۔ اور جب وہ عورت اس سے بات نہ کرتی تو وہ چڑیوں میں مشغول ہو جاتا۔ پرسکون جھیل کے کنارے کنارے چکر کاٹتا۔ نرکلوں کے درمیان ساگو دانے کی طرح پھیلے ہوئے مچھلیوں کے انڈے کو دیکھتا اور نیل پنکھی کے جوڑوں کو تاکتا..... بگلے کو محو خواب دیکھ کر وہ سانس روک کر ٹھہر جاتا اور اس کے شکار کرنے کا انتظار کرتا۔ دیر ہو جاتی تو گھر کی یاد آتے ہی لوٹ پڑتا۔

ایک بار وہ دن بھر نہیں آیا۔ آدھی رات کو لوٹا۔ پاربتی نے ناراض ہو کر پوچھا تو بھولے پن سے کہہ دیا "جنگل تک گیا تھا۔"

"جھیل پر گھوم کر جی نہیں بھرتا؟" پاربتی نے طعنہ دیا تو بڑی صفائی سے اس نے بتا دیا "جنگل میں تیتر دیکھنے گیا تھا۔ سسرے دھول میں نہاتے ہیں۔"

"تیتر و یتر کچھ نہیں، تم کہیں اور گئے تھے۔ سچ سچ بتاؤ مجھے!" پاربتی کچھ سخت ہو گئی۔ "تیتر دیکھنا تھا تو بندو کے گھر دیکھ لیتے تھے۔ وہ تیتر لڑاتا ہے۔"

"پنجرے میں بند تیتر کیا دیکھنا!" جھیلا نے کہا۔ "مجھے کچھ پالنا تو ہے نہیں۔ معلوم نہیں لوگ کیسے چڑیوں کو پالتے ہیں۔"

تبھی اوپر آسمان میں کچھ پرندوں کا جھنڈ اڑتا گزر گیا۔ اس کی آنکھیں آسمان میں گڑ گئیں۔ ایک دم بولا۔ یہ چکوروں کا جھنڈ ہے .... دیکھ پاربتی۔ اب رات بھر یہ پچھلی کا شکار کریں گے"

پرندوں کے نرم پیروں کی ریشمی آواز دور چلی گئی تھی۔

"وہ کچھ بھی کریں۔ تم ہماری بات کا جواب دو۔ سچ سچ بتاؤ کہاں گئے تھے؟"

"ایمان سے بتا دیا۔"

لیکن آدھی رات تک تیتر ہی دیکھتے رہے؟" پاربتی کے لہجہ میں شک تھا۔

"ہاں۔ ہاں پاربتی، مانا تو کرو...... دیکھ پیروں میں کتنے کانٹے چبھ گئے ہیں۔ لڑنا ہے تو سویرے لڑ لیں گے" کہہ کر وہ آرام سے ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔

پاربتی نے بات بدل دی "روپیہ بہت پھیل گیا ہے۔ وصول نہیں ہوتا تم ذرا لوگوں کو ڈانٹو ڈپٹو، یہ ہم سے نہیں ہوگا"

اچھا سنو! میرا من ہے کہ کچھ روپیہ لگا کر یہاں چبوترے پر ایک مندر بنوا دیا جائے .... اور بن سکیں تو مسافروں کے لئے دو کوٹھریاں بھی بن جائیں۔ تھکے ماندے لوگوں کو آرام ملے گا اور کچھ روپیہ دھرم کے کاج میں لگ جائے گا۔

"یہ دھرم کرم تمہیں کب سے ستانے لگا؟"

بہت دن کی آرزو ہے دل میں، استری کو بلا کے زمین بھی دکھائی تھی پھر کچھ ہو نہیں پایا...... مر جاؤں تو تیرے نام کا ایک مندر تو رہے گا۔ دس دلوں سے دعا نکلے گی!" پاربتی نے بڑی سچائی سے بات کہی۔

"بے وقت یہ بات کیسے سوجھ گئی تھیں؟" ٹھیسا نے پوچھا

"آج دن بھر یہی بات سوچتی رہی۔"

ٹھیسا نے غور سے دیکھا پاربتی کو چاندنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، واقعی پاربتی بہت بدلی سی لگی۔ آج اس کو لگا کہ سچ مچ پاربتی اس سے بہت بڑی ہے اور اس کے چہرے پر پتیلی لکیروں کا جال بننا شروع ہو رہا ہے باہوں کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا ہے۔ گڑھے پر بھاری پن آ گیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے چھلے دار بال اس کو اچھے لگ رہے تھے ....

"کا دیکھ رہے ہو؟" پاربتی نے آنچل کا پلّو اوپر سرکا لیا۔

ٹھیسا خاموش دیکھتا رہا۔ بولا کچھ نہیں۔ پاربتی نے پھر ٹوکا تو ٹھیسا نے یونہی کہہ دیا۔ "مندر بنانا ضروری ہے؟"

پاربتی سمجھ گئی کہ اس کے دل کی بات یہ نہیں ہے۔ ٹھیسا کی آنکھوں میں ابھی جو سونا پن اس نے دیکھا تھا وہ کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ پاربتی نے کچھ اداس لہجے میں پوچھا "ہم سے شادی کر کے پچھتاتے تو نہیں ہو؟"

"ایں" ٹھیسا اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا۔

"آج سوچ سوچ کے دکھ ہوا ...... اپنے سکھ کے خاطر ہم نے تمہیں خراب کر دیا" پاربتی کی آنکھوں میں نمی تھی "پچھتاوا تو ہوتا ہوگا۔ سچ سچ بتانا"

"کاہے کا پچھتاوا پاربتی؟" ہیسلنے کہا۔ "ہم نے کبھی یہ سب سوچا ہی نہیں - ضرورت ہی نہیں پڑی"

تم نے کبھی کچھ نہیں سوچا؟ شادی کی بابت بھی نہیں سوچا تھا؟"، پاربتی نے جیسے اس کو کریدا۔ "ابھی تم اپنے کو آزاد سمجھتے ہو۔ بال بچے ہوتے تو سمجھتے!" کہتے کہتے اس کی آواز بھاری ہو آئی۔ چاند پر بادل آجانے سے چاندنی مٹیالی ہو گئی تھی اور پاربتی کا چہرہ دھندلا پڑ گیا۔ لالٹین جو کھاٹ میں کنڈی سے لٹکی تھی اور اس کی روشنی میں کھاٹ کی ادوائن سایوں کی سلاخیں بن رہی تھی۔

ہیسیا کو یکایک لگا کہ شادی کے بعد سب گھروں میں بچے ہوتے ہیں۔ اس کے گھر میں ابھی تک کچھ نہیں ہوا اس نے گہری نظروں سے پاربتی کو دیکھا۔ اس وقت کی بات وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ آخر پاربتی کہنا کیا چاہتی ہے؟ گھر میں سناٹا طاری تھا۔ ایسے سونے پن میں اس نے پاربتی کے ساتھ کبھی تنہائی نہیں محسوس کی ہے لیکن آج وہ اتنی الگ سی کیوں معلوم ہو رہی ہے؟ ہمیشہ رات اور دن کو تنہائی میں اس کے دل میں پیار ہی امڈا ہے۔ اور اس نے بھی کبھی ایسی اکھڑی باتیں نہیں کیں۔

"تمہیں ہوا کیا ہے؟"، ہیسا نے شاید آج پہلی بار اتنا سوچ کر پوچھا تھا۔

"معلوم نہیں کا ہوا ہے۔ بستی کا اسپتال بہت چھوٹا ہے۔ یہاں میری دیکھ بھال نہیں ہو پائے گی۔"

"ہسپتال، لیکن ہسپتال کی کا ضرورت ہے؟"، ہیسا اور الجھ رہا تھا۔

تمہاری نا سمجھی کے لئے کا کہوں! یہاں گھر پر میری دیکھ بھال کون کرے گا۔ رشتہ دار بھی نہیں جو ضرورت کے وقت پر آجاتے۔ سنا ہے اسپتال میں تکلیف نہیں ہوتی۔ ایسی دوا دیتے ہیں ڈاکٹر جی۔"

ہیسیا ہنسا۔ اب سمجھ پایا تھا وہ جوش سے بھر کر بولا۔ "ضلع اسپتال میں چلی چلنا۔ پیسہ سب دیکھ بھال کرا دے گا۔ بھگوان کا دیا سب کچھ ہے۔"

لیکن پاربتی اس کی خوشی میں حصہ نہیں بٹا پائی۔ اس کے دل میں جیسے ڈر سمایا ہوا تھا۔ بولی "ایک بات کہوں؟ ہمیں بڑا ڈر لگتا ہے۔ جان چلی جائے گی۔"

بیکار ڈرتی ہو تم!"

"بیکار نہیں۔ جانے من میں کیسی کیسی باتیں آتی ہیں! بڑے ڈراؤنے سپنے دکھائی پڑتے ہیں۔ سانس رکنے لگتی ہے!"، پاربتی نے باہیں چھاتی پر کس لی تھیں۔

"تو ہمارے ساتھ لیٹا کرو۔"، ہیسلنے طریقہ بتا دیا۔

"کچھ تو سوچا کرو!"

"ہم کہیں کہ آج کل تم کتراتی کاہے رہتی ہو...... بیکار کی باتیں دل میں مت لایا کرو پاربتی! آ کھاٹ یہیں کر لیں۔"

پاربتی نے اٹھ کر کھاٹ پکڑاتے ہوئے کہا کہ۔" اب اتنا باہر مت رہا کرو۔ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔

ہیسا نے چارپائی سے چارپائی ملالی اور پٹی کے پاس سرک کر ہاتھ اس کی بانہہ پر رکھ دیا۔"
اب ڈر نہیں لگے گا تمہیں۔"

کچھ دیر بعد پاربتی تو سو گئی لیکن ہیسا کو نیند نہیں آرہی تھی۔ پاربتی کا پیر ذرا ایک ہلا اور سانس تیز ہو آئی۔ جیسے وہ ڈر رہی ہو ہیسا نے اٹھ کر اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ بڑی دیر تک بیٹھا دیکھتا رہا اور جب اس کو نیند آنے لگی تو لوہے کا ایک چاقو لا کر اس نے پاربتی کے سرہانے رکھا اور لیٹ گیا جیسے پاربتی ننھی سی بچی ہو۔

ان دنوں اس کا جی بہت بکھرا بکھرا رہتا۔ پاربتی اس لائق نہیں تھی کہ اس کو تحصیل تک لے جاتا خود بھی بیٹھتا اور اسے بھی دکھاتا وہاں کی خوبصورتی۔ اس لئے وہ آس پاس ہی کچھ دیر کے لئے چلا جاتا۔ حافظ جی بساطی کی دکان پر جا کر بیٹھ جاتا تو پاربتی کے لئے ناخنوں کی لالی کوئی چھوٹا سا شیشہ یا کوئی ایسی چیز خرید لاتا جسے حافظ جی نئی چال بتا دیتے۔ .... ایک دفعہ حافظ جی نے اس کو فوٹو فریم دکھا کر کہا "اس میں میاں بیوی کی تصویر لگتی ہے۔ بڑے گھروں میں لوگ اس کو رکھتے ہیں" فوٹو فریم تو وہ لے آیا لیکن تصویر نہیں تھی۔ تیسرے ہی دن اس نے پاربتی کو تیار کرایا۔ سارے زیورات اس کو پہننے پر مجبور کیا۔ اور خوب تیل لگا کر راما فوٹو گرافر کی دکان پر جا پہنچا۔

ساتھ ساتھ بیٹھتے ہوئے اس نے پاربتی کے سر کا پلو کانوں کے پیچھے کر دیا۔ اور اپنی قمیض کی جیب میں ست رنگا ریشمی رومال رکھ لیا اپنے گلے کا تعویذ بھی کھینچ کر اوپر قمیض پر نکال لیا تاکہ تصویر میں سب کچھ دکھائی پڑے اپنے پیچھے باغ کا پردہ لگوایا جس میں دو چڑیاں چونچ سے چونچ ملائے بیٹھی تھیں۔ پاربتی کو بھی وہ پردہ پسند آیا تھا۔

لیکن تصویر میں وہ سب تو ٹھیک آ گیا افسوس صرف بالوں کا تھا۔

"سسرے نے ہمیں بوڑھا بنا دیا! کا ہے پاربتی؟"

"تمہیں بڑا شوق چرایا تھا۔ ایک روپیہ خراب کر دیا"

لیکن ہیسا کو اس بات کا ملال نہیں تھا اس نے تصویر کو فریم میں لگوا کر برآمدے والی کھڑکی پر سجا دیا "ایسی تصویر مشکل سے کسی کے گھر نکلے گی ...... مختار صاحب کے گھر ہی ہو سکتی ہے!"

اس دن وہ حافظ جی کی دکان پر بیٹھ کر لوٹ رہا تھا۔ پاربتی کے بالوں میں لگانے کے لئے ملائی جیسی کے پتے پودینے میں کو وہ تاک رہا تھا کہ پاربتی نے پوچھا۔

"مندر کے پیلے مستری سے بات ہوئی؟"

"مستری تو نہیں ملے پر ایک نئی بات سننے میں آئی ہے"

"کا؟" پاربتی نے اشتیاق سے جاننا چاہا۔

"اپنی بستی میں بجلی لگ رہی ہے چنگی والے بڑی کوشش میں ہیں لیکن پیسہ پاس نہیں ہے چنگی کے"

"تو بجلی کب لگے گی۔"

"سنا کہ چنگی اپنی کچھ زمینیں بیچنے کی بات سوچ رہی ہے۔ ایسی زمینیں جو اس کے لئے بیکار ہیں" ہیسا نے کہا تو پاربتی ایک دم بولی۔ "چنگی اگر بیچے تو اپنے چبوترے کے قریب والا کولھو خانہ ہم خرید لیں ....."

چبوترے پر مندر ہو جائے گا۔ اور اُدھر مسافروں کے لئے چھوٹی سی دھرم شالہ! تم ذرا سچی بات کا پتہ لگاؤ۔

"بات تو سچی ہے۔ حافظ جی کا روز تحصیل میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔ غلط خبر نہیں لائیں گے۔ وہ ہی بتا رہے تھے۔ مہیسا نے جیسے اس کو یقین دلایا۔" موقع لگا تو خرید لیں گے۔"

"کا پتہ کب تک ہو؟"

جھیل کی جانب سے تبھی چڑیوں کا مضطرب شور سنائی پڑا اور اس کا جی بہک گیا۔ ایک دم بولا۔ شاید شکاری آئے ہیں۔"

اوپر آسمان سے "آنگ آینگ" کرتے چکوروں کے جوڑے گزر رہے تھے۔ مہیسا کا دل ندامت سے بھر آیا۔ بولا نہیں مارنے سے فائدہ! اِتی سندر چڑیا ہے پر مردہ کھاتی ہے۔"

"آج کل نئی نئی چڑیاں بہت دکھائی پڑتی ہیں پہچان میں بھی نہیں آتیں۔" پاربتی نے کہا۔ "نہ جانے کہاں سے اتنی آجاتی ہیں۔"

یہ چڑیاں مہمان ہیں .... کارتک ختم ہوتے ہی آتی ہیں اور پھاگن چیت تک چلی جاتی ہیں۔" مہیسا پاربتی کو بتا رہا تھا۔ "میں نے چڑیوں کے انڈے بھی جمع کئے ہیں تجھے نہیں بتایا۔ نہیں تو گھر سے نکال دیتی۔" اب بھی نکال سکتی ہوں۔" پاربتی کہہ رہی تھی کہ "دکھاؤں" کہتا ہوا مہیسا اٹھ کر گیا اور طرح طرح کے، چتکبرے، ہریالے سے انڈے اکٹھا کر لے آیا۔

"دیکھ پاربتی یہ واک کا انڈا ہے۔ یہ سارس کا اور یہ سونا پتری کا، مہیسا ایک ایک انڈا دکھانے لگا۔ ویسے تو پاربتی نہیں چھوتی لیکن اس نے سونا پتری کا انڈا ہاتھ میں لے ہی لیا۔ گھما کر دیکھتے ہی ہاتھ سے چھوٹ کر وہ گر پڑا اور ٹوٹ گیا تو پاربتی کے منہ سے چیخ نکل گئی "ہائے دیّا!"

"ٹوٹ گیا تو کیا ہوا؟" مہیسا نے سادگی سے کہہ دیا۔

لیکن پاربتی کے چہرے پر کالے بادل سے پھیل گئے تھے اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ بہت مدھم لہجہ میں بولی۔ "بُرا شگن ہو گیا" اور آنچل میں منہ چھپا کے رو پڑی۔

پاربتی جیسے اس دن مستقبل کے اندیشوں کو سوچ کر روئی تھی۔ بالکل ویسے ہی پُرسوز اور لاچاری سے بھری اس کی آواز تھی جب بچہ ہسپتال میں تھی۔

مہیسا کو سب کچھ یاد ہے یہ کیسے ہوتا ہے کہ آدمی ہمیشہ ایک ہی طرح سے روتا ہے..... پاربتی کی وہ آواز اس کو بھولتی نہیں جب اس نے ہسپتال کے پلنگ پر پڑے ہوئے مہیسا کو اپنے پاس بلایا تھا۔ "اتنے دن چڑھ گئے ہیں۔ ڈاکٹرنی کہتی ہے چیرا لگانا پڑے گا۔ پاربتی کا رواں رواں کانپ رہا تھا چیرے کا نام سن کر آنکھوں میں آنسو بھر کر اس نے مہیسا کی بانہہ پکڑ لی تھی اور بڑے ہی درد بھرے لہجے میں کہا تھا——

"اب میرا کوئی ٹھکانا نہیں۔ پتہ نہیں بھگوان کو کیا منظور ہے۔"

"دل چھوٹا کیوں کرتی ہو پاربتی؟ تم جلدی جاگتی گھر پہنچو گی .... میں مندر بناؤں گا اور مسافروں کے لئے دھرم شالہ!"

لیکن پاربتی جیتی جاگتی گھر نہیں پہنچی۔ بچّہ پیٹ میں مر گیا تھا اور آپریشن کے بعد بھی اس کی بگڑتی حالت کو اکیلی ڈاکٹرنی سنبھال نہیں پائی تھی........ سارا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ پاربتی کے جسم میں زہر پھیل گیا تھا۔

اور جھبیا کو پاربتی کا ہلکا نیلاپن لئے جسم ٹھیک ویسا ہی لگا تھا جیسا کہ اس دن چاندنی میں اس نے دیکھا تھا۔ پاربتی کی سانسیں دھیمی پڑتی جا رہی تھیں۔ وہ ایک دم بے فکر لگ رہی تھی اور اس نے جھبیا کو قریب بلا کر کہا تھا۔ " اب مندر ضرور بنوا دینا۔ پاربتی مندر!"

مندر! سوچ کر ہی جھبیا کا کلیجہ پھٹ گیا تھا۔ آخری آس تھی اس کو چیخ کر بولا تھا " ایسا مت کہو پاربتی! بچّہ مر گیا تو کیا ہوا تو تو جیتی جاگتی ہے۔"

" مجھے دیکھ لو اچھی طرح دیکھ لو۔" پاربتی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار بہہ بہہ کر کانوں کے پاس سے ہوتے ہوئے نیچے گر رہی تھی۔...... پھر...... اس سے نہیں دیکھا گیا جیسے پاربتی کی جان کھنچی جا رہی تھی اور پھر پاربتی کے نچلے ہونٹ سوکھ کر چپک سے گئے تھے......

جھبیا کی دنیا ویران ہو گئی تھی اور ویرانہ دیکھ کر آدمی پگلا ہو جاتا ہے۔ بستی کے آدمیوں کا یہی کہنا تھا کہ جھبیا پگلا گیا۔ جو آدمی آدمی کا خیال نہیں کرتا وہ پاگل نہیں تو اور کیا ہے؟ آدمی کے دکھ درد کو جو نہیں سمجھتا اس کو اور کیا کہا جائے؟ جھبیا وہ آزاد اور بے فکر جھبیا ایک دم بدل گیا تھا۔

اس کو صرف پیسے کی فکر تھی۔ پاربتی کا پھیلا ہوا روپیہ وہ بڑی سختی سے وصول کر رہا تھا۔ ...... گھر کی تنہائی اس کو کاٹنے دوڑتی .... اتنا پیار رہا گر اب جیسے اس کی عادت بگڑ چکی تھی

لوگوں نے کہا۔ جھبیا پنڈت! دوسری شادی کر لو۔ اتنا روپیہ کس کام آئے گا؟ آس اولاد بھی تو نہیں!"

جھبیا نے جواب دیدیا۔ " پاربتی کے برابر کوئی میرا خیال کرے تو سوچوں بھی...... نہیں تو بھی نہ سوچوں۔ غلط بات بول گیا .... بیکار کا مخول مت کیا کرو۔ اب بوڑھا ہو چلا۔"

یوں پاربتی سے دس برس چھوٹا تھا لیکن پاربتی کی موت کے بعد وہ اس سے دس برس بڑا لگنے لگا کنپٹیوں پر تین ہی برس میں سفیدی آگئی۔ اور گردن کے نیچے کی کھال جھرّیوں سے بھر گئی۔ سچ مچ۔ آدمی بوڑھا نہیں ہوتا۔ وقت اس کو بوڑھا بنا جاتا ہے۔

سونے گھر میں جھبیا آٹھ آٹھ آنسو روتا اور اس کو پاربتی کی ایک ایک بات یاد آتی......

چیزیں دیکھتا تو آنکھوں میں آنسو بھر آتے......... وہ ٹین کا صندوق جس میں اس کے کپڑے رہتے تھے... ...... اور جس میں پاربتی اپنے رقعے اور روپے رکھتی تھی...... صندوق کے اوپر والی کیل میں کناری میں بندھی چوڑیوں کا لچھا دیکھ کر وہ اس دن رو پڑا تھا...... ایک ایک چوڑی اس نے پہچانی تھی...... کون کس میلے میں پہنائی تھی اس نے ..... اور دوسرا جوڑا پہننے کے وقت اس نے کب کب ان چوڑیوں کو اتارا تھا...... پرنم آنکھوں سے وہ دیکھتا رہا۔...... گھر کا سونا پن اس کو اب کاٹنے دوڑتا...... دیوار پر سگنوتی کی لکیریں بنی دیکھ کر اس کو پھر کچھ یاد آیا......... جب ایک بار وہ دو دن کے لئے کہہ کر چار دن بعد لوٹا تھا شاید تبھی پاربتی نے گیرو سے یہ سگنوتی اٹھائی ہو گی...... وہ جو کچھ کرتی تھی اس میں صرف اسی کے لئے تو سب کچھ تھا۔

اور کون تھا اس کا؟ نہ پاربتی کا تھا اور نہ اب دھنیسا کا کوئی رہ گیا ہے ......!

اور جب وہ جگن نائی کے گھر دھرنا دے کے بیٹھ گیا کہ آج حساب معہ سود اور اصل کے لے کر اٹھے گا تو اس کی عورت نے اندر سے دکھی ہو کر کہا ــ "پنڈت تم تو اتنے ظالم ہو کہ کسی کی عزت نہیں سمجھتے!...... پاربتی چاچی منہ سے چاہے جتنا بگڑ لیں پر آدمی کی مریادا اور عزت کا تو خیال کرتی تھیں......"

یہ سب ہم نہیں جانتے! ہم روپیہ لے کر اٹھیں گے آج! پورا سو روپیہ ہے معہ بیاج کے!" دھنیسا نے کڑکتی آواز میں کہا اور چٹیا کی گانٹھ کھول لی۔

جگن نائی بہت گڑگڑایا۔ "مہاراج گھر کی بنیا دکھدوالو تو بھی اس وخت پچیس سے ایک پائی زیادہ نہیں نکلے گا...... تھوڑی سی مہلت اور مل جائے!"

آخر چار بھلے آدمیوں نے آکر جب بہت سمجھایا تو دھنیسا کسی طرح رام رام کر کے اٹھا۔

کچھ دنوں بعد دھنیسا جو اب دھنیش پانڈے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بستی سے چلا گیا۔ سنا مرزاپور کی طرف پتھر کی تلاش میں گیا ہے۔ قرضداروں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن وہ پندرہ دن کے اندر اندر لوٹ آیا۔ چودھری کے باغ میں بیٹھ کر بتا رہا تھا۔ پاربتی مندر کے لئے سامان دیکھنے گیا تھا۔ مورتی جے پور سے منگواؤں گا۔"

لوگوں کا کہنا تھا کہ سونا چاندی ملا کر کل آٹھ دس ہزار کی پونجی ہے ان کے پاس اور جو دیا دیا ہو سو الگ اس دوران میں اس نے کافی لینا یا روپیہ وصول کر لیا تھا۔

دھیرے دھیرے روپیہ اکٹھا کرنے کا اس کا جوش ختم ہو گیا۔ حافظ جی کی دکان سے گزرتا تو آواز سنکر کہہ دیتا۔ "اب کیا کروں گا بیٹھ کر حافظ میاں؟...... پہننے اوڑھنے والی تو چلی گئی۔"

ایک دن حافظ جی نے اس کو ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا بیٹھے بیٹھے بات چل نکلی ــ سنا مندر بنوانے کی فکر میں ہو۔"

بس یہی کام کرنا ہے حافظ جی، کسی طرح مندر اور ایک چھوٹا سا دھرم شالہ بن جائے تو من کو شانتی ملے۔ پاربتی یہی کہتی کہتی مر گئی۔"

یہ تو دھرم کا کام ہے۔ بنانے کھڑے ہو گے تو دس آدمی ہاتھ بٹائیں گے۔ تم شروع تو کرو۔" حافظ جی نے اس کی اداس نظریں دیکھ کر تسلی دی۔ "کبھی ضرورت پڑے تو دس بیس روپے ہم سے بھی لے لینا۔"

"روپیہ پیسا نہیں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں میرے پاس کھاتی گڑی ہے پر سچ حافظ جی۔ کل چار ہزار ہے اتنے میں تو سمنٹ بھی نہیں آئے گا۔"

گاہک آتا دیکھ کر حافظ جی ادھر الجھ گئے اور دھنیش پانڈے اٹھ کر چل دیئے ایسے ہی

ایک دن وہ بستی کی طرف سے گھر جا رہا تھا کہ جھیل والے راستہ پر کچھ لوگ دکھائی پڑے اس کے پیر ادھر ہی اٹھ گئے کچھ سیاح تھے۔ چار مرد اور دو عورتیں۔ عورتیں سندر تو نہیں تھیں لیکن پھر بھی وہ ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ کافی دنوں بعد آیا تھا وہ ادھر۔

نیلی جھیل خاموش تھی۔ کناروں پر گیلی آنکھوں کی طرح نمی تھی اور گھاس کی ٹہنیاں ہوا کے ساتھ دھیرے دھیرے پانی کو سہلا رہی تھیں۔ نرکل کی لمبی پتیاں پرندوں کی کلغی کی طرح کانپ رہی تھیں

اور پانی میں ڈوبی سیوار کے سوتوں سے مچھلیوں کے بچّے کترا کر نکل رہے تھے۔ وہ کنارے پر آکر بیٹھ گیا۔ پانی کے ننھے ننھے بلبلے نیچے سے اوپر سطح تک آئے تو لگا کسی مچھلی نے موتی اُگل دیئے ہوں۔ آبی پرندوں کی باریک آوازیں جھیل کے پانی میں گونج رہی تھیں اور اوپر درختوں پر پرندوں کے پروں کی سرسراہٹ اور سیٹیوں کی مدھم آوازیں تھیں۔

کالے سر اور سفید چھاتی والی گنگا گُرّہی کی ہلکی سی سیٹی اس کے کانوں میں پڑی۔ آنکھیں اُدھر اٹک گیئں جھیل کے اُوپر وہ چکّر کاٹ رہی تھی۔ کچھ اس طرح جیسے اس کو چکّر میں اڑانے والا معلوم ڈور کسی کے ہاتھوں میں ہو اور وہ گھومتی ہی جا رہی ہو۔ تبھی وہ تیر کی طرح پانی کے اوپر گر پڑی اور ایک چمکدار مچھلی اس کی لمبی چونچ میں تھی۔

اچانک سنگیت کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔ آئے ہوئے سیّاح لوگ کچھ گا بجا رہے تھے نیلی جھیل کے پُرسکون پانی میں اُن کے سر تیرتے ہوئے دور تک جا رہے تھے۔ اس کو بڑا سکون ملا۔

پھر سون ہنسوں کا ایک جھنڈ اپنے راگ کا سُر ملاتا ہوا جھیل کے دوسرے کنارے پر اُتر پڑا اور دو چار ہنس گیہوں اور چنے کے کھیت میں گھس کر بیج کھانے لگے گردن اُٹھا اُٹھا کر وہ یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ اجنبی ہوں اور واقعی وہ اجنبی ہی تھے۔ مہیش پانڈے کا من نجانے کیوں بھر آیا۔ یہ سون ہنس اب آئے ہیں چار پانچ مہینے رہ کر اب پاربتی کی طرح چلے جائیں گے۔ یا پھر کسی شکاری کا شکار ہو جائیں گے۔ جیسے پاربتی ہو گئی ان کے سنہرے پر خون کی لکیروں سے بھر جائیں گے۔ اور ان کے پیروں کو پکڑ کر شکاری یوں لٹکائے جائیں گے جیسے مردہ پاربتی کو اسپتال کے مہتر پلنگ سے اٹھا کر اس ویران برآمدے میں لے آئے تھے......

تبھی فرقسہ بولا۔ سفید کلغی کا تاج پہنے وہ گردن لپکاتا ہوا چلا جا رہا ہے۔ شاید آرام دہ ریتیلی زمین ڈھونڈ رہا ہے فرقرائے...... پھر ایک بھیانک دھڑا کے آواز سے وہ چونک اٹھا۔ بائیں جانب بھیلے دلدل سے مادہ سارس کی تڑپتی سی تیز چیخ آئی اور گونجتی رہی۔ وہ بار بار چیخ رہی تھی اور سارس مضطرب سا کچھ اوپر چکّر کاٹ رہا تھا۔ کبھی وہ دلدل میں اُتر کر چیختا۔ کبھی لمبے لمبے ڈگ بھر کے اِدھر اُدھر لپکتا اور ویسی ہی تیز آواز میں چیخنے لگتا۔ گری ہوئی مادہ کی آواز پھٹ گئی تھی اور اس کی گردن کچلے ہوئے سانپ کی مانند تڑپھڑا رہی تھی۔

سون ہنسوں کا جھنڈ کنارے سے بھاگ کر کھیتوں میں چلا گیا...... ابھی ابھی کچھ لمحہ قبل کا خواب ناک ماحول ایک دم بھیانک ہو اٹھا تھا۔ جھیل کا پانی حدود میں بندھا جیسے کھڑا رہا تھا اور بھیگے کناروں پر مردہ سر ٹکرا رہے تھے۔ درختوں میں ابھی ابھی سنسناہٹ بھر گئی تھی۔ دلدل میں گھائل پڑے سارس کو اٹھا کر لانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کسی کی۔

مہیش پانڈے نے قریب آکر ان سیّاحوں کو دیکھا اس کو اُمید تھی کہ پاربتی کی طرح ایسے لمحوں میں ان عورتوں کی آنکھوں میں پانی ڈبڈبا آیا ہو گا لیکن انہیں تو شکاری کے نشانے کی تعریف بھری تھی۔

وہ گھر لوٹ آیا۔ رات بھر اُس اکیلے گھر میں اس کو بار بار وہی تیز آواز سنائی پڑتی رہی۔ پھر جانے کہاں سے اسپتال میں چیختی پاربتی کی آوازیں آنے لگیں...... صبح ہوتے ہی اس سے نہیں رکا گیا۔ وہ سیدھا جھیل پر پہنچا۔ جھیل کے اوپر کا دھواں دھیرے دھیرے صاف ہو رہا تھا۔ کانڈ کا جوڑا کنارے پر بیٹھا کانی کھا رہا تھا

جھیل کی پُرسکون خوبصورتی نے اس کو اس لمحہ بالکل متاثر نہیں کیا اس کے پیر دلدل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سارس اس کو دکھائی دیا۔ وہ مُردہ پڑی مادہ کے پروں میں چونچ گڑو گڑو کر اس کو جگا رہا تھا شاید۔ اور جب وہ نہیں جاگی تو روتا ہوا جھیل کی جانب چلا آیا۔

وہیں درخت کے نیچے بیٹھ کر وہ دیکھتا رہا۔ مان سروور اور کیلاش کے آئے ہوئے دیو ہنسوں کو جو گندھروں کے دیش سے آئے تھے پروا اس کے لئے...... نازک اور پاکیزہ پرندے........ ہلکی کرنوں میں سونا تپاری کے سنہری پر چمکا اٹھے اس کا دل اداسی سے بھر گیا۔ ان پردیسی پرندوں سے کیا تعلق قائم کرتا! بیٹھے بیٹھے جب وہ اُکتا جاتا تو بستی کی طرف چلا آتا۔

بستی میں پیمائش ہونے لگی تو لوگوں کو یقین ہوا کہ اب بجلی لگ جائے گی۔ مہیش پانڈے نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ "سنا اُتر طرف بہت بجلی پیدا کی جا رہی ہے۔ وہیں سے یہاں آ رہی ہے۔"

تبھی منادی والا اعلان کرتا سنائی پڑا۔ "بحکم چیئرمین صاحب جنگی کی کچھ زمینوں کا نیلام بتاریخ ۴ جنوری سوموار کو جنگی احاطے میں سویرے آٹھ بجے سے ہوگا...... زمینوں کے نقشے دفتر جنگی میں خریداروں کے لئے لگے ہیں۔ ہر خاص و عام کو خبر دی جاتی ہے کہ........" اور منادی والے طبلہ پر بانس کی کھپچیوں سے چوٹ کی اور آگے بڑھ گیا۔

چار جنوری کو ابھی بیس دن تھے۔ مہیش پانڈے کے دماغ میں چبوترے کے قریبی زمین گھومنے لگی جنگی کو بجلی کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور اس کو زمین کی دھرم شالہ کے لئے۔

مندر اور دھرم شالہ کی بات لے کر وہ سبھی کے پاس پہنچا۔ "دھرم کا کام ہے کچھ مدد آپ لوگ کریں دھرم شالہ پنچایتی کر دی جائے گی۔ آپ لوگ بھی مدد کریں تو یہ کام ہو سکتا ہے۔"

ان بیس دنوں کے درمیان وہ گھر گھر گھوما۔ مختاروں کے پاس گیا۔ حلوائیوں اور وکیلوں کے پاس گیا۔ کپڑے کے آڑھتیوں سے لے کر انگریزی ڈاکٹروں تک پہنچا اور سب کا تعاون حاصل کرتا رہا۔

سب کی آنکھوں میں مہیش پانڈے کا رتبہ اور احترام اور بڑھ گیا تھا۔ اب وہ سر پر گروا صافہ باندھنے لگا تھا اور ہاتھ میں لاٹھی لے کر چلتا تھا۔ جسم کچھ کمزور ہو رہا تھا۔

لیکن اس ڈھلتے جسم کے ساتھ بھی وہ دن بھر گھومتا اور اپنے صافے میں کسی چڑیا کا گرا ہوا خوبصورت سا پر کلغی کی مانند لگا لیتا۔ جنگی کے دفتر میں جا کر وہ نقشے بھی دیکھ آیا تھا۔ نیلام کا دن قریب آ رہا تھا اور جوں جوں وہ دن قریب آ رہا تھا مہیش پانڈے کی اداسی اور بھی بڑھتی جاتی۔

جھیل پر شکار کھیلنے کے لئے آدمیوں کی بہت سی ٹولیاں اس دوران میں آئیں اس نے اپنے گھر پر بیٹھے یا بستی میں گھومتے ہوئے اس نے جب جب چیخیں سنیں اور صاحب شکاریوں کو نرم پروالی چڑیوں کو لٹکائے لے جاتے دیکھا۔ تب تب اس کو پاربتی کی یاد آئی بے طرح۔ اس کی حالت بھی تو اس سارس کے جوڑے کی طرح ہی تھی ....

گھر میں لوٹتا تو اڑتے پرندوں کے نرم و نازک پروں کی سرسراہٹ اس کو محسوس ہوتی جیسے پاربتی کیلاش کی دھوتی پہنے نامعلوم طور پر گزر گئی ہو........ پہاڑوں سے آئے مہمان پرندوں کے سفید اور

سیل کی روئی سے سجیلے پر اور پاربتی کے سفید دانت !

صبح اٹھا تو جی نہیں لگا اور وہ سکون پانے کے لئے جھیل کی جانب چلا ۔

جھیل پر پہونچکر اپنی لاٹھی سے وہ کائی کو بکھیرتا رہا ۔ سیوار کے سوتوں کو الجھا کر اس نے نکالا ۔ ننھے ننھے بیج چن کر منہ میں ڈال لئے اور اٹھ کر ادھر چلا گیا جس جانب جل منجری کھلی ہوئی تھی ۔ جل منجری کے پاس سے ہی دلدل شروع ہو جاتا تھا ۔ ناری کی بیل پانی میں تاروں کی طرح بچھی ہوئی تھی اور کانٹوں کے قریب ننھے ننھے گھونگھے چپکے ہوئے تھے ۔ سوت سی سفید ننھی جڑیں مچھلی کے اجلے پروں کی طرح دھیرے دھیرے کانپ رہی تھیں ۔ دلدل میں گھس کر اس نے منجری کے پھول توڑے اور رنگوا بنا کر لوٹنے لگا ۔

سونا پتاری کا جھنڈ رات بھر چارہ کھا کر اڑنے ہی والا تھا کہ ایک گولی اس پار سے چھوٹی اور اڑتے سونا پتاری کے جھنڈ میں سے ایک چڑیا بلبلا کر چھپ سے جھیل کے بیچوں بیچ گر پڑی اس کے سونے سے پر پانی پر بکھر گئے اور نیلی جھیل کے خاموش پانی پر ایک ہلچل ہو گئی ۔ ایک لمحہ بعد ہی لال خون کی ایک پتلی سی لکیر پانی پر کھنچی اور سونا پتاری اس پار جانے کی کوشش کرنے لگی ۔ اس کے نرم پر پھڑپھڑا رہے تھے اور پانی پر خون کی لکیر اس کا تعاقب کر رہی تھی ۔

جھرمٹ سے شکاری نکلے ۔ انہوں نے دیکھا لیکن پرندہ تیرتا ہوا اس کنارے نکل کر کسی جھاڑی میں بک کر خاموش ہو گیا شکاریوں نے بہت ڈھونڈا لیکن پرندہ نہیں ملا ۔ جھیل پر مٹتی ہوئی لکیر کے درمیان ایک آدھ پر پڑا تھا ۔

اس کا جی اچاٹ ہو گیا ۔ جل منجری کے پھولوں کو وہیں پھینک کر لوٹ آیا ۔

پاربتی کی یاد اس کو پھر آئی اور نیلام والے دن اس نے تین ہزار کی بولی لگا کر پھوترے کی قریبی زمین نہیں ، دلدلی نیلی جھیل خرید لی ۔ لوگوں کی آنکھیں پھٹ گئیں ۔ اس کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ؟

لیکن اس نے کسی کو کچھ بھی جواب نہیں دیا ۔ اور دل بھی لگتا کہ اب تو وہ پاربتی کو بھی جواب نہیں دے سکتا ۔ اس کے پاس جواب ہے ہی کیا ؟

پھاگن آتے آتے مہمان پرندے اڑ گئے ۔ سون ہنس چلے گئے ، سفید سرخاب اپنے پرانے گھروں میں لوٹ گئے ، موبر ، سند ، سارس اور سرپ پنچھی کبھی چلے گئے .... جھیل بہت ویران ہو گئی تھی ۔ لیکن مہیش پانڈے کو یقین تھا کہ یہ پھر ہمیشہ کی طرح اپنے جھنڈوں کے ساتھ کارتک اگہن تک واپس آئیں گے ۔

مہیش پانڈے لکھنا دکھنا تو جانتا نہیں تھا ۔ بس جھیل والے راستہ کے پہلے درخت پر اس نے ایک تختی لٹکا دی تھی ۔ جس پر اس نے لکھا تھا ۔ " یہاں شکار کرنا منع ہے " اور نیچے کا جملہ تھا ۔ " دستخط نیلی جھیل کا مالک ۔ مہیش پانڈے ۔ "

کملیشور

دور دور تک پھیلا ہوا سمندر، سفید لکیر کی طرح پانی کی سطح کا چھور، اور اس کے بعد یکدم اوپر اٹھتا ہوا آسمان۔ میلوں دور جب سطح کے کنارے پر کسی کشتی کا بادبان پرچم کی طرح اُبھرتا تھا تو میں محتاط ہو جاتا تھا۔ شاید انہیں کی کشتی ہو، مگر یہ وقت ان کے آنے کا نہیں ہوتا۔ سمندر میں بارہ میل بعد انٹرنیشنل سرحد آب شروع ہو جاتی ہے۔ اسمگلر بیوپاری اسی حصے کے پار رہتے ہیں۔ پھر وقت لے دقت وہ آتے ہیں۔ روز اطلاعات آتی ہیں کہ کروڑوں روپیوں کا سونا اور سامان بمبئی کے ساحلوں پر اسمگلنگ کے ذریعہ اتر رہا ہے۔ اور وہ لوگ بحرِ عرب سے بادبانی کشتیوں یا موٹر بوٹوں میں آتے ہیں ...... کب اور کہاں آتے ہیں، وہ کیسے ہوتے ہیں، یہ دیکھنے کے لئے میرا دل بے چین تھا۔

اس خواہش کے تحت میں ویران کناروں پر جاتا تھا۔ کافی رات گئے تک ان کی راہ دیکھتا تھا کہ شاید کہیں وہ دلیر ملاح دکھائی پڑ جائیں مگر وہ کبھی نظر نہیں آئے۔ وہ کئی بار آئے اور ساحلوں پر لاکھوں کا مال اتار کر چلے گئے، لیکن مجھے فریب ہی دیتے رہے۔

کبھی کبھی آسمان میں چاند ہوتا تھا، میں کنارے پر کھڑا کھڑا دیکھا کرتا تھا۔ حدِ نگاہ تک پھیلا ہوا سمندر ہر وقت میری ہی طرح مضطرب رہ کر بپھرتا ہوا۔ پھر مطمئن ہو کر لوٹتا ہوا۔ جب جب سمندر تھا اور میں تھا، تب تب مجھے کبھی ڈر نہیں لگا۔ آسمان میں چاند ہوتا تو اور بھی اچھا معلوم ہوتا تھا۔ تب جہاں میں کھڑا ہوتا تھا وہاں سے کچھ ہی دور سمندر پر ایک چمکتی ہوئی سڑک شروع ہوتی تھی اور انتہائی دور تک جاتی تھی۔ اس سڑک کو میں کبھی پکڑ نہیں پایا۔ کچھ دور پانی میں جاتا تو وہ جھلکی سڑک پھر کچھ دور سے شروع ہو جاتی۔ وہ دوری بہت ذرا سی تھی مگر وہ سرکتی جاتی تھی۔

اپنے اس بچپنے پر مجھے ترس آتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ سمندر ہے اور چاندنی کی یہ جھلملاتی سڑک نہ کہیں شروع ہوتی ہے، نہ کہیں ختم ہوتی ہے۔ مگر دل جب اداس ہوتا ہے اور شہر کی سڑکیں کاٹتی ہیں تب ایسی ہی کسی پانی کی سڑک پر قدم بڑھانے کا جنون سوار ہو جاتا ہے۔

یہ اداسی اور بدحواسی بھی اب بہت بے کار سی معلوم ہونے لگی ہے۔ راحت ملتی ہی نہیں۔ میں کس طرح کی راحت چاہتا ہوں ...... یہ بتانا بھی کافی مشکل ہو جاتا ہے۔ کبھی مالی تکلیف زیادہ ہوتی ہے، کبھی کسی کے ساتھ کے لئے جی گھبراتا ہے۔ کبھی کسی دوست کے لئے دل پریشان ہوتا ہے، کبھی ماں کا خیال آتا ہے، عزت، آرام اور دلی اطمینان

کے لئے کبھی کبھی سٹپٹا جاتا ہوں۔ کبھی میں پینٹر بن جانا چاہتا ہوں..... کبھی ہار کے بڈھیلگر بن جانے کے تصوّر میں لطف ملتی ہے۔ پناہ کی یہ کوشش کہیں لے نہیں جاتی۔ ساری دنیا کی طرح میں بھی کیوں سمجھوتہ نہیں کر لیتا اور سکھ نہیں پا لیتا!

بس چاروں طرف دھواں سا ہوتا ہے۔ بھیڑ اور شور و غل ہوتا ہے۔ کچھ خواہشیں بے شکل ہوتی ہیں، تمنائیں بے لفظ۔ کوئی مسلسل تمنا نہیں ہوتی وہ اندر ہی اندر ٹوٹتی اور پگھلتی رہتی ہے۔

ایسے میں میں انہیں یاد کرتا ہوں جن سے کچھ بات کی جا سکتی ہے۔ کوئی پاس تو نہیں ہوتا مگر میں تنہائی ان سے بہ آسانی باتیں کر لیتا ہوں کیوں کہ ان کے جواب مجھے تقریباً معلوم ہیں۔ ماں کو ہی لو اگر اس سے کہوں کہ میں بہت پریشان ہوں اور بمبئی میں بھی مجھے جینے کی راہ نہیں مل رہی ہے تو وہ قریب قریب یہی کہے گی "تب یہیں رہو...... وہاں کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو۔" اگر میں کہوں کہ میں بہت آرام سے ہوں اور مجھے بمبئی میں آگے کی راہ دکھائی دے رہی ہے تو وہ کہے گی "جیسا تم ٹھیک سمجھو۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ تمہاری خوشی میں میری خوشی ہے۔"

تنہائی میں میں یہ باتیں آسانی سے کر لیتا ہوں..... ایسے میں میرا جھوٹ یا اندرونی پریشانی پکڑی نہیں جاتی۔ میں خود کو کافی محفوظ محسوس کرتا ہوں میں اپنی تاریکی جمع کر لیتا ہوں اور اپنی تاریکی ہی میں مجھے وہ جھلملاتی ہوئی پانی کی سڑک نظر آتی ہے جس پر لالٹین لٹکا جلانے کو دل چاہتا ہے مگر ایسا ہوتا نہیں۔

تب یہ عمارتیں...... اچانک اور اوپر اٹھ جاتی ہیں، آسمان میں بنے گھروں کی روشنی مجھے دہشت زدہ کرتی ہے۔ اس کی جھلملاتی دھندھلی روشنی، ریشمی بدن، چھوٹے چھوٹے پتھروں پر بہتے جھرنے کے پانی کی طرح گونجتی مست کھل کھلاہٹ، بے پروائی کا عالم اور ان کے چہروں کا اطمینان مجھے چوکنے لگتا ہے۔ ان کے دکھ کہاں ہیں؟

اب نہ میں ماں سے اپنے دکھ کہتا ہوں، نہ ماں مجھے اپنے دکھ بتاتی ہے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے دکھ سے کتراتے ہیں وہ اپنے شہر میں سب کو یہی بتاتی ہے کہ میں بڑے آرام سے ہوں اور اگر مجھے بتانے کی ضرورت پڑ بھی گئی تو کہتا ہوں۔ "ماں ہے۔ وہ بڑے آرام سے گذر کر لیتی ہے۔" آہستہ آہستہ ہم اس کربناک سمجھوتے پر پہنچ گئے ہیں بے بسی میں ہمارا باہمی سمجھوتہ ہمیں راحت دیتا ہے۔

ماں کے خط اب بھی آتے ہیں۔ ان کی تحریر پھر تبدیل ہو گئی تھی اس لئے نہیں کہ ماں بوڑھی ہو گئی تھی اس لئے کہ جگن ناتھ پوسٹ مین مر گیا تھا۔ وہی ماں کے خط قلم بند کرتا تھا جب بھی وہ دو یا تین یا چار سال بعد کبھی ماں کے خط کی تحریر بدلتی تھی، میں سمجھ جاتا تھا کہ بستی اور محلے کا کوئی اور چل بسا۔ اکثر یہی ہوتا تھا۔ میری ماں ایسی عورت ہے جو اپنے تعلقات اور اعتقاد جلد جلد نہیں بدلتی۔ ایک ہی شخص اس کے خط تب تک لکھا کرتا تھا جب تک کہ مر نہیں جاتا تھا یا بستی چھوڑ کر کہیں چلا نہیں جاتا تھا۔

پانچ برس بعد جب ایک بار خط کی تحریر بدلی تھی تو مجھے دھچکا سا لگا تھا۔ تب وہ اپنے خط ماسٹر جی سے لکھوایا کرتی تھیں۔ ماسٹر جی کے تحریر کردہ خطوں میں دوہری خوشی ہوتی تھی۔ اس میں جب سب کچھ لکھوا چکتا تھا تو بچی ہوئی جگہ میں ماں کی طرف سے ہی ایک اور جملہ لکھوایا ہوا (یا لکھا ہوا) ہوتا تھا۔ "اماں جی کہہ رہی ہیں کہ اب تم لوٹ آؤ۔ جیسے بھی ہو چلے آؤ۔" اس لائن کی تحریر مختلف ہوتی تھی۔ تب یہ جملہ دوہرا مطلب دینے لگتا تھا۔ یہ لائن پونیتا لکھتی تھی۔ ماسٹر جی کی لڑکی پونیتا کے لئے کوئی خاص لگاؤ میرے دل میں اس وقت نہیں تھا۔ جب میں شہر چھوڑ کر آیا تھا۔ کوئی خاص بات تھی بھی نہیں۔ مگر آہستہ آہستہ ماں کے خطوط میں ایک لائن الگ لکھے

اس نے عجیب سی جگہ میرے آس پاس بنا لی تھی۔ شروع شروع میں اس کا یہ لکھنا مجھے ذرا رومانٹک معلوم ہونے لگا تھا جس کا میری سچائیوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگر یہ مان لوں کہ کوئی لڑکی مجھے چاہتی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے؟ یہ چاہنا میری زندگی میں کہاں فٹ بیٹھتا ہے؟ کہاں ہے وہ وقت کہ میں کسی کو چاہ سکوں؟ دادر یا وی۔ٹی پلیٹ فارم کی بھیڑ میں یا بسوں میں چڑھتے اُترتے یا پیدل دوڑتے بھاگتے...... کہاں میں اس کو چاہ سکوں گا؟ اُترتی شام کو کراس میدان کے اندھیرے میں بھی گھاس پر لے کر بیٹھ جاؤں، تو زیادہ سے زیادہ لپٹا لوں گا، چوم لوں گا...... لیکن رات ہوتے اس کو کہاں لے جاؤں گا؟ کہاں سلاؤں گا؟ یہ سب وقت کی بات ہے۔

تمام لوگ ایک دوسرے کو چاہتے آتے ہیں وہ کراس میدان کے اندھیرے میں گھاس پر یا برج کینڈی کی چٹانوں کی اوٹ میں یا مہالکشمی کے پیچھے سمندر کی بوچھار میں بھیگتے پتھروں کی گود میں یا کملا گارڈینس کے اندھیرے میں بڑی بنچوں پر بیٹھ کر کچھ تھوڑا بہت پیار کر لیتے ہیں۔ پھر لڑکی اپنے گھر چلی جاتی ہے۔ آدمی اپنے گھر، مگر کس کے پاس ہے گھر؟

میں نے ایک دوکان کا پتہ دے رکھا تھا۔ ماں کے خط وہیں آتے تھے۔ ہر بار مجھے واپس بلاتی تھی۔ اس کی یہ عادت سی پڑ گئی تھی۔

اس روز سمندر پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ مانسون چاروں طرف تھا۔ مالابار ہل پہاڑی اس دھند میں کھو گئی تھی۔ صرف میرے چاروں طرف پچاس پچاس گز تک صاف صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بعد کچھ نہیں۔ ایک سنٹ بعد سمندر کا بھی ایک چھوٹا سا ٹکڑا جدید رہ گیا تھا۔ باقی اوجھل ہو گیا تھا۔ ایک نہایت چھوٹی سی دھند تھی اور سمندر کے ٹکڑے پر دو آبی پرندے —— سفید ماحول میں زیادہ سفید پنکھڑی والے وہ آبی پنچھی کی طرح چمک رہے تھے۔

تب میں نے حساب لگایا تھا۔ یہ شہر مجھے اور کتنے دنوں کے لئے پناہ دے سکتا ہے؟ تین دن پورے اور ایک صبح —— اس سے زیادہ نہیں!

جب بھی ایسا موقع آتا تھا۔ میں دوڑ بھاگ شروع کر دیتا تھا۔ لوگوں سے ملتا تھا۔ بڑی بڑی اور چھوٹی معمولی کمپنیوں کے چکر کاٹتا تھا۔ لوگ مجھے کافی تپاک سے لیتے تھے۔ انہوں نے کبھی میری بے عزتی نہیں کی۔ ہمیشہ میری دقتوں اور ضروریات کو بڑی توجہ اور ہمدردی سے سنا اور جواب میں اپنی دقتیں بیان کیں۔ ایسے میں ہمیشہ ان کی دقتیں زیادہ بڑی معلوم ہوتی تھیں اور میں لمحہ بھر کے لئے بے حس رہ جاتا تھا...... لگتا تھا ان کی دقتوں کے سامنے میرا دس دن کا فاقہ کر لینا بھی مناسب اور معمولی ہے۔ وہ بڑی بڑی باتوں کو سلجھا رہے ہوتے تھے۔ تب میں خود کو بہت حقیر بات کے لئے گھبرایا پاتا تھا۔ اور دل ہی دل میں مرجھا جاتا تھا۔ تب اپنے میں اُوب اوب کر معلوم نہیں کیوں ایسا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے نام تک بھول جاتا تھا کبھی کبھی تو چہرے بھی۔ شاید میرے ناکام ہوتے جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ بیکار رہنے کی وجہ سے میں زیادہ تر اچھے اور معزز آدمیوں ہی سے ملنے کی کوشش میں رہتا تھا۔

جب ان کی دقتیں مجھے چھوٹا اور خود غرض ثابت کر دیتی تھیں تو نامعلوم ان کے چہرے کیوں میری یاد سے اتر جاتے تھے۔ پھر کبھی وہ ملتے تو میں انہیں پہچاننے اور یاد کرنے کی ناکام کوشش کرتا۔ لیکن کچھ ہوتا نہیں تھا۔ ان میں سے کچھ بھلے لوگ مجھے پہچان لیتے تھے اور مسکرا کے میرا حال بھی پوچھ لیتے تھے۔ میں ان سے باتیں بھی کر لیتا تھا مگر یہ یاد نہیں کر پاتا تھا کہ وہ آدمی کون تھا، یا تھے۔

سچ پوچھئے تو میرے پاس کچھ یادوں اور ایک لہولہان زندگی کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ماں ہے اور ماں کے اڑوسی پڑوسی ...... لوٹیتا ہے اور وہ لوگ ہیں جو ماں کے لئے خط لکھ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑی ناکام۔ محدود اور بیکار سی زندگی ہے۔ یوں سب چلتا ہے۔ چلتا جاتا ہے۔ مگر یہ کیوں اور کس لئے ہے اس کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔

میں کہاں سے کام شروع کروں یا جدوجہد شروع کروں؟ کہاں سے؟ جہاں بتایئے جاکر کام کرنے لگوں۔ سڑک کھودنے لگوں یا اسپتال میں جاکر مریضوں کی خون آلود پٹیاں صاف کرنے لگوں، ...... یا گودی پر جاکر گانٹھیں اٹھانے لگوں، یا لڑکیوں کے لئے آدمی تلاش کر کے لانے لگوں یا شراب پہونچانے لگوں...... یا نریمان پوائنٹ پر کھڑے ہوکر دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھاکر چیخ پڑوں۔ کیا کروں؟

یوگی راج کی طرح پانی پر چل کر دکھانے کا پاکھنڈ رچوں؟ یا اس جوان سادھو کی طرح کسی سیٹھ کی بیوی کو لے کر بھاگ جاؤں ...... پلیتے کھاتے ہوئے اسے بے زبان مزدور نما آدمی کے طمانچہ ماردوں؟

زیادہ خوش نصیب ہیں وہ عورتیں جو تن کا دھندا کر کے کچھ کر لیتی ہیں۔ دکھ سکھ کی اچھی بری زندگی جی لیتی ہیں۔ میرے پاس تو وہ بھی نہیں ہے۔ نہ دکھ نہ سکھ۔ صرف ایک جمود۔ کوئی کام آٹھ دس دن سے زیادہ نہیں چلتا۔ پھر وہی۔ وہی جمود...... تب آنکھیں دور تک دیکھ پاتی ہیں۔ اس کے آگے کچھ دیکھتی ہی نہیں۔ یہ کیوں ہوتا ہے نظریں کیوں ٹک جاتی ہیں؟ ایک بہت چھوٹی سی دوری تک آنکھیں دیکھ پاتی ہیں۔ وہ بھی صاف صاف نہیں۔ صرف دھبے دھبے ہوتے ہیں۔ دھندلی سفید یا بدرنگ دھبے ان کے علاوہ اور کچھ نگاہ میں سماتا ہی نہیں۔ نظر جیسے سدھ جاتی ہے سب چیزوں پر باریک سا پردہ پڑجاتا ہے اور جب آنکھوں کے ساتھ یہ ہوتا ہے تب دماغ بھی تھوڑا سا کچھ سوچ کر ٹھہر جاتا ہے۔ پھر چلتا ہی نہیں۔ کان کچھ آوازیں سن سن کر ویران ہوجاتے ہیں۔ پھر کچھ سنتے ہی نہیں تب بڑی مشکل سے مجھے اپنے پر قابو پانا پڑتا ہے بے حد کوشش کے بعد سمندر کی وسعت آنکھوں کو نظر آتی ہے۔ دماغ بیدار ہوتا ہے۔ کانوں میں شور آنے لگتا ہے۔ یہی سب رک رک کر چلتا رہتا ہے۔

اس دکان پر گیا تو ماں کا ایک اور خط آیا ہوا تھا۔ اس کی طبیعت کچھ خراب تھی اور اس نے لکھوایا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ ایک بار مجھے دیکھ لینا چاہتی ہے۔ یہ کوئی بہت بڑی تمنا نہیں تھی۔ اور اتنی بے ہودہ بھی نہیں کہ مجھے ہنسی آجاتی مگر ان دنوں میں اسی چکر میں مبتلا تھا۔ ڈھیر ملاحوں والے چکر میں!

روز روز سنائی پڑتا تھا کہ کروڑوں روپے کا سونا اور سامان بمبئی کے ساحلوں پر اسمگلنگ سے اترتا ہے۔ وہ لوگ بحر عرب سے آتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بادبانی کشتیوں میں۔ اور تاریکی میں آکر کناروں پر سامان اتار جاتے ہیں۔ کبھی بسئی کی کھاڑی میں کبھی مفت لال پارک کی عالی شان عمارتوں کے قریب پتھریلے کنارے پر۔ کبھی گودی کے قریبی جزیروں میں کبھی مارو سے ساحل پر یا چوپاٹی کے نزدیک کنہری غاروں کے قریب قلعہ کی نشیب میں کبھی گھوڑ بندر کی کھاڑی میں۔

میں نے ان کروڑپتی اسمگلر بیوپاریوں کو نہیں دیکھا تھا اربوں روپے کا مال چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں

روزانہ آتا تھا۔ میں ان دیدہ دلیر عرب ملاحوں کو خاص طور پر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں ان دنوں اسی لوٹہ میں رہتا تھا کہ رات برات کہیں کسی کنارے یا کھاڑی میں یہ لوگ نظر آجائیں، ان سے بھی مل سکوں تو بادبانی اڑاتی کشتیوں کو دیکھ سکوں۔ اس منصوبہ سے مجبور ہو کر ماں کے پاس نہیں جا پایا تھا۔ پھر جانے کے لئے پیسہ نہیں رہ گیا تھا۔ ایک عورت کو شام کو چھ بجے گرانٹ روڈ سے قلابہ پہنچانا ہوتا تھا اور گیارہ بجے اس کو واپس لانا ہوتا تھا۔ لوٹتے وقت وہ بہت خوش اور مست ہوتی تھی، ہلکے نشے میں۔

چھ بجے سے گیارہ بجے تک میں ایک طرح سے بیکار رہتا تھا۔ گاڑی میں ہو تو وی ٹی سے کلیان اور کلیان سے وی ٹی کے کئی چکر لگا کر سویا جا سکتا تھا۔ چلتی سڑکوں پر سو سکنا ممکن نہیں تھا۔ کف پریڈ کے بنچوں پر جگہ نہیں ملتی تھی۔ بغیر لڑکی کے ان پر بیٹھنا جرم سا لگتا تھا۔

گیارہ بجے چل کر میں اس لڑکی کو قریب پونے بارہ بجے اس کے گھر چھوڑ دیتا تھا اور گرانٹ روڈ سے گاڑی پکڑ کر کے سنٹرل پہنچ جاتا تھا۔

سترہ دن بعد پھر وہی حالت ہو گئی اور اب یہ مشکل لگ رہا تھا کہ کوئی بھی قاعدے کا کام مل جائے ایک دفعہ غلط کام کر لینے کے بعد میں ہمیشہ اس سے بھی زیادہ غلط کام لینے کو مجبور ہوتا رہا ہوں۔ میری سیڑھی نیچے اترتی تھی ......

آخر ماں کا ایک اور خط آیا اور میں ماں کے گھر چل دیا۔ راستہ بھر میں یہی سوچتا جا رہا تھا کہ بحر عرب میں وہ دیدہ دلیر ملاح کیسے کروڑوں کا مال لاد کر چلے آتے ہوں گے۔ اتھاہ سمندر میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں لئے۔

مسلسل خطرہ کی جانب بڑھتے ہوئے۔ فارس کی کھاڑی اور لال سمندر سے بمبئی تک۔ ایک بار عرب دھو کا ایک ملاح پکڑا گیا تھا۔ میں بڑی عقیدت لے کر اس کو دیکھنے گیا تھا۔ وہ پولیس کی حراست میں تھا سلاخوں والے دروازے کے اندر آرام سے بیٹھا ہوا اس کو دیکھ کر یہ یقین ہی نہیں ہوا کہ یہ اسمگلر بیوپاری ہو سکتا ہے۔ یوں معلوم ہوا تھا کہ اس آدمی کو خواہ مخواہ پکڑ لیا گیا ہے۔ لیکن سمندر پر اور آدمی کہاں ہیں کہ سمندری پولیس غلط آدمی کو پکڑ سکے۔

راستہ بھر وہ عرب ملاح میرے حواس پر طاری رہا تھا پھر اس کا خیال کچھ ایسا اترا کہ میں نے اس کی شکل بہت یاد کرنے کی کوشش کی ..... وہ شکل آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی صورت اختیار نہ کر سکی۔ معلوم نہیں یہ گڈمڈ میرے ساتھ ہی ہوتی ہے یا کسی دوسرے کے ساتھ بھی کبھی ہوتی ہے شکلیں۔ باتیں۔ واقعات ذہن سے اتر جاتے ہیں۔

میں پانچ سال بعد ماں کے پاس لوٹ رہا تھا۔ مجھے یہ پوری امید تھی کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش نہ آیا ہوگا۔ مشکل یہی ہے کہ ہمارے جیسے لوگوں کے ساتھ کوئی حادثہ نہیں ہوتا اچھا نہ برا۔ ہم سمندر کی سطح کی طرح بکھرے ہوئے بس کانپتے رہتے ہیں۔ لہروں کا شور، حرکت اور ان کا اٹھنا۔ بکھرنا اور یہی ہوتا ہے۔

پانچ سال میں کچھ خاص تبدیلی کی امید مجھے نہیں تھی۔ ماں بھی اور کتنی بوڑھی ہو سکتی تھی؟ وہ تب بھی بے حد بوڑھی تھی۔ اتنے بڑھاپے کے بعد اور بڑھاپا کیا ہو سکتا تھا؟ انتہا کے بعد اور کیا انتہا ہوگی؟

مگر جب میں پہنچا تو ایک ہی بات بڑی افسوسناک تھی۔ ماں واقعی بیمار تھی۔ اس کو لقوہ ہو چکا تھا۔ جسم کا دایاں حصّہ سُن ہو چکا تھا۔ میں نے جب اس کی آنکھوں کو دیکھا تو اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ یہ مجھے عجیب لگا۔ مگر تبھی تھرتھراتے بائیں ہاتھ سے میرے منھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ بولی تھی "میں تجھے دیکھ بھی نہیں سکتی۔"

ماں اندھی ہو گئی تھی۔ پانچ سال قبل جاتے وقت اس نے مجھے دیکھا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہو جائے گا۔ اگر اتنا پتہ ہوتا تو تین یا چار مہینے پہلے ہی لوٹ آتا۔ جب اس کی آنکھوں میں تھوڑی تھوڑی روشنی باقی تھی۔ وہ مجھے دیکھ لیتی۔ معلوم نہیں اس کی یہ خواہش کیوں تھی؟

تھوڑی سی تسکین اس بات سے ضرور ملی تھی کہ میں اگر ان دنوں بھی لوٹ آتا جب میں ان ملاحوں کو دیکھ سکنے کے لئے رکا ہوا تھا تب بھی بات کچھ نہیں بنتی۔ ماں نے بتایا کہ وہ ڈیڑھ سال قبل ہی اندھی ہو گئی تھی۔

ان ملاحوں کو دیکھنے کے لئے میں نے اپنے دل کے فیصلے کے مطابق وقت گنوایا تھا۔ مجھے لگا کہ جو وقت اپنے فیصلے کے ماتحت گزارا جاتا ہے وہی بھاری پڑ جاتا ہے صرف وہی وقت، پچھتاوے کا سبب بن جاتا ہے.....

ماں کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس کا جسم دھیرے دھیرے جان چھوڑ رہا تھا۔ زبان بند ہونے سے قبل اس نے مجھے کچھ ضروری باتیں بتائی تھیں کہ کچھ روپیہ ویدجی کا دینا تھا وہ تیس روپے ماہوار کے حساب سے خرچ نہیں چلا پاتی تھی۔ ماں کو یہ بتیس روپے دان کھاتے سے ملتے تھے۔ اس نے بتایا تھا کہ عمر کے ساتھ اس کی ضروریات اور بھوک کم ہو رہی تھی مگر معلوم نہیں بازار کو کیا ہو رہا تھا کہ خرچہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس بات کو وہ لے کر بہت ہی پریشان اور دکھی تھی۔ میں اس کو کیا سمجھاتا۔ اگر سمجھاتا بھی تو کیا ہوتا؟ اس کی زبان بند ہو چکی تھی۔ وہ متفق نہ ہوتی تو بھی کیا کہہ سکتی تھی؟ میں اس کے دکھ کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے کافی بھاگ دوڑ کی۔ اسپتال کے ڈاکٹر کو لایا۔ ویدجی کو لایا۔ سب نے دیکھا۔ لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا۔ زبان بند ہونے کے بعد ماں پتھر کی مورتی سی لگنے لگی تھی۔ داہنے کندھے اور آدھے منھ تک وہ سن پڑ چکی تھی اب اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ مجھے صرف اس کے پاس رہنا تھا اور اس کا کھنڈر پڑتے جانا دیکھتے رہنا تھا دس گیارہ دن بعد میں گھبرانے لگا۔ ماں بائیں ہاتھ کے پوروں پر دھیرے دھیرے کچھ گنتی رہتی تھی جیسے کچھ گنتی رہتی تھی۔ جیسے کچھ حساب لگا رہی ہو۔ دسویں یا گیارھویں دن جب اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں جکڑ گئیں تو میں گھبرا گیا۔

اب اس کے جسم میں سب کچھ بے حس و حرکت ہو گیا تھا لیکن وہ زندہ تھی اسپتال کے ڈاکٹر اور محلّے کے ویدجی نے بڑی انسانیت سے سب کچھ مجھے سمجھایا۔ میں نے ان سے آکر دیکھنے کے لئے کہا تو ان دونوں نے یہی جواب دیا "اب انہیں دیکھ کر کیا کریں گے؟ تین چار دن پہلے ہی تو دیکھا تھا۔ آپ انتظار ہی کر سکتے ہیں۔"

تب میں بہت تنہا ہو گیا۔ لیکن ان دونوں کی بات بھی صحیح تھی۔ وہ کیا کر سکتے تھے۔ ماں کو مرتا دیکھ کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ میں کچھ بھی سوچ نہیں پا رہا تھا۔ کس کو بلاؤں اور کس سے کیا کہوں؟ میں بے طرح پریشان ہو گیا تھا۔ جوں جوں وہ مر رہی تھی توں توں میرے پیر تلے کی زمین دھنستی جا رہی تھی لگ رہا تھا کہ اب میں کٹی پتنگ کی طرح منڈلاتا رہوں گا۔ ایک خلا میرے چاروں طرف پھیلتا جا رہا تھا کوئی ایسا نہیں تھا

جس سے میں بات کر پاتا جو میری خوفناک تنہائی کو سمجھ پاتا۔

ایک لمحہ کے لئے لیکن ویسے ہی ہوا جو میرے ساتھ ہوتا ہے۔ میں کسی سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا۔ کہ اب میرا کیا ہوگا؟ ماں بھی شاید یہی جاننا چاہتی تھی کہ میرا کیا ہوگا؟ اس دوغلے معاشی نظام میں میں کب تک بھٹکتا رہوں گا۔ اور ان لوگوں کی دقتیں کب ختم ہوں گی جن کے سامنے میں خود غرض لگنے لگتا تھا میں کسی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ان کے پاس کب جاؤں ...... تاکہ وہ مجھے کچھ بتا سکیں۔ ایسے خلا میں جب مجھے کچھ نہیں سوجھا اور اپنے خوف سے گھبرانے لگا تو میں نے وزیر مال مسٹر مرارجی دیسائی کو ایک خط لکھا کہ وہ آکر میری ماں کی حالت دیکھ جائیں اور مجھے کچھ بتا جائیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔

خط پاتے ہی وہ فوراً آ گئے۔ انہوں نے ماں کو دیکھا اور چپ چاپ کبھی سے میرے قریب بیٹھ گئے ماں تو کچھ دیکھ ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ صرف دھیرے دھیرے مرتی ہی جا رہی تھی، پتھر ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر خاموشی رہی میں ماں کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن لگا کہ بیکار رہے گا۔ اب کیا ہوگا۔ اب کیا ہو سکتا ہے؟ وزیر خزانہ کفن کی طرح سفید کھادی پہنے ہوئے۔ فرشتے سے لگ رہے تھے ان کے آنے چلنے سے مجھے قدرے راحت مل گئی تھی۔ لیکن اندیشہ اور احساس تنہائی مزید بڑھ گیا تھا۔

کچھ لمحوں بعد میں نے بات شروع کی ,, آپ نے ان کمپنیوں کی جائداد کی تحقیقات نہیں کروائی ......

وہ تھوڑا سا مسکرا دیئے۔ ان کی مسکراہٹ مجھے عجیب لگی۔ ماں کے چہرے پر میں درد کی لہریں اور سائے دیکھتے دیکھتے یہ بھول ہی گیا تھا کہ چہرے پر ایسی بے باک مسکراہٹ بھی کبھی آتی ہے مجھے تھوڑا اطمینان سا ہوا۔ میں پھر آہستہ سے بولا ,, میرا اب کیا ہوگا؟ ان لوگوں کی دقتیں اگر آپ جلد ختم کر دیں تو شاید مجھے مستقبل کے لئے کوئی راستہ مل جائے......"

وہ کچھ بولے نہیں۔ مسکراتے رہے۔ ایک لمحہ بعد بات بدلی " آپ نے مجھے کیوں بلایا تھا؟ "

وہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا آپ کی رائے جاننا چاہتا تھا کہ اب میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں..... میں بہت معمولی آدمی ہوں اور کچھ ایسا چاہتا ہوں کہ قاعدے سے جی سکوں۔ "

,, آپ کے پاس صرف شکایتیں ہیں " وہ کچھ چڑ گئے تھے

وہ بھی مجھے غلط سمجھ گئے تھے۔ شکایت کہاں تھی۔ اگر کچھ تھا تو اندھیرا۔ تنہائی۔ ٹھہراؤ اور اندیشہ۔ میں انہیں۔ نہیں سمجھا پایا۔

کچھ دیر بعد وہ اکتا کر بولے۔ ,, اچھا اب چلتا ہوں "

میں نے کہا " یہ سب میں اکیلے نہیں اٹھا پاؤں گا۔ آپ رک سکیں تو بہت اچھا ہو۔ میں بہت ڈرا ہوا ہوں۔ "

وہ بولے " میں معافی چاہتا ہوں۔ مجھے جانا ہے "

میں نے انہیں زبردستی روکا۔ آخر کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر چلے ہی گئے۔ وہ رکتے بھی تو کب تک؟ میں بہت پچھتایا۔ خواہ مخواہ انہیں بلایا۔ کچھ بات بھی نہیں ہوئی۔ کوئی راستہ کھلنے کے آثار بھی نظر نہیں آئے وہ بھی بڑی طاقتوں میں تھے۔ انہیں بلا کے ان کا وقت برباد کرنا مجھ پر بھاری پڑتا رہا۔

ان کے پاس میرے لئے کوئی دلاسا تسکین نہیں تھی۔ ان کے جانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ ماں کو شکایت تھی۔ بازار کے متعلق اس کو پتہ نہیں تھا کہ بازار کو کیا ہوتا جا رہا تھا۔ کہ اس کا خرچہ نہیں چل رہا تھا۔ یہ بات میں ان سے نہیں کہہ پایا میں اپنے مسئلوں سے گھبرایا ہوا تھا۔

ان کے جانے کے بعد ماں کا بدن اور بھی پتھرا گیا۔ مجھے تو رکنا ہی تھا۔ میں کہاں جا سکتا تھا؟ دھیرے دھیرے کئی دنوں تک اس کا بدن پتھراتا رہا۔ کبھی اس کے ہونٹوں کا کونہ لے جان تتلی کے پر کی طرح کانپتا تھا وہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا اس کی اندھی آنکھوں کے کناروں پر سوکھی سوکھی سی بوندوں کا رس سا نچڑ آیا تھا۔ وہ بھی کائی کی طرح وہیں جم گیا۔

آنکھ کے نیچے کی ایک چھوٹی سی پتلی کبھی کانپتی تھی۔ وہ بھی پرسکون ہو چکی تھی۔

قریب چودہ دن کے بعد ماں کا جسم پوری طرح پتھرا گیا۔ جس نے دیکھا اسی نے تعریف کی۔ بالکل پتھر کی مورتی بن گئی ہے۔ کتنا سکون ہے چہرے پر۔ اتنی پرسکون موت کہاں ملتی ہے کسی کو۔

مجھے یہ اچھا لگا کہ لوگ ماں کو خوش نصیب عورت سمجھ رہے تھے۔ وہ عورت تھی بھی بہت سیدھی دنیا سے بے طرح وابستہ اس کا اچھا اور بھلا سوچنے والی۔ اپنی تکلیفوں کو نہ سمجھنے والی ایک معمولی عورت۔

لوگوں نے رائے دی کہ اتنی اچھی مورتی کو برباد نہ کیا جائے، اسے ہم کہیں لگا دیں۔ مجھے اس میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ایک چوراہے پر اپنا سا اونچا چبوترا بنا کر ماں کو وہاں بٹھا دیا گیا۔

تب سے وہ مورتی میرے شہر کے چوراہے پر لگی ہوئی ہے اور میرے اندر وقت بے وقت کوندتی ہے۔ پتھر کی وہ مورتی بالکل جیتی جاگتی سی لگتی ہے۔ نہ ہلتی ہے نہ ڈولتی ہے۔

برسوں بعد جب کبھی میں شہر لوٹتا ہوں اور اس کے پاس دو پل کے لئے رکتا ہوں تو اس کی آنکھ کے نیچے وہ چھوٹی سی پتلی کانپتی ہے اور لگتا ہے کہ وہ مجھے دیکھنے کے لئے آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتی ہے لیکن کھول نہیں پاتی۔

کملیشور

سانپ

برسات کے دن شروع ہو چکے تھے جب مزدوروں کی ٹولی یہاں آئی تھی۔ یہ سب خانہ بدوشوں کی طرح آئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں کدالیں، تسلے اور کنکر کھودنے والے بیلچے تھے۔ گھٹنے سے کمر تک کسی ہوئی دھوتیاں اور کمر سے گردن تک فتوئیاں تھیں۔ گلے میں کالے ڈورے، منتوں، مرادوں کے تعویذ اور بانہوں میں مہاویر جی کا جھنڈا، اکثر مزدوروں کے پاس تھا۔ آتے ہی ان لوگوں نے زمین کی پرتیں اُدھیڑ دیں، اسے کھوکھلی کر کے مٹی کے ٹیلے بنائے۔

یہ پی ڈبلیو ڈی کا گینگ نمبر دس تھا۔ سڑک پر حلوے کا جھنڈا لہرانے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔ سڑک پر آمد و رفت تھی ہی نہیں اور پھر اُن کا کام سڑک کے کنارے چل رہا تھا، شہر سے بہت دُور۔ پی ڈبلیو ڈی کا ٹرک شام کو آتا تھا، اوورسیئر صاحب آکر کام کی رفتار دیکھ جاتے تھے اور ضرورت کا سامان چھوڑ جاتے تھے۔ یہ لوگ بڑی بے فکری اور مستانہ انداز میں کام کرتے۔ وہیں درختوں کے نیچے یا کھودی ہوئی مٹی کے ڈھیروں پر ان کا کھانا ایک ساتھ پکتا۔ ایک آدھ ایسے بھی تھے جو الگ پکاتے تھے اور سب اپنی ضرورت کے حساب سے کام بانٹ لیا کرتے۔ ایک مزدور سوکھی ہوئی لکڑیاں چننے چلا جاتا تھا۔ برسات کے سبب ایندھن کی بڑی دشواری تھی۔

صبح سے وہ لوگ کام شروع کر دیتے اور شام تک تھک کے چُور ہو جاتے۔ ان مزدوروں کا میٹھ، باپ کی طرح پیار بھی کرتا اور قصائی کی طرح کام بھی لیتا تھا۔ اس کی لال پگڑی کبھی سر سے اترتی نہ تھی۔ جب وہ ہنس کر کوئی بات کہتا تو اس کا چہرہ بہت خوفناک لگتا تھا، کیونکہ اُس کا دہانہ اتنا پھیل اور کھل جاتا تھا کہ جبڑوں کے اندر کے تمام دانت دکھائی دینے لگتے تھے، جنمیں تمباکو کا زنگ صاف جھلکتا تھا۔ اُسکی ناک میں بہت کھجلی ہوتی تھی۔ ایک تو مونچھ بڑی ہونیکے سبب، دوسرے نتھنوں میں سانپ کی زبان کی طرح لمبے لپلپاتے، سرسراتے بالوں کی وجہ سے، شاید یہی بات تھی جو وہ ہر دوسرے لمحے منہ سکوڑ کر ناک مروڑا کرتا تھا۔ ہنسنے کے بعد لمبی کلکاری چھوڑنا اسکی مخصوص عادت تھی۔ اسی لیے جب وہ ہنستا تو سب اسکے خوفناک منہ کو دیکھکر حیران رہ جاتے پر ہجڑوں کی سیٹی کی طرح کلکاری سنتے ہی ٹھہاکے کے ساتھ ہنس پڑتے۔

ان مزدوروں کے سپرد دو کام تھے۔ ایک تو محنت، دوسرے سرکاری سامان کی رکھوالی کرنا۔ ان کا پڑاؤ، فوج کی طرح کا ہی ہوتا تھا۔ رات کو بغیر چمنی کی اس بستی میں ایک لالٹین ٹمٹمایا کرتی اور جب وہ سب تھک کے چُور ہو جاتے تو وہیں باندھ کی طرح بندھے ہوئے مٹی کے ٹیلوں یا آس پاس کے گھنے پیڑوں کے تلے اپنے اپنے انگوچھے بچھا کر سو رہتے۔

جب کھدائی کا کام قریب قریب ختم تھا تو پُل بنانے کیلئے پتھر، اینٹیں اور سمنٹ کے بورے آئے اور ساتھ میں ایک چوکیدار بھی آیا۔ سامان پٹری کے کنارے گرا دیا گیا۔ سمنٹ کے بورے بوندا باندی سے بچانے کیلئے ایک املی کے پیڑ کے نیچے رکھدئے گئے۔ چوکیدار کے آجانے سے مزدور اور بے فکر ہو گئے۔ شام کو کام ختم کر کے وہ اپنے اوزار وغیرہ اسی کے سرہانے پٹخ آتے اور کھدی ہوئی مٹی جسم پر رگڑ کر آدھی رات تک کبڈی کھیلتے رہتے۔ کبڈی کے شور اور ہنگامے اور کامیابی پر پُرجوش اظہارِ مسرت اور قہقہے، اس بیابان میں آدھی رات گئے تک بھوتوں کی چیخوں جیسے لگتے۔ کچھ بوڑھے اور کمزور مزدور سات میل دور ڈاک بنگلے کے برآمدے میں سونے کیلئے چلے جاتے اور منہ اندھیرے واپس آجاتے۔

چوکیدار آیا تو چار پانچ دن بعد ہی مزدوروں کی اس سے ان بن ہو گئی۔ سومیر بیلدار نے شام کو کبڈی جمنے سے پہلے کہا "ہم کو سب پتہ ہے، چوکیدار، اوورسیئر بابو کا آدمی ہے اسی لئے انسپکٹری جھاڑتا ہے، لانترانی بولتا ہے، ہمارا افسر ہمارا اینٹھ ہے، ہم چوکیدار کے آڈر میں نہیں رہیں۔"

"ہر دکھت کچر کچر لگائے رہتا ہے سالا"۔ بوچن بیلدار نے لقمہ دیا۔ "کہتا ہے بیگار کٹوا دینگے، ہم اپنی جگہ موجود ہیں، کام کیا ہے، دیکھتے ہیں کون سالا بیگار کٹوائے گا؟"۔

"میٹھ کے جاتے ہی غراتا ہے بدماس"۔ "اپنے لئے کھیمہ منگوا رہا ہے، نام کرتا ہے سیلمنٹ (سمنٹ) کا کہ بوندا باندی میں پتھرا جائیگا صاحب۔ کوئی پوچھے بدماس سے، آدمی نہیں پتھراتا، سیلمنٹ کی بوری پتھرا جائیگی.... ایک بیلچے میں لنگڑا کر دوں سالے کو"...۔ رام برن نے کہا تو سر کھجاتے ہوئے سری چرن نے جوڑ لگایا۔ "سوتے میں سالے کی چھاتی پر سیلمنٹ کی بوری پٹک دو، وہیں تو سوتا ہے اجگر کی طرح"۔

اس سوجھ پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے...!

"گھر والی کے بغیر چین نہیں پڑتا تو سیلمنٹ کا نام کر کے کھیمہ منگوا رہا ہے۔ اوورسیئر بابو سے درکھاس (درخواست) کر رہا تھا کل۔ آدمی بنتا ہے، عورت کے بغیر رہا نہیں جاتا، جوکھن۔ جو آدمی عورتوں کے معاملے میں پنڈت سمجھا جاتا تھا گیننگ میں، سورتی چوستے ہوئے بولا "کتے کی اولاد ہے کتے کی"...!

"ہاں سالا! اوورسیئر بابو کے آگے دُم ہلاتا ہے ہماری گردن کاٹنے کے لئے"۔ سومیر نے مزدور نیتا کی طرح کہا۔ "ہم خود ہی بھگت لینگے۔ کسی سے کہنے کی جرورت نہیں ہے!!"۔

تب ہی بنسی چوکیدار آتا دکھائی پڑا اور سب نے "پالیاں" بنا کر کبڈی کھیلنا شروع کر دیا۔ وہ پاس سے نکلا تو بوچن نے ٹوکا۔ "گھر والی نہیں آئی چوکیدار! ہم سب بھوجی کی راہ دیکھ رہے تھے"۔ یہ سن کر سب ٹھہاکا کے ساتھ ہنس پڑے۔ بنسی چوکیدار وہیں گھاس کے میدان کی میڑھ پر بیٹھ گیا۔ بات اسے لگ گئی تھی اور سومیر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رام برن کو جو اشارہ کیا تھا وہ اس نے پرکھ لیا تھا۔ "سالا بھوجی بناتا ہے۔ اکیلا پڑ جاتا ہے، نہیں تو بتاتا"۔

بنسی وہیں میڑھ پر اکیلا بیٹھا رہا گھاس میں۔ گھاس کا میدان دور دور تک پھیلا ہوا تھا، کمر تک اونچی گھاس تھی بڑی سوندھی مہک اٹھ رہی تھی بھیگی گھاس سے... چندن اور شراب جیسی، یا جیسے نہوا الہک اٹھا ہو.... برسات کے بھیگے ہوئے دن اور گھپ اندھیری راتوں کی خنکی اور پاروتی کی جھانجھوں کی جھنکار۔ سامنے کے دو سنہرے دانت اور ٹھوڑی پر گودنا۔ اسے یہاں لے آیا تو بدماس فجیہت (فضیحت) کر دیں گے۔ بنسی سوچ رہا تھا، کھلے آسمان تلے لا کر بھی کہاں ڈال دے جب تک خیمہ نہ مل جائے۔ اوورسیئر صاحب کا دورہ ہو تب شاید خیمہ آئے۔ پتہ نہیں کتنے مہینے کام چلے! بارہ پل فوراً تو بن نہیں جائینگے اور پھر گابھن بھینس کی طرح تو کام کرتے ہیں یہ بیلدار۔!

میدان کی گھاس ہوا سے سرسرا رہی تھی جیسے پکے اناج کے کھیت بول رہے ہوں۔ اتنے مہینے کا کام اور بیابان میں اکیلے پڑے رہنا۔ ٹولے میں روز لڑائی دنگا اور کھانے پینے کی کھٹ کھٹ۔ ان لوگوں کی اتنی مجال نہیں کہ پاروتی سے بول جائیں۔ آسمان میں بادل گھر آئے تھے اور ٹمٹماتی لالٹین کی روشنی میں سمنٹ کی بوریاں دکھائی دے رہی تھیں۔ جا کر اس نے سمنٹ پر ترپال ڈالا اور اسی کے ایک کونے پر انگوچھا لپیٹ کر لیٹ رہا۔

بیلدار گئی رات تک ہا ہا ہو ہو کرتے رہے۔ کھیل ختم ہونے پر رام برن کو بدمعاشی سوجھی۔ سری چرن کے ساتھ مل کر اس نے چپکے سے چوکیدار بنسی کی چھاتی پر سمنٹ کی ایک بوری رکھ دی اور مزہ لینے کے لئے چپ چاپ آ کر لیٹ گئے... تھکے

ہوئے مزدوروں کی آنکھوں میں نیند کے ساتھ ساتھ اس کارگزاری کا کمال دیکھنے کی تمنا بھی تھی۔ سری چرن نے پھسپھسا کر کہا:۔ "ابھی سالے سے قبول کرواؤں گا۔ ہماری جڑ کاٹتا ہے اوورسیئر بابو کے سامنے"۔ رام برن اور سری چرن نے سر پر پگڑی باندھی اور بنسی چوکیدار کے سرہانے پیڑ کے نیچے جا کے چھپ گئے۔

ایکا ایک بنسی چوکیدار کی گھگھیاتی ہوئی آواز سنائی پڑی، جیسے کسی نے گلا دبا دیا ہو۔ سری چرن نے بھوت کی آواز میں کہا "ہم ٹھاکر والے پیپل کے گوریلا مالک ہیں، بول کیا کہتا ہے؟"۔

بنسی پھر گھگھیاتا ہوا بولا:۔ "سچی بانٹوں گا! دیا کریں مہاراج، دیا کریں"۔

"بیلداروں کو ستائے گا۔ بیگار کٹوائیگا؟"۔

"نہیں۔ نہیں"

"قسم کھا"؟۔

"سب کی سوگندھ! گنگا میا کی سوگندھ"!۔

"جا! اچھا کیا۔ پر سچی بانٹے گا نا؟"۔

"جرور مہاراج"۔

اور بنسی چوکیدار کی سانسیں جب تک ٹھیک ہوں تب تک سری چرن اور رام برن اپنی اپنی جگہ آکر لیٹ رہے، چھاتی پر سے بوراسر کا کر بنسی بیٹھا کانپتا رہا۔ اس نے دیکھا دونوں گوریلا بھوت گھاس کے میدان سے ٹھاکر والے پیپل کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ وہ ڈر کر بیلداروں کے پاس جا بیٹھا۔ پر وہ سب کے سب دم سادھے مزہ لے رہے تھے۔ اس نے سری چرن کو آنکھیں بند کئے ہنستے دیکھا۔ شک ہوا، لیکن وہ کروٹ بدل گیا۔ وہ رات بھر وہیں بیٹھا رہا۔ ڈر سے کانپتا اور گھبراتا... ایسے اکیلے پن میں جنا کی ماں بہت یاد آئی تھی۔ رہ رہ کر اسے یاد آ رہا تھا اپنا گھر۔ جنا اور دلاری اسے پریشان کرتے ہوں گے۔

بادل آسمان میں گرج رہے تھے، اسی سمت سے بھیگی ہوئی ہوا آ رہی تھی۔ گھر تو چھلنی کی طرح ٹپکتا ہوگا کیسے ٹھیک کیا ہوگا جنا کی ماں نے! کونوں سے پانی کی دھار آتی ہے اور محلے میں ایسا ایک بھی آدمی نہیں، جس نے ہاتھ لگوایا ہو... کوئی آفت، مصیبت ٹوٹ پڑی تو؟ کیڑے مکوڑوں کے دن، کہیں کچھ ہو گیا تو؟ موسم بے موسم سانپ دیوتا درشن دیتے ہیں وہاں۔ آجکل تو بامبیاں بھر گئی ہیں، سوچتے ہی سوچتے اس کا کلیجہ دھک سے ہو گیا، وہ دلاری اور جنا کو دونوں بغلوں سے چپکائے سو رہی ہے اور ایک سانپ...

گھبرا کر وہ کھڑا ہو گیا، سوئے ہوئے بیلداروں کے بیچ پہنچ کر ایسے پیر اٹھاتا اور رکھتا رہا، جیسے مٹی گوندھ رہا ہو۔ اسے لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی سانپ ابھی اس کے پیروں میں لپٹ جائیگا۔ وہ سانپ جوان سب بیلداروں کو ایک ایک کر کے ڈس چکا ہے۔ پیر زمین پر رکھتے ہوئے وحشت زدہ نگاہوں سے اس نے آس پاس دیکھا... سب گہری نیند میں ڈوبے تھے، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو! اس کا رواں رواں سہم سا گیا اور وہ پیر بدل بدل کر کودتا رہا سری چرن نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو بنسی روک نہیں پایا، پر اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ بنسی دھم سے زمین پر بیٹھ گیا، جیسے سانپ نے اسے کاٹ ہی لیا ہو۔ لیکن صبح سویرے سب بیلدار جیتے جاگتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

بنسی ڈاک بنگلہ چلا گیا۔ من میں خوف سما گیا تھا۔ سوچتا تھا، سیدھے گھر چلا جائے۔ کسی دن سچ مچ سانپ دلوتا لے... پر یہ کیسے ہوتا؟ آخر خیمہ ٹرک میں لدوا کر چلا آیا۔ چنا، دلاری اور اس کی مائی کو یہیں لے آئیگا۔ دکھ، مصیبت اور گھبراہٹ میں کوئی ساتھ ہو تو اتنا ڈر نہیں لگتا۔

شام کو بنسی چوکیدار کا خیمہ تنتے ہی سری چرن نے اعلان کیا "کل رات سالے پر ٹھاکر کے پیپل والا گوریلا بھوت سوار تھا۔ پیر پٹک پٹک کر عرج داست کر رہا تھا رات میں اور تڑکے بھاگ گیا اٹھ کر!"

"ای سالا لاٹ گورنر ہے، کھیمہ میں رہیگا سیلمنٹ کے ساتھ" رام برن نے کہا تو بوچن بولا "سوئے سالا کھیمے میں، دیکھ لینگے...!"

اور آدھی رات گئے سری چرن نے خیمے کی دو رسیاں کاٹ دیں۔ خیمہ ہڑبڑا کر گر پڑا۔ بیچ والا لٹھا بنسی کو ایسا لگا کہ پیشانی پھوٹ گئی۔ اوورسیئر صاحب کو اس نے خون سے رنگا انگوچھا دکھا کر شکایت کی "ہم ان کو کام کی کھاطر (خاطر) لوٹکتے ہیں صاحب، اس لئے ہم سے کھار (خار) کھاتے ہیں اور اس طرح کا سلوک کرتے ہیں۔"

اوورسیئر بابو آگ بگولہ ہو گئے۔ کڑک کر بولے "سب کو نکال کر نئی بھرتی کر لوں گا، مزدوری کی کمی نہیں ہے یہاں۔ ایک تو کام کو بے گار کی طرح ٹالتے ہو، اوپر سے یہ سب بدمعاشیاں۔"

سومیر نیتا کی طرح آگے آیا۔ "لیکن صاحب، کہاں لیٹیں بیٹھیں؟ بھیگی جمین (زمین) میں سردی اکڑ جاتی ہے۔ ہمیں بھی کھیمے ملنے چاہئیں۔"

"کون کہتا ہے کہ لیٹو بیٹھو! کام ختم کر کے اپنے اپنے گھر جاؤ، صبح آکر حاضری دو۔ روزانہ مزدوری پر کام کرنے والوں کو خیمے نہیں ملتے۔ ہمیں بھی نہیں، دینگے کہاں سے...؟" اوورسیئر بابو نے ہیٹ لگاتے ہوئے کہا کہ "سرکار کام لیتی ہے، اس کا بھرپور پیسہ دیتی ہے۔ بیکار کی بکواس نہیں سننا چاہتا۔"

"سیلمنٹ کی بوری کے لئے کھیمہ؟" سومیر کہہ ہی رہا تھا کہ اوورسیئر بابو نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔ "دس بوری پانی میں بھیگ کر پتھر ہو جائیں گے تو کون بھریگا... اپنے گھر سے لاؤں گا یا تم لوگ پگار کٹواؤ گے؟"

پھسپھساتے ہوئے سری چرن نے کہا "سیلمنٹ پتھرا جائے تو سب کچھ اور آدمی پتھرا جائے تو کچھ نہیں؟ بوری کون بھریگا! اور وہ بدبداتا رہا۔ اوورسیئر بابو کیا گھر سے بھرینگے، آدمی تو دوسرے کے گھر سے بھی بھرا جاسکتا ہے..."

اوورسیئر بابو کے موٹر میں چڑھتے چڑھتے سومیر نے کہا۔ سرکار! کسی کا گھر بیس[۲] کوس ہے کسی کا پچیس ۲۵ کوس۔ پیٹ کی کھاتر سب پڑے یہاں۔ آنا جانا کیسے ہو سکتا ہے؟

اس پر کچھ پگھلتے ہوئے اوورسیئر بابو نے کہا۔ "ڈاک بنگلے کے برآمدے میں جتنے لیٹ پاؤ، لیٹ لیا کرو اور کیا بتاؤں؟ اور موٹر اسٹارٹ کر کے چلے گئے۔

پر بالیس بھر کی ڈاک بنگلیا اور انگور بھر کا برآمدہ۔ کتنے سمائیں گے وہاں؟ پچاس آدمیوں کی ٹولی۔ آدھے چلے جائیں وہاں اور آدھے یہاں پڑے رہیں۔ یہ کسی کو گوارہ نہ ہوا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ رات کو کبڈی جمنے کے بعد سب بھول جاتے۔

بنسی جاکر پاروتی، چنّا اور دلاری کو لے آیا تھا۔ خیمے میں اینٹ بچھا کر فرش بنالیا تھا، اُسی پر گودڑیاں پڑی تھیں۔ جن پر وہ اپنے دونوں بچوں کو کتیا کی طرح پیٹ تلے دبا کر سو جاتی۔ راتیں بے حد گیلی ہو گئی تھیں اور آس پاس اُگی ہوئی گھاس روز بڑھ آتی تھی۔ دور تک پھیلے لمبے گھاس کے میدان کے سبب سناٹا اور بھی خوفناک ہو جاتا تھا۔ دور میدان کے آگے ہوا خوفناک سیٹیاں بجاتی ہوئی دوڑتی تھی اور پیڑوں پر سوئے ہوئے کوّے آدھی رات جاگ کر بلبلاتے تو سارا ماحول چیخنے لگتا تھا۔ جھینگر شور مچاتے تو گھاس کے میدان کے اس پار آواز گونجنے لگتی اور دور سے آتی ہوئی آواز بے حد خوفناک لگتی تھی۔ بھیگی زمین ایسی لگتی جیسے نئی قبر میں کسی نے لٹا دیا ہو۔

پاروتی، بیلداروں کی خاطر لالٹین، خیمے کے باہر لٹکا دیتی۔ بنسی جو کیدار اور بیلداروں کا من مٹاؤ تو برقرار تھا، لیکن پاروتی کی وجہ سے کوئی جھگڑا فساد نہیں ہو پاتا تھا۔ چنّا، کودتا ہوا، کنڈی کے پالنے میں آن دھمکتا تو بنسی اسے ڈانٹتا نہیں تھا۔ کام ابھی زور و شور سے چل رہا تھا۔ اوورسیئر بابو کا حکم تھا کہ باڑھ آنے سے پہلے پل بن کر تیار ہو جانا چاہئے۔ نہیں تو سارا کیا دھرا مٹی میں مل جائے گا۔

بیلدار ویسے ہی محنت کرتے اور مستی میں کھیل کود کر سو جاتے۔ بے فکر اور بے خوف۔ مٹی لپیٹے رات کو سوتے اور مٹی جھاڑ کر سویرے اٹھ پڑتے! ایسی الوٹ نیند سوتے کہ سویرے سورج کی کرن ہی جگاتی۔

اس دن بھی سورج کی پہلی کرن نے سب کو جگایا.. سب مٹی جھاڑ جھاڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے لیکن رام برن نہیں اٹھا۔ سری چرن نے پیر پر ٹھوکر دی پر وہ ہلا بھی نہیں۔ سورج کی تمام کرنیں بھی مل کر اسے نہیں جگا پائیں۔ حیرت سے سومیر نے اس کے منہ پر پڑا ہوا انگوچھا ہٹایا تو اس پر سکتہ پڑ گیا۔ سارے بیلدار جھک پڑے۔ رام برن پتھرایا پڑا تھا۔ اس کے ہونٹ نیلے تھے اور ناخن سیاہ پڑ گئے تھے... سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

بنسی نے ڈبڈبائی آنکھوں اور کانپتے ہاتھوں سے نس کاٹ کر دیکھی۔ خون نہیں، نیل بہہ رہی تھی اس بیابان بستی میں خوفناک سناٹا چھا گیا۔

گھاس کے میدان میں جیسے کروڑوں ناگ پھن پھیلائے کھڑے تھے۔ جلدی سے کدالوں اور بیلچوں کے ہتھوں کو جوڑ کر کھاٹ بنائی گئی اور بیلدار اسے اٹھا کر چار کوس دور گاؤں میں بھگت کے یہاں لے گئے۔ بھگت نے اکڑ ڈھاک بجائی، کوڑیاں پھینکیں پر رام برن نہیں کھیلا۔ دوڑے دوڑے اسپتال گئے مگر رام برن نہیں جاگا ہار کر اسے جمنا میّا کے حوالے کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے سب لوٹ آئے!

جب بنسی اور سارے بیلدار واپس آئے تو شام ہو چکی تھی۔ پاروتی اپنے دونوں بچوں کو گھٹنوں سے چپکائے، لالٹین جلائے خیمے کے باہر اکیلی بیٹھی تھی۔ سب بری طرح تھکے ہوئے تھے۔ ہڈی ہڈی چور تھی چپ چاپ کوئی کہیں ٹیک لگا کر وہیں خیمے کے آس پاس، کوئی ہانپتا ہوا گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے کی چادر سرکتی آ رہی تھی۔ گیلی دھرتی پیتل کی طرح ٹھنڈی لگ رہی تھی اور روندی ہوئی گھاس کے سرے، نوکیلے کانٹوں کی طرح چبھ رہے تھے۔ آسمان میں بادل پھیلے ہوئے تھے اور ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی۔

سومیر نے دھیرے سے کہا:... بنسی! بال بچوں کو ڈاک بنگلے پہنچا آؤ۔ تم بھی وہیں سو رہو۔ اور اس نے

دو چار کی آنکھوں سے نگاہیں ملا کر انہیں بھی بنسی کے ساتھ جانے کا اشارہ کیا، پر کوئی اٹھا نہیں۔ سناٹا اور بھی بوجھل ہو گیا اندھیرا آسمان سے اور نیچے اتر آیا اور ہوا کی غراہٹ اور بڑھ گئی۔ پرندے خاموش تھے۔ زور سے پانی ہی برس جاتا تو یہ موت کا سناٹا تو تحلیل ہو جاتا۔ مگر بادل بوجھ سے اور نیچے ہوتے جا رہے تھے۔ سومیر نے پھر کہا: "بنسی بچوں کو لے کر چلے جاؤ، ہم لوگوں کی بات اور ہے!"

مگر پاروتی نے دھیرے سے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ سومیر نے سوالیہ نگاہوں سے آٹھ دس لوگوں کی طرف دیکھا۔ تو جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب مل گیا۔ "آج چلے جائیں۔ لیکن پھر؟!"

اور تھکے ماندے بیلدار وہیں لیٹ گئے۔ روز کی طرح۔ کون کس کو چھوڑ کر چلا جائے؟ اور چلا بھی جائے تو کب تک کے لئے؟ پاؤں بری طرح بھرے ہوئے تھے، سویرے کام شروع ہونا ہے۔ پاروتی اپنے چنا اور دلاری کو لیکر اندر خیمے میں چلی گئی۔ اپنے لئے کپّی جلا کر اس نے لالٹین بنسی کو دے دی۔

بنسی سے لیٹا ہی نہیں جا رہا تھا خیمے میں۔ لالٹین لے کر باہر چلا آیا اور پیڑ میں اڑ لگا کر بیٹھا رہا۔ اندر دونوں بچوں کو سُلا کر پاروتی گھٹنوں میں سر دئے ان کے سرہانے بیٹھی تھی۔

اندھیرا بے حد بڑھ گیا تھا۔ کالے بادل ایسے گرج چمک رہے تھے، جیسے کوئی دیو انہیں ہاتھ سے نچا رہا تھا۔ گھاس کے میدان کے پاس خوفناک سیٹیاں بج رہی تھیں اور بیلداروں کے سرہانے بیٹھا بنسی ذرا سی سرسراہٹ پر لالٹین اٹھا کر دیکھتا تھا۔

تھکے ہوئے مزدور بے خبر سو رہے تھے۔ بنسی کی توجہ رہ رہ کر، بار بار گھاس کے میدان پر اٹک جاتی۔ گھاس سرسراتی تھی تو یوں لگتا تھا، ہزاروں ان دیکھے سانپ اس لہلہاتے گھاس کے میدان میں سرسراتے چلے آ رہے ہیں۔ چونک کر وہ ہر بار لالٹین اونچی کر لیتا۔ اس کا دل تھرا اٹھتا۔ لیکن سارے بیلدار۔ مزدور۔ ایسے سوئے پڑے تھے جیسے ان سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ بے حرکت، بے فکر، بے خوف ۔۔ !!

کے لئے نذرِ خلوص

جنہوں نے

ادب، فلم، ٹی وی

کے ذریعہ صرف

انسانیت کی خدمت کو اپنا شیوہ بنایا ہے

پریم جی

(فلمساز)

سُچترا فلمز — . — باندرہ — . — بمبئی — ۴۰۰۰۵۰

سرحدوں کے ٹکڑے

ایک لاکھ ہندو مار کر مسلمانوں نے یہ سمجھا ہوگا کہ ہندو مذہب مر گیا ہوگا لیکن وہ زندہ ہے اور زندہ رہیگا۔ اسی طرح ایک لاکھ مسلمانوں کو قتل کر کے ہندوؤں نے بغلیں بجائی ہونگی کہ اسلام ختم ہو گیا، مگر حقیقت آپ کے سامنے ہے کہ اسلام پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔

اس لئے یہ مت کہو کہ ایک لاکھ ہندو اور ایک لاکھ مسلمان مرے ہیں۔

یہ کہو کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں اور یہ اتنی بڑی ٹریجڈی نہیں ہے کہ دو لاکھ انسان مرے ہیں، ٹریجڈی اصل میں یہ ہے کہ مارنے اور مرنے والے کسی بھی کھاتے میں نہیں گئے۔

• کملیشور نے فسادات یا ہندستان اور پاکستان کی تقسیم سے متاثر ہونے والے انسانوں کی جو کہانی لکھی ہے اسے پڑھتے وقت منٹو کا مذکورہ بالا جملہ بار بار یاد آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کملیشور نے انسان کی اس ٹریجڈی کو اپنے خونِ جگر میں قلم ڈبو کر، کتنے پاکستان اور لوٹے ہوئے مسافر لکھا ہے۔

(ادارہ)

ڈاکٹر راہی معصوم رضا

وقت ہندو ہے نہ مسلمان

"لوٹے ہوئے مسافر" کملیشور کا سب سے اچھا ناول نہیں ہے، پھر بھی اس نمبر کے لئے میں نے اس ناول کا انتخاب کیا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کملیشور کے اسی ناول میں "ہندی" ادب کے ہندستانی ادب ہونے کے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔

دیوناگری لیپی میں ہندی کا یہ پہلا ناول ہے جسمیں "ہندوؤں" کے سوا جو ہندستانی حقیقت ہے اسے دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میری یہ بات ممکن ہے بہت سے "دوستوں اور دشمنوں" کو بری لگے، پر میں یہ بات ایک بار پھر کہنا چاہتا ہوں کہ کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں ہندی یا ہندوئی کو ہندو اور مسلمان خانوں میں بانٹنے کی جو سازش کی گئی تھی اس کے نتیجے میں آگے چل کر ہندستان تقسیم ہوا اور مملکت اسلامیۂ پاکستان وجود میں آئی۔ دیوناگری رسم الخط کو ہندو اور اردو رسم الخط کو مسلمان تسلیم کر کے دو قومی نظریئے کی بنیاد ڈالی گئی۔ یہی وجہ تھی کہ دیوناگری کا ادب پورے کا پورا ہندو ہو گیا۔ مسلمانوں نے اس رسم خط سے کوئی ناتہ قائم نہیں کیا اور دیوناگری ادب اپنے علاقے کی آدھی ہی صداقتوں میں الجھ کر رہ گیا۔ دیوناگری ادب کو پڑھ کر یہ جاننا ناممکن ہے کہ اس لسانی علاقے میں ہندوؤں کے سوا بھی کوئی رہتا، جیتا اور مرتا ہے۔ اس کے برخلاف اردو رسم الخط والے ادب میں اس علاقہ کی لگ بھگ پوری صداقت سمائی ہوئی ہے۔ تاہم اس کے باوجود اردو رسم الخط والے ادب پر مسلمانوں کی جو چھاپ رہی ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خود پاکستان کی تخلیق میں اس رسم الخط کا کتنا بڑا ہاتھ ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔

اردو رسم الخط میں "ہندوؤں" اور "مسلمانوں" دونوں کی باتیں کی گئیں، مگر مسلمانوں کا رنگ کافی چوکھا ہے۔ اس رسم الخط کو چونکہ ہندو بھی استعمال کر رہے تھے، اس لئے بڑی حد تک یہ رسم الخط تقیہ کے عالم میں رہا۔ مگر دیوناگری کو چونکہ مسلمانوں نے ہاتھ نہیں لگایا اس لئے اس کے ادب کی قومی صورت نہ بن سکی، اور "لوٹے ہوئے مسافر" کی تخلیق سے پہلے تک وہ ہندو ادب ہی رہا۔ کملیشور نے اس ناول سے دیوناگری ادب کی ادھوری حقیقت کو مکمل کر دیا

اس ناول کا آغاز ہی قاری کو متوجہ کر لیتا ہے:-

"..... صرف نفرت نے اس بستی کو جلا دیا تھا۔"

کیسی عجیب ابتدا ہے، کیسا سہما دینے والا آغاز ہے۔ اس بیانِ حلفی سے یہ ناول شروع ہوتا ہے۔ کون بستی؟ کیسی نفرت؟ یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ چنانچہ ان تمام بستیوں کے رہنے والے اس کہانی کے کردار بن جاتے ہیں، جنہیں صرف نفرت نے جلا دیا ہے اور اپنے وطن میں ایسی بستیوں کی کوئی کمی نہیں ہے، مگر کملیشور غالب کی طرح راکھ کریدنے سے نہیں ڈرتے۔ غالب تو یہ کہہ کر الگ ہو گئے تھے کہ ؎

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

کملیشور جانتے ہیں کہ جسم ضرور جل گیا، بستیاں ضرور جل گئیں پر راکھ کریدی جائے تو دل جیسی زندہ حقیقت، یقیناً دھڑکتی ہوئی ہاتھ آئیگی۔

"لوٹے ہوئے مسافر" وہی راکھ کریدنے کی ایک کوشش ہے۔

آیئے۔ کملیشور کی اس بستی میں چلیں، جسے نفرت کی آگ نے جلادیا تھا۔ یہ تو ماضی کا صیغہ ہے، یہی امید کی کرن ہے۔ راکھ کریدنے سے یہی زندہ حقیقت تو ہاتھ آئی ہے کہ اس بستی کو نفرت نے جلایا تھا، جلایا ہے" نہیں، اور جلنے سے پہلے بہت خوبصورت تھی یہ بستی۔

کملیشور کے لفظوں میں تب :۔

" راجہ کے تالاب میں کنول کے پھول کھلتے تھے۔ دھیمروں کے لڑکے بچے کمل گٹے بیچنے آیا کرتے تھے۔ دوسرے تالابوں میں بیگنی جل منجری پھولتی تھی .... اس کے پتے ناگوں کی طرح پھن اٹھائے رہتے تھے۔ بیجاون کے ڈھلانوں پر بیریوں کے باغ تھے۔ جنگل میں کمرخ اور آنولے کے پیڑ تھے۔ پکے ہوئے بیل جب مہکتے تھے تو بستی میں خوشبو منڈلاتی تھی مہوا ٹپکتا تھا تو خمار چھاجاتا تھا۔ گھروں میں بھبکے چلتے اور کچی شراب کھنچتی تھی۔ مندروں کے آنگنوں میں گیندا پھولتا تھا اور مسجدوں کے صحن میں بیلا، چمیلی اور موتیا مہکتا تھا...."

کیسی پیاری بستی تھی، کیسا پیارا ماحول ہے، کتنی پاکیزہ خوبصورتی ہے۔ ایسی بستی کا نفرت کی آگ میں جل جانا واقعی بہت بڑا المیہ ہے۔

لیکن اس ناول میں کملیشور اس پوری بستی کی بات نہیں کرتے۔ وہ صرف آدھی بستی کی بات کرتے ہیں چکوؤں کی بات ہے۔ کملیشور اس بستی کا تعارف یوں کرواتے ہیں:۔

" سن بیالیس کے آندولن میں چکوؤں کے جوان لڑکوں نے بڑا اُدھم مچایا تھا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ دیش کیسے آزاد ہوگا، پر اتنا انھیں معلوم تھا کہ کچھ کرنا چاہئے اور وہ جو کچھ کر سکتے تھے وہ انھوں نے کیا تھا۔"

سن بیالیس میں بڑی اُدھم مچانیوالے سن چھیالیس میں کیوں بدل گئے، وہ آزادی اور پاکستان میں فرق کیوں نہ کر سکے ؛ یہی تو المیہ ہے، نفرت کی یہ آگ چکوؤں کی بستی میں خود بخود نہیں لگ گئی تھی۔ نفرت کی اس آگ کی چنگاریاں باہر سے آئی تھیں ... دوسرے شہروں، قصبوں اور صوبوں سے۔" اور اس چنگاری نے ایک جیتی جاگتی بستی کی صورت ہی بگاڑ دی۔ زمین وہی ہے۔ پیپل اور جامن کے پیڑ وہی ہیں ... دور میدان جہاں نیچا ہو کر ہری پہاڑیوں پر پھیل جاتا ہے، وہاں بیریاں ہیں .... ٹیلوں کے پیچھے کمرخ اور آنولے کا جنگل ہے، جہاں بمبا بہتا ہے اور ڈھلان سے بائیں طرف گہرا تالاب ہے، جسمیں سوّر اور بھینیں نہاتی ہیں۔ اس بستی میں راتیں بڑی منحوس ہونے لگیں اور صدیوں سے ایک دوسرے کو پہچاننے والے ایک دوسرے کی طرف یوں حیرت اور رشک سے دیکھنے لگے جیسے انھوں نے ایک دوسرے کو پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ من میں بیٹھے ہوئے شبہات کے سانپ پھنکارنے لگتے اور آنکھوں میں اجنبی پن کی چمک بھر جاتی۔ ویسے کوئی اجنبی دیکھے تو اسے کوئی فرق ہی نہ دکھائی دے۔ کیونکہ آج بھی سب کچھ لگ بھگ ویسا ہی ہے۔ صرف اس بستی کو اداسی نے جکڑ لیا ہے۔ ٹھہری ہوئی شامیں ہوتی ہیں اور رُکا ہوا وقت ہے۔

یہ بستی جس کی شامیں اداس ہیں اور جسمیں وقت رکا ہوا ہے اور جہاں شکوک و شبہات کے سانپ پھنکارتے ہیں، میدان عمل ہے نصیبن کا اور سائیں کا، میدان عمل ہے سلمہ اور ستار کا، میدان عمل ہے بچن کا جس کے چلے جانے سے

نصیبن اداس ہو گئی ہے اور سائیں کہہ رہا ہے "اتنے برس ہو گئے، ادھر کوئی نہیں آیا ۔ ۔ ۔ ۔ اب بچن بھی کیا آئیگا۔ سب ویران ہو گیا ۔ سب اجڑ گیا۔"

پر سب ویران کیوں ہو گیا ؟ سب کچھ اُجڑ کیسے گیا ؟ جواب سیدھا اور سادہ ہے اور مختصر سا ہے ۔ کیوں کہ پاکستان بن گیا ۔ یہاں مقصود اور لیلین کی گھناؤنی جنسی زندگی کی صبحیں اور شامیں ہیں ۔ یہاں افتخار کا یکہ گھوڑا ہے ۔ سب سے اچھا ہے گھوڑا ۔ سب سے شاندار یکہ، جسے اب سواری نہیں ملتی، کیونکہ مسافروں کو پتہ چل گیا ہے کہ افتخار مسلمان ہے یہاں وہ بھوتوں والا گھر ہے جسمیں سلمہ نے ایک رات ستار کے روئیں روئیں پر اپنے ہونٹوں کا چراغ جلایا ۔ جہاں اس کے پیٹ میں ستار کا بچہ آیا ۔ ۔ اور جہاں وہ پیڑ ہے جس کی چھاؤں میں بیٹھ کر چکوڈں کی بستی نے داروغہ جی کو بتایا کہ چوری بچن ہی نے کی ہے ۔ بچن جو چور نہیں تھا، ہندو تھا ۔

پہلے اس بستی اور پاس والے شہر میں لوگ رہا کرتے تھے ۔ پھر وہی لوگ نہیں رہ گئے ۔ ہندو اور مسلمان ہو گئے اور ہر چیز اسی ترازو میں تولی جانے لگی ۔ ظاہر ہے کہ جب ترازو ہی سیدھی ہوئی نہیں ہو گی تو، تول میں اونچ نیچ ضرور ہو گی ۔

ستار نے دو بیڑیاں جلا کر ایک رتن کی طرف بڑھائی ۔ رتن نے انکار کر دیا تو ستار نے حیرت سے پوچھا ۔

"کیوں کب سے چھوڑ دی ؟

"ایسے ہی" ۔

"ارے پی یار"

"نہیں سالی تندرستی خراب کرتی ہے" ۔ (ص ۳۷)

دکھ کی بات یا سچائی یہ ہے کہ اب رتن کی دوکان بہت بدل گئی ہے ۔ سینما کے پوسٹروں کی جگہ دلی میں چھپے وہ کلنڈر لٹک رہے تھے جن میں مہارانا پرتاپ، بندا بیراگی، اور شیواجی وغیرہ کی تصویریں تھیں ۔ اب رتن اور ستار دوست نہیں تھے رتن ہندو ہو گیا تھا اور ستار مسلمان ۔ رتن نے بیڑی پینا نہیں چھوڑا تھا ۔ وہ ایک مسلمان کی جلائی ہوئی بیڑی اب پی نہیں سکتا تھا ۔ یہ کیسی بھیانک تبدیلی ہے ۔

بستی کی دیواریں وہی ہیں، مکان وہی ہیں ۔ پر ان پر اشتہار نئے ہیں ۔ مکانوں پر لہراتے ہوئے جھنڈے نئے ہیں گھروں میں ٹنگنے والے کلنڈر نئے ہیں اور لگتا ہے جیسے یہ اشتہار ہی سب کچھ ہیں، یہ کلنڈر ہی سب کچھ ہیں اور آدمی جیسے، کچھ نہیں رہ گیا تھا ۔ وہ دن تھے ان آدمیوں کے جنھیں کسی اللہ نے خلق نہیں کیا تھا، جو چند نعروں، چند پوسٹروں اور کلنڈروں کی نسل کے لوگوں کا زمانہ تھا ۔ پہچانیں گم ہو گئی تھیں اور ایک باشعور فنکار کی طرح کملیشور نے اس المیہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ کیا اور یہ دیکھا کہ :۔

دکانیں اس طرح کھلتی تھیں ۔ شہر کا کاروبار اسی طرح چلتا تھا ۔ اسی طرح اناج منڈیوں میں گاڑیاں آتی تھیں گھروں میں "کتھائیں" اور "میلاد شریف" ہوتے تھے ۔ پر کچھ ایسا تھا جو ٹوٹ رہا تھا جسے بیان نہیں کیا جا سکتا تھا (ص ۴۶)

اہم بات یہ نہیں ہے کہ کملیشور سے کہاں کہاں اور کتنی بار حقیقت نگاری میں چوک ہوئی ۔ یہ چوک اس ناول میں ایک سے زیادہ جگہوں پر ہوئی ہیں ۔ پر یہ ناول تفصیلات کی کھتونی نہیں ہے ۔ خارجی تبدیلیوں کے بیان میں کملیشور کئی جگہ چوکے ہیں پر روح کے سناٹے کی تکلیف میں ان سے کہیں غلطی ہوئی ہے اور اس بیدرد سناٹے کی علامت ہے نصیبن جو ایک بوڑھی چٹان کی طرح نفرت کے اس طوفان کو جھیل گئی، جیتی رہی اور مسافروں کے لوٹ آنے کا انتظار کرتی رہی ۔ یہ بوڑھی نصیبن وقت ہے جو اس بستی میں

ٹھہر گیا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ وقت جس کے ساتھ ٹھہرنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دراصل کہیں سے چلا جانا چاہے تو نہیں جا سکتا۔ وقت ہندو نہیں ہے کہ لاہور سے دلی آجائیگا، وقت مسلمان بھی نہیں کہ بیلی بھیت سے کراچی چلا جائیگا۔ اسی لئے جب رات کے اندھیرے میں سب چلے گئے تو چکوؤں کی اس بستی میں نصیبن وقت کے ساتھ اکیلی رہ گئی اور راہ دیکھتی رہی۔

وہ سات آٹھ آدمی ادھر ہی آرہے تھے ... پر دل کا شک سر اٹھا کر بولا — "اب کون ادھر آئیگا اور کیوں آئیگا وہ راہرو ہونگے، اپنے راستے چلے جائینگے ...

" یہ سوچ کر اس کے من کی اداسی اور بڑھ گئی، سونا پن بھی گہرا ہوگیا۔ سڑک پر وہ لوگ چلتی پھرتی لاٹوں کی طرح بڑھتے چلے آرہے تھے ... نصیبن دھیرے سے بولی۔ "سائیں! آگئے ہیں یہ لوگ ادھر ہی آرہے ہیں۔ راستہ بھول گئے ہونگے۔ یہاں روشنی دیکھ کر پوچھنے آرہے ہیں شاید" — کہتے ہوئے وہ بھی ادھر ہی تکنے لگی۔

اور دو تین منٹ بعد ہی وہ آٹھوں آدمی وہاں، نصیبن کے پاس آکر رک گئے۔ سبھی جوان تھے۔ سب کے بدن لوہے کی طرح ٹھوس اور بھرے ہوئے تھے۔

" ادھر کوئی مسجد ہے؟ " ایک نے پوچھا۔

" ہاں ہے" — کہتے ہوئے نصیبن اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور پوچھا — " کہاں سے آئے ہو؟ " —

" ادھر ہمارے مکان تھے ... ہم یہاں پاتال توڑ کنواں کے محکمے میں مزدوری کرنے آئے ہیں ... ادھر ہمارے پرانے ...

نصیبن کی آنکھوں میں چمک بھر گئی، اور اس کا بدن خوشی سے تھرتھرانے لگا۔ " ادھر تمھارے گھر تھے۔ ارے تم بشیر تو نہیں ہو؟ — (ص ۱۱۲-۱۱۵)

وہ بشیر ہی نکلا۔

یہ جو دائرہ مکمل ہوتا ہے، یہی ہمارا خواب ہے۔ ہم سب مسافروں کے لوٹنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ انتظار وہاں بھی ہو رہا ہوگا۔

میں نے کہانی کی بات جان بوجھ کے نہیں چھیڑی، کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ اس چھوٹے سے ناول کے صفحوں کا سفر تنہا کریں۔ کملیشور آپ کو چکوؤں کی اس بستی کے کسی گھر کے اندر نہیں لے جائینگے۔ شاید اس لئے کہ وہاں پردہ دار عورتیں رہتی ہیں۔ یا شاید اس لئے کہ کملیشور نے ان گھروں کو خود بھی کبھی اندر سے نہیں دیکھا ہے۔ اگر کملیشور دروازہ کھٹکھٹا کر کسی گھر کے اندر چلے گئے ہوتے تو اس ناول کی معنویت بڑھ گئی ہوتی اور درد کی چاشنی بھی تیز ہوگئی ہوتی۔ لیکن کسی ان دیکھے درد کو بیان کرنا بھی حوصلے کا کام ہے اور کملیشور نے یہ کام بڑے حوصلے سے کیا ہے۔

کملیشور

کتنے پاکستان

کتنا طویل سفر ہے اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ پاکستان بار بار آڑے کیوں آ رہا ہے۔ سلیمہ، میں نے کچھ بگاڑا تو نہیں تیرا، تب تو نے کیوں، اپنے کو بگاڑ لیا؟ تو ہنستی ہے۔ پر میں جانتا ہوں، تیری اس ہنسی میں زہر بجھے تیر ہیں۔ یہ مہندی کے پھول نہیں ہیں سلیمہ جو صرف ہوا کے ساتھ مہکتے ہیں۔ ہوا ہی آتی ہے اس ہوا کو سوچ کر۔ تو نے ہی تو کہا تھا کہ مجھے ہوا لگ گئی ہے، یاد ہے ان دنوں کی؟

تمہیں سب یاد ہو گا، عورتیں کچھ نہیں بھولتیں۔ صرف ظاہر کرتی ہیں جیسے سب کچھ بھول گئی ہوں وہ ایسا نہ کریں تو جینا مشکل ہو جائے۔ تمہیں عورت یا سلیمہ کہتے ہوئے بھی مجھے اٹپٹا لگتا ہے، بنّو کہنے کو دل چاہتا ہے۔ وہی بنّو، جو مہندی کے پھول لاتی تھی، ان سالنوں کی یاد ہے بنّو، جن میں تمہارے منہ کی مہک اور مہندی کے پھولوں کی خوشبو رہتی تھی۔ جب میری ناک کے پاس مہندی کے پھول لا کر تو اپنے منہ سے انہیں پھونکا کرتی تھی کہ مہک اڑنے لگے، اور کہا کرتی تھی "ان کی مہک تب ہی اڑتی ہے جب ہوا چلتی ہے" سچ پوچھو تو مجھے وہی ہوا لگ گئی وہی ہوا، بنو! پر اب تمہیں بنو کہتے من جھجکتا ہے۔ پتہ نہیں خود تمہیں یہ نام برداشت ہو گا یا نہیں۔ او مااب ان کا نام میں رکھا بھی گیا ہے۔

میرا دل چاہتا تھا کہ اس رات میں سیڑھیوں سے پھر اوپر چڑھ جاؤں اور تجھ سے کچھ پوچھوں، کچھ بلعد لاؤں پر ایسا کیا تھا جو تمہیں یاد نہیں ہو گا۔

اُف! معلوم نہیں کتنے پاکستان بن گئے ایک پاکستان بننے کے ساتھ کہاں کہاں، کیسے کیسے! سب باتیں الجھ کر رہ گئیں، سلجھا تو کچھ بھی نہیں۔

وہ رات بھی ویسی ہی تھی، پتہ نہیں پچھواڑے کا بیبل بولا تھا یا بدرو میاں، "قادر میاں، بن گیا سالا پاکستان ——— بھیو، اب بن گیا پورا پاکستان......"!

کتنی ڈراؤنی تھی وہ چاندنی رات...... نیچے آنگن میں تم ہی پڑی تھیں بنّو! چاندنی کے دودھ میں نہائی اور پچھواڑے پیپل کھڑ کھڑا رہا تھا اور بدرو میاں کی آواز جیسے پاتال سے آ رہی تھی۔ "قادر میاں...... بن گیا سالا پاکستان......"

دوست! اس طویل سفر کے تین پڑاؤ ہیں، پہلا جب مجھے بنّو کے مہندی کے پھولوں کی ہوا لگ گئی تھی دوسرا جب اس چاندنی رات میں میں نے پہلی بار بنّو کو ننگی دیکھا تھا، اور تیسرا تب، جب اس چوکھٹ پر

بنّو ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور پوچھ رہی تھی! اور ہے کوئی؟

ہاں تھا۔ کوئی اور بھی تھا! ...... کوئی.......

بنّو ایک تھرتھراتے اندھیرے کے بعد ہنسی کیوں تھی؟ میں نے کیا بگاڑا تھا تیرا! تو کس سے بدلہ لے رہی تھی؟ مجھ سے؟ منیر سے یا پاکستان سے؟ کس کو ذلیل کر رہی تھی، مجھے، خود کو، منیر کو، یا........

یہ پاکستان ہمارے بیچ بار بار آجاتا ہے۔ یہ ہمارے یا تمہارے لئے کوئی ملک نہیں ہے۔ ایک درد ناک سچائی کا نام ہے۔ وہ چیز جو ہمیں زیادہ دور کرتی ہے جو ہمارے باتوں کی بیچ ایک سنّاٹے کی طرح آجاتی ہے جو تمہارے گھر والوں، رشتے داروں یا مذہب والوں کی جانب دوسروں کے احساس کی گہرائی کو اتھلا کر دیتا ہے تب اُن دوسروں کو اُن کے دکھ اتنے بڑے نہیں لگتے جتنے وہ ہوتے ہیں، ان کی خوشی اتنی خوشی نہیں لگتی جتنی وہ ہوتی ہے کہیں کچھ کم ہو جاتا ہے، احساس کی کچھ ایسی ہی کمی کا نام شاید پاکستان ہے یعنی مہندی کے پھول ہوں، پر ہوا نہ چلے یا کوئی پھونک مار کر ان میں مہک نہ پیدا نہ کرے جیسے پھول ہوں، رنگ نہ ہو، رنگ ہو، مہک نہ ہو، مہک ہو، ہوا نہ ہو، یعنی احساس کی رکی ہوئی ہوا ہی پاکستان ہو۔

سنو، اگر ایسا نہ ہوتا تو مجھے چنار چھوڑ کے دردیش کیوں ملنا پڑتا؟ وہی چنار، جہاں مہندی پھولتی تھی، مشن اسکول کے احاطے کے پاس...... جہاں ہم گنگا گھاٹ کے پیپل تلے آتے تھے اور راجہ بھرتری کے قلعہ کی ٹوٹی دیوار پر بیٹھ املیاں کھایا کرتے تھے۔

وہ شام مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جب کیا ڈنڈ رضامن علی نے آکر دادا سے کہا تھا "اور تو کچھ نہیں ہے، پر لوگ مانیں گے نہیں۔ منگل کو کچھ دنوں کے لئے کہیں باہر بھیج دیجئے، یہاں رہے گا تو بنّو والی بات بار بار اکھڑے گی۔ شادی تو نہیں ہو پائے گی، دنگا ہو جائے گا۔"

تم نہیں سوچ سکتے ہو یہ سنکر مجھ پر کیا بیتی تھی، چنار چھوڑ دوں۔ پھر چھوٹ ہی گیا........

کیسی ہوتی تھیں چنار کی راتیں...... گنگا کا پانی، کاشی جاتی کشتیاں، بھرتری کے قلعے کی ویران دیواریں اور گنگا کنارے چنگی کی وہ کوٹھری جس کے چھپر میں بیٹھ کر میں ملّنھ کے آنے جانے کا اندازہ لگایا کرتا تھا۔ نالیوں کی دھار سے بھیگی زمین والی وہ گلیاں، جن سے بنّو بار بار گنگا کنارے آنے کی کوشش کرتی تھی، اور آ نہیں پاتی تھی۔ انتظار...... انتظار....

ہمیں تو یہ پتہ نہیں تھا کہ کب ہم بڑے مان لئے گئے تھے۔ کب ہمارا قدرتی ملنا ایک بڑی بڑی باتوں کا باعث بن گیا تھا۔

بستی میں تناؤ پیدا ہو جائے گا۔ اس کا اندازہ تک نہیں تھا یہ کیسے اور کیوں ہوا بنّو۔ پر تمہیں بھی کیا معلوم ہوگا۔ پھر ہم نے بات ہی کہاں کی۔

تینوں پڑاؤ ایسے ہی گذر گئے —— کہیں رک کر ہم بات بھی نہیں کر پائے نہ تب، جب مہندی کے پھولوں کو ہوا لگی تھی نہ تب جب اس چاندنی رات میں تجھے پہلی بار ننگا دیکھا تھا، اور نہ تب، جب چوکھٹ پر ہاتھ رکھے تم پوچھ رہی تھیں اور ہے کوئی!

مہندی کے پھول: چنار، میرا گھر، تمہارا گھر، میرے گھر سے گذرتی تھی وہ اینٹوں والی گلی جو شہر سے بازار کو جاتی تھی، جو گنگا کے کنارے چل کر بھرتری مہاراج کے قلعے کے بڑے پھاٹک

تک پہنچی تھی۔

جہاں سے سڑک قلعے کی جانب مڑی تھی، وہیں تھی چنگی۔ گنگا گھاٹ پر لگنے والی کشتیوں سے اترتے سامان پر محصول لگتا تھا۔ مچھلی، کیکڑے، جھینگے آتے تھے، موسم میں اس پار سے آم بھی آتے ہیں چنگی والے منشی جی دن بھر رام نام جپتے اور محصول کے عوض مچھلی لیتے تھے۔ وہ دن میں دس بار بیل تلے کے مہادیو کو گنگا جل چڑھاتے تھے اور چھپر میں بیٹھ کر تین چار لڑکوں کو پڑھایا کرتے تھے۔

چنگی کے قریب کہیں جلیبا، موڑ تھا۔ بائیں طرف کٹہرے کی سڑک قلعہ کو جاتی تھی۔ بائیں طرف سے آکر جو سڑک ملتی تھی وہ کچی تھی۔ اُس کچی سڑک پر نالیوں نے راستے بنالئے تھے، جن کا پانی گنگا گھاٹ کی ریت میں خشک ہو جاتا تھا۔ اسی کچی سڑک پر کئی نالیاں) ساتھ ساتھ اترتی تھیں، بہتے پانی سے کٹی پھٹی گلیاں، یہی گلیاں بنّو کی گلیاں تھیں۔،،

جہاں بنو کی گلیاں ختم ہوتی تھیں وہاں سے پتھریلی سڑک مشن اسکول تک جاتی تھی، جو انگریزوں کی پرانی کوٹھی تھی، یہیں پر تھی ہندی کی پاٹھ اور دھتوروں کا میدان!

اس دھتورے کے میدان نے مجھے برباد کر دیا تھا۔ جب بستی میں مجھے اور بنّو کو لے کر تنازعہ پیدا ہو گیا تھا تو ایک بار بنو جوں توں چنگی تک آئی اور بولی "مولوی صاحب کے ساتھ والے اگر زیادہ بدمعاشی کریں گے تو میں جنگل میں دھتورے کھا کر سو جاؤں گی۔ تم شہر چھوڑ کر مت جانا۔ تم نے شہر چھوڑا تو گنگا جی یہیں ہیں۔ سوچ لینا......"

زیادہ بات نہیں ہو پائی تھی وہ چلی گئی تھی۔ میں کچھ بتا بھی نہیں پایا تھا کہ میرے گھر میں کیا کہرام برپا ہے۔ کس طرح روز بازار میں دادا جی کو وہ لوگ دھمکیاں دے رہے تھے جن کو وہ پہچانتے تک نہیں تھے۔ سب کو ڈر تھا کہ کہیں کسی دن مجھے قتل نہ کر دیا جائے، یا رات بے رات مسلمان گھر میں نہ گھس پڑیں۔

پاکستان تو بن چکا تھا بنّو! اس کے بعد بھی تمہارے ابا بھرتری نامہ لکھ رہے تھے۔

"ناتا جی پچھلے تپ سے نرپ بنا، اب نرپ سے بنوں فقیر
آخر وقت وفات کے ہرہ ہوں گے دل گیر
تیرے اپنی خلق سپرد کری ان کے سر سر گردن کیا
برباد سب سلطنت کری بن جوگی ملک ویران کیا

لوگ کہتے تھے کہ ڈرل ماسٹر کا دماغ بگڑ گیا ہے جو بھرتری نامہ لکھ رہے ہیں۔ یہ ترک نہیں ہے، یہیں کا کوئی کاچھی، کہار ہے۔ تبھی ہمیں پتہ چلا تھا کہ مسلمان وہی ہے جو ایرانی تورانی ہے، یہاں کے مسلمان بھی مسلمان نہیں رہے۔ ڈرل ماسٹر کو سب نے الگ سا کر دیا تھا پر انہی کی بنو کی بات لے کر سب کھڑے ہو گئے تھے، جیسے وہ سب اس کے بڑے سرپرست تھے۔

تمہیں نہیں معلوم، مگر مجھے معلوم ہے بنو! ڈرل ماسٹر صاحب نے کچھ بھی نہیں کہا تھا، سوائے اس کے کہ جو مولوی صاحب اور باقی لوگ ٹھیک سمجھیں، وہی ٹھیک ہو گا وہ خود سوچ ہی نہیں پا رہے تھے ایک دفعہ چھپ کر آئے تھے دادا جی کے پاس، اور رو پڑے تھے۔ اس دن کے بعد وہ بھرتری نامہ تو لکھتے رہے تھے ہر کسی کو سنانے کی ہمت نہیں کرتے تھے۔ وہ لکھتے رہے اس کا پتہ مجھے اس وقت چلا تھا جب گھر والوں کی گھبراہٹ اور خود کچھ نہ سمجھ پانے کی وجہ سے میں شہر چھوڑ رہا تھا اور چنگی والے منشی جی نے مجھے چپ چاپ وداع کرتے ہوئے

ایک پرزہ میرے پسینے سے تر ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

وہ رات بہت ڈراؤنی تھی، بستی پر موت منڈلا رہی تھی، سب دہشت کے مارے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں کب کیا ہو جائے، یکایک یا علی یا علی کی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ اور خون خرابہ ہو جائے، گنگا بھی اس روز چڑھی ہوئی تھی، کنارے کا پیپل بھی بے چین تھا۔ بہت تیز ہوا تھی، قلعہ سائیں سائیں کر رہا تھا، اور پانچ سات ہندوؤں کے ساتھ —— ہاں کہنا پڑتا ہے بنو، ہندوؤں کے ساتھ دادا مجھے اسٹیشن چھوڑنے آ رہے تھے تاکہ میں جیوں جاگوں کہیں بھی پردیس میں رہ کر۔

پہلے سوچا گیا کہ ماموں کے یہاں جون پور چلا جاؤں، مگر پھر معلوم نہیں کیسے یہ طے ہوا کہ بمبئی چلا جاؤں اور وہاں ریلوے ورکس شاپ کرلا میں کام کر رہے اپنے خالو کے پاس رہوں —— وہیں ملازمت تلاش کر لوں۔

کیسی تھی وہ رات بنو! اور کتنا بے عزت ہو کر میں نکل رہا تھا؟ ذہن میں ہزاروں ہتھوڑے بج رہے تھے۔ ایک دل کرتا تھا کہ لوٹ پڑوں۔ گھر سے گنڈاسا اٹھاؤں اور تمہارے ان مسلمانوں پر ٹوٹ پڑوں، خون کی ہولی کھیل کر تمہیں بتاؤں، اور نہ جیت پاؤں تو تمہیں بھی مار کر گنگا میں ڈوب جاؤں۔

لیکن شرمندگی اور خوف بھی تھا اور یہ خیال بھی کہ ڈرل ماسٹر صاحب نے تو کچھ بھی نہیں کہا ہے، مخالفت بھی نہیں کی ہے، سوائے اس کے کہ وہ خاموش رہ گئے ہیں۔ ان کو پھر تعزیت نامہ بھی لکھنا ہے۔ اب لگتا ہے کہ وہ پھر تعزیت نامہ لکھ رہے ہوتے تو شاید اتنی مخالفت نہ ہوتی۔

شہر کو سانپ سونگھ گیا تھا، دادا کو بتا دیا گیا تھا کہ اگلی صبح میری شکل نہ دکھائی دے۔ آدھی رات تک صلاح مشورہ ہوتا رہا۔ پھر آخری گاڑی رہ گئی تھی۔ پارسل جو مغل سرائے جاتی تھی۔

ہاں تو پانچ سات ہندوؤں کے ساتھ مجھے اسٹیشن پہنچایا گیا۔ ہم بازار والی سڑک سے بھی نہیں آئے تھے۔ قلعے والے سنسان راستے سے اسٹیشن کی سڑک پکڑی تھی۔ منشی جی لالٹین لئے پکی سڑک تک آئے تھے، اور تبھی وہ پرزہ انہوں نے میری تر بتر ہتھیلی میں تھما دیا تھا۔ وہاں تو روشنی تھی نہیں۔ اسٹیشن پر سب تھے۔ پارسل ڈھائی بجے رات کو چھوٹتی تھی دادا جی کتنے پریشان اور بے حال تھے۔ سب بہت ڈرے ہوئے، بے عزت، شاید اسی لئے بہت خونخوار بھی ہو رہے تھے لگ رہا تھا کہ مجھے شہر سے ہٹا دینے کے بعد دنگا ضرور ہوگا۔ میں نے سوچا تھا خدا جانے اب یہ لوٹ کر جانے والے ہندو دنگا کریں گے۔ ڈھلتی رات میں یہ سوتے ہوئے مسلمانوں کو چیر پھاڑ ڈالیں گے۔ ہندو کا ہندو ہونا بھی کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے بنو —— یہ ہوتے ہی انسان کی کوئی انمول چیز گم ہو جاتی ہے۔ بڑی تکلیف دہ تھی وہ جدائی۔ اتری رات کی ہوا میں خنکی تھی اور اسٹیشن کا پتھر کا فرش کافی ٹھنڈا تھا۔ سامنے وندھیا کی پہاڑیاں اور تاڑ کے پیڑ چپ چاپ کھڑے تھے۔

اب تم کو کیا بتاؤں...... کیا کبھی سوچا تھا کہ اس طرح میرا گھر چھوٹ جائے گا؟ اپنے شہر سے بے عزت ہو کر کوئی کہیں بھی چین نہیں پاتا۔ مجھے وہ گلیاں یاد آ رہی تھیں جن سے بنو آنے کی کوشش کرتی تھی۔ میں چنگی میں بیٹھ کر کتنا انتظار کرتا تھا، آخر ہار کے ڈرتے ڈرتے ان گلیوں کی جانب جاتا تھا اور یہاں مہندی کے پھول پڑے دکھائی دیتے تھے سمجھ لیتا تھا کہ بنو یہاں تک آ پائی ہے آگے نہیں بڑھ پائی، کسی نے دیکھ لیا ہوگا

ٹوکا ہوگا یا روک لیا ہوگا۔

سچ کہتا ہوں تم سے، اسی دن سے ایک پاکستان میرے سینے میں شمشیر کی طرح اتر آیا تھا لوگوں کے نام بدلے یا ادھورے رہ گئے تھے۔ بستی میں ہوا کا بہنا بند ہو گیا تھا اور لگا تھا کہ بنو گھر گئی ہے۔ شرم، ڈر، غصہ، آنسو، خون، بدحواسی، پاگل پن، پیار، کیا کیا اُبل کر دہک رہا تھا میرے اندر۔ سچ کہوں تو یہ سب ہونے کے بعد اگر بنو مل بھی جاتی تو کچھ نہیں ہوتا۔ جو ہونا تھا۔ ہو چکا تھا۔

پارسل گاڑی میں بیٹھ کر وہ پرزہ پڑھا تھا۔ تمہارے پاس بھی وہی کہنے کو تھا جو ماسٹر صاحب کے پاس تھا۔ اسی پرزے سے معلوم ہوا کہ ماسٹر صاحب پھر تربی نامہ لکھتے جا رہے ہیں،

"کیوں بنتا درویش، چھوڑ لاؤ لشکر فوج رسالے کو

کیوں بن کھنڈ میں رہتا ہے سچ گر نرگس و گل لالے کو

کیوں بھگوا بھیس بناتا ہے تج اطلس شال دوشالے کو

کیوں در در الکھ جگاتا ہے تج کامروپ ڈھاکے بنگالے کو

کیوں ہوا سودائی، چھوڑ سب بادشاہی۔"

ہاں، سودائی ہی کہہ لو ——— اطلس، شال دوشالے اور نرگس گل لالہ، سب کچھ تو تھا۔ سچ مچ ——— نیم، آک، مہندی، اور دھتورے کے پھول کسی نرگس سے کم نہ تھے بنو؟ لیکن اس پاکستان کا ہم کیا کرتے؟

گاڑی چلی آئی اور میں سچ مچ درویش ہو گیا۔ پھر کبھی گھر لوٹنے کا موہ نہیں ہوا۔

میں جانتا تھا کہ ماسٹر صاحب کی سانس بھی چنار میں گھٹ رہی ہو گی، بنو کی سانسوں کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ بس اتنا لگتا تھا کہ اس نے گنگا میں ڈوب کر جان نہیں دی ہوگی۔ وہ ہوگی، کہیں ہوگی کسی کے ساتھ ہنستی، روتی، کلپتی، خوش ہوتی ہوگی۔ راتوں میں کسی کا بستر گرم کرتی ہوگی۔ بیوی کی طرح پوری ایمانداری سے منتیں مانتی ہوگی۔ مہندی رچاتی ہوگی۔ بچوں کا گوموت کرتی ہوگی، سکھی ہوگی، پچھتاتی ہوگی، سب بھول گئی ہوگی۔ جو نہیں بھول پائی ہوگی، اور کا ہوا چنتنا اس کا پاکستان بن گیا ہوگا، اسے ستانے کے لئے۔ ......

خیر، جو ہوا اچھا ہوا، سو ہو گیا ——— میں مغل سرائے سے الٰہ آباد آیا اور الٰہ آباد سے بمبئی۔ کرلا کی ریلوے ورکشاپ میں خالو نے کام دلا دیا، کچھ دن وہیں گذرے، پھر میں پونہ چلا گیا۔ اسپتال کی ایک فیکٹری میں جہاں لکڑی کے ہاتھ پاؤں بنتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اب کبھی چنار نام کی جگہ میں جی نہیں پائے گا۔ نہ میرا گھر، نہ تمہارا گھر، پھر یہ معلوم نہیں تھا کہ دادا اتنی دور چلے آئیں گے۔ اور ساتھ میں کئی گھروں کو لیتے آئیں گے۔

سچ پوچھو تو چنار میں رہ ہی کیا گیا تھا؟ جب پاکستان بن جاتا ہے تو آدمی آدھا رہ جاتا ہے، فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور آسمان کٹ پھٹ جاتا ہے، بادل خالی ہو جاتے ہیں اور ہوائیں نہیں چلتیں، وہ قید ہو جاتی ہیں۔

دادا کے خط سے معلوم ہوا تھا، کئی برس بعد کچھ گھر جولاہوں اور بڑھئیوں کے ساتھ لے کر وہ فضلوں گلیوں، آسمان، بادل اور ہوا کی تلاش میں نکل پڑے تھے اور بھیونڈی آگئے تھے، یہ نہیں معلوم تھا کہ بنّو کا گھر بھی ساتھ آیا تھا —— ڈرل ماسٹر کیا کرتے آکر؟ یہ میں نے بھی سوچا تھا، دادا کا آنا تو ٹھیک تھا۔ وہ سوتی کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ آٹھ مسلمان جولاہے اور دو گھر ہندو بڑھئیوں کو لے کر وہ بھیونڈی آگئے۔ معلوم نہیں شروع شروع میں انہیں کیا پریشانی ہوئی ہوگی۔

بنّو! تمہارے بارے میں مجھے تب پتہ چلا جب دادا ایک بار مجھ سے پونہ ملنے آئے، تب معمولی طرح سے انہوں نے بتایا تھا کہ ڈرل ماسٹر صاحب کا گھر بھی آیا ہے، انہیں بھیونڈی اسکول میں جگہ مل گئی ہے اور یہ بھی کہ انہوں نے بنّو کی شادی کر دی ہے، داماد وہیں ان کے ساتھ باجے محلے میں رہتا ہے۔ کرگھے چلاتا ہے، ریشم کا بڑھیا کاریگر ہے۔

جس طرح دادا نے یہ خبر دی تھی، اس سے لگ رہا تھا کہ وہ جان بوجھ کر اسے معمولی بنا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

لیکن مجھے نہیں معلوم تھا بنّو کہ باجے محلے میں دادا اور تمہارا گھر ایک ہی ہے، اور اوپر دادا رہتے ہیں اور تم لوگ نیچے باقی لوگ بنگال پورہ اور نئی بستی میں ہیں۔ شاید ماسٹر صاحب پچھلے پچھتاوے کو بھوگنے کے لیے ہی ایسا کر بیٹھے ہوں، دل تو بہت چاہا کہ جلد از جلد چل کر تم کو دیکھ آؤں، لیکن سچ پوچھو تو دل اکھڑا ہوا تھا، یہ سب سن کر اور بھی اکھڑ گیا تھا، کہ تم بھی وہیں ہو اور شادی شدہ ہو۔ پھر باتوں باتوں میں دادا جی نے کہا پھر اگر یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں بھیونڈی نہ آؤں تو بہتر ہے، کیوں کہ ان کو ماسٹر صاحب کا خیال تھا اور وہ جانتے تھے کہ ماسٹر صاحب نے کچھ نہیں کیا تھا اور دادا جی انہیں میری موجودگی سے دکھی یا ذلیل نہیں کرنا چاہتے تھے، کتنی عجیب کیفیت تھی یہ —— کیا یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ گھر ایسا ہی رہتا اور اس میں رہنے کو مجھے بھی جگہ ملتی۔

دل میں طرح طرح کے خیالات آتے تھے۔ دبا ہوا غصہ کہیں پھوٹ پڑا تو ......؟

اگر میرے اندر دبکا ہوا پاکستان پھٹ پڑا تو؟ اگر میں نے تمہارے آدمی کو تمہارے ساتھ نہ سونے دیا تو؟ اگر بھیونڈی سے اسے بھی میں اسی طرح نکال سکا جیسے کبھی میں نکالا گیا تھا تو؟ کسی رات میں برداشت نہ کر پایا اور تمہارے کمرے میں گھس پڑا تو؟

مجھے معلوم ہے دادا اور ماسٹر صاحب —— دونوں ایک دوسرے کو اپنے معصوم ہونے کا بھروسہ دے رہے تھے، لیکن میرے پاس کیا بھروسہ تھا؟ ان کا کیا بگڑا تھا —— بگڑا تو میرا تھا۔ میں تبھی سے ایک نقاب لگائے گھوم رہا تھا۔ ہاتھوں میں دستانے پہنے اور کمر میں خنجر دبائے۔

لیکن بنّو، بھیونڈی میں بھی دنگا ہو گیا۔ میری تمہاری وجہ سے نہیں، اسی احساس کی کمی کی وجہ سے۔ سنا تو مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ معلوم نہیں اب کیا ہوا ہو گا۔ پانچ برس قبل تو میں اس کی وجہ ہو سکتا تھا؟ اب تو میں وہاں نہیں تھا۔ گیا تک نہیں تھا اسی وجہ سے کہ تم دکھائی دو گی اور میں دنگا شروع کر دوں گا۔

لیکن تم مجھے دکھائی دیں تو اس حالت میں!

چاندنی رات اور بنّو :-

جب میں بھیونڈی پہنچا تو دنگا ختم ہوئے دس بارہ دن ہو چکے تھے، لیکن گھستے ہی بستی میں جگہ جگہ کالے چکتّے دکھائی پڑ رہے تھے۔ کچھ گھر، پھر ایک کالا میدان، پھر مکانوں گھروں کا ایک سہما ہوا جھنڈ اور اس کے بعد پھر ایک کالا میدان۔ اڑتی ہوئی خاک، آگ اور انگاروں کی مہک اب نہیں تھی یہ راکھ کی ایک الگ مہک ہوتی ہے بجھے ہوئے شعلے جیسی۔ کچھ تیز کھرندی جو نتھنوں سے ہو کر اندر تک کاٹ کرتی ہے۔

سنو، تم نے بھی تو اس مہک کو ضرور محسوس کیا ہوگا۔ ایسا کون ہے اس ملک میں جو راکھ کی مہک کو نہ پہچانتا ہو، جب میں ایس۔ ٹی۔ اسٹینڈ (بس اڈہ) پر اترا، شام ہو رہی تھی گشت سے جو دہشت ہوتی ہے ویسا کچھ نہیں تھا وہاں، جہاں پہ سینما کے پوسٹر لگے ہوئے ہیں دو تین پولیس والے بات کرتے کھڑے تھے۔ بسیں زیادہ تر خالی تھیں اور خاموش کھڑی تھیں۔ سنگم نیر۔ علی باغ۔ بھیوروارٹہ یا سنّر جانے والی بسوں کی تو بات ہی کیا، شیرڈی جانے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

بس اڈے کے ٹین تلے چار پانچ پولیس والے اور نظر آئے خانہ بدوشوں کی طرح چھوٹی سی گرہستی جمائے ہوئے اگر ان کی بندوقیں کنّے کے ڈھیر کی طرح ایک جگہ جمع نہ ہوتیں تو شاید یہ بھی نہیں معلوم پڑتا کہ وہ پولیس والے ہیں۔

دونوں سڑکیں خالی تھیں، ڈاک بنگلے میں جہاں کلکٹر ڈیرہ ڈالے پڑے تھے، کچھ لوگ چل پھر رہے تھے۔ تھانہ کلیان جانے والی ٹیکسیاں بھی نہیں تھیں۔

فسادات کے مارے علاقوں سے گزرنا کیسا لگتا ہے، شاید اس کا بھی اندازہ تمہیں ہو، مجھے زیادہ نہیں تھا۔ ایک خاص قسم کا سناٹا، ویران راستے اور صاف صاف دکھائی دینے والا خالی پن، کوئی دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا۔ ہے تو غور سے دیکھتا ہے، مگر بغیر انسانی رشتے کے یہ کیوں ہو جاتا ہے؟ احساس اتنا کیوں مر جاتا ہے؟ کیا بھروسہ اتنا زیادہ لوٹ جاتا ہے؟

اتنے چھوٹے سے قصبے میں بانجے محلے کا پتہ پوچھنا بھی دشوار ہو گیا۔ خیر جیسے تیسے محلہ ملا، گھر بھی ملا، لیکن اس میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کیا اتنے سناٹے میں کوئی انسان رہ سکتا ہے؟

مجھے معلوم تھا بنو، ڈرل ماسٹر صاحب، تمہارا شوہر منیر، سب یہیں ہوں گے، میرے گھر والے بھی ہوں گے۔ لیکن اوپر کے حصے میں اندھیرا تھا، چاندنی رات نہ ہوتی تو میں گھبرا ہی جاتا۔

سچ مچ، ایک لمحے کے لئے لگا کہ اگر میں نے چنار نہ چھوڑ دیا ہوتا تو اس کی بھی یہی حالت ہوئی ہوتی پھر بنو تمہارا خیال آیا کہ تمہارا سامنا کیسے کروں گا۔ سارا کھولتا ہوا خون ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ میں جیسے چنار کی انہی گلیوں میں آ گیا تھا۔ اسی عمر کے ساتھ۔

گھر کا دروازہ کھلا تھا میں نے آہستہ سے اندر قدم رکھا۔ ایک آنگن۔ آنگن کے ایک کونے میں دو ایک گدڑے پڑے تھے۔ ان ہی کے قریب مدھم سرمئی پرچھائیاں تھیں ایک عورت کمر تک عریاں تھی، دوسری اسی کے پاس بیٹھی بار بار اس کے گلے تک ہاتھ لے جاتی تھی اور عریاں چھاتیوں سے کمر تک لاتی تھی۔ معلوم نہیں وہ کیا کر رہی تھی لیکن ایک عورت کی ننگی پیٹھ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دونوں عورتیں وہاں بیٹھی کیا کر رہی تھیں، میں سمجھ نہیں پایا۔ سہم کر باہر آ گیا۔

باہر کھڑا ہی تھا کہ ڈرل ماسٹر صاحب دکھائی دیئے۔ انہوں نے ایک منٹ بعد ہی پہچان لیا۔

لیکن انہوں نے آؤ بھگت نہیں کی۔ وہ سوچ ہی نہیں پائے کہ مجھ سے کس طرح ملیں۔ کس برس کے کس دن سے بات شروع کریں، کس رشتے سے کریں۔ کہاں سے کریں، وہ کچھ کہیں، اس سے قبل ہی میں نے انہیں سنبھال لیا۔ جیسے کسی اجنبی نے پوچھا ہو، ویسے ہی دادا جی کے بارے میں پوچھ لیا۔

"وہ تو چنار چلے گئے۔" "پرسوں۔" ماسٹر صاحب نے کہا۔

"پرسوں......" میں اور کیا کہتا۔

"ہاں، رکے نہیں۔ بہت سے لوگ واپس چلے گئے ہیں۔" وہ بولے۔

اور میں اسی لمحے سمجھ گیا کہ سب باتوں کے باوجود دادا جی شاید پھر بھی چنار لوٹ سکتے تھے، لیکن ماسٹر صاحب نہیں۔ ماسٹر صاحب کے چنار چھوڑنے کا سبب وہ نہیں تھا جو دادا جی کا یا میرا رہا ہوگا۔ ان کا یہاں چلے آنا وقت کا دیا ہوا بن باس تھا، اور وقت کے دیئے ہوئے بن باس سے لوٹ سکنا آسان نہیں ہوتا۔ مجھے تو صرف کچھ لوگوں نے بن باس دیا تھا۔

گھر والے وہاں نہیں تھے، اس لئے کچھ کہہ بھی نہیں پا رہا تھا۔ فساد سے گھرا شہر، کہاں پناہ مل سکتی تھی؟ ماسٹر صاحب اپنے گھر ٹھہرا لیں یہ ہو نہیں سکتا تھا۔ وہاں بہو ہوگی۔ اجنبی کی طرح وہ مجھے وہیں چھوڑ کے گھر میں گھس جائیں، اتنا پانی نہیں مرا تھا۔

"سب سامان وغیرہ بھی لے گئے ہیں"؟ میں نے آگے پوچھا۔

"نہیں، زیادہ سامان تو نہیں ہے۔" وہ بولے

"تالہ بند کر گئے ہیں"؟

"ہاں، ایک چابی میرے پاس ہے۔" انہوں نے مجھے جھجکتے ہوئے سہارا دیا۔

"میں ایک دن رکوں گا، ویسے بھی کل شام چلا جانا ہے۔" میں نے خواہ مخواہ کہا، کیوں کہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ اجنبی بستی میں رات گئے میں کہاں جا سکتا تھا۔

مجھے چھوڑ کے وہ گھر میں گھس گئے۔ ایک منٹ بعد وہ ایک موم بتی اور چابی لے کر آئے اور بغل کے زینے سے اوپر چڑھا لے گئے۔ تالا کھول کر مجھے پکڑاتے ہوئے بولے۔ "کھانا کھایا ہے"؟

"ہاں"! میں نے کہا اور اندر چلا گیا۔

"کچھ ضرورت ہو تو بتا دینا۔" وہ بولے اور نیچے چلے گئے۔ پھر مجھے نامہ کا شاعر کافی سمجھدار تھا۔ بتا دینا یہ نہیں کہا کہ مانگ لینا۔

بہو کتنی عجیب و غریب تھی وہ رات۔ بہو کو معلوم نہیں تھا کہ اوپر میں ہی ہوں۔ ماسٹر صاحب نے بتلایا یا نہیں بتایا۔ کیا معلوم، کچھ بھی کہہ دیا ہوگا۔ صبح صبح پولیس نہ آتی تو مجھے زندگی بھر معلوم نہ ہوتا کہ رات چھت پر منڈلانے والا سایہ کون تھا۔

چاروں طرف سناٹا سناٹا

رات چاندنی تھی، ہوا بند تھی۔ میں سانس لینے یا شاید بہو کو دیکھ سکنے کے لئے کھلی چھت پر کھاٹ ڈال کر لیٹ گیا تھا۔ کچھ دیر آہٹ لیتا رہا، شاید کوئی آہٹ تمہاری ہو بہو! لیکن پھر دل ڈوب گیا۔ خواہ کتنی

گرمی ہو، لیکن عورت کو تو آدمی کے ساتھ ہی لیٹنا پڑتا ہے۔

پچھواڑے والا بیل چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔ میں نے کھاٹ ایسی جگہ ڈال لی تھی جہاں سے آنگن میں دیکھ سکوں۔ لیکن جو کچھ دیکھا وہ بہت بھیانک تھا۔

دو چار پائیاں آنگن میں پڑی تھیں، ایک پر امّی تھیں اور دوسری پر بنّو۔ کتنا عجیب معلوم ہوا تھا بنّو کو لیٹا دیکھ کر......

چاندنی برس رہی تھی اور بنّو اپنا بلاؤز کھولے، دمعوتی کمر تک سرکائے عریاں پڑی تھی۔ اس کی عریاں چھاتیاں پانی سے بھرے غبارے کی طرح مچل رہی تھیں۔ وہ نیم جان مچھلی کی طرح آہستہ آہستہ تڑپ رہی تھی۔

"اوئی اللہ"! یہ بنّو کی آواز تھی۔

"سو جا، سو جا" امّی بولی تھیں۔

یہ پھٹے جا رہے ہیں" بنّو نے کہا تھا، اور اپنی دونوں چھاتیاں کس کر دبا لی تھیں۔ جیسے انہیں نچوڑ رہی ہو۔

امّی اٹھ کر بیٹھ گئیں، لاؤ میں سونت دوں، کہتے ہوئے انہوں نے بنّو کی بھری چھاتیوں کو سونتنا شروع کر دیا تھا۔ دودھ کی چھوٹی چھوٹی پھواریں بنّو کی چھاتیوں سے گر رہی تھیں۔ وہ ہلکے ہلکے کراہتی سسکتی جا رہی تھی۔ دودھ کی ٹوٹتی پھوار، جیسے عطر کے فوارے میں کچھ اٹک گیا ہو۔ پھر دس بیس بوندیں یکایک تیزی سے ٹپک پڑتی تھیں۔ دو چار بوندیں اس کے پیٹ کی سلوٹوں میں سما کر پارے کی طرح چمکتی تھیں۔ اس کے ناف میں پھر ادھ بڑے موتی کی طرح جگمگا رہا تھا۔

امّی اس کی چھاتیوں کا دودھ اپنی اوڑھنی کے کونے سے سکھاتیں اور چار چھ بار کے بعد وہیں کنارے کی نالی میں اوڑھنی نچوڑ دیتی تھیں۔ مٹیالی نالی میں پیلے دودھ کا پتلا سا سانپ کچھ دور سرک کر کہیں گم ہو جاتا تھا۔

آہ بنّو! یہ میں نے کیا دیکھا تھا۔ مجھ پر دہشت کے مارے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

کئی رات تک میں چھت پر ٹہلتا رہا۔ جب نیچے سکون ہو گیا اور میں نے دیکھ لیا کہ بنّو دھوتی کا پلّو چھاتیوں پر ڈال کر لیٹ گئی ہے۔ تب میں بھی لیٹ پایا۔ یہ کیسا منظر تھا۔ آسمان میں جگہ جگہ دودھ بھری چھاتیاں لٹکی ہوئی تھیں، ادھر ادھر۔ ......

آنکھ لگی ہی تھی کہ یکایک پچھواڑے میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ کوئی رو رہا تھا، اور ناک پونچھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "قادر میاں، بن گیا سالا پاکستان ...... کھیتن، اب بن گیا پورا پاکستان ......" پھر رونا رک گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہی آواز پھر آئی تھی ——— " قادر میاں، اب یہیں احرام باندھ لیں گے۔ اور تسبیح پھیریں گے۔ اپنا تو حج ہو گیا، سمجھے قادر میاں"

اگر پچھواڑے بیل نہ ہوتا تو شاید پاتال سے آتی یہ آواز سن کر میں بھاگ جاتا۔ لیکن اب تو کھلی آنکھوں کو طرح طرح کے نظارے دکھائی دے رہے تھے۔ آسمان سے گرتا خون، تاریکی میں بھاگتی لاشیں، بازار میں کھڑے ہوئے دھڑ اور کٹی گردنوں سے پھوٹتے ہوئے خون کے فوارے، شعلوں میں ننگے ناچتے ہوئے لوگ

پیپل نہ کھڑکھڑاتا تو میں بہت ڈر جاتا۔ اس کے پتوں کی آوازیں آرہی تھی جیسے ہسپتال کے دفتر میں بیٹھے ہوئے ٹائپ بابو اپنی مشین پہ کچھ چھاپ رہے ہوں۔ بس یہی آواز جانی پہچانی تھی۔ باقی سب بہت ہی بھیانک تھا۔

صبح ماتھا بری طرح بھاری تھا۔ آنکھوں میں جلن تھی، ہاتھ پیر سُن تھے۔ اُٹھنا پڑا، پولیس جو آئی تھی۔ ماسٹر صاحب نے آکر جگایا تھا۔ وہ ڈرے ہوئے تھے، بولے "پولیس تم کو پوچھ رہی ہے"۔

"کیوں" ؟

باہر والوں کی تحقیقات کرتی ہے۔ ہم سے پوچھ رہے تھے، رات کون آیا ہے، کہاں سے آیا ہے، کیوں آیا ہے" ؟

سنتے ہی میرے آگ لگ گئی تھی۔ تم ہی بتاؤ، جب میں گھر سے اس اندھیری رات میں نکلا تھا یا نکالا گیا تھا تو کوئی پوچھنے آیا تھا کہ اس رات میں کون جا رہا ہے، کہاں جا رہا ہے، کیوں جا رہا ہے ؟

پورے آدمی کو نہ سمجھنا، اس کے صرف ایک وقتی حصے کو سمجھنا ہی تو پاکستان ہے۔ بنو !

جب پولیس مجھے صبح صبح جگا کر تھانے لے گئی تو میں سمجھ گیا کہ اب ہم اور تم دونوں پاکستان میں گھر گئے ہیں لیکن یہ گھِر جانا کتنا تکلیف دہ تھا۔

تھانہ پر میری تحقیقات ہوئی۔ میں یہاں کیوں آیا ہوں ؟ کیا تیا تا میں اہنیں ؟ آدمی کہیں کیوں آتا جاتا ہے —— پولیس والے مجھے بہت پریشان کرتے اگر ماسٹر صاحب وہاں خود نہ پہونچ گئے ہوتے۔ انہوں نے ہی ساری تفصیل دی تھی۔ اس وقت اِن کا مسلمان ہونا کارگر ثابت ہوا تھا۔ ایک مسلمان ہندو کے لئے بے گناہی کا بیان دے یہ بڑا ثبوت تھا۔ لیکن مجھے لگ رہا تھا کہ اس موجودہ ماحول میں ماسٹر صاحب کہیں وہ غلطی تو نہیں کر رہے تھے جو انہوں نے بھر تری نامہ شروع کرکے کی تھی۔

تھانہ میں سوالات کے جواب دینا آسان بھی تھا اور ٹیڑھا بھی۔ آخر وہاں سے نکل کر ہم سامنے پڑے کٹی لکڑیوں کے ڈھیر پر بیٹھ گئے تھے۔ ماسٹر صاحب چاہتے تھے کہ میں ہوش و حواس میں آجاؤں، کیونکہ میرا رنگ فق پڑ گیا تھا وہیں مین بتی کے پاس دو تین آدمی اور بیٹھے تھے شاید کسی کی ضمانت کے لئے یا تفتیش کے لئے آئے تھے۔ ان کے چہرے لٹکے ہوئے اور غم زدہ تھے۔ مولانا کی آنکھوں میں خوف تھا وہ قریب بیٹھے لوگوں کو بتا رہے تھے۔ رسول نے کہا کہ صور تین بار پھونکا جائیگا پہلی بار پھنکے گا تو لوگ گھبر جائیں گے۔ سب پر خوف طاری ہو جائے گا۔ دوسری بار جب صور میں پھونک ماری جائے گی تو سب مر جائیں گے، تیسری آواز پر لوگ جی اٹھیں گے۔ اور اپنے خدا کے سامنے پیش ہونے کے لئے نکل آئیں گے، یہی ہونا ہے۔۔۔ صور پہلی ہی پہلی بار پھونک ماری گئی ہے۔۔۔

"بھر تری نامہ لکھ رہے ہیں" ؟ میں نے ماسٹر صاحب سے پوچھا۔

"ہاں —— پھر مت امن میرا، آج یہاں رین بسیرا
کچھ بات بلا کے ٹرات، جلد ہو فجر سویرا

کہتے کہتے ماسٹر صاحب اُدھر دیکھنے لگے جہاں چھت کی ویران منڈیروں پر گھاس کے پیلے پیلے پھول کھلے تھے۔ گھنی گھاس میں سے ابابیلیں چھوٹی مچھلیوں کی طرح اچھل رہی تھیں۔ گھاس کی ٹہنی سے پیلے پھول پشم نخ سے توڑ کر اُڑتیں اور جب چونچ سے پھول گر جاتے تو اڑتے اڑتے پھر توڑنے لگتیں۔ ابابیلوں کا اڑتے

اڑتے یا گھنی گھاس میں سے اچھل کر پھولوں تک آنا، پیلے پھولوں کا توڑنا چکراتے ہوئے پھولوں کا گرنا اور ابابیلوں کا دور آسمان سے پھر لوٹ کر آنا......

ماسٹر صاحب خاموشی سے یہ سب دیکھ رہے تھے، آخر میں نے انہیں ٹوکا "کل رات ......"

ہاں، وہ بدرو ہے ——— پاگل ہو گیا ہے۔ اس کے چالیس کر گھے تھے، سب جل کر خاک ہو گئے۔ بچھو اڑے پیپل کے نیچے تب سے رات بھر روتا ہے، گالیاں بکتا ہے......... ماسٹر صاحب بولے۔

گھر میں کچھ......." میں نے ہمت کر کے کہا تو جوگی کی طرح ماسٹر صاحب سب کچھ بتا گئے۔

"ہاں...... بہو کو تکلیف ہے۔ دنگے سے تین دن قبل بچہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر سارنگ کے نرسنگ ہوم میں تھی۔ فسادیوں نے وہاں بھی آگ لگا دی۔ راستہ بند ہو گیا تو جان بچانے کے لئے دوسری منزل سے زچاؤں کو پھینکا گیا، بچوں کو پھینکا گیا۔ نو زچہ تھیں، دو مر گئیں، پانچ بچے مر گئے۔ بہو کا بچہ بھی گلی میں گر کر مر گیا۔ اس وقت مارکاٹ مچی ہوئی تھی۔ سویرے ہم بہو کو جیسے تیسے لے آئے، اب اس کے دودھ اتر رہا ہے۔ تو تکلیف ہوتی ہے!"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ابابیلیں گھاس کے پھول توڑ رہی تھیں، اڑ رہی تھیں اٹھنے کا بہانہ تلاش کرتے ہوئے میں نے کہا "سوچتا ہوں دوپہر ہی کو پونہ چلا جاؤں۔"

"جاسکو تو چنار چلے جاؤ، اپنے دادا کو دیکھ آؤ۔" ماسٹر صاحب بولے۔

"کیوں، ان کو کچھ ہو گیا ہے کیا؟"

"ہاں...... ان کی ایک بانہہ کٹ گئی ہے۔ گھر کے سامنے مارکاٹ ہوئی، وہ نہ ہوتے تو شاید ہم لوگ بھی زندہ نہ بچتے۔ حملہ تو ہم پہ ہوا تھا۔ وہ گلی میں اتر گئے۔ تبھی بانہہ پر وار ہوا۔ بانہہ کٹ کر الگ گر پڑی، لیکن ان کی ہمت ——— اپنی ہی کٹی بانہہ کو زمین سے اٹھا کر وہ لڑتے رہے، خون کی پچکاری چھوٹ رہی تھی۔ کٹی بانہہ ہی ان کا ہتھیار تھی ——— فسادی تب آگ کے گولے پھینک کر بھاگ گئے۔ گلی میں ان کی بانہہ کے چیتھڑے پڑے تھے۔ جب اٹھایا تو بے ہوش تھے۔ داہنے ہاتھ میں کٹی بانہہ کی کلائی تب بھی جکڑی ہوئی تھی ——— لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، تھانہ ہسپتال میں مرہم پٹی ہوئی۔ آٹھ دن بعد لوٹے۔ دوسرے دن چنار چلے گئے۔"

"تو ان کی بانہہ کا کیا حال تھا؟" سنکر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔

"ٹھیک تھا، چل پھر سکتے تھے۔ کہتے تھے وہیں چنار ہسپتال میں پٹی کرواتے رہیں گے ——— یا غفلا رحم کر ——— بہتر ہو کہ دیکھ آؤ۔" ماسٹر صاحب نے کہا اور اپنی آنکھیں ہتھیلیوں سے ڈھانپ لیں۔

میرا شعور بجھ سا رہا تھا۔ میں کس جہان میں تھا، یہ لوگ کون تھے، میں کن کے درمیان تھا؟ کیا یہ لوگ جو آدمیوں کی طرح دکھائی دیتے، سچ تھے، یا خوفناک خواب؟ اب تو کٹا پھٹا آدمی ہی سچ لگتا تھا دیکھ کر دہشت ہوتی تھی۔

میں پھر آ کر کمرے میں لیٹ گیا تھا۔ ماسٹر صاحب اندر چلے گئے تھے۔ تبھی نیچے سے کچھ آوازیں آئی تھیں۔ امی۔ ماسٹر صاحب، بنٹو کا آدمی منیر اور ننو، سبھی تھے۔

منیر کہہ رہا تھا، "یہاں رہنے کی منطق سمجھ میں نہیں آتی۔"

"تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی" یہ بنو کی آواز تھی۔ "ہم تو پہلے اسی دھرتی سے اپنا بچہ لیں گے، جس میں کھویا ہے، پھر سب جگہ چلے جائیں گے، جہاں کہو گے"۔

"میں نے جھانک کر دیکھا، دبلا پتلا منیر غصے سے کانپ رہا تھا۔ چیخ کر بولا" تو لے اپنا بچہ یہیں سے جس سے جی میں آئے ولے" !

میں سکتے میں آگیا تھا کہیں کچھ .... کہیں اس میں میرا ذکر تو نہیں تھا۔ لیکن شاید میں غلط سمجھا تھا۔ بنو بھی بپھر کر بولی تھی "تو اب کیا دیگا بچہ مجھے ——— تجھے اپنا خون بیچ بیچ کر شراب پینے سے فرصت ہے"؟

"تڑاق : ——— شاید منیر نے بنو کو مارا تھا۔ چھوٹا سا کہرام مچ گیا۔ بعد میں بنو منیر کو کوسنے لگی تھی" مجھے معلوم نہیں ہے کیا، تو جتنی بار بمبئی جاتا ہے خون بیچ کر آتا ہے۔ پھر رات بھر پڑا کانپتا رہتا ہے"۔

یہ سب میں کیا سن رہا تھا بنو! تیرے اندر بھی ایک پاکستان رو رہا تھا۔ سب ہی تو اپنے اپنے پاکستان لیے ہوئے تڑپ رہے تھے۔ آدھے اور ادھورے، کٹے پھٹے۔ انگ انگ۔

اُف! کتنا اندھیرا تھا اس چاندنی رات میں ——— جب میں بھیونڈی سے اسی طرح چلا جیسے ایک دن چنار سے چلا تھا۔ اڈے سے ایک ٹیکسی تھانہ جا رہی تھی، اسی میں بیٹھ گیا تھا۔ جب تک بستی رہی کھلے کھلے میدان بھی بیچ بیچ میں نظر آتے رہے۔ راکھ کی تیز مہک اندر تک اترتی رہی۔ آسمان میں ڈبڈباتی چھاتیاں لٹکتی رہیں، چوراہوں پر کھڑے بغیر سروں کے دھڑوں سے خون کے فوارے چھوٹتے رہے۔

تھانہ، تھانہ سے بس پکڑ کر بمبئی، بمبئی سے گاڑی پکڑ کے پونہ اور پونہ میں کئی روز سنجا میں پڑا ایبتا رہا۔

میں سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا بنو .... ! صرف اپنی ذات میں سمٹ جانا چاہتا تھا۔ عمر کا یہ سفر کتنا بے ہودہ ہے کہ آدمی کٹتا پھٹتا جاتا ہے، مگر لہولہان ہو کر جیئے جاتا ہے،

اور یوں تنہائی میں آگر کوئی یہ آواز سنے کہ اور ہے کوئی؟" تو کیا بیت سکتی ہے، اس کا اندازہ کسی کو نہیں ..... تمہیں بھی نہیں بنو!

اور ہے کوئی؟

چار یا پانچ مہینے ہو گئے، دادا جی کا خط ملا تھا۔ وہ پھر بھیونڈی لوٹ کر آئے ہیں۔ :- سندھیوں اور مارواڑیوں کی وجہ سے مال زیادہ نہیں مل پاتا، اس لئے بازار مندا ہے۔ سب کر گھے بھی نہیں چل رہے ہیں۔ ایک بازو نہ رہنے کی وجہ سے بدن کا توازن بگڑ گیا ہے۔ مذاق میں انہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ ان کا نام "ٹنڈا" پڑ گیا ہے باقی کوئی خبر انہوں نے نہیں دی تھی۔ سوائے اس کے کہ منیر بنو کو لے کر بمبئی چلا گیا ہے۔ معلوم نہیں وہ لوگ بمبئی میں ہیں یا پاکستان چلے گئے، ڈرل ماسٹر نیم پاگل ہو گئے ہیں، گھر میں ڈرل کرتے ہیں۔ اسکول میں کوئی پوتھی لکھتے رہتے ہیں۔

.... اس دن میں بمبئی نہ آتا تو تجھ سے ملاقات کبھی نہ ہوتی بنو! ——— اور کتنی تکلیف دہ تھی وہ ملاقات ——— میں پچھتا رہا تو بھی کیا سوچا ہوگا کہ میں یہی سب کرتا ہوں؟ لیکن سچ بنو، کرتا تو میں تب بھی رہا ہوں پر تمہارے ساتھ نہیں، شاید تمہاری وجہ سے کرتا رہا ہوں۔

وہ پونہ کا دوست نہیں تھا، وہیں بمبئی کا تھا۔ اس کا نام کیدار ہے، کچھ دن پونہ میں ساتھ رہا تھا تبھی دوستی ہوئی تھی۔ میں بھیونڈی جانے کے لئے بمبئی آیا تھا۔ بمبئی آکر دل اکھڑ گیا تھا کہ کیا کروں گا وہاں جاکر اس شام سے تمہارا کوئی سروکار نہیں ہے بنو! وہ شام میں اور کیدار ساتھ گزارنا چاہتے تھے۔ کولابہ کے ایک شراب خانے میں ہم نے تھوڑی سی پی تھی۔ پھر وہاں سے گھومتے ہوئے ہینڈلوم ہاؤس تک آئے تھے۔

اسی کے قریب کوئی گلی تھی، اب جاؤں تو پہچان لوں گا لیکن یاد نہیں ہے۔ کیدار اور میں دونوں اسی میں چلے گئے، شاید آگے چل کر داہنے کو مڑے تھے۔ وہیں پر ایک سگریٹ والے کی دکان تھی۔ نیچے کاریں کھڑی تھیں۔ لگتا تھا، بوہرا مسلمانوں کی بستی ہے۔ بہت پرسکون صاف ستھری۔

اس بلڈنگ میں لفٹ تھی۔ یوں سیڑھیاں بھی بہت صاف ستھری تھیں۔ کیدار کے ساتھ میں سیڑھیوں سے ہی اوپر گیا تھا، پانچ منزل تک چڑھتے چڑھتے میری سانس پھول گئی تھی اس وقت گھروں کی کھڑکیوں سے کھانا پکانے کی مہک آ رہی تھی، چھٹی منزل ایک دم ویران تھی۔ جس فلیٹ کی گھنٹی کیدار نے بجائی وہ اتنا صاف ستھرا نہیں لگ رہا تھا۔

دروازہ کھلا اور ہم ہیلیوں کی طرح ہانپتے ہوئے ایک سندھی کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ ہمیں اس کمرے میں لے گیا، جس میں معمولی قسم کے صوفے لگے ہوئے تھے۔ وہ سندھی اب بھی ہانپ رہا تھا۔ لگتا تھا زیادہ بات کرے گا تو ابھی اس کی سانس اکھڑ جائے گی اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے گی۔

مجھے الجھن ہو رہی تھی میں کھلی ہوا میں سانس لینے کے لئے کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ دور دور تک گندی چھتیں نظر آرہی تھیں میرے بارے میں کیدار نے بتا دیا تھا کہ میں وہیں صوفے پر بیٹھوں گا اور انتظار کروں گا اس ہانپتے سندھی نے کوکاکولا کی ایک بوتل منگا کر میرے لئے رکھ دی اور کیدار کو لے کر اپنی میز کے قریب چلا گیا۔ وہاں کیدار کو ایک گنجلا ہوا کالا برقعہ نظر آ رہا تھا۔ کہہ کیا رہا تھا یہ وہاں سے سنائی نہیں پڑتا۔

اس کے بعد وہ دونوں کہاں غائب ہو گئے، کچھ معلوم نہیں۔ وہ ایک منٹ بعد کیدار کے ہنسنے کی آواز بغل سے آئی تھی۔

پھر کیدار تو نہیں آیا، وہ سندھی اس طرح ہانپتا ہوا آیا اور زور سے سانس چھوڑتا ہوا بولا "بیئر......" باقی الفاظ اس کے ہانپنے سے صاف ہو رہے تھے "بیٹھے گے، منگواؤں"؟

"پی لوں گا......" میں نے کہا تو اس نے لڑکے کو بھیجا اور وہ بیئر لے آیا۔ سندھی نے نہیں پی، میں ہی بیٹھا پیتا رہا۔

"آپ......... وہ اسی طرح ہانپ رہا تھا۔" بمبئی ..... "مطلب تھا نہیں رہتے"

"نہیں پونہ رہتا ہوں۔ وہ پھر ہانپا۔

"گھومنے....... وہ پھر ہانپا۔

"کام سے آیا تھا" میں نے اسے بتا دیا۔

"بزنس......... ہانپنا بدستور تھا۔

"نہیں پرسنل کام تھا۔ بھیونڈی جاؤں گا"

پھر وہ بیٹھا بیٹھا تب تک ہانپتا رہا جب تک کیدار سامنے آکر کھڑا نہیں ہوا۔ اسے دیکھتے

رہی سندھی ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے بھی الجھن ہو رہی تھی۔
میں گلاس ختم کرکے فوراً کیدار کے پاس آگیا۔ اب ہم تینوں درمیانی کمرے میں تھے۔ کیدار میری
بیئر کے پیسے دے ہی رہا تھا کہ بغل کا دروازہ کھلا۔ میں نے اتنا ہی دیکھا کہ ایک عورت کے ہاتھ نے کیدار کو اس کا
چابیوں کا گچھا دیا اور اس ہانپتے ہوئے سندھی کے ساتھ مجھے کھڑا دیکھ کر پوچھا: "اور ہے کوئی"؟
میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھے نیلی کوٹ اور بلاؤز پہنے تم کھڑی تھی بنو،
اور پوچھ رہی تھی: "اور ہے کوئی.......؟"
ہاں، کوئی....... کوئی اور بھی تھا.......
ایک تھرتھراتے اندھے لمحے کے بعد تم نے بھی مجھے پہچان لیا تھا، اور تب کیسی ٹیڑھی مسکراہٹ
آئی تھی تمہارے ہونٹوں پر۔ زہر میں بجھی مسکراہٹ! یا وہ سخت ملامت کی مسکراہٹ تھی یا قدرتی، کچھ بھی نہیں معلوم
——— خبر نہیں یہ انتقام تم مجھ سے لے رہی تھیں، خود سے، منیر سے یا پاکستان سے؟
میں سیڑھیوں سے اتر آیا تھا۔ آگے آگے میں تھا، پیچھے پیچھے کیدار۔ دل چاہ رہا تھا کہ سیڑھیاں
چڑھ جاؤں اور تم سے پوچھوں، بنو، کیا یہی ہونا تھا؟ میرا حشر یہی ہونا تھا؟
اب کون سا شہر ہے جسے چھوڑ کر میں بھاگ جاؤں؟ کہاں کہاں بھاگتا رہوں؟ جہاں پاکستان
نہ ہو۔ جہاں میں پورا ہو کر اپنی تمام حسرتوں اور احساسوں کو لے کر جی سکوں۔
بنو، ہر جگہ ایک پاکستان ہے، جو مجھے اور تمہیں گھائل کرتا ہے پیٹتا ہے، لگاتار پیٹتا اور ذلیل کرتا
چلا جا رہا ہے۔

———— ❖ ————

لوٹے ہوئے مسافر

(ایک ناول)

کملیشور

مترجم
زاہد اقبال

... صرف نفرت کی آگ نے اِس بستی کو جلایا تھا۔

یہ وہی بستی ہے جس نے اٹھارہ سو ستاون (۱۸۵۷) میں انگریزوں سے لوہا لیا تھا۔ ہر قوم اور مذہب کے لوگوں نے کندھے سے کندھا ملاکر گولیوں کی بوچھار سینوں پر جھیلی تھی۔

... تب بہت خوبصورت تھی یہ بستی۔

راجا کے تالاب میں کمل کِھلتے تھے۔ دھیروں کے لڑکے کچے کمل گٹے بیچنے آیا کرتے تھے۔ دوسرے تالابوں میں سِنگھاڑے جل منجری کِھلتی تھی۔ ... اُن کے پتے ناگوں کی طرح پھن اٹھائے رہتے تھے۔ بجاؤں کی ڈھلوانوں پر بیریوں کے باغ تھے۔ جنگل میں کمرکھ اور آنولے کے پیڑ تھے۔ پکے ہوئے بیر جب مہکتے تھے تو بستی میں خوشبو پھیلتی تھی۔ مہوا ٹپکتا تھا تو خمار چھاجاتا تھا۔ گھروں میں بھبکے چلتے اور کچی شراب کھینچی جاتی تھی۔

ندی تالابوں میں نینگے، پڑھین، دنمگار، ساور اور رہو مچھلیوں کی بھرمار تھی۔ ندی کے پار تاڑ کے باغ تھے جہاں نیرا بکتا تھا۔

مندروں کے آنگنوں میں گیندے کِھلتے تھے اور مسجدوں کے صحن میں بیلا، چمیلی اور موتیا مہکتا تھا۔ بڑی مسجد کے گنبدوں اور میناروں پر جنگلی کبوتر بیٹھے رہتے تھے۔ صحن بیٹ سے بھرا رہتا تھا۔

جب ہندوؤں کی بستی سے تازیے گذرتے تھے تو اُن پر لوگ گلاب جل چھڑکتے تھے اور ہندو عورتیں اپنے بچوں کو گود میں اٹھائے تازیوں کے نیچے سے گذرتی تھیں اور دوڑ دوڑ کر پھینکے ہوئے مکھانے چُن کر احتراماً آنچل کے پلو میں باندھ لیتی تھیں۔

جب رام لیلا کا دیوان اٹھتا تھا تو مسلمان عورتیں دروازوں کی چِقوں یا بوروں کے پردے اُلٹ کر مورتیوں کے سنگار کی تعریف کرتی تھیں اور ان کے بچے دیوان کے ساتھ دُور تک شور مچاتے ہوئے آیا کرتے تھے — "بول راجا رام چندر کی جے"

... لیکن صرف نفرت کی آگ نے اس بستی کو جلایا تھا۔

قلعے کے آس پاس پرانا شہر بسا ہوا تھا۔ آج بھی وہ شاندار قلعہ یہاں موجود ہے جسے دیکھ کر پُرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ اُتر کی طرف کی دیواریں جو انگریزوں کی گولیوں سے سن ستاون میں گری تھیں، آج بھی ویسی ہی پڑی ہیں۔ اب اصطبل میں فقیر رہتے ہیں اور ہاتھی خانے میں تانگے والے۔ ٹھاکر راجاؤں کا وہ راج دیکھتے دیکھتے دھول میں مل گیا۔ بازار ویران ہو گیا۔ منڈی اُجڑ گئی ... اور یہ راج صوبے کا ایک ضلع بنا دیا گیا۔

وہ دن بیت گئے اور شہر قلعے کے آس پاس سے ہٹ کر دکھن کی طرف بسنے لگا۔ انگریزی حکومت کے

ساتھ ساتھ عیسائی آئے اور ان کی ایک ایک کالونی بن گئی۔ ندی پار سول لائنز تھیں اور انگریزی دبدبا پورے شہر پر حاوی ہو گیا۔ چھوٹے سے شہر میں ایک آدھ گرجے اور بن گئے۔ کچھ چھوٹی موٹی مشینیں شہر میں آئیں۔ اِدھر اُدھر بک بک کرنے والی چکیاں لگ گئیں۔ اور ایک آدھ آرا مشین۔ صاحب لوگوں کا کام کرنے والی جاتو کار ذات کا ایک طبقہ اور بڑھ گیا۔ یہ طبقہ اپنے اپنے گھروں پر ہندو مسلمان تھا۔ لیکن صاحب کے سامنے صرف نوکر تھا۔ نئے شہر سے باہر ایک اور نئی بستی کی بنیاد پڑ گئی جس میں کھلے ہوئے بنگلے، کچہریاں، باغ، کھیل کے میدان، جیل اور دوسرے سرکاری دفتر بن گئے۔ عوام کے لئے شہر میں جو سب سے بڑی عمارت تھی، وہ کوتوالی تھی۔ جس کے باہر چوبیس گھنٹے سنتری پہرہ دیا کرتے تھے۔ اس عمارت اور اس کے اندر چلنے والے کاروبار کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں ایک خوفناک ڈر سمایا ہوا تھا۔

لیکن اندر ہی اندر ایک آگ بھی سُلگ رہی تھی۔ کچھ جوشیلے نوجوان کبھی کبھی شہر میں دکھائی دیتے تھے۔ جو چھپ چھپا کر لوگوں سے ملتے تھے اور اسپتال کی پاس والی گندی کوٹھریوں میں بیٹھ کر صلاح مشورہ کیا کرتے تھے۔ اُن کے دلوں میں کیا ہے اس کا پتہ کسی کو بھی نہیں تھا۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہی تھے اس جتھے میں۔ ان نوجوانوں کی چال میں ایک عجیب سی مستی تھی اور آنکھوں میں انگارے دہکتے تھے۔۔۔۔۔

۔۔۔ کہ تبھی ندی کے پُل کے پاس کسی صاحب کے مرنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح چھوٹے سے شہر میں پھیل گئی تھی۔ دن دہاڑے کسی آدمی نے انگریز پولیس افسر کا خون کر دیا تھا۔۔۔ انتقام کی یہ آگ بہت پہلے سے بھڑک رہی تھی۔ یہ اس کا پہلا دھماکہ تھا۔ رادھے شیام اور یونس پکڑے گئے تھے۔ مقدمے کا ڈرامہ ہوا اور جیل میں یونس کو پھانسی دی گئی۔ ایک دیش بھگت کے خون سے اس جیل کا راج تلک ہوا تھا۔ رادھے شیام کو کالا پانی بھیج دیا گیا تھا۔ لیکن ان زیادتیوں کے بعد بھی بیدار لوگوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے تھے۔ وہ چھپ چھپ کر میٹنگیں کرتے اور ہندو مسلمان دونوں ہی مل کر انگریزوں سے نجات پانے کی ترکیبیں سوچتے۔ شہر میں کوئی بھی بہت بڑا نہیں تھا۔ چھوٹے چھوٹے مکانوں کی بستیاں تھیں۔ زیادہ تر پیشوں کے حساب سے محلے بنے ہوئے تھے۔

شہر سے تھوڑی سی الگ بسی ہوئی یہ بستی چکوں کی تھی۔ ملکی حکومت کے دنوں میں بہت اچھے حال تھے ان لوگوں کے۔ اس کے بعد انگریزی حکومت کے طوفانوں کو بھی انہوں نے جھیلا اور پھر خوشحال ہو گئے۔ سن بیالیس کے اندولن میں چکوں کے جوان لڑکوں نے بڑا اودھم مچایا تھا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ دیش کیسے آزاد ہوگا لیکن اتنا انہیں معلوم تھا کہ کچھ کرنا چاہئے۔ اور وہ جو کچھ کر سکتے تھے، انہوں نے کیا۔ جمن سائیں کی کوٹھری کے سامنے دھونی رمی رہتی تھی۔ اگربتیاں جلتی رہتیں اور لوبان کا پاک دھواں اٹھتا رہتا تھا۔ یکے اور ٹانگے والے اسٹیشن کے قلی اور چھوٹے دوکان دار وہاں شام کو اکٹھے ہوتے اور گپیں لڑاتے۔

افتخار کہا کرتا تھا "جناح صاحب کدھر سے مسلمان ہیں۔ سُنا نماز تک نہیں پڑھتے۔"

تب ہی سائیں ٹوکتا تھا۔ "تجھے کیا لینا دینا ہے، تو اپنا بیکھ جوت۔"

لیکن بولنے والے بولتے رہتے اور سائیں چپ چاپ سُنتا رہتا۔

اور پھر سن سینتالیس کا زمانہ آیا۔ ایک بوند خون نہیں گرا، کسی محلے پر دھاوا نہیں ہوا، کسی نے کسی کو نہیں مارا، کسی نے کسی کو گالی تک نہیں دی۔ مسجدوں میں لڑائی کی تیاریاں نہیں ہوئیں۔ مندروں میں اینٹ

پتے اکھڑے نہیں ہوئے۔ جو روز پٹتے تھے انھیں بھی کسی نے نہیں پلٹا۔

لیکن اندر ہی اندر ایک زلزلہ آیا تھا۔ بڑا بھیانک زلزلہ۔ جس سے سب کی چولیں ہل گئی تھیں۔ اندر اندر سب کچھ بگڑ گیا تھا۔ دلی عمارتیں ڈھے گئی تھیں۔ اپنے پن کا جذبہ مر گیا تھا۔ نفرت کی آگ نے اس بستی کو نگل لیا تھا۔۔۔۔ اور یہ بھری پری چکوں کی بستی سب سے پہلے اُجڑ گئی تھی۔ پتہ نہیں، یہ آگ کہاں چھپی رہی تھی۔

نفرت کی اس آگ کی چنگاریاں باہر سے آئی تھیں ___ دوسرے شہروں قصبوں اور صوبوں سے۔ بڑی منحوس راتیں تھیں جیسے پوری بستی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ سب سب کو پہچانتے تھے لیکن جب سامنے ہوتے تو عجیب حیرت اور شک کے انداز میں ایک دوسرے کو دیکھتے۔ من میں بیٹھے ہوئے شکوں کے سانپ اندر ہی اندر پھنکارنے لگتے تھے اور آنکھوں میں اجنبیت کی چمک بھر جاتی تھی۔

چکوں کی اس بستی میں ہی جمن سائیں کی کوٹھری اور نصیبن کی جھونپڑی بھی تھی۔ یہ دونوں تب بھی یہیں تھے اور اب بھی یہیں ہیں۔ ان کے علاوہ گرے ہوئے اور ڈھے ہوئے مکانوں کے نشان باقی رہ گئے ہیں۔ زمین وہی ہے۔ پیپل اور جامن کے پیڑ بھی وہی ہیں۔ دُور میدان جہاں نیچا ہو کر ہری بھری پہاڑیوں پر پھیل جاتا ہے، وہاں بیریاں ہیں۔۔۔ ٹیلوں کے پیچھے کمرکھ اور آنولے کے جنگل ہیں، جہاں بمبا بہتا ہے اور ڈھلوان سے بائیں طرف گہرا تالاب ہے جس میں سور اور بھینسیں نہاتی ہیں۔

پہلے شہر سے اسٹیشن جانے والی سڑک ادھر سے بھی جایا کرتی تھی۔ کنکڑ کی سڑک پر پہیئے کرکراتے ہوئے اور گالیاں بکتے ہوئے یکے تانگے ادھر سے ہی گذرتے تھے۔ صاحبوں کی موٹریں بھی سرسراکر گذر جاتی تھیں یا کبھی ڈاک بنگلے میں آکر رک جاتی تھیں۔ تب یہ ڈاک بنگلہ ایک اداس گرجے کی طرح دکھائی پڑتا تھا۔ کبھی کبھی کوئی بڑا صاحب آکر ٹھہرتا تو لال پگڑیاں دکھائی دینے لگتیں۔ جھاڑیاں صاف کر دی جاتیں اور باہر ایک پیٹرومیکس لٹک جاتا تھا۔

آج بھی سب کچھ لگ بھگ ویسا ہی ہے جیسا آزادی سے پہلے تھا۔ صرف اس بستی کو اداسی نے جکڑ لیا ہے۔ ٹھہری شامیں ہوتی ہیں اور رُکا ہوا وقت ہے۔

اس اجڑی ہوئی بستی سے دُور دُور تک کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ بہت دُوری پر دھان ملوں کی پتلی چمنیوں سے رینگتا ہوا دُھواں آسمان کے نیلے پن میں بکھر جاتا ہے۔ دھان ملوں کے پیچھے پجاوے ہیں جن میں اینٹیں پکتی ہیں۔ وہ پجاوے گوبر کے بڑے بڑے ڈھیروں کی طرح سلگتے رہتے ہیں۔ اس کے پیچھے کسی گاؤں کی بستی ہے اور ہرے بھرے میدان ہیں پھتنار کے پیڑ یا کوئی تالاب یا دلدل بھی ہے کیونکہ اُدھر سے نارسوں کی تیز آواز کی گونج آتی ہے یا کبھی کبھی آبی پرندے دلدل پر جھکتے نظر آتے ہیں۔

ایک سفید مٹھیا بھی چمکتی ہے جس کے اوپر بانس میں اٹکا ہوا ایک جھنڈا لہراتا ہے۔ بانس اب ٹیڑھا ہو گیا ہے اور جھنڈا پھٹ گیا ہے۔۔۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی ہارے ہوئے جنگ جُو کا نشان ہے۔ اُس مٹھیا میں ایک مُورتی رکھی ہے جسے کوئی پوجنے نہیں جاتا۔

اور ادھر ہے اسٹیشن اور ایک برساتی گہرا نالا، جس کے پُل سے ریل گذرتی ہے تو لوہے کی کھوکھلی سی آواز آتی ہے۔ اسٹیشن پر تب کچھ چہل پہل ہوتی ہے۔ یکے بھرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کچھ رونق ہو جاتی ہے۔ آوازیں یہاں سے نہیں سنائی پڑتیں۔ صرف ریل گاڑی کی دھمک کا احساس ہوتا ہے۔

اسٹیشن کے اُس پار اب ایک بستی اور نظر آنے لگی ہے اور نصیبن اسٹیشن کے اس پار والی بستی میں چمکتی بجلی کی روشنی کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔

شہر بھر میں اگر کہیں بجلی تھی تو صرف اسٹیشن کے پار والی بستی میں۔ آزادی کے بعد بھی یہ شہر اداس اور اندھیرا ہی رہا لیکن اسٹیشن کے اس پار پتال توڑ کنواں کھودنے والے جرمن کاریگروں کا ڈیرہ پڑا ہوا تھا۔ جب سے جرمن کاریگر آئے ہیں تب سے اُسر آباد ہوا ہے۔ کٹیلی جھاڑیوں والا اُسر جہاں دھرتی کے تن پر جگہ جگہ سفید چکتے پڑے ہوئے تھے ٹھونٹھ اُگے ہوئے تھے۔ برسات کے بعد جب دھوپ چٹختی تھی اور دھرتی میں دراڑیں پڑ جاتی تھیں تو بچے اس اُسر کا چکر لگایا کرتے تھے۔ چھتری لگائے سفید بگر مٹے چنتے تھے اور لڑتے جھگڑتے لوٹتے تھے۔

نصیبن کی آنکھوں کے سامنے سب منظر ناچ جاتے ہیں۔ اُس اُسر میں جہاں آج پتال توڑ کنویں کھودنے والے جرمن کاریگروں نے بجلی لگالی اور راوٹیاں کھڑی کر لیں وہاں وہ بچوں کو تلاش کرنے جایا کرتی تھی جو ریل دیکھنے جایا کرتے تھے بڑا شور و غل مچاتے تھے۔ مسافروں کو منہ چڑاتے یا ڈھیلے پھینکتے تھے اور پلیٹ فارم سے بیڑیوں کے نمبر اور سگریٹوں کی پنیاں جمع کر کے لاتے تھے۔

لیکن آج جب اُس طرف دیکھتی ہے تو ویرانی اور بڑھ جاتی ہے۔ وہ سب بچے چلے گئے۔ اب کوئی لگر مٹے چن کر نہیں لاتا۔ اسٹیشن سے بیڑیوں کے نمبر اور سگریٹوں کی پنیاں جمع کر کے نہیں لاتا . . . .

اور اب تو اُس اُسر میں بجلی بھی لگ گئی ہے۔ ایک نئی زندگی کی جھلک مل رہی ہے . . . لیکن جب تک اپنے سبھی جانے والے اپنے پاس نہ ہوں، نئی زندگی بھی بہت پرائی اور بوجھل لگتی ہے۔ وہی بوجھ سا تھا نصیبن کے دل پر . . . .

لیکن جب سے اُسر آباد ہوا ہے، ضلع میں مزدوروں کی روزی چمکی ہے۔ جیسے جیسے کام بڑھتا جاتا ہے، مزدوروں کی کھپت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ بہت سے نئے لوگ جب اس چھوٹے ہوئے راستے سے گذرتے ہیں تو نصیبن انہیں دیکھتی ہے۔ وہ مزدور ہیں جو پتال توڑ کنویں بنانے والے کاریگروں کے ساتھ کام کرنے آئے ہیں۔

شام گہری ہو رہی تھی، نصیبن کی آنکھیں وہیں لگی ہوئی تھیں۔ بجلی اور نئی نئی مشینوں کے ساتھ یہ کیسی زندگی لوٹ رہی ہے؟ یہ نئی زندگی کیسی ہوگی؟ کیا یہ ویسی ہی بے فکری، غریبی اور مستی کی زندگی ہوگی؟ اور ہوگی بھی تو کیا؟ نصیبن تو ایک چھوٹا ہوا کنارہ ہے جس سے اب کوئی لہر نہیں ٹکرائے گی۔ اس کا من اداس ہو گیا تھا۔ تبھی سائی نے کہا۔ "اتنے برس ہو گئے اِدھر کوئی نہیں آیا . . . اب بچن بھی کیا آئے گا۔ سب ویران ہو گیا، سب اجڑ گیا۔"

بچن کا نام سن کر نصیبن کی یادیں اور ہری ہو گئیں۔ دھیرے سے بولی۔ "سائی! دھرتی نہیں اجڑتی۔" یہ سن کر سائی بے یقینی سے مسکرا دیا۔

نصیبن کو کچھ غصہ بھی آ گیا لیکن سائی سے کہے بھی کیا۔ وہ پھر اُدھر روشنی کی طرف گھورنے لگی۔ سرمئی خیمے چمک رہے تھے۔ بڑی بڑی مشینیں پہاڑیوں کی طرح ساکت کھڑی تھیں۔ ایک راوٹی سے دھوئیں کی لکیر اٹھ رہی تھی۔ اِس دھندلی روشنی میں آدمیوں کے سیاہ سائے بے چینیاں سے گھوم رہے تھے۔ کبھی روشنی کے بیچ کوئی آدمی آ جاتا تو اس کا پسینہ سے تر بہ تر جسم شبنم سے بھیگے مجسمے کی طرح چمک اٹھتا تھا۔ مگر وہ سب اتنا پرایا تھا کہ دل کو چھتا نہیں تھا۔ نصیبن نے نگاہ ہٹائی تو سڑک پہ چلی گئی۔ وہی ویران سڑک، جو ڈاک بنگلے کے پاس سے ہوتی ہوئی اِدھر آتی ہے اور یہاں سے مڑ کر شہر کی طرف چلی جاتی ہے جس کی بیڑی کی دکانیں اٹھ کر اب نئی سڑک

پر چلی گئی ہیں۔

لیکن ویران سڑک پر سات آٹھ پرچھائیاں ادھر ہی آ رہی ہیں۔ نصیبن نے دیکھا وہ پرچھائیاں سچ مچ ادھر ہی آ رہی تھیں۔ لیکن اس بستی میں اب کون آئے گا؟ یہ اجڑی بستی اور پھر اس وقت کون آئے گا یہاں۔ راہ گیر ہوں گے اپنے راستے چلے جائیں گے۔

سن سینتالیس میں پاکستان بنا اور یہ چکوں کی بستی اپنے آپ اجڑ گئی۔ تانت کے ستار پر ابھرنے والے شام کے گیت ڈوب گئے ——— میرے مولا مدینے بلا لے مجھے

وہ ستار گایا کرتا تھا۔ ستار جو پہلے سرکس کمپنی میں گھوڑوں کی زین کسا کرتا تھا اور بہت بڑھ چڑھ کے بتایا کرتا تھا ——— خدا قسم، کیا جسم ہوتے ہیں سرکس کی لڑکیوں کے ... تانت کی طرح کسے ہوئے اور چست۔ ایک سے آنکھ لڑی تھی اپنی، سیلون کی لڑکی تھی۔ ڈریس پہنتی تھی تو کہتی تھی ——— "ستار پیارے ذرا ننی تو باندھنا ——— خدا کی قسم زندگی تو وہی تھی۔"

لیکن وہ کہانیاں کھو گئیں۔ پاکستان کیا بنا سب بکھر گیا۔ آدمی کے حوصلے بکھر گئے۔ من کی مرادیں ٹوٹ گئیں دلوں کے رشتے ختم ہو گئے ....

اس بستی کے چکوے کبھی پاکستان جانے کے حوصلے سے بھاگے تھے۔ لیکن غریبی آڑے آ گئی تھی اس لئے صوبہ بھی پار نہیں کر پائے۔ ضلع میں ادھر ادھر بکھر گئے۔ لیکن یہاں کوئی لوٹ کر نہیں آیا .... پتہ نہیں اب یہاں کے لوگ کیسا سلوک کریں؟ بستی میں رہنے دیں یا نہ رہنے دیں۔ آخر ہندوؤں کا شہر ہے ....

اور ہندوؤں میں سے صرف بچن رہ گیا تھا بستی میں۔ لیکن ایک دن وہ بھی گھبرا کر لاپتہ ہو گیا۔ وہ بیتے ہوئے دن بھی کیسے تھے ———

سائیں کی کوٹھری ہی بستی کی سب سے بارونق جگہ تھی اور چمن سائیں ہی اس بستی کے سب جھگڑوں کا فیصلہ کیا کرتا تھا۔ ستار اور سلمہ کا معاملہ اس نے نپٹانے کی کوشش کی تھی۔ یوں سائیں دنیا کی باتوں سے بہت دور ہونے کا ناٹک کرتا تھا۔ لیکن اندر ہی اندر وہ اس میں رما ہوا تھا۔ اس کی سرمہ لگی آنکھیں باز کی طرح تیز تھیں وہ ہر طرف نگاہ رکھتا تھا۔

ستار کسی دوسرے قصبے سے آیا تھا۔ شہر میں سائیں سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ وہیں سے سائیں اسے اس بستی میں لے آیا تھا۔ راستے ہی میں ستار نے کہا تھا ——— لگتا ہے اب اپنا پاکستان بن جائے گا ... شاید ایک اچھی زندگی ملے مسلمانوں کو .... یہاں تو بڑی غریبی ہے۔ نہ کرنے کو کام ہے نہ رہنے کو جگہ۔"

اور مسجد کی باہر والی کوٹھری میں ستار کو رہنے کی جگہ مل گئی تھی۔ نصیبن نے اس نئے نوجوان کو دیکھا تو سائیں سے پوچھا تھا ——— "یہ کون ہے؟"

بڑا سمجھ دار اور خدا سے ڈرنے والا آدمی ہے ... نام ستار ہے۔ ایک سرکس میں کام کرتا تھا، اب چھوڑ کر چلا آیا ہے۔ کچھ اپنا کام شروع کرنا چاہتا ہے۔" سن کر نصیبن نے گہری نظروں سے سائیں کو دیکھا تھا جیسے وہ سب جانتی ہو کہ یہاں آ کر وہ کون سا کام شروع کر سکتا ہے۔

لیکن بستی کے لڑکوں سے ستار کا میل جول ہو گیا تھا۔ وہ انھیں تاش کے کھیل اور جادو کے کرشمے

دکھاتا تھا۔ لڑکے اس کے مرید ہو گئے تھے کیونکہ وہ ہتھیلی پر رکھا ہوا پیسہ غائب کر دیتا تھا اور چاہنے پر بہت سے پیسے منگا لیتا تھا۔ بچوں کے لئے سب سے زیادہ تعجب کی بات یہی تھی۔

اور جمن سائی کے کان کھڑے ہو گئے تھے جب انہوں نے سنا تھا کہ ستار اور سلمہ میں تاک جھانک چل رہی ہے وہ ایک دوسرے کو اشارے کرتے ہیں اور سلمہ جب اسپتال کی طرف جاتی ہے تو ستار کچھ دور پیچھے پیچھے جاکر پھر اس کے ساتھ ہو جاتا ہے۔

ویسے بھی باپ کا خوف سلمہ کو نہیں تھا کیونکہ وہ زنانے اسپتال میں ڈاکٹر کی ذاتی نوکرانی تھی اور خود کماتی تھی۔ سائی نے ایک روز خود ہی پیچھا کیا تو ستار نے راستہ بدل لیا تھا۔ وہ کترا کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔ سلمہ کے بدزبان ہونے کی وجہ سے سائی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ اسے بلا کر کچھ کہے۔ سلمہ اپنے آدمی کو پانچ برس پہلے چھوڑ کر چلی آئی تھی اور تب سے یہاں اپنے باپ کے پاس رہ رہی تھی۔

سلمہ کے مکان کے پاس ہی ادھر پیپل کے سامنے ایک پرانا مکان تھا جس کی تین کوٹھریوں میں سے دو گری ہوئی تھیں۔ کچا ملبہ اور سیڑھی بیمیں پیچھے پڑی تھیں اور کوٹھری میں مکڑیوں کے جالے لگے ہوئے تھے۔ اس مکان میں کوئی بھی گھسنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ جانو قصائی نے اپنی بے وفا عورت کا قتل وہیں کیا تھا اور خود کالے پانی کی سزا کاٹ رہا تھا۔ لوگوں کے خیال سے جانو کی بیوی کی پیاسی روح وہاں بھٹکتی تھی۔ جب تیز ہوا چلتی تو وہ گرا ہوا مکان بے حد خوفناک ہو جاتا تھا۔

ایک شام بستی میں چراغ جل گئے تھے۔ سلمہ اسپتال سے لوٹ آئی تھی۔ ستار اپنی کوٹھری میں بیٹھا تھا۔ پوری بستی بڑی اداس تھی کہ زور سے ہوا چلنے لگی۔ جانو کے مکان کے سامنے والا پیپل بھوتوں کی طرح ہنسنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد بارش ہونے لگی۔

پانی برسنے کا شور چاروں طرف ہونے لگا۔ رستے اور کچی گلیوں میں بہتے پانی کا شور، مٹی کٹ کٹ کر بہنے لگی۔ ٹاٹ کے پردے بھاری ہو کر رہ رہ کر بکتر کی طرح جھول گئے اور گھروں کے چراغوں کی روشنی کانپ کانپ کر بجھنے لگی۔ اور تبھی جمن سائی کی باز جیسی تیز آنکھوں نے دیکھا۔ مسجد کی کوٹھری سے نکل کر ستار ادھر پیپل والی گلی میں جا رہا تھا۔ پھر وہ جانو والے بھوت مکان میں گھس گیا تھا۔ سائیں کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں . . .

اور تبھی ایک عورت تیزی سے اس مکان میں داخل ہو گئی تھی اور اسی لمحہ تیز بارش کا جال تیز ہوا کے ساتھ اس مکان اور پیپل پر ہہرتا ہوا نکل گیا۔

سائی کو لگا کہ جانو کی بیوی کی روح ستار سے عشق کر رہی ہے اور جب اس روح کا دل بھر جائے گا تب کھلا کھلا کر مار ڈالے گی۔

بارش میں بری طرح بھیگتا اور سر پہ بورا ڈالے ہوئے بدری آیا۔ اس کی آنکھوں میں آگ اور حیرت تھی۔ سائی کی کوٹھری میں اب بھی دھواں ٹھہرا ہوا تھا۔ بھیگا ہوا بورا لکڑیوں پہ ڈالتے ہوئے وہ ایکدم بولا۔ غضب ہو گیا سائی، اب بستی میں یہ حرکتیں ہونے لگیں ؛ وہ تمہارا ستار . . . . "

سائی درمیان میں بولا " قسمت ہے ستار کی۔ اچھا خاصا نوجوان ہے۔ جانو کی بیوی کی روح کا دل اس پر آ گیا ہے . . . اور روحوں کے بارے میں سائی بھی کچھ نہیں کر سکتا . . . روحوں کی زندگی میں دخل نہیں دینا چاہیئے . . . . . . "

بدری نے سنا تو زور دے کر بولا "سائیں وہ روح نہیں وہ گوشت پوست والی سلمیٰ تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، اپنی آنکھوں سے۔ ہم لوگوں کے ہوتے اگر یہ ہوگا تو لعنت ہے ہم پر۔"

"ہیں۔" سائیں کو لگا کہ بات ٹھیک ہے۔ یہ اس کا شک ہی تھا کہ روح آئی تھی سلمیٰ اور ستار ضرور یہ موقع پا کر اس مکان میں گئے ہوں گے۔

اور صبح ہی سائیں کی کوٹھری میں حاضری ہوئی۔ یہی رسم تھی اس بستی کی۔ غفور، بچن، بدری اور جعفر میاں کے ساتھ ہی نصیبن بھی موجود تھی۔ ستار ایک طرف بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ سلمیٰ اور سلمیٰ کے اندیشے باپ کا انتظار تھا۔ سائیں اپنی مونگے کی مالا پھیر رہا تھا۔ آنکھوں میں سرمے کی زیادتی سے ایک عجیب چمک تھی۔ انگلیوں میں پڑی ہوئی چاندی کی انگوٹھیوں کے نگ بینڈک کی آنکھوں کی طرح ابھرے ہوئے تھے۔

تبھی اوڑھنی ڈالے ہوئے سلمیٰ آئی۔

سائیں نے سر دیکھا اور تسبیح پھیرتے ہوئے کچھ بدبدایا۔ ایک چٹکی لوبان اس نے آگ میں ڈالا اور جیسے ہی دھواں پیدا ہوا بولا "ستار تم اسے پہچانتے ہو؟" اس کا اشارہ سلمیٰ کی طرف تھا۔ ستار کچھ گھبرا گیا۔ اس نے بیڑی جوتے سے دبلتے ہوئے بجھا دی اور دھواں اگلتے ہوئے بدبدایا "سبھی پہچانتے ہیں۔"

سلمیٰ مسکرائی۔

سائیں ناراض ہوا۔ "بات بننے کی ضرورت نہیں ہے، جو پوچھتا ہوں اس کا سیدھا سیدھا جواب دو۔"

ستار نے گہری سانس لی، بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھ سے لینا دینا کیا ہے؟ مجھ سے یہ سوال کیوں پوچھے جا رہے ہیں؟"

سائیں کا پارہ اور چڑھا۔ بدری نے سوچا اب جال کسے گا۔ نصیبن گہری نظروں سے سلمیٰ کو تاک رہی تھی۔ سائیں نے ایک چٹکی لوبان آگ پر پھر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ "تم اس سے ملتے جلتے ہو؟"

تبھی سلمیٰ کی آواز آئی۔ "یہ سب مجھ سے پوچھئے۔ میرے بارے میں بات پوچھنی ہے تو میں خود ہوں۔ جو پوچھئے اس کا جواب میں دوں گی۔"

"تو ہی بتا اسے جانتی ہے؟" سائیں نے اور بھی غصے سے پوچھا

"خوب اچھی طرح۔ اور پوچھئے۔" سلمیٰ نے جواب دیا۔

"تو اس کے ساتھ ... میرا مطلب ہے کہ ... اس بھوتیا مکان میں کل رات تو اس کے ساتھ ... یعنی ...." سائیں بات نہیں کہہ پا رہا تھا۔

سلمیٰ نے نظر پھیر کر ستار کو دیکھا اور بولی۔ "میں بتائے دیتی ہوں .... میں اس کے ساتھ بھوتیا مکان میں گئی تھی ..." کہتے کہتے اس کی آواز بھاری ہو گئی تھی اور گلا رندھنے لگا تھا۔

"کیوں گئی تھی؟" سائیں نے کڑک کر پوچھا۔

"ملنے ....." سلمیٰ نے صاف صاف کہہ دیا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے جیسے کہیں اندر اس نے کوئی بات بڑی گہرائی سے محسوس کی ہو۔ بے عزتی کی کھٹک بھی سائیں کی بات میں تھی۔ لیکن جس طرح اس نے بے جھجک جواب دے دیا تھا اس سے سبھی کے چہرے فق ہو گئے تھے۔ نصیبن بھی حیرت سے سلمیٰ کو دیکھ رہی تھی سلمیٰ کی صاف بیانی سے سائیں کی جو بے عزتی ہوئی تھی اس سے نصیبن دل ہی دل میں بے حد خوش ہوئی تھی۔

سائیں نڈھال تھا۔ لیکن اپنی عزتی وہ قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ دل ہی دل میں انتقام کی آگ دہک اٹھی۔ ستار کو اس نے تیز نظروں سے دیکھا اور پھر بولا۔ "تم وہ کوٹھری خالی کر دو۔"

"کیوں؟" سلمہ نے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں کہہ رہا ہوں۔" سائیں چڑ کر بولا۔

"ٹھیک ہے خالی کر دیں گے۔" سلمہ نے جواب دیا اور گھٹتے ہوئے لوبان کے دھوئیں کے گھیرے سے باہر ہو گئی۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔ ستار اب خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ سلمہ کو جاتے دیکھ کر وہ بھی اٹھا تو سائیں نے اسے روکا ——"تم ابھی رکو۔"

"رک کے کیا کروں گا" کہتا ہوا وہ باہر نکل گیا۔ چھوٹی سی محفل پر سناٹا چھا گیا اور تبھی ماحول کے بھاری پن کو چیرتی ہوئی نصیبن کی آواز سنائی دی۔ "اس سب سے کیا فائدہ ہوا سائیں؟"

"تو اپنا کام دیکھ۔" سائیں نے اسے دھتکار دیا۔

"ساری دنیا کی ذمے داری کیوں لے لی ہے تم نے سائیں؟ جس کے جو دل میں آتا ہے کرنے دو... تم ٹانگ کیوں اڑاتے ہو" کہتی ہوئی نصیبن کھڑی ہو گئی۔

اور اب —— جب نصیبن سائیں کو دیکھتی ہے تو اسے لگتا ہے کہ یہ بوڑھا سائیں بھی بہت ناسمجھ ہے۔ یہ کیوں نہیں سمجھتا کہ زندگی آخر زندگی ہے، وہ اس کی بنائی لکیروں پر چلنے والی مردہ چیز نہیں۔

ستار اور سلمہ کا یہ قصہ بستی میں آہستہ آہستہ پھیل گیا تھا۔ جتنا یہ قصہ پھیلتا جاتا تھا، سائیں اپنے کو چھوٹا محسوس کرتا جاتا تھا۔ لیکن اس کا بس نہیں چل رہا تھا۔ ستار نے کوٹھری بھی خالی نہیں کی تھی اور سنا تھا کہ اسے زنانے اسپتال میں دربان کی جگہ مل گئی تھی۔ وہ صبح نکل جاتا تو رات کو ہی لوٹتا تھا۔

لیکن ادھر پچھلے کچھ ہفتوں سے نصیبن دیکھ رہی تھی کہ ستار بہت اداس رہنے لگا تھا۔ آخر جب اس سے نہیں رہا گیا تو ایک دن جا کر نصیبن نے ہی بات شروع کی "سنا تم نوکر ہو گئے ہو۔"

"ہو گیا تھا لیکن نکال دیا گیا... آج کل کچھ بھی نہیں کر رہا ہوں۔" ستار نے بھاری آواز میں کہا۔

"ایسی کیا بات ہے؟" نصیبن نے پیار سے پوچھا تھا۔

"کچھ بھی نہیں... بس یوں ہی طبیعت نہیں لگتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہاں چلا جاؤں۔ یہ بستی چھوڑ کر کہاں کنارہ کر لوں۔" ستار بولا تھا۔

"سلمہ سے لڑائی ہو گئی ہے؟" نصیبن نے گہری نظروں سے اس کے جذبات پڑھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"لڑائی تو نہیں لیکن اس کا گھر والا آ رہا ہے۔" ستار نے بتلایا تھا۔

"تو تُو اتنا پریشان کیوں ہے؟ سلمہ کیا کہتی ہے؟" نصیبن نے پوچھا لیکن اسے لگ رہا تھا کہ سب پوچھ کر بھی وہ کچھ کر نہیں پائے گی۔ لیکن دنیا میں بہت سے ایسے زخم ہوتے ہیں جن کا مرہم بات کر لینا ہی ہوتا ہے۔ لیکن ستار کو سلمہ کی بے وفائی مارے ڈال رہی تھی۔ وہ اسے بے وفائی ہی سمجھتا تھا۔ سلمہ اپنے گھر والے سے طلاق بھی لے سکتی تھی اور باقی زندگی ستار کے ساتھ گذار سکتی تھی۔ دو گواہوں کو وہ کہیں سے بھی لے کر آتا.... لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے سلمہ کو بہت اکسایا کہ وہ طلاق لے لے لیکن نہ جانے کیوں وہ راضی نہیں ہوئی۔

سائیں کے شاگرد کہتے تھے کہ یہ سائیں کی چال ہے۔ سائیں کے پاس سلمہ کا دل بدل دینے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ نہ ہی سائیں نے کیا تھا۔

اور سلمہ کے گھر والے مقصود کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور آدمی بھی اس بستی میں آیا تھا۔ وہ علی گڑھ کا رہنے والا تھا اور اپنے کو سیاسی کارکن کہتا تھا۔

اور جب اس سیاسی کارکن نے دیکھا کہ ان جکوں کی بستی میں کوئی سنسنی نہیں ہے تو اس کے دل کو چوٹ سی لگی تھی۔ وہ کارکن سوچ ہی نہیں پا رہا تھا کہ یہ جکوے دنیا کی خبروں سے اتنے الگ تھلگ کیسے رہ رہے ہیں، انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے .... کہ مسلمانوں کو ایک نیا ملک ملنے والا ہے جس کے لئے جدوجہد چل رہی ہے....

جب وہ دیکھتا کہ مسجد میں مکتب لگتا ہے اور مندر کی چہار دیواری میں پاٹھ شالا جمتی ہے اور سب کچھ بدستور چل رہا ہے تو وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔

اور سچ مچ تب اس بستی کی اور ہی فضا تھی۔ مسلمان جکوں کے لڑکے مسجد کے مکتب میں ہل ہل کر کلام پاک کی آیتیں رٹتے اور پاٹھ شالا میں سنتری کی طرح کھڑے ہو کر بچے پہاڑ رٹا کرتے اور پہاڑہ دوہراتے۔

چھٹی ہونے پر تختیوں، بیٹریوں اور بستوں سے زبردست مار پیٹ ہوتی، بد کیے پھوٹتے، کھریا سے ناک منہ رنگا جاتا یا پھر تختی لیتے وغیرہ سب ایک جگہ اکٹھا ہوتے۔ ایک دو پہرے دار ان پر تعینات رہتے اور باقی سب غول بنا کر بجاوے کے پیچھے والی بیریوں پر دھاوا بول دیتے۔ دوسرے روز رکھوالے کی شکایت پر ادھر حمید مرغا بنا نظر آتا، اُدھر کنو کی پیٹھ پر تابڑ توڑ گھونسے بجتے ہوتے۔

جمن سائیں لمبا چوغا پہنے گلی سے ہوتا ہوا شہر کی طرف چلا جاتا۔ محمودہ کا باپ بٹھیا سویے بناتا رہتا۔ ناظر کا دادا پیر سے چھری دبائے کھال کی ڈوری کاٹتا رہتا۔ گلی کے ہر چھپر سے بکریوں کے ممیانے کی آواز آتی اندر بھیڑوں اور بکریوں کی کھالیں ٹنگی ہوئی سوکھتی رہتیں۔

گلی کے موڑ پر چمن کا گھر تھا۔ وہ جنگل سے بانس کاٹ کر لاتا تھا۔ گلی ہی میں آگ جلا کر وہ بانسوں کے موڑ سیدھے کرتا۔ کبھی کبھی بانس پٹاخے کی طرح بجتا تھا تو گلی کے لڑکے بڑا شور مچاتے تھے کہ "بندوق چلی"۔

اور گلی سے بائیں طرف ہی دلاور میلے تماشوں میں بیچنے کے لئے ڈگڈگیاں یا چیکاریاں کے خول کھال سے مڑھتا رہتا تھا۔ جب وہ چیکارے تیار کر لیتا تھا تو بڑی پیاری فلمی دھنیں بجاتا تھا۔

روزانہ یہ سب دیکھتے ہوئے سائیں نکل جاتا تھا۔ یہی ایک بستی ایسی تھی جس میں نئی تعمیریں نہیں ہو رہی تھیں۔ سب جیسے کے تیسے رہتے آ رہے تھے اور اپنے کٹورے میں پیسے کھنکھناتا ہوا اور تومبی لئے ہوئے جب وہ لوٹتا تو جیسے شہر بھر کا درد بٹور لاتا۔

اس بستی کے لوگوں کے لئے کسی کی پیدائش کا دن خوشی کا دن اور موت کا دن غم کا دن تھا۔ وہ دنیا میں رہتے تھے کیونکہ انہیں رہنا تھا۔ وہ کام کرتے تھے کیونکہ انہیں کام کرنا تھا۔ وہ زندہ تھے کیونکہ انہیں زندہ رہنا تھا۔

.... اور اسی لئے جمن سائیں کی کوٹھری کے پاس روحانی سکون کے لئے اسکیش کے قلفیوں اور پیکے والوں کا جمگھٹا بھی ہوتا۔ بیڑیاں پھونکی جاتیں اور چلمیں سلگتیں۔ پیکے والے زیادہ تر مسلمان تھے اور قلفی ہندو۔ لیکن ان میں

کچھ فرق نہیں تھا۔ سب پر زمانے کی مار تھی۔ سب کے تاسف ایک سے رنگ رہے تھے اور سب کے مسئلے ایک ہی تھے۔ انہیں مذہبی جھگڑوں سے مطلب نہیں تھا لیکن اس سے مطلب ضرور تھا کہ مذہب ان جیسے بدنصیبوں کے لئے کیا کہتا ہے؟ وہ سب ایسے بیٹھ جاتے جیسے ماتم کرنے آئے ہوں۔ گاڑی آنے کا وقت ہوتا تو ایک ایک کر کے سب اٹھ کر چلے جاتے۔

چھوٹے چھوٹے جھگڑے کے ساتھ یہاں کی زندگی چلتی تھی۔ کبھی کبھی ہفتوں گذر جاتے اور کوئی بات نہ ہوتی ستار کبھی غفور کے ساتھ ساتھ جانور کھانے لگا تھا۔ اب قصائی گھر تک جانے کا کام وہی کرتا۔ بکرے پر نمبر لیتا اور پرچیوں کے ساتھ گوشت بازار میں پہنچا دیتا۔ تہوار دن پر وہ بغیر لائسنس کے ہی گھر پر چوری چھپے کاٹ لیتا اور بڑے آرام سے پاس بازار میں پہنچا دیتا۔

ستار کو جیسے جانور مارنے میں مزہ آنے لگا تھا۔ وہ سلمہ کا پیچھا اب بھی کرتا۔ سلمہ بھی کبھی کبھی آنکھ بچا کر اس سے بات کر لیتی۔ گوشت بازار سے وہ لوٹتا تو زنانے اسپتال کے پاس کچھ دیر ضرور بیٹھتا۔ جن دنوں وہ وہاں کام کرتا تھا تب کچھ لوگوں سے جان پہچان ہو گئی تھی۔ خاص طور سے رتن سے۔ رتن کی سائیکل مرمت کی دوکان تھی پھاٹک کے پاس۔ گاؤں سے سائیکلوں پر آنے والے لوگوں سے وہ مرمت کے بدلے میں گھی یا دودھ بھی لے لیتا تھا۔ اسے چرس کا شوق تھا اور اپنی کاٹھ کی دکان میں اس نے سنیما اسٹاروں کی تصویریں چپکا رکھی تھیں۔ ان تصویروں کے گلے میں سیپوں کی لمبی لمبی مالائیں پڑی تھیں۔

اس دن گوشت بازار سے لوٹ کر ستار اسی کی دکان پر بیٹھ گیا۔ رتن نے ہاتھ کا کام جاری رکھتے ہوئے پوچھا "کیوں کب سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

"ملاقات! اب وہ ملاقات نہیں کرنا چاہتی۔" ستار نے سیدھے سے جواب دے دیا۔

"تو زبردستی کر لو، ڈر کاہے کا ہے۔ ادھر سے رات کو لوٹتی ہے، راستے میں پکڑ کر ملاقات کر لو۔ آخر کہتی کیا ہے؟" رتن نے بیڑی سلگا لی تھی۔

"یہی کہتی ہے تمہارا خیال مجھے ہر وقت رہتا ہے جب بھی اکیلے بیٹھتی ہوں تمہارے بارے میں سوچتی ہوں" گہری سانس لے کر ستار نے آگے کہا "لیکن اس کے رنگ ڈھنگ سمجھ میں نہیں آتے۔ ایک طرح سے سوچتا ہوں تو ٹھیک ہی لگتا ہے۔ اس کا آدمی آگیا ہے۔ اب اسے میری ضرورت نہیں ہے اور ہو بھی کیوں؟ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں؟"

"اس کا آدمی کیا کرتا ہے؟" رتن نے پوچھا۔

"فیروزہ آباد کے چوڑی کارخانے میں کاریگر ہے۔" ستار نے بتایا۔ "کچھ دن رہ کر پھر چلا جائے گا۔"

"تب کاہے کو پریشان ہے، وہ پھر راستے پر آجائے گی۔" رتن نے ستار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ستار کے چہرے پر ایک عجیب تاثر پیدا ہو رہا تھا اور اس کے سامنے وہ منظر گھوم رہے تھے جن میں کہیں نہ کہیں سلمہ ضرور تھی۔ اور ایک دن اسپتال کے پھاٹک پر ستار کو دیکھ کر سلمہ بھی بھاگی بھاگی آئی تھی اور صرف اتنا ہی کہہ کر چلی گئی تھی کہ کل رات مجھے پیپل والے گھر میں ملنا... ایک عجیب خواب کی طرح سب یکایک گذر گیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ اسپتال سے لوٹ رہا تھا اور اپنی گمٹی میں خاموش بیٹھ گیا تھا۔

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ نہیں تو سلمہ اتنی اداس نہ ہوتی۔ اور شاید اسے اس طرح کل رات کا بلاوا نہ دیتی۔

دن بھر وہ اسی انتظار میں رہا کہ کب رات ہو اور کب وہ سلمہ سے ملے۔ مسجد والی کوٹھری میں وہ یہی سوچتا پڑا رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ ابھی تک سلمہ کو اس نے اچھی طرح آنکھ بھر کر نہیں دیکھا ہے۔ رات وہ اسے کچے آنگن میں پھیلی چاندنی میں گھسیٹ لے جائے گا۔۔۔ آسمان میں بادل ہوئے تو کبھی چاند سے نکلتی ہوئی شعاعیں تو ہوں گی۔ اس میں وہ سلمہ کو بہت بہت پیار کرے گا۔ کوٹھری میں پڑے لیٹے وہ سلمہ کے بار بار دیکھے ہوئے چہرے کو یاد کرتا تو لگتا جیسے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ وہ جھنجھلا اٹھتا تھا۔

سیلن بھری کوٹھری میں اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ ابھی تو رات میں بہت دیر باقی تھی۔ ابھی تو شام بھی نہیں ہوئی تھی۔ شام کے بعد رات ہوگی۔ بستی کے کچے گھروں سے پکتے کھانوں کی مہک آئے گی اور بات چیت کی آوازیں دیر تک آتی رہیں گی۔ پھر کوئی گلی میں اپنے لڑکے کو ڈھونڈتا ہوا اور گالیاں دیتا ہوا نکلے گا اور پیٹتے پیٹتے لڑکوں کو گھر پکڑ لے جائے گا۔ کچھ دیر بعد ایک ادھ گھروں سے برسات میں پھولے ہوئے کواڑوں کی بند ہوتے کی چرچراہٹ آئے گی۔ پھر ٹاٹ کے پردوں سے چھن کر آتی ہوئی چراغوں کی روشنی گل ہوگی اور تب پاس کے پُل سے گذرتی ہوئی ٹرین کی کھڑکھڑاہٹ آئے گی۔ آہستہ آہستہ اسٹیشن کا شور ڈوب جائے گا اور بستی نیند میں کھو جائے گی۔

یہ سب سوچتے سوچتے وہ کوٹھری سے باہر نکل آیا تھا۔ کنڈی چڑھا کر وقت کاٹنے کے لئے وہ ریل کے پُل کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں چٹانوں پر بیٹھے بیٹھے دن ڈھلنے کا انتظار کرتا رہا۔۔۔۔ جب دل گھبرا گیا تو لوٹ پڑا۔ کوٹھری تک واپس آتے آتے اسے لگا جیسے اندھیرا ایکایک جلدی سے اتر آیا ہو۔ دل کو بڑی راحت ملی اور پھر جیسا اس نے سوچا تھا ویسا ہی ہوتا گیا۔۔۔۔ کوٹھری میں لیٹے لیٹے اس کے کان وقت بیتنے کی سب آہٹیں سنتے رہے۔۔۔۔ سب آہٹیں آتی رہیں اور پھر سب آہٹیں اور آوازیں ڈوب گئی تھیں۔ یہ کب ہوا اسے پتہ نہیں چلا۔

اور جب اس کی آنکھ کھلی تو چونک کر اس نے دیکھا۔۔۔۔ شاید چاندنی پھیلی تھی۔ تبھی اذان کی آواز کانوں میں پڑی ۔۔۔ صبح ہو چکی تھی۔ رات بھر وہ سوتا ہی رہ گیا تھا۔ یہ ہوا کیا؟ وہ سمجھ ہی نہیں پایا۔ یہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا؟ وہ قطعی یقین نہیں کر رہا تھا کہ رات بیت چکی ہے اور وہ کوٹھری ہی میں سوتا رہا ہے۔ ہڑبڑا کر وہ باہر نکلا۔ گلی سے ہوتا ہوا سلمہ کے گھر کی طرف گیا۔ دروازہ بند تھا۔ کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ صرف اذان کی آواز مسجد سے آرہی تھی۔

بہت پچھتاوا ہوا اسے۔ کس نشے میں وہ سوتا رہ گیا۔ سلمہ ضرور آئی ہوگی اور انتظار کر کے لوٹ گئی ہوگی۔ کیا سوچا ہوگا اس نے؟ ملے گی تو وہ کیا بتائے گا؟ اور بتلائے گا تو بھی وہ یقین نہیں کرے گی۔

اور اسی رات کے بعد سلمہ بدل گئی تھی۔ ساتھ ہی دوسرے دن سنار کو اسپتال کی نوکری سے بھی جواب مل گیا تھا۔

انہی دنوں آزادی کا اندولن دیش بھر میں زور پکڑ رہا تھا۔ شہر میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو سیاست میں حصہ لیتے تھے اور جن کی زبانوں پر گاندھی، نہرو اور جناح کا نام بار بار آتا تھا۔ یہ اوپری طبقہ تھا جو نیچے کے لوگوں سے ملتا جلتا نہیں تھا۔ صرف نیچے طبقے والوں میں ان کی شہرت پہنچتی تھی۔ چکوں کی اس بستی کے لوگ صرف یہ جانتے تھے کہ فلاں ڈاکٹر بھگوان داس ہیں اور وہ جو کھادی کی دھوتی پہنتے ہیں ۔۔۔ وہ گپتا جی ہیں۔

صحیح بات یہ ہے کہ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ آزادی کہاں ملتی ہے، یہ کس کے پاس ہے اور اسے کون دے گا لمبی غلامی کے بعد۔ انہیں صرف یہی معلوم تھا کہ انگریزوں نے ہمارے دیش کی ساری دولت لوٹ کر ولایت پہنچا دی ہے اور ہم غریب ہو چکے ہیں۔ اب وہ نسل سامنے آ چکی ہے جس نے یہ نہیں دیکھا تھا کہ ۱۸۵۷ میں انکے

آباء و اجداد نے آزادی کو قائم رکھنے کے لئے اپنا خون بہایا تھا۔ انھیں صرف یہی معلوم تھا کہ ہم غلام ہیں اور غلامی ہی کی وجہ سے غریب ہیں۔

۴۲ء کے آندولن نے ان کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ ۔ ۔ اور انھیں لگا تھا کہ کچھ ہو رہا ہے۔ شہر بھر میں عجیب سی سنسنی تھی۔ یوں سائیں سیاست اور سیاسی باتوں میں دخل نہیں رکھتا تھا لیکن اس نے ہی جا کر سب کو بتایا تھا کہ گاندھی جی نے انگریزوں سے کہا ہے کہ وہ حکومت چھوڑ جائیں اور اپنے دیش چلے جائیں۔

لوگوں نے سنا تھا تو بات سب سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ جعفر میاں بولے تھے۔ "تو پولیس بھی بدل جائیگی"۔ ان کے لئے ہی سب سے بڑا سوال تھا، کیوں کہ جب بھی شہر میں کوئی چوری بھاری ہوتی تو پولیس والے جعفر کو ضرور گھیرتے تھے۔ بدری نے بھی سوال کیا تھا "کیا انگریز اس طرح چلے جائیں گے"؟ تو سائیں نے اپنی عقل سے بتایا تھا کہ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ ۔ ۔ دیکھو کیا ہوتا ہے؟ اور بات اس وقت وہیں رک گئی تھی۔ لیکن بستی کے جوان لڑکوں کو جیسے ہی خبر ملی، وہ شہر پہنچے اور ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ٹھیک ٹھیک انھیں بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ یہ سب توڑ پھوڑ کیوں کر رہے ہیں۔ لیکن ان کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ "ڈاکٹر بھگوان داس کو پولیس نے کیوں پکڑا؟ ہم آزادی لیں گے۔ پولیس راج ہٹائیں گے"۔ ۔ ۔

ایک عجیب سنسنی تھی اور اس سنسنی میں آزادی کی بھنک تھی۔ سبھاش چندر بوس کے قصے تھے۔

شہر کا بازار بند تھا۔ دوکانوں کے باہر لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ کچہری، کوتوالی اور تحصیل پر پولیس کی موجودگی کی وجہ سے لگ رہا تھا کہ کچھ ہونیوالا ہے۔ نیچے کے طبقے میں دھیرے دھیرے ایک ہی بات پھیل رہی تھی۔ سبھاش چندر بوس اپنی فوج لے کر کلکتہ پہنچ گئے ہیں۔ کلکتہ سے انگریزوں کو انھوں نے مار بھگایا ہے اور اب ان کی فوج جے ہند کا نعرہ لگاتے ہوئے دلّی کی طرف بڑھ رہی ہے۔

جس وقت ڈاک خانہ جلا یا گیا تب رات ہو رہی تھی۔ لپٹوں کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ لوگوں کے دلوں میں خوشی بھری ہی تھی کیونکہ انتقام کا سنتوش چھوٹا نہیں ہوتا۔ جاتی ہوئی ریل گاڑیوں پر پتھر پھینکنے کے لئے لڑکوں کی قطاریں ریلوے لائن کے آس پاس کھڑی تھیں۔ گلیوں میں گرم گرم بحثیں ہوتی تھیں اور بازار میں سناٹا چھایا رہتا تھا۔ یکایک سناٹے کو چیرتی ہوئی آوازیں آتی تھیں اور کسی سرکاری عمارت سے لپٹیں پھوٹنے لگتی تھیں۔ انگریزوں نے جو نئی بستی بسائی تھی اس میں بہت سخت پہرہ تھا۔ ادھر جو بھی جاتے کی ہمت کرتا گرفتار کر لیا جاتا لیکن گرفتاریاں لوگوں کی امنگوں کو دبا نہیں پاتی تھیں۔ تار کاٹ دیے گئے تھے اور کچھ عمارتوں کی دیواروں کو تار کول سے کالا کر دیا گیا تھا۔

اوپر سے یہ سب جنون ہی لگتا تھا۔ ۔ ۔ کیونکہ آندولن کو چلانے والے رہنما جیلوں میں بند تھے اور ان کی غیر حاضری میں جس کی سمجھ میں جو آرہا تھا، کر رہا تھا۔ لیکن اس جنون اور توڑ پھوڑ کے پیچھے آزادی کی امنگ کا دور دورہ تھا۔ پورا شہر اس میں شامل تھا یہاں تک کہ پولیس بھی کھڑی کھڑی دیکھتی رہتی تھی۔

چنگوں کی بستی میں نوجوان لڑکے ان دنوں سینہ پھلا پھلا کر گھومتے تھے کیونکہ انہوں نے توڑ پھوڑ میں حصہ لیا تھا۔ سائیں کو یہ سب برا لگتا تھا۔ وہ کہتا تھا "ہمیں کیا ملنا ملانا ہے؟ یہ سب تو اوروں کے لئے ہے"۔ لیکن ستار دل ہی دل میں سازشیں کرتا رہا۔ کسی نے تو یہاں تک کہا کہ ندی کے پل پر ستار چھری چھپا کر بیٹھتا ہے۔ ۔ ۔ اور

اس انتظار میں رہتا ہے کہ کوئی انگریز اُدھر سے نکلے تو مار دے لیکن اس کے ہاتھ کوئی شکار نہیں آیا۔

سلمہ نے جب یہ سنا تو دل دہل گیا۔ ستار یہ کیا کرنا چاہتا ہے ... کہیں کسی انگریز نے پستول چلا دی تو کیا ہوگا؟ بڑی پریشانی تھی اسے۔ اس کا گھر والا مقصود دن بھر گھر میں پڑا رہتا تھا اس لئے کہیں نکل بھی نہیں پاتی تھی اور مقصود کا دوست جو کہ اپنے کو علی گڈھ کا سیاسی کارکن بتاتا تھا وہ بھی دن بھر کھاتا اور پڑا رہتا تھا۔ سلمہ بہت بے تاب تھی لیکن کوئی چارہ نہیں تھا۔ آخر ہار کر وہ رتن کی دکان پر پہنچی تھی۔ یہی آسان طریقہ تھا کیونکہ وہ اسپتال آتی ہی تھی۔ اور رتن کی سائیکل کی دوکان عین پھاٹک پر تھی۔ رتن نے سلمہ کو اپنی دکان پر دیکھا تو چونک پڑا۔ اتنے برسوں میں کبھی سلمہ نے اس کی دوکان کی طرف نظر بھی نہیں اٹھائی تھی۔ وہ لپک کر آ گیا ـــ "کیا ہے؟"

"ستار کا کچھ پتہ ہے؟" سلمہ نے پوچھا۔

"دیکھا تو تھا ...." رتن نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ملے تو کہہ دینا میں پوچھ رہی تھی" اتنا کہہ کر سلمہ ڈیوٹی پر چلی گئی تھی۔ لیکن ستار پھر سلمہ سے نہیں ملا۔ رتن نے کہا تو اس نے بس یہی جواب دیا "اب مل کر کیا کروں گا ... اس سے کہنا جب مر جاؤں تو میری قبر پر ملنے چلی آئے۔ وہیں ملاقات ہوگی۔"

ستار پڑا پڑا یہی سب سوچ رہا تھا کہ کوٹھری کے دروازے پر کسی کی آہٹ ہوئی۔ باہر نکل کر دیکھا تو نصیبن تھی۔ ستار ایک دم بولا "ارے نصیبن تو؟ تم؟"

"تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟" نصیبن نے کہا۔

"آخر کوئی بات بھی ہو؟" ستار نے پوچھا۔

کاہے کو جان دینے کو گھوم رہا ہے ... سنا ندی کے پُل پر جا کر بیٹھتا ہے" نصیبن کہہ رہی تھی کہ ستار نے بانہیں پکڑ کر اسے اندر کمرے میں بٹھا لیا اور بولا "ہاں بیٹھتا تو ہوں ...."

"تیرا ارادہ کیا ہے؟" نصیبن نے بات کاٹ کر پیار سے جھگڑتے ہوئے پوچھا۔

"ارادہ! ارادہ تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن اتنا ضرور لگتا ہے کہ اگر ایک بھی انگریز مار لیا تو دل میں ٹھنڈک آئے گی۔"

"اس سے ہوگا کیا؟" نصیبن نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اتنا مجھے پتہ ہے کہ انگریز ہمارے دشمن ہیں، ہندوستان کے دشمن ہیں اور انہیں مار بھگانا ہمارا فرض ہے۔ سارا ملک آج مخالفت میں اٹھ کھڑا ہوا ہے۔"

"تجھے یہ سب کیسے پتہ؟" نصیبن نے پوچھا۔

"سب خبریں شہر میں آتی ہیں ... تحصیل کے پاس مختار نیاز علی کا مکان ہے۔ وہیں یہ سب پتہ چلا۔ انہوں نے ہی کہا تھا کہ یہی وقت ہے جب ہم انگریزوں کو اپنے وطن سے مار بھگا سکتے ہیں۔"

"تو، تو اکیلا کیا کرے گا؟" نصیبن نے فکرمندی سے پوچھا۔

"اکیلا کہاں ہوں ... تمام لوگ ساتھ ہیں۔ آج تو شہر کے ایسے ایسے لوگ ساتھ ہیں جنہیں میں نے پہلے دیکھا تک نہ تھا۔ ہم سب مل جل کر اپنا کام طے کرتے ہیں ..." ستار نے نصیبن کو بتایا تو وہ کچھ سوچتی رہی۔ پھر دھیرے سے بولی "سن میرے پاس ایک اصلی لوہے کی گپتی ہے ... ہاتھ میں رکھو تو چھوٹا سا ڈنڈا لگتی ہے۔ کھولو تو آدھے ہاتھ کا پھل ہے اس میں۔ تو ادھر آ تو میں تجھے دے دوں۔ کسی سے مت کہیو سمجھا" پھر کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے

کے بعد پچھواڑے کی طرف نکل گئی تھی۔

دوسرے دن ایک اور ہی بستی تھی۔ مسجد کے احاطے میں جمن سائیں نے ایک میٹنگ کی تھی جس میں مدرسے کے مولوی صاحب اور بستی کے دوسرے مسلمانوں کے علاوہ سلمہ کا آدمی مقصود بھی تھا۔

بستی کے مسئلوں میں ہاتھ بٹانے کا مقصود کا یہ پہلا موقع تھا۔ مقصود نے اس چھوٹی سی میٹنگ میں اپنی بغل میں بیٹھے ہوئے سیاسی کارکن کا تعارف سب سے کرایا ـــ "یہ یسین صاحب ہیں۔ علی گڈھ کے سیاسی کارکن ہیں۔ مسلم لیگ میں کام کرتے ہیں اور مسلمانوں کی بھلائی کی خاطر ہی جگہ جگہ گھومتے ہیں۔ جناح صاحب انہیں بڑی عزت کی نظروں سے دیکھتے ہیں، یہ آج آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔"

سائیں نے سب کو غور سے دیکھا اور دھیرے سے سر ہلایا۔ مسجد کے صحن میں کبوتر دانہ چگ رہے تھے وہیں ستار نہ جانے کب آکر بیٹھ گیا تھا۔ سائیں کی نظر اس پر پڑی تو اس نے آنکھ سے پاس آنے کا اشارہ کیا لیکن ستار وہیں بیٹھا رہا۔ اسے نیچے فرش پر بیٹھنے میں دقت بھی ہوتی، نصیبن کی دی ہوئی لنگی وہ کمر میں چھپائے ہوئے تھا۔ اسٹیشن کے پیچھے والے بھی اس مجمع میں حصہ لینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ افتخار پیچھے والا گھٹنوں پر باہیں لپیٹے بیٹھا تھا۔ اس کے دل میں نہ جانے کیسا شک رینگ رہا تھا۔ رہ رہ کر وہ یسین، مقصود اور سائیں کو دیکھتا اور دل ہی دل میں کسمسانے لگتا۔

ستار مقصود کو بڑے غور سے آنکھ بچاکر تکتا تھا اور اس کے سامنے سلمہ کا چہرہ گھوم جاتا تھا ـــ وہ یہ یقین ہی نہیں کر پا رہا تھا کہ اس مقصود کے لئے سلمہ اسے چھوڑ سکتی ہے ... آخر اس میں ہے کیا؟ عجب لفنگا تو لگتا ہے۔ اس کے ساتھی سیاسی کارکن یسین کی نظروں میں ایک تیزی اور سمجھداری ضرور جھلک رہی تھی۔

تبھی اس کے کانوں میں آواز آئی۔ علی گڈھ کا سیاسی کارکن یسین کہہ رہا تھا ـــ "تو بات جنگ کی نہیں ہے اس وقت ہمیں اُن اندرونی باتوں کو سمجھنا ہے جو جناح صاحب کہہ رہے ہیں۔ آپ ہندوؤں کی چالوں کو نہیں سمجھتے۔ ہندو قوم کبھی ہمارے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ ہم نے ہندوستان پر صدیوں حکومت کی ہے۔ آزادی کے بعد اس کا بدلہ وہ مسلمان قوم سے لیں گے۔ یہ بات بالکل طے ہے۔"

افتخار ذرا اور کسمسایا۔ آخر اپنے کو نہ روک سکنے کی وجہ سے وہ بول ہی پڑا۔ "لیکن سنا ہے کانگرس ہندو مسلمان دونوں کو ساتھ لیکر چلنا چاہتی ہے۔ وہ یہ فرق نہیں کرتی۔"

سائیں کی بھویں ٹیڑھی ہو گئیں ـــ بولا۔ "کانگرس تو ہندوؤں کی جماعت ہے۔"

یسین نے سدھی ہوئی آواز میں بات کو سنبھالا۔ "سچی بات یہ ہے کہ یہ غلط فہمیاں بہتوں کو ہے۔ کانگرس اگر ہماری جماعت ہوتی تو ہمیں لیگ بنانے کی ضرورت کیوں پڑتی؟ اگر ہندوؤں کے مندروں میں عبادت کی جا سکتی تو مسجدوں کی تعمیر کیوں ہوتی؟ ہندو ہندو رہے اور مسلمان مسلمان ...." مقصود نے اس مثال پر بڑے زور سے سر ہلایا۔ ستار کو دل ہی دل میں بات تو اچھی لگی تھی لیکن مقصود کے سر ہلانے کی وجہ سے اس نے تائید نہیں کی۔ میٹنگ میں ایک عجیب سا اسرار بڑھتا جا رہا تھا۔ لگتا تھا کوئی بہت بڑی بات ہونے جا رہی ہے۔

کچھ ٹھہر کر یسین نے بات آگے بڑھائی ـــ "ایک راز کی بات جو میں آپ سب کو بتانا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ حکومت برطانیہ نے ہم مسلمانوں کو یہ یقین بھی دلایا ہے کہ جنگ میں جیتنے کے بعد وہ ہمیں پوری مدد دیں گے۔

اور اگر ممکن ہوا تو ہمارا ایک نیا ملک بھی ہوگا۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ ڈاکٹر اپنے کمیٹی کے سر فیروز خان نے ہندوستان کو پانچ حصوں میں بانٹنے کی بات سامنے رکھی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ بھائیو! ہم، مسلمانوں کے لئے الگ حق چاہتے ہیں۔ ہم اس بات کو قطعی نہیں مانیں گے جیسے گاندھی جیسے ہندو رہنما طے کریں گے۔"

تبھی سائی نے بات جوڑی۔ "ہندو لیڈر یہ چاہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو ساتھ لیکر ابھی تو انگریزوں سے حکومت چھین لے بس ... بعد میں وہ مسلمانوں کو انگوٹھا دکھا دیں گے۔ یہی ان کی چال ہے۔" یٰسین نے اگلی بات کہی۔

"اس لئے جناح صاحب نے اس اندولن کو غلط بنایا ہے اور کہا ہے کہ کوئی بھی سچا مسلمان ہندوؤں کے اس اندولن میں شرکت نہ کرے، اور ایک بہت ہی خاص بات جناح صاحب نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ میں اس وقت حکومت برطانیہ سے یہ پکا وعدہ لے لینا چاہتا ہوں کہ لڑائی کے بعد ہمیں پاکستان مل جائے گا۔ اگر پاکستان کی شرط منظور ہو جاتی ہے تو جناح صاحب سرکار میں شامل ہو جائیں گے۔ ورنہ نہیں۔ تو بھائیو اس وقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پاکستان کی مانگ کو ذرا شور سے اٹھائیں۔ ایسا کوئی کام نہ کریں جس سے ہمیں ہندوؤں کے ساتھ شامل سمجھا جائے ...."

مقصود کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ رہ رہ کر بیچ بیچ میں یٰسین کی بات کی تائید کرتا تھا۔ موقع ملتے ہی وہ بولا۔ "فیروزہ آباد، کانڈلہ، آگرہ اور بھوپال وغیرہ ... سب جگہ یہی باتیں سوچی جا رہی ہیں.. ہندوستان کا بٹوارہ ہوتا ہے۔"

اُسی کی بات میں گانٹھ لگاتے ہوئے یٰسین نے اور آگے بتایا۔ "اس کے لئے خون خرابہ بھی ہو سکتا ہے۔ آسانی سے ہندو اس تقسیم کے مسئلے کو نہیں مانیں گے، ہمیں ان سے لوہا لینا ہوگا، ضرورت ہوئی تو ہمیں قربانیاں دینی پڑیں گی کیونکہ ہندوؤں کے دلوں میں ہمارے لئے ایک نفرت ہے کیونکہ ہم نے یہاں سلطنتیں قائم کی تھیں۔ ہماری قوم حکومت کرنے اور اسلام کو پھیلانے کے لئے ہی زندہ ہے۔"

اور اس کے بعد جوش کی جو باتیں اس نے کہی تھیں ان سے سننے والوں پر ایک عجیب سناٹا چھا گیا تھا۔ میٹنگ ختم ہونے کے بعد طرح طرح کی اور باتیں بھی ہوتی رہیں جن میں کچھ بڑی سنسنی خیز بھی تھیں۔ سائی نے آہستہ سے کہا تھا "سُنا ضلع قنوج میں آریہ سماجیوں نے ایک مسلمان گھرانے کو ہندو بنا لیا ہے۔"

"اتنا ہی نہیں کان پور میں تو دن دہاڑے چار ہندو غنڈے دو مسلمان عورتوں کو بھگا لے گئے۔ آج تک ان کا پتہ نہیں چلا۔"

"اور سنا ہے کہ ادھر الٰہ آباد میں بڑا زبردست فساد ہوا ہے جس میں کئی سو لوگ مارے گئے ہیں... پولیس بھی ہندوؤں کا ساتھ دے رہی ہے۔"

بڑی دیر تک مسجد کے احاطے میں ایسی ہی باتیں ہوتی رہیں۔ ان باتوں کے دوران افتخار ہی ایک ایسا تھا جو دل ہی دل گھٹتا رہا۔ اس نے ایک دفعہ آہستہ سے کہا بھی۔ "اصلی لڑائی تو غریبی اور رہبری کی ہے۔ ملک کی تقسیم ہو جانے سے ہمیں کیا مل جائے گا؟"

یٰسین نے اسے سمجھایا تھا — بھائی جان اپنا ملک اپنا ہی ہوتا ہے۔ ابھی تو آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اگر ہندوؤں کا راج ہوا تو اس ہندوستان میں ہمیں کتنی مصیبتیں اور ستم سہنے پڑیں گے۔ ہندوؤں کی چال یہی ہے کہ یہاں کے سارے مسلمانوں کو پھسلا کر، دبا کر اور ضرورت پڑی تو زبردستی ہندو دھرم قبول کروایا جائے۔

آپ ان کی باتوں کو نہیں سمجھتے۔"

اور چونکہ زیادہ تر لوگ لیسین کی باتوں کو صحیح سمجھ رہے تھے اس لئے افتخار کو خاموش رہ جانا پڑا تھا۔ ستار کو باتیں تو صحیح لگ رہی تھیں لیکن مقصود کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے وہ ان میں شامل ہو کر تائید نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اور اس دن کی میٹنگ اگلے جمعرات تک کے لئے برخاست کر دی گئی۔ مسجد کی سیڑھیوں سے نیچے اترتے ہوئے مقصود نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ لیسین کے ساتھ انہیں باتوں کا اعلان کرنے کے لئے آس پاس کے علاقوں میں جا رہا ہے۔

ستار جب اپنی کوٹھری میں آیا تو اس کا من بہت بھاری تھا۔ اس کے دماغ میں طرح طرح کے خیال آ جا رہے تھے۔ اسے یہ لگتا تھا کہ شاید پاکستان بننے سے ایک نئی زندگی کی حدیں کھل جائیں۔ کچھ ایسا ہو کہ اسے اپنی بے کاری اور ناکامی سے نجات مل جائے اور ایک نیا راستہ مل جائے جو زندگی کو خوشحال کر دے۔ لیکن رہ رہ کر اسے یہ بھی خیال آتا تھا کہ یہ سب کچھ ہو گا نہیں۔ کیسے ہو گا؟ کروڑوں مسلمانوں کے بیچ اس کی بساط ہی کیا ہے؟ کون پوچھے گا اُسے؟ تبھی مقصود کی یہ بات کہ وہ باہر جا رہا ہے اس کے دماغ میں یکایک کوندی تھی ... ایک نرم سا ہاتھ اسے سہلا گیا تھا اور اس نے طے کیا تھا کہ وہ سلمہ سے ملے گا۔

رات گہری ہو کر بستی پر چھا گئی تھی۔ دور اسٹیشن پر روشنی ہو گئی تھی اور ... نالے کے پُل سے گذرتی ریل کی دھمک اور گڑگڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ مسجد کی میناریں اور گنبد اندھیرے کے سیلاب میں ڈوب گئے تھے۔ افتخار سواریوں کی تلاش میں یکہ جوت کر اسٹیشن کی طرف کافی پہلے جا چکا تھا۔

جب کمرے میں لیٹے لیٹے اسے نیند نہیں آئی تو سوچا کہ نصیبن کو اس کی گیتی ہی واپس کر آئے۔ کیونکہ اب وہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں کو مارنے میں مدد کیوں دے؟

کمرے سے نکل کر اس کے پیر نصیبن کے گھر کی طرف نہیں اٹھے تھے۔ وہ سیدھا بیل والی گلی میں چلا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں سلمہ کی ایک آہٹ پانے کے لئے وہ بے تاب سا ہو رہا تھا۔ سلمہ کے گھر کے باہر سے جب وہ گذرا تو اس نے ذرا سی آہٹ لینی چاہی۔ ایک منٹ ٹھہر کر اس نے باتیں سننے کی کوشش کی۔ کھلے ہوئے دروازے کی جھریوں سے روشنی آ رہی تھی اور کچھ بات چیت ہو رہی تھی۔ تبھی اسے سلمہ کی کھلکھلاہٹ سنائی پڑی۔ اور اس کا دل ایکدم اداس ہو گیا۔ اسے لگا کہ رتن سے سلمہ نے ملنے کی جو بات کہی تھی اس میں کوئی سچائی نہیں تھی؟ اگر وہ ستار سے ملنا ہی چاہتی تھی تو اپنے آپ بھی مل سکتی تھی۔ کچھ دور جا کر وہ پھر رک گیا۔ اس کے دل پر اس کھلکھلاہٹ سے اب بھی گھونسے سے لگ رہے تھے تب راہیں کھڑے کھڑے اس نے طے کیا تھا ... کہ وہ ایسا کوئی بھی کام ہرگز نہیں کرے گا جس میں مقصود کا ہاتھ ہو۔"

آدھی رات گئے وہ پریشان سا کوٹھری میں لوٹ آیا تھا۔ نیند تب بھی نہیں آ رہی تھی۔ تبھی بستی کی کچی سڑک پر افتخار کے یکے کی ہلکی کھڑکھڑاہٹ سنائی پڑی تھی۔ جب وہ مسجد کی بغل سے گذرا تو ستار نے اسے پکار لیا۔

افتخار نے راس کھینچ کر پوچھا "کیا بات ہے ستار؟"

"کچھ نہیں افتخار بھائی، آج پتہ نہیں نیند کیوں نہیں آ رہی ہے؟"

"یٰسین کی باتیں پریشان کر رہی ہیں؟"

"نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ نیند نہ آ رہی ہو تو آؤ بیٹھو۔"

لیکن یکے سے اتر کر آنے میں افتخار کو کافی پریشانی ہوئی تھی۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ جیسے تیسے اس نے گھوڑے کو وہیں کھول دیا تھا، مدہا پائے دان میں بھری گھاس اس کے سامنے ڈال کر ستار کی کوٹھری میں گھس گیا تھا۔

"نیند کی دوا دوں؟"

"ہے؟"

"ہاں ہے۔"

"تو لے آؤ ذرا۔"

افتخار نے اشارے سے اسے بتایا تھا۔ پائے دان کی گھاس میں سے ہی وہ بھنگ کا ایک پودا نکال لایا۔ دونوں بڑی دیر تک وہیں بیٹھے بیٹھے پیتے رہے اور جب نشہ ستار پر حاوی ہو گیا تو بولا "افتخار بھائی جی کرتا ہے سب سے پہلے مقصود کے سینے میں چھرا اتار دوں۔"

"کیوں؟"

"بس یوں ہی۔"

افتخار نے بات کو سمجھا تھا۔ بولا "سلمہ کی وجہ سے؟"

بھنگ کا گھونٹ لیتے ہوئے وہ بولا تھا "تم نے اصل بات پکڑ لی افتخار بھائی۔ مقصود کی باتوں سے میری نا اتفاقی نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ میری نبھ نہیں سکتی۔"

افتخار ایک منٹ خاموش رہا۔ میلی ٹوپی کے کنارے دبی ہوئی بیڑی نکال کر اس نے سلگائی اور بیٹھا پیتا رہا۔ پھر جیسے بہت سوچ سمجھ کر بولا تھا "ستار بھائی ہو چاہے کچھ لیکن مجھے لگتا ہے کہ ان باتوں سے غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں۔۔۔ اب مسلمان کو کہاں جانا ہے۔۔ یہی ملک ہے اور لگتا مجھے یہ ہے کہ اگر پاکستان بنا بھی تو اپنے کسی کام نہیں آئے گا۔ پاکستان میں بھی ہمیں تو یکہ چلانا پڑے گا۔"

"سینما کی گیٹ کیپری کرنا۔ نور جہاں کے گانے سننا۔۔" ستار موج میں آ گیا تھا۔ "ستارہ کا ناچ دیکھنا۔ کیا ناچتی ہے ستارہ۔۔۔"

افتخار بھی سناٹا محسوس کر رہا تھا۔ "پاکستان بنا تو یہ سب بھی پاکستان چلیں گی۔ خدا کی قسم!"

"اور پاکستان کاہے کے لئے بن رہا ہے۔ انہیں سب کو لے جانے کے لئے تو بن رہا ہے۔ کیا گلا پایا ہے نور جہاں نے۔" ستار بکتا جا رہا تھا۔ "کبھی اپن تو جان دے سکتے ہیں نور جہاں کے لئے۔"

"تب سلمہ کا کیا ہوگا؟" افتخار نے مذاق کیا تھا اور نشے کی جھونک میں بھی ستار کو جیسے ہوش کا جھٹکا لگا تھا۔ آخری گھونٹ لیتے ہوئے بولا تھا "سلمہ اگر پاکستان جائے گی تو میں بھی جاؤں گا۔ نہیں تو نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے وہ پاکستان ضرور جائے گی۔"

"وہ جائے گی تو مقصود کے ساتھ ہی۔" افتخار نے سمجھایا تھا۔ ستار یہ سن کر اداس ہو گیا تھا اور پھر وہ دونوں وہیں کوٹھری کے فرش پر لیٹ گئے تھے۔

صبح ابھی اچھی طرح ہوئی نہیں تھی۔ فرخ آباد کی طرف جانے والی گاڑی جا چکی تھی۔ اس کی دھمک بھی دونوں نے نہیں سنی تھی۔ مقصود اور یٰسین صبح ہی گاڑی سے محمود آباد سے فرخ آباد کی طرف چلے گئے تھے۔ سلمہ نے صبح اٹھ کر ہی ان کے لئے چائے بنائی تھی اور انہیں گلی کے موڑ تک چھوڑنے آئی تھی۔

اُس وقت تک بستی میں کوئی جاگا نہیں تھا۔ چاروں طرف دھند چھائی ہوئی تھی۔ سلمہ جب گلی کے موڑ سے لوٹنے لگی تو اسے ستار کا دھیان آیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسجد کی طرف چل دی تھی۔ بہانہ بھی تھا کہ ایک راستہ اُدھر سے بھی اسٹیشن کو جاتا ہے۔ ستار کی کوٹھری کے سامنے سے وہ گذری تو اندر کا یکہ وہیں باہر کھلا دیکھ کر اسے کچھ شک بھی ہوا۔ "کہیں ستار چلا تو نہیں آیا؟"

صبح صبح ہی ہاتھ میں سنٹی لئے نصیبن مرغیوں کو ڈربے سے نکال کر رگھورے کی طرف ہانکتی ہوئی لے جا رہی تھی۔ اس نے سلمہ کو پہچانا تو قدم بڑھاتی ہوئی پاس پہنچ گئی۔ "اتنے سویرے کہاں سلمہ؟"

سلمہ کانپ گئی۔ ٹھٹھکتے ہوئے بولی۔ "ادھر آئی تھی ان لوگوں کو چھوڑنے... اب گھر جا رہی ہوں... آپ بہت جلدی نکل پڑیں۔"

نصیبن نے اسے غور سے دیکھا تھا اور مسکرا دی تھی۔ "آج یہ افتخار کا یکہ ادھر کیسے کھلا ہوا ہے؟" کہتے کہتے اس نے بڑھ کر ستار کی کوٹھری پر دستک دی تھی۔ سلمہ چلنے لگی تھی تو اس نے روک لیا تھا۔ "ارے میں بھی ادھر ہی چل رہی ہوں ٹھہر تو۔"

چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی سلمہ رک گئی تھی۔ نصیبن کے ساتھ ہونے سے حوصلہ لوٹ آیا تھا۔

اور اسی وقت خمار آلودہ ستار باہر نکل آیا۔ سلمہ پچھواڑے کی طرف رخ کر کے کھڑی تھی۔ ستار نے آنکھیں ملا کر دونوں کی طرف دیکھا اور ایکدم بولا۔ "خواب دیکھ رہا ہوں۔"

نصیبن پھر مسکرائی۔ "یہ یکہ یہاں کیوں کھلا ہے؟"

افتخار بھائی ادھر ہی سو رہے ہیں، رات یہیں رکے تھے..." کہتے کہتے وہ سلمہ کو تاک رہا تھا۔ سلمہ نے ایک بار پھر آنکھ اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی بھری ہوئی تھی۔ ستار کو وہ آنکھیں دور تک چھیدتی چلی گئیں۔ ان آنکھوں میں وہ سب نہیں تھا جسے سوچ سوچ کر اس کا دل ڈوبتا تھا۔ رات کی کھلکھلاہٹ کی کوئی گونج بھی ان میں نہیں تھی... ان میں وہی جھلملاہٹ تھی جو اس نے پہلے کبھی دیکھی اور محسوس کی تھی۔

"اچھا میں چل رہی ہوں، آج جلدی ہی اسپتال جانا ہے۔" نصیبن سے کہہ سلمہ چلنے لگی تھی۔

اور دو منٹ بعد ہی ستار کُرتا پہن کر اسپتال والی سڑک پر سلمہ سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا اور جب سلمہ آتی دکھائی دی تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آج سلمہ سے بات کیسے شروع کرے گا۔ اسے روکے گا کیسے؟ اسے کیا کہہ کر پکارے گا؟ ان تھوڑے سے دنوں میں رشتے کتنے بدل گئے تھے۔

تب ہی سلمہ پاس آ گئی تھی۔ ستار ٹھٹھک کر کھڑا رہ گیا تھا۔ سلمہ ایک نظر اس پر ڈال کر آگے بڑھ گئی تھی۔ ستار بہت ہمت کر کے اس کے پاس پہنچا تھا۔ کچھ قدم وہ ساتھ ساتھ چلے تھے لیکن بات منہ سے نہیں نکل رہی تھی۔ آخر بڑا زور لگا کر ستار نے پوچھا تھا۔ "اسپتال جا رہی ہو؟"

"ہوں۔" سلمہ مسکرا دی تھی۔ "کیوں؟"

"کچھ نہیں۔" وہ کچھ اور پاس آ گیا تھا۔ "تم نے مجھے بلایا تھا؟"

"نہیں تو۔"

"تو میں جاؤں؟"

"جاؤ۔"

"اس طرح میں نہیں جاؤں گا۔"

سلمیٰ چپ رہی۔

"اگر پاکستان بنا تو تم جاؤ گی؟"

سلمیٰ ہنس دی اور اپنی بے ہودہ بات پر ستار کو بھی شرم آنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اور کیا بات کرے۔ جیسے ساری باتیں چوک گئی تھیں اور اسپتال کے پھاٹک پر آنے سے پہلے سلمیٰ نے ستار سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ "دوپہر میں ڈاکٹر خانہ کے پاس ملنا، مجھے ادھر کام ہے۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے پھاٹک میں گھس گئی تھی۔

ستار کچھ دیر کھڑا انتظار کرتا رہا تھا۔ پھر اس کی نظر رتن کی دوکان کی طرف چلی گئی جو آدھی کھلی تھی۔ بہت دن ہو گئے تھے رتن سے ملے۔ وہ لپک کر سڑک کے پار پہنچا تو رتن کو دیکھ کر یکایک پہچان نہیں پایا۔ وہ سنگھیوں کا خاکی نیکر پہنے پیٹی اور کالی ٹوپی لگائے کھڑا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک آدمی اور کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ اس کی وردی وہی تھی اور وہ رتن کو سمجھا رہا تھا۔ "اورنگ زیب نے جو مظالم کیے ہیں، ہندو دھرم کو جس طرح نقصان پہنچایا ہے اس کا بدلہ تو لینا ہی ہے۔ یہ تو ہماری روایت ہے۔ رانا پرتاپ کی، شیواجی کی، جنہوں نے ملیچھوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔"

تبھی رتن نے آہستہ سے پوچھا۔ "گٹھ نائک جی یہ ملیچھ تو مسلمان ہی ہیں نا؟"

"ہاں! بھارت ورش ہندو راشٹر ہے۔ اس آریہ دیش کے ٹکڑے ہوں یہ ......"

تبھی ستار نے آگے پہنچ کر کہا۔ "رتن بھائی سلام!"

رتن نے اسے دیکھا اور گٹھ نائک کی طرف دیکھ کر اس طرح نظریں گھما لیں جیسے وہ اسے پہچانتا ہی نہ ہو۔

گٹھ نائک جی نے کڑی نظروں سے ستار کو دیکھا اور اگلی بات سمجھانے لگے۔ "شام کو ساکھا میں مہندر اور اختر کے سب لڑکوں کو لیکر آنا.... گرو پورنیا کو جشن منایا جائے گا۔ اس کی تیاری بھی ہونی ہے۔ سمجھے۔ اچھا بندھو نمسکار۔"

رتن نے کہا اور گٹھ نائک جی چستی سے شہر کی اور چلے گئے۔

ستار کھڑا حیرت سے دیکھتا رہا۔ شہر میں اس نے سنگھیوں کو دیکھا تھا اور اس کے کانوں میں یہ بھنک بھی پڑی تھی کہ سنگھی مسلمانوں کے بہت خلاف ہیں۔ کچھ لمحے تو وہ سکتے میں کھڑا رہ گیا تھا لیکن رتن سے دوستی تو تھی ہی۔ اس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "کیوں رتن بھائی آج کل بڑی جلدی دوکان کھول لیتے ہو؟"

"ہاں! ساکھا سے لوٹتا ہوں تو کھول لیتا ہوں۔" اب تک رتن ٹوپی اتار کر کیل پر ٹانگ چکا تھا۔ نیکر بدل کر اپنا پرانا پاجامہ پہنے جا رہا تھا۔ ستار کھڑا ہوا دوکان میں نظریں دوڑانے لگا۔ اسے دوکان کچھ بدلی بدلی لگی۔ سنیما کے پوسٹروں کی جگہ دلی میں چھپے وہ کلنڈر وہاں لٹک رہے تھے جن میں مہارانا پرتاپ، بندہ بیراگی اور شیواجی وغیرہ کی تصویریں تھیں۔ تبھی رتن نے پوچھا تھا۔ "کیا حال ہے میاں؟"

"میاں"، سن کر ستار تلملا گیا تھا۔ اس نے رتن کی طرف حقارت سے دیکھا تھا اور یہ اندازہ کیا تھا کہ ایک جھٹکے میں پانی مانگے گا۔ لیکن تلملاہٹ دباتے ہوئے اس نے بھی طنزیہ انداز میں جواب دیا تھا۔ "حال ٹھیک

ہے پنڈت کی اولاد"۔

"لیلی کہاں ہے؟" رتن نے مذاق میں بات ٹال دینی چاہی تھی۔ ستار اس کے بدلے ہوئے رُخ کو تاڑ گیا تھا۔ لیکن سلمہ کو لیلی کہہ کر پکارنا اسے کچھ اچھا نہیں لگا تھا۔

"ارے یار چھوڑ اس کی بات" ستار نے بات بدلی۔ کپڑے بدل کر رتن نے رم سیدھی کرنے کے لئے اوزار سنبھالے۔ ایک منٹ پہلے ہوئی باتوں کی گونج دونوں ہی دبا جانا چاہتے تھے۔

"ہوں۔ لو" ستار نے دو بیڑیاں سلگا کر ایک رتن کی طرف بڑھا دی۔ رتن نے انکار کر دیا۔

"کیوں، کب سے چھوڑ دی؟"

"ایسے ہی۔"

"پی یار۔"

"نہیں، سالی تندرستی خراب کرتی ہے"۔

"تم سے تگڑا تو میں ہی ہوں!"

"ہاں بیٹے! ہندوستان کا مال کھاتے ہو، تگڑے کیوں نہیں ہو گے؟" رتن بولا۔

ستار اس کی بات کے ڈنگ کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ اس نے غصے سے رتن کو دیکھا اور بولا "کسی سے مانگ کر نہیں کھاتے بیٹا، اپنے حق کا کھاتے ہیں، وہ حق جو صدیوں پہلے ہماری قوم نے جیتا تھا۔ سمجھے؟"

تبھی ایک دودھ والا پنکچر سائیکل لیکر آگیا اور رتن اس میں الجھ گیا لیکن ستار کو کھڑا دیکھ کر وہ برابر بڑبڑاتا رہا۔ "میاں اب ہندوستان میں مسلمانی حکومت کے سپنے دیکھنا چھوڑ دو۔ وہ زمانے لد گئے"۔

ستار سنتا ہوا حقارت سے ہنستا رہا۔ لیکن دل ہی دل وہ بہت بڑا فرق محسوس کر رہا تھا۔ آخر وہ رتن کی دکان سے ہٹ کر دور چلا گیا۔

سرائے کی طرف جانے والی سڑک پر چلتے ہوئے اسے اپنی چاروں طرف ایک ایسا سیلاب سا نظر آ رہا تھا جس میں نفرت کے کیڑے کلبلا رہے تھے۔ جانے پہچانے لوگوں کے مردہ چہرے اتراتے ہوئے بہتے جا رہے تھے۔ وہ چہرے جنہیں دیکھ کر ابھی تک انسان جیتتا آیا تھا جن میں پیار اور اپنا پن تھا۔ یہ سب کیا ہوا؟ لوگوں نے یکایک وہ چہرے اتار کر کیوں پھینک دیے ہیں؟

اور سچ مچ تب بستی میں نعروں کا ایک خوفناک سیلاب آیا تھا۔ سڑکیں وہی تھیں، لوگ بھی وہی تھے۔ دکانوں میں بھری ہوئی چیزیں وہی تھیں۔ بستی کی مکانوں کی دیواریں وہی تھیں۔

لیکن ان پر اشتہار لگے تھے۔

مکانوں پر لہراتے ہوئے جھنڈے نئے تھے۔

گھروں میں لگنے والے کلنڈر نئے تھے۔

ٹوپیوں کے پہننے کا شوق نیا تھا۔

سوچنے سمجھنے کا نظریہ بدلا ہوا تھا۔

قصبے سے نکلنے والے دو صفحات کے اخباروں کی آواز بدلی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں کیا ہوا تھا بستی کو؟ اونچے اونچے املی نیم کے درختوں پر لمبی لمبی بلیاں لگا کر لیگ اور ہندو مہا سبھا کے جھنڈے لہرائے گئے تھے گھروں

پر بھی چھوٹے چھوٹے اوم (ॐ) کے ہرے جھنڈے نظر آنے لگے تھے۔ خانقاہ میں رنگ روغن ہوا تھا اور اس کے پھاٹک پر بہت بڑا چاند ستارہ بنایا گیا تھا۔ شہر کے آریہ سماجیوں نے سب دیواروں پر چاک سے اوم لکھوا دیا تھا۔ پرائمری اسکولوں کے احاطے میں سنگھی نوجوان قواعد کرتے تھے اور لاٹھیاں چلانا سیکھتے تھے۔ وہ ہندی ایسے چبا چبا کر اور غرور سے بولتے تھے کہ اوروں کے لئے سمجھنا ہی مشکل ہو جاتا تھا۔

جگہ جگہ دکانوں پر لکھنؤ، علی گڑھ سے چھپے پرچے آتے تھے اور ناگپور، پونا سے چھپی تصویریں آتی تھیں کتب خانوں میں بانکے مراٹھوں اور راج پوت بہادروں کی زندگیاں بھر گئی تھیں۔ بچوں نے یکایک — اپنے بزرگوں کو پہچانا تھا اور کالی ٹوپی والے گاندھی جی پر بگڑتے تھے — ملیچھوں کو سر پر چڑھا کر آریہ بھومی کو، ہندو کو ذلیل کیا جا رہا ہے۔"

اور ادھر مسلمانوں کے محلے میں ان باتوں سے طرح طرح کی اٹکلیں لگائی جاتی تھیں۔ اور اُدھر چکوں کی بستی میں سنائی سمجھا تا تھا — اسلام خطرے میں ہے!"

ستار یہ سب سوچ سوچ کر پاگل ہو جاتا تھا۔ یہ سب کیا تھا جو اس کے دل و دماغ میں پگھلے سیسے کی طرح بھرتا اور وہیں جمتا جا رہا تھا۔

جب وہ سرائے کے نکڑ پر پہنچا تو عبدل پتنگ والے نے اسے روک کر خبر دی تھی۔ "خانقاہ میں آج رات ایک میٹنگ ہے۔ تمام مسلمانوں کا شریک ہونا ضروری ہے۔ اپنی طرف کہہ دینا۔ لوگ ایک ساتھ نہ آئیں، الگ الگ آئیں۔" اور اتنا کہہ کر وہ چلا گیا تھا۔

اسی پریشانی میں ستار بستی کی طرف لوٹ گیا۔ دوپہر میں سلمہ سے ملنے کی بات تھی۔ وقت تو کاٹنا ہی تھا۔ کہیں اور جانے کو دل نہیں کر رہا تھا تو وہ نصیبن کے گھر پہنچ گیا۔ وہ مٹھریاں تل رہی تھی۔ ستار کو دیکھتے ہی کھل گئی۔ "آ ستارے، مٹھریاں کھا۔" کہتے ہوئے نصیبن نے وہیں پڑی ہوئی چھوٹی طشتری میں آٹھ دس مٹھریاں رکھ دیں۔ باقی مٹھریاں اس نے ایک گندے کپڑے میں لپیٹیں، اور چلنے لگی، تو ستار نے پوچھا "کہاں جا رہی ہو؟"

"بچن کے گھر تک۔"

جس بے باکی اور کھلے پن سے نصیبن نے بچن کا نام لیا تھا وہ ستار کو سن کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ آہستہ سے بولا تھا۔ "بچن اور تمہیں لیکر لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔"

نصیبن ہلکے سے مسکرا دی۔ سر پر اوڑھنی ڈال کر وہ نکل گئی۔ نصیبن کے اس کچے گھر میں وہ اکیلا رہ گیا تھا۔

دور شاید سلمہ کا اندھا باپ کوئی ڈھولک منڈھ کر بجا رہا تھا۔ آس پاس گھروں سے چمڑا کمانے کی سرسراہٹ اور چھریوں کی چال ملی پھسپھساہٹ آ رہی تھی۔ ادھر تھوڑی دور پر مکتب میں بچوں کے پڑھنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

لوٹ کر نصیبن آئی تو گھر میں داخل ہوتے ہی شکایت بھرے لہجے میں بولی۔ "ستار تو سلمہ کو نجات کیوں نہیں دلاتا؟"

"میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"تو ہی سب کچھ کر سکتا ہے۔" آخر تجھے لیکر سلمہ نے اتنی بدنامی اٹھائی ہے۔ بستی بھر میں اس کی اتنی بے عزتی ہوئی ہے۔ وہ سب کیا اس نے اسی لئے اٹھائی تھی؟"

"کیا پتہ کس لئے اٹھائی تھی! میں تو ہر طرح سے تیار تھا لیکن وہ بدل گئی۔ تمہیں تو معلوم ہے۔"..."

"اس کے دکھ کو تو نہیں سمجھ سکتا ستار۔"

"کیوں ایسی کیا بات ہے؟"

"ہے!"

"مجھے بتاؤ تبھی تو میں کچھ کر سکتا ہوں۔"

"تجھے تو پتہ ہے اس کا آدمی اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔"

"لیکن اب تو اس کا آدمی آ گیا ہے مجھے تو وہ خوش دکھائی پڑتی ہے، اس کی خاطر اس نے مجھ سے ملنا جلنا تک چھوڑ دیا ہے...."

"تو نہیں سمجھے گا اس کے دکھ..."

"اسے کس بات کا دکھ ہے؟ میں نے تو کوئی ایسی بات نہیں دیکھی؟"

"اب کیا بتاؤں تجھے... زبان پہ بات بھی نہیں آتی۔" اتنا کہہ کر نصیبن ستار کی قمیض میں بٹن ٹانکنے لگی تھی۔ ستار اس گتھی کو سلجھا نہیں پا رہا تھا۔ اِدھر اُدھر کی تمام باتیں سوچنے کے بعد اس نے پوچھا تھا۔ "مقصود میاں کیا اس کے ساتھ بری طرح پیش آتے ہیں؟"

"تم نے مقصود کو اچھی طرح دیکھا ہے؟"

"خاص خیال تو نہیں کیا۔ تم پہیلیاں کیوں بجھا رہی ہو؟ جو بات ہے صاف صاف بتاؤ نا۔"

ستار بے چین ہو رہا تھا۔

"تم نے اس کے رنگ ڈھنگ دیکھے ہیں؟"

"اُفوہ —"

"میں کہوں کیسے... کیسے سمجھاؤں تجھے!"

"ارے تو اس میں کوئی کمی ہے؟"

"اس کا بننا سنورنا دیکھا ہے؟"

"تو اس میں کیا بات ہے؟"

"وہ جو سیاسی کارکن لیسین اسکے ساتھ ہے نا، اس کے تعلقات دیکھے ہیں اس سے۔"

"میں نے تو لیسین کو اس دن مسجد میں ہی پاس سے دیکھا تھا اور تو کوئی موقع آیا نہیں۔"

"سلمہ یہ سب کس سے کہے۔"

"کیا لیسین سلمہ...." ستار بات کہتے کہتے رک گیا تھا۔ وہ حالات کو کچھ کچھ بھانپ رہا تھا۔ اس کے تن بدن سے چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ لیکن تبھی نصیبن نے بہت سنبھل کر کہا تھا۔ "تو جو بات سوچ رہا ہے وہ نہیں ہے۔ لیسین اور سلمہ کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ بات اصل میں یہ ہے ستار کہ مقصود کے رنگ ڈھنگ ہی عجیب ہیں۔ اس دن رو رو کر سلمہ نے بتایا تھا۔ شام ہوتے ہی مقصود عورتوں کی طرح سجتا ہے۔ آنکھوں میں

کاجل لگاتا ہے۔ اپنے گال پر مسّا بناتا ہے۔ بالوں میں تیل ڈالتا ہے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں چھلّے بناتا ہے۔ گالوں پر بھی لالی پوتتا ہے اور گلوریاں دبا کر لیسین کے پاس بیٹھ جاتا ہے۔ تب دونوں شراب کی بوتل کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی رنگ رلیاں چلتی ہیں اور سلمہ کلیجی تل کر لاتی ہے ۔۔۔ لیسین مقصود کو اپنے گلاس سے شراب پلاتا ہے۔

اور سلمہ یہ سب دیکھتی ہے، دن رات روتی ہے۔ انہیں یہ سب کرتے ہوئے دیکھ کر بھی برداشت کرتی ہے۔ رات گئے تک یہ سب چلتا رہتا ہے اور سلمہ شرم کی ماری روتی روتی جب سو جاتی ہے تو آدھی رات کے بعد مقصود اس کے پاس آتا ہے ۔۔۔" اتنا کہہ کر نصیبن چپ ہو گئی تھی۔

ستار سن رہا تھا۔

کچھ دیر دونوں خاموش رہے۔ نفرت آمیز سناٹا چھایا رہا۔ ستار کے منہ سے جیسے زبان گر گئی تھی۔ آخر نصیبن نے ہی خاموشی توڑی تھی "اور عورت یہ سب کچھ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ برداشت کرنے کی بات تو دور، سوچ بھی نہیں سکتی۔ عجیب چکر میں پھنسی ہے سلمہ۔"

ستار اب بھی خاموش رہا۔

"یہی فیروز آباد میں ہوتا تھا۔ سلمہ تو یہاں تک بتاتی تھی کہ فیروز آباد میں تو وہ چوڑیاں تک پہن کر بیٹھتا تھا اور سلمہ جب بگڑتی تھی تو اسے بری طرح پیٹتا تھا۔ ایک روز تو اس نے قینچی لیکر سلمہ کے بال تک کاٹ ڈالے تھے ۔۔۔ تم ہی سوچو ستار ۔۔۔ کوئی عورت کیسے اس طرح کے آدمی کے ساتھ رہ سکتی ہے۔"

ستار کے سامنے اس رات مسجد میں بیٹھے مقصود اور لیسین کے چہرے گھوم رہے تھے۔ مقصود کے لمبے لمبے بال اور لیسین کو دیکھنے کا طریقہ، جیسے ایک ایک بات صاف ہوتی جا رہی تھی۔

"مجھے یقین ہی نہیں ہوتا!"

"تو سلمہ سے خود پوچھ لینا۔ اس نے تو ہزاروں باتیں بتائی تھیں۔ انہیں تو میں زبان پر بھی نہیں لا سکتی۔"

"تو سلمہ اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتی؟"

"یہ اتنا آسان تو نہیں ہوتا۔"

"تو میں اسے کہیں لیکر بھاگ جاؤں گا۔"

"کہاں؟" نصیبن نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"پاکستان ۔۔۔"

نصیبن کے چہرے پر یکایک کئی رنگ آئے اور چلے گئے۔ آخر اس نے بڑا صبر کر کے پوچھا۔

"کہاں ہے پاکستان؟"

"بنے گا قائد اعظم لیکر چھوڑیں گے۔"

"تو چلے جانا ۔۔۔" نصیبن نے بڑی مایوسی سے کہا تھا۔

"سب مسلمان چلیں گے پاکستان۔"

"کیوں ۔۔۔؟"

"سنا ہے اُدھر صوبے کے دوسرے شہروں میں مسلمانوں کو مارنے کے لئے ہندو بڑی تیاریاں کر رہے

ہیں وہاں کالی ٹوپی والے بندوقیں چلانا سیکھ رہے ہیں۔" ستار بولا۔

وہ لیسین بھی تو مسلمانوں میں تیاری کر وا رہا ہے۔ نصیبن نے چھوٹتے ہی کہا۔ یٰسین کا نام سنتے ہی ستار کا منھ بگڑ گیا۔ یٰسین اور مقصود کے جوڑے کی بات دھیان میں آتے ہی اس کا دل بے چین ہو گیا۔ یکایک وہ کوئی جواب نہیں دے پایا تھا۔ بات بدلنے کے لئے وہ بولا — آج سلمہ سے ملنا ہے۔"

"تو ادھر ادھر کیوں ملتا ہے، یہیں آکر سیدھے سے بات کر لیا کر، مجھ سے تو اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔" نصیبن یہ کہہ ہی رہی تھی کہ کودتے پھاندتے اس کے لڑکے آ گئے۔

سلمہ سے ملنے کا وقت ہو گیا تھا۔ ڈاکخانے کی طرف جاتے جاتے اس نے ساری باتیں سوچ ڈالی تھیں۔ وہ سلمہ سے کیا کیا کہے گا۔ آگے کیا کرے گا......

سلمہ کو لیکر وہ نصیبن کے گھر چلا آیا تھا۔ گھر میں سناٹا تھا۔ نصیبن کے لڑکے کھیلنے باہر چلے گئے تھے اور نصیبن پچن کے گھر چلی گئی تھی۔ پچھم کی طرف جاتے ہوئے سورج کی کرنیں ترچھی ہو کر گھر پر سے گذر چکی تھیں۔ دور آسمان میں چیلیں اڑ رہی تھیں۔ اس سناٹے میں انہیں سانسوں کی آواز تک سنائی دے رہی تھی۔ ستار نے اسے اپنے پاس کھینچ لیا تھا اور دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے بولا تھا۔ "سلمہ اتنے ظلم کیوں سہتی ہو؟"

"تو اور کیا کروں؟"

"اس سے باہر نہیں نکل سکتیں؟"

"اب اور کوئی راستہ نہیں نکل سکتا؟" سلمہ نے گہری سانس لیکر کہا تھا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ کچھ دیر بعد سلمہ نے کہا تھا۔

"ستار پتہ نہیں کون سی مجبوریاں ہیں جو کچھ بھی کرنے سے روکتی ہیں۔ چاہتے ہوئے بھی وہ نہیں کر سکتی جو کرنا چاہتی ہوں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟"

"وہ میرے پیروں پر سر رکھ کر رونا بھی ہے۔ بہت روتا ہے۔ تب میرے دل سے سب کچھ دھل جاتا ہے۔ بے بس جتنی میں ہوں، اتنا ہی وہ بھی ہے۔ لیکن کبھی کبھی اتنی نفرت ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں۔ لیکن اب تو وہ بھی نہیں کر سکتی۔"

"تو کوئی ایسا راستہ ڈھونڈلو جس سے ساری پریشانیاں دور ہو جائیں۔ ہم دونوں یہاں سے چپ چاپ چلے چلیں۔" ستار نے بڑی گہرائی سے کہا تھا۔

"میں کہیں نہیں جا سکتی۔"

"تمہاری یہی بات تو میں سمجھ نہیں پاتا۔"

"تم نہیں سمجھ پاؤ گے ستار... مرد ہو نا۔"

"تو تم مجھے بتاؤ نا۔"

"میرے پیٹ میں بچہ ہے۔"

ستار سن سا رہ گیا تھا۔ اس کی عقل چکرا گئی تھی۔ پر تبھی وہ بپھر اٹھا تھا۔ "تم جھوٹ بولتی ہو۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں ستار۔" کہتے کہتے سلمہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور ان آنسوؤں سے نہائی

سلمہ اسے بہت پاک لگی تھی۔ بہت بڑی صابرہ لگی تھی۔
لیکن دوسرے ہی لمحے شکوں کی پرچھائیاں اس کی فکر پر گردش کرنے لگی تھیں۔"مقصود کا بچہ کیسے ہو سکتا ہے"
اور اسے لگتا تھا کہ سلمہ اپنے کسی بہت بڑے راز کو چھپائے ہوئے ہے۔ تب وہ اسے بہت ذلیل گری ہوئی اور ناپاک لگی تھی اور اس نے اپنے سب سہارے ٹوٹتے ہوئے محسوس کئے تھے۔
سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا تھا اور گھر میں اندھیرا بھرنے لگا تھا۔
"اچھا سلمہ اب جاؤ، بہت دیر ہو گئی ہے"۔ ستار نے غیر شعوری طور پر کہا تھا۔
اور سلمہ اٹھ کر چپ چاپ باہر نکل گئی۔ ستار کھڑا کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔
ستار اسی پریشانی میں اپنی کوٹھری میں چلا گیا اور جا کر لیٹ گیا۔ اس کے سامنے دھند چھائی ہوئی تھی کوئی بھی چیز صاف نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہر طرف ایک شور تھا، ایسا شور جس میں کوئی بھی آواز پہچانی نہیں جا رہی تھی

اور پوری بستی میں بھی ایسا ہی ایک خاموش شور چھایا ہوا تھا، تذبذب، اندیشوں اور شک و شبہ کا۔ دکانیں اسی طرح کھلتی تھیں، شہر کا کاروبار اسی طرح چلتا تھا۔ اسی طرح اناج منڈیوں میں گاڑیاں آتی تھیں گھروں میں کتھائیں اور میلاد شریف ہو رہے تھے۔ لیکن کچھ ایسا تھا جو ٹوٹ رہا تھا جسے بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔
باہر سے جو خبریں آتی تھیں ان کا روپ یہاں دوسرا ہی ہوتا تھا۔ یہاں تک آتے آتے ان کا رنگ ہی بدل جاتا تھا۔ لڑائی میں سبھی کو دلچسپی تھی۔ لیکن جب جاپانیوں کے قدم ڈگمگانے لگے اور جنگ میں انگریزوں کی جیت دکھائی دینے لگی تو لوگوں کے عجیب عجیب ردعمل ہوئے۔
آزاد ہند فوج کے قصے اس چھوٹے سے شہر تک بھی پہنچ گئے تھے اور بڑی گرما گرمی پیدا کر رہے تھے۔ کچھ دیر کے لئے سب کا دھیان اپنے آپسی تنازع کو بھلا کر انہیں خبروں کی طرف لگ گیا تھا۔ گلیوں میں لڑکے کہتے پھرتے تھے ۔"تم مجھے خون دو، میں تمہیں آزادی دوں گا"۔
اور کبھی کبھی تو لڑکے لائن بنا کر گلیوں میں پریڈ کرتے تھے ۔"قدم قدم بڑھائے جا۔ خوشی کے گیت گائے جا۔ یہ زندگی ہے قوم کی۔ تو قوم پر لٹائے جا"۔
جب شہر میں اندھیرا اترنے لگتا تھا اور سڑکوں کے کنارے کالی دھند میں چھپ جاتے تھے، تو بچوں کے یہ ترانے رونگٹے کھڑے کر دیتے تھے۔ لیکن وہاں جگنوں کو سائیں نے سمجھایا تھا۔ ہمیں ان سے کیا لینا دینا؟ اگر آزاد ہند کی فوج نے ہندوستان کی حکومت جیت لی تو کیا ہوگا، حکومت تو ہندوؤں کی ہی ہوگی؟ انگریزوں پر بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ترکی کے خلیفہ سے وعدہ کر کے کیا سلوک کیا تھا انہوں نے؟ ۔ ہم صرف اپنی قوم پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔ ہندو اور انگریز دونوں دغا دیں گے ہیں"۔
ستار درخت کے نیچے بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ سائیں کی بغل میں بیٹھے مقصود اور یٰسین کو دیکھ کر اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ وہ دونوں کئی دن پہلے لوٹ چکے تھے۔
اس نے وہیں بیڑی مسل کر للکارتے ہوئے کہا۔"لیکن سائیں آزاد ہند فوج میں مسلمان بھی تو ہیں۔ سنا ہے شاہنواز اس کے سب سے بڑے سپہ سالار ہیں۔ ان کی کمان میں ساری فوج ہے اور شاہنواز مسلمان ہیں"۔

انہیں اور ان کے ساتھیوں کو انگریزوں نے باغی قرار دے دیا ہے۔"
بات کا جواب لیسین نے دیا۔ "جناب عالی! مسلمان بھی تو غلطی کر سکتا ہے۔ کچھ مسلمان کانگریس کے ساتھ بھی تو ہیں۔ ان کے دلوں میں اسلام کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ وہ تو کافروں سے بھی بدتر ہیں۔ جو ہندو ہماری کھل کر مخالفت کرتے ہیں ہم انہیں پھر بھی اچھا سمجھتے ہیں۔ لیکن ان مسلمانوں کو کیا کہا جائے جو اپنے ہی مذہب، دین و ایمان اور بھائیوں کے ساتھ غداری کر رہے ہیں۔ ہمیں ان سے ہوشیار رہنا ہے اور یہ مان کر چلنا ہے کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں۔ ہمارے لیڈر ہیں قائد اعظم محمد علی جناح۔ پوری مسلمان قوم ان کے ساتھ ہے۔"
ستار بھڑک اٹھا تھا۔ "سنا ہے جناح صاحب مذہب کو نہیں مانتے۔ وہ سب کرتے ہیں جو اسلامی شریعت کے خلاف ہے۔ وہ نہ اردو جانتے ہیں اور نہ عربی۔ انہوں نے پارسی لڑکی سے شادی کی ہے۔ وہ ہمارے لیڈر کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"زبان بند کرو ستار۔" سائیں بپھر اٹھا تھا۔ لیسین کی آنکھیں انگارے کی طرح سلگ اٹھی تھیں اور مقصود ایک قدم آگے بڑھ کر اس پر وار کرنے کو تیار تھا۔

"زبان تو بند نہیں ہوگی سائیں۔"

"یہ کافر ہے۔" مقصود چلایا تھا۔

"مارو سالے کو۔" کئی آوازیں آئی تھیں۔

اور جب تک ستار سنبھلے اس پر تابڑ توڑ مار لگ گئی تھی۔ وہ اپنے کو سنبھال نہیں پایا تھا لیکن مار پیٹ کی اسی جھونک میں اس نے مقصود کی ناک توڑ دی تھی۔

آخر سائیں ہی نے بیچ بچاؤ کیا تھا۔ جب اس نے سب کو ہٹایا تھا تو ستار گالیاں دیتا ہوا اپنی کوٹھری کی طرف چلا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے اوپر نیلے دھبے پڑ گئے تھے۔ ہونٹ کٹ گئے تھے اور پیر سے خون بہہ رہا تھا۔

اس جھگڑے سے بستی میں سناٹا چھا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے! شہر میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جس کے پاس وہ چلا جاتا۔ وہاں ایک دوسری ہی نفرت رینگ رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر پچھتاوا بھی ہو رہا تھا کہ یہ سب اس نے کیا کر لیا اور کیوں کر لیا۔

اپنی نادانی پر اسے غصہ بھی آ رہا تھا لیکن خوشی اس بات کی تھی کہ مقصود کی پٹائی اس نے کر دی تھی۔ تبھی گلی کے اندھیرے میں اسے نصیبن آتی دکھائی دی۔

"کیوں، کیا بات ہو گئی تھی؟" اس نے پاس آ کر کہا۔

"خواہ مخواہ بات بڑھ گئی... لگتا ہے اس سالے مقصود نے پہلے سے سب طے کر رکھا تھا۔"

"بہت چوٹ آئی ہے؟"

"ہاں تھوڑی سی لگی ہے، لیکن مرمت میں نے ان سالوں کی بھی کر دی۔"

"خیر ہوگا۔ اب جاؤ گے کہاں؟"

"یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔"

"میرے گھر چلے چلو اور ان جھگڑوں میں پڑنا بند کرو۔ میرے گھر رہو اور کام دھام کا کوئی سلسلہ ڈھونڈو۔"

"ہاں! اب تو سائیں وغیرہ مجھے یہاں کام بھی نہیں ملنے دیں گے۔"
"تیری قسمت کوئی تجھ سے نہیں چھینے گا ... سمجھا۔"
اپنا بستر لپیٹ کر اور باقی سامان لے کر وہ نصیبن کے ساتھ چل دیا۔ راستے میں اس نے دھیرے سے پوچھا۔ "تمہیں تو یہ لوگ پریشان نہیں کریں گے؟ میری وجہ سے تم سے بھی کہیں دشمنی نہ کرنے لگیں؟"
"میں ان سے نہیں ڈرتی ..." کہتی ہوئی نصیبن دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹایا تو رجن نے آکر کھولا اور کھولتے ہی داستان بیان کرنے لگا۔ "امی۔ ببے کو بڑی چوٹ آئی ہے، کلوا نے بہت مارا آج ببے کو۔"
"کون کلوا۔؟" ستار نے پوچھا
"بچن کا لڑکا۔" نصیبن نے بتایا اور آگے پوچھنے لگی۔ "لیکن ہوا کیا تھا؟ کیوں لڑائی ہوئی تھی؟"
"امی ہم سب کلوا، رموا کے ساتھ کھیلنے گئے تھے۔ وہاں بجاوے والی پہاڑی پر کھیل رہے تھے تو ببے کے دھکے سے رموا لڑھک گیا۔ بس اتنی سی بات پر کلوا نے ببے کو بہت مارا۔ پھر ہم سب نے مل کر کلوا کو مارا۔"
"ارے حرام خور، لڑامت کر۔" نصیبن نے رجن کا کان اینٹھتے ہوئے کہا "کتنی بار کہا کہ لڑائی ہوا کرے تو مجھ سے شکایت کیا کر۔ اب آیا ہے نپٹا کر داستان بیان کرنے۔" اور اتنا کہتے کہتے اس نے دو چانٹے رسید کر دیے۔
مار کھا کر رجن باہر نکل گیا۔ نصیبن ستار کے ساتھ اندر چلی گئی۔ بغل والی کچی کوٹھری میں چٹائی بچھا کر ستار نے اپنا بستر پھیلا لیا۔ نصیبن ایک ڈھبری جلا کر رکھ گئی۔ انگیٹھی جلا کر اس نے تیل گرم کیا اور ستار کو دے آئی۔ ببے تب تک سو گیا تھا۔ اس نے ٹٹول کر دیکھا آنکھ کے پاس سوجن تھی۔ اس پر گرم تیل مل کر وہ رجن کا انتظار کرنے لگی کہ آجائے تو دروازہ بند کریں لیکن رجن کا کہیں پتہ نہیں تھا۔
باہر دروازے پر آئی۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ لیکن وہ نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ تبھی بچن پہنچ گیا نصیبن کو پریشان سا دیکھ کر وہیں کھڑا ہو گیا۔ بچن کو دیکھتے ہی نصیبن نے پوچھا۔ "کیا بات ہے بچن، اس وقت کیسے؟"
"کچھ نہیں، رموا کو چین نہیں پڑ رہا ہے، لگتا ہے اس کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں ہلدی لینے آیا تھا۔"
"ہڈی ٹوٹ گئی؟" نصیبن نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔
"لگتا تو یہی ہے ... ذرا سا پیر ہلتا ہے تو چیختا ہے۔"
"چلو ..." کہہ کر وہ بچن کے ساتھ چل دی۔
رموا کی ٹانگ کی ہڈی سچ مچ ٹوٹ گئی تھی۔ اسے کسی کروٹ چین نہیں پڑ رہا تھا۔ گوشت ایک طرف سے پھول آیا تھا۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔ یکایک نصیبن گھبرا گئی، بولی۔ "اسے فوراً اسپتال لے چلو۔"
"لیکن اس وقت اسپتال میں ہوگا کون؟"
"ہوگا کیوں نہیں۔ نہیں ہوگا تو بلوائیں گے۔ رات بھر میں تو بچے کی جان نکل جائے گی۔ اچھا، میں ابھی آئی ..." اتنا کہہ کر وہ سیدھی سلمہ کے گھر گئی۔
اور اسی وقت رات میں ہی نصیبن، بچن اور سلمہ، رموا کو لیکر اسپتال پہنچے تھے۔ ستار چھپے چھپے خاموشی

سے پہنچ گیا تھا۔ مردانہ اسپتال میں سلمہ کو لوگ جانتے تو تھے لیکن بڑی کوشش کے باوجود اُس وقت کچھ نہیں ہو پایا۔ رات کی ڈیوٹی پر جو میل نرس تھے انہوں نے ایک بستر دلوا دیا تھا۔ صبح ڈاکٹر کے آتے ہی ہڈی چڑھ جائے گی یہ دلاسا بھی دے دیا تھا۔ لیکن بات تھی بچے کے پاس رکنے کی۔ ہاری بیماری میں آدمی کے بس میں نہیں ہوتا سنبھلنا۔ تبھی نصیبن نے بچن کو شہر سے دودھ لانے کے لئے بھیجد یا تھا اور خود وہیں رک گئی تھی۔

رات پھر نصیبن وہیں رموا کے بستر کے پاس بیٹھی رہی۔ بچن نے کہا کہ وہ کچھ دیر سو لے۔ لیکن وہ نہیں ہٹی۔ "مرد نہیں سمجھ سکتے بال بچوں کا دکھ سکھ"۔

وہ رات بھی گذر گئی۔ دو تین دن بھی گذر گئے اور وہاں بستی میں یہ خبر زور پکڑتی جا رہی تھی کہ نصیبن ہندو کے گھر بیٹھ گئی ہے۔

رموا اسپتال میں پڑا تھا۔ اس کی ٹوٹی ٹانگ پر پلاسٹر چڑھ گیا تھا لیکن بخار پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔ نصیبن فکرمندی سے دن بھر اس کے سرہانے بیٹھی رہتی۔ بستی کی باتوں کی بھنک اس کے کانوں میں بھی پڑتی تھی لیکن وہ ان باتوں کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ وہ شام کو چار بجے لوٹ کر آتی تھی۔ اپنے بچوں اور کلوا کے لئے کھانا پکا کر پھر اسپتال چلی جاتی تھی تو چھ بجے لوٹتی تھی۔ یہ روزانہ کا معمول ہو گیا تھا اس کا۔

اور ادھر شہر میں آزاد ہند فوج کے جوانوں کی گرفتاری اور مقدمے کی خبر گرم تھی۔ ڈھلن، سہگل اور شاہنواز کا مقدمہ جب لال قلعے میں شروع ہوا تھا تو شہر جیسے بیدار ہو گیا تھا۔

کٹہرا محلے میں ایک کمیٹی بن گئی تھی جو آزاد ہند فوج کے گھر والوں کے لئے چندہ، کپڑے وغیرہ اکٹھا کر رہی تھی۔ جوش بھری تقریریں بھی ہوتی تھیں۔

سردیاں ختم ہوتے ہوتے لال قلعے کا وہ مقدمہ ختم ہو گیا اور نان بائی نے پوری خبر دی۔ "مذاق نہیں تھا ان لوگوں کو دیش سے باہر نکال دینا۔ وہ ڈھلن، سہگل، شاہنواز کو دیش سے نکالتے، وہ دیش کے باہر پھر آزاد ہند فوج بناتے۔ وہاں سے پکڑے جاتے تو دس دن بعد غائب — پھر پتہ لگتا امریکہ پہنچ گئے۔ وہاں پھر وہی آزاد ہند فوج"۔

لیکن شہر کے وکیلوں مختاروں میں سنجیدگی کے ساتھ یہ چہ میگوئیاں تھیں کہ ایک طرح سے انگریزی حکومت نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے۔ عوام کے بھڑکتے ہوئے جذبات کو دیکھ کر حکومت کی یہ ہمت نہیں ہوئی کہ انہیں جلاوطن کرے۔

مختار صاحب نے ایک بار آہستہ سے پھر کہا تھا۔ "بھائی بھلائی اسی میں ہے کہ ہندو مسلمان مل کر رہیں۔ گھڑوں پر لگائے فرقہ پرستی کے جھنڈے اتارے تو نہیں گئے تھے لیکن ان کے رنگ ضرور پھیکے پڑ گئے تھے۔ سردیوں کی وجہ سے ویسے بھی شہر دیر سے جاگتا تھا اور جلدی سو جاتا تھا۔

سائیں کی بیٹھک بھی جلد ہی ختم ہو جاتی تھی لیکن جب مقصود اور لطیفن اس کے پاس آ کر بیٹھ جاتے تو باتیں چلتی رہتیں، اور پھر اب تو بچن اور نصیبن کی خبر گرم تھی۔

سائیں نے دھونی میں لوبان ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ "پتہ نہیں اس نصیبن کو کیا ہو گیا ہے جو اُس کے

گھر میں گھس گھس کے بیٹھتی ہے۔"

مقصود نے اپنا شک ظاہر کیا۔ "مجھے تو پتہ لگا ہے کہ بچن اسے ہندوؤنی بنانے کے چکر میں ہے۔"

اور ایک دن یہ خبر بھی ملی کہ الہٰ آباد میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔ تیس آدمی مارے گئے ہیں۔ شہر کے لوگوں پر کوئی خاص اثر تو نہیں دکھائی دیا لیکن شہر کی دیواروں پر ایک پرچہ ضرور چپکا ہوا دکھائی دیا۔

"لے کر رہیں گے پاکستان"

"پاکستان زندہ باد"

کوئی بھی اس پرچے کو رک کر نہیں پڑھتا تھا۔ لیکن سبھوں نے اسے دیکھا تھا اور اندر ہی اندر باتیں ہونے لگی تھیں۔ طرح طرح کی باتوں کے مطلب نکالے جانے لگے تھے۔ تحصیل کے اسٹامپ فروش سیٹھے نے حافظ کی دکان پر جب آہستہ سے بتایا کہ تحصیل دار صاحب گجادھر سنگھ نے اپنے پرانے مسلمان چپراسی کو جواب دے دیا ہے تو لوگوں کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔

"ارے تو اس نے کوئی چوری چماری کی تھی؟" حافظ جی نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں، ان کے بچوں کو اسکول چھوڑنے جاتا تھا، ساگ سبزی لا دیتا تھا اور وہ اتنا پرانا چپراسی تھا کہ اس سے کسی نقصان کی امید ہی نہیں کی جا سکتی۔ اب بتائیے پانچ پانچ بچے ہیں غریب کے، کہاں سے ان کا پیٹ بھرے گا۔" سیٹھے نے کہا۔

حافظ جی کچھ دیر تک سوچتے رہے تھے۔ پھر بولے "سیٹھے تم اسے یہاں بلا لانا۔ کسی وقت شاید میرے پاس کچھ کام نکل آئے۔"

اور تحصیل کا چپراسی برکت دوسرے ہی دن سے حافظ جی کے یہاں کام پر لگ گیا تھا۔ لوگوں نے اپنی طرح سے باتوں کو توڑا مروڑا تھا۔ تحصیل دار صاحب کے نئے چپراسی ہرنام نے اپنی مونچھ پر تاؤ دیتے ہوئے کہا تھا۔ "اب یہاں مسلمانوں کی نہیں چلے گی۔ ان کا کوئی بھروسہ نہیں۔ تحصیل دار صاحب اپنے بچوں کو کیسے سونپ دیتے ایک مسلمان کے ہاتھ میں؟"

اور منظور علی کی جو عمارت بیچ بازار میں بن رہی تھی اس میں سات دکانیں بھی نکلی تھیں۔ ہندو تاجروں نے اچھے کرائے پر انہیں لینا چاہا تھا لیکن منظور علی نے کم کرایہ لینا منظور کیا تھا لیکن دوکانیں مسلمانوں ہی کو دے دی تھیں۔

اس بات پر کھادی بھنڈار کے آچاریہ جی تنک بپھر اٹھے تھے۔ "ان مسلمانوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اندر ہی اندر ان کے دلوں میں ہندوؤں کے لئے چھریاں چل رہی ہیں۔"

"یہ سب اپنے کو مضبوط بنانے میں لگے ہوئے ہیں ... آپ دیکھئے گا فساد ہوں گے اور ہندو مار کھائیں گے۔" گپتا نے رائے دی تھی۔

"ارے ٹھاکروں کی گدی رہی ہے یہ ..." جسپال سنگھ نے شہد کی شیشی خریدتے ہوئے کہا۔ "اتنی مجال نہیں ہے مسلمنٹوں کی یہاں اس ضلع میں سر اٹھائیں۔"

"سنگھ والوں نے بڑی سمجھ داری کا قدم اٹھایا ہے۔ منڈل کانگریس کمیٹی کے منتری جی بھی اپنے لڑکوں کو سنگھ کی ساکھا میں بھیجتے ہیں۔ سنگھ والوں کا وہ خود بھی بہت ساتھ دیتے ہیں۔" گپتا کہنے لگا۔

"اب سنگھ ہی حفاظت کریگا ان جوانوں سے"۔ ٹھاکر صاحب سنگھی بھاشا میں ہی بول رہے تھے۔۔۔ "ہندو ذاتی کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ کلیوگ میں سنگھ ہی شکتی ہے"۔
ٹھاکر صاحب نے سنگھ لفظ کا مفہوم ہی بدل دیا تھا۔

پوری بستی میں سنگھ والوں کا دَور دَورہ بڑھتا جا رہا تھا۔

تین چار دن سے بڑی دوڑ دھوپ ہو رہی تھی۔ سیوک سائیکلوں پر گھوم گھوم کر اِدھر اُدھر خبریں پہنچا رہے تھے۔ ان کا کوئی پرب تھا اور ایک بڑے ادھیکاری شہر میں آنے والے تھے۔

ادھیکاری جی کا اسٹیشن پر ہی شایانِ شان استقبال ہوا اور ہاتھی پر بٹھا کر انہیں شہر لایا گیا۔

وقت ہوتے ہی سیٹیاں بجنے لگیں اور سویم سیوک قطاروں میں کھڑے ہو گئے۔ ان کی قواعد دیکھ کر لوگوں کو انوکھا تجربہ ہو رہا تھا۔ ہندوییت کی اہمیت کی سوئی ہوئی تاریخ جیسے پھر جاگ رہی تھی۔

اور سنگھ کے ادھیکاری نے سویم سیوکوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا "آج مادرِ وطن پھر وہی قربانی مانگ رہی ہے۔ ہندوستان آج ایک مدت کی غلامی کی نیند کے بعد جاگ رہا ہے، ہم اپنی تہذیب اپنی شان اور اپنی ماضی کی عظمت کے تحفظ کی خاطر سینہ پلائی ہوئی دیواریں ہیں۔ کمزور قوم کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔۔۔ ہندو راشٹر نے آج اپنی تیسری آنکھ کھولی ہے۔ وہ سب اس میں بھسم ہوگا جو بدیشی ہے۔ ہمیں دنیا کی کوئی طاقت پامال نہیں کر سکتی، ہم شیروں کی اولاد ہیں۔ ہم شیواجی، مہارانا پرتاب اور لچھمی بائی کی سنتان ہیں۔ بہادری میں طاقت ہے اور شکتی میں ہے خدائی کا جلوہ۔۔۔ اور بہادر وہی ہے جو ہندو ہے۔"

چاروں طرف ہیجان پھیل گیا تھا، خون میں گرمی آ گئی تھی۔ بچوں کے لئے تو یہ سب ایک اچھا کھیل تھا طالب علم کی اندھی طاقت کے لئے اس میں ایک راہ تھی اور کاروباری لوگوں کی حفاظت کی ضمانت تھی۔

اس دن مسلمانوں میں مردنی چھائی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی دکانیں جلدی بند ہو گئی تھیں۔ مسجدوں میں زیادہ بھیڑ تھی۔ ایک عجیب سا سکتہ طاری تھا۔

حافظ جی اس دن اپنی دکان سے اترے تھے اور لعل کی دکان والے بسنت لال سے دعا بندگی کئے بغیر ہی چلے گئے تھے۔ مسجد کے نیچے بیٹھ کر کباب اور پراٹھے بیچنے والوں نے جلد ہی خوانچے اٹھا لئے تھے۔

صبح شہر جاگا تو رات کے اندیشے ختم ہو چکے تھے لیکن کچھ اور بدل چکا تھا۔ نظریں ملنے سے کتراتی تھیں

رات کو ڈاکخانے والے اڈے پر کھڑے افتخار کے یکے کو اسٹیشن کے لئے تین سواریاں مشکل سے ملی تھیں۔

اس کے سامنے ہی بدری اور جمنا کے یکے لد پھند کر چلے گئے تھے۔ وہ یکے جن پر لوگ بیٹھتے کتراتے تھے۔

مریل گھوڑوں پر رحم کرتے ہوئے وہ سواریاں کو دکر افتخار کے سجے بنے یکے پر بیٹھ جاتی تھیں۔

افتخار دیکھتا رہا — بڑی الجھن ہو رہی تھی اسے۔ شہر میں اس کا یکہ مشہور تھا۔ اس کے گھوڑے کا ثانی نہیں تھا۔۔۔ اپنے یکے کو وہ سجا سنوار کر رکھتا تھا اور کنکر کی سڑک سے جب اس کا یکہ گزرتا تھا تو گھوڑے کے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگرو کھنکتے جاتے تھے۔

افتخار کا یکہ جا رہا ہے۔۔۔ لوگ گھروں میں بیٹھے بیٹھے ہی جان جاتے تھے۔ چوتھی سواری کے لئے وہ ترستا ہی

رہ گیا۔ لیکن نہیں ملی۔ اس کے دل پر جیسے کسی نے پہلی بار گھونسا مارا تھا۔

بڑے بوجھل دل سے افتخار ان تین سواریوں کو اسٹیشن لے گیا تھا اور گاڑی چھوٹنے کا انتظار کئے بغیر ہی وہ یکہ ہانک لایا تھا۔ گھر آکر اس نے سست ہاتھوں سے یکہ کھولا تھا اور گھوڑے کے گھنگھرو کھول کر اس نے کوٹھری کے ایک کونے میں پھینک دیے تھے۔ تبھی ستار آگیا تھا۔

"بڑی جلدی لوٹ آئے افتخار بھائی؟ سواریاں نہیں تھیں؟"

"تھیں تو، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا ستار۔ میں مسلمان ہوں شاید اسی لئے لوگ میرے یکے پر بیٹھتے کتراتے ہیں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟"

اسٹیشن کا راستہ سنسان ہے نا۔ اسی لئے انہیں ڈر لگتا ہے۔" ارے پوچھو، یہیں پیدا ہوا، یہیں رہا بسا۔ اب لوگ دل ہی دل مجھ پر شک کرتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا یہ ہو کیا رہا ہے؟" بڑے بوجھل دل سے افتخار نے کہا تھا۔

"ہاں یہ رنگ ڈھنگ کچھ میری بھی سمجھ میں نہیں آتے۔"

"کچھ نہیں ستار، ہم غریب مارے جائیں گے۔" اپنا وطن چھوڑ کر ہم کہاں جائیں گے، یہاں پیٹ نہیں بھرے گا تو کیا کریں گے؟"

تب ہی دور پر ڈاک بنگلے میں یکایک گیس کی روشنی دکھائی دی۔ درختوں کی کالی قطاروں کے پار سے وہ روشنی چھن چھن کر آرہی تھی۔ ایک طرف ہٹ کر ستار نے دیکھا اور بولا۔ "لگتا ہے کوئی آیا ہے ڈاک بنگلے میں ....."

"ہوگا کوئی افسر۔" افتخار نے کہا۔

"بڑی تیاری سی لگ رہی ہے؟"

"تو کوئی انگریز افسر آیا ہوگا۔" کہہ کر افتخار متفکر سا ہو گیا تھا۔ یوں ہی جب کوئی اور بات کرنے کی نہیں رہ گئی تو ستار بولا۔ "سائیں بڑا ہنگامہ کھڑا کر رہا ہے۔ کچھ سنا تم نے ....؟"

"نصیبن اور بچین کو لیکر وہی نا ... ارے سائیں کی مایا ہے۔ سائیں جانے۔ وہ تو اونٹ کی ذات کا ہے۔ جس کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ کب کس کروٹ بیٹھے گا۔"

"سائیں پیچھے پڑ گیا ہے نصیبن کے ....." ستار نے کہا۔

"سائیں بڑا گھٹا ہوا آدمی ہے۔ ستار۔ شہر بھر میں گھوم گھوم کر یہ کرتا کیا ہے۔ جتنے برے فعل والے لوگ ہیں سب سے دوستی ہے اس کی۔ اسے اللہ سے کیا واسطہ ـ؟" افتخار بتاتا جا رہا تھا۔ ستار کان کھڑے کر کے سن رہا تھا۔ ایک پل رک کر اس نے پوچھا۔ "یہ سائیں کوکین وکین تو نہیں بیچتا۔ اگر ایسا ہو تو سالے کو پھنسوا دیا جائے ....."

"سائیں کو ـ؟ اسے پھنسوانا ٹیڑھی کھیر ہے ... پولیس والوں سے بڑی بنتی ہے اس کی۔ وہ انہیں خبریں بھی پہنچاتا ہے ..." افتخار نے پراسرار انداز سے کہا۔

دونوں کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے تھے۔ ان کی آنکھیں ادھر ڈاک بنگلے پر لگی تھیں جہاں رونق

بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک گیس لیمپ اور آ گیا تھا۔ بھ چیراسی وغیرہ بھی بھوتوں کی طرح بھاگ دوڑ کر رہے اور ایک کالر سے میم بھی اتری تھی۔

تبھی سلمہ کی گلی سے کچھ عجیب سی آوازیں آنے لگیں۔ دبی دبی لیکن درد سے بھری ہوئی۔ ستار کے کان کھڑے ہوئے۔ بولا "لگتا ہے مقصود سلمہ کو مار رہا ہے۔"

"ارے اس نخے میں اتنی ہمت کہاں۔"

"تو عورت پر ہاتھ کوئی مرد اٹھائے گا ...." کہتا ہوا ستار گلی کی طرف چل دیا۔ کچھ دور پر وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ سلمہ کے گھر کے باہر کچھ لوگوں کا مجمع تھا اور مقصود چیخ رہا تھا۔

اب دیکھیں کہاں جاتی ہے سوّر کی بچی۔ نوکری کا رعب ڈالتی ہے۔ اب باہر نکلے حرامزادی تو پیسہ قلم کر دوں ....."

ستار کچھ اور پاس پہنچا۔ دیکھا مقصود سرمہ لگائے اور پٹی دار بال کاڑھے ہوئے تھا۔ مانگ بیچ سے نکلی ہوئی تھی۔

ستار کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ سلمہ کے کراہنے اور رہ رہ کر چیخنے کی آواز اب بھی آ رہی تھی۔

ستار طے نہیں کر پا رہا تھا کہ کیا کرے۔

اسی حالت اور غصے میں پیر پٹکتا ہوا وہ سلمہ کے گھر کے پچھواڑے چلا گیا۔ کچی دیواروں پر نظر پڑی تو دل میں آیا اندر کود جائے اور سلمہ کو اس جہنم سے باہر لے آئے۔ پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہ ارادہ کر ہی رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی "... ستار"

ستار چوکنا ہو گیا۔ ٹھٹھک کر اس نے دیکھا۔ کچھ دور پر بچن کھڑا تھا۔

"کیا ہے بچن بھائی؟"

"اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں ایسے ہی۔" اس سے کوئی جواب نہیں بن پا رہا تھا۔ بچن اور پاس آ گیا۔ اس کے چہرے پر شک بھری مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اندھیرے میں دونوں کی پتلیاں چمک رہی تھیں۔ لیکن بچن کی آنکھوں میں لالی تیر رہی تھی، ایک خوفناک لالی۔ ایک لمحے کے لیے ستار کو گھبراہٹ ہوئی۔ پھر وہ اپنے آپ ہی سب کو چھپاتا گیا۔ سن کر بچن بولا۔ "تو گھر میں کود کر اسے نکال لانے کی غلطی کیوں کر رہے ہو، اس طرح تو قانون میں پھنس جاؤ گے۔ پہلے سلمہ کی منشا جان لو ... اگر وہ تیار ہوئی تو چپ چپاتے کسی وقت لیکر نکل جاؤ۔ میری ضرورت پڑی تو بتانا۔ سمجھے۔ آؤ چلو میرے ساتھ۔" کہتے ہوئے بچن اسے لے آیا۔ مسجد کے چبوترے کے پاس جا کر وہ رک گیا۔ بچن لڑکھڑاتا ہوا نصیبن کے گھر کی طرف چلا گیا۔

کچھ دیر بعد وہ بچن کو لوٹتے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن بچن اسے دیکھے بنا ادھر باہر والی پگڈنڈی پر چلا گیا۔

آخر وہ گھر پہنچا تو دیکھا نصیبن باہر آ رہی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ پوچھ بیٹھا۔ "اتنی رات میں کہاں جا رہی ہو؟"

"بچن کے گھر تک۔"

"لیکن بچن تو اُدھر باسے کی طرف گیا ہے، گھر گیا ہی نہیں ہے۔ میں نے خود دیکھا ہے؟"

"پتہ نہیں کیسا باپ ہے جو اپنے بچوں تک کا خیال نہیں رکھتا۔ اتنی رات ہو گئی۔ بچے گھر میں تنہا ہوں گے۔ بھوکے پیاسے، اور یہ بیٹھا گھوم رہا ہے۔ عجب آدمی ہے ..." بڑبڑاتی ہوئی نصیبن باہر نکل گئی۔ ستار نے دیکھا اس کی بغل میں روٹیوں کی پوٹلی تھی اور گلاس میں سالن۔ اسے یہ سب اچھا لگا۔ وہ تب تک نصیبن کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب تک وہ موڑ پر اوجھل نہیں ہو گئی۔

بکری کے بچے کھٹّے سے باہر نکل کر تلانچیں بھر رہے تھے۔ انہیں کھٹّے کے اندر کر کے ستار چپ چاپ اندر رہینچ کر لیٹ گیا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی، تو شور سا سنائی پڑا۔ جیسے گھر کے پچھواڑے ہی کچھ لوگ کھڑے ہو کر باتیں کر رہے ہوں۔ تہہ بند کس کر وہ باہر نکل آیا تو دیکھا ڈاک بنگلہ لال پگڑی والوں سے بھرا ہوا تھا اور بستی میں پولیس کے آدمی منڈلا رہے تھے۔ ماجرا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پتہ نہیں کیا واردات ہوئی تھی۔ بچے اپنے کچے گھروں کے سامنے سہمے سے کھڑے تھے۔ مکتب کے مولوی صاحب شاید داروغہ سے ہی کچھ کھسر پھسر کر رہے تھے۔ اور سامنے ایک طرف کھڑا پولیس کے کانسٹیبلوں سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر باتیں کر رہا تھا۔ ستار کو دیکھتے ہی مولوی صاحب نے داروغہ کو اشارہ کیا تھا اور اس کی کڑکتی ہوئی آواز سنائی دی تھی۔ "پکڑ لو بدمعاش کو۔"

دو پولیس والوں نے ستار کے دونوں ہاتھ پکڑے اور لا کر داروغہ کے سامنے حاضر کر دیا۔ ستار حیرت زدہ سا ابھی کچھ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ داروغہ کا دستی ڈنڈا اس کی پیٹھ پر پڑا۔

"کیوں بے حرامی کے بچے۔ کتنے دنوں سے ادھر ہے؟"

"پر حضور میرا قصور ..." ستار نے ایک اور وار جھیلنے کے لئے پیٹھ کو سکوڑتے ہوئے کہا۔

تبھی مولوی نے داروغہ سے کہا۔ "حضور یہ ویسے تو مسلمان ہے۔"

"لیکن ہے غدار۔" پتہ نہیں کہاں سے نکل کر مقصود بولا تھا۔ ستار کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ تبھی مقصود نے بتانا شروع کیا۔ "حضور میں نے اسے اپنی آنکھوں سے کل رات بچن کے ساتھ پچھواڑے جاتے دیکھا تھا۔ پھر میں نے ان دونوں کو ایک سوکھا نالہ پار کر کے اُدھر ڈاک بنگلے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہی کوئی ساڑھے گیارہ ... بارہ کا وقت رہا ہو گا۔ دونوں ڈاک بنگلے کا چکر لگا کر لوٹے تھے تو کچھ دیر مسجد کے چبوترے پر بیٹھے رہے تھے۔"

"اے تو مجھے بھی تو کچھ بتائیے ... آخر یہ سب کیا ہے؟ کیا کیا ہے میں نے؟" ستار نے پریشانی سے کہا تھا۔

"چپ بے حرامی کے پلّے۔" داروغہ نے ڈانٹ دیا اور اسے گھورتے ہوئے بولا تھا۔ "وہاں پانچ ہزار کی حویلی میں جب چوتڑ پر ڈنڈے برسیں گے تو سب بکے گا۔ ابھی کتنا بھولا بن رہا ہے سالا ... بچن کہاں ہے؟" ڈانٹتے ہوئے داروغہ نے پوچھا تھا۔

"بچن ...؟ مجھے واقعی پتہ نہیں ہے حضور۔" ستار کچھ گھگھیا کر عاجزی سے بولا تھا۔

ایک دستی ڈنڈا اور پیٹھ پر پڑ گیا تھا۔

"یہاں نہیں قبولے گا داروغہ صاحب۔" مقصود بیچ میں بولا تھا۔ "وہیں لے جائیے .... سالا بڑا ہندوؤں کا حمایتی بنتا ہے۔"

لیکن حضور... مائی باپ مجھے سچ مچ نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ ادھر مکان کے پچھواڑے وہ مجھے ملا ضرور تھا اور مسجد تک ساتھ آیا تھا لیکن پھر پتہ نہیں کہاں چلا گیا۔ سچ کہہ رہا ہوں سرکار۔"

"سرکار کا بچہ۔" داروغہ نے ایک زناٹے کا تھپڑ جڑ دیا تھا۔ "ابے یہیں سے حرامزدگی۔ بوٹی بوٹی اڑا دوں گا بتا کہاں ہے بچن... اور کتنے آدمی شامل تھے چوری میں...؟"

"کہاں کی چوری، کیسی چوری؟"

"ابے وہیں کی، جہاں کی تھی۔ ڈاک بنگلے کی اور کہاں کی" کمر پر ڈنڈا لگاتے ہوئے داروغہ نے بے رحمی سے کہا تھا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں"۔ ستار گھبرا گیا تھا۔

"تم بچن کا پتہ بتا دو، باقی سب ٹھیک ہو جائے گا، تمہارے اوپر حرف نہیں آئے گا، سمجھے ستار" مولوی اور سائیں سمجھانے لگے تھے۔

مقصود نے اس بیچ پان کے بیڑے گھر سے منگوالئے تھے۔ انہیں پیش کرتے ہوئے اس نے ایک تہہ جمائی — داروغہ صاحب، بچن کا پتہ لگ جائے گا اور صاحب کا سارا سامان بھی مل جائے گا.... آخر ستار اپنا بھائی برادر ہے" کہتے ہوئے اس نے مسکرا کر سائیں کی طرف دیکھا تھا۔ سائیں کی سرمہ لگی ہوئی آنکھوں میں شیطانی بھری تھی۔

داروغہ صاحب، خدا کی قسم مجھے بچن کے بارے میں رتی بھر بھی پتہ نہیں۔ آپ اطمینان تو کیجئے" ستار نے پھر کہا۔

"تو نصیبن سے پوچھ کر آ، اسے معلوم ہوگا" سائیں نے کہا تھا۔

"پتہ اسے بھی نہیں ہے لیکن آپ کہتے ہیں تو پوچھ آتا ہوں" کہتے ہوئے ستار اٹھا تو داروغہ نے روک لیا۔ "تو رہنے دے۔ اسے یہیں بلواتے ہیں"۔

اور اس کے بعد دو پہر تک تلاش ہوتی رہی۔ داروغہ کی کھاٹ اٹھ کر مقصود کے چھپر میں چلی گئی۔ پان اور شربت آتا رہا۔

بچن کا پتہ لگانے کے لئے ستار کو فی الحال گرفتار کر کے تھانے میں بند نہیں کیا گیا تھا۔ اسے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا... تاکہ پولیس اس کے ادھر اُدھر آنے جانے سے کچھ سراغ لگا سکے۔ اب پولیس نصیبن کو پریشان کر رہی تھی، لیکن بچن کا کوئی پتہ نہیں تھا۔ رات کا گیا وہ لوٹا ہی نہیں تھا۔ نصیبن داروغہ کے سوالوں سے پریشان ہو گئی تھی اور یہ کہہ کر اٹھ آئی تھی۔ "مجھے جب پتہ ہی نہیں ہے تو کیا بتاؤں... مرضی مجھے گرفتار کرنے کی ہو تو کر لیجئے اور میں کیا کہوں"۔

بستی میں دن بھر سناٹا چھایا رہا۔ لڑکے بچے کچھ دیر تک تو پولیس والوں کو حیرت بھری نگاہوں سے تاکتے رہے۔ پھر ادھر اُدھر بکھر گئے۔

لیکن بچن کے بچے اکیلے گھر میں خاموش بیٹھے تھے۔ لکڑی کی کھڑکی کی جھڑیں پکڑے دونوں بہت دیر تک کچی سڑک کی طرف دیکھتے رہے تھے۔ شاید ابا لوٹ آئے۔ ایسا تو کبھی نہیں ہوا کہ ابا لوٹ کر نہ آئے۔ بھوک کے مارے

چھوٹے لڑکے کا برا حال ہو رہا تھا۔ بکن بستی میں چھائے سناٹے کی وجہ سے دونوں سہمے ہوئے تھے۔ دوپہر ڈھلے جب نصیبن ان کے لئے کھانا بنا کر لائی، تو دونوں رو پڑے تھے۔ جیسے تیسے انہیں کھانا کھلایا تھا اور وہیں ٹھہر گئی تھی۔

شام ہوتے ہی ستار آیا تھا۔ "گھر نہیں جائے گی"؟

"ان بچوں کا کیا کروں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بکن تو آتا دکھائی نہیں دیتا۔ پتہ نہیں کیا ہوا۔ ویسے اب اس کا آنا ٹھیک بھی نہیں ہے۔ اگر آیا تو پولیس کے چنگل میں پھنس جائے گا۔"

"اگر اس نے کچھ کیا نہیں ہے تو ڈر کس بات کا؟" ستار نے ناسمجھی سے کہا تھا۔

"تو، تو ایک دم ناسمجھ ہے۔ لوگ دشمنی نبھا رہے ہیں۔ اچھا دیکھ ایک کام کر ستار"۔ نصیبن کی فکر ابھر آئی تھی۔ "ادھر باہمے پر جا کر ذرا نظر رکھ۔ شاید بکن لوٹتا ہو۔ آئے گا تو اسی پگڈنڈی سے، اگر دکھائی پڑے تو وہیں سے لوٹا دینا۔ کہنا یہاں اس کے لئے خطرہ ہے۔ لیکن تم بھی ذرا سنبھل کر جانا۔ کہیں کسی جاسوس نے دیکھ لیا اور شک ہو گیا تو تم الٹے پھنس جاؤ گے۔ سمجھے؟"۔

"اور یہ بچے ____؟"

"انہیں میں ساتھ گھر لے جاتی ہوں، وہیں رکھوں گی جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔" نصیبن نے کہا تھا۔

ستار کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ لمبے راستے سے باہمے کی طرف جاتے ہوئے اس کے دماغ میں طرح طرح کی باتیں آ رہی تھیں۔ آخر یہ سب ماجرا کیا ہے۔ شاید نصیبن کو بکن کا پتہ ہے۔ شاید یہ بھی بکن کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ یہ چوری بکن نے ہی کی ہے اور ان دونوں کے رشتے بھی کچھ .... لیکن تبھی نصیبن کا مرجھایا ہوا ڈھلتا چہرہ سامنے آ گیا تھا۔ اتنی عمر میں اب بھلا اس طرح کی باتیں ... رہ رہ کر اس کا دل اداس ہو جاتا تھا۔

چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دیر بعد باہمے کے اس پار اندھیارے میں اسے ایک کالا دھبہ نظر آیا تھا۔ وہ چونکا ہوا لیکن وہ دھبہ بہت آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔

وہ ٹیلے کے نیچے اتر آیا۔ منہ پر باہمے کے پانی کے چھینٹے مارے اور آنکھیں دھو کر وہ غور سے تاکنے لگا۔ دھبے کی دوری گھٹتی جا رہی تھی اور اب وہ زیادہ تیزی سے نزدیک آ رہا تھا۔ یہ بکن ہی ہو گا۔ لیکن بکن تو پیدل گیا تھا۔ یہ دھبہ تو سائیکل پر لگ رہا ہے۔

کچھ آگے بڑھ کر اس نے پہچانا — وہ بکن ہی تھا۔ وہ اور لپکا تو دور پر ہی بکن سائیکل سے اتر کر ٹھٹھک گیا۔

"کون بکن ___؟" ستار نے آواز دی۔

بکن خاموش رہا۔

"بکن بھائی میں ہوں ستار" کہہ کر وہ آگے بڑھا تو بکن کی جان میں جان آئی۔ ماتھے کا پسینہ کندھوں سے پونچھتے ہوئے بکن بولا۔

"اس وقت ادھر کیسے؟"

"تمہارے انتظار میں تھا"

"کیوں، کوئی خاص بات؟ اچھا ذرا سائیکل سنبھال"۔ بکن نے اسے سائیکل تھما کر کیریر پر بندھی چمڑے کی چھوٹی چھوٹی مشکوں کو ذرا اوپر کھسکایا جو اوبڑ کھابڑ راستے کی وجہ سے ڈھیلی ہو کر ایک طرف لٹک آئی تھیں۔ مشکوں سے کچی شراب کی بو پھوٹ رہی تھی۔ ستار کا سر یکبارگی اس تیز مہک سے گنگنا اٹھا۔ بولا "یہ مشکیں

تم یہیں بامبے میں بہادو اور تم ابھی تو دو گیارہ ہو جاؤ، سمجھے۔"

"کیوں، پولیس نے چھاپا مارا ہے کیا؟" بچن کی آواز میں بے حد پریشانی تھی۔

"ہاں۔ صبح سے پولیس تمہیں ڈھونڈ رہی ہے۔ ڈاک بنگلے میں کل رات چوری ہوئی ہے۔ شک ہمارے اوپر ہے۔ تم بھاگ جاؤ۔" ستار نے کہا تو بچن سوچ میں پڑ گیا اور اپنے آپ ہی بڑبڑانے لگا۔ "سالوں کا پیٹ نہیں بھرتا.... چاہے جتنا روپیہ کھلاؤ۔ یہ گردن پر سوار رہیں گے۔"

پھر ستار سے اس نے پوچھا تھا۔ "کون داروغہ آیا تھا۔ کچھ نام دام پتہ ہے؟"

"جعفر علی بتاتا تھا اپنے آپ کو۔" ستار نے بتایا۔

ایک لمحہ خاموش رہ کر بچن بولا۔ "سمجھ گیا۔ یہ سب پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔ غنیمت ہے ڈاک بنگلے میں چوری ہی ہوئی ہے۔ کہیں قتل ہوا ہوتا تو اس میں بھی نام دے دیتے۔"

"تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ بس یہی ٹھیک ہے۔ نصیبن بوا بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ اگر دکھائی دے تو بھگا دینا۔ بچوں کی فکر مت کرو۔ وہ نصیبن بوا کے گھر پر حفاظت سے ہیں۔ ادھر جب دھول بیٹھ جائے تو لوٹ آنا۔ آپ دیر مت کرو..." ستار نے سائیکل کا رخ جیسے تیسے پلٹتے ہوئے ہینڈل اسے تھمایا۔ "ارے سنو یہ مشکیں یہیں بامبے میں کھول دو..."

"انہیں لیتا جاؤں گا واپس۔ بہت پیسے کا نقصان ہو جائے گا۔" کہتے ہوئے اس نے سائیکل کو پگڈنڈی کی میک میں ڈال دیا۔

"اچھا ستار بھائی دو چار دن بعد چکر لگاؤں گا۔ تب تک بچوں کا ذرا خیال رکھنا۔"

"خدا حافظ۔" ستار نے کہا اور اوبڑ کھابڑ راستے پر اسے ڈگمگاتے ہوئے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

گھر کی طرف لوٹتے ہوئے اسے خوشی ہو رہی تھی جیسے وہ کوئی بہت بڑا کام کر کے لوٹ رہا ہو۔ لیکن وہ خوشی دھیرے دھیرے غائب ہو گئی۔ اپنی پریشانیوں میں وہ الجھ گیا۔ آخر اس طرح کیسے چلے گا۔ بغیر کام دھام کے دن کیسے گذریں گے!"

نہ چاہتے ہوئے بھی افتخار کی کوٹھری کے پاس اس کے قدم ٹھٹھک گئے۔ افتخار کی کوٹھری سے موم بتی کی روشنی باہر آ رہی تھی۔ یکہ توپ کی طرح اٹکا ہوا تھا اور گھوڑا گردن میں لٹکی بالٹی سے راتب کی جگالی کر رہا تھا۔ بھڑکے ہوئے دروازے سے اس نے جھانک کر دیکھا۔ افتخار کا پنج کے بیٹھے ہوئے گلاس میں غٹ غٹ پانی پی رہا تھا۔ اس کے سامنے وہ تام چینی کی پلیٹ بھی نہیں تھی جس میں روٹی رکھ کر وہ کچے پیاز اور نمک سے کھایا کرتا تھا۔

"آج افتخار کا فاقہ ہوا ہے۔"

پانی پی کر تہہ بند سے منہ پونچھتے ہوئے وہ باہر نکلنے والا تھا کہ ستار لوٹ آیا۔ رکنے اور بات کرنے کی ہمت ہی اس میں نہیں رہ گئی تھی

تھکے من اور تن سے وہ گھر لوٹ آیا۔ نصیبن کو سب بتا کر وہ اپنی دری پر لیٹ رہا۔ کچھ دیر کے بعد نصیبن تو سو گئی، لیکن ستار کی آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔

کہنی کے سہارے بیٹھ کر وہ کچھ دیر نصیبن کو تکتا رہا۔ جیسے وہ نصیبن کو آج پہلی بار اچھی طرح پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اور پہچانتے پہچانتے اسے یکایک ایسا لگا تھا جیسے وہ نصیبن کو سچ مچ پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اس کے

سب نقش، کانوں میں پڑی چاندی کی بالیاں، الجھے ہوئے بال اور چہرے کی جھریاں... گردن کے پاس ابھری ہوئی نسیں اور سوکھی ہوئی چھاتیاں... ہاتھوں کی انگلیوں کے کالے اور ٹوٹے ہوئے ناخن، سوکھی باہنوں میں تار کی طرح ابھری ہوئی نسیں اور سانس سے زندہ ہونے کا احساس پیدا کرتا ہوا پورا جسم — جیسے سب کچھ اس کے لئے ایک دم نیا تھا۔ اس کایا سے وہ نصیبن کا نام جوڑ ہی نہیں پا رہا تھا۔

کہنی درد کرنے لگی تو وہ سیدھا لیٹ گیا۔

اور ادھر شہر میں عجیب سا سناٹا چھانے لگا تھا۔ کبھی کبھی کچھ سنسناہٹ بھی ہوتی تو سناٹا ٹوٹتا سا لگتا۔ شہر کی دھڑکنیں کبھی کبھی تیز ہو جاتیں۔ کبھی دھیمی پڑ جاتیں۔ کبھی لوگ بہت ہی فکرمند اور سہمے سہمے سے نظر آتے اور کبھی جوش و ولولے سے بھرے نظر آتے۔

جب سے آزاد ہند فوج کا مقدمہ نپٹا تھا تب سے ایک اور طرح کی دوری نظر آنے لگی تھی۔ آپسی تعلقات دم توڑ رہے تھے۔ دونوں ذاتوں میں اپنے ہندو اور مسلمان ہونے کا احساس بڑھتا جا رہا تھا۔ ہندو شاید اپنے کو یکایک — زیادہ ہندو سمجھنے لگے تھے اور مسلمان اپنے کو زیادہ مسلمان۔

پولیس پر سے بھی لوگوں کا بھروسہ اٹھتا جا رہا تھا — خاص کر ہندوؤں کا — اگر شہر کوتوال کا تبادلہ ہوتا اور مسلمان کوتوال کے آنے کی خبر ملتی تو ہندوؤں کو دل ہی دل پریشانی سی ہوتی اور مسلمانوں کو خوشی ہوتی۔ پولیس میں زیادہ تر مسلمان کانسٹبل ہی تھے اس لئے ہندوؤں کو برابر یہی لگتا کہ آفت مصیبت کے وقت ان کا ساتھ پولیس نہیں دے گی...... اور مسلمان کو کچھ یہی بھروسہ تھا کہ اگر قہر ٹوٹا تو کم از کم پولیس تو ساتھ ہوگی۔ دس بیس ہندو حوالدار کیا کر لیں گے؟

شہر کے انگریز افسروں سے مسلمانوں کو بہت مدد کی امید تھی۔ کیونکہ اندر ہی اندر انہیں یہ یقین تھا کہ جناح صاحب کی پیٹھ پر انگریز سرکار کا ہاتھ ہے اور وقت آنے پر انگریز افسر مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔

اور ہندوؤں کو سہارا تھا شہر کے دھنی گھرانوں اور آس پاس کے گاؤں کے ٹھاکروں اہیروں کا۔ اگر مار کاٹ ہوئی تو گاؤں سے جنگجو ٹھاکروں اور اہیروں کے جتھے کے جتھے آئیں گے اور منٹ بھر میں سب کا صفایا کر دیں گے... پولیس کیا کرے گی تب۔

سب ہی مجلسوں میں اندر ہی اندر انہی باتوں کا ذکر تھا اور الگ الگ ذاتوں کے محلوں میں ایک دوسرے کی زیادتیوں اور بدمعاشیوں، چالوں اور فریبوں کی دماغی لپٹیں بن رہی تھیں۔ ایک ایک حادثے کے مطلب نکالے جا رہے تھے۔ اور اس کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

بہت معمولی فرق جگہ جگہ ابھرا تھا۔ ابھی تک بازار میں ہندو اور مسلمانوں کو پہچاننے کے لئے آنکھوں پر کچھ زور ڈالنا پڑتا تھا۔ لیکن اب اس کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ چوک بازار میں دری اور چادروں کے مسلمان کاروباری سفید لنگی کی جگہ چار خلنے کی لنگی پہننے لگے تھے اور اوپر تن زیب کے کرتے کی جگہ وائل کی رنگی ہوئی ہری قمیض۔ بساط خانے کے بساطی روزمرہ کا سامان رکھنے کے ساتھ ساتھ علی گڈھ کی چھپی ہوئی کچھ اردو کتابیں اور پرچے بھی رکھنے لگے تھے۔

اب مندروں میں بلاناغہ شام کو آرتی ہوتی تھی اور گھنٹے گھڑیالوں کا شور دیر دیر تک شام کے دھندلکے

میں ٹھہرا رہتا تھا۔ ان کی گونج دور دور تک سنائی پڑتی تھی۔ گلیوں میں پجاریوں کے کھڑاؤں کی آواز اب بہت صاف صاف سنائی پڑتی تھی۔

مسجدوں کے موذن بھی اب گلا کھول کر اذان دیتے تھے اور مسجدوں کی نماز میں شامل ہونے والوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔

اس وقت شہر میں مسلمان فقیروں اور ہندو سادھوؤں کی باڑھ بھی آئی تھی۔ کٹرا کے لالہ سیتا رام چھبی مختار صاحب، چوہ بیانے کے چوبے جی اور بجریا کے پنولال کے یہاں ایک ایک سوامی جی مقیم تھے اور سبھی جلسوں پر ہر شام رامائن، بھگوت گیتا کے درس دیے جا رہے تھے۔

گلاب باغ، دری باغ اور خانقاہ کے پیچھے والے محلے میں پہنچے ہوئے فقیر شریعت سمجھا رہے تھے۔

ادھر چکوں کی بستی میں سائی کا دبدبا اور بڑھ گیا تھا۔ مقصود اور یٰسین بہت مصروف اور پریشان نظر آتے تھے۔

برسات کے دن تھے۔ آسمان رہ رہ کر کالا پڑتا جاتا تھا اور بادل ٹوٹ کر برستے تھے۔ پوری بستی میں سوندھی مٹی کی مہک بھری ہوئی تھی۔ پتلی گلیوں میں پانی جمع ہوا تھا۔ گھروں کے دروازوں پر پڑے ٹاٹ کے پردے زرہ بکتروں کی طرح بھاری ہو کر جھول آئے تھے۔ بے حد امُس اور سیلن تھی۔

انتخار کا گھوڑا پونچھ سے مکھیاں اڑاتے اڑاتے پریشان تھا اور جھنجھلا کر ہنہنا اٹھتا تھا۔

مسجد اور مندر کی دیواریں کو نیلیں پھوٹتی گھاس اور کائی سے بھری ہوئی تھیں۔ چبوتروں کی اینٹوں اور دراروں میں گجابیاں رینگ رہی تھیں اور لڑکوں کے غول گیلی اور پھسپھسی مٹی میں سے گیسے پکڑ پکڑ کر جمع کر رہے تھے۔ ابھی بارش رُکی ہی تھی کہ اپنے تہہ بند سے پسینہ پونچھتے ہوئے مقصود نے مسجد کی دہلیز میں جمع کچھ آدمیوں کی بھیڑ میں آکر دریافت کیا۔ "مولانا صاحب کو لایا جائے؟"

"ضرور لاؤ بھائی دیر ہو رہی ہے۔"

"بس ذرا چائے پی لیں۔ میں ساتھ لیکر آتا ہوں۔"

اور مولانا کے آتے تک اس پچیس تیس آدمیوں کی بھیڑ میں یہی بات ہوتی رہی کہ مولانا صاحب جناب لیاقت علی صاحب کے گھرانے کے ہیں۔ ادھر سے جونپور جا رہے تھے کہ یٰسین بھائی نے ایک شام کے لئے اصرار کر کے روک لیا.... مولانا صاحب کو سب پتہ ہے کہ کیا ہونے والا ہے اور پاکستان کب بننے والا ہے۔ اتنا ہی نہیں جس وقت پاکستان کا اعلان ہوگا اُس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو کس طرح پیش آنا ہے یہ بھی وہ بتائیں گے۔

یہ باتیں چل ہی رہی تھیں کہ مولانا صاحب براق علی گڈھ پاجامہ اور شیروانی پہنے تشریف لائے۔ ان کی شیروانی کے بٹن چاندی کے تھے اور ان میں چاند تارا بنا ہوا تھا۔ ان کی انگلیوں میں کئی انگوٹھیاں تھیں اور آنکھوں میں سرمے کی ہلکی سی لکیر، منہ میں گلوریاں اور سر پر رومی ٹوپی۔

سیلی ہوئی مسند اور بھیگی ہوئی جاجم پر مولانا صاحب بے جھجک بیٹھ گئے۔ ان کی دائیں طرف تھا یٰسین اور بائیں طرف سائیں۔

مولانا نے بڑے فخر سے سمجھانا شروع کیا۔

"تو برادران قوم مجھے بہت خوشی ہے کہ آج شام میں آپ سب کے درمیان ہوں۔ جس طرح حالات رنگ بدل رہے ہیں اور ملک میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں کے آثار نظر آرہے ہیں ان سے اب یہ صاف ظاہر ہے کہ اپنا پاکستان بن کر رہے گا۔ ہندو کانگریس اور انگریز چاہے جتنا زور لگا لیں اب ان کے کئے کچھ ہوتا نہیں .... یہ بات دنیا پر ظاہر ہو چکی ہے کہ ہندوستان میں دو قومیں رہتی ہیں اور اب وہ ساتھ نہیں رہ سکتیں۔

"ہندو کانگریس نے ودھان بنانے والی سبھا میں شامل ہونا منظور کیا ہے، لیکن جو عبوری حکومت بن رہی ہے اس میں شامل ہونا نامنظور کیا ہے۔ قائد اعظم جناح صاحب نے بڑے لاٹ سے کہا ہے کہ اگر کانگریس انٹریم سرکار میں شامل نہیں ہوتی ہو تو بقیہ پارٹیوں کو لیکر انٹریم سرکار بنالی جائے۔ وائسرائے نے اس بات کو نہیں مانا اس لئے جناح صاحب نے پوری اسکیم ہی ٹھکرادی ہے۔ پھر بھی بڑے لاٹ نے اپنے وزیر چن لئے ہیں۔ اس کے خلاف ۱۶ اگست کو "پروٹسٹ ڈے" منانے کا اعلان قائد اعظم نے کیا ہے۔"

"فی الحال میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ آپ سب مسلمان ۱۶ اگست کا دن ایک رنج بھرے دن کی طرح منائیں۔ کالے جھنڈے کا جلوس نکالیں اور یہاں کے افسروں پر یہ ظاہر کر دیں کہ مسلمان اس دن کو ماتم کا دن مانتا ہے وہ ہندو سرکار کے ماتحت نہیں رہے گا اور ہندوؤں کے پٹھو انگریزوں کی بھی مخالفت کرے گا۔"

مولانا صاحب نے جو کچھ فرمایا تھا۔ اسے لوگ سمجھے تو نہیں تھے لیکن انہیں یہ ضرور لگا تھا کہ مسلمان قوم کے ساتھ انگریز اب دغا کر رہے ہیں اور دن برے آرہے ہیں۔ مولانا صاحب کے جانے کے بعد مولوی صاحب کچھ دیر تک اپنی باتیں سمجھاتے رہے۔ تبھی کسی نے خبر دی۔ داروغہ صاحب آگئے ہیں۔"

سب لوگوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ مقصود نے کہا۔ شاید بچن پکڑا گیا ہے۔"

تبھی داروغہ صاحب نے آواز دی — "مقصود صاحب"۔ مقصود انہیں وہیں اندرونی دہلیز میں لے آیا۔ داروغہ نے حاضر لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہیئے صاحبان۔ تو اپنا کام نہیں بنے گا؟"

"بنے گا کیوں نہیں صاحب۔ بچن کے دونوں بچے نصیبن کے یہاں ہیں۔ وہ وقت بے وقت بچوں کو دیکھنے آئیگا ضرور اور اسی وقت اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔"

"تو نصیبن کے گھر پر نظر کون رکھے گا۔ پولیس کا آدمی رہے گا تو وہ چوکنا ہو جائے گا اور بچن کبھی نہیں آئے گا۔ .... اس لئے آپ لوگوں میں سے ہی کسی کو یہ کام کرنا پڑے گا۔ اگر بچن نہیں پکڑا جاتا تو اپنی بڑی سبکی ہوگی ... اب آپ لوگ ساتھ دیں تو کام بن سکتا ہے۔" داروغہ نے کہا۔

"ساتھ کیوں نہیں دیں گے صاحب! ارے ہم اور کس دن کام آئیں گے آپ کے۔" شبراتی نے ادب سے کہا اور پورا ذمہ لے لیا۔

داروغہ صاحب کے چلے جانے کے بعد سائیں نصیبن کے گھر کی طرف گیا۔ اندر سے لیمپ کی روشنی آرہی تھی۔ اور ٹاٹ کے پیچھے کچھ لوگ بیٹھے نظر آرہے تھے۔ سائیں نے آواز دے کر نصیبن کو بلوایا۔ نصیبن کے ہاتھ آٹے میں سنے تھے۔ سائیں کو دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ لیکن اس اندھیرے میں سائیں یہ دیکھ نہیں پایا۔ سائیں بہت ہی اپنے پن سے بولا۔ "ارے اس وقت کبھی کھانا بنا رہی ہو نصیبن؟"

"تو اور کیا کروں؛ اتنے بچے ہیں گھر میں۔ کرنا تو پڑتا ہی ہے۔"

سائیں پاس پڑے پتھر پر بیٹھ گیا تھا۔ ایک لمحہ ٹھٹھک کر اس نے بڑی ہوشیاری سے کہا تھا۔ "تو خود ہی تو مصیبت پال لیتی ہے۔ خود پریشان ہوتی ہے اور لوگوں کو انٹ شنٹ بات کرنے کا موقع دیتی ہے... اب یہی بچن والی بات ہے نصیبن۔ کس کی زبان پر روک لگائی جائے۔ جو جس کے منہ میں آتا ہے بکتا ہے۔ برداشت تو مجھ سے بھی نہیں ہوتا لیکن کیا کروں۔ تو تو خود انہیں یہ سب کہنے کا موقع دیتی ہے۔"

"لوگوں کا کیا ہے سائیں؛ جو دل میں آئے بکیں۔ میں کیا کر سکتی ہوں؟"

"نہیں نصیبن یہی، تو غلط سوچتی ہے۔ بھلا بتا کوئی یہ کیسے برداشت کریگا کہ تیرا ایک ہندو کے ساتھ اتنا میل ملاپ ہو... اپنے لوگ بھی ہیں۔ لیکن بچن کے ساتھ تیرا ربط ضبط کسی کو نہیں بھاتا ______

______ کوئی کیسے برداشت کریگا کہ اس طرح ایک مسلمان گھرانے کی عورت ہندو کے گھر بیٹھ جائے۔"

"کیا مطلب؟" نصیبن کے ماتھے پر پسینہ چھلچھلا آیا تھا۔ "سائیں کہنے والے کہا کریں لیکن میرا اللہ جانتا ہے۔ دل پہ ہاتھ رکھ کر ایمان سے کہنا سائیں... اب پچاس کے آس پاس آکر کیا یہی سب باقی رہ گیا ہے میرے لئے... اس عمر میں ہوں اور لوگوں کو شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔ اور تم خود سنتے رہتے ہو شکوے شکایت لیکر آتے ہو۔ خود جواب نہیں دیا جاتا تم سے۔"

کچھ لمحوں کے لئے سائیں بغلیں جھانکنے لگا تھا۔ پھر اس نے نصیبن کی بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ "عمر اپنی جگہ ہے نصیبن۔"

"تو اب آشنائی کرنے کے دن ہیں میرے؛ جو دل میں آئے سوچو سائیں۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔"

نصیبن کی بات کاٹ کر بڑے رازدارانہ انداز میں سائیں نے کہا۔ "ابے دیکھ نا لوگ طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ الٰہی کہہ رہا تھا کہ بچن نے اپنی بیوی کا سب چاندی کا زیور تک تمہیں دے دیا ہے اور تم گھر والی کی طرح اس کا سب کچھ...."

نصیبن بپھر گئی تھی۔ "سائیں تمہارا مطلب کیا ہے؟ تم چاہتے کیا ہو؟"

"میں کاہے کو کچھ چاہوں گا۔ لیکن نصیبن میں یہی سمجھانے آیا تھا کہ وقت بہت برا آیا ہے۔ پورے ملک میں ہندو قوم مسلمانوں کے خون کی پیاسی ہو رہی ہے اور تو ہے کہ بچن کے لونڈوں کو گھر پر اٹھا لائی... اس کے پیچھے پولیس پڑی ہے اور تو ہے کہ اپنی نادانیوں سے باز نہیں آتی۔ کل کو خدانہ کرے کچھ گڑبڑ ہو تو یہی بچن تیرے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ ہم نے تو یہاں تک سنا ہے کہ ڈاک بنگلے میں چوری کرکے بچن ندی پار کے ٹھاکروں کے یہاں چھپ گیا ہے اور وہاں جو فوجیں مسلمانوں کے قتل عام کے لئے بن رہی ہیں، وہ ان کا سرغنہ بن گیا ہے اور تم ان سنپولوں کو دودھ پلا رہی ہو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو سائیں؟ کہاں کی باتیں ہیں یہ سب؟ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ بچن کا چوری میں کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ داروغہ اس سے کسی بات پر ناراض ہے اس لئے اس چوری میں اسے پھنسایا گیا ہے اور تم سب لوگ اس داروغہ بدمعاش کا ساتھ دے رہے ہو۔" نصیبن اپنے کو روک نہیں پا رہی تھی۔

سائیں پتھر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے اس نے پھر ایک بار جیسے نصیبن کو آگاہ کیا۔ "اب سوچ لو اپنا بھلا برا۔ میرا فرض تھا تمہیں سمجھا دینا۔ سو پورا کر دیا۔ اب جیسی تمہاری مرضی۔ زبردستی تو میں کر نہیں سکتا۔ کل

کوئی آفت مصیبت پڑے گی تو کوئی ساتھ نہیں دے گا۔"

"ارے تو کون سا قہر ٹوٹنے جا رہا ہے جو ڈر رہے ہو سائیں۔"

"تیری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ تو تو اندھی ہو رہی ہے اندھی۔" کہتا ہوا سائیں اپنی کوٹھری کی طرف چلا گیا۔

چپ چپاتی گلی میں وہ چھپروں کے پیچھے پیچھے ہوتا ہوا جا رہا تھا کہ دوسری طرف والی پڑی پر ایک سایہ اسے دیکھ کر کچھ ٹھٹھکا اور خاموشی سے کھڑا رہ گیا۔

سائیں جب آگے نکل گیا تو وہ سایہ جلدی جلدی بڑھا اور نصیبن کے گھر میں سما گیا۔

"ارے سلمہ تم —" روٹی سینکتے ہوئے نصیبن نے حیرت سے کہا۔ "کیوں کیا بات ہے جو اس وقت آنا پڑا؟"

ستار سامنے کھڑا تھا۔ اس کی باہوں میں خون کی حرکت تیز ہو گئی تھی اور اسے لگا تھا کہ شاید اب اسی وقت اسے کچھ کرنا ہوگا۔ وہ سلمہ کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا کہ اس کے منہ سے بات نکلے اور وہ جا کر مقصود کا گلا دبا دے۔ ہمیشہ کے لئے وارا نیارا کر دے۔

تبھی سلمہ نے کہا تھا۔ "ذرا خیال رکھنا اپنا اور آنے جانے والوں کا۔ سنا ہے کہ داروغہ نے شبراتی کو بچن کو پکڑنے کے لئے تمہارے گھر پر تعینات کیا ہے۔ ابھی گھر میں یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ شبراتی بھی وہیں تھا ابھی تینوں نکل کر کہیں گئے تو موقع پاتے ہی میں چلی آئی۔ اچھا اب چلتی ہوں . . . ."

جاتے جاتے سلمہ نے ایک بھری بھری نظر ستار پر ڈالی تھی۔ خاموشی سے ہی وہ جیسے بہت کچھ کہہ دینا چاہتی تھی۔ ستار اس سے کچھ پوچھنے کے لئے اپنے کو دل ہی دل میں تیار کر رہا تھا۔ کہ وہ پردہ اٹھا کر باہر نکل گئی . . . . .

وہ جب تک کچھ بات کرنے کے لئے تیار ہو، تب تک تو سلمہ آدھی گلی پار کر گئی تھی۔ اور دروازے کے باہر چوکھٹ پر اٹک کر وہ دیکھتا رہ گیا تھا۔ سلمہ کی چال میں بھاری پن سا سمایا ہوا تھا اور اسے لگا تھا جیسے کسی انجانی مار سے اس کا اپنا بدن اس لمحہ بری طرح دکھ رہا ہے . . . . وہ چلنے لائق نہیں ہے۔

چوکھٹ پر کھڑا کھڑا وہ اپنے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ ایک تیز بوچھار بکھر گئی۔ منہ پر پڑا پانی پونچھتا ہوا وہ اندر بھاگا۔ نصیبن بچوں کے لئے کھانا نکال رہی تھی۔ وہیں پاس بیٹھ کر اس نے دھیرے سے کہا — "شاید آج رات بچن ادھر کا چکر لگائے گا۔"

"اگر کم بختی ساتھ ہوگی تو ضرور لگائے گا۔" نصیبن بولی۔

"بارش بہت تیز ہو گئی ہے۔"

"ارے اس کا کوئی بھروسہ نہیں۔ بارش نہیں قہر ٹوٹے . . . . اگر اسے آنا ہوگا تو آئے گا۔"

"یہاں تو جال بچھا ہے۔"

"تو کوئی کیا کرے۔ آئے گا تو پھنسے گا۔ رہے بچے سو میں دیکھ رہی ہوں۔ جیسا باہر ہے ویسے ہی جیل کے اندر۔ ہمیں کیا فرق پڑتا ہے؟ ہاں نہیں تو۔" نصیبن بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ "اور دشمنی کرے پولیس والوں سے . . . . کوئی کہاں کہاں ہاتھ لگائے گا۔"

اور کھانا کھا کر اسی موسلا دھار بارش میں ستار باہر نکل گیا تھا۔ چلتے چلتے اتنا کہہ گیا تھا — بچن کو آگاہ کر آؤں۔ کیا پتہ وہ ادھر آ ہی جائے۔

ندی کا پاٹ پھیل گیا تھا۔ ندی کی سطح پر بارش کی لگاتار بوندیں ایسے گر رہی تھیں جیسے ندی اور آسمان کے بیچ سوت پرو دیے گئے ہوں۔ اندھیرے میں وہ پردہ بڑا خواب انگیز لگ رہا تھا۔

ستار بھیگتا ہوا آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میدان میں جگہ جگہ پانی کے شیشے چمک رہے تھے۔ دھندلے اور سیاہ شیشے۔ شمشان کے تاڑوں پر پانی بہت شور کر رہا تھا اور میدان میں مینڈک ٹرا رہے تھے۔ تاڑوں پر بیٹھے ہوئے گدھ چپ چاپ بھیگ رہے تھے۔ ستار آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ اس وقت اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیوں بڑھتا جا رہا ہے۔ کیا وہ سچ مچ بچن کے لئے ہمدردی کی وجہ سے اس اندھی پانی کی رات میں نکل پڑا ہے؟ پھر اسے لگا تھا کہ ایک ہی تار ہے جس سے وہ بندھا ہے اور وہ ہے سلمہ کی بات کا۔ بچن کے تئیں اس کی فکر کا۔

دور، ندی کنارے مچھیروں کی بستی تھی۔ ایسے مچھیرے جو کھیتی باڑی بھی کرتے تھے اور موقع ہونے پر ٹھیکہ لیکر مچھلیاں بھی پکڑتے تھے۔ ندی کے رتیلے پاٹ میں وہ ککڑیاں، خربوزہ، تربوز اور کچھ ساگ سبزیاں بھی اُگا لیتے تھے اور اوپر میدان میں باجرا، رائی وغیرہ چھٹک کر کچھ پیدا کر لیتے تھے۔ گنے چنے مکان تھے ان کے۔ برسات میں کبھی کبھی یہ مکان بھی چھوڑنے پڑ جاتے تھے اور یکایک ندی کا پانی بڑھ جانے سے کھیت بھی چوپٹ ہو جاتے تھے۔ اس لئے کوئی بھی ایسا دھندہ کرنے میں اُن مچھیروں کو پریشانی نہیں ہوتی تھی جس سے چار پیسے ہاتھ میں آتے ہوں۔

بچن کے کچی شراب کے دھندے میں مانک اور اس کے دونوں بھائی بھی ہاتھ بٹاتے تھے۔ زیادہ تر شراب کی مشکیں کسی سنسان جگہ پر ہی رکھی جاتی تھیں اور کشتی کے ذریعے اس پار لائی جاتی تھیں۔ پل سے لانا اتنا آسان کام نہیں تھا... ایک تو چنگی ٹیکس کی جھونپڑی وہیں تھی۔ دوسرے محصول وصول کرنے والا منشی علی زبردست پینے والا تھا۔ وہ صراحی میں تین چار بوتلیں انڈیل لیتا تھا۔ پھر چوکیدار بھی کم نہیں تھا۔ وہ بخشش اوپر سے لیتا تھا اور بڑا کلھڑ نکال کر اسی میں غٹ غٹ پی جاتا تھا۔ نقصان تو اسے بہت نہیں ہوتا تھا لیکن اتنی رشوت دینے کے بعد بھی منشی کے پیر کے انگوٹھے کے نیچے ہی رہنا پڑتا تھا۔

اس لئے بچن نے مانک سے سانٹھ گانٹھ کی تھی اور اسے اپنے کاروبار میں حصہ دے دیا تھا۔ اس کی اپنی کشتی تھی اس لئے کرائے ورائے کا چکر بھی نہیں تھا۔

اور پھر بچن کے لئے سب سے بڑی کشش تھی مانک کی گھر والی ــــ رکمنی ــــ جسے وہ بھوجی کہہ کر پکارتا تھا۔ اور جب بھی مشکیں لاتا، اسے بغیر بلائے نہیں جاتا تھا۔ رکمنی جب پی کر بہکتی تھی تو بچن کو بڑا رس لگتا تھا... خاص طور سے اس لئے بھی کہ وہ مانک کو بہت بہت ستاتی تھی۔

جس دن مشکیں اترنے والی ہوتیں، رکمنی رہو یا پڑھن مچھلی ضرور پکڑ لاتی اور تل کر رکھ لیتی تھی۔ انگلی بھر کی کلیجی کا ٹکڑا ہوتا۔ لیکن اسی پر مانک سے اس کا جھگڑا ہوتا۔ کبھی کبھی تو مار پیٹ تک ہو جاتی۔ بچن تبھی رکمنی کو کندھے سے پکڑ کر دو گھونٹ اور پلا دیتا.... تب اس کے چاروں طرف بھیگی کالی مٹی، پسینے اور مچھلی کی بساند بھر جاتی۔ رکمنی کی بانہوں میں اسے مچھلیاں سی تڑپتی محسوس ہوتیں اور اس کا جسم پھڑکنے لگتا تھا۔

پتہ نہیں اس وقت رکمنی کو کیا ہوتا تھا کہ بچن محسوس کرنے لگتا تھا کہ وہ اسی کے ساتھ سٹی بیٹھی رہنا چاہتی ہے۔ اس کے جسم کی بو سے وہ بے سدھ ہوتا تھا لیکن جب بھی کس کر پکڑنا چاہتا وہ مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسل جاتی تھی۔ بچن رہ رہ کر تڑپتا تھا اور اسے اس بات سے اطمینان ہو جاتا تھا کہ رکمنی اس کے سامنے مانک کی بے عزتی کر دیتی تھی لیکن بچن نے کبھی اکیلے میں مانک کو اپنی اس خوشی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ مانک سے وہ بگاڑ بھی نہیں کرنا

چاہتا تھا۔

جب سے ڈاک بنگلے میں چوری ہوئی تھی اور پولیس اس کے پیچھے پڑی تھی۔ وہ بستی میں نہیں جانا چاہتا تھا شہر میں داخل ہونے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ پولیس کے رخ کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا اور دھندے میں برابر نقصان ہو رہا تھا۔

ایسا بھی کوئی نہیں تھا جس سے وہ کھل کر بات کر لیتا۔ لڑکے کی ہڈی جب سے ٹوٹی تھی تب نصیبن اپنے آپ ہی آئی تھی اور سب کچھ سنبھال کر بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت بچن کو بڑا سہارا ملا تھا۔ لیکن جب بستی میں اسے لیکر باتیں شروع ہوئی تھیں تو بچن نے پوری آنکھیں کھول کر نصیبن کو دیکھا تھا — شاید کہیں پر ... شاید کچھ ... لیکن دوسرے ہی پل اسے اپنے آپ پر غصہ آیا تھا اور اس کا دل اُچاٹ ہو گیا تھا۔

نصیبن کے بائیں ہاتھ کی بیچ والی انگلی کا ٹوٹا ہوا ناخن اسے بار بار کچھ یاد دلاتا تھا ...

جب ماں مری تھی اور اس پر کپڑا ڈالا گیا تھا تو بایاں ہاتھ غلطی سے باہر رہ گیا تھا .... اور اس کی بیچ والی انگلی کا ناخن کچھ اس طرح ٹوٹا ہوا تھا۔ آنسو بھری آنکھوں کے پار سے اس کی نظر بار بار اسی ناخن پر اٹک جاتی تھی اور دل بھر آتا تھا۔

اسی رات جب اسے بچوں کو چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا تو وہ مری ہوئی بیوی کا چاندی کا زیور نصیبن کو سونپ آیا تھا ... "میں اسے کہاں رکھوں گا؟"

پھر دل کے چور نے سوچا تھا — یہ غلط کیا۔

اور ایک دن ندی کنارے مانک کے ساتھ بیٹھے بیٹھے جب وہ گپیں لڑا رہا تھا تو پتہ نہیں من کی کس رو میں اس نے سن گن لینے کے لئے جھوٹ موٹ گڑھ کر بات سنائی تھی۔ "مانک بھائی اپنا تو ایک انتظام ہے۔ وہیں بستی میں — بڑی زبردست عورت ہے۔" کہتے کہتے اسے کسی اصلیت کی ضرورت پڑی تھی جو کہ اس کی بات کو وزن دے سکے تو اسی دھن میں اس نے نصیبن کی ایک مورت سامنے کھڑی کر کے سب کچھ بتا ڈالا تھا۔ "اس کا دل تو بہت دنوں سے تھا۔ لیکن میں کچھ خیال ہی نہیں کرتا تھا۔ ایک دن لڑکے کی ہڈی ٹوٹی تو وہ اپنے آپ ہی آ گئی۔ پھر رہنا سہنا ہو گیا۔" بچن بتاتا جا رہا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ گیا۔ "میں نے تو اسے من سے مان بھی لیا اس لئے گھر والی کا سب زیور بھی اس کے حوالے کر دیا۔"

اس وقت کچی دارو زیادہ چڑھی ہوئی تھی اور رنگینی بھی پہلے سے زیادہ اچھی طرح پیش آئی تھی۔ اس لئے من میں شک بیٹھ گیا تھا کہ کہیں مانک اس کے اندرونی خیالوں کو بھانپ نہ جائے اور وہ گڑھ گڑھ کر باتیں سناتا گیا تھا۔ "ہے بڑی سندر! بھرا ہوا جسم ہے اور من کی بڑی نیک!"

لیکن اس لمحہ اسے لگا تھا کہ یہ مورت نصیبن سے کہیں دور چلی گئی تھی۔ یہ اس کے دل کی عورت کی تصویر تھی۔ شاید رکمنی کی۔

مانک سب کچھ چپ چاپ سن کر ہاں ہوں کرتا رہتا تھا۔ بیچ بیچ میں رس لینے کے لئے وہ ایک آدھ سوال بھی کر بیٹھتا تو بچن مزا لے لے کر باتیں گڑھتا جاتا تھا اور سناتا جاتا تھا۔

"نام کیا ہے —؟" مانک نے پوچھا تھا تو وہ گھبرا گیا تھا۔ نصیبن کا نام اس کی زبان پر نہیں آیا تھا۔ دل

میں نفرت سی پیدا ہو گئی تھی کہ وہ کیسے یہ سب باتیں کہہ گیا ہے۔

بیچ والی انگلی کا ٹوٹا ہوا ناخن! اس کا سر چکرا اٹھا تھا اور دل بجھتا جا رہا تھا۔ خاموشی سے اس نے مانک کی طرف دیکھا تھا۔ مانک کی آنکھوں میں پچھلے دنوں سے لگاتار ڈوبتے ابھرتے شک کی پرچھائیں اسے تہہ میں بیٹھی دکھائی دی تھی۔

اس جھوٹ موٹ کے قصے سے مانک کا سلوک ہی بدل گیا تھا اور اسے یہ بہت اچھا لگا تھا۔ اب وہ رکمنی سے کھل کر کھیل پائے گا اور مانک کے دل میں شک نہیں پیدا ہوگا۔

لیکن اس سب میں نصیبن کو کھینچ لینے کی وجہ سے رہ رہ کر دل کہیں کچوٹتا تھا اور وہ تصویر بن ہی نہیں پاتی تھی جو روپ میں وہ مانک کے سامنے کھینچ گیا تھا۔ جب کبھی وہ سوچتا تو دل میں چوٹ سی لگتی تھی کہ نصیبن نے اس کے ساتھ کیا کیا اور وہ کیا سوچ گیا۔

اس سے بھی زیادہ تو شرمندگی اس وقت ہوئی تھی جب ایک دن رکمنی سے بھی اس نے اسی طرح کی باتیں کہہ ڈالی تھیں ۔۔۔ اپنا عیب چھپانے کے لیے۔

مانک اور رکمنی کے ساتھ اس کے تعلقات ایسے ہو گئے تھے کہ اب وہ کہی ہوئی باتوں سے پلٹ بھی نہیں سکتا تھا۔ بستی میں کوئی ایسا نہیں تھا جس کے پاس بیٹھ کر دل کے اس سارے غبار کو نکال دے۔ اور جب سے یہ قصے ہوئے تھے تب سے اس کا کہیں بھی آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ بہت ہمت کر کے وہ ندی پار مانک کے گھر آتا تھا۔ ندی کے اس پار دوسرے ضلع کا علاقہ تھا اور یہاں کی پولیس تلملا کر رہ جاتی تھی۔

آج مشکیں بھی نہیں اتری تھیں۔ مچھیروں کو جو ضرورت پڑی تو مانک کے گھر سے نکل آئی تھی۔ رکمنی نے الگ سے بچا کر تھوڑی سی رکھ لی تھی۔ مچھلیاں بھی پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے ہاتھ نہیں آئی تھیں اس لیے اس نے سوکھے جھینگے تل لئے تھے۔ ڈھبری کی روشنی میں تینوں بیٹھے پی رہے تھے اور اپنی ہی باتوں میں مشغول تھے۔

ستار چلتا چلتا ندی کنارے کے گاؤں تک پہنچا تو سونے پن سے گھبرا گیا تھا۔ بارش کی وجہ سے سناٹا اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ کہیں روشنی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ غنیمت یہی تھا کہ مچھیروں کے کتے اندر دبکے ہوئے تھے نہیں تو اب تک حملہ ہو جاتا۔ ہوا کی تیزی کی وجہ سے اسے کچھ کچھ سردی سی لگ رہی تھی۔ دو تین منٹ ٹھہر کر وہ سن گن لیتا رہا۔ تبھی اسے ہنسنے کی آواز سنائی دی اور اسی کے ساتھ ڈھبری کی چمک بھی دکھائی دی۔ وہ کچھ اور پاس پہنچا تو بات چیت سن کر اسے یقین ہو گیا کہ یہی گھر اس مچھیرے کا ہے جہاں بچن کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔ ایک بار بچن نے ایسے ہی ذکر کیا تھا۔

آگے بڑھ کر اس نے آواز دی: "چودھری۔ او چودھری"۔

"اب ایک بوند بھی نہیں ہے۔" رکمنی اندر سے بولی تھی تو مانک نے اسے ڈانٹا تھا۔ "پہلے سوچ سمجھ لیا کر۔ تب آواز دیا کر۔"

"تو اور کون موت کا مارا آئے گا اس وقت۔ ادھا پوا کی ضرورت پڑی ہوگی تو چلا آیا ہوگا۔"

ستار نے پھر آواز لگائی تو بچن نکل کر دیکھنے آیا۔ ستار کو سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

ضرور کچھ گڑبڑ ہوئی ہے۔ نہیں تو یہ اس وقت کیوں آتا؟" گھبرا کر بچن نے پوچھا۔

"خیریت تو ہے؟"

"ہاں ہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"اس وقت کیسے آنا ہوا؟"

"تمہیں آگاہ کرنے آیا تھا۔ شبراتی دن رات گھر پر پہرہ دے رہا ہے۔ تم غلطی سے بھی ادھر نہیں آنا۔ بس اتنا ہی کہنے آیا تھا...." ستار نے کہا اور اسے اپنے کچھ دیر پہلے کے جنون پر خود ہی ہنسی آ گئی۔ یہاں تک چلا آیا اس اندھی برسات میں۔

"اندر تو آؤ" کہتے ہوئے بچن اسے گھسیٹ لے گیا۔ مانک اور رکمنی سے جان پہچان ہوئی اور ایک کلہڑ اس کے سامنے بھی آیا۔

دو چار گھونٹ کے بعد ستار نے جسم میں کچھ سنسناہٹ اور زندگی سی محسوس کی۔ بڑی دیر تک مستی کی باتیں ہوتی رہیں اور ستار نے یہ بھی بتایا کہ سائیں، مقصود اور نصیبن کس طرح کی باتیں پھیلا رہے ہیں... لیکن شکایت تو اسے ہندوؤں سے بھی تھی۔ بڑی دبی زبان میں وہ سب بتا گیا تھا لیکن یہ باتیں سبھی کے دماغ کے باہر کی تھیں۔ اس لئے رکمنی نے دوسری باتیں چھیڑ دیں۔

"ارے وہ کون عورت ہے جس نے بچن کا مال دبا رکھا ہے؟" اس نے کچھ بے لاگ ڈھنگ سے کہا تھا لیکن بچن کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ اس نے بات گھمانے کے لئے کہا تھا۔ "ارے وہ وہاں کہاں ہے"

"تم ہی تو کہتے تھے، وہیں کی ہے اور اب بھی وہیں رہتی ہے۔ کترا کاہے کو رہے ہو، کوئی اور بات ہو تو بتاؤ"

......" رکمنی پر نشہ حاوی ہو رہا تھا اور ایسے میں اس سے بحث کرنا یا اس کی بات کو کاٹنا مصیبت مول لینا تھا۔

بچن دل ہی دل میں بہت پریشان تھا — کہیں ستار سب کچھ سمجھ نہ جائے۔

مانک بھی دوسری طرح سے برس رہا تھا۔ جو کچھ اس نے سنا تھا اس کے سہارے وہ بھی مزہ لینے لگا — بہت خوبصورت ہے وہ لگائی.... کیوں ستار بھائی؟"

ستار سب سمجھ رہا تھا۔ لیکن باتیں پکڑ میں نہیں آ رہی تھیں۔ بچن بیچ بیچ میں ایسی بات جوڑتا کہ نصیبن کی بنتی ہوئی تصویر میں کوئی دوسرا ہی نظر آنے لگتا۔

تبھی رکمنی نے کہا۔ "بچے اسی عورت کے پاس ہیں نا"۔ بچن چاہتے ہوئے بھی نا نہیں کہہ پایا۔ اس نے جواب دینے کی بجائے کلہڑ اٹھایا اور غٹ غٹ پی گیا۔

ستار سمجھ کر بھی انجان بن گیا تھا۔ بات میں مزہ لینے کے لئے اس نے اتنا ہی کہا تھا۔ "ارے وہاں ان کی ایک ہو تو کوئی بتائے بھی ...."

اس بات سے بچن کو بڑا سہارا ملا تھا۔ ساری باتیں تھم گئی تھیں۔ پھر بھی وہ حیرت سے تینوں کو دیکھتا رہا تھا۔

بارش کچھ کچھ تھمنے لگی تو ستار باہر نکلنے کے لئے اٹھا۔ "اچھا اب چلوں گا۔"

چلتے وقت رکمنی نے اس سے سفارش کی۔ "ارے بھیا اس کا مال جیسے تیسے دلا دو نا، بہت پریشان ہے یہ وہی تو جمع پونجی ہے بچارے کی۔"

سن کر ستار ہنستا رہا۔ اس کے پاس کوئی جواب بھی نہیں تھا۔ بچن اسے چھوڑنے باہر آیا تو بوندا باندی میں ساتھ ہو لیا — کچھ دیر دونوں خاموش چلتے رہے۔ کچھ اور آگے جا کر بچن نے ہی خاموشی توڑی۔ "رکمنی کی بات کا

انٹ شنٹ مطلب مت لگانا۔ وہ ایسے ہی بکتی رہتی ہے جو منہ آگیا دے مارتی ہے۔"

اس کی بات سن کر ستار کا دل کھٹا ہو گیا تھا۔

اور لوٹتے ہوئے ستار کو اپنا آنا بے کار سا لگنے لگا تھا۔ نصیبن کو لے کر جو جو اور جس جس طرح کی باتیں اس نے سنی تھیں ان سے اس کی پریشانی اور بڑھ گئی تھی۔ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کیسا بال اور کیسی عورت، بستی میں اور کوئی عورت بھی ایسی نہیں جس سے بچن کا ربط ضبط رہا ہو۔ نصیبن کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے۔ بہت سوچنے کے بعد وہ ایک ہی نتیجے پر پہنچا تھا۔ ہو چاہے جو کچھ، لیکن بچن نصیبن کے بارے میں اچھا خیال نہیں رکھتا اور ایک نصیبن ہے کہ ....."

گھر پہنچ کر وہ لیٹ گیا تھا۔ سیلن کے مارے نیند نہیں آ رہی تھی۔ چار بچوں کے اس طرف نصیبن لیٹی ہوئی تھی۔ نیند میں بے سُدھ۔

جب سب کچھ سمجھ سے باہر ہو گیا اور اپنی مصیبتوں اور دلی پریشانیوں کا بھی کوئی حل نہیں نکلا تو دماغ ایک ہی جگہ جا کر ٹک گیا۔ زندگی کا یہ ڈھرہ بدلنا چاہیے ... کوئی اور زندگی ہو، جہاں مجبوریاں ختم ہو جائیں۔ ..... شاید اس بننے والے پاکستان میں نئی زندگی شروع کرنے کا موقع ملے اور دل کی یہ جلن اور زندگی کی یہ تھکان مٹ جائے۔

لیکن پاکستان کے بارے میں سوچتے ہی جو پہلی تصویر ابھرتی تھی ـــ وہ مقصود اور یسین کی تھی۔ اسے دوسرے ہی لمحے لگا تھا کہ پاکستان وہی تو ہوگا جہاں مقصود اور یسین ہوں گے۔ وہیں پاکستان ہوگا۔ تب وہ کیسے جائے گا۔

اور سلمہ، وہ کیا کرے گی؟ اب تو اس کے پیٹ میں بچہ بھی ہے۔ جہاں اس کا شوہر جائے گا وہیں تو وہ بھی جائے گی۔ اور کیا کرے گی؟ اس کے لئے اور راستہ بھی کیا ہے؟

انہی خیالوں میں ڈبا ڈبا وہ ادھ نندا ہو آیا تھا۔ صبح آنکھ کھلی تو دیکھا ـــ نصیبن بچوں کو پڑھنے کے لئے گھیر رہی ہے۔

کچھ دیر بعد وہ سب بچوں کو ریوڑ کی طرح ہانکتی ہوئی لے گئی تھی۔ بچن کے دونوں لڑکوں کو اس نے خاص طور سے کاجل ڈالا تھا اور خود ہی بستہ بنا کر دیا تھا۔

نصیبن کے لوٹتے ہی گھومتا ہوا سائیں آگیا تھا۔ کچھ دیر وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر بولا۔

"نصیبن لگتا ہے اب وبال کھڑا ہو جائے گا۔"

"کاہے کا وبال ـــ"

"ان ہی بچن کے بچوں کو لیکر۔ ہندو مسلمان ہونے کی بات نہیں ہے۔ لیکن تمہاری وجہ سے پوری بستی پر مصیبت ٹوٹ پڑے گی۔ پولیس ابھی تک کچھ کر نہیں رہی ہے۔ لیکن اسے ڈاک بنگلے کی چوری کے ملزموں کو پکڑنا ہی ہے۔ اگر بچن نہیں پکڑا جاتا تو کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوگا کہ ہم بستی کے لوگ اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں؟"۔

کہہ کر جواب سننے کے لئے سائیں خاموش ہو گیا تھا۔

نصیبن کچھ دیر تو خاموش رہی۔ لیکن سائیں کو جواب کے لئے اڑا دیکھ کر بولی۔ "سائیں اصل بات یہ ہے کہ یہ بچے تمہاری آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں۔ میرے لئے دھرم کرم کا سوال نہیں ہے سائیں۔ سیدھی سی بات ہے

مجھ سے ان بچوں کو بلکتا نہیں دیکھا گیا سو لے آئی، کل کو ان کا باپ آجائے گا تو چلے جائیں گے ...."

نصیبن کی بات کو ستار سن رہا تھا اور دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔

"خیر، دو دفعہ سمجھا چکا اب جیسی تمہاری مرضی۔" سائیں ناراض ہو کر چلا گیا۔

پہلے تو ستار نے سوچا کچھ نہ کہے لیکن رہا نہیں گیا۔ وہ اسے بلا کر اندر لے گیا اور بڑی مشکل سے بولا۔ "ہوا کچھ بات میں بھی تم سے کرنا چاہتا تھا۔ سائیں کی بات میں کچھ وزن تو ہے۔ بچن پر تم جتنا بھروسہ کرتی ہو وہ اتنا تم پر کرتا ہے یا نہیں اس کا بھی تمہیں پتہ نہیں۔ کیا پتہ کل تمہارے اوپر چار الزام آجائیں۔"

"کیسے الزام؟"

"اب یہ تو تم ہی بہتر جانتی ہو؟"

"گناہ تو کوئی کیا نہیں ستار .... رہ گئی بچن کی بات، وہ اتنا اچھا آدمی نہیں ہے، کچھ پرکھ مجھ میں بھی ہے۔"

نصیبن کا وشواس دیکھ کر ستار کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ پھر بھی اس نے کہہ ہی دیا۔ "ندی کنارے والے گاؤں میں تمہیں اور بچن کو لیکر بچاس طرح کی اول جلول باتیں ہوتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ تم بچن کے گھر کے زیور چرا لائی ہو، کوئی کہتا ہے ...."

یہ سنکر نصیبن کا دل تھوڑا گھبرایا تھا۔ پھر اپنے کو سنبھالتے ہوئے وہ بولی تھی۔ "کہنے کو تو جتنے منہ اتنی باتیں۔ بچن تو نہیں کہتا؟"

"خود مجھ سے تو نہیں، لیکن میرے سامنے یہ بات ہوئی تھی اور بچن نے انکار نہیں کیا۔ میری وجہ سے وہ بات کو ٹال جانا چاہتا تھا۔" ستار کہتے کہتے رک گیا تھا۔ اس نے نصیبن کی آنکھوں میں جھانکا تھا وہاں بادل گھر رہے تھے اور ایک اٹھتا ہوا سیلاب نظر آرہا تھا۔ ستار کو اپنے پر ذرا ندامت سی ہوئی کہ اس نے یہ سب کیوں کہا۔ لیکن اب تو تیر نکل چکا تھا۔ کوئی چارہ نہیں تھا۔

"خیر وہ اپنی جانے ..." کہہ کر نصیبن پانی پینے کے لئے اٹھ گئی اور ستار پھر اس کے سامنے نہیں رہ سکا تھا۔

صبح کی دھوپ دوپہر کی چلچلاتی گرمی میں بدلتی جا رہی تھی۔ بادل نہ ہونے سے گرمی بہت تیز ہو گئی تھی۔ رات کا کیچڑ اوپر سے سوکھتا جا رہا تھا اور پتلی مٹی کی پپڑیاں بن کر چٹک گئی تھیں۔

ستار افتخار کی کوٹھری کی طرف گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہیں ہوگا۔ لیکن افتخار وہیں تھا۔ گھوڑا اور بچاووں پر چر رہا تھا اور یکہ کھڑا تھا۔ کوٹھری میں بیٹھ کر افتخار گھوڑے کے گھونگھرو بجا رہا تھا ایک تال پر۔ ستار کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

"کیوں اڈے نہیں گئے؟"

"سواری نہیں ملتی تو جانور بھی اکتا جاتا ہے اس لئے اب اسے چھٹی دے دی ہے۔" پھر گھونگھرو کو بڑی بے دلی سے کونے میں پھینکتے ہوئے بولا تھا۔ "اب کیا ہوگا ستار بھائی؟"

"کاہے کا؟"

"پیٹ کا۔"

"کیوں؟"

"حال نہیں دیکھ رہے ہو۔"

"تو کیا۔ کیا جائے؟"

"یہی کہ پاکستان چلا جائے۔"

"لیکن وہ ابھی ہے کہاں؟"

"بن جائے گا۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے نہیں، ہوگا۔ شہر میں حافظ جی کہہ رہے تھے۔ اب پاکستان کے بننے میں دیر نہیں ہے۔"

"پر بنے گا کیسے؟ اپنی سمجھ میں تو یہ بات ہی نہیں آتی۔ مان لو یہ پاکستان بن گیا تب بھی کیا فرق پڑتا ہے۔" ستار نے جاننے کے لئے پوچھا تھا۔

"ارے ذرا اُدھر دیکھنا۔" انتخار کی نظر سڑک سے بستی کی طرف کٹنے والی پگڈنڈی کی طرف تھی۔

ستار نے دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ کالی ٹوپی اور خاکی نیکر والے سنگھی چلے آرہے تھے ..... وہ کچھ سمجھ نہیں پایا۔

"خطرہ ہے۔ لاٹھیاں دیکھ رہے ہو؟"

"لگتا تو یہی ہے۔ لیکن اب کیا جائے؟"

"جو ہوگا سو کریں گے۔ یہ بڑے ظالم ہوتے ہیں اور بڑے کٹر ہندو ہوتے ہو۔ اس سے پار پانا مشکل ہے۔" کہتے ہوئے وہ اٹھا اور ٹین کے بکسے میں سے ایک قرولی نکال کر اس نے تہہ بند میں چھپائی۔

ستار کی سمجھ میں جب کچھ نہیں آیا تو اس نے گھوڑے کا چابک ہی تھام لیا۔

سات آٹھ سنگھی سوئم سیوک بغل سے گذرے تو ستار نے دیکھا، رتن بھی ان میں تھا۔ مسجد کے نکڑ پر انہوں نے نصیبن کا اتہ پتہ پوچھا اور اس کے گھر کی طرف مڑ گئے۔ تماشبین بچوں کے غول ان کے پیچھے لگ گئے۔

منیر کے دونوں لڑکے کتے کے پلّے دبائے ہوئے تھے۔ حسن کا لڑکا گلہریوں کا شکار چھوڑ کر غلیل پکڑے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ ستابی بیوہ کی لڑکی اور لڑکا بھی حیرت سے دیکھتے ہوئے بھاگے چلے آرہے تھے۔ غنی مستری کی آٹھ کی پلٹن ریل۔ ریل کا کھیل کھیلتی ہوئی باقاعدہ پیچھے آرہی تھی۔ بچوں کے ساتھ ہی گلی کے کتے بھی بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور بھونک رہے تھے۔ پوری بستی کے بچے جمع ہو گئے تھے۔ مرد گھروں میں نہیں تھے۔ سب اپنے اپنے کاموں پر یا بیکاری میں شہر کی خاک چھان رہے تھے۔ چکوے تو گوشت بازار میں تھے۔ کچھ ایک پڑوس کے قصبے میں بکروں کے سودے کے لئے گئے ہوئے تھے۔ مستریوں کا جمگھٹ تو گھر سے صبح ہی نکل جاتا تھا کرنی بسولی لیکر۔ بانسوں کا کاروبار کرنے والے جنگل کی طرف تھے۔ ایک آدھ اپاہج، دمہ اور تپ دق کے مریض اور بوڑھے گھروں کے سامنے چبوتروں پر کھاٹیں ڈالے لیٹے تھے۔

سائیں بھی اس وقت بستی میں نہیں تھا۔ مولوی صاحب پاٹھ شالا والوں سے چل رہے مقدمے کی پیروی کے لئے کچہری میں کسی سے ملنے چلے گئے تھے۔

عورتوں کی ڈری سہمی ہوئی نگاہیں ٹاٹوں کے چھیدوں اور کواڑوں کی آڑوں سے ان نئے قسم کے آدمیوں کو دیکھ رہی تھیں۔ "ٹوپی تو ہندوانی ہے پر نیکر ولایتی۔"

"کون ہیں یہ لوگ ؟"
"لگتا ہے نئی طرح کی پولیس بنی ہے ، اسی بچین کی تلاش میں آئی ہوگی۔"
"لیکن یہ ہندو پولیس ہے۔"
"پولیس کے پاس تو بندوق ہوتی ہے۔"
"لاٹھی پولیس کے پاس بھی ہوتی ہے۔"
"ہوتی ہوگی۔"
تب تک سنگھی سوئم سیوک نصیبن کے گھر پر پہنچ چکے تھے۔ بہت ہمت کر کے افتخار اور ستار بھی وہاں پہنچے تو رتن نے دیکھ کر بھی پہچاننے سے انکار کیا اور ٹوپی اتار کر لاٹھی کو دونوں جانگھوں کے بیچ میں دبا کر چوٹی باندھنے لگا۔
سنگھی سوئم سیوکوں کے ساتھ کھدر کی دھوتی اور کرتا پہنے ہوئے ایک آدمی بھی تھا۔ یہ آدمی مارواڑی یتیم خانہ کا مستری تھا۔
رتن نے بڑھ کر نصیبن کے دروازے پر دستک دی۔ نصیبن نکل کر آئی تو اتنے سارے کالی ٹوپی والوں کو دیکھ کر بھونچکی رہ گئی۔ وہ کچھ سمجھ نہیں پائی۔ رتن نے تبھی پوچھا۔ "آپ کے گھر میں ہندو بچے ہیں ؟"
"کیوں ؟"
"ہم معلوم کرنے آئے ہیں۔"
"آپ کہاں سے آئے ہیں ؟" نصیبن نے پوچھا۔
"یہیں شہر سے ..... ہم ہندو سیوک سمیتی کے لوگ ہیں، ہم ہندوؤں کی سیوا کرتے ہیں۔"
نصیبن کو اکیلا دیکھ کر ستار آگے بڑھ آیا۔ نصیبن کو پیچھے کرتے ہوئے اس نے رتن سے پوچھا۔
"آپ کا مطلب کیا ہے ؟"
"مطلب ہم بعد میں بتائیں گے۔ پہلے ہمیں یہ بتایئے کہ ان کے یہاں دو ہندو بچے ہیں ؟"
"مان لیجئے ہیں تو ؟"
"مان لیجئے کا سوال نہیں ہے۔ ہیں یا نہیں ؟ ہاں یا نا میں جواب دیجئے۔"
ستار کو کچا پڑتے دیکھ کر نصیبن ہی پھر آگے ہوگئی ۔ "ہاں ہیں تو۔"
"تو انھیں میرے حوالے کر دو۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"
"ہمیں پتہ چلا ہے کہ آپ دو ہندو بچوں کا مذہب تبدیل کرنے والی ہیں .... یہ نہیں ہو سکتا۔"
"کیا ... دھرم .... ؟" نصیبن نے جاننے کے لئے پوچھا۔
"ہاں ! ہم نے سنا ہے کہ ان کے باپ کی موت ہو گئی ہے اور آپ لوگ چپ چاپ ان دونوں بچوں کو مسلمان بنا رہے ہیں۔ یہ جرم ہے۔ ہمارے ساتھ اناتھ آشرم کے منتری مہودے آئے ہیں۔ آپ بچوں کو ان کے حوالے کر دیجئے اور جھگڑا ختم کیجئے۔" رتن بہت سنبھل سنبھل کر کہہ رہا تھا۔ یہ اس کے بولنے میں غرور اور اقتدار کی جھنکار تھی۔

"بچے کسی یتیم خانے میں نہیں جائیں گے۔" نصیبن نے بہت صاف صاف کہہ دیا تھا۔ "ہم یہ سب جھنجھٹ جانتے نہیں ۔ . . رہی ان کے مسلمان ہونے کی بات سو سولہ آنے غلط ہے ۔ باپ ان کا زندہ ہے۔ جب آئے گا تب لے جائے گا۔"

"بے کار کی باتوں کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں ہے ۔ ہم آپ سے التجا کرنے آئے ہیں۔ اگر آپ بچوں کو حوالے نہیں کریں گی تو ہم پولیس کو اطلاع دیں گے اور آپ گرفتار ہو جائیں گی ۔ ایک آدمی بھی نہیں بچے گا۔" کہتے ہوئے رتن نے ایک حقارت بھری نظر ستار پر ڈالی تھی۔

"آپ پولیس کو خبر کر دیں۔" نصیبن نے دو ٹوک بات کہی تو سویم سیوکوں کی منڈلی میں کانا پھوسی شروع ہو گئی اور آس پاس جمع بچوں نے ایکدم شور و غل کرنا شروع کر دیا۔

ستار نے بڑھ کر ایک آدھ کو چانٹا رسید کر دیا اور بچوں کے غول چڑیوں کی طرح اُڑ گئے اور شور مچاتے ہوئے وہ گلیوں میں بکھر گئے۔ انہی کے پیچھے پیچھے کتے بھی بھاگ گئے۔

"تو آپ بچوں کو اناتھ آشرم کے منتری کے سپرد کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں؟" رتن نے کچھ غصے سے پوچھا تھا۔

"کیسے کر دوں؟ کاہے کو کر دوں؟ کل کو ان کا باپ آئے گا تو؟ یہ بھی ہنسی ٹھٹھا ہے؟ ارے بچے ہیں یہ۔ کوئی کاٹھ کواڑ تو نہیں جو پڑے رہیں گے وہاں۔ خوب رہی؟" نصیبن بھی بپھر اٹھی تھی۔ "خوب آئے آپ لوگ۔ بچے حوالے کر دو۔ واہ بھائی واہ۔ جو کرنا ہو جا کر کرو، پولیس نہیں لیفٹن کو بُلا لاؤ۔ ہاں نہیں تو۔ اوپر سے طرّہ لیکر آئے ہیں۔ مسلمان بنایا جا رہا ہے۔ ارے ہم کاہے کو بنائیں گے کسی کو مسلمان۔ ہمارے کیا بال بچے نہیں ہیں ..... ہاں نہیں تو .....،" بڑبڑاتی ہوئی وہ اندر چلی گئی اور غصے ہی میں اس نے کواڑ لگا لیا۔

سنگھی سویم سیوک اپنا سا منہ لیکر رہ گئے تھے۔ دال گلتی نہ دیکھ کر رتن نے بڑی شان سے کہا تھا "ستار میاں، اس عورت کو سمجھا کر کل تک دونوں بچوں کو یتیم خانے میں پہنچا دو۔ نہیں تو ٹھیک نہیں ہوگا۔" کہہ کر اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا۔ اپنے ساتھیوں سے بولا "آیئے بندھو، کل تک دیکھ کر پولیس کو خبر کریں گے۔ یہی کرنا پڑے گا۔ شاید۔ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔"

اور وہ سنگھی بندھو قواعد کے انداز میں اپنے پیر اٹھاتے اور پٹیاں ٹٹولتے ہوئے جیسے آئے تھے ویسے ہی لوٹ گئے۔

ان کے جانے کے بعد بستی میں اور بھی سناٹا چھا گیا۔ شام کے جھٹپٹے میں جب مرد لوگ واپس آئے تو سب سے تازہ گرم خبر یہی تھی۔ لیکن اسی خبر سے بجائے جوش اور غصے کے ایک عجیب سناٹا چھا گیا تھا۔ لوگ ڈر سے گئے تھے۔ ان کے دلوں میں دہشت سما گئی تھی۔

شہر میں بھی اس حادثے کو لیکر اندر ہی اندر سنسنی پھیل گئی تھی ....
تب ہی آیا ۱۶ر اگست سن چھیالیس اور شہر میں کچھ دبنگ مسلمانوں نے کالے جھنڈے لے کر جلوس نکالا۔
جلوس میں بیس بائیس لوگ ہی تھے، باقی بھیڑ لڑکوں کی تھی۔ لیکن شہر کی خاص خاص سڑکوں پر کالے جھنڈے لیکر جب مسلمانوں کا یہ جتھا گھوما اور نعرے سنائی پڑے :

"ہندو راج ہائے ہائے۔ انگریز کے پٹھو ہائے ہائے" تو لوگوں کو بڑا عجیب سا لگا۔

شہر کے ہندو جتنا اس جلوس کو دیکھ دیکھ کر طرح طرح کی اٹکلیں لگا رہے تھے۔ وہ جلوس خانقاہ میں جاکر ختم ہوا، جہاں تقریباً دو ڈھائی سو مسلمان جمع تھے۔ خانقاہ میں جلوس کے رہنماؤں نے دھواں دھار تقریریں کیں۔ یٰسین میاں نے بھی پاکستان کی مانگ رکھی اور یہ اعلان کیا کہ مسلمان اور ہندو — ان دونوں قوموں کی تہذیب، رہن سہن، کھانا پینا اور مذہب الگ الگ ہیں اس لئے ایک ملک میں رہنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

جلوس نکالے جانے کے بعد پھر وہی سناٹا چھا گیا۔ بڑا خاموش ہنگامہ ہوا۔ اندر ہی اندر۔ باہر اس کا کوئی خاص اثر نہیں دکھائی دیا مگر مسلمانوں کے حوصلے کچھ بڑھے ہوئے ضرور دکھائی دیتے تھے۔ شہر کی دونوں خاص سڑکوں سے جب کالے جھنڈوں والا جلوس گذرا تو کہیں کچھ بھی نہیں ہوا۔ جلوس کے لیڈروں کو ڈر تھا کہ کہیں کسی جگہ پر ہندوؤں کی طرف سے اینٹ پتھر نہ پھینکے جائیں۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ کسی نے کسی کی طرف انگلی تک نہیں اٹھائی اور نہ جلوس کے پروگرام میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑی۔ ہندوؤں کو ڈر تھا کہ جلوس والے شاید دوکانوں کو لوٹ لیں یا فساد کریں لیکن یہ بھی نہیں ہوا۔ کچھ بھی ایسا نہیں ہوا کہ بات بگڑتی۔

کسی نے کسی کو گالی تک نہیں دی تھی، کسی نے ڈھیلا تک نہیں پھینکا تھا۔ کسی کے خراش تک نہیں آئی تھی۔

لیکن صبح ہوتے ہی شہر میں افواہیں پھیلنے لگی تھیں۔ کلکتہ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا ہے۔ مسلمانوں نے جلوس نکلنے سے پہلے پوری تیاری کر رکھی تھی ۔۔۔ انھوں ہندوؤں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ہے۔ بچوں کی ٹانگیں چیر دی گئیں اور سر عام ہندو عورتوں کو ننگا کر کے بے عزت کیا گیا ہے ۔۔۔۔۔۔۔

جن کے گھر ریڈیو تھے وہاں بھیڑ جمع ہو گئی تھی۔ سبھوں کے دل خوف اور اندیشوں سے بیٹھے جا رہے تھے۔ ریڈیو فساد کی خبریں نشر تو کر رہا تھا لیکن کتنا بڑا ہنگامہ اور قتل عام ہوا ہے اس کی زبانی رپورٹیں ہی آرہی تھیں۔

شہر کا چپہ چپہ اندر ہی اندر دھڑک رہا تھا۔

جو بیا سے محلے میں لوگ شہر کے مسلمانوں کو کاٹ ڈالنے کی باتیں کر رہے تھے۔ دفتر اور بازار کھلے تھے لیکن لوگ اپنی اپنی ذاتوں اور مذہب کے مطابق ہی غولوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے ۔۔۔ فکر میں ڈوبے ۔۔۔۔

"بنگال کا وزیر اعلیٰ مسلمان ہے نا۔ وہ سالا سہروردی۔ اسی نے سب کرایا ہے۔ مہینوں پہلے سے قتل عام کی تیاریاں ہوئی تھیں۔"

دن بھر طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ مسلمانوں کے ٹولوں میں کچھ ڈر بھی تھا اور اندر چھپی ہوئی خوشی بھی۔ لیکن ہندو دل ہی دل میں ابل رہے تھے۔

بازار کا حال ٹیڑھا تھا۔ جہاں ہندوؤں کی دس دکانوں کے بیچ کسی مسلمان کی اکیلی دکان تھی تو وہ بند تھی۔ اور جہاں مسلمانوں کے بیچ کسی ایک یا دو ہندوؤں کی دوکانیں تھیں تو وہ بھی بند تھیں۔

مسلمان چوڑی والے پھیری لگانے کے لئے نہیں نکلنے تھے۔ کپڑے والے خردہ فروش بھی نہیں آئے تھے۔ تالا چابی بنانے یا برتن قلعی کرنے والوں کی آوازیں بھی نہیں سنائی دی تھیں۔

اس خوف اور شک نے لوگوں کو اس قدر خوف زدہ کر دیا تھا کہ کچہری والی سڑک پر "قائم" الکوستے گردوارے میں یکایک بھیڑ بڑھ گئی تھی۔

گرنتھی دھڑا دھڑ سکھ بنا رہے تھے۔ موتی دھانک کا لڑکا پہلا سکھ بنا تھا شہر میں۔ پھر گلی والے نتھو رام کا
لڑکا بھگت ساہے آیا تھا اور محلے بھر میں کڑا پرساد بانٹ آیا تھا۔ سکھ بننے کا فیشن سا چل پڑا تھا۔ ہر نوجوان ہندو قرولی باندھنے
کے لالچ میں سکھ بننے کو تیار تھا۔

ادھر وائسرائے کے یہاں پنڈت نہرو نے قسم لی تو نواکھالی میں دنگے بھڑک اٹھے۔ مہاتما گاندھی کلکتہ نہ رک
کر نواکھالی پہنچے لیکن ہندوؤں کو تشفی نہیں ہوئی۔

اور ان سب کا بدلہ جب ہندوؤں نے بہار میں لیا تو خبریں اور گرم ہوئیں۔
اسی شہر میں باہر کی ان خبروں سے فضا تنی بگڑتی رہی۔ سنگھی سویم سیوکوں اور مسلمانوں کے والنٹیروں کی
آمدورفت بڑھ گئی۔

بیلیوں پر بھگوے جھنڈے لہرانے لگے اور مسلمانوں کے گھروں پر ہرے جھنڈے۔ دیواروں پر طرح طرح کی
عبارتیں صبح لکھی ملنے لگیں۔ ہر شخص خوف زدہ تھا اور ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ دیواروں، زینوں
گلیوں اور سڑکوں تک کا دل ہی دل میں بٹوارہ ہو گیا۔ کسی حد تک کسی کا جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ یہ سب نے سمجھ
لیا تھا جیسے شہر ہی میں حدیں بن گئی تھیں ہندوستان اور پاکستان کی۔

اسکولوں اور مدرسوں میں بچوں کی حاضری بہت کم ہو گئی تھی۔ کوئی مسلمان لڑکا ہندو محلے سے ہو کر اسکول
نہیں گیا تھا۔ ہندو لڑکے مسلمانوں کے محلوں کے پاس تک نہیں گئے تھے۔ بازاروں میں درگا چنڈی، شیواجی، مہارانا
پرتاپ، ہری سنگھ نلوا اور پرتھوی راج کی تصویریں اور زیادہ دکھائی دینے لگی تھیں۔ پان والوں کے یہاں سے
فلمی تصویریں اتر گئی تھیں اور ان کی جگہ ویر سینانیوں کی تصویریں لٹک گئی تھیں۔

بچن سنگھ ڈرائیور نے اپنے ٹرک کے پیچھے لکھی عبارت "اچھا پھر ملیں گے نمستے" مٹوا کر لکھوالیا تھا "جے
درگا ماتا، جے چنڈی"

نہر والے مندر کے بڈھے پجاری اپنے چبوترے پر بیٹھے گیتا کے اشلوکوں کو سمجھا رہے تھے اور شہر کے
اکلوتے پرچے میں بہادر ہندوؤں کی زندگیاں چھپ رہی تھیں۔

تبھی پاکستان بننے کا اعلان ہوا۔

شہر کے مسلمان اندر ہی اندر خوش ہوئے لیکن اوپر سے کٹے ہوئے تھے... ساتھ ہی ان میں کہیں
خوف اور بھی گہرا اتر گیا تھا۔ پر ایک آدھ سرپھرے تو نا سمجھی میں یہاں تک اعلان کر دیا — "اب بن گیا
ہمارا پاکستان۔ ہندو جائیں اپنے ہندوستان میں۔ گلی کے ادھر ہے ہندوستان اور ادھر ہے پاکستان"
چکوں کی بستی میں لیگیوں نے جشن منایا تھا — آخر میں قائد اعظم کی جیت ہوئی۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا
ہندوؤں نے۔ لیکن پاکستان کا بننا نہیں روک پائے"

مقصود کے دروازے پر ڈھولک بجا بجا کر قوالیاں ہوتی رہیں۔ لڑکوں کے لئے اچھا تماشا تھا.....
سب کو یہی پتہ تھا کہ کچھ ایسا ہوا ہے جو پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اب مسلمانوں کے دن لوٹ آئیں گے اور غریبی کا
جوا ان کی گردن سے اتر جائے گا۔

اور بستی میں جب بغیر جانے سمجھے لوگ جشن منا رہے تھے تو نصیبن گھر میں بیٹھی بیٹھی کڑھ رہی تھی۔ "دماغ
خراب ہو گیا ہے ان لوگوں کا۔ ارے پوچھو کوئی کیا بدلے گا۔ اپنا نصیب جو ہے وہی رہے گا۔"

تبھی باہر سے آیا ہوا ایک آدمی پیغام لایا تھا کہ بچن نے اپنے لڑکوں کو بلایا ہے۔ نصیبن نے ستار کو پاس بٹھا کر مشورہ کیا تھا کہ کیا کیا جائے۔

ستار نے سیدھے سیدھے سمجھایا تھا "اس سے کہہ دو کہ بچن اپنے لڑکوں کو آکر لے جائے۔"

"یہاں آئے گا تو پکڑا جائے گا۔"

"ضرور پکڑا جائے گا لیکن تم کس موہ ممتا میں پڑی ہو۔ جو ہوتا ہے ہونے دو۔ کہہ دو آکر وہ اپنے بچوں کو لے جائے۔"

"وہ یہاں نہیں آئے گا۔ وہیں باسبے کے کنارے اس نے ملنے کو کہا ہے ..." اس آدمی نے کہا تھا "اب یہاں آئے گا کس منہ سے۔" نصیبن نے کہا تو ستار کو کچھ حیرت ہوئی۔ پھر وہ ستار کی خوشامد کرتے ہوئے بولی تھی۔

"ستار تو اپنی ذمہ داری پر ان بچوں کو سونپ آ۔ نہیں تو مجھے کبھی چین نہیں آئے گا۔"

بہت منانے بجھانے کے بعد ستار تیار ہو گیا تھا۔

"ہم رات کو بچوں کو لیکر آئیں گے وہیں باسبے کے پل پر۔ بچن سے کہہ دینا۔ سمجھے۔" کہہ کر ستار نے پیغام لانے والے کو رخصت کر دیا تھا۔

دن بھر نصیبن بہت اداس رہی۔ رات کو جب ستار دونوں بچوں کو لیکر چلنے لگا تو نصیبن نے ایک پوٹلی اس کے ہاتھ میں تھمائی تھی۔ "یہ بھی بچن کو دے دینا۔"

"اس کے زیور ہیں؟"

"ہاں۔"

"ستار ایک لمحہ پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اتنی بے عزتی کے بعد بھی لوٹا رہی ہو۔"

"پر چیز تو اسی کی ہے۔"

"اس میں تو روپے بھی معلوم ہوتے ہیں۔" ستار نے ٹٹولتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں کچھ چاندی کے روپے ہیں۔"

"اسی کے ہیں؟"

"ہیں تو اپنے، لیکن مصیبت میں گھرا ہے بیچارہ ... ادھر چوری چھپے رہتے ہوئے کام دھام نہیں کر پایا ہوگا، اوپر سے بچے بھی جا رہے ہیں۔ کچھ ضرورت بھی تو پڑے گی ... اس سے کہہ دینا۔ اپنے سمجھ کر ہی خرچ کرے۔ کوئی بات دل میں نہ لائے ..."

ستار کچھ سمجھ نہیں پایا تھا۔ کچھ بھی کہتے ہوئے جیسے وہ اپنی نظروں میں اب بہت چھوٹا ہوا جا رہا تھا۔

ستار کے لوٹنے تک نصیبن سوئی نہیں تھی۔ خیریت پوچھ پاچھ کر وہ لیٹ تو گئی لیکن نیند نہیں آ رہی تھی۔ آخر ڈھبری جلا کر وہ چرخا کاتنے لگی تھی۔

ستار کی جب بھی نیند اچٹتی تو نصیبن کو جاگتے اور کچھ سوچتے ہوئے پاتا۔ اور ایسے ہی رات کٹ گئی تھی۔

صبح ہی سے ماحول کچھ کچھ اندا اور بے خواب سا تھا۔

چاروں طرف جو کچھ ہو رہا یا ہوا تھا، وہ اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہا تھا۔ نہ تو وہ نصیبن ہی کو

سمجھ پا رہا تھا اور نہ چاروں طرف ابلتے ہوئے ماحول کو۔

اس کے لئے کوئی اور ٹھکانہ بھی نہیں تھا سوائے افتخار کی کوٹھری کے۔ وہاں پہنچا تو افتخار نے کہا۔ "بھائی اپن تو پاکستان جا رہے ہیں۔" ستار خاموش دیکھتا رہ گیا تھا۔

"کس کے ساتھ؟"

"اپنے بچے گھوڑے کے ساتھ۔ یہاں سے یکہ جُتے گا اور پاکستان جا کر کھلے گا۔" افتخار نے کہا اور ہنسنے لگا۔

"ہم کہاں جائیں؟"

"تم بھی چلو یتے پر، جگہ کی کیا کمی ہے۔ چاہو تو اپنی سلمہ کو بھی لے لو۔" کہتے ہوئے افتخار نے آنکھ ماری۔

"لیکن یکا ایک پاکستان جانے کی بات۔۔۔۔؟"

"بات یہ ہے کہ یہ گھوڑا بھی سالا ہندو ہو گیا ہے۔ کل سے یہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتا۔ اب کیا کیا جائے۔ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔"

بچوں کے شور سے ان کا دھیان بٹ گیا۔

پاکستان بننے کی خوشی میں مولوی صاحب نے ایک دن کی چھٹی بچوں کو دی تھی۔ بچے ٹولیاں بنائے شور مچاتے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑ بھاگ رہے تھے اور مقصود نے انہیں ایک نعرہ دیا تھا: پاکستان زندہ باد، قائد اعظم زندہ باد۔ اور بچے قطار باندھ کر گلیوں میں گھومتے ہوئے بڑے جوش سے یہ نعرہ لگاتے رہے۔ نصیبن مرغیوں کو دبلے میں بند کرتے ہوئے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بے انتہا ممتا تھی ان بچوں کے لئے۔۔۔ اور شاید اپنے لئے گہرا سناٹا۔۔۔۔

بستی کے سبھی لوگ یہ نظارہ دیکھتے رہے۔ جب بچوں کا جلوس لوٹ کر مکتب کے پاس پہنچا تو مقصود نے سب کو ایک ایک میٹھی گولی دی تھی۔

منیر کے لڑکے شبیر اور شمشیر کتّے کے پلّے دبا کر بھاگ گئے تھے۔ حسن کا لڑکا گُو اپنی غلیل لیکر گلہریوں کے شکار پر چلا گیا تھا۔ غنی مستری کی آٹھ کی پلٹن بھی بکھر گئی تھی۔

لیکن شہر میں کوئی جلوس نہیں نکلا تھا۔

کسی نے نعرے نہیں لگائے تھے۔

ویسے ہندوؤں کو لگ رہا تھا کہ پاکستان بننے کی خوشی میں مسلمان کچھ نہ کچھ کریں گے لیکن شہر میں پتہ بھی نہیں کھڑکا۔۔۔۔۔

سب کچھ اپنی جگہ پر تھا۔ پر کچھ تھا جو نہیں تھا۔ گلیوں کے چھوٹے چھوٹے گھروں میں بیٹھے سُنار زیور گڑھ رہے تھے۔ تالابوں میں کمل پھولے ہوئے تھے۔ جل منجری کے پتے ناگوں کی طرح پھن اٹھائے کھڑے تھے۔ جنگل میں کمرکھ اور آنولے پھلے تھے۔ جھاڑیوں میں مدھو مکھیوں کے چھتے اب نہیں تھے پر مندروں کے آنگنوں میں کنیر اب بھی پھولے ہوئے تھے اور مسجدوں کے صحن میں مہندی مہک رہی تھی۔

پر فضا میں خدشات رینگ رہے تھے۔

ایک بھیانک خوف لوگوں کے دل و دماغ پر حاوی تھا۔

تقسیم ہوئی تو پنجاب میں خون کی ندیاں بہیں۔ بنگال میں مار کاٹ ہوئی۔ صوبے کے بڑے شہروں میں

قتل ہوئے اور بستیاں جلا کر راکھ کر ڈالی گئیں۔

لیکن اس شہر میں ایک بوند خون بھی نہیں گرا۔ کسی محلے پر حملہ نہیں ہوا۔ کسی نے کسی کو نہیں مارا۔ کسی نے کسی کو گالی تک نہیں دی۔ مسجدوں میں لڑائی کی تیاریاں نہیں ہوئیں۔ مندروں میں اینٹ پتھر اکٹھے نہیں ہوئے، جو بدمعاش روز پٹتے تھے انہیں بھی کسی نے نہیں پیٹا۔

لیکن اندر ہی اندر ایک زلزلہ آیا ہوا تھا جس سے بستی کی چولیں ہل رہی تھیں۔ دلی عمارتیں ڈھہ رہی تھیں ایک ابلتا ہوا نفرت کا دریا نیچے ہی نیچے بہہ رہا تھا۔ شک اور ڈر سب کے دلوں میں سمایا ہوا تھا۔

دوسرے شہروں، قصبوں اور صوبوں سے طرح طرح کی خوفناک خبریں آ رہی تھیں — ہر صبح ایک نئی خبر ہوتی۔ ہر شام ایک نیا ڈر ہوتا۔

ٹھہری ٹھہری شامیں تھیں اور وقت جیسے رکا ہوا تھا۔ کوئی کسی سے کچھ نہیں کہتا تھا۔ ایک عجیب سا تناؤ تھا دونوں طرف۔

صبح ہوتی، پھر اداس سی شام اتر آتی۔ مسلمانوں کا کاروبار ٹھپ ہو گیا تھا۔ زندگی جیسے رک گئی تھی۔ بھی خبریں آئی تھیں۔

علی گڈھ سے مسلمانوں کا ایک جتھا پولیس کی نگرانی میں ریل سے لاہور جا رہا ہے —— محمود آباد کے مولوی صاحب اور ان کا پورا گھرانہ کل کراچی کے لئے روانہ ہو گیا —— کوسما کے زمیندار عبد الحق صاحب کا گھرانہ کل لاہور جا رہا ہے۔

پاکستان جانے والے ہر مسلمان کے لئے جناح صاحب کی سرکار نے پورا انتظام کیا ہے۔ پاکستان جانے والوں کے لئے جناح صاحب نے اپنی فوج بھیجی ہے جو انہیں ہندوؤں کے علاقوں سے حفاظت سے نکال لے جائے گی۔

تبھی یٰسین نے ایک طوفانی دورہ کیا تھا۔ "گاندھی کی باتوں پر یقین مت کیجئے۔ وہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں کو یہیں روک کر بعد میں مروا ڈالا جائے۔ یہ فریب ہے۔ پاکستان بنا ہی اسی لئے ہے کہ ہر مسلمان وہاں آرام اور چین سے رہے۔ سارے انتظامات پورے ہو گئے ہیں۔ ہوائی جہاز دلی کے اڈے پر انتظار کر رہے ہیں... پاکستان کی سرحد پر ہی زمینیں اور جائدادیں بٹ رہی ہیں۔ کام دھندے شروع کرنے کے لئے جناح صاحب کی سرکار نقد روپے دے رہی ہے۔ انگور آٹھ آنے سیر بک رہے ہیں....."

آس پاس کے قصبوں سے پرانے مسلمان زمینداروں کے گھرانوں کی خبریں بھی آتی رہیں۔ بید گاؤں کے سیّد صاحب بھی آج چلے گئے۔

اٹالہ کے حکیم جی بھی گئے۔

شہر کوتوال نے ہندوستان کی نوکری چھوڑ کر پاکستان جانے کا طے کیا ہے۔

ڈپٹی کلکٹر خان صاحب بھی استعفیٰ دے کر اپنے شہر غازی پور گئے ہیں۔ وہاں سے وہ ہوائی جہاز سے کراچی جا رہے ہیں۔ کراچی یعنی پاکستان۔

اور اس شام حافظ جی جب اپنی دوکان کا سامان لدوا کر گھر کی طرف چلے تو شربت والے ستّار نے انہیں غور سے دیکھا۔ حافظ جی نے مسکرا کر دور سے ہی سلام کیا اور بولے "خالی نہیں کر رہا ہوں۔" لیکن صبح ایک موٹر میں

سارا سامان بیچ کر حافظ جی اپنے بال بچوں کے ساتھ نکل گئے۔ گھر ایک درزی کو سونپ دیا۔ کسی کو پتہ نہیں چلا کہ حافظ جی کب اور کیدھر چلے گئے۔

سبھی غریب مسلمانوں کی نگاہیں امیر لوگوں پر لگی ہوئی تھیں۔ جو وہ کریں گے وہی ٹھیک ہوگا۔

یکایک کچھ چہرے شہر سے غائب ہو گئے۔ وہ چہرے جو چونگی میں لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے۔ اسکول کی کمیٹیوں میں بحث کرتے تھے، تحصیل کچہریوں میں پیروی کرتے تھے۔

ماجد صاحب کی کوٹھی کے باہر کے پودے سوکھنے لگے تو پتہ چلا کہ چار دن ہوئے وہ بھی پاکستان چلے گئے۔ غلام نبی موٹر والوں کا پتہ ہی نہیں چلا۔ ان کی موٹریں ویسی ہی دھول اڑاتی ہوئی جسد انہ لائن پر دوڑتی رہیں۔ پر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اپنی موٹریں اور حویلی ایٹہ کے مارواڑی کے ہاتھ بیچ کر چپ چاپ چلے گئے۔

کچھ چہرے تھے جو شام تک ہنستے مسکراتے دکھائی پڑتے تھے لیکن صبح بغیر سلام بندگی کے کھو جاتے تھے۔

اچانک کچھ گھروں میں رات کو روشنی نہیں ہوئی تو لگا کہ خالی ہو گئے ہیں۔ شہر کی کچھ دوکانوں کے پٹروں پر تین تین چار چار دنوں کا کوڑا جمع دکھائی دیا تو معلوم ہوا کہ وہ سوداگر بھی چلے گئے۔

جتنے بھی پیسے والے تھے وہ جلدی سے جلدی اپنا انتظام کر کے چلے گئے۔ غریبوں کا رہنما کوئی نہیں تھا۔

یکوں کی بستی میں لوگوں کا یہی خیال تھا کہ لیسین بھی علی گڑھ گیا ہے اور وہاں سے لاہور چلا گیا ہوگا لیکن دس روز بعد ہی لیسین لوٹ آیا اور اسی نے بتایا:

"بھئی کام اور بھی تھے۔ لاکھوں کی تعداد میں لوگوں کو چلنا ہے۔ ان کا انتظام بھی تو ہونا تھا۔"

اور ایک رات یکوں کی بستی کے باشندوں کے سفر کا انتظام ہوا۔ سب کچھ خاموشی سے اور چپکے چپکے ہوا۔ شام کو طے ہو گیا تھا کہ پرسوں سویرے سورج نکلنے سے پہلے یہاں سے قافلہ نکل پڑے گا — اور لیسین انہیں دلی اسٹیشن پر ملے گا۔ وہاں سے انہیں ریلوں یا ہوائی جہازوں کے ذریعے پاکستان پہنچایا جائے گا۔

مقررہ دن تین بجے رات کو ہی دس گھرانوں کا ایک قافلہ بستی سے روانہ ہوا۔ اپنا سامان چیزیں اور بال بچوں کو لے کر.....

خدا حافظ

خدا حافظ

آنسو، دکھ اور گھروں کو چھوڑنے کی تکلیف۔

سسکیاں دور دور تک سنائی دیتی رہی تھیں..... موہ توڑ کر وہ لوگ نکل تو گئے تھے لیکن گھروں کو ایسے چھوڑ گئے تھے جیسے وہ کبھی واپس آ جائیں گے۔

رات اندھیری تھی اور اسٹیشن والا راستہ سنسان تھا۔ سبھوں نے پیسے جمع کر کے تین بیل گاڑیاں کرایہ پر لی تھیں جو انہیں جنکشن تک پہنچا کر واپس آ جائیں گی۔ اپنے اسٹیشن سے گاڑی میں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔ یہ لیسین نے ہی بتایا تھا۔

صبح نصیبن مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھی بیٹھی اُن ویران گھروں کو دیکھتی رہی جن کے باشندے چلے گئے تھے۔ آسمان اداس تھا اور پچاوؤں کے پیچھے آج حد سے زیادہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس دن لوگوں کے پاس بات

کرنے کے لئے بھی کچھ نہیں بچا تھا۔ ستار نڈھال سا گھر میں پڑا تھا۔ اور افتخار اپنی کوٹھری میں بیٹھا گھوڑے کے گھونگھرو بجا بجا کر کچھ گا رہا تھا۔ بہت دیر تک نصیبن آنگن اجڑے ہوئے گھروں کو دیکھتی رہی ... پھر اس نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور سیڑھیوں سے اتر کر گھر چلی آئی۔ بستی میں ایسی اداسی چھائی ہوئی تھی جیسے دس بیس موتیں ایک ساتھ ہوگئی ہوں۔ دوپہر سائیں سائیں کرتی رہی۔

دوپہر بعد ستار اٹھا تھا۔ گھڑے سے پانی پی کر ذرا ٹھیک ہوا تو نصیبن سے بولا تھا "کل میں بھی جا رہا ہوں۔"

"اچھا"

پھر بہت دیر خاموشی چھائی رہی۔

کچھ آہٹ ہوئی تو ستار نے دیکھا افتخار کھڑا تھا۔ دھیرے سے وہ اندر آکر بولا۔ "سلمہ نے تجھے بلایا ہے۔"

"کہاں ؟"

"مسجد کے پاس۔ یہاں وہ نہیں آنا چاہتی۔"

ستار اٹھ کر چلا گیا۔ افتخار بیٹھا رہا لیکن نصیبن سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ آخر افتخار نے ہی خاموشی توڑی تھی۔ "تم جا رہی ہو ؟"

"کہاں جاؤں گی"

"جہاں اور سب جا رہے ہیں۔"

نصیبن ہنس دی تھی۔ اس کی ہنسی میں کوئی مطلب نہیں تھا۔

رات گئے تک ستار لوٹ کر نہیں آیا۔ نصیبن کو گھر اور بھی کاٹنے لگا اور سویرا ہونے سے پہلے باقی گھروں کا قافلہ بھی اسی راستے چلا گیا جس راستے پہلا گیا تھا۔ سلمہ اور مقصود بھی پاکستان چلے گئے تھے .... جانے سے پہلے دو بجے رات سلمہ نصیبن سے ملنے آئی تھی اور دبی زبان سے اس نے یہ بھی پوچھا تھا کہ ستار گھر پر ہے یا نہیں۔ نصیبن نے بتا دیا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے بعد پھر گھر نہیں آیا۔

سلمہ آنسو نہیں روک پائی تھی "میں نے تو یہاں تک کہا تھا کہ ہمارے ساتھ ہی چلو .... لیکن وہ مانا ہی نہیں۔ کہنے لگا وہاں جا کر کیا مل جائے گا اور ناراض ہو کر چلا گیا .... کہتا تھا میں بچے کو اپنا کہوں گا لیکن تو یہیں رک جا ... بتاؤ نا بوا ایسا بھی کہیں ہوتا ہے ؟ تو وہ میری مجبوریاں نہیں سمجھتا۔ کیسے رکتی ہو سکتا ہے یہاں ... ؟"

اور رات ڈھلنے سے پہلے باقی گھرانوں کا قافلہ بھی چل پڑا تھا۔ باقی گھر بھی اندھیرے ہو گئے تھے۔

نصیبن نے افتخار سے کہا تھا "اب تو روشنی کی گنتی کر لو ... پوری بستی میں تین جگہ روشنی ہے۔ سائیں کے یہاں۔ میرے اور تیرے یہاں ... چوتھا روشنی والا گھر تو دکھائی نہیں دیتا۔ مسجد تو اسی دن سے ویران پڑی ہے جب سے پہلا قافلہ گیا ہے۔"

"سبھی سنجیدہ تھے" افتخار بولا۔

"آخر گھر بار چھوڑ گئے ہیں۔ کئی کئی پشتوں کے نال نہیں گڑے ہیں ... اے خدا ! " اور وہ بڑبڑاتی ہوئی خاموش ہو گئی تھی۔

تبھی تھکا ہارا سا سائیں آیا تھا۔ "شہر بھی ویران ہو گیا ہے۔ بڑا آدمی تو کوئی دکھائی نہیں دیتا... ارے ہاں ادھر مسجد کے پاس بڑی بدبو آ رہی ہے۔ لگتا ہے کوئی جانور سڑ رہا ہے... وہاں تو بدبو بھری ہوئی ہے۔ یہاں بھی لگتی ہے بہن" ہلکی ہوا کے ساتھ کچھ بدبو آ رہی تھی۔

صبح جب بدبو اور بڑھ گئی تو افتخار نے مسجد کے آس پاس چکر لگایا۔ سائیں نے بھی اِدھر اُدھر دیکھا بھالا۔ لیکن کچھ نہیں تھا۔

پر مؤذن کی کوٹھری کا دروازہ کھولتے ہی بدبو کا جھونکا آیا تھا اور چمگادڑ پنکھ پھڑپھڑاتا ہوا نکل کر مسجد کے گنبد سے جا چپکا تھا۔

پولیس آکر ستار کی لاش کو اٹھا لے گئی تھی۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا۔ کوتوالی میں دو بار سائیں اور افتخار کو جانا پڑا تھا۔ تھوڑی بہت تحقیقات ہوئی تھی اور ستار کی لاش کو شاید لاوارث بتا کر چیر پھاڑ کے بعد دفنا دیا گیا تھا۔

اسی درمیان افتخار بھی اپنا یکہ جوت کر اور گھوڑے کے پیروں میں پھر سے گھونگھرو باندھ کر اپنا بوریا بستر لیکر چلا گیا تھا۔

چراغ اب صرف دو رہ گئے تھے۔ سائیں اور نصیبن کے اردگرد گہرا اندھیرا تھا جو شام سے ہی کاٹنے کو دوڑنے لگتا تھا۔ سب بیابان ہو گیا تھا۔ تانت کے ستار پہ اٹھنے والے گیت ڈوب گئے تھے اور اپنوں کے چہرے کھو گئے تھے۔

صرف نفرت کی آگ نے اس بستی کو جلایا تھا۔

غربت، ہتک، بھوک، اور بے بسی میں بھی وہ ہارے نہیں تھے۔ لیکن نفرت کی آگ اور خوف کا دھواں وہ برداشت نہیں کر سکے اور ان کے قافلے ایک انجان دیش کی طرف چلے گئے۔

اور تب سے اتنے برس گذر گئے۔ یہاں کوئی نہیں آیا سوائے افتخار کے۔

شروع میں تو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ تیسرے برس دیولوں کے میلے میں کمائی کرنے کے لئے جب افتخار اپنا یکہ لیکر آیا تھا تو ایک رات اس بستی کی طرف بھی پہنچا تھا یہ دیکھنے کہ کوئی نشان باقی ہے یا نہیں۔

تب اسے نصیبن ملی تھی۔

"تم نہیں گئیں —؟" افتخار نے پوچھا

"کہاں جاتی... میں سمجھی تھی کہ تم بھی پاکستان چلے گئے۔ اب کہاں ہو؟" نصیبن نے پوچھا۔

"میں تو ستار کی موت سے گھبرا کر بھاگ گیا تھا۔ آج کل ہاتھرس میں ہوں۔ سوچا میلے میں چار پیسے بھی مل جائیں گے اور دیکھتا بھی آؤں گا۔ دل میں ملال تو ہے ہی یہ شہر چھوڑنے کا..." افتخار نے کہا تھا پھر وہ اپنے آپ ہی بتانے لگا تھا۔ "ارے اپنے وہ غنی مستری تھے نا..."

"وہ تو لاہور چلا گیا" نصیبن نے بات کاٹ کر کہا۔

"لاہور واہور کہیں نہیں، وہ فیروز آباد میں وقت کاٹ رہے ہیں۔ وہیں ہیں بال بچوں کے ساتھ۔ وہیں روزانہ پر کام کرکے جیسے تیسے پیٹ بھر رہے ہیں" افتخار نے بتایا تو ہلکی سی اپنائیت کی چمک نصیبن کے چہرے پر دوڑ گئی تھی۔

غنی مستری تو شاید پہلے قافلے میں گیا تھا۔" اس نے یاد کیا۔

"غنی ہی بتا رہے تھے کہ ان کے ساتھ کا کوئی بھی دلی تک نہیں پہنچ پایا۔ سب ادھر ادھر بکھر گئے۔ شبراتی موچی آگرہ میں راجا منڈی کے چوراہے پر بیٹھتا ہے۔ ۔ ۔ اور جمن وہیں کے چونگی میں چپراسی لگ گیا ہے۔ رمضانی کا حال بہت برا بتا رہے تھے۔ وہ بے چارہ بھوکوں مر رہا ہے ۔ ۔ ۔" افتخار نے اوروں کے بارے میں بھی خبریں دی تھیں۔

"یہاں تو کام اچھا خاصا جما ہوا تھا رمضانی کا۔" نصیبن نے کہا تو افتخار بولا۔

"بھئی جو کچھ بھی اس کے پاس تھا وہ تو جانے میں خرچ کر دیا تھا۔ وہ بھی پورا نہیں پڑا۔ نہیں تو پاکستان نہیں پہنچ جاتے ۔ ۔ ۔ اب روٹیوں کے بھی لالے پڑ گئے ہیں۔"

"کیسے منحوس دن تھے"، نصیبن کی آنکھوں میں دو برس پہلے کی راتیں ناچ رہی تھیں۔

افتخار بہت دیر تک دنیا جہان کی باتیں کرتا رہا تھا۔ پھر اپنے اڈے پر لوٹ گیا تھا۔

افتخار برس دو برس بعد میلے پر آتا تو خبریں بھی لاتا اور میل ملاقات بھی کر جاتا۔ اتنے دن بعد آنے سے سونا پن اور بھی بڑھ جاتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور نصیبن ہر دن ان ڈھلتے ہوئے اندھیروں کو دیکھتی۔ قافلوں کے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد سب سے پہلے ٹاٹ کے پردے سڑ سڑ کر گر گئے تھے اور پہلی ہی برسات میں تین چوتھائی سے زیادہ کوٹھریوں اور گھروں کی چھتیں بیٹھ گئی تھیں۔ دھیرے دھیرے لکڑی کی چوکھٹیں وغیرہ پھول پھول کر ٹوٹ گئی تھیں اور سڑ کر کھوکھلی ہو گئی تھیں ۔ ۔ ۔ ان کی درازوں میں ککرمتے اور گھاس اگ آئی تھی۔

کچی دیواریں سونی کھا کر بیتی ہو گئیں پھر ڈھہ گئی تھیں۔ جن گھروں میں پکی اینٹوں کا ایک بھی ردا لگا ہوا تھا وہ کچھ دیر اور ٹکی رہی تھیں۔ پھر ان کی اینٹیں بھی سفید پڑ کر جھڑنے لگی تھیں۔

بستی کے بچے اینٹوں نے اس ریت کو جمع کرنے کے لئے کتنا لڑا کرتے تھے۔

کچے آنگنوں میں اکثر کر تک آوارہ گھاس اگ آئی تھی اور ٹوٹی ہوئی ہانڈیوں، گھڑوں وغیرہ کے ٹکڑے جیسے کے تیسے بکھرے پڑے تھے۔ کئی دیواروں میں چراغوں کے کالے پڑے ہوئے طاق اب بھی دکھائی پڑتے تھے۔ جگہ جگہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے، سڑے ہوئے گودڑ اور زنگ کھائے ٹین کے پرانے ڈبے پڑے ہوئے تھے۔

گذرتے ہوئے برسوں کے ساتھ اور بھی نشان مٹتے جا رہے تھے۔ دیواریں پھول کر گریں تو صرف مکانوں کی حدوں کا احساس رہ گیا تھا۔

نئے نظام میں کچھ نئی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ لیکن یہ قصبہ ویسا ہی پڑا تھا۔ پجاروں کی وجہ سے جگہ جگہ زمین جلی ہوئی پڑی تھی۔ مٹی جہاں تھی وہاں بھی اینٹیں تھاپنے سے کھائیاں بن گئی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دھرتی کسی کام کی نہیں رہ گئی تھی۔

نصیبن اور سائیں وہیں تھے۔ نصیبن جاتی بھی کہاں ؟

اتنے برسوں میں اس کے لئے کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ کبھی سائیں نصیبن کے پاس آ بیٹھتا تو پرانی باتیں چھڑ جاتیں۔ اب سائیں بھی دکھی تھا اور کسی حد تک دل ہی دل میں اپنی غلطی تسلیم کر چکا تھا۔

اندھیرا ہو رہا تھا۔ سائیں آ بیٹھا تھا۔ بولا "اتنے برس ہونے کو آئے نصیبن لیکن ادھر کوئی نہیں آیا۔ اب بچن بھی بھلا کیا آئے گا؟"

بوڑھی نصیبن نے صرف گردن ہلائی۔

سائیں نے پھر کہا "نصیبن سب تو چلے گئے۔ آدم اور آدم زاد۔ نئی سڑک کیا بنی۔ یہ سڑک بھی ویران ہو گئی۔ بستی اُجڑنی تھی اُجڑ گئی۔ ۔ ۔ اب تو دل بہت دھڑکتا ہے۔ اب تُو تو نہیں چلی جائے گی کہیں؟ یہ زمین بھی۔۔۔۔۔۔۔۔"

نصیبن نے بات کاٹ دی "سائیں دھول اُڑ جاتی ہے، مٹی اُڑ سکتی ہے، دھول مٹی کا کیا؟ کہتے کہتے وہ ہنس دی تھی۔ جب بھی وہ اس طرح ہنستی، سائیں چپ ہو جاتا تھا۔

برسوں سے یہی ہوتا آ رہا ہے۔۔۔۔

اُجڑی ہوئی اس بستی سے دور دور تک کا منظر دکھائی پڑتا ہے۔۔۔۔ اب بھی سب کچھ ویسا ہی ہے۔۔۔۔ اب بھی دور پر دھان ملوں کی پتلی چمنیوں سے رینگتا ہوا دھواں آسمان کے نیلے پن میں ویسے ہی کھو جاتا ہے۔ سلگتے ہوئے پجاوے ہیں اور پکی ہوئی اینٹوں کی قطاریں۔۔۔۔ ان کے پیچھے گاؤں اور ہرے بھرے میدان، گھنے درخت۔ اُدھر دلدل کی طرف سے سارسوں کی تیز آواز اب بھی آتی ہے۔ آبی پرندوں کے جھنڈ اب بھی اسی طرح اس اجاڑ بستی کے اوپر سے گذرتے ہیں اور پھر یہ جھنڈ دلدل اور میدانوں پر جھکتے نظر آتے ہیں۔

اتنے برس ہو گئے۔۔۔ اب بھی میدان والی مٹھیا پر وہی جھنڈا بدرنگ ہو کر لہرا رہا ہے۔ بانس ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ جھنڈا پھٹ گیا ہے۔ وہ کسی سپاہی کا نشان سا لگتا ہے۔

صرف ایک ہی نئی چیز دکھائی پڑتی ہے۔ پاکستان بننے کے بارہ چودہ برس بعد ایک دن کچھ انگریزی سے لگنے والے لوگ ہندوستانی صاحبوں کے ساتھ ادھر بستی میں کچھ جانچ پڑتال کے لئے آئے تھے۔

اُن کے ساتھ چپراسی بھاگ بھاگ کر کام کر رہے تھے۔ پیمائش کے لئے فیتہ بھی ان کے پاس تھا۔ جب انگریزی سے لگنے والے لوگ چلنے لگے تھے تو نصیبن نے ایک چپراسی کو روک کر پوچھا تھا "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون لوگ ہیں یہ؟"

چپراسی نے بتایا تھا "یہ لوگ جرمنی کے انجینئر ہیں۔۔۔ یہاں پاتال توڑ کنوئیں کھودے جائیں گے اسی کے لئے جگہ کی تلاش ہو رہی ہے"

تب نصیبن نے سائیں سے کہا تھا "تب تو ادھر کچھ رونق ہو جائے گی۔ شاید یہ ویران بستی پھر سے آباد ہو جائے۔"

اور پھر کچھ ہی دنوں بعد بڑی بڑی مشینیں آئی تھیں اور دھرتی میں جگہ جگہ پائپ گھسا کر پانی کی تلاش کی گئی تھی۔ پھر پتہ ہی نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ کوئی لوٹ کر ادھر نہیں آیا۔

قریب آٹھ دس مہینوں کے بعد اُدھر اسٹیشن پار ویرانے میں ایک بستی ابھرتی ہوئی نظر آنے لگی تھی۔ اُس آبسر میں جو بہت برسوں سے اُجاڑ پڑا تھا اور جہاں کٹیلی جھاڑیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ جہاں دھرتی کے تن پر جگہ جگہ سفید چکتے پڑے ہوئے تھے، ٹھونٹھ اگے ہوئے تھے۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ مٹی بٹورنے کے لئے دھوبی جہاں کے چکر لگایا کرتے تھے۔

برسات کے بعد جب دھوپ چٹختی تھی اور دھرتی میں دراڑیں پڑ جاتی تھیں تو اس بستی میں سب بچے اس ایسر میں جایا کرتے تھے اور چھتری دار سفید کگرمتے چنتے اور لڑتے جھگڑتے تھے۔

اسی ایسر میں زندگی کے نشانات دکھائی دینے لگے تھے۔ جرمن کاریگروں نے اسی ایسر میں ڈیرہ ڈالا تھا۔ اور طرح طرح کی مشینیں وہاں لگائی تھیں۔ جرمنوں نے جنریٹر لگا کر بجلی کی روشنی بھی کر لی تھی۔ دن رات وہاں چہل پہل رہتی۔ پاتال توڑ کنویں کا کام کرنے کے لئے ایک بہت بڑا ڈیپارٹمنٹ بنا تھا جس کے لئے ہزاروں مزدوروں کی ضرورت پڑتی تھی۔ بڑی رونق رہتی وہاں ... جب بھی نصیبن کا دل گھبراتا وہ ادھر ہی دیکھنے لگتی اور اسے وہ دن یاد آتے جب وہ بستی کے بچوں کو ڈھونڈتی ہوئی وہاں جایا کرتی تھی .... بچے کگرمتے، سگریٹ کی خالی ڈبیاں اور پنیاں چن کر لایا کرتے تھے۔ وہ جھنڈ کا جھنڈ ہانک کر لاتی تھی۔ چل تیری ہڈی گڑواتی ہوں تیرے ابا سے۔ وہ ڈانٹتی کلکلاتی ہوئی منے سے کہتی۔ بوا کے کان مروڑ دیتی تھی۔ باقر کو دھول جماتی تھی۔ منیر اور شمشیر کو ڈراتی دھمکاتی لاتی تھی۔ لیکن بچوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

تقسیم کے وقت اور اس سے پہلے کی طرفداریاں رہ گئی تھیں اور زندگی اپنی رفتار سے چلتی جا رہی تھی۔ لگ بھگ سبھی کی خبریں مل جاتی تھیں .... پاکستان جانے کے جوش میں جو گھرانے قافلوں کے ساتھ گئے تھے وہ سبھی غریبوں کے تھے اور ان کی غریبی ہی ان کے آڑے آ گئی تھی۔

یہاں اس بستی سے تو وہ اکھڑ گئے تھے لیکن غریبی نے ان کی ٹانگیں جکڑ لی تھیں اور وہ صوبے کے پچھمی ضلعوں تک پہنچ کر اٹک گئے تھے۔ صوبے کی سرحد تک پار نہیں کر پائے تھے۔

غریبوں کو کوئی پاکستان نہیں لے گیا تھا۔

اور اب بھی اکیلی نصیبن وہی سب سوچتی رہتی ہے اور خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ جب سے ایسر آباد ہوا اور مزدوری چمکی ہے تب سے کچھ لوگوں کی آمد و رفت ادھر شروع ہوئی ہے ....

نصیبن سائیں کے پاس بیٹھی تھی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ نصیبن کی آنکھیں دہیں سامنے لگی ہوئی تھیں .... اور وہ اپنے میں گھٹی گھٹی یہی سوچ رہی تھی کہ بجلی اور ان نئی بھاری بھاری مشینوں کے ساتھ یہ کیسی زندگی لوٹ رہی ہے؟ یہ نئی زندگی کیسی ہوگی؟ کیا یہ ویسی ہی بے فکری اور مستی کی زندگی ہوگی؟ کیا غریبی بھی ویسی ہی رہے گی؟

پھر اسے لگا کہ اگر ایک اور زندگی آئی بھی ہے تو کیا؟ ہوگی بھی، تو کیا! سامنے ایسر میں بجلی کی بتیوں کو وہ ایک ٹک تکتی رہی۔ تبھی اس نے دیکھا۔ ویران سڑک پر سات آٹھ پرچھائیاں چلی آ رہی تھیں۔ وہ ادھر بستی کی طرف ہی آ رہی تھیں۔ لیکن اندھیرے کی وجہ سے صاف صاف دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔

وہ ایک ٹک دیکھتی رہی۔

نہیں، وہ سات آٹھ آدمی ادھر ہی آ رہے تھے۔ پر دل کا شک سر اٹھا کر بولا تھا — — "اب کون ادھر آنے گا اور کیوں آنے گا اس اجاڑ بستی کی طرف؟ اور پھر اس وقت وہ راہگیر ہوں گے۔ اپنے راستے چلے جائیں گے۔"

یہ سوچ کر اس کے دل کی اداسی اور بڑھ گئی۔ سونا پن اور بھی گہرا ہو گیا۔

سڑک پر وہ آدمی چلتی پھرتی لاشوں کی طرح بڑھے آ رہے تھے۔ ان کے پیچھے اوسر میں راڈ ٹینوں کے

ارد گرد چہل پہل تھی۔ کچھ ایک موٹریں کھڑی تھیں اور چلتی ہوئی مشینوں کی لگاتار گڑگڑاہٹ کی آواز یہاں تک دھیمی دھیمی آرہی تھی جیسے زمین ہلکے ہلکے تیر رہی ہو۔

اندھیرا ہوتے ہوئے بھی ان آدمیوں کے قریب آنے کی وجہ سے چہرے کچھ کچھ دکھائی دے رہے تھے۔ سلگی ہوئی بیڑیوں کی چنگاریاں اور دھواں بھی دکھائی دینے لگا تھا۔ سڑک کے پاس وہ لوگ رک گئے۔ املی کے گھنے درخت کے کالے سائے میں وہ یکایک گھل مل گئے۔ انہوں نے کچھ لمحے وہاں ٹھہر کر کچھ طے کیا۔ وہیں سے اس بستی کی طرف سڑک سے راستہ کٹتا ہے...

نصیبن آہستہ سے بولی۔ "سائیں لگتا ہے یہ آدمی ادھر ہی آرہے ہیں۔"

"راستہ بھول گئے ہوں گے، یہاں روشنی دیکھ کر پوچھنے آرہے ہیں شاید۔" کہتے ہوئے وہ بھی ادھر ہی دیکھنے لگا۔

اور دو تین منٹ کے بعد ہی وہ آٹھوں آدمی وہیں اُن کے پاس آکر رک گئے۔ سبھی جوان تھے۔ سبھی کے بدن لوہے کی طرح ٹھوس اور بھرے ہوئے تھے۔

"اِدھر کوئی مسجد ہے؟" ایک نے پوچھا تھا۔

"ہاں ہے۔" کہتے ہوئے نصیبن اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور پوچھا تھا۔ "کہاں سے آئے ہو تم لوگ؟"

"اِدھر ہمارے مکان تھے... ہم یہاں پاتال توڑ کنویں کے محکمے میں مزدوری کرنے آئے ہیں۔ آج ہی ہماری بھرتی ہوئی ہے۔ اب رہنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ اِدھر ہمارے پرانے...."

نصیبن کی آنکھوں میں چمک بھر گئی اور جسم خوشی سے تھرتھرانے لگا۔ "ادھر تمہارے گھر تھے... ارے تو بشیر تو نہیں؟ لگتا تو ویسا ہی ہے؟"

اور منٹ بھر میں ہی ساری پہچانیں ابھر آئی تھیں۔ انہیں گئے ہوئے اور بکھرے ہوئے گھرانوں کے بچے اب مزدوری کرنے کے لئے پھر لوٹے تھے اور اپنے پرانے گھروں کی جگہ تلاش کر رہے تھے۔ چلتے وقت ان کے ابا یا گھر والوں نے بتایا تھا۔ "اِدھر اپنے گھر ہیں۔"

نصیبن خوشی سے رو پڑی تھی۔ وہ سب بچے بشیر، باقر، رمضانی، فتح وغیرہ جوان ہو ہو کر لوٹے تھے۔ نصیبن انہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی... ان نشانوں کے پاس جو اب بھی باقی تھے۔ "یہی تیرے ابا کا گھر تھا بشیر... یہیں بیٹھ کر وہ چمڑا کمایا کرتا تھا اور بات کرتا تھا۔ وہ دیکھ رہا ہے نا... اسی کے نیچے۔ جو ٹوٹی ہوئی دیوار ہے وہ تیرا گھر تھا اور وہ گھر... گھر... اور وہ ڈھہا ہوا چبوترہ رمضانی کے چاچا کا ہے۔"

"نصیبن بوا۔ اب تو رات گذارنی ہے... کل سے اپنے گھروں کو ٹھیک کریں گے۔" فتح نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے کہا تھا۔

نصیبن دوڑ کر گھر گئی تھی اور جو بھی ملا اٹھا لائی تھی — بورا، پھٹی دری، میلی چادر وغیرہ... اور بولی "او انہیں یہیں پیڑ کے نیچے بچھالو اور آرام کرو۔"

اور صبح تک کے لئے رات اسی پیڑ کے نیچے کٹ گئی تھی۔

اپنے محبوب کہانی کار

کملیشور

کے لئے عزّت اور محبّت کے ساتھ

جے دیو

(موسیقار)

شگوفے

۔ ۱۹۶۱ء میں ملکہ الزابتھ ثانی جب ہندستان آئی تھیں تو سرکار شہر کے ساتھ جارج پنجم کے مجسمہ کو سنوارنے میں بھی مصروف تھی۔۔

کملیشور ان دنوں ٹیلی ویژن پر ملازم تھے۔ سرکار کی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر انھوں نے ایک طنزیہ کہانی، 'جارج پنجم کی ناک' لکھی۔ جسے پڑھ کر سرکار بھی بلبلا اٹھی اور کملیشور کو ٹیلی ویژن کی نوکری سے دستبردار ہونا پڑا۔

اصل میں کملیشور کی حقیقت بیں نظریں زندگی کے مضحکہ خیز پہلو کو بھی دیکھتی ہیں اور وہ جب سماج کی دُکھتی رگ کو چھیڑتے ہیں تو دیر تک ایک جھنجھناہٹ محسوس کی جاتی ہے۔

اس حصے میں کملیشور کی ایسی ہی
چُبھتی ہوئی کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں

★ ادارہ

ھری کرشن کول

پورے ہندستان کا افسانہ نگار

ہری کرشن کول کشمیری زبان کے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں ہیں۔ آپ کی پیدائش ۲۲ جولائی ۱۹۳۷ء کو سری نگر میں ہوئی تھی۔ کول صاحب، امر سنگھ کالج سری نگر میں بالغ بچوں کو پڑھاتے ہیں اور کھتلیشور، زمیندار محلہ، سری نگر (کشمیر) میں قیام پذیر ہیں ★

سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کملیشور کے بارے میں لکھوں؟ افسانہ نگار کملیشور کے بارے میں لکھوں، جس کے افسانوں نے آج سے بیس، پچیس ۲۵ سال پہلے ہی مجھے متاثر کیا تھا۔ "راجہ نربنسیا" اور "کھوئی ہوئی دِشائیں" سے لے کر "بیان" اور "راتیں" تک جس کے سارے افسانے اس عام آدمی کی داستانیں ہیں، جس کی حالت پر بڑے بڑے قومی اور بین الاقوامی واقعات، آزادی، جمہوریت اور انقلاب کے لمبے چوڑے دعوے کوئی اثر ڈالنے سے قاصر رہے ہیں۔ جو گمنام زندگی جیتا اور موجودہ سماجی اور اقتصادی نظام کی چکی میں پتا جا رہا ہے۔ اس باشعور فنکار کے بارے میں لکھوں، ہیئت میں کئے گئے جس کے تجربے، موضوع کے اپنے پن اور بے ساختگی کو دھندلا نہیں کرتے اور جس کی وجہ سے اس کی تخلیقات موجودہ دور کی اہم دستاویز بن گئی ہیں۔

یا اس کملیشور کے بارے میں لکھوں جو ایک عظیم اور پُرکشش شخصیت کا مالک ہے۔ عام ہندوستانی کی طرح سانولی صورت کے باوجود جس کے نقوش تیکھے ہیں۔ نسبتاً چھوٹے قد کے باوجود جو اپنے ساتھیوں میں ہر لحاظ سے اونچا ہی نظر آتا ہے۔ جس کی نظر صاف ہے۔ سوچ میں کوئی الجھن نہیں۔ اظہار میں کوئی ابہام نہیں۔ باتوں میں لطافت اور ظرافت کا حسین امتزاج۔ مسائل کا صحیح تجزیہ کرنے کی ایسی صلاحیت کہ سارا ماحول منور ہو جائے زندہ دلی کی ایسی مہک کہ گرد و پیش معطر ہو جائے۔ طنز کی ایسی چبھن کہ شکار تڑپ کر رہ جائے پاس کھڑے یار دوستوں کے منہ سے ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوٹ پڑیں اور پھر سب کی ہنسی کو ڈبوتا اس کا زوردار قہقہہ فضا میں گونج اٹھے۔

لیکن کملیشور افسانہ نگار، فنکار اور عظیم شخصیت ہی نہیں اپنے میں ایک ادارہ بھی ہے۔ ہندی کا مصنف ہونے کے باوجود اس کی دلچسپی اور اس کا اثر ہندی تک ہی محدود نہیں ہے۔ وہ شروع ہی سے اس بات کے لئے کوشاں رہا ہے کہ ہندی، اردو، بنگالی، کشمیری وغیرہ علاقائی زبانوں کی حدود سے اوپر اٹھ کر ایک ایسے ہندستانی ادب کی تخلیق کی جائے، جو سچے معنوں میں آج کے ہندستان کا آئینہ دار ہو۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں لکھا جا رہا ادب سبھی ہندوستانیوں کی مشترکہ میراث ہو۔

مجھے یاد ہے آج سے کوئی بیس ۲۰ سال پہلے جب کملیشور الہ آباد سے شائع ہونے والے

"سنکیت" کی ترتیب و تزئین کرتا تھا۔ تو وہ اس ادبی شمارے کے لئے کشمیری زبان کی نگارشات کے لئے سری نگر آیا تھا۔ کشمیر سے لوٹ کر اس نے فاؔم کے بارے میں ہندی میں ایک مضمون چھپوا کر جدید کشمیری ادب کے اس میر کارواں کو غیر کشمیریوں سے متعارف کروایا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ سعادت حسن منٹو کی وفات پر منٹو کے ایک ہم عصر ادیب نے ایک مضمون لکھا، جو پہلے پاکستانی رسالے "نقوش" میں شائع ہوا اور پھر جس کا ہندی روپ لکھنؤ سے شائع ہونے والے ماہنامے "نیا پتھ" میں چھپا۔

اس مضمون میں مضمون نگار نے اشارے سے یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ خود منٹو سے بڑا ادیب ہے اور منٹو نے اس سے ہی سیکھ کر لکھنا شروع کیا تھا۔ تب کملیشور نے اس مضمون کے جواب میں ایک مضمون لکھ کر ہندی قارئین کو منٹو کی عظمت اور اس کے ادبی کارناموں کی صحیح جانکاری دی تھی۔

کچھ عرصہ بعد جب کملیشور نے دلّی میں "نئی کہانیاں" کی ادارت سنبھالی تو اس نے اس ماہنامے میں ہندی افسانوں کے ساتھ ساتھ دوسری ہندوستانی زبانوں کے افسانوں کے ترجمے بھی شائع کرنا شروع کیئے، اور پھر کئی سال بعد جب کملیشور "ساریکا" کا ایڈیٹر مقرر ہوا تو اس نے اس دیدہ زیب "ہندی کہانیوں کی پتریکا" کو "بھارتیہ کہانیوں کی پتریکا" میں بدل ڈالا۔ جس سے ملک کے مختلف علاقائی زبانوں میں تخلیق ہو رہے افسانوی ادب کے درمیان ایک رابطہ قائم ہو گیا۔ ایسا رابطہ جسے نہ ساہتیہ اکیڈیمی قائم کر سکی تھی اور نہ ہی نیشنل بک ٹرسٹ۔

کملیشور ہی کی کوششوں سے ہمارے سامنے ہندوستانی افسانے کا تصوّر ابھر کر آیا ہے ایسا ہندوستانی افسانہ جو ہوا میں نہیں لٹک رہا ہے، بلکہ جس کا پایہ (بنیاد) ہندوستان کی سرزمین میں مضبوطی سے ٹکا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں کملیشور کی وہ بات مجھے یاد رہیگی جو اس نے ابھی جنوری ۱۹۷۷ء میں انجار (کچھ) میں ہوئی چھٹی سمانتر کانفرنس کی ایک نشست میں کہی تھی۔

"ہمیں سبھی علاقوں کی زبانوں میں لکھے جا رہے ادب کو ہندوستانی ادب کے مرکزی دھارے کے ساتھ جوڑنا ہوگا۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ مرکزی دھارا صحیح اور صحت مند ادب کا ہو۔ محض دھارے کی باتیں تو فرقہ پرست لوگ بھی کرتے ہیں۔"

★ ★

کملیشور

یادگار

(اردو کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی موت کے بعد یہ افسانہ لکھ کر الٰہ آباد کے ایک جلسہ میں سنایا گیا)

"اور اب تم میری لاش کو قبر سے نکال کر تمغے پہناؤ گے۔ مجھے وہاں بھی آرام سے سونے نہیں دو گے۔ تم نے مجھے زندگی بھر پریشان کیا۔ میں اپنے بچوں کے پیٹ کی خاطر ایک ٹکڑے کے لئے مارا مارا پھرتا رہا۔ جب میں نے سچی بات کہی تب تم نے مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے ڈھکیل دیا۔ مجھ پر مقدمہ چلائے اور میرا جینا مشکل کر دیا۔ اور میری موت کی خبر پا کر تم تقریریں کرو گے۔ مگر مچھ کے آنسو بہاؤ گے اور میری یادگاریں قائم کرنے کی باتیں کرو گے۔ لیکن میں تمہیں جانتا ہوں۔ تم میرے جینے سے سوئے دل میں بے عزتی کا ایک خنجر اور مارو گے۔"

یہ اس عظیم ادیب کی کتاب کے دیباچہ کے آخری جملے تھے، جنہیں سلیم صاحب نے ابھی ابھی ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے پڑھ کر سنایا تھا۔ سب لوگوں کے دل بھر آئے تھے، پلکیں جھکی اور گردنیں لٹکی ہوئی تھیں۔ اس کے یہ جملے کمرے کی بندھی ہوئی فضا میں بکھرے ہوئے دھوئیں کی طرح لٹک رہے تھے اور لوگوں کے ابھی تک جھکے ہوئے چہرے ایسے دھندلے پڑ گئے جیسے کسی نے روشنی کا رخ بدل دیا ہو۔ کئی منٹوں تک سناٹا چھایا رہا۔ اگر غور کرنے عین اسی وقت پان سگریٹ کی ٹرے نہ حاضر کر دی ہوتی، تو سب ہی ادبتے ہوئے بت کی طرح بیٹھے رہتے لوگوں نے بڑے سکون سے ماتمی انداز سے پان کھائے یا سگریٹیں سلگائیں اور اب صاحب صدر نے کہا — "اب میں چندر بھان جی سے درخواست کروں گا کہ وہ دو لفظ کہیں۔ چندر بھان جی کی یہ خوش قسمتی رہی ہے کہ وہ لگاتار تین برس تک اُن کے ساتھ رہے ہیں اور آپ انہیں بہت نزدیک سے جانا پہچانا ہے — چندر بھان جی —"

چندر بھان جی نے شروع کیا — "سب سے پہلے میں اس عظیم شخص، اس عظیم ادیب کو اپنا عقیدت مندانہ سلام پیش کرتا ہوں۔"

اتنا کہہ کر وہ یکایک چپ ہو گئے۔ ان کے چہرے پر درد کی لکیریں پرچھائیں کی طرح کانپ رہی تھیں، ایک لمحہ جیسے چندر بھان جی نے اس مرحوم ہستی کو یاد کیا ہو، پھر بولنا شروع کیا — "یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں ان کے ساتھ ایک لمبی مدت تک رہا اور انہیں ہر طرح سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔

وہ بڑے ہی صاف دل اور نیک آدمی تھے۔ انہوں نے مصیبتوں میں کبھی ہمت نہیں ہاری۔ انہوں نے اپنے دن انتہائی افلاس میں گزارے اور آخری لمحہ تک وہ اپنی مجبوریوں اور حالات سے لڑتے رہے جس وقت ان کی بیوی کا انتقال ہوا تھا، میں وہیں تھا۔ فاقہ مستی کی یہ حالت تھی کہ اس وقت ان کے پاس کفن تک کے لئے کرایہ نہ تھا۔ ادھار دینے والے ان کے نام سے کتراتے تھے۔ ان کی زندگی میں ایسے دن بھی آئے جب گھر میں چولہا تک نہیں جلا۔ میں انہیں اپنے گھر کھانے کے لئے بلا بلا کر لاتا تھا۔ کھانا کھا کر وہ چپ چاپ بیٹھے رہتے تھے اور کوئی لفظ کہے بغیر اٹھ جایا کرتے تھے۔ میں نے ان کا تھوڑا بہت قرض چکایا تب بنئے کی دوکان سے انہیں راشن ملنا شروع ہوا۔ یہ ہماری زبان کی بدبختی ہے کہ ان کے جیسے ہونہار سپوت اس طرح کھوکھوں مریں۔ ان کی بیوی کی تجہیز و تکفین کے لئے جب ہم نے چندے سے روپیہ جمع کرنا چاہا تو انہیں برداشت نہ ہوا۔ اسی دن انہوں نے اپنے ایک ناول کے مسودے کا کاپی رائٹ بیچا اور بیوی کے آخری رسومات ادا کئے۔ مجھے وہ دن یاد ہے آج بھی وہ سارے مناظر میری آنکھوں کے سامنے ناچ رہے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ بیوی کی لاش گھر میں پڑی ہے اور وہ ــــ کاپی رائٹ ایگریمنٹ پر دستخط کر رہے ہیں ایسی تھی ان کی خودداری، میں ان کی خودداری کے سامنے سر تعظیم جھکاتا ہوں اور اپنے زمانہ کے عظیم ادیب کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔"

کہتے کہتے حیدر بھان جی کا گلا بھر آیا تھا اور وہ آنکھوں پر رومال رکھ کر اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

جس ناشر جی کو ٹھی پر یہ تعزیتی جلسہ ہو رہا تھا، وہ خود بہت دبلے دبلے، نہایت مسکین صورت بنائے چوبدار کی طرح بیٹھے تھے۔ صدر کی نظر ان پر پڑی تو دھیرے سے بولے، ـــ "بہاری بابو ادھر آ جائیے" اور اپنی بغل میں صوفے پر ان کے لئے جگہ خالی کر لی۔ بہاری بابو بہت جھجکتے ہوئے اس طرح قدم رکھتے ہوئے آئے جیسے پاس والے کمرے میں سو رہی پڑی اس عظیم ہستی کی نیند میں خلل نہ پڑ جائے۔ ان کے ہاتھ پیر ڈھیلے تھے اور وہ رہ رہ کر اپنی سنہری کمانی والے چشمہ کو کھوؤں سے جھپکا کر سامنے دیوار پر لگی اس فوٹو کو تاک لیتے تھے، جس میں اس عظیم ادیب کے ساتھ ان کی اور ان کے خاندان کی تصویر تھی۔

اس وقفہ کے بعد اس ادیب کی موت پھر لوجھل ثابت ہونے لگی۔ جو سکون ابھی لوگوں کے طور طریقہ میں آ گیا تھا، وہ گمبھیرتا میں بدل گیا اور صاحب صدر کی ایما پر ایک کھدر دھاری سجن اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ "معزز صدر اور ساتھیو، میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ آج اس جلسہ میں حاضر ہو سکا ہم اپنے زمانے کے بہترین ادیب سے بہت دور نہیں گئے ہیں۔ وہ آنے والے زمانہ میں بھی زندہ رہیں گے اور ایک لائٹ ہاؤس کی طرح ہر بھٹکتے ہوئے جہاز کو راستہ دکھائیں گے ــــ مجھے وہ دن یاد آتے ہیں جب یہاں وہ میرے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔" کھدر دھاری سجن نے اس قدر خود اعتمادی سے یہ بات کہی تھی کہ ایک صاحب تردید کر بیٹھے۔ "انہوں نے تعلیم ناگپور میں پائی تھی، یہاں تو وہ چار سال پہلے آئے تھے۔"

صدر نے آنکھ کے اشارے سے تردید کرنے والے کو منع کرنا چاہا۔ کھدر دھاری سجن کا چہرہ تمتما اٹھا تھا، اپنے منہ کے گوشہ میں بہہ آئے پان کی پیک کو اپنچھتے ہوئے وہ ذرا سختی سے بولے ــــ۔

کملیشور ہنبر

یہ نہایت افسوس کی بات ہے کہ آج کا پڑھا لکھا اور ادیب کہا جانے والا آدمی ایک بات کے حقیقی معنی کو نہ سمجھ پایا ہے ,, انہوں نے بڑی صفائی سے اپنی بات سنبھالی — ,, گورکی نے مائی یونیورسٹیز ,, لکھا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ یونیورسٹی سے فارغ تھے۔ زندگی خود سب سے بڑی تعلیم گاہ ہے، جن میں ادیب، شاعر اور ڈرامہ نویس تجربے حاصل کرتا ہے۔ وہ سماج کا پیش رو ہے۔,,

کھدر دھاری سجن جوش میں آگئے تھے، سپاری کا کوئی ٹکڑا حلق میں ایک کھراش پیدا کر رہا تھا۔ میز پر رکھا گلاس اٹھا کر انہوں نے پانی پیا اور بولنے لگے — ,, ادب ایک ریاضت ہے، وہ ایک عبادت ہے اور ادیب ایک عبادت گذار۔ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے جیسا سماج ہوگا ویسا ہی ادب ہوگا۔

ان کے ہاتھ ہوا میں آئینہ کا نقشہ بناتے ہوئے انگلیوں سے کوئی بڑا سا بولٹ کھول کر سماج کا روپ سامنے لانا چاہتے تھے۔ ,, ہماری روایات والمیکی، بھگوتی، کالی داس اور تلسی کی ہیں۔ وہ اپنے عہد کے عظیم خالق تھے۔ وہ مستقبل کے پیغامبر تھے۔ یہ ہمارے زمانہ کا قصور ہے کہ ہم ابھی تک ان جیسا ایک شاعر بھی پیدا نہیں کر سکے۔ کیونکہ ادب ,, ستیم شیوم سندرم ,, کا بنیادی مسلک نہیں بناتا ہے۔ ہمارے رشیوں نے کہا ہے کہ جو شیو ہے، جو سندر ہے وہ ستیہ ہے۔ ادب میں چونکہ یہ رجحان نہیں رہا ہے اس لئے ہم بچھڑ گئے ہیں .... ہم نہیں جانتے کہ رہسیہ واد کیا ہے اس کا کارن صرف یہ ہے کہ ہمارا ادیب سادھنا اور ریاضت سے گھبراتا ہے۔ اور جب تک ادیب اپنے اس فرض کو نہیں سمجھے گا سماج آگے نہیں بڑھے گا۔ آج بدیشوں میں ہمارے دیش کی جو عزت ہے اس کی بنیادی وجہ ہے ہماری پرامن خارجہ پالیسی۔ ہم نے دیش بدیش میں اپنی آواز پہنچائی ہے۔ عزت حاصل کی ہے ..... ادب کی بنیاد پر یہی سچائی ادب کی جان ہے۔ وہ انسانیت پرست ہو، رجعت پسند ہو، رہسیہ ہو، انقلاب ہو، زندہ باد ہو سب میں سچائی موجود ہے۔ آج کے ادیبوں اور شاعروں سے میری دست بستہ گذارش ہے کہ وہ اس سچائی کو پہلے حاصل کریں اور ملک کی تعمیر میں اپنا فرض ادا کریں۔ بس مجھے اتنا ہی کہنا ہے۔,,

اور وہ اسی جوش میں اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

تعزیتی جلسہ میں آئے ہوئے تمام لوگوں کے چہرے فق تھے۔ صدر بھی تھوڑا سکتے میں آگئے تھے۔ ہوا ایکدم بدل گئی تھی۔ اپنے خشک ہونٹوں کو تر کرتے ہوئے صدر نے کہا — ,, ابھی ہمارے شہر کے محبوب رہنما شری عبتندر جی نے آپ کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہمیں چاہیئے کہ ہم ان کی پیروی کریں۔ اپنے عظیم ادیب کو ہم اسی طرح واقعی خراج عقیدت پیش کر سکیں گے۔ اب میں شری بہاری بابو سے عاجزانہ استدعا کرتا ہوں کہ وہ چند لفظوں میں کچھ کہیں ,, کہہ کر صدر نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ بہاری بابو نے اپنے کرتے کی آستینیں ہاتھ تک کھینچ لیں اور بڑے افسوسناک لہجہ میں بولے — ,, یہ وقت میرے بولنے کا نہیں ہے۔ ادبی ہستیوں کے سامنے بولتے مجھ کو تامل ہوتا ہے۔ آج ہم جس عظیم ہستی کی تعزیت کے لئے یہاں اکٹھا ہوئے ہیں وہ میرے اپنے تھے۔ وہ پورے خاندان کے رکن تھے۔ آج میں اکیلا رہ گیا۔ یہ ہماری زبان کا ایک باصلاحیت فن کار کا ہی

انتقال نہیں، میرا ذاتی نقصان ہے، آج سے چار سال پہلے مجھے وہ ایک ادبی جلسے میں ملے تھے۔ تب وہ بہت ہی تکلیفوں میں تھے۔ آپ کی مہربانی سے میری ایسی حالت تھی کہ میں ان کی کچھ مدد کر سکوں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس شہر میں آنے کا احسان کریں۔ میں نے ان سے بے حد التجا کی کہ وہ غریب خانے ہی پر تشریف لائیں پر وہ لکھنے کے لئے تنہائی چاہتے تھے۔ میں نے اپنا ایک مکان اسی لئے خالی کروا دیا۔ میں نے ان سے کرایہ کبھی نہیں لیا اور یہ میری خوش قسمتی تھی کہ تا عمر انہوں نے میری خدمات کو شرف قبولیت بخشا، مجھ پر ان کی نظر کرم رہی اور وہ میرے خاندان کے ایک رکن بن گئے۔ میرا دل اتنا بھرا ہوا ہے کہ اس موقعہ پر کچھ کہہ پانا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے ان کی تمام تخلیقات کو ایک جگہ شائع کرنے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ جس سے ہمارے ادب کے اس عظیم فنکار کی ساری تخلیقات قارئین کو آسانی سے مل سکیں۔ ہم نے عوام کے پیش نظر ان کی تخلیقات کی قیمت بہت کم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ ان کا پرچار گھر گھر ہو سکے اور ہمارے اس عظیم ادیب کے نظریات کی روشنی ہر سو پھیل سکے۔"

میری یہی تمنا ہے کہ وہ جو کچھ عمر بھر سوچتے رہے وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے، جو کچھ انہوں نے لکھا وہ ہمارے ادب کا لازوال سرمایہ ہے۔ میں اپنے دوست اور علم کی دیوی کے بے لوث خادم کو اپنا حقیر نذرانۂ عقیدت پیش کرتا ہوں۔"

ان کے بیٹھتے ہی مشہور کہانی کار بھیشور جی اپنے آپ کھڑے ہو کر بولنے لگے۔"

دوستو! میں بھی آپ سے چند لفظ کہنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کا زیادہ وقت نہ لے کر اپنی بات اختصار سے پیش کروں گا۔ آج سے تیس سال پہلے کی بات ہے جب میں نے لکھنا شروع کیا تھا اور تب سے لگاتار ادب کی خدمت کرتا چلا آ رہا ہوں۔ میں نے اب تک سرسوتی کی سادھنا کر کے لگ بھگ پچھتر سے اوپر نثری تخلیقات پیش کی ہیں جنہیں ہم پیش کرتے ہیں۔ آج ہم اپنے ادب کے مشہور ترقی پسند فنکار کے انتقال پر یہاں اکٹھا ہوئے ہیں۔ وہ ہمارے ساتھی تھے۔ ہم لوگوں نے تقریباً ایک ساتھ لکھنا شروع کیا تھا۔ میں نے کچھ سال پہلے شروع کیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب وہ اپنی پہلی کہانی لکھ کر میرے سامنے لائے تھے۔ اس وقت میں ادبی دنیا میں داخل ہو چکا تھا، میری تخلیقات مشہور رسالوں میں اہم مقام پانے لگی تھیں۔ میں نے ان کی پہلی کہانی پر بڑی تیز تنقید کی تھی۔ ہم پھر بھی اچھے دوستوں کی طرح ملتے رہے اور ایک دوسرے کو تخلیقات سناتے رہے۔"

سچ پوچھئے تو وہ میرے بہت ہی قریبی دوستوں میں تھے۔ آج جو آپ مجھے اس روپ میں دیکھ رہے ہیں، یہ حیثیت مجھے یونہی نہیں ملی ہے۔ میرے پتاجی کو شعر و ادب کا ذوق تھا۔ اور جب چھوٹی عمر میں میں نے پہلی بار ایک کویتا لکھی تو میرے پتاجی نے میری بہت حوصلہ افزائی کی اور دھیرے دھیرے وہ مجھے اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے کوی سمیلنوں میں لے جانے لگے۔ میرے پڑھنے والوں میں یہ جھگڑا ہے کہ میں بنیادی طور پر ناول نگار ہوں، کوی ہوں، کہانی کار ہوں یا نقاد۔ دوستو! میں نے ابتدا شاعری سے کی اس لئے میں اپنے کو بنیادی طور پر شاعر ہی مانتا ہوں اور اسی میں میرے دلی جذبات ظاہر ہوتے ہیں۔ بہر حال اسے چھوڑیئے۔ آج ہماری زبان ایک ایسے موڑ پہ ہے کہ ہمیں اس کے وقار اور سلامتی کے لئے بڑے بڑے کام کرنے ہیں وہ اپنا کام پورا کر گئے۔ ایک بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ ادبی مسائل پر ہم میں ان میں بہت جھگڑے ہوئے ایسے موقعوں پر اکثر و بیشتر وہ ہار جاتے تھے اور اگلی بار کے لئے تیار ہو کر آتے تھے۔ جب وہ میرے ساتھ تھے تب میں نے

اپنا پہلا ناول "بھیگا آنچل لہرائے رے" لکھا تھا۔ — بھوبنیشور جی نے دھیرے سے مسکرا کر آگے کہا۔" کویتا میرے اوپر کتنی حاوی تھی، اس کا اندازہ ناول کے نام سے ہی ہو گیا ہو گا۔ اس کے بعد میں جذبات اور تخیلات کی دنیا سے نکل آیا۔ میں نے حقیقت کی ٹھوس دھرتی پر قدم رکھے۔ یہ میرا اپنا موڑ تھا، اس دور میں میں نے پتھر کی دیوار اور بلبلے نام کے دو ناول لکھے جسے نقادوں نے خوب سراہا۔ اس کے بعد میں نے سترہ افسانوی مجموعے اور دس شعری مجموعے اور تین طویل نظمیں لکھیں۔ یہ فہرست آپ کہیں بھی دیکھ سکتے۔ اب میں ایک نئی کتاب لکھنے جا رہا ہوں جس میں میرے ادبی ہمسفروں کی یادیں ہوں گی اور میں اپنی سچی شردھانجلی اس روپ میں پیش کروں گا۔ اب میں آپ سے آگیا چاہتا ہوں — نمسکار۔"

اور نمسکار کے ڈرامائی انداز سے وہ اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ سامنے بیٹھے ہوئے خاص سامعین میں سے ایک صاحب ڈھیلی گدی کی طرح بار بار اچک رہے تھے، کھڑے ہو کر انہوں نے صدر جلسہ سے ایک منٹ وقت چاہا۔ اجازت ملتے ہی انہوں نے کہا۔" ابھی ہمارے کہانی کار بھوبنیشور جی نے دبنگ ادیب کو ترقی پسندی کے خطاب سے نوازا۔ میں اس کی مخالفت کرتا ہوں۔ وہ سچے انسانیت پرست تھے، میں نے ان کی تخلیقات کی ایک ایک سطر پڑھی اور میں اس گمبھیر الزام کے لئے بحث کرنے کو تیار ہوں۔ کیا وہ اپنے دعوے کی دلیل میں مثالیں پیش کر سکتے ہیں؟"

اور وہ صاحب للکارنے کے انداز سے اپنی جگہ پر کھڑے رہے۔ صدر جلسہ نے گھڑی پر نگاہ ڈال کر کہا۔" بھائیو! ہم لوگ ادبی مسئلوں کو سلجھانے کے لئے نہیں بلکہ تعزیتی جلسہ کے لئے اکٹھا ہوئے ہیں۔ لہذا ان باتوں کا نپٹارہ بعد میں ہوتا رہے گا۔ آپ کرپا کر کے بیٹھ جائیے۔"

ان کھڑے ہوئے سجن کے بیٹھتے ہی صدر نے کہا۔" آپ کے سامنے بہت سے لوگ بول چکے ہیں اور اب کچھ بھی کہنے کو باقی نہیں۔ یہ موقع بھی ایسا نہیں اس لئے میں ایک تجویز آپ کے سامنے رکھتا ہوں اور ایک منٹ خاموشی کی درخواست آپ سے کرتا ہوں اور اس کے بعد ایک بات اور سامنے رکھوں گا۔"

ایک منٹ کی خاموشی کے بعد غمزدہ ادیبوں کی تجویز آئی۔ اس کی منظوری کے بعد صاحب صدر بولے۔" ہمارے ہاں مردہ پرستی کا رواج ہے۔ پتہ نہیں، ہم زندہ شخصیتوں کا احترام کرنا کب سیکھیں گے۔ خیر یہ مسئلہ آگے کا ہے، اس وقت میری تجویز ہے کہ ہم ان کے لئے ایک یادگار قائم کریں — یہیں اپنے شہر میں تاکہ آنے والی نسلیں جان سکیں کہ انہوں نے اپنے آخری دن اسی متبرک شہر میں گذارے تھے۔ بیرونی ملکوں میں بڑی ہی صحت مند روایت ہے۔ وہ اپنے اہل قلم کا آدر کرنا جانتے ہیں۔ ہم بھی اس سمت میں قدم بڑھائیں تو دوست میری تجویز ہے کہ ایک یادگار ایسی ہو جہاں ان کی مکمل تخلیقات، ان پر لکھی گئی تنقیدیں ان کے قلمی مسودات اور ان کی دوسری چیزیں محفوظ طریقے سے رکھی جا سکیں۔"

"میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔" چندر بھان جی نے کہا کہ — "میں ان سے آخری دنوں میں ملا تھا۔ تب ان کے چہرے پر حد درجہ کی مایوسی چھائی ہوئی تھی اور انہوں نے بڑے درد سے مجھ سے پوچھا تھا — "کیوں چندر بھان! میں نے کیا ایسا کچھ بھی لکھا ہے جو میرے مرنے کے بعد باقی رہے گا؟" — میں نے انہیں کبھی اس قدر مایوس نہیں دیکھا تھا۔ میری آنکھیں بھر آئی تھیں اور میں نے ان سے کہا تھا —"

کملیشور نمبر

بھائی صاحب، آپ ہمارے ادب کی عہد آفریں شخصیت ہیں۔ یہ ٹھیک ہے آپ کی زندگی میں ہم لوگ آپ کے لئے ابھی تک کچھ نہیں کر پائے، لیکن آنے والی پود آپ کی قدر و قیمت جانے گی اور آپ کو وہ اعزاز بخشے گی جو آج تک کسی کو نہیں ملا۔ یہ آپ کا حق ہے جو آج تک آپ کو نہیں ملا۔ سنتے سنتے اُن کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ بہاری بابو اس وقت وہیں تھے۔ اور بہاری بابو نے جب وقت اُن سے کہا تھا — "آپ کی یادگار رہے گی۔ نئے ادیب وہاں بیٹھ کر لکھنا سیکھیں گے" تو اُن کی آنکھ سے آنسو ڈھلک پڑے تھے۔ جیسے انہیں یقین نہ آ رہا ہو۔ انہیں اپنی اہمیت کا کبھی احساس نہیں ہوا۔ اس دن بہاری بابو نے لوٹتے وقت ایک خیال پیش کیا تھا کہ کیوں نہ اُن کی یادگار ہم لوگ یہیں قائم کریں۔ آخر ہمارے شہر کا اب اُن پر پورا حق ہے۔ اپنا یہ مکان جس میں وہ رہ رہے ہیں۔ میں یادگار کمیٹی کو عطیہ دے دوں گا۔ بہاری بابو کے اس دن کے یہ الفاظ مجھے یاد ہیں۔ اور اب وہ وقت آ گیا ہے گرچہ یہ بڑے افسوس کا موقعہ ہے لیکن جو دنیا میں آیا ہے وہ جائے گا ہی۔ میں بہاری بابو سے گذارش کروں گا کہ وہ اپنی بات پوری کر دیں۔ اور ہم لوگ چندہ جمع کر کے دوسری ضروری کارروائیاں شروع کر دیں۔

تعزیتی جلسہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ آخر دھیرے دھیرے یادگار بنانے کی بات آگے بڑھی۔ اور لوگوں نے ایک کمیٹی بنائی۔ سب نے اپنا اپنا چندہ لکھوایا۔ کسی نے سو کسی نے دو سو — جتنی جس کی صلاحیت تھی۔ ایک سکریٹری کا انتخاب عمل میں آیا اور پھر تعزیتی جلسہ برخاست ہو گیا۔

لوگ اب تک اوب چکے تھے۔ چلنے کے لئے بے قرار تھے کہ بہاری بابو نے اپنی سنہری کمانی والا چشمہ بھوؤں سے چپکاتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا — "آپ لوگ کچھ چائے پان تو کر لیں"

باہر برآمدے میں میزیں لگی ہوئی تھیں اور ان پر بھرپور ناشتہ رکھا ہوا تھا۔ بیچ میں گلدستے سجے تھے۔

"یہ تعزیتی جلسہ ہے یا چائے پارٹی؟" — ایک نے کہا تو بہاری بابو عاجزی سے بولے — "آپ آج اس گھر پر تشریف لائے ہیں اب موقعہ کہاں ملتا ہے۔ اسے قبول کیجئے۔ ایک پیالی ہی سہی۔"

پر کچھ لوگوں کے قدم ٹھٹھک رہے تھے۔ تب تک کھدر دھاری جتیندر جی نے کہا — "اب یادگار کمیٹی کی طرف سے ہی۔" ایک قہقہہ گونجا اور سب بری الذمہ ہو کر ادھر بڑھ گئے۔

اور تین چار دن بعد اس یادگار کمیٹی والے مکان پر، جس میں وہ عہد آفریں ادیب مرا تھا، ایک بورڈ لگا ہوا تھا۔ "مکان کرائے کے لئے خالی ہے۔" جس میں ایک نہیں، چار لوہے کی کیلیں خنجروں کی طرح گھسی ہوئی تھیں۔

کملیشور

"اپنے دیش کے لوگ"

وہاں پر بہت سے لوگ اکٹھے تھے۔ سب کی گردنوں میں پٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان پٹوں پر اُن کے نام اور مرض لکھے ہوئے تھے۔

دین دیال ــــ عمر ۴۰ سال ...... مرض، زیادہ تنخواہ مانگتا ہے۔ اور سلام نہیں کرتا۔

سدانند ــــ عمر ۲۵ سال، مرض، دفتر کی اسٹیشنری چراتا ہے۔

ابراہیم ــــ عمر ۳۰ سال، مرض، سچ بات کہنے سے نہیں ڈرتا۔

الیس۔ سبرامنیم۔ عمر ۲۸ سال، مرض، اپنے افسر سے زیادہ قابل ہے۔

سیرادگھوش ــــ عمر ۲۶ سال، مرض، غلط بات نہیں مانتا۔

سبودھ بکیر اسی۔ عمر ۲۵ سال، مرض، لکھ لکھ کر افسر کی شکایت کرتا ہے۔

سبھی کی گردنوں میں پڑے ہوئے پٹوں پر نام اور طرح طرح کے مرض لکھے ہوئے تھے۔ وہ سب چپ چاپ لائن میں کھڑے تھے۔ ایک سیکشن افسر نما کمانڈر دس گیارہ فائلیں پکڑے ہوئے ہر آدمی کی جانچ کر رہا تھا۔ ساتھ ہی جیب سے ایک ایک گولی نکال کر سب کو دیتا جا رہا تھا۔ جو گولی کھا چکے تھے، وہ چپ چاپ کھڑے تھے۔ باقی شور مچا رہے تھے۔

کچھ ہسپتال کی طرح کا ماحول تھا۔ بہت سے افسر لوگ ڈاکٹروں کی طرح سفید لمبا کوٹ پہنے ہوئے پھرتی سے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ وہ مصروف تھے۔ ان کے ساتھ کچھ بیرونی شخصیتیں بھی گھوم رہی تھیں جو ان ڈاکٹر نما افسروں کو چلتے چلتے ہدایتیں اور رائے دے رہی تھیں۔ برآمدوں میں فائلوں کے ڈھیر تھے۔ فرش سے چھت تک ۔ ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان کی وجہ سے آمد و رفت میں تکلیف ہو رہی تھی نرسوں کی جگہ پر بیڑی پیتے ہوئے چپراسی تھے، جو اپنے ڈاکٹر افسروں کو دیکھ کر بیڑی چھپا لیتے تھے، دد دوسرے افسر کے سامنے پیچھے رہتے تھے۔

ہاں کافی سر گرمی تھی، میں تاریخ پیدائش لکھنے والے افسر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ پتھر کی مورتی کی طرح خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پاس کھڑے چپراسی نے ان کے پلک کھول دیئے اور مجھے دیکھنے لگے۔ چپراسی نے ان کا داہنا گال کھینچ دیا، جس سے ان کے ہونٹ لمبے ہو گئے۔ اور ان کی مسکراہٹ نظر آنے لگی۔ میں نے بڑی ہی گمبھیرتا سے پوچھا، "وہ کونسا ڈپارٹمنٹ ہے اور کیا کام کرتا ہے۔ تاریخ

پیدائش لکھنے والے افسر نے چپراسی کی جانب دیکھا، چپراسی نے ان کی ٹھڈی کے نیچے لگے ایک بٹن کو
دابا۔ اور آواز نکلنے لگی۔
"بھارت میں آزادی کو قائم کرنے کے لئے ایسے نئے آدمیوں کی ضرورت ہے جو صرف
من لگا کر اپنا کام کریں۔ حکومت کو سمجھے۔ جو سپنے نہ دیکھا کرے۔ اپنے دماغ کا زیادہ استعمال نہ
کرے۔ کھانا کپڑا اور رہنے کے لئے جگہ نہ مانگے۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں سے پریشان اور ناراض نہ ہوں جلسوں
اور جلوسوں میں حصّہ نہ لیں۔ کیونکہ ترقی میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ یہ ڈپارٹمنٹ عہدیداروں کے سدھار
کے لئے کھولا گیا ہے تاکہ وہ من لگا کر صرف اپنا کام کریں۔" اتنا بولا کہ تاریخ پیدائش لکھنے والا افسر چپ
رہ گیا۔ چپراسی نے بٹن بند کر دیا تھا۔
میں نے پھر پوچھا، "لیکن سرکار اور کچھ غیر سرکاری انجمنیں بھی عوام کے لئے تمام کام کر رہی
ہیں ملک میں معاشی یکسانیت اور نئے سماج کو قائم کرنے کے لئے قدم اٹھا رہی ہے۔ پھر آپ کا ڈپارٹمنٹ
اس طرح کے کاموں کو کیوں کرنا چاہتا ہے؟" اس بار چپراسی نے ان کے کان کے اوپر لگے بٹن کو دبا دیا اور
وہ بولنے لگے، "اصل میں بات یہ ہے کہ سرکار یا اچھی غیر سرکاری انجمنوں کے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے۔ وہ
ہاتھی کے دانت ہیں جنہیں دیکھ کر جنتا خوش ہوتی ہے۔ دراصل اصلی دانت منھ کے اندر رہیں، انہی
کے لئے سب ہوتا ہے۔ یہ جتنے سماج سیوک اور سیاست داں ہیں سب بکے ہوئے ہیں!....." وہ
کچھ کہنے جا رہے تھے کہ چپراسی نے دماغ کا بٹن بند کر دیا۔ تاریخ پیدائش لکھنے والا افسر ایک دم "چپ" ہو گیا۔
چپراسی نے ان کے ہونٹوں کو دبا دیا۔ ہونٹ چپک گئے اور وہ میری جانب ٹکر ٹکر تکتے رہے۔
میں ان کے کمرے سے نکل آیا اور برآمدے میں ہوتا ہوا بھیتر پہنچا وہاں بہت سے افسر نما ڈاکٹر
ایک آپریشن میز کی چاروں طرف کھڑے تھے۔ کچھ بیرونی شخصیتیں بھی تھیں۔ ایک کونے میں فائلوں کا انبار
لگا ہوا تھا۔ اور ایک کلرک کچھ لکھنے میں چپ چاپ مصروف تھا۔ میز کے پاس ہی "کھوکھری" لئے ہوئے دو
سرجن کھڑے تھے۔ ہاتھوں میں دستانے تھے۔
تبھی کونے والے کلرک نے آواز لگائی۔ دین دیال —— عمر ۴۰ سال، مرض زیادہ تنخواہ
مانگتا ہے۔ سلام نہیں کرتا!
دین دیال اندر آیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ چہرے کا رنگ اُڑا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ اندر داخل
ہوا، اُن افسر نما ڈاکٹروں نے اسے پکڑ لیا۔ اُس نے سب کو دیکھا۔ کچھ افسروں کو اُس نے پہچانا۔ تبھی
کھوکھری لے کر کھڑے ہوئے دونوں سرجن آگے بڑھے۔ ایک سرجن نے اسے ٹٹولا اور دوسرے نے
کہا، "پہلے اس کی پرچھائیں نکال لی جائے۔"
سرجن نمبر دو نے باس کی میز سے کوئی دوا اُٹھا کر دین دیال کو سونگھائی اور اس کے منھ میں
ہاتھ ڈال کر ایک آتما نما چیز کھینچ لی اس چیز کو میز کی بغل والی پلیٹ میں رکھ دیا گیا تھا۔
پہلے سرجن نے اشارہ کیا اور دوسرے سرجن نے کھوکھری کے ایک جھٹکے سے دین دیال کی
کھوپڑی اتار دی۔ کھوپڑی کی ہڈی اتارتے ہی ایک چھوٹی سے ڈائری نکل کر تکئے پر گر پڑی۔ باس

کٹھڑے افسر نما ڈاکٹروں نے دین دیال کی کھوپڑی میں جھانکا اور وہ خالی تھی ایک ڈاکٹر نے ڈائری اٹھا کر دیکھنی شروع کی۔ اس میں بہت سی باتیں نوٹ کی تھیں۔

جتنا قرض اُس نے لیا تھا وہ پورے سے اُس پر لکھا ہوا تھا۔ ڈاکٹروں نے حساب جوڑا تو قرضہ پانچ ہزار نکلا۔ اُسی ڈائری میں وہ دن بھی لکھے ہوئے تھے جب جب اُس کی تنخواہ میں اضافہ ہوا تھا ڈاکٹروں نے حساب لگایا بائیس سال کی نوکری میں اُس کا کل ایک سو دس روپے بڑھا تھا۔ پچاسی روپے سے اُس نے نوکری شروع کر دی تھی اور اب ایک سو پچانوے پا رہا تھا۔

اس کے علاوہ ڈائری میں وہ رقمیں بھی نوٹ تھیں؛ جو وہ اپنے بیٹے کو پڑھانے کے لیے ہر مہینے بھیجتا رہا تھا۔ کئی وقت سیلاب زدہ لوگوں اور ملک کی سلامتی کے لیے بھی چندے دیئے تھے۔ اُس میں ان کے گھر والوں، اور ہسپتالوں کے نام درج تھے جن میں اُن کی موتیں یا جنم ہوئے تھے۔ ابھی ڈاکٹر لوگ وہ ڈائری پڑھ ہی رہے تھے کہ سرجن نے پھر اشارہ کیا۔ اس دوسرے سرجن نے کھوکھری ڈال ڈال کر اس کی دونوں آنکھیں کی مٹی پتلیاں نکالیں تو ان کے ساتھ کیمرے کے ریل کی طرح لمبی ریلیں نکلتی چلی آئیں۔ دونوں سرجن مل کر کھینچتے رہے پر وہ ریلیں ختم ہی نہیں ہوتی تھیں۔ آخر کار ہار کر انہوں نے کھوکھری سے وہ ریلیں کاٹ لیں۔

اُن ریلوں پر ہزاروں تصویریں تھیں لیکن بہت ہی عجیب! اُن میں کچھ تصویریں مکانوں کی تھیں، اچھے صاف ستھرے مکانوں کی۔ کچھ تصویروں میں سجی ہوئی دو کانوں کے عکس تھے۔ جن کے شوکیس میں خوب صورت ساڑیاں لٹک رہی تھیں۔ کچھ تصویریں، قمیضوں، بنیٹوں اور کوٹوں کی تھیں۔ جوتوں کی تھیں۔ اچھے ہوٹلوں کی تھیں۔ صحت مند بچوں اور ان کے کپڑوں کی تھیں۔ کھلونوں اور راشن کی تھیں۔ بنارس اور ہر دوار کی تھیں۔ مندروں اور تیرتھ استھانوں کی تھیں۔ دوائیوں اور پھلوں کی تھیں۔ بچوں اور رنگ برنگی پوشاکوں اور کھیلوں کی تھیں۔

ان تصویروں کو دیکھتے دیکھتے سبھی لوگ اُوب اٹھے۔ انہوں نے ریلیں لپیٹ کر رکھ دیں۔ پھر سرجن نے اشارہ کیا اور دوسرے سرجن نے کھوکھری مار کر اس کے پیٹ کو چیر لیا۔ اُس کے کھلتے ہی دھوئیں کا ایک غبار سا نکلا اور چاروں طرف میز کی پھیل گئی۔ دھواں جب صاف ہوا تو ایک راشن کارڈ اور کرانے کی کچھ پرچیاں نکل آئیں۔ بیڑی کے کچھ ٹکڑے اور چائے کی پتیاں بھی نکلیں۔ ان سب چیزوں کو نکال کر پلیٹ میں رکھ دیا گیا۔ ایک کلرک وہیں کھڑا ان کی فہرست بناتا جا رہا تھا اس کے بعد پہلے سرجن نے اشارہ کیا اور دوسرے سرجن نے اُس کا سینا چاک کیا دل کے آس پاس کا حصہ اُس نے کاٹ لیا تھا۔ انہیں امید تھی کہ ایک دھڑکتا ہوا دل وہاں ہوگا۔ پر کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ جھانک کر دونوں سرجنوں نے دیکھا تو وہاں جالا لگا ہوا نظر آیا۔ سرجن نے کھوکھری کی نوک سے جالے کی ایک پرت ہٹائی۔ جالا بھر لگا ہوا تھا۔ کھوکھری کی نوک سے اُس نے پورا جالا صاف کیا تو اس کے ساتھ ایک زندہ مکڑی بھی نکلی دونوں سرجنوں نے مل کر دین دیال کی کھوپڑی آنکھیں، پیٹ اور دل والی جگہ اچھی طرح صاف کر دی۔ صاف کرنے کے بعد ان میں پوڈر چھڑکا تبھی ایک پلیٹ میں کچھ چیزیں لیے ایک کمپونڈر حاضر ہوا دوسرا سرجن ایک جانب ہٹ گیا پہلے والے سرجن نے کمپونڈر کی پلیٹ سے فائلوں کا ایک چھوٹا سا چنا ہوا گھر اٹھایا اور اس کی کھوپڑی میں رکھ کر کمرے دار

ہڈی چڑھا دی۔ اس کے بعد پلیٹ سے اس نے دین دیال کے سب آفیسروں کی تصویریں اٹھائیں۔ انہیں پیسٹ لپیٹ کر آنکھوں کے گڈھوں میں بھر دیا۔ آنکھوں کے کٹورے بھر گئے پھر اس نے بہت احتیاط سے پتلیاں جوڑ دیں پھر پلیٹ سے اس نے اخباروں کی وہ کترن اٹھائی جن میں مہنگائی بھتہ بڑھنے اور قیمتوں کے کم ہونے کی خبریں چھپی تھیں۔ ان کترنوں کو ایک آلپین سے نتھی کیا اور پیٹ میں رکھ کر سلائی کر دیا۔

اس کے بعد اس نے پتھر کا ایک چھوٹا ٹکڑا اٹھایا اور دل کی جگہ رکھ کر سینے پر بھی ٹانکے لگا دیئے اور آخر میں اس نے وہ پرچھائیں نما آتما اٹھائی اور دین دیال کا منہ کھول کر اسے بھیتر گھسیڑ دیا۔ اسے میز سے اٹھانے سے پہلے انہوں نے جلدی سے دو ٹانکے اس کی زبان میں بھی لگا دیئے اور تھپک تھپک کر اس نے بٹھا دیا۔

دین دیال بڑی پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے جھک جھک کر اپنے سب افسروں کو سلام کیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی کلرک نے آواز لگائی۔ سدا آنند۔ عمر ۲۵ سال۔ مرض۔

.... یہ تو سب جانتے ہیں کہ یہ ملک غریب ہے لیکن غربت کا یہ مطلب نہیں کہ ہم اپنی بہو، بیٹیوں اور بہنوں کو بیچتے ہیں۔ پورا ہندستان غریب ہے اور غریبی ہمیں اپنی اونچائیوں کا احساس کراتی ہے۔ اس مشکل اور پریشانی میں صرف ہماری عزت ہی ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں زندہ رکھے ہوئے ہے۔

اور عزت کا سودا امیر کرتے ہیں

غریب نہیں کرتا۔ ہم چوری کر سکتے

ہیں، ڈاکہ ڈال سکتے ہیں ......

کملیشور

کملیشور

جارج پنجم کی ناک

یہ اس زمانے کی بات ہے۔ جب برطانیہ کی ملکہ الزبتھ دوم اپنے خاوند کے ہمراہ ہندستان آنے والی تھیں۔ اخباروں میں اُن کے چرچے ہو رہے تھے۔ لندن کے اخباروں کے ذریعہ روزانہ خبریں موصول ہو رہی تھیں کہ شاہی دورے کے لئے کیا کیا انتظامات ہو رہے ہیں ...... ملکہ الزبتھ کا درزی پریشان تھا کہ ہندوستان، پاکستان اور نیپال کے دورے پر وہ کب کیا پہنیں گی؟ ان کے سکریٹری اور شاید سراغ رساں ان کی آمد سے قبل ہی اس براعظم کا طوفانی دورہ کرنے والے تھے ...... آخر کوئی مذاق تو تھا نہیں۔ چونکہ زمانہ نیا تھا، لاؤ لشکر کے ساتھ نکلنے کے دن گزر چکے تھے۔ اس لئے فوٹو گرافروں کی ایک فوج تیار ہو رہی تھی۔

انگلینڈ کے اخباروں کے تراشے دوسرے ہی دن ہندوستانی اخباروں میں چپکے ہوئے نظر آئے تھے...... کہ ملکہ نے ہلکے نیلے رنگ کا سوٹ بنوایا ہے۔ جس کا ریشمی کپڑا ہندوستان سے منگوایا گیا ہے.... اور اس سوٹ پر تقریباً چار سو پونڈ لاگت آئی ہے......

ملکہ الزبتھ کی سوانح حیات شائع ہوئی۔ پرنس فلپ کے کارنامے شائع کئے گئے ...... اور تو اور ان کے ملازموں، باورچیوں، خانساماؤں اور محافظوں تک کے مکمل حالات زندگی نظر آئے...... شاہی محل میں پرورش پانے والے کتے کی تصویریں اخباروں میں چھاپی گئیں......

ہر سو بڑی دھوم تھی۔ بگل انگلینڈ میں بج رہا تھا۔ بازگشت ہندوستان میں سنائی دے رہی تھی۔

ان خبروں سے ہندوستان میں سنسنی پھیلی ہوئی تھی۔ راجدھانی میں تہلکہ مچا ہوا تھا جو ملکہ پانچ ہزار روپئے کی ریشمی سوٹ میں ملبوس ہو کر پالم کے ہوائی اڈے پر اترے گی، اس کے لئے کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی چاہیئے جس کے باورچی گزشتہ جنگ عظیم میں اپنی جان عزیز کو ہتھیلی پر رکھ کر لڑ چکے تھے۔ ان کی شان و شوکت کے کیا کہنے! اور وہی ملکہ دلّی آنے والی تھیں........

——— نئی دلّی نے اپنی جانب دیکھا اور اس کے منھ سے بے ساختہ نکل گیا۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

اور دیکھتے ہی دیکھتے نئی دلّی کا کایا پلٹ ہونے لگا۔

اور حیرت تو یہ تھی کہ کسی نے کسی سے کچھ نہیں کہا، کسی نے کسی کو نہیں دیکھا لیکن سڑکیں جوان ہوگئیں کھنڈر کے آثار مٹ گئے۔ عمارتوں نے نازنینوں کی مانند سنگار کیا......

لیکن ایک بڑا مسئلہ در پیش تھا ـــــــ وہ تھا جارج پنجم کی ناک کا .... نئی دلّی میں سب کچھ تھا، سب کچھ ہوتا جا رہا تھا، سب کچھ ہو جانے کی امید تھی۔ لیکن جارج پنجم کی ناک کا مسئلہ بڑا اہم تھا! نئی دلّی میں سب کچھ تھا...... صرف ناک نہیں تھی۔

اس ناک کی بھی ایک لمبی داستان ہے۔ کسی زمانے میں اس ناک کے لئے بہت ہنگامہ آرائی ہوئی تھی۔ تحریک چلی تھی۔ سیاسی جماعتوں نے ریزولیوشن پاس کئے تھے، چندہ فراہم کیا گیا تھا۔ کئی لیڈروں نے تقریریں بھی کی تھیں۔ گرما گرم مباحثے ہوئے تھے۔ اخباروں کے صفحات سیاہ ہوگئے تھے ـــــــ اور موضوع بحث یہ تھا کہ جارج پنجم کی ناک سنوار دی جائے یا ختم کر دی جائے۔ اور جیسا کہ ہر سیاسی تحریک میں ہوتا ہے، کچھ لوگ حمایتی تھے اور کچھ مخالف۔ لیکن زیادہ تر لوگ خاموش تھے۔ خاموش رہنے والوں کی قوت دونوں طرف تھی......

یہ تحریک چل رہی تھی۔ جارج پنجم کی ناک کی حفاظت کے لئے ہتھیار بند پہریدار تعینات کر دیئے گئے تھے۔ کسی کی جرأت نہ تھی کہ وہ ان کی ناک تک پہونچ سکے۔ ہندوستان میں جگہ جگہ ایسی ناکیں کھڑی تھیں۔ اور جہاں تک لوگوں کے ہاتھ پہونچ سکے۔ انہیں بڑے اہتمام کے ساتھ ہٹا کر عجائب خانوں میں پہنچا دیا گیا۔ شاہی لاٹوں کی ناکوں کے لئے گوریلا جنگ ہوتی رہی......

اسی زمانے میں یہ حادثہ پیش آیا تھا ـــــــ یکایک انڈیا گیٹ کے سامنے والے جارج پنجم کے مجسمے کی ناک غائب ہوگئی۔ ہتھیار بند پہرے دار اپنی جگہ تعینات رہے۔ گشت لگتے رہے اور مجسمے کی ناک چلی گئی۔

ملکہ آئے اور ناک نہ ہو!...... اچانک پریشانی بڑھی اور سرگرمی شروع ہوگئی۔ اور ملک کے بہی خواہوں کی ایک میٹنگ بلائی گئی اور مسئلہ پیش کیا گیا کہ آخر اس کا کیا حل ہو؟........ وہاں سب لوگ اس بات سے متفق تھے کہ اگر یہ ناک نہیں آئی تو ہماری ناک نہیں رہے گی!

اعلیٰ سطح پر مشاورتی جلسے ہوئے اور کافی دماغ سوزی کے بعد یہ طے کیا گیا کہ ہر حالت میں اس ناک کا ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ طے ہوتے ہی ایک سنگتراش کو فوراً دلّی میں حاضری کا حکم دیا گیا۔

سنگتراش یوں تو فنکار تھا۔ لیکن ذرا مالی طور پر پریشان تھا۔ اس نے آتے ہی حکام کے چہروں کی جانب دیکھا عجب وحشت سی ٹپک رہی تھی ان چہروں سے ـــــــ کچھ لٹکے ہوئے تھے، کچھ پژمردہ تھے، اور کچھ حواس باختہ تھے ان کی حالت دیکھ کر خستہ حال بت تراش کی آنکھوں میں آنسو آگئے...... اسی وقت ایک آواز سنائی دی "بت تراش جارج پنجم کی ناک لگانی ہے"،

بت تراش نے سنا اور جواب دیا "ناک لگ جائے گی۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ بت کب اور کہاں تیار ہوا تھا۔ اور اس کے لئے پتھر کہاں سے لایا گیا تھا؟"

حکام نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا، ایک نے دوسرے سے نگاہوں ہی نگاہوں میں کہا کہ یہ بتانے کی ذمہ داری تمہاری ہے! خیر مسئلہ طے ہوگیا ایک کلرک کو فون کیا گیا اور اس بات کی تحقیق کا کام اس کے

سپرد کر دیا گیا...... متعلقہ محکمے کی فائلوں کے پیٹ چیرے گئے۔ لیکن بے سود ...... کلرک نے کمیٹی کے سامنے کانپتے ہوئے بیان دیا۔ ! "سر! میری خطا معاف کی جائے۔ فائلیں سب کچھ ہضم کر چکی ہیں۔"

حکام کے چہروں پر پژمردگی چھا گئی۔ پھر ایک خاص کمیٹی تشکیل دی گئی اور اس کے ذمہ یہ کام سونپ دیا گیا کہ جس طرح بھی ہو، اس کا کام ہونا اشد ضروری ہے۔ اور اس ناک کا دارومدار آپ پر ہے۔

آخر بت تراش کو پھر بلایا گیا۔ اس نے مسئلہ حل کر دیا۔ وہ بولا "پتھر کی اصلیت کا صحیح پتہ نہیں چلتا تو اس میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے...... میں ہندوستان کے ہر پہاڑ پر جاؤں گا، اور ویسا ہی پتھر ڈھونڈھ نکالوں گا۔" کمیٹی کے ممبروں کی جان میں جان آئی۔ صدر نے چلتے چلتے بڑے فخریہ لہجے میں کہا اس ملک کی زمین میں ہر شے پوشیدہ ہے...... ضرورت ہے تلاش و جستجو کی ...... اور اس کے لئے محنت درکار ہے۔ اس محنت کا پھل ہمیں ملیگا آئندہ دور مسرت خیز ہو گا۔"

یہ مختصر سی تقریر فوراً اخباروں میں شائع ہو گئی۔

بت تراش ہندوستان کے کوہستانی علاقوں کے دورے پر نکل پڑا۔ لیکن کچھ دن بعد وہ ناکام لوٹ آیا۔ اسکے چہرے پر خجالت برس رہی تھی۔ اس نے بڑی مایوسی کے ساتھ اطلاع دی۔ "ہندوستان کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن اس قسم کا پتھر کہیں دستیاب نہیں ہوا یہ پتھر غیر ملکی ہے۔"

صدر نے طیش میں آکر کہا۔ "لعنت ہے آپ کی عقل پر۔ ہم لوگ غیر ممالک کی تمام چیزیں اپنا چکے ہیں...... دل دماغ، طور طریقہ، یہاں تک کہ رہن سہن بھی...... جب ہندوستان میں بال ڈانس تک مل جاتا ہے تو پھر پتھر کیوں نہیں مل سکتا؟"

بت تراش خاموش تھا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اس نے کہا۔ "میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ خبر اخبار والوں تک نہ پہنچنے پائے۔"

صدر کی آنکھوں میں بھی چمک آگئی۔ دربان کو حکم دیا گیا اور کمرے کے تمام دروازے بند کر دیئے گئے۔ تب بت تراش نے کہا "ملک میں اپنے لیڈروں کے بت بھی ہیں...... اگر اجازت ہو...... اگر آپ آپ لوگ مناسب سمجھیں...... تو میرا مطلب ہے...... تو...... جس کی ناک اس بت کی ناک پر بیٹھ جائے اسے اتار لیا جائے۔

سب نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا سب کی آنکھوں میں چند لمحے کی بدحواسی کے بعد خوشی تیرنے لگی۔ صدر نے آہستہ سے کہا، "لیکن بڑی ہوشیاری سے!"

اور بت تراش ملک کے دورے پر نکل پڑا۔ جارج پنجم کی گم شدہ ناک کا ناپ اس کے پاس محفوظ تھا۔ وہ دلی سے بمبئی پہنچا...... دادا بھائی نوروجی، گوکھلے، تلک، شیواجی، کاؤس جی جہانگیر...... وہ سب کی ناکوں کو ٹٹولنے کے بعد گجرات کی طرف چل پڑا...... گاندھی جی، سردار پٹیل، وٹھل بھائی پٹیل، مہادیو دیسائی کے بتوں کو پرکھا...... اور پھر بنگال کی جانب چل پڑا۔ گرودیو رابندر ناتھ، سبھاش چندر بوس، راجہ رام موہن رائے وغیرہ کو بھی دیکھا۔ پیمائش کی اور پھر بہار کی طرف روانہ ہو گیا۔ پھر وہ بہار ہوتا ہوا اتر پردیش پہنچا...... چندر شیکھر آزاد، بسمل، موتی لال نہرو،

مدن موہن مالویہ کے بتوں کے پاس گیا...... گھبراہٹ میں مدراس بھی جا پہنچا۔ ستیہ مورتی کو بھی دیکھا...... اور میسور، کیرالا وغیرہ صوبوں کا دورہ کرتا ہوا پنجاب گیا۔ لالہ لاجپت رائے اور بھگت سنگھ کے بتوں پر نظر ڈالی...... آخر دلی پہنچا۔ اور اپنی روداد بیان کی۔ ہم نے پورے ملک کے تمام بتوں کا معائنہ کر لیا۔ سب کی ناکوں کی پیمائش کی لیکن سب جارج پنجم کی ناک سے بڑی نکلیں......"

یہ سن کر سب کے اوسان خطا ہو گئے۔ آخر بت تراش نے ہی بات آگے بڑھائی "سنا تھا کہ بہار سکریٹریٹ کے سامنے سنہ ۴۲ء میں شہید ہونے والے تین بچوں کے بت نصب کئے گئے ہیں...... شاید بچوں کی ناک ہی بیٹھ جائے۔ یہ سوچ کر وہاں بھی گیا تھا...... لیکن...... ان کی ناکیں بھی اس سے کہیں بڑی نکلیں...... اب بتلائیے مجھے کیا حکم ہے؟......"

راجدھانی میں زور دار تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جارج پنجم کے بت کو رگڑ رگڑ کر نہلایا گیا۔ روغن کاری ہوئی۔ سب انتظامات مکمل تھے، صرف ناک نہیں تھی۔

بات پھر اعلیٰ حکام تک پہنچی۔ چہ میگوئیاں ہونے لگیں — اگر جارج پنجم کی ناک نہ فٹ کی گئی تو پھر ملکہ کا استقبال چہ معنی دارد؟ یہ تو اپنی ناک کٹوانے والی بات ہوئی۔

لیکن بت تراش صرف پیسے سے مجبور تھا...... یعنی وہ شکست تسلیم کرنے والا فنکار نہیں تھا۔ ایک حیرت انگیز خیال بجلی کی سی سرعت سے اس کے ذہن میں کوند گیا۔ اور اس نے اپنی پہلی شرط دہرائی۔ یعنی کمرے کے تمام دروازے پھر بند کر دیئے گئے۔ اور تب بت تراش نے اپنی نئی تجویز پیش کی "چونکہ ناک لگانا ایک دم ضروری ہے۔ اس لئے میری رائے ہے کہ چالیس کروڑ میں سے کوئی ایک زندہ ناک تراش کر لگا دی جائے۔"

بات ختم ہوتے ہی ہال پر مکمل سکوت طاری ہو گیا۔ چند لمحے کے بعد صدر نے سب کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ سب کو پریشان دیکھ بت تراش نے بڑی آہستگی سے کہا۔ "آپ لوگ پریشان نہ ہوں۔ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجئے...... ناک دینا میرا کام ہے۔ مجھے صرف اجازت چاہئے۔"

سرگوشی ہوئی اور آخر کار بت تراش کو اجازت دے دی گئی — اخباروں میں صرف اتنا شائع ہوا کہ ناک کا مسئلہ بحسن و خوبی انجام پا گیا ہے۔ اور راج پتھ پر انڈیا گیٹ کے پاس والے جارج پنجم کے مجسمہ کی ناک لگ رہی ہے۔

ناک لگنے سے قبل پھر ہتھیار بند پہرے دار تعینات کئے گئے۔ بت کے قریب کا حوض صاف کیا گیا۔ اس میں تازہ پانی ڈالا گیا۔ تاکہ جو زندہ ناک لگائی جانے والی تھی وہ خشک نہ ہونے پائے۔ اس بات کی خبر دوسروں کو نہیں تھی۔ یہ سب کارروائیاں در پردہ ہو رہی تھیں۔ ملکہ کی آمد کا دن نزدیک آتا جا رہا تھا۔ بت تراش اپنے تجویز کردہ حل سے خود بھی پریشان تھا۔ زندہ ناک کی فراہمی کے لئے اس نے کمیٹی سے مزید مدد طلب کی۔ اور وہ اسے دیدی گئی۔ لیکن اس ہدایت کے ساتھ کہ وقت مقررہ تک ناک ہر حال لگ جانی چاہئے۔

اور آخر وہ دن بھی آ پہنچا۔

کملیشور نمبر

جارج پنجم کی ناک لگ گئی۔

تمام اخباروں نے یہ خبر شائع کی کہ جارج پنجم کے بت میں زندہ ناک لگائی گئی ہے...... یعنی ایسی ناک جو قطعی پتھر کی نہیں لگتی۔

لیکن اس دن کے اخباروں میں ایک بات غور طلب تھی —— اس دن ملک میں کہیں بھی کسی افتتاحی جلسے کی خبر نہیں تھی، —— کسی نے کوئی فیتہ نہیں کاٹا تھا۔ کوئی عوامی جلسہ منعقد نہیں ہوا تھا —— کہیں کسی کا کوئی استقبال نہیں کیا گیا تھا —— کسی کو سپاس نامہ پیش کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی —— کسی ہوائی اڈے یا اسٹیشن پر استقبالیہ تقریب نہیں ہوئی تھی —— کسی کی تازہ تصویر نہیں چھپی تھی ——

تمام اخبارات خالی تھے۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا تھا؟

ضرورت تو صرف ایک ناک کی تھی —— اور وہ بھی بت کے لئے!!

"... کامیاب ہونے والے آدمی کے لئے بے حد ضروری ہوتی ہے، ایک خوبصورت بیوی، دولت، اونچی رشتہ داری... اور سب سے بڑی چیز جو چاہئے وہ یہ کہ، مقابلے کی اس دنیا میں کامیاب ہونے کے لئے اسے دوسروں کے جذبات کا کوئی خیال نہیں کرنا چاہئے۔ اسے خود غرض ہونا چاہئے۔ کامیاب ہونے والے آدمی کو دوسروں کو استعمال کرنا چاہئے... خود استعمال کی چیز نہیں بننا چاہئے...."

کملیشور

کملیشور

دلّی میں ایک موت

چاروں طرف کہرا طاری ہے۔ صبح کے نو بجے ہیں۔ لیکن پوری دلّی دھند میں لپٹی ہوئی ہے۔ سڑکیں نم ہیں، درخت بھیگے ہوئے ہیں، کچھ صاف نظر نہیں آتا۔ زندگی کی ہل چل کا پتہ آوازوں سے لگ رہا ہے۔ یہ آوازیں کانوں میں بس گئی ہیں۔ گھر کے ہر حصے سے آوازیں آ رہی ہیں۔ واسوانی کے نوکر نے حسبِ معمول اسٹو جلا لیا ہے۔ اس کی سنسناہٹ دیوار کے پار سے آ رہی ہے۔ بغل والے کمرے میں اتل موانی جوتے پر پالش کر رہا ہے۔ اوپر سردار جی مونچھوں پر فکسو لگا رہے ہیں۔ اُن کی کھڑکی کے پردے کے پار جلتا ہوا بلب بڑے موتی کی مانند چمک رہا ہے۔ سب دروازے بند ہیں۔ سب کھڑکیوں پہ پردے ہیں لیکن ہر حصے میں زندگی کی کھنک ہے۔ سہ منزلے پہ واسوانی نے باتھ روم کا دروازہ بند کیا ہے اور پائپ کھول لیا ہے . . . .

کہرے میں بسیں دوڑ رہی ہیں۔ جوں جوں کرتے بھاری ٹائروں کی آوازیں دور سے نزدیک آتی ہیں اور پھر دور ہو جاتی ہیں۔ موٹر رکشے بے تحاشہ بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ٹیکسی کا میٹر ابھی کسی نے ڈاؤن کیا ہے۔ پڑوس کے ڈاکٹر کے ہاں فون کی گھنٹی بج رہی ہے اور پھر کچھ اڑے کی گلی سے گنگناتی ہوئی کچھ لڑکیاں صبح کی شفٹ پر جا رہی ہیں۔

سخت سردی ہے۔ سڑکیں ٹھٹھری ہوئی ہیں اور کہرے کے بادلوں کو چیرتی ہوئی کاریں اور بسیں ہارن بجاتی ہوئی بھاگ رہی ہیں۔ سڑکوں اور پٹریوں پہ بھیڑ ہے لیکن کہرے میں لپٹا ہوا ہر آدمی بھٹکتی ہوئی روح کی طرح معلوم ہو رہا ہے۔

وہ روحیں خاموش دھند کے سمندر میں بڑھتی جا رہی ہیں . . . . بسوں میں بھیڑ ہے لوگ ٹھنڈی ٹھنڈی سیٹوں پر سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں اور کچھ لوگ درمیان ہی میں حضرت عیسٰی کی طرح صلیب پہ لٹکتے ہوئے ہیں۔ باہنیں پسارے ان کی ہتھیلیوں میں کیلیں نہیں۔ بس کی برفیلی چمکدار چھڑیں ہیں۔

اور ایسے میں دور سے ایک ارتھی سڑک پہ چلی آ رہی ہے۔

اس ارتھی کی خبر اخبار میں ہے۔ میں نے ابھی ابھی پڑھی ہے۔ اسی موت کی خبر ہو گی۔ اخبار میں چھپا ہے۔ آج رات قرول باغ کے مشہور اور مقبول بزنس میگنیٹ سیٹھ دیوان چند جی کی موت اِروِن ہسپتال میں ہو گئی۔ اُن کی لاش کوٹھی پہ لائی گئی ہے۔ کل صبح نو بجے اُن کی ارتھی آریہ سماج روڈ سے ہوتی ہوئی پنچ کوئیاں شمشان بھومی میں داہ سنسکار کے لئے جائے گی۔

اور اس وقت سڑک پہ آتی ہوئی یہ ارتھی انہیں کی ہو گی۔ کچھ لوگ ٹوپیاں لگائے اور مفلر باندھے ہوئے خاموشی سے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ اُن کی چال بہت دھیمی ہے۔ کچھ دکھائی پڑ رہا ہے۔ کچھ نہیں دکھائی پڑ رہا ہے لیکن مجھے یوں لگتا ہے کہ ارتھی کے پیچھے کچھ آدمی ہیں۔

میرے دروازے پہ دستک ہوتی ہے۔ میں اخبار ایک طرف رکھ کر دروازہ کھولتا ہوں۔ اُتل موانی سامنے کھڑا ہے۔

"یار، کیا مصیبت ہے آج کوئی آئرن کرنے والا بھی نہیں آیا۔ ذرا اپنا آئرن دینا۔" اتُل کہتا ہے تو مجھے تسلی ہوتی ہے، نہیں تو اُس کا چہرہ دیکھتے ہی مجھے خدشہ ہوا تھا کہ کہیں میّت کے ساتھ جانے کا وبال نہ کھڑا کر دے۔ میں اُس کو فوراً آئرن دے دیتا ہوں، اور بے فکر ہو جاتا ہوں کہ اتُل اپنی پینٹ پر لوہا کرے گا اور سفارت خانوں کے چکر کاٹنے نکل جائے گا۔

جب سے میں نے اخبار میں سیٹھ دیوان چند کی موت کی خبر پڑھی تھی مجھے ہر لمحہ یہی اندیشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں کوئی آ کر اس سردی میں میّت کے ساتھ جانے کی بات نہ کہہ دے۔ بلڈنگ کے سبھی لوگ اُن سے واقف تھے اور سبھی شریف و دنیا دار آدمی تھے۔

تبھی سردار جی کا نوکر نیچے سے بھر بھر آتا ہوا آیا اور دروازہ کھول کر باہر جانے لگا۔ اپنے دل کو مزید سہارا دینے کے لئے میں نے پکارا۔

"دھرما! کہاں جا رہا ہے؟"

"سردار جی کے لئے مکھن لینے۔" اُس نے وہیں سے جواب دیا تو لگے ہاتھوں لپک کر میں نے بھی اپنی سگریٹ منگوانے کے لئے اس کو پیسے تھما دیئے۔

سردار جی ناشتے کے لئے مکھن منگوا رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی میّت میں شریک نہیں ہو رہے ہیں مجھے کچھ اور راحت ملی۔ جب اتُل موانی اور سردار جی کا ارادہ میّت کے ساتھ جانے کا نہیں ہے تو میرا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ ان دونوں کا یا واسوانی خاندان کا ہی سیٹھ دیوان چند کے ہاں زیادہ آنا جانا تھا۔ میری تو چار پانچ بار کی ملاقات تھی۔ اگر یہ لوگ ہی شامل نہیں ہو رہے ہیں تو میرا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔

سامنے بالکونی پہ مجھے مسز واسوانی دکھائی پڑتی ہیں۔ اُن کے خوبصورت چہرے پر عجیب سی سفیدی ہے اور ہونٹوں پہ گذشتہ شام کی لپ اسٹک کی ہلکی سرخی اب بھی موجود ہے۔ گاؤن پہنے ہوئے ہی وہ نکلی ہیں اور اپنا جوڑا باندھ رہی ہیں۔ اُن کی آواز سنائی پڑتی ہے۔

"ڈارلنگ ذرا مجھے پیسٹ دینا پلیز۔"

مجھے اور راحت ملتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مسٹر واسوانی بھی میّت میں شریک نہیں ہو رہے ہیں۔

دور آریہ سماج روڈ پر وہ ارتھی آہستہ آہستہ بڑھتی آ رہی ہے .....

اتُل موانی مجھے آئرن لوٹانے آتا ہے۔ میں آئرن لے کر دروازہ بند کر لینا چاہتا ہوں لیکن وہ اندر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے۔ "تم نے سنا۔ دیوان چند جی کی کل موت ہو گئی؟"

"میں نے ابھی اخبار میں پڑھا ہے۔" میں سیدھا سا جواب دیتا ہوں تاکہ موت کی بات آگے نہ بڑھے۔ اتُل موانی کے چہرے پر سفیدی چمک رہی ہے، وہ شیو کر چکا ہے۔ وہ آگے کہتا ہے۔ "بڑے بھلے آدمی تھے دیوان چند۔"

یہ سن کر مجھے لگتا ہے کہ اگر بات آگے بڑھ گئی تو ابھی میّت میں شریک ہونے کی اخلاقی ذمہ داری ہو جائے گی۔ لہٰذا میں کہتا ہوں "تمہارے اُس کام کا کیا ہوا؟"

"بس مشین آنے بھر کی دیر ہے۔ آتے ہی اپنا کمیشن تو کھڑا ہو جائے گا۔ یہ کمیشن کا کام بھی بڑا بیہودہ ہے لیکن کیا کیا جائے۔ آٹھ دس مشینیں میرے تھرو نکل گئیں تو اپنا بزنس شروع کر دوں گا۔" اتُل موانی کہہ رہا ہے۔

"بھئی شروع شروع میں جب میں یہاں آیا تھا تو دیوان چند جی نے بڑی مدد کی تھی میری۔ انہیں کی وجہ سے کچھ کام دھام مل گیا تھا۔ لوگ بہت مانتے تھے انہیں۔"

پھر دیوان چند کا نام سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ تبھی کھڑکی سے سردار جی سر نکال کر پوچھنے لگتے ہیں۔

"مسٹر موانی! کتنے بجے چلنا ہے۔؟"

"وقت تو نو بجے کا تھا۔ شاید کہرے اور سردی کی وجہ سے کچھ دیر ہو جائے" وہ کہہ رہا ہے اور مجھے لگتا ہے کہ یہ بات میت کے متعلق ہی ہے۔

سردار جی کا نوکر دھرما مجھے سگریٹ دے کر جا چکا ہے اور اوپر میز پر چائے لگا رہا ہے۔ تبھی مسز واسوانی کی آواز سنائی پڑتی ہے: "میرے خیال سے پرمیلا وہاں ضرور پہنچے گی۔ کیوں ڈارلنگ؟"

"پہنچنا تو چاہیے۔ تم ذرا جلدی سے تیار ہو جاؤ۔" کہتے ہوئے مسٹر واسوانی بالکونی سے گذر گئے ہیں۔

اتُل مجھ سے پوچھ رہا ہے "شام کو کافی ہاؤس کی طرف آنا ہوگا؟"

"شاید چلا آؤں" کہتے ہوئے میں کمبل لپیٹ لیتا ہوں اور وہ واپس اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے۔ آدھ منٹ بعد ہی اس کی آواز ابھرتی ہے۔ "کیوں۔ بجلی آ رہی ہے؟"

میں جواب دے دیتا ہوں "ہاں آ رہی ہے" میں جانتا ہوں کہ وہ الیکٹرک راڈ سے پانی گرم کر رہا ہے۔ اس لئے اس نے یہ پوچھا ہے۔

"پالش! بوٹ پالش" والا لڑکا ہر روز کی مانند ادب سے آواز لگاتا ہے اور سردار جی اس کو اوپر پکار لیتے ہیں۔ لڑکا بیٹھ کر پالش کرنے لگتا ہے اور وہ اپنے نوکر کو ہدایتیں دے رہے ہیں۔ "کھانا ٹھیک ایک بجے لے کر آنا... پاپڑ بھون کر لانا اور سلاد بھی بنا لینا...."

میں جانتا ہوں، سردار جی کا نوکر پاجی ہے، وہ وقت سے کبھی کھانا نہیں پہنچاتا، اور نہ ان کی طبیعت کی چیزیں ہی پکاتا ہے۔

باہر سڑک پر کہرا اب بھی گہرا ہے۔ سورج کی کرنوں کا پتہ نہیں ہے۔ گلچھے چھولے والے وشنو نے اپنی ریڑھی لا کر کھڑی کر لی ہے۔ حسب معمول وہ پلیٹیں بجا رہا ہے۔ اُن کی کھنکھناہٹ کی آواز آ رہی ہے۔

سات نمبر کی بس چھوٹ رہی ہے۔ سولیوں پر لٹکے بہت سے عیسے اس میں چلے جا رہے ہیں۔ اور کیو میں کھڑے دوسرے لوگوں کو کنڈکٹر پیشگی ٹکٹ بانٹ رہا ہے۔ ہر بار جب بھی وہ پیسے واپس کرتا ہے تو ریزگاری کی کھنک یہاں تک آتی ہے۔ دھند میں لپٹی روحوں کے درمیان کالی وردی والا کنڈکٹر شیطان کی طرح لگ رہا ہے۔

اور ارتھی اب کچھ اور قریب آ گئی ہے۔

"نیلی ساڑی پہن لوں" مسز واسوانی پوچھ رہی ہیں۔

"واسوانی کے جواب دینے کی گھٹی گھٹی آواز سے لگ رہا ہے کہ وہ ٹائی کی ناٹ درست کر رہا ہے۔

سردار جی کے نوکر نے ان کا سوٹ برش سے صاف کر کے ہینگر پر لٹکا دیا ہے اور سردار جی شیشے کے سامنے کھڑے پگڑی باندھ رہے ہیں۔

اتُل موانی پھر میرے سامنے سے نکلا ہے۔ پورٹ فولیو اس کے ہاتھ میں ہے۔ پچھلے ماہ بنوایا ہوا سوٹ اس نے پہن رکھا ہے اُس کے چہرے پر تازگی ہے اور جوتوں پہ چمک۔ آتے ہی وہ مجھ سے پوچھتا ہے۔ "تم نہیں چل رہے ہو؟" اور میں جب تک پوچھوں کہ کہاں چلنے کو وہ پوچھ رہا ہے کہ وہ سردار جی کو آواز لگاتا ہے "آیئے سردار جی! اب دیر ہو رہی ہے۔ دس بج چکا ہے۔"

دو منٹ بعد ہی سردار جی تیار ہو کر نیچے آتے ہیں کہ واسوانی اوپر سے موانی کا سوٹ دیکھ کر پوچھتا ہے: "یہ سوٹ

کدھر سلوایا ہے؟"

"ادھر خان مارکیٹ میں!"

"بہت اچھا سلا ہے۔ ٹیلر کا پتہ ہمیں بھی دینا" پھر وہ اپنی مسز کو پکارتا ہے "اب آجاؤ ڈیرا!... اچھا میں نیچے کھڑا ہوں۔ تم آؤ" کہتا ہوا وہ بھی موانی اور سردار جی کے پاس آجاتا ہے اور سوٹ کو ہاتھ لگاتے ہوئے پوچھتا ہے

"لائننگ انڈین ہے؟"

"انگلش"

"بہت اچھی فٹنگ ہے" کہتے ہوئے وہ ٹیلر کا پتہ ڈائری میں نوٹ کرتا ہے۔ مسز واسوانی بالکونی پر دکھائی پڑتی ہے۔ نم اور سرد صبح میں اس کی خوبصورتی اور بھی نکھر آئی ہے۔ سردار جی آہستہ سے موانی کو آنکھ کا اشارہ کر کے سیٹی بجانے لگتے ہیں۔

ارتھی اب سڑک پر ٹھیک میرے کمرے کے نیچے ہے۔ اس کے ساتھ چند آدمی ہیں۔ ایک دو کاریں بھی ہیں جو دھیرے دھیرے رینگ رہی ہیں۔ لوگ باتوں میں مشغول ہیں۔

مسز واسوانی جوڑے میں پھول لگاتے ہوئے نیچے اترتی ہیں تو سردار جی اپنی جیب کا رومال ٹھیک لگاتے ہیں اور اس سے پیشتر کہ وہ لوگ باہر جائیں۔ واسوانی مجھ سے پوچھتا ہے۔ "آپ نہیں چل رہے ہیں؟"

"آپ چلیے۔ میں آرہا ہوں۔" میں کہتا ہوں مگر دوسرے ہی لمحے مجھے لگتا ہے کہ اس نے مجھ سے کہاں چلنے کو کہا ہے؟ میں ابھی کھڑا سوچ ہی رہا ہوں کہ وہ چاروں گھر کے باہر ہو جاتے ہیں۔

ارتھی کچھ اور آگے نکل گئی ہے۔ ایک کار پیچھے سے آتی ہے اور ارتھی کے قریب آہستہ ہو جاتی ہے۔ چلانے والے صاحب میت میں پیدل چلنے والے آدمی سے کچھ بات کرتے ہیں اور پھر کار میت سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ ارتھی کے ساتھ پیچھے چلنے والی دونوں کاریں بھی اسی کار کے پیچھے سرسراتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔

مسز واسوانی اور وہ تینوں لوگ ٹیکسی اسٹینڈ کی جانب جا رہے ہیں۔ میں انھیں دیکھتا رہتا ہوں۔ مسز واسوانی نے فر کا کالر ڈال رکھا ہے اور شاید سردار جی اپنے چمڑے کے دستانے انہیں دے رہے ہیں یا دکھا رہے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور آگے بڑھ کر دروازہ کھولتا ہے اور وہ چاروں ٹیکسی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ اب ٹیکسی ادھر ہی آرہی ہے اور اس میں سے کھِل کھِلانے کی آواز مجھے سنائی دے رہی ہے واسوانی آگے سڑک پر جاتی ارتھی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ڈرائیور کو کچھ بتا رہا ہے۔

میں خاموش کھڑا سب دیکھ رہا ہوں اور اب نہ جانے کیوں مجھے دل میں لگ رہا ہے کہ دلیان چند کی میت میں کم از کم مجھے تو شامل ہو ہی جانا چاہیئے تھا۔ اُن کے لڑکے سے میری خاصی جان پہچان ہے اور ایسے موقعہ پہ تو دشمن کا ساتھ بھی دیا جاتا ہے۔ سردی کی وجہ سے میری ہمت جواب دے رہی ہے مگر دل میں کہیں شریک ہونے کی بات اندر ہی اندر سلگ رہی ہے۔

اُن چاروں کی ٹیکسی ارتھی کے قریب آہستہ ہوتی ہے۔ موانی گردن نکال کر کچھ کہتا ہے۔ اور داہنے سے راستہ کاٹتے ہوئے ٹیکسی آگے بڑھ جاتی ہے۔

مجھے دھچکا سا لگتا ہے اور میں اوورکوٹ پہن کر چپلیں ڈال کر نیچے اترتا ہوں۔ مجھے میرے قدم خود بخود ارتھی کے قریب پہنچا دیتے ہیں۔ اور میں خاموش اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگتا ہوں۔ چار آدمی کندھا دیے ہوئے ہیں۔ اور سات آدمی ساتھ چل رہے ہیں۔ ساتواں میں ہوں۔ اور سوچ رہا ہوں کہ آدمی کے مرتے ہی کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔

پچھلے سال ہی دلیوان چند نے اپنی لڑکی کی شادی کی تھی تو ہزاروں کی بھیڑ تھی۔ کوٹھی کے باہر کاروں کی لائن لگی ہوئی تھی۔

میں ارتھی کے ساتھ ساتھ لنک روڈ پر پہنچ چکا ہوں۔ اگلے موڑ پر ہی نیگم بودھ شمشان بھومی ہے۔

اور جیسے ہی ارتھی موڑ پر گھومتی ہے لوگوں کی بھیڑ اور کاروں کی قطار مجھے دکھائی دینے لگتی ہے۔ کچھ اسکوٹر بھی کھڑے ہیں۔ عورتوں کی بھیڑ ایک طرف کھڑی ہے۔ اُن کی باتوں کی اونچی آوازیں سنائی پڑ رہی ہیں۔ اُن کے کھڑے ہونے میں وہی لچک ہے جو کناٹ پلیس میں نظر آتی ہے۔ سب کے جوڑوں کی اسٹائل الگ الگ ہے۔ مردوں کی بھیڑ سے سگریٹ کا دھواں اٹھ اٹھ کر کہرے میں گھلا جا رہا ہے اور گفتگو کرتی ہوئی عورتوں کے لال لال لب اور سفید دانت چمک رہے ہیں اور اُن کی آنکھوں میں ایک غرور ہے۔

ارتھی کو باہر بنے چبوترے پر رکھ دیا گیا ہے۔ اب خاموشی طاری ہے۔ ادھر اُدھر بکھری ہوئی بھیڑ نعش کے ارد گرد جمع ہو گئی ہے اور کاروں کے شوفر ہاتھوں میں پھولوں کے گلدستے اور مالائیں لئے اپنی مالکوں کی نظروں کے منتظر ہیں۔

میری نظر واسوانی پر پڑتی ہے وہ اپنی مسز کو آنکھ کے اشارے سے میت کے قریب جانے کو کہہ رہا ہے اور وہ ہیں کہ ایک عورت کے ساتھ کھڑی بات کر رہی ہیں۔ سردار جی اور اتّل موانی بھی وہیں کھڑے ہیں۔

نعش کا منہ کھول دیا گیا ہے اور اب عورتیں پھول مالائیں اس کے ارد گرد رکھتی جا رہی ہیں۔ شوفر فارغ ہو کر اب کاروں کے پاس کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔

ایک خاتون مالا رکھ کر کوٹ کی جیب سے رومال نکالتی ہیں اور آنکھوں پر رکھ کر ناک سُڑ سُڑانے لگتی ہیں اور پیچھے ہٹ آتی ہیں۔

اور اب سب عورتوں نے رومال نکال لئے ہیں اور ان کی ناکوں کی آوازیں آ رہی ہیں۔

کچھ آدمیوں نے اگربتیاں جلا کر نعش کے سرہانے رکھ دی ہیں۔ وہ بے حس و حرکت کھڑے ہیں۔

آوازوں سے لگ رہا ہے کہ عورتوں کے دل کو زیادہ صدمہ پہنچا ہے۔

اتّل موانی اپنے پورٹ فولیو سے کوئی کاغذ نکال کر واسوانی کو دکھا رہا ہے۔ میرے خیال میں وہ پاسپورٹ کا فارم ہے۔

اب لاش کو اندر شمشان بھومی میں لے جایا جا رہا ہے۔ بھیڑ پھاٹک کے باہر کھڑی دیکھ رہی ہے۔

شوفروں نے سگریٹیں یا تو پی لی ہیں یا بجھا دی ہیں اور وہ اپنی اپنی کاروں کے پاس تعینات ہیں۔

نعش اب اندر پہنچ چکی ہے۔

ماتم پُرسی کے لئے آئے ہوئے آدمی اور عورتیں اب باہر کی طرف لوٹ رہے ہیں۔

کاروں کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ اسکوٹر اسٹارٹ ہو رہے ہیں اور کچھ لوگ ریڈنگ روڈ بس اسٹاپ کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

کہرا اب بھی گہرا ہے۔ سڑک سے بسیں گزر رہی ہیں اور مسز واسوانی کہہ رہی ہیں۔

"پرمیلا نے شام کو بلایا ہے، چلو گے نا۔ ڈیر؟ کار آ جائے گی۔ ٹھیک ہے نا؟"

واسوانی اثبات میں سر ہلا رہا ہے۔ کاروں میں جاتی ہوئی عورتیں مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے وداع ہو رہی ہیں اور بائی بائی کی چند آوازیں آ رہی ہیں۔ کاریں اسٹارٹ ہو کر جا رہی ہیں۔

اتّل موانی اور سردار جی بھی ریڈنگ روڈ کی طرف بڑھ گئے ہیں اور میں کھڑا سوچ رہا ہوں کہ میں بھی تیار ہو کر آیا ہوتا تو یہیں سے سیدھا کام پر نکل جاتا لیکن اب تو ساڑھے گیارہ بج چکے ہیں۔

چتا میں آگ لگا دی گئی ہے اور چار پانچ آدمی درخت کے نیچے پڑی بنچ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میری طرح وہ بھی یوں ہی چلے آئے ہیں۔ انہوں نے ضرور چھٹی لے رکھی ہوگی۔ ورنہ وہ بھی تیار ہو کر آتے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ گھر جا کر تیار ہو کر دفتر جاؤں یا اب ایک موت کا بہانہ بنا کر آج چھٹی لے لوں، آخر موت تو ہوئی ہی ہے اور میں میت میں شریک بھی ہوا ہوں۔

...... آج کا اخلاقی بحران صرف اتنا نہیں ہے
کہ کچھ لوگ بے ایمان ہو گئے ہیں، بلکہ اصل اخلاقی بحران یہ ہے
کہ جمہوریت کے تحت جن اداروں اور انتظاموں
کو جنم دیا گیا ہے۔ وہ بے ایمان ہو گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے
ان سیاسی اور معاشی اداروں پر سے آدمی کا
یقین جاتا رہا ہے۔ بے ایمان آدمیوں نے پہلے ان اداروں کو بدنام
کیا اور اب یہ ادارے بے ایمان لوگوں کو پیدا
کرنے والی مشینوں میں تبدیل ہو گئے ہیں۔

اس لئے نئی اخلاقی قدروں کی ضرورت ہمیں ہر
شعبہ میں ہے۔ سماجی بے انصافی کی جتنی "شاندار" تاریخ اس
بھارت نام کے دیش کے پاس ہے اتنی کسی اور
کی نہیں ہے ...... کملیشور

کملیشور

لڑائی

ڈر تو خیر نہیں لگ رہا تھا لیکن میں بدحواس ضرور تھا۔ کچھ پتہ بھی نہیں تھا کہ کہاں جانا تھا۔ میں تنہا نہیں تھا۔ دو ڈاکٹر اور تھے۔ ہمیں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ پٹھان کوٹ رپورٹ کرو۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میری رجمنٹ کہاں لڑ رہی تھی۔ ہم تینوں ہی نئے تھے۔

پٹھان کوٹ اسٹیشن پر بہت بھیڑ تھی۔ جگہ جگہ چائے ناشتہ کا انتظام تھا۔ کھانا بھی مل رہا تھا۔ تمام والنٹیر گشت کر رہے تھے۔ اس وقت اسٹیشن اور اسٹیشن کے باہر کا علاقہ ٹرانزٹ کیمپ کی طرح تھا۔ ہزاروں فوجی ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ سیدھے بارکوں سے آئے تھے اور کچھ چھٹیاں گزار کر۔

خیر مجھے تو اتنا خطرہ نہیں تھا۔ ایک طرح سے تھا بھی۔ ڈاکٹر ہونے کے ناتے مجھے فیلڈ کمانڈنگ پوسٹ کے ساتھ رہنا پڑتا تھا۔ یہ کمانڈنگ پوسٹ شکست و فتح کے ساتھ آگے پیچھے ہوتی رہتی ہے۔

زخمیوں کی دیکھ بھال تو کرنی ہی پڑتی ہے۔ لیکن گھائلوں کی تعداد کا ایک اوسط اندازہ ہمیں رہتا ہے۔ ہم ویسی ہی تیاری کرتے ہیں۔ یہ اندازہ لگانا کوئی بہت مشکل کام نہیں ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے ہمیں بہت سے آنکڑے دئے ہیں۔ اگر ہمیں حملہ کرنا ہے تو اندازاً تعداد کم ہوتی ہے۔ اگر دشمن حملہ کرتا ہے تو زیادہ ہوتی ہے۔ موٹی سی بات ہے اگر ہمیں پتہ ہے کہ دشمن حملہ کرنے والا ہے تو تعداد کم ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ دشمن زیادہ بزدل ہوتا ہے۔ دشمن یعنی حملہ آور، وہ چاہے ہم ہوں یا وہ۔ ایک دفعہ لڑائی شروع ہو جانے پر سب گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ ہم دونوں ہی حملہ آور ہو جاتے ہیں۔

لیکن پٹھان کوٹ اسٹیشن پر جو بھی تھا، ڈرا ہوا نہیں تھا۔ بدحواس ضرور تھا۔ کسی کے پاس وقت نہیں تھا۔ کیونکہ کچھ پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ دو تین ٹولیاں بہت ہی اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا سیالکوٹ والے مورچے پر جانا ہے۔ زیادہ تر فوجی نہانے دھونے میں لگے تھے۔ کیا معلوم کتنے دن بدن صاف کرنے کا موقعہ نہ ملے۔

اگر یہ نہ معلوم ہو کہ کہاں جانا ہے تو بڑی الجھن ہوتی ہے۔ کسی اور کام کے لئے وقت ہی نہیں ملتا۔ سارا وقت اسی الجھن میں جاتا ہے۔

ہم تینوں ڈاکٹروں کو بھی پتہ نہیں چل رہا تھا کہ ہمیں کہاں جانا ہے۔ کہ ہماری رجمنٹیں کہاں کہاں پر ہے۔ اور ہم ان تک کیسے پہنچیں گے

اسی پریشانی میں تھا کہ ایک لڑکی آئی تھی۔ اسٹیشن پر لڑکیوں کا ایک جھنڈ تھا۔ سبھی کے ہاتھوں میں

ان لینڈ اور پوسٹ کارڈ تھے۔ وہ گھوم گھوم کر فوجیوں سے پوچھ رہی تھیں ۔" آپ کو گھر کوئی خبر بھیجنی ہے؟ ہمیں پتہ بتا دیجئے ..... ہم بھیج دیں گے ۔

اس لڑکی نے آکر مجھ سے بھی وہی پوچھا۔ میں نے کہہ دیا۔ جی نہیں۔ میں ابھی ہی چھٹیوں سے لوٹ رہا ہوں۔ وہ چلی گئی۔ اُس کا پوچھنا مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے دل میں بڑا خوبصورت سا خیال آیا تھا۔ لڑائی سے لوٹنے کے بعد اگر اس کا باپ رشتہ طے کرنے آیا تو ضرور منظور کر لوں گا۔ پھر ہنسی آئی۔ کہاں کی یہ اور کہاں کا اس کا باپ اور کہاں کا میں۔ کون ملتا ہے۔ لڑائی شروع ہوتے ہی رشتہ طے کرانے والے لوگ ختم گئے تھے۔ مجھے برا لگ رہا تھا۔ یہ بھی کیا بات ہوئی۔ لیکن دنیا زیادہ سمجھدار ہے۔ ہماری ہونے والی موت کی بات انہیں زیادہ سمجھدار بنا دیتی ہے۔ اور ہمیں چھوٹا۔ یکایک ہم کچھ نہیں رہ جاتے ہیں۔ اُن کے لئے بے کار ہو جاتے ہیں۔

وہ لڑکی اِدھر اُدھر جاتی اور ایک آدھ چھٹیاں لکھتی دکھائی دیتی رہی۔ بار بار وہ پھر میرے پاس سے گزری تو میں نے اسے روکا۔

"آپ کو امید ہے کہ میں لوٹ کر آؤں گا۔"

وہ تھوڑا مسکرائی ——"ہاں"

تو یہ لکھ دیجئے۔

"اچھا۔ پتہ؟"

پتہ میں نے بتا دیا۔ پتہ بتاتے ہی بات کی اہمیت ختم ہو گئی۔ لوٹ کر آنا، نہ آنا بے مطلب سا ہو گیا۔ لیکن یوں ہی مر جانے کے لئے میرے پاس کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔

یوں بھی لڑائی میں اوسطاً تیس ہزار گولیوں پر ایک آدمی مرتا ہے۔ حملہ ہو جائے تو موت اور گھائلوں کی در تیس[۳۰] فی صد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ہم حملہ کریں تو یہ در اور کم ہو جاتی ہے۔ اسی حساب سے ہم فیلڈ پر انتظام رکھتے ہیں۔ حملہ کرنے یا حملہ ہونے کی تیاری کا ہمیں پتہ رہتا ہے۔ فیلڈ کمانڈنگ پوسٹ سے ہم زیادہ دور نہیں ہوتے۔ ان میں ہی ہوتے ہیں۔ لیکن سیف جگہ پر ہوتے ہیں۔

آخر ہمیں جموں بھیج دیا گیا اور جموں سے ہم تینوں الگ الگ ہو گئے۔ میں اپنی رجمنٹ میں چلا گیا۔ لڑائی چل رہی تھی۔ جب آدمی لڑائی کے ٹھیک بیچوں بیچ پہنچ جاتا ہے تو بہت سی باتیں دل ہی میں طے ہو جاتی ہیں۔ اس وقت صرف ضروری باتوں سے تعلق رہ جاتا ہے۔ یعنی چوکنا رہنا، مارنا یا مرنا ... اور اپنا کام کرتے رہنا۔ لڑائی کے ماحول میں آدمی وابستہ ہو جاتا ہے۔ سنسناتی ہوئی گولیاں، دھماکے، دھواں، آگ، اور دھما کے سب ٹھیک لگنے لگتے ہیں۔ بہت سی باتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ شیلنگ شروع ہوئی اور پہلا گولہ نزدیک گرا تو ڈائرکشن کا پتہ چل جاتا ہے۔ پہلے گولے پھر آگے جاتے ہیں۔ گرتے ہیں۔

خیر یہ سب چلتا رہتا ہے۔ لیکن میں اصل میں کچھ اور ہی بتانا چاہتا تھا۔ نہیں نہیں، اس لڑکی کے بارے میں نہیں۔ وہ تو پھر ملی ہی نہیں۔ ہاں! مورچے پر جب مرے ہوئے فوجیوں کو دیکھتا تھا تو ضرور اس لڑکی کا خیال آتا تھا۔ شاید اس سپاہی کا خط اس نے لکھا ہو۔ اب وہ کیا جواب دے گی؟ اس لڑکی نے یہ ذمہ داری کیوں لے لی تھی؟

پتہ نہیں کیوں، جب کوئی آدمی اپنے کو ذمہ دار ماننے لگتا ہے تو مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں درمیان کا ہوں۔ مجھ سے بڑا ایک اور چھوٹا ایک بھائی اور ہے۔ وہ عوام کا کام کرتے ہیں۔ بڑے بھائی کی کافی عزت ہے۔ وہ ایک سرکار میں کچھ دنوں کے لئے وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ چھوٹا بھائی انہیں کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ وہ کیسے اس طرف چلے گئے، مجھے خاص معلوم نہیں۔ اصل میں دونوں بیکار رہے تھے۔ دونوں میں ایک خاصیت تھی۔ ان میں کوئی چھوٹا یا بڑا نہیں لگتا تھا۔ بڑے سے بڑے کو وہ تم یا تو کہہ کر پکار لیتے تھے۔ اور انجان سے انجان کو بھی دوست مان لیتے تھے۔

صبح کپڑے پہن کر وہ سڑک پر آکر کھڑے ہو جاتے تھے۔ جو اُن سے پوچھ لیتا تھا — کیا ہو رہا ہے؟ بس اسی آدمی کے ساتھ ان کا پورا دن کٹ جاتا تھا۔ یہ پرانے دنوں کی بات ہے۔ آہستہ آہستہ وہ شہر میں مشہور ہو گئے۔ اور انہوں نے بہت سی ذمہ داریاں اٹھالیں۔ ہمارے گھر کا رتبہ بڑھ گیا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو شاید مجھے میڈیکل میں داخلہ نہ ملتا۔ بہر حال، لڑائی پر ہوتے مجھے دیش کا خیال بھی آتا تھا۔ گھائلوں کی مرہم پٹی کرتے وقت بڑا فخر ہوتا تھا۔ لگتا تھا ہم بڑا کام کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی ایک آدھ دشمن سپاہیوں کی مرہم پٹی بھی کرنی پڑتی تھی — دو کو ہمارا باورچی اٹھا کر لایا تھا۔

جن دنوں میں لڑائی پر تھا۔ ان ہی دنوں کی بات ہے ہمارے شہر میں ایک سرکاری خزانہ تھا۔ ایسا خزانہ سبھی شہروں میں ہوتا ہے۔ اس سرکاری خزانے میں محصول، ٹیکس اور آمدنی کا پیسہ جمع ہوتا تھا۔ ہمارے شہر کی منڈی بہت بڑی ہے۔ علاقے میں مونگ پھلی، سرسوں، تلہن، گیہوں کی پیداوار بہت ہوتی ہے۔ گنا بھی ہوتا ہے۔ موسم کی سبزیاں اور پھل بھی بہت ہوتے ہیں۔ شہر کے چاروں طرف یعنی شہر میں آنے والی ہر سڑک پر چنگی گھر ہے۔ جہاں فروخت کے لیے منڈی میں جانے والے سامان پر محصول لگتا ہے۔

سڑکوں پر چلنے کے لئے گھوڑا گاڑیوں، یکوں، تانگے، بیل گاڑیوں، ٹھیلوں کو بھی لائسنس لینا پڑتا ہے۔ سائکل والے بھی لائسنس لیتے ہیں۔ دکاندار دکان کا ٹیکس بھرتے ہیں۔ خوانچے والے بھی ٹیکس دیتے ہیں۔ ندی اور تالابوں سے مچھلی لانے والے بھی محصول چکاتے ہیں۔ جو لوگ شہر میں اپنے مکانوں میں رہتے ہیں۔ وہ جائیداد اور حیثیت پر ٹیکس دیتے ہیں۔

یہ سب پیسہ اسی سرکاری خزانے میں جمع ہوتا ہے۔ خزانہ جس جگہ ہے وہ بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں وہ سول لائنس کہلاتی تھی۔

شام کو شہر بھر کا پیسہ جمع ہو کر اسی خزانے میں جاتا ہے۔ ایک تانگہ ڈاک کے تھیلے اور لوہے کے صندوق لے کر چلتا ہے۔ اس پر بندوق لئے دو سنتری بیٹھے ہوتے ہیں اور ڈاک گھر کا ایک بابو۔ تانگہ پہلے خزانے جاتا ہے۔ وہاں لوہے کے صندوق اتار لئے جاتے ہیں۔ پھر وہ بڑے ڈاک خانے میں تھیلے اتار کر لوٹ جاتا ہے۔ تب تک رات ہونے لگتی ہے۔

خزانہ شہر سے دور ہے۔ وہاں سنتری رہتے ہیں اور رات کو جب جیل کا گھنٹہ وقت بتانے کے لئے بجتا ہے تب خزانے کا سنتری بھی گھنٹہ ٹھونک دیتا ہے اور جھپکی لینے لگتا ہے۔

بڑے بھائی جب تعمیرات عامہ کے وزیر تھے، تب انہوں نے خزانے کو پختہ کرانے کی تجویز رکھی تھی۔ اس تجویز کا خوش آمدید منتری منڈل نے کیا تھا۔

راتوں رات تب چھوٹے بھائی کو ٹھیکیدار بننا پڑا تھا۔ فارم چھپ گئے تھے۔ اور وہ خزانے کی تعمیر کا ٹھیکہ لینے کے لئے اوپری اور دکھاوے کی دوڑ بھاگ کرنے لگا تھا۔

خزانے کی عمارت کو دوبارہ بنانے اور اسے پختہ کرنے کا ٹھیکہ آخر میں اسے ہی ملا تھا۔

میرا چھوٹا بھائی بہت تیز اور سمجھدار آدمی ثابت ہوا۔ عمارت بنواتے وقت اس نے خزانے کی پچھلی پرانی دیوار میں ایک پتھر ایسا دیکھا تھا جو ضرورت پڑنے پر ہٹایا جا سکتا تھا اسے ہٹانے سے خزانے میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔ چھوٹے بھائی نے پچھلی پرانی دیوار کو جیوں کا توں رہنے دیا اور سامنے ایک شاندار عمارت کھڑی کر دی۔

اس عمارت کا شاندار افتتاح ہوا تھا۔

پچھلی دیوار کا راز چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کو بتا دیا تھا۔ اور انہوں نے اپنی ترکیبیں بنالی تھیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ کچھ دنوں بعد بڑے بھائی منتری نہیں رہ گئے تھے۔ لیکن وہ تب بھی عوام کی خدمت کرتے تھے۔

میرے دونوں بھائی بہت ذمہ دار اور اسی لئے بہت سمجھدار بھی تھے۔ یہ بات ان ہی دنوں کی ہے جب میں لڑائی میں تھا۔

رات کے وقت دونوں بھائی چپ چاپ گھر سے نکل جایا کرتے تھے۔ وہ پیدل ہی خزانے کے پچھواڑے پہنچتے تھے۔

دونوں مل کر خزانے کی دیوار میں لگا وہ پتھر کا ٹکڑا ہٹا لیتے تھے۔ بڑے بھائی اندر جاتے تھے چھوٹا بھائی باہر رہتا تھا۔ بڑے بھائی خزانے میں سے روپیہ نکال لیتے تھے۔ پھر دونوں وہ پتھر کا ٹکڑا ٹھیک سے اسی جگہ پر لگا کر آرام سے گھر چلے آتے تھے۔ وہ اتنا روپیہ ہی نکالتے تھے کہ کوئی جھمیلا نہ اٹھ کھڑا ہو۔

ہر دن خزانے میں روپیہ گھٹتا جاتا تھا۔ سب پریشان تھے۔ کہ یہ کیسے ہوتا ہے۔ آخر ادھیکاریوں کو تب ہوشیار ہونا پڑا۔ جب رقم لاکھوں تک پہنچ گئی۔ لیکن وہ زیادہ پریشان اس لئے تھے کہ یہ ہوتا کیسے ہے۔ روز ایک ایک پائی گن کر رکھی جاتی تھی اور سنتری پہرے پر رہتے تھے۔

اگر چوری ڈکیتی ہوتی تو سب لٹ جانا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا تھا بس روپیہ گھٹتا جاتا تھا۔ گھٹتا جاتا تھا۔ آخری بار خزانچی نے ایک رائے پیش کی۔ ـــ صاحبو! کوئی تو خزانے میں آتا ہی ہے۔ کہاں سے آتا ہے۔ یہ پتہ نہیں چلتا۔ خزانے کی حفاظت کے لئے میں ایک ترکیب کام میں لانا چاہتا ہوں۔ صندوقوں کے پاس میں ایک ایسا جال بچھانا چاہتا ہوں کہ جو بھی وہاں آئے گا پھنس جائے گا۔ وہ نکل کر باہر نہیں جا پائے گا۔ اس طرح ہم چور کو پکڑ لینگے۔

خزانچی کو جال بچھانے کی اجازت مل گئی۔

میرے بھائی اس سے بے خبر تھے۔ کیونکہ بڑے بھائی منتری نہیں رہ گئے تھے۔ وہ ہمیشہ کی طرح اس رات بھی وہاں گئے۔ پتھر ہٹا کر بڑے بھائی اندر داخل ہو گئے۔ جب انہوں نے صندوق کھول کر روپیہ نکالنے کی کوشش کی تو جال میں پھنس گئے۔ وہ بہت گھبرائے۔ انہوں نے چھوٹے بھائی سے کہا۔ اب میں نہیں نکل سکوں گا۔ صبح ہوتے ہی پکڑا جاؤں گا۔

"نکلنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔۔" چھوٹے بھائی نے کہا۔

"کچھ نہیں ہوتا۔ اب پھنس گیا ہوں" بڑے بھائی نے کہا۔

"میں اندر آتا ہوں۔ نکالنے کی کوشش کرتا ہوں" چھوٹا بولا۔

" نہیں۔ نہیں۔ تم مت آؤ۔ تم بھی پھنس جاؤ گے۔۔۔۔۔ یہ غلطی مت کرو۔ مت کرو ـــ بڑے بھائی بولے اور فکر میں غرق ہو گئے۔

دونوں بہت پریشان تھے۔

اس پریشانی میں بڑے بھائی بولے۔ یہ غضب ہو گیا۔ کل جب پکڑا جاؤں گا تو بڑی مشکل ہوگی۔ ساری عزت مٹی میں مل جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔؟

"تو پھر کیا کیا جائے؟" چھوٹے نے پوچھا۔

تم ایک کام کرو... تم سنبھل کر اندر چلے آؤ۔ ان صندوقوں کو بالکل نہیں چھونا۔ اندر آکر تم میرا سر کاٹ کر لے جاؤ، تاکہ کوئی مجھے پہچان نہ سکے۔ سر تم کہیں چھپا کر گاڑ دینا۔ میرے نہیں رہنے پر غم کبھی مت منانا۔ اب یہی ایک راستہ ہے۔ دیر مت کرو..... آؤ....." بڑے بھائی نے کہا۔

چھوٹا بھائی ساکت کھڑا تھا۔ وہ عقل لڑا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بولا "تمہارا سر کاٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک بات اور بھی ہو سکتی ہے۔ میں تمہاری طرح کے، تمہاری شکل و صورت کے سیکڑوں لوگ پیدا کئے دیتا ہوں۔ یہ کام راتوں رات ہو سکتا ہے۔"

"لیکن اس سے ہونا کیا؟" بڑے نے پوچھا۔

تب کون کسے پہچانے گا؟ کتنوں کو پکڑے گا؟ صبح تمہاری طرح کے سیکڑوں لوگ شہر میں گھوم رہے ہوں گے۔ تب کون کسے پہچانے گا۔ کون کہہ سکے گا کہ خزانے کے اندر تمہیں تھے... ٹھیک ہے نا؟" چھوٹے نے کہا۔

یہ سب انہی درمیان ہوا جب میں لڑائی پر تھا۔ سچ پوچھئے تو، تب مجھے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ یہ تو لوٹ کر آنے پر پتہ چلا۔ گھر کی بات تھی۔

یہ ایک عجیب حادثہ تھا۔ جب میں لڑائی پر گیا تھا تب سب طرح کے لوگ تھے۔ سارجنٹ تھے۔ خلاصی اور بیرکار تھے۔ چائے والے تھے۔ ہوٹل والے تھے۔ دکاندار اور حاکم تھے۔ طرح طرح کے لوگ تھے۔ اور وہ لڑکی بھی تھی جس کا خیال کبھی کبھی مورچے پر آتا تھا۔

لوٹ کر آنے پر سب بدل گیا۔ لوگ اب بھی وہی ہیں۔ وہ لڑکی بھی ہو گی کہیں۔ بڑے بھائی بھی ہیں۔ لیکن انہیں پہچاننے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ وہ بہت سے ہیں۔ بڑی الجھن ہوتی ہے کہ کسے بھائی کہوں۔ کسے نہ کہوں۔ لڑائی کی وجہ سے میں بہت الجھن میں پڑ گیا ہوں۔ وہاں خطرہ کم تھا۔ وہاں اوسطاً تیس ہزار گولیوں سے ایک سپاہی مرتا تھا۔

جائزے

★ اِس حصّے میں قلم کاروں نے کملیشور کے
فکر و فن پر بہت ہی ادق اور فلسفیانہ
انداز میں بحث کی ہے۔ اِس لئے یہ حصّہ
دوسرے حِصّوں سے یقیناً کم دلچسپ ہے۔
اور اسے خاصی محنت و ریاضت سے
پڑھنے کی ضرورت ہے۔ ظاہر ہے
کچھ حاصل کرنے کے لئے ریاضت اور
عرق ریزی کرنی ہی پڑتی ہے۔
(ادارہ)

اصغر علی انجینئر

کملیشور کے سماجی اور فنّی نظریات

کملیشور کا شمار ہندی ادب میں صفِ اوّل کے کہانی کاروں میں ہوتا ہے۔ اُن کی کہانیاں جدید ہندوستانی ادب میں اور خصوصاً ہندی ادب میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیں گی۔ کملیشور کی کہانیاں ہمارے دور کے ہندوستان، اُس کے لوگ، ان کی سماجی اور تہذیبی قدروں، ان کے غموں، احتجاج، آرزوؤں اور نراشاؤں کی آئینہ دار ہیں۔ اُن کی کہانیوں میں خاص طور سے شمالی ہندوستان کے نچلے اور متوسط طبقوں کی زندگی کی بڑی خوبصورت عکاسی ہوئی ہے۔ چونکہ میں ہندی ادب سے اچھی طرح واقف نہیں ہوں اس لئے میں ان کا مقابلہ کسی دوسرے ہندی کہانی کار سے نہیں کرنا چاہتا نہ ہی میں ہندی ادب میں ان کے مقام کا تعین کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کام ہندی کے فاضل نقادوں کا ہے۔ میں اپنے اس مضمون میں ایک ادب کے طالب علم کی حیثیت سے ان کے فنی اور سماجی نظریات کا جائزہ لوں گا۔ ذاتی ملاقاتوں میں میں نے ان سے ان نظریات پر بحث کی ہے اور ان کے متعلق میں نے جو نتائج اخذ کئے ہیں یہ مضمون انہیں بنیادوں پر لکھا گیا ہے۔

ہر فن کار کا ایک خاص نظریہ ہوتا ہے چاہے یہ بات وہ تسلیم کرے یا نہ کرے۔ چند نقاد جو ادب اور زندگی کے گہرے رشتوں سے یا تو نا واقف ہوتے ہیں یا اُس کا محض سرسری مطالعہ کرتے ہیں، بعض وقت ادب میں کسی نقطۂ نگاہ کے قائل نہیں ہوتے۔ ادب، اُن کی نگاہ میں، محض جمالیاتی قدروں کا عکس ہے لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ جمالیاتی قدریں آسمان سے نہیں ٹپکتیں، اسی کرۂ ارض سے جس میں ہمارے خارجی حالات شامل ہیں، پیدا ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں مارکسی نقاد گورگی پلیخانوف نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ فن برائے فن کا عقیدہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب فن کار اپنے اردگرد کے سماجی ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہوتا۔" کملیشور کے متعلق یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ فن اور زندگی کے گہرے رشتوں کے قائل ہیں اور ادب میں وہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہیں۔ نوعمری سے ان کا اُٹھان انقلابی ماحول میں ہوا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ انقلاب کی چھاتی سے دودھ پی کر جوان ہوئے۔ مجھے جہاں تک معلوم ہے وہ بارہ سال کی عمر میں انقلابی سوشلسٹ پارٹی میں شامل ہو کر ہتھیار سنبھال چکے تھے۔ ویسے اُن کے گاؤں کی اور خاندان کی روایت بھی آزادی کے لئے سر مٹنے کی رہی ہے۔

ایسے ادیب کے فن میں زندگی کی تلخیاں اور شیرینیاں، آرزوئیں اور محرومیاں پوری شدت
کے ساتھ اور مختلف زاویوں سے در آتی ہیں۔ لیکن یہ اور یہ بات میں زور دیکر کہنا چاہتا ہوں کہ کملیشور
کے ہاتھ سے فن کا دامن کہیں چھوٹنے نہیں پایا۔ ان کی کہانیوں میں سستی نعرے بازی کہیں نظر نہیں آتی —
زندگی اور اس کے حقائق کو فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا گیا ہے وہ اپنے کرداروں کو اپنے ہاتھوں میں
پتلوں کی طرح نہیں نچاتے، اپنے نظریوں کو ان پر نہیں تھوپتے نہ ہی ان کو میکانکی طور پر اپنی کہانیوں
میں برتتے ہیں۔ کملیشور کی ایک مشہور کہانی ہے "مالش کا دریا" یہ کہانی طوالفوں سے متعلق ہے
اور نچلے درجے کے قصباتی لوگوں کے آس پاس گھومتی ہے۔ اس کا ایک کیریکٹر ہے بدن لال ایک مزدور
اور پارٹی ورکر۔ اگر کوئی معمولی نوعیت کا کہانی کار ہوتا تو اسے پارٹی لائن یا نعرے بازی کے لیے استعمال
کرتا۔ مگر کملیشور اسے پارٹی ورکر سے زیادہ ایک انسان کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ جو صرف نعرے نہیں لگاتا
نہ ہی تمام معصیتوں سے بچ کر زندگی بسر کرتا ہے وہ دوسروں کی طرح انسان ہے اور اپنی جنسی خواہش پوری
کرنے کے لئے طوائف کے یہاں بھی جاتا ہے اُس سے دل لگی بھی کرتا ہے اور بار بار سوال کرنے پر بھی پارٹی ہڑتال
وغیرہ کی باتیں اس طرح کرتا ہے جیسے ٹال رہا ہو۔ وہ بغیر نوٹس کی چھٹی اور ہڑتال کا ذکر ? کرتا ہے
نہ وہ کمیونسٹ جارگن استعمال کرتا ہے اور نہ ہی پارٹی لائن کا ذکر بس یوں ہی کہہ جاتا ہے۔ لیکن اس طرح کہہ
جانے میں بھی موجودہ معاشی نظام پر چبھتا ہوا طنز ہے۔ کملیشور نے اُس کے کردار کا ایک اور پہلو ابھارا ہے۔
جب جگنو (طوائف کا نام) ٹی بی کا شکار ہو جاتی ہے اور اُس کے پاس علاج کے لئے پیسے نہیں ہوتے بدن
لال پارٹی کے چندے کے پیسے انسانی ہمدردی کے پیش نظر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُسے دے دیتا ہے۔ پارٹی کی
ضرورت اور انسانی ہمدردی کے بیچ ٹینشن کہانی میں بیان نہیں ہوا مگر خود بخود ابھر آیا ہے۔ کہانی کے
دوسرے کرداروں کا بھی ذکر اتنی سادگی اور روانی سے ہوا ہے کہ قصبے کے اس چھوٹے سے شہری زندگی کی جیتی
جاگتی تصویر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ کہانی میں کسی واقعے پر کوئی خاص زور نہیں ہے۔ معمولی سے واقعات ہیں
جو بیان ہوتے چلے گئے ہیں۔ کہانی کا کوئی کلائمیکس نہیں ہے۔ نچلے طبقے کے لوگ کس طرح چھوٹی
چھوٹی باتوں میں اپنی خوشیوں کا سامان پیدا کر لیتے ہیں یہ اس کہانی میں بڑی خوبصورتی سے ابھر کر آیا ہے
طوائف کی ماں کس طرح اپنے بیٹیوں کا خیال رکھتی ہے اور کتنی شفقت کے ساتھ اُن سے پیش آتی ہے۔ یہ
بھی اس کہانی میں بھرپور طریقے سے بیان ہوا ہے۔ ہر کردار زندگی سے بہت قریب ہے۔ مصنف کے ہاتھوں
میں بے بس کھلونا نہیں دراصل یہ کہانی حقیقت نگاری اور کردار کی پیچیدگیوں کو نہایت سادگی سے بیان
کر جانے کا بہترین نمونہ ہے اسے پڑھ کر بے اختیار چیخوف کا خیال آنے لگتا ہے۔ شروع سے آخر تک کہانی میں زندگی
اور تباہی کے بیچ ایک ہلکا سا تناؤ محسوس ہوتا رہتا ہے۔ اینگلس نے مینا کاؤٹسکی کو خط لکھتے ہوئے بڑی خوبصورت
اور گہری بات لکھی ہے۔ میرے خیال سے کہانی کا مقصد موقع و محل سے اُبھرنا چاہئے نہ واضح بیان سے
نہیں اور لکھنے والے کے لئے کسی بھی سماجی تنازعے کا تاریخی حل اپنے قارئین کے سامنے چاندی کی طشتری میں
پیش کرنا بالکل ضروری نہیں۔ کملیشور کی یہ کہانی اینگلس کی اس کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔
انور عظیم اپنے ایک مضمون افسانہ اور ردِ افسانہ میں سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا ادب کے دائرے میں

کملیشور نمبر

ابھرنے والے اور ابھر کر چھا جانے والے رجحانات اور رویوں کے سوتے خود ادب کے اندرونی تہوں سے پھوٹتے ہیں یا زندگی کے ان مظاہر اور محرکات سے جن کا سلسلۂ عمل ادب کے باہر ہے اور ادب میں محض جن کی عکاسی یا آئینہ داری ہوتی ہے؟ مطلب یہ کہ ادب جن عوامل اور مظاہر کا اظہار کرتا ہے وہ ادب کے داخلی عوامل اور مظاہر ہیں یا خارجی جن کو ادب اپنے اندر جذب کرتا ہے اور پھر تخلیقی معجز کاری کے ساتھ خیال و فن کے سانچے میں ڈھال کر باہر کی طرف لوٹا دیتا ہے؟ یہ بڑے اہم سوال ہیں اور ظاہر کہ ہر ادیب ان سوالوں کا جواب اپنے اپنے فنی نظریے کو مدنظر رکھ کر ہی دے گا۔ کملیشور ایک ترقی پسند ادیب ہیں اور اس بات کے پوری طرح قائل ہیں کہ ادب زندگی سے پیدا ہوتا ہے محض تخیل کی اڑان سے یا تجریدی تصورات سے نہیں۔ ان کا جواب بالکل متوقع تھا۔

> میں یہ نہیں مانتا کہ ادب کہیں آدمی کے بھیتر سے پیدا ہوتا ہے۔ ادب آدمی کو پیش کرنے کا شعور دیتا ہے۔ ہماری رچنائیں جلتی، سلگتی، دکھی زندگی سے نکل کر آتی ہیں۔ ادب میں محض آئینہ دار نہیں ہوتا۔ آئینہ صرف شکل دکھاتا ہے۔ مرکز کی طرف نہیں پہنچاتا۔ تخلیق ہمیں ایک آگاہی دیتی ہے اور تبدیلی لاتی ہے جسے چند سالوں میں نہیں بہایا جا سکتا۔ جس ادب کی جڑیں اپنے وقت میں نہ ہوں وہ اپنے وقت کے ماورا نہیں جا سکتا۔

کملیشور کا فن سیدھے سادے فارمولے کا فن نہیں ہے اُن میں زندگی کی پیچیدگیاں جھلکتی ہیں کردار کے سارے خم و پیچ آجاتے ہیں جہاں وہ سوشلسٹ ریلزم (سماج وادی حقیقت نگاری) کے قائل ہیں وہاں وہ علامتوں اور [illegible] کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کرتے ہیں۔ ہمیں ان کی کہانیوں میں عصری تقاضوں، نئی نسل کی اُمنگوں اور اُس کی مذہب اور نظریوں سے بیزاری اُس کی مایوسی غرض کہ عصری زندگی کی صحیح تصویریں مل جاتی ہیں۔ اُن کی ایک کہانی ہے۔ لاش۔ اس کہانی میں کسی خاص کردار پر فوکس نہیں ہے۔ چند علامتیں ہیں جن کا خوبصورتی سے استعمال ہوا ہے۔ شہر میں ایک بڑا احتجاجی جلوس نکلنے والا ہے اور حزب مخالف کے نیتا اس میں پیش پیش ہیں۔ پولیس کا یہ اندازہ ہے کہ اس جلوس میں بڑی کثیر تعداد میں لوگ شریک ہوں گے۔ امن قائم رکھنے کے مسئلے نے پولیس افسر کو خاصا پریشان کر رکھا ہے اور وہ اپنے وزیر اعلیٰ سے بندوبست کے لئے ہدایتیں حاصل کرنے کے لئے ملتا ہے۔ وزیر اعلیٰ اس سے کہتے ہیں کہ پریشانی کی کوئی خاص بات نہیں حزب مخالف کا لیڈر میرا دوست ہے جلوس پرامن رہے گا۔ اُس کی یقین دہانی اُس نے کر دی ہے۔ بہت بڑے پیمانے پر جلوس نکلتا ہے دھواں دھار تقریریں ہوتی ہیں اور جلسہ ختم ہونے پر بھیڑ چھٹ جاتی ہے۔ مگر پولیس افسر کو ایک لاش نظر آتی ہے۔ چیف منسٹر سے پوچھ تاچھ پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لاش اس کی نہیں ہے نہ ہی یہ لاش حزب مخالف کے لیڈر کی ہے رسمی کارروائیوں کے بعد لاش کو مردہ خانے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ کہانی یہاں ختم ہو جاتی ہے۔

دراصل یہ لاش ایک عام آدمی کی علامت ہے اس کہانی میں ہمارے سماجی اور سیاسی نظام پر گہرا اور تیکھا طنز ہے۔ ہمارے مسائل سے نہ حکمراں پارٹی کو دلچسپی ہے نہ حزب مخالف کو۔ سارا کھیل اقتدار کا ہے اور حکمراں جماعت اور حزب مخالف مل جل کر عام آدمی کو فریب دیتے رہتے ہیں۔ انتخاب بھی ایک رسم بن کر رہ گئی ہے جو وقتاً فوقتاً ادا کر دی جاتی ہے۔ گھاٹے میں رہتا ہے عام آدمی اور یہ لاش اس کی علامت ہے۔ دراصل اس کہانی میں کملیشور نے ہمارے دور میں قدروں کی شکست و ریخت اور اس دور کے انسان کے disillusionment کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک باشعور انسان ہمارے دور میں اجنبیت کے احساس کا شکار ہے۔ alienation کا یہ احساس اس کی روح کے لئے ایک عذاب ہے اور اسے بچھو کی طرح ڈنک مارتا رہتا ہے پُرخلوص رشتے ٹوٹ چکے ہیں۔ اور نفسا نفسی کے اس عالم میں وہ ایک دوسرے کے تئیں قربت کا احساس کھو چکے ہیں۔ حساس ذہنوں کے لئے تنہائی کا یہ عذاب ناقابل برداشت ہوتا ہے اور ایک حساس فن کار اسے اپنی تخلیقوں میں پوری شدت کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض ادیب اسے محض فیشن کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور اپنی رچناؤں میں اسے صرف ایک فارمولا بنا دیتے ہیں۔ ایک مغربی ادیب نے کیا خوب کہا ہے کہ "اس کا (اجنبیت کا) خیال تو ڈراؤنا ہے۔ مگر لفظ بڑا تسلی بخش ہے"۔ دراصل اسے تسلی بخش سمجھ کر کئی لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن اس کے کربناک تجربے سے محروم ہوتے ہیں۔ کارل مارکس نے اپنی کتاب Economic & Philosophic manuscripts میں جو ۱۸۴۴ء میں لکھی گئی تھی اس بات پر بحث کی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں ایک فن کار اور انسان کس طرح alienation کے احساس کا شکار ہوتا ہے۔ کملیشور اس سلسلے میں کہنے لگے:

مارکس کی یہ کتاب میں نے نہیں پڑھی۔ میں نے محض اس پر تبصرے پڑھے ہیں۔ اس لئے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اسے ٹھیک طور پر سمجھ پا رہا ہوں۔ لیکن ویسٹ میں جو اس کا تصور آیا وہ Meta physical (مابعد الطبیعی) اور negative (منفی) تھا وہ inactive (بے عملی) اور منفی روپ میں ہمارے سامنے آیا جس نے ہمیں صرف یہ بتایا کہ ہمارا alienation (fate) مقدر ہے۔ چونکہ ہم اس دنیا میں آئے ہیں ہم alienated رہیں گے اور اس بے معنی زندگی کو سہیں گے۔ میں اسے اس روپ میں نہیں مانتا۔ مارکس نے جس سیاق و سباق میں یہ بات کہی ہے اور میں نے جو اپنے سماج میں محسوس کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے سماج اور کلچر نے جو ماحول پیدا کیا اس نے نہ صرف alienate کیا ہے بلکہ انسان کی توہین کی گئی ہے۔ ہم اپنے ہی سماج میں رہتے ہوئے ایک insulted (توہین کردہ) انسان

زیادہ رہے ہیں) اور ایک surplus کی طرح رہے ہیں جو اپنے سماج کو بدلنے میں نہ تو شامل کیا جاتا ہے نہ وہ شامل ہو پاتا ہے۔ اُسے زندگی میں جینے اور compete کرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے اور یہ competition ہمیں اپنے سماج سے alienate کرتی ہے کیونکہ اس competition میں جہاں ایک آدمی کامیاب ہوتا ہے وہاں 99 آدمی فیل ہوتے ہیں۔

میری کہانیوں میں یہ بات کہیں آئی ہے تو وہ ایک آدمی کے alienation کے روپ میں یا ایک فرد کا سوال بن کر نہیں بلکہ صدیوں کی سماجی اور تہذیبی ظلم کے تحت alienate کی گئیں قوموں یا فرقوں کا سوال بن کر آئی ہے۔ اس طرح کے فرقوں، طبقوں اور توہین کردہ لوگوں کا ذکر آپ کو ضرور ملے گا۔ میری کہانیوں میں یہ بات ضرور ہے کہ ان کا alienation وہ نہیں ہے جو مغربی ممالک کا تصوّر ہے۔

ویسے کملیشور کی بعض کہانیوں میں متوسط طبقے کے لوگوں کے مسائل، ان کی بوریت، تنہائی اور اجنبیت کے احساس کا ذکر ملتا ہے۔ کملیشور کی کہانی تلاش میں ماں اور بیٹی کے کچھ کردار اس کی بہترین مثال ہیں۔ کملیشور نے اس کہانی میں رمزیت کا بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ ان دونوں ہوتے ہوئے بھی کسی سے پیار کرتی ہے مگر پوری کہانی میں یہ کہیں ڈائریکٹ نہیں کہی گئی۔ لطیف اشارے کئے گئے ہیں یا ایسی علامتیں استعمال ہوئی ہیں جیسے ممی آج بھی بہت خوبصورت ہیں اور اعلیٰ درجے کا سنیٹ استعمال کرتی ہیں، ممی کی ساڑی میں موزہ الجھا ہوا ہے جسے ہولڈال میں سے نکالتے ہوئے بیٹی دیکھ لیتی ہے، بستر کے نیچے سے سگریٹ کا ٹکڑا ملتا ہے (حالانکہ ممی سگریٹ نہیں پیتیں) وغیرہ وغیرہ۔ موزہ، رومال، سلیپر، سگریٹ کا ٹکڑا وغیرہ علامت کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ اس کہانی میں ماں اور بیٹی کے کردار کے ذریعے کملیشور نے متوسط طبقے کی عورتوں کی تنہائی، ان کی الجھنیں، اُن کا ذہنی کرب اخلاقی اقدار اور ریاکاری (hypocracy) کو پیش کیا ہے اور بیٹی کے کردار میں alienation کے احساس کو بھی بہت اچھی طرح ابھارا ہے۔

اسی سے جڑا ہوا سوال ہندی ادب میں alienation کو برتنے کا ہے۔ اسے جدید ہندی ادب میں کتنی جذباتی شدت سے برتا گیا یا یہ محض جارگن کے طور پر استعمال ہوا یا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ادیب عوامی زبان اور طرز زندگی سے اتنے دور ہو گئے ہیں کہ وہ اب alienated

محسوس کرتے ہیں ؟ کیلشور کا کہنا تھا کہ :

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ alienation ہندی ادب میں ایک جارگن کے طور پر استعمال ہوا اور ہمارے ادیب عوامی زبان اور طرز زندگی سے بالکل الگ ہوگئے ہیں۔ یہ لہر ہندی ادب میں اتنے زور سے چلی ہے کہ ایک نئی پرسنل (شخصی) زبان وجود میں آگئی جسے لکھنے والے کے ماسوا کسی اور کے لئے سمجھنا مشکل تھا۔ یکایک نیلی روشنیوں سے بھرے ہوئے ریستوران دکھائی دینے لگے اور عورتوں کے ساتھ لیٹے لوگ بستر پر لیٹے ہوئے نظر آنے لگے جن کی جانگیں تھرتھراتی تھیں اور ہتھیلی پر پسینے آتے تھے اور جو عورت کے بغل میں لیٹے ہوئے اپنے بچے کو بھی اس لئے برداشت نہیں کر پاتے تھے کہ جو پیدا ہونے کا دکھ وہ بھوگ رہے ہیں اس کی غلط روایت اپنے بچے میں نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور اس لئے انہوں نے اپنی کہانیوں میں بستروں پر ان بچوں کو مارا، ذبح کیا اور چادر پر پھیلے ہوئے خون کو ایک ٹک دیکھتے رہے۔

زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ ادب میں بھی مختلف موڑ آتے ہیں۔ ہر زندہ ادب اپنے زمانے کے تاثرات قبول کرکے انہیں تخلیقی اور ماورائی روپ میں پیش کرتا ہے۔ ادب میں صنف کا تعلق بھی خاص سماجی طبقوں سے ہوتا ہے۔ ڈیوڈ کریگ (David Craig) نے ہماری توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ نئے سماجی طبقوں کے ساتھ ساتھ نئے اصناف ادب میں پیدا ہوتے ہیں۔ ماڈرن ناول یا جدید افسانے سرمایہ دار طبقے کی دین ہے۔ ڈیوڈ کریگ نے اپنے ایک مضمون " ادبی ارتقا کے کلیئے " (Towards Laws of Literary Development) میں اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ اگر ادب اور سماجی زندگی میں قریب قریب ایک ساتھ اتھل پتھل ہو اور زبردست تبدیلی آئے تو اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ دونوں میں ایک علت کا رشتہ پایا جائے اس سلسلے میں جارج لوکاچ کہتا ہے کہ انیسویں صدی کے آخری زمانے میں روسی حقیقت نگاروں کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے کرداروں میں اس زمانے کے تضادات کی کامیاب عکاسی کرتے ہیں۔ کملیشور نے جو کردار تخلیق کئے ہیں ان میں بھی بڑی حد تک جدید ہندوستانی سماج کے تضادات کے خوبصورت عکس ہمیں مل جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں قارئین کی توجہ پھر ان کی کہانی تلاش کی طرف کھینچوں گا۔ اس کہانی میں متوسط طبقے کی عورتوں کی الجھنوں، اور آج کے سماج میں جو ترقی کرنے کے باوجود پرانی پرمپراؤں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکا ہے، ان کے مسائل کو رمز و اشاروں میں بڑی خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے ہندوستانی ادب میں زبردست تبدیلیاں آئیں اور نئی ابھرتی ہوئی طاقتوں اور پرانی پرمپرا میں جو کشمکش ہوا، اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ کملیشور چونکہ ہندی کے ادیب ہیں اسلئے ہندی افسانے کے اہم موڑ پر وہ بہتر روشنی ڈال سکتے ہیں۔ انہوں نے میرے اس سوال کے جواب میں کہا:

ہندی افسانے کا پہلا موڑ مادھوراؤ سپرے سے شروع ہوتا ہے جنھوں نے
ہندی ماڈرن افسانے کی شروعات کی۔ دوسرا موڑ چندر دھر شرما
گلیری سے شروع ہوا جنھوں نے افسانے کی زبان کو ایک نیا عام فہم
لہجہ دیا۔ اس سلسلے میں اُن کا افسانہ "اُس نے کہا تھا" خاص طور پر قابل
ذکر ہے۔ اس کے بعد پریم چند نے ہندی کہانی کو نہ صرف زبان کے اعتبار
سے بلکہ مواد کے اعتبار سے بھی ایک زبردست تاریخی موڑ دیا۔ گلیری کے
یہاں مواد رومانی اور قومی اثر لئے ہوئے ہے۔ اس کے بعد ایک پوری
نئی روایت سے جسے راہول سنکرتاین، بھگوت شرن اُپادھیائے، امرت
لال ناگر، نرالا، یشپال وغیرہ نے اپنی کہانیوں میں نبھایا اور زندہ رکھا۔
ان لوگوں نے اپنے سماجی نظریے کو بہت گہرائی سے اپنی کہانیوں میں پیش
کیا اس کے بعد نئی کہانی کی تحریک چلی۔ اس تحریک میں موہن راکیش،
راجندر یادو، بھیشم ساہنی، ہری شنکر پرسائی، امرکانت وغیرہ پیش
پیش رہے اور انھوں نے نئی کہانی کو نئی زندگی بخشی اور کہانی میں جو بناوٹی
زبان اور parasite کردار اور انفرادیت کا رجحان زور و شور
سے چل پڑا تھا اور جس کے بانی جینندر کمار تھے، ختم کیا۔ جینندر کمار
اور سچیدانند ہیرانند واتسیاین وغیرہ نے وہ لٹریچر دیا جو آدمی کو اس
کی زندگی سے بے پرواہ اور بے نیاز کر دیتا ہے۔ ایسے منفی رجحان کے
خلاف نئی کہانی کا یہ انقلابی موڑ آیا۔

جینندر وغیرہ نے اپنی پاگل کر دینے والی زبان سے ادب کو یہ محض دماغی
عیاشی کا ذریعہ بنا دیا تھا۔ نئی کہانی نے اپنی اکھڑ (rugged) زبان
اور بولیوں کے الفاظ کے ذریعے زندگی کے تجربوں کو پیش کیا۔ نئی کہانی
کی تحریک کے بعد ہندی میں ایک اور نیا موڑ alienation کا آیا۔
اس دور کی کہانی میں ادیبوں، عورتوں، بچوں کے ذکر کے بجائے جانوروں
کتوں، بکرے بکریوں، بکری پر چڑھے ہوئے بکروں، اپنی محبوبہ کی
چھاتیوں پر نب سے لکھے ہوئے آدمیوں، دانتوں سے نیل کاٹتے ہوئے
لوگوں، عورتوں کی دونوں ٹانگیں چیر کر دیکھنے والوں کا ذکر ملتا ہے۔
ان کہانیوں نے آدمی کو تو devalue کیا ہی، اُس کے جینے کی طاقت
کو، اِچھا کو بھی مار دیا۔ ایسا محسوس کرا دیا کہ ہم کیڑے مکوڑے بلبلاتے
جانور کی طرح ہیں۔ اس لئے ہندی کہانی میں جتنے خود کشی کے واقعات
ملتے ہیں وہ ہندی ادب میں پچھلے پانچ چھ سو سالوں میں نہیں

ملیں گے۔

اس کے بعد سمانتر کا دور آیا جو محض متوازی نہیں بلکہ ایک بدل (alternative) ہے۔ اس نے کہانی کو اتنا زبردست موڑ دیا جو نئی کہانی کا دور نہیں دے سکا تھا۔ اس میں محض پیشہ ور لکھنے والے نہیں بلکہ زندگی کے مختلف میدانوں میں تجربہ حاصل کیے ہوئے لوگ ہیں۔ چاہے وہ میدان کیمیکل انجینیرنگ کا ہو یا ٹریڈ یونین کا، کوئلہ کانوں کا ہو یا دیہاتی زندگی اور بے زمین کسانوں کا۔ اس کہانی نے ہندی ادب کو ایک نئے سنگ میل سے آشنا کرایا۔ ان لیکھکوں میں ابراہیم شریف، جتندر بھاٹیا، کامتا ناتھ، مدھوکر سنگھ، دامودر سدن، سدیپ، ہمانشو جوشی، بابو راؤ باگل، دیا پوار، ستیش کالسیکر، ہرکشن کول وغیرہ شامل ہیں، ان کے لئے زندگی کی سچائیاں زبان سے بڑھ کر اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ ہندوستانی تجربے کی سطح پر بات کرتے ہیں۔ سمانتر تحریک دراصل تیسری دنیا کی ادبی تحریکوں کی ہی ایک کڑی ہے۔ اور ان تحریکوں میں فلسطینی تحریک بھی شامل ہے۔ ادب کے مواد کو ایک خاص سیاق و سباق میں دیکھنا چاہیے۔ دراصل (content) اور .... (context) بذات خود کچھ نہیں۔ ان میں جدلیاتی رشتہ ہے اور دونوں کے تال میل سے ہی نظریہ بنتا ہے۔ اب ہماری سچائیاں مطلق.... (absolute) سچائیاں نہیں ہوتیں بلکہ اضافی ہوتی ہیں اور اس میں تاریخ کا عمل شامل ہوتا ہے۔ سمانتر تحریک نے زندگی کی ایسی سچائیوں کو پیش کیا ہے جو ہمارے دور کی سچائیاں ہیں۔ اس معنی میں اس تحریک نے ہندی ادب کو ایک دھچکا لگایا ہے۔

کملیشور نے بھی اپنے دور کی سچائیوں کو اپنی کہانی کے کرداروں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے fantasy اور علامتوں کا استعمال بڑے فنکارانہ طریقے سے کیا ہے۔ ان کی کہانیاں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم جدید دور کی کہانی پڑھ رہے ہیں اور اس میں ہمارے دور کی سچائیوں کا جو صنعتی دور کی سچائیاں ہیں، بھرپور عکس ہے، ان کی کہانی جوکھم اس سلسلے میں خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کا مرکزی کردار گاؤں کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور روزگار کی تلاش میں بمبئی آیا ہوا ہے۔ اس کی ماں گاؤں میں ہے اور اس کی محبوبہ بھی۔ گاؤں سے خط آتے رہتے ہیں اور دستخط بدلتے ہی وہ سمجھ جاتا ہے کہ پہلے جو خط لکھا کرتا تھا مر گیا۔ محبوبہ کبھی کبھی ایک آدھ جملہ اس طرح لکھوا دیتی ہے جس سے اس کی محبت کا اندازہ ہوتا رہتا ہے۔ اس کہانی میں بڑے صنعتی شہر کی گھٹن، صنعتی انسان کی بیزاری، بوریت، ہر چیز کا بے معنی ہونا وغیرہ باتوں کو بہت اچھے طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ اس کہانی میں

صنعتی دور اور سرمایہ دارانہ نظام کے مسائل بھی اس طرح آگئے ہیں کہ کہانی سے سیچوئیشن سے پیدا ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ کہانی میں بڑھتے ہوئے دام اور ہماری سیاست اور سیاسی رہنماؤں پر بھی بھرپور مگر فنکارانہ طنز ہے۔ کہانی ایک موڑ پر fantasy کا سہارا لیتی ہے اور اُس شخص کی ماں جب گاؤں میں بستر مرگ پر دم توڑ رہی ہے۔ مراجی دلیسائی مزاج پرسی کے لئے آتے ہیں اُس کے بلانے پر۔ مگر اُن کا آنا بھی بے معنی سا لگتا ہے وہ خود سمجھ نہیں پاتا کہ اُن سے کیا کہے اور کن چیزوں کا ذکر کرے۔ مختصر سا ڈائلاگ ہوتا ہے اُس میں ہماری سماج ویوستھا اور سیاست پر چبھتا ہوا طنز ہے۔ کملیشور نے کہانی کا اختتام بھی علامتی انداز میں کیا ہے ماں اوروں کی طرح نہیں مرتی بلکہ اُس کا جسم دھیرے دھیرے پتھرا جاتا ہے اور گاؤں والے اُس کے پتھرائے ہوئے جسم کو مورتی کی طرح ایک اونچی جگہ نصب کر دیتے ہیں۔ دراصل یہ بے حس و حرکت پتھرایا ہوا جسم علامت ہے اس بات کی کہ ہمارے سماج میں ایک عام انسان کا جو سیدھا اور نیک ہو زندہ رہنا یا مر جانا ایک ہی بات ہے۔ مر جانے پر اُسے ایک مورتی کی طرح رکھ دیا جاتا ہے اس سے زیادہ اُس کی افادیت نہیں ہے۔

کملیشور نے علامتیں اور fantasy کی جدید تکنک استعمال کی ہیں مگر اپنی کہانیوں کو بے معنی یا لا یعنی (absurd) نہیں ہونے دیا۔ آرٹ سے وہ مقصد کا کام لینا چاہتے۔ اس طرح اُن کی کہانی فن، ٹیکنک اور مقصدیت کا خوبصورت تال میل بن جاتی ہے۔ کملیشور تجریدی جمالیات کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کے جمالیاتی ایروتح میں گہرا سماجی شعور پایا جاتا ہے۔ اُنہیں بھوک سے نڈھال بے روزگار سے پریشان و داش چہرے میں کہانی کا اتنا ہی مواد نظر آتا ہے جتنا ایک محبوب سے بچھڑے وصال کی آرزو سینے سے لگائے ہوئے حسرت زدہ انسان میں۔ انہوں نے بارہا یہ بات کہی ہے کہ میرے لئے خوبصورتی کا معیار صرف لمبے لمبے کیش، چاند سا چہرہ، بھرے بھرے گداز جسم مرمریں تک محدود نہیں ہے۔ زندگی کی اور بھی خوبصورتیاں ہیں میں سمجھتا ہوں ہمارے ملک کے لئے اور ہمارے سماج کے لئے یہ بڑا صحت مند اپروچ ہے ہمارے مسائل کے مدنظر ادیبوں اور فن کاروں کو ایسا جمالیاتی نظریہ اختیار کرنا ہوگا جو ہمارے مظلوم اور کچلے ہوئے اور پسماندہ عوام کی زندگی کی سچائیوں کا حامل ہو۔ کملیشور کا جمالیاتی نظریہ ان سچائیوں سے قریب تر ہے حالانکہ بعض وقت اُن کے کرداروں کی وہ پیچیدہ نفسیاتی عکاسی نہیں ہو پاتی جو بیدی کے یہاں ہوتی ہے۔ مجھے کملیشور کی کچھ کہانیاں پڑھ کر یہ محسوس ہوا کہ اُن کے یہاں داخلیت پر زور نہیں ہے، اُن کے کرداروں میں داخلی کرب ابھر کر نہیں آتا اور فن کی گہرائی کے لئے کردار کے اندر بھی اترنا اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جتنا خارجی حالات کو ٹٹولنا۔

ظفر ادیب

کملیشور کی کہانی کا فن

(”راجہ نربنسیا“ اور ”دیوا کی ماں“ کی روشنی میں)

کئی جہت کی تخلیقات کے ادیب کو کسی ایک جہت کا ادیب قرار دینا دشوار ہوتا ہے۔ ایسے ادیب ہر زبان کے ادب میں ہوتے رہے ہیں، خصوصاً اس دور میں۔ جب ادب کے لئے سوچنے، سمجھنے اور اپنے ارد گرد دیکھنے اور اس سب کچھ سے تخلیقی تحریک حاصل کرنے کی پہلے سے زیادہ ضرورت ہو گئی ہو۔ یہ دور کسی شاعر کو صرف شاعر یا کسی افسانہ نگار کو صرف افسانہ نگار نہیں رہنے دیتا، یہ اور بات ہے کہ کسی شاعر یا افسانہ نگار کا بیشتر رجحان شاعری یا افسانہ نگاری کی طرف رہے، آج ایک باشعور ادیب کسی ایک صنف ادب تک محدود نہیں رہ سکتا۔ اسے اپنے دور کے سارے ادب پر نظر ڈالنی پڑتی ہے اور اس کے متعلق اپنے تاثرات بھی ظاہر کرنے پڑتے ہیں۔

کملیشور ایسے ہی خوش نصیب ادیب ہیں۔ انہوں نے تنقیدیں بھی لکھی ہیں، سفر نامے بھی اپنے پڑھنے والوں کو دئے ہیں۔ کتابیں بھی کئی ایک موضوعات سے متعلق ترتیب دی ہیں۔ کہانی، ناول، ڈرامے اور فلم بھی لکھے ہیں جو دراصل ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ لیکن کہانی کا پلڑا ان کی تخلیقات میں بھاری ہے، اس لئے ان کی کہانی کار کی حیثیت میرے لئے دوسری حیثیتوں سے کہیں زیادہ نمایاں ہے اور غالباً کہانی ہی ان کی پوری نمائندگی کرتی ہے یعنی یہی ان کی بھی نمائندہ صنفِ ادب ہے۔

اس سے پہلے کہ ان کی کہانیوں کے بارے میں کچھ کہا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کہانی کے متعلق ان کے خیالات کا جائزہ لیا جائے جو انہوں نے اپنی کتاب ”راجہ نربنسیا“ کے ابتدائیے میں اپنے پڑھنے والوں کے غور و فکر کے لئے پیش کئے ہیں، بلکہ شاید اس لئے بھی کہ ان کی کہانیوں کو انہی خیالات کی روشنی میں پڑھا جائے۔ انہی خیالات کو ان کی کہانیوں کی کسوٹی قرار دینے اور اسی معیار پر ان کی کہانیوں کو جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی جائے یہ مناسب ہے۔ اس لئے بھی کہ یہی خیالات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور فکر و ذہن کے ارتقا کے باوجود یہ نہیں بدلے ہیں۔

کئی تنقید نگار یہ کہتے ہیں کہ ”کہانی ابھی پریم چند سے آگے نہیں بڑھی ہے“۔ اس سلسلے میں کملیشور کا کہنا ہے کہ ”آج کی کہانیاں چاہے کہانی کی تعریف پر پوری نہ اتریں لیکن فنکارانہ حقیقت پسندی، تکنیک اور زبان کے اعتبار سے یقیناً ترقی ہوئی ہے، اس کے علاوہ نئی کہانی کی ایک اور بھی دین ہے، نئے نظریات اور خیالات کی تخلیق“۔

نئی کہانی کا تصور دینے کے لئے وہ اپنے ایک خاص انداز میں کہتے ہیں:۔

”کبھی آپ نے جوالا مکھی کی چوٹی پر بیٹھے ہوئے آدمی کا تصور کیا ہے ان کی اندرونی کشمکش اور ذہنی حالت

لے مطالعے کی کوشش کی ہے اور ایسا سوچا ہوگا انہیں کس طور دھا کو حالات میں زندگی کا گرتایا جائے اور اگر سوچا ہے تب نئی کہانی کی بنیاد اور نئے کہانی کاروں کی افتاد طبیعت آپ کے سامنے آسانی سے ظاہر ہو جائیگی۔

سوال یہ ہے کہ کئی کہانی کار اپنے آپ کو اس عالم میں پاتے ہیں اور اس انداز سے یہ نئی کہانیوں کو جنم دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمام ہندوستانی زبانوں کی کہانیوں میں ایسی کہانیاں گنتی کی نکلیں گی۔ کیونکہ ہمارے یہاں کا ادیب فیشن زدہ زیادہ ہوتا ہے، حقیقت اور واقعیت سے اس کا تعلق اتنا نہیں ہوتا جتنا وہ ظاہر کرتا ہے، ہم میں کتنے نٹ ہمسن، فلابیر، بالزاک او ہنری اور چیخوف ہیں۔ ہم لوگ بیشتر کہانیاں لکھنے کے لئے لکھتے ہیں۔ کملیشور جیسے لوگ کہانی ہو کر کہانی کو جنم دیتے ہیں اور جب تک یہ کچھ کر نہیں پاتے اپنے دلی اور ذہنی اتھل پتھل سے نجات نہیں پاتے اور لاوے کو ابلتا، کھولتا اور امنڈتا ہوا محسوس کرتے ہوئے آتش فشاں بنے رہتے ہیں۔

کہانی کے پریم چند سے آگے نہ چلنے کی بات میں کچھ تو سچائی ہے۔ اس بات کو بالکل بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا چاہے نئے کہانی کار کچھ بھی کہیں۔ یہ نہیں کہ پریم چند سے آگے جا ہی نہیں سکتی، جا تو سکتی ہے لیکن اس کے لئے ان جیسے قد آور کہانی کار کی ضرورت ہے۔ کملیشور صاحب اور دوستوں کے ساتھ "نئے جذبات و خیالات کی تخلیق" کو نئی کہانی کا اضافہ بتاتے ہیں۔ سچ پوچھا جائے تو یہ اضافہ نہیں بلکہ پرانی باتوں کی توسیع ہے، اگر ہم چاہیں تو اس کا بھی پہلے کہانی کاروں میں سراغ لگا سکتے ہیں۔ ہمیں اس طرح بھی سوچنا چاہئے کہ ہماری کہانی میں اپنا پن کتنا رہ گیا ہے یعنی یہ اب ہندوستانی کتنی ہے اور "کچھ اور" کتنی ——— "ہندوستانیت" کی خصوصیت جتنی زیادہ پریم چند کی کہانیوں میں ہے اتنی ان کے بعد آنے والے کہانی کاروں میں نہیں ہے، بیشتر مغربی کہانی کاروں کے فن سے متاثر ہوئے ہیں۔ نئی کہانی کے فنکاروں میں ایسے ہی لوگ زیادہ ہیں لہٰذا کہانی کی اس ترقی کو ترقی نہیں کہا جا سکتا۔

"آج کے ہر کہانی کار میں کچھ کہنے کیلئے ایک عجیب سی بے بسی ہے جو یقیناً اس پر آشوب اور عبوری دور کی دین ہے۔ جس نے ایک طرف اگر ہمیں تخلیقی کرب میں مبتلا کیا ہے تو دوسری طرف ہمارے شعور کو بھی جھنجھوڑا ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ آج کی کہانیاں تخیل کے پنکھوں پر نہیں اڑتیں بلکہ دنیا کی ویادہارک اور حقیقی زندگی سے ان کا سیدھا سمبندھ ہے۔ دھرتی کی ہر چیز سے لگاؤ، ہر موڑ پر تجسس اور ہر گڑھے کو پاٹ دینے کی ہمدردانہ امنگ ان میں ہے۔"

یہ بات حقیقت سے زیادہ خیال ہی ہے کیونکہ کہانی کاروں کی اپنی زندگی ان کی کہانیوں سے مختلف ہے ان کے احساسات سنگین حقائق سے نہیں ٹکر لیتے۔ بیشتر پر تو عبوری دور کی پرچھائیں بھی نہیں پڑتی، اگر کسی وقت اس کی پرچھائیں پڑی بھی ہے تو اس کی محض یاد ہی رہ گئی ہے ان کے پاس۔ اور وہ بھی صبح شام اور دن رات کی رنگینیوں میں دبی ہوئی۔ لیکن میں نہیں مانتا کہ محلوں میں رہنے والے جھونپڑوں کی جھانکیاں دیکھ سکتے ہیں اور وہاں کے رہنے والوں کے شب روز کا احساس کر سکتے ہیں۔

کہانی کا جو معیار کملیشور نے وضع کیا ہے اس سے کوئی ذی ہوش اور ادب کی صحیح قدروں کی پہچان رکھنے والا انکار نہیں کر سکتا۔

"ان کی کہانیوں کی کامیابی یا ناکامی کی کسوٹی یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ کس حد تک تفریح کا سامان مہیا کرتی ہے، بلکہ یہ ہوگی کہ وہ انسان کے ہمدردانہ جذبات کو کہاں تک جھنجھوڑتی، چھوتی اور اکساتی ہیں۔ آج کے کہانی کاروں کی تخلیقات کا مطالعہ صرف ملکی حالات کے پس منظر میں کیا جاتا ہے، اس معیار پر بھی میرے خیال میں پریم چند کی بیشتر کہانیاں آج

کی کہانیوں سے آگے ہی رہتی ہیں۔ اس لئے ان کی ساری زندگی انہی مسائل کے دشت کی سیاحی میں گزری۔ رہا یہ کہ ناموردتے کہانی کار کی ساری زندگی کا تو سوال رہا بہت دور، عمر کا ایک حصہ بھی نہیں رہے، اپنا کہانیوں کے ماحول میں — تخئیل میں رہے ہوں تو کیا؛ تخئیل میں رہنے سے تو وہ احساس نہیں ہوتا جو اصل ماحول میں رہنے پر ہوتا ہے۔

کملیشور اپنی کہانیوں کے بارے میں کہتے ہیں:—

"ان کے لئے میں اس چھوٹے سے قصبے مین پوری کا شکر گزار ہوں جہاں جنما اور پل کر بڑا ہوا اور جہاں کا دھول، دھکڑ اور زندگی کی ہلچل سے بھرا پُرا، اداس لیکن دہاں کا دلکشش ماحول میرے تجربات کو نئے نئے رنگ میں رنگتا رہتا ہے"

کاش ان کی موجودہ زندگی میں یعنی موجودہ ماحول میں بھی یہ سب کچھ برقرار آتا ہو اور بمبئی کی رنگینیوں اور وہاں کی زندگی کی آسودگیوں نے ان یادوں کے انگاروں کو بالکل ہی نہ بجھا دیا ہو، یہ بڑی مقدس آگ ہے۔

کملیشور کی کہانیاں یعنی "راجہ نربنسیا" اور "دیوا کی ماں" میرے خیال میں ان کی کہانی کے فن سے متعارف کرانے کے لئے کافی ہی ہونگی — میں نے انھیں "مشتے از خروارے" کے طور سے لیا ہے، ممکن ہے کہ بہت سے لوگ صرف ان کہانیوں کا مطالعہ نہایت ناکافی سمجھیں — جبکہ ان کی کہانیوں کی کتابوں کی تعداد نو تک پہنچ گئی ہے۔

دیوا کی ماں

:— اس کہانی میں پہلی بات جو توجہ طلب ہے وہ کہانی کا میٹھا میٹھا اور دھیما دھیما لہجہ ہے، کہانی بڑے سنبھلے ہوئے انداز میں بڑھتی رہتی ہے۔ کرداروں کی اندرونی کشمکش اپنے حقیقی اور واقعی رنگ میں بیان ہوتی ہے، اگرچہ کہانی کار کا اپنا تخئیل بھی کہیں کہیں درمیان میں آپڑتا ہے۔ لیکن بیشتر مقامات کہانی کو پڑھتے ہوئے دل کو پکڑتے ہیں۔ خاموش لبوں سے سب کچھ کہہ لینا اور سُن لینا، کہانی کے تجربے میں آئی ہوئی بات معلوم ہوتی ہے —
دیوا کا کردار جو شکل اختیار کرتا ہے اس کے انداز پہلے ہی سے دور کی جھلک دکھاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ دیوا کی ماں کی ذہنی کیفیت اس کے طور طریق سے دکھانے کا رویہ فنکارانہ ہے۔ دیوا کا سال بھر بعد جیل سے آنے پر ماں کے سامنے کھڑے ہوئے چپ چاپ سا رہنا اور ماں کا چُپ چپ سا دیکھنا پھر یکایک کہنا "سال بھر سے کبھو کا ہوں، اماں پورے ایک سال سے" اور پھر "تب سارا کے سمٹ آیا، سب سہاگ ہوگیا" ماں نے کھانا پروسا، دیوا نے پانی رکھا"۔

اور پھر دیوا کا "بابو جی ہسپتال میں ہیں" کہہ کر ایک اور مرحلہ پیدا کر دینا۔ ماں کے احساسات — "ماں چُپ رہی، تین چار کور اس نے اور کھائے، غٹ غٹ پانی پیا اور اٹھ گئی"۔ بیان کرنا اسی کے ساتھ ساتھ یہ کہنا "سوت کاتتے ہوئے لوٹے تار جوڑتے جوڑتے دھیرج اور اٹوٹ دڑھتا اس کی پرکرتی میں آگئی تھی"۔ کہیں اور ایسے مقامات ہیں جن سے کملیشور صاحب کی دقیق بینی اور دقیق رسی ظاہر ہوتی ہے۔

کہانی کا اختتام نہایت غیر متوقع لیکن دیوا کی ماں جیسے کردار کی عورت کے لئے فطری ہے۔ پڑھنے والا اس اختتام سے اچنبھے میں آجاتا ہے، کیونکہ ماں کی رات بھر کی بے چینی کے بعد اس کی توقع نہیں تھی کہ وہ کہہ اٹھتی ہے "میں نہیں جاؤنگی" اور دیوا کے پوچھنے پر "تو میں چلا جاؤں" "نہیں" جس کا لہجہ نہایت استحکام لئے ہوئے تھا" اور اپنے کام میں لگ گئی"۔ وہ سچی ہندوستانی عورت کی سچی تصویر ہے، جس کا سہارا چرخہ اور تلسی کا پودا ہوتا ہے، جب اس کا شوہر اسے دغا دے جاتا ہے۔

بلاشبہ کہانی سے کہانی کار کا پرستار ہو جانا پڑتا ہے، کیونکہ کچھ ایسے ہی انداز سے کہانی کے واقعات چلائے گئے ہیں اور کرداروں کی ذہنی تصویر سے آنکھوں کے سامنے زندہ ماں بیٹے کی صورتیں لا کھڑی کر دی گئی ہیں۔

راجہ نربنسیا :- "ایک راجہ نربنسیا تھے" ماں سنایا کرتی تھیں۔ بڑی بوڑھیوں کی سنائی ہوئی کہانی کے سہارے ایک واقعی کہانی سنانے کی ترکیب اور تکنک میری نظر سے پہلے نہیں گزری، نئی کی نئی۔ دلپذیر کی دلپذیر، پھر انداز بھی آہستہ روی کا۔ کہیں بھگدڑ کی کیفیت نہیں پائی جاتی، بڑی دھیمی دھیمی آنچ سے کہانی چلتی اور بڑھتی رہتی ہے آغاز یوں ہوتا ہے۔ "میرے سامنے میرے خیالوں کا راجہ تھا، راجہ جگ پتی۔ تب جگ پتی سے میری دانت کاٹی دوستی تھی" اس کے بعد کہانی کے واقعاتی ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ لیکن کہانی کی دلچسپیاں کہیں کم نہیں ہوتی۔ درمیان درمیان میں "ماں سنایا کرتی تھیں" کی کہانی کا موقعے کے مطابق ٹکڑا آ کر اس دلچسپی کو اور بڑھا دیتا ہے۔

کہانی کا اختتام "ماں سنایا کرتی تھیں" سے مختلف ہے اور کملیشور اسی کہانی کو دنیوی کہانی کا جسم و جان دیتے اور دنیا ہی کو سامنے رکھتے ہیں۔

"پر اسی رات جگ پتی اپنا سارا کاروبار تیاگ، افیم اور تیل پی کر مر گیا۔ کیونکہ چندا کے پاس کوئی دے دی شکتی نہیں تھی اور جگ پتی راجہ نہیں بچن سنگھ کمپاؤنڈر کا قرضدار تھا۔"

راجا نے اپنے ولی عہد کی عوام کو اطلاع دینے کے لئے سکوں پر بڑے راجکمار کا نام کھدوایا تھا لیکن جگ پتی نے دو پرچے چھوڑے ایک چندا کے نام، دوسرا قانون کے نام۔ قانون کے نام کے پرچے میں وہ لکھتا ہے "میں نے افیم نہیں روپے کھائے ہیں، ان روپوؤں میں قرض کا زہر تھا۔ اسی نے مجھے مارا ہے، میری لاش تب تک نہ جلائی جائے جب تک چندا بچے کو لے کر آ نہ جائے، آگ بچے سے دلوائی جائے، بس" ۔۔ لکھ گیا۔ اور چندا کے نام "چندا، آدمی کو پاپ نہیں پشچاتاپ مارتا ہے، میں بہت پہلے مر گیا تھا، بچے کو لے کر ضرور چلی آنا"۔ پیغام دے گیا۔ کملیشور تکمیلی نقش (Finiahing touch) کے لئے "ماں سنایا کرتی تھیں" تو آس پاس بیٹھے بچے پھول چڑھاتے تھے۔ میری کہانی بھی ختم ہو گئی پر ۔۔۔۔"

کہانی میں بہت کچھ سمیٹ لیا گیا ہے، سماج کا طور طریق اور برتاؤ، رشتہ داروں کا غیر موافقانہ اور غیر دوستانہ رویہ، آس پاس کی کڑوی کسیلی نگاہیں اور جانے کیا کیا۔ ہسپتال سے جگپتی اور چندا کے واپس آنے پر چاچی کا زہریلا جملہ۔ "راجہ نربنسیا، اسپتال سے لوٹ آئے ۔۔ گُما بھی آئی ہے" اور پھر اس کا رد عمل "گھر کے اندھیرے بروٹھے میں گھستے ہی جگپتی ہانپ کر بیٹھ گیا، جھنجھلا کر چندا سے بولا "اندھیرے میں کیا میرے ہاتھ پیر تڑوا ؤ گی۔ بہتر جا کر لالٹین جلا لاؤ نا"۔ تیل نہیں ہو گا اس وقت ذرا ایسے ہی کام ۔۔۔ تمہارے کبھی کچھ نہ ہو گا ۔۔۔ نہ تیل نہ ۔۔۔ کہتے کہتے جگ پتی چپ رہ گیا اور چندا کو لگا کہ آج پہلی بار جگ پتی نے اس کے ویرتھ ماتری تو پر اتنی گہری چوٹ کر دی، جسکی گہرائی کی اس نے کبھی کلپنا نہیں کی تھی، دونوں خاموش، بنا ایک بات کئے اندر چلے گئے"۔

اس کے بعد جگ پتی کو "راجہ نربنسیا اسپتال سے آ گئے"۔ اور چندا کو "تمہارے کبھی کچھ نہ ہو گا"، سانپ بنے ڈستے رہے ـــــ ان کہانیوں سے کملیشور صاحب اچھی خاصی سوجھ بوجھ والے فکری کہانی کار ظاہر ہوتے ہیں۔ بلاشبہ اُن کا مشاہدہ بھی خوب ہے اور ان کا بیان بھی۔

★ ★

بلراج ورما

کہانی اور کملیشور

آدمی کا احساس فن اور جذبۂ تخلیق و اظہار پہلے رقص، پھر نقش و نگاری اور بعد میں مصوری اور سنگ تراشی میں رونما ہوا۔ جب تک قدیم انسان نے زبان دریافت نہ کی یہ فنون ہی اس کے جذبات اور خیالات کے اظہار کا وسیلہ تھے۔ لہٰذا انہیں کہانی کی ابتدائی صورت تسلیم کرنا چاہیئے گویا کہانی کہنے کا جذبہ اتنا ہی پرانا ہے جتنا آدمی کا احساسِ فن۔ کہانی فنون لطیفہ کی روح رواں ہے۔

ہر شخص جو دیکھ، سن اور بول سکتا ہے کہانی کہتا ہے، ہر بات، ہر واقعہ، ہر حادثہ ایک کہانی ہے یعنی ہم جب کبھی کوئی بات کرتے ہیں یا کسی دوسرے شخص سے ہم کلام ہوتے ہیں اور کوئی واقعہ اسے سناتے ہیں یا کسی واقعہ کا ذکر یا تذکرہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ کہانی کہہ رہے ہوتے ہیں۔ ہر کسی کو سلیقہ سے بات کہنا نہیں آتا نہ ہر کوئی ہر واقعہ یا حادثہ یا قصّہ کو دلچسپ رنگین یا سبق آموز بنا کر پیش کر سکتا ہے پھر بھی نہ جانے کیوں کہا جاتا ہے کہ کہانی کہنا یا سمجھنا سہل نہیں تو کوئی ایسا مشکل بھی نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہر آدمی جو دیکھ، سن اور بول سکنے کے علاوہ پڑھ لکھ بھی سکتا ہے جی جان سے سمجھتا ہے کہ وہ کہانی کہتا اور سمجھتا ہی نہیں بلکہ اچھی اور بری کہانی میں فرق بھی بتا سکتا ہے ایک انگریز افسانہ گو کا دعویٰ ہے کہ اچھی یا بری کہانی کوئی شے نہیں ہوتی۔ کہانی یا اچھے ڈھنگ میں لکھی ہوتی ہے یا بھونڈے انداز میں گویا کہ اچھی یا بری کہانی میں وہی بنیادی فرق کارفرما رہتا ہے۔ جب مجھے کملیشور کے فن پر لکھنے کی دعوت دی گئی تو ایڈیٹر کے ذہن میں بھی غالباً کچھ ایسی بات تھی۔ کھیلے ہی میں کہانی کے میدان میں نیا نیا اترا ہوں مگر میں عمر میں تو کملیشور سے بڑا ہی ہوں اور جب کہانی کی پرکھ کا حق ہر کسی کو ہے تو مجھے بھی کیوں نہ ہو۔

ایڈیٹر کے لکھنے کے انداز میں ایک ایسا ادھیکار تھا جو ایک دوست کو دوسرے سے ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایڈیٹر جانتا ہے کہ میں کملیشور کا مداح ہوں اور کہانی میری سب سے بڑی کمزوری ہے

ظاہر ہے کہ میرا فوری ردعمل بے پناہ مسرت کا تھا۔ فن اور شخصیت میں ہر طرح کی شمولیت بجائے خود ایک تخلیقی عمل ہے۔ کچھ کہنے کے لئے اتنا بڑھیا اور دل کش موضوع بھی در پیش ہو تو کون کافر حیل و حجت کرے گا۔

ہماری اولین اچھی لکھی ہوئی کہانیاں بھاگوت، رامائن، پنچ تنتر دو میں ملتی ہیں جو سینکڑوں سال پرانی ہیں مگر آج بھی بڑے شوق و احترام سے پڑھی جاتی ہیں۔ جیسے جیسے آدمی کا

ماحول بدلتا جاتا ہے اس کے تہذیب و تمدن کی اقدار اور کہنے کی زبان بھی بدلتی جاتی ہے۔

ہر چیز بدلتی ہے مگر کچھ حقیقتیں اور سچائیاں بنیادی کلی ہوتی ہیں جو کبھی نہیں بدلتیں ہر نئی ادبی تخلیق ماضی کے بزرگ ادبا کی شروع کی ہوئی کسی لڑی کا موتی ہوتی ہے اور ہر ادیب اپنے بزرگوں کا امانت دار۔ ماضی کو بے جان، بوسیدہ اور بے مقصد سمجھ کر اس سے انحراف کرنا بلکہ مکمل لاتعلقی کا درس دینا احمقانہ بغاوت ہے میں کلاسیکی ادب کی تجدید کے ان تمام بزرگوں اور دانشوروں کا ہم خیال ہوں جو ماضی سے تعلق بنائے رکھنے کی تلقین کرتے تا کہ تہذیب کا کارواں رواں دواں رہے۔

بریڈلے نے کہا ہے کہ دنیا کا تمام ادب بائبل، شیکسپیئر اور دانتے کا مرہون منت ہے اور ان کے بعد آدمی نے آج تک کوئی ایسی ادبی یا علمی اختراع نہیں کی جسے پورے طور پر انفرادی کہا جا سکے۔ بریڈلے نے کوئی بہت بڑا کفر نہیں تولا تھا اگرچہ سبھی جانتے ہیں کہ شیکسپیئر کے تقریباً سارے کے سارے ڈرامے کسی نہ کسی صورت میں یورپ کی لوک کتھاؤں میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ البتہ یہ بھولی بھٹکی کہانیاں اور پریوں کے دلنواز قصے شیکسپیئر کی بے پناہ انفرادیت کی رنگا رنگی سے سج دھج کر ہی دنیائے ادب میں سنگ میل کا رتبہ پا سکے۔

ازلی اور ابدی اقدار کو سرمدی بنائے رکھنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ انہیں ہر یگ میں یگ ہی کی زبان اور یگ ہی کے پس منظر میں یگ ہی کے جاموں میں سجا سنوار کر دہرایا جائے۔

ادبی ارتقا کا سفر صدیوں پرانا ہے۔ ہر اچھا ادب اس مسلسل سفر کا ایک لنک ہے جو لعل و جواہر کی اس انمول لڑی میں پرو کر اسے ذرا اور آگے سرکاتا ہے۔ ہر بڑے ادیب کا طرز اسلوب جو اس کی تخلیقات میں اسرٹ اور ری اسرٹ ہو کر بالآخر اپنی انفرادیت منوا لیتا ہے برسوں سے چلی آ رہی ادبی روایت ہی کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس طرح ہر لائق توجہ ادیب اور ہر قابل غور و قدر ادبی تخلیق سالہا سال سے چلی آ رہی اس لڑی کو چند سوت اور آگے بڑھاتی ہے اور آدمی حق، حقیقت اور سچائی کے اور قریب ہو جاتا ہے۔ جہالت کا ازالہ اور تہذیب کا نکھرنا سنورنا اسی مسلسل پیش قدمی کا رد عمل ہے۔

ظاہر ہے کملیشور بھی افسانوی ادب کے طویل قصہ گوئی کی ایک کڑی ہے۔ ایک ایسی کڑی جو نئی بھی ہے اور پرانی بھی۔ یہ مسرت کا مقام ہے کہ اپنی بے پناہ انفرادیت کے باوجود کملیشور کسی ایک مخصوص جگہ جم کر نہیں بیٹھ گیا بلکہ ادب کے افسانوی قافلے میں اپنی ساری صلاحیتوں سمیت ہمیشہ شامل رہا ہے۔

افسانہ، ڈرامہ اور ناول ادب کے متوازی دھارے اور فن قصہ گوئی کے منفرد اسلوب ہیں جن پر کملیشور نے یکسر اعتماد و یقین کے ساتھ اپنا ہنرمند قلم اٹھایا ہے اس کے فن کے بنیادی عناصر، زبان و بیان کا بے پناہ بانکپن اور سنجیدہ غور و فکر ہیں۔ وہ شاعر نہیں ہے۔ (اس کی کوئی منظوم تخلیق کم از کم میری نظر سے نہیں گزری) مگر اپنی نثر میں ہی اس نے وہ لطیف و نازک نغمگی پیدا کی ہے جسے شعریت کا ایک روپ کہا جا سکتا ہے۔ کملیشور کی کہانیوں کی زبان میں بہ یک وقت نسوانی گھنگھروؤں کی لطیف جھنجھناہٹ بھی ہے اور مردانہ للکار بھی اپنے موضوع کے انتخاب اور اظہار کے معاملے میں اپنے ہم عصر ہندی جمگھٹ کی

زد سے کملیشور ہمیشہ ماورا رہا ہے۔ اس صورتحال کا اس سے بڑا دوسرا ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ خالص ہندی ادیب ہوتے ہوئے بھی وہ اردو والوں میں (بھی) عزت و احترام سے قبول کیا جاتا ہے۔ وہ اس نظریے اور قول کی ناقابل تردید تصدیق کرتا ہے کہ ادیب ادیب ہوتا ہے، وہ ہندی میں لکھے، انگریزی میں لکھے، اردو میں لکھے یا تامل میں لکھے اس کی انفرادیت ہی اصل چیز ہوتی ہے۔ دراصل ادیبوں کی اپنی ایک نجی برادری ہوتی ہے جس میں نہ زبان مخل ہوتی ہے نہ علاقائی سیمائیں۔

اگرچہ میں نے کملیشور کو کئی بار، کئی جگہ پر دیکھا ہے مگر میں ذاتی طور پر اسے نہیں جانتا۔ دو ایک بار کناٹ پیلس کے ہندی بھون میں جو اب مسمار کر دیا گیا ہے، میں نے اس سے کہانیاں بھی سنی ہیں۔ اب تو خیر میں نہیں جانتا مگر تب وہ مجھے اپنے ہم عصروں سے قطعی الگ لگا تھا۔ خوش شکل، خوش پوش، خوش اخلاق اور خوش کلام۔ یہ سب تو خیر، وہ ان دنوں کی طرح آج بھی ہوگا۔ دکھتا ہے کہ وہ اب ایک صاحب ثروت ایڈیٹر بھی ہے اور کامیاب فلمی کہانی کار بھی، مگر پھر بھی جوانی اور ڈھلتی جوانی میں کچھ فرق تو ہوتا ہی ہے۔ ان دنوں تو وہ باقاعدہ فلمی ہیرو ایسا لگا تھا مجھے۔

ادیب لوگ عادتاً یا مجبوراً (یا بلا وجہ) اپنی نجی زندگی میں تہذیب و ترکیب اور رکھ رکھاؤ کے قائل نہیں ہوتے مگر کملیشور مجھے بڑا آرڈرلی اور آرگنائزڈ قسم کی شخصیت لگا تھا۔ ایسا آدمی ظاہر ہے کم گو، سنجیدہ اور خوددار تو ہوتا ہی ہے۔ انانیت کے عناصر بھی اس کے کردار میں کم مقدار میں نہیں ہوتے۔ وہ کریم النفس، شفیق، ہمدرد، خدا ترس (وہ بھلے ہی خدا کو نہ مانتا ہو) نیا منش، انسان دوست اور انسان شناس ہوتا ہے۔

کملیشور کی شخصیت کا ہر پہلو زندگی سے بھرپور ہے۔ اس نے اپنی تحریر میں منفی عناصر کو کبھی شامل نہیں ہونے دیا۔ اس نے ہمیشہ مثبت نظریات کو اپنایا ہے۔ اس کے افسانے تازہ دم ہیں۔ اور اپنے دور کے نمائندہ بھی۔ اس کے تمام افسانوی مجموعوں میں کوئی ایک افسانہ بھی ایسا نہیں جس میں اس کی بے پناہ انفرادیت پوری آب و تاب سے نمایاں نہ رہی ہو۔ اس کے باوجود اس کا کوئی افسانہ ان پرانی بنیادی قدروں کو جھٹلاتا بھی دکھائی نہیں دیتا جو ابدی، ازلی اور سرمدی ہیں اور جن سے عالمی ادب کی زرین روایات قائم ہیں۔

کملیشور ہندی کے جدید افسانہ کے علمبرداروں کا نقیب ہے مگر اس کا جذباتی افق اس نئی رو تک ہی محدود نہیں۔ اس کی جدت محض برائے جدت نہیں، اس جدت میں ایک جوان تر و تازہ اور شگفتہ ذہن کارفرما ہے۔ یہ ذہن اپنی ذات کی تلاش میں تو سرگرداں ہے ہی، اظہار کے لئے نئے افق بھی بدستور ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اس جدت کا مقصد محض چکا چوند پیدا کر کے قاری کو حیران کرنا نہیں بلکہ اپنے ہم عصروں کو جگاتا ہے اور بیدار رکھتا ہے تاکہ نیند میں ہی اس کی موت نہ ہو جائے۔ یہ جدت اپنے دور کے آدمی کو نئے تیشوں میں اترنے کی ترغیب دیتی ہے اور آگے بڑھنے اور نئے آفاق کو جا لینے کے لئے اکساتی ہے۔

کملیشور کی کہانیاں پڑھ کر جو تصور ذہن میں ابھرتا ہے وہ ایک ایسے شخص کا ہوتا ہے جو خوبصورتی کا دلدادہ بلکہ عاشق ہے۔ خوبصورتی میں ظاہر ہے کہ پھول بھی ہوتے ہیں، عورتیں بھی اور

وہ خوشگوار مہکتے اور رنگ گاتے لمحات بھی جو ہم اچھی صحبت میں رفیقوں کے ساتھ ہنس کھیل کر گذارتے ہیں۔ لباس میں رنگوں کی ترتیب کا بانکپن اور دلکش رکھ رکھاؤ اسے پسند ہے۔ نیلا سمندر اور نیلا آسمان اسے بھلا لگتا ہے۔ اچھا کھانا اور بڑھیا شراب اسے بھاتی ہے۔ وہ سگریٹ پیتا ہے یا نہیں مگر اسے سگریٹ پینا پسند نہیں۔ اگر وہ سگریٹ پیتا ہے تو ڈبلیو۔ ڈی۔ اینڈ اور ولز کے سگریٹ بھی اسے یقیناً پسند ہوں گے۔ ہر آدمی جو سگریٹ پسند کرتا ہے، دوستی پسند کرتا ہے۔ باتیں کرنا اور سننا پسند کرتا ہے۔ چائے اور کافی پسند کرتا ہے۔ خود با ادب اور سلجھا ہوا ہوتے ہوئے بھی بے ادب اور الجھے کیریکٹر کو پسند کرتا ہے اور کھنڈت یاترائیں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے آوارگی بھی بے حد پسند ہے۔ زندگی کی نفسیاتی کیفیات اور نئی کہانی کی الجھنوں کو وہ کچھ ایسی ہی تلی اور سلجھی ہوئی زبان میں بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والا ابھی کہانی کے لیکھک اور کرداروں سے مل جل کر انہیں جیسا محسوس کرتا ہے۔ اس کے عاشق اور معشوق دل کی دنیا کے شہزادے، شہزادیاں ہیں تو ہماری آپ کی دنیا کے چمڑے کے بیوپاری بھی۔ ان کا عشق افلاطونی بھی ہے اور بھرپور مرد عورت کا والہانہ پیار بھی۔ یہ افسانے گہرے شعور اور خوبصورت اسلوب میں نئے اور پرانے انسانی رشتوں کے ہمدردانہ مطالعے ہیں جنہیں کملیشور نے بڑے لطیف اور دلکش انداز میں قلم بند کیا ہے۔

اپنے دور کے تمام دنیاوی امور جن کا علم ہمیں حواس خمسہ کے ذریعے ہوتا ہے ہم اپنی عقل و بصیرت سے جانچتے پرکھتے ہیں۔ اس طرح سابقہ کی نسبت آئندہ کو ہم زیادہ سوجھ بوجھ اور ہوشیاری سے سجا سنوار سکتے ہیں۔ عقل کا دائرہ لامحدود ہے مگر ہمارے دنیاوی تجربات کا تعلق ہمارے گرد و نواح کے حالات، ہماری خاندانی روایات، عمر کے اختلافات، ممالک کی آب و ہوا، اور ہماری قومی، طبقاتی اور علاقائی رغبت اور نفرت سے بھی متاثر ہوتے رہتے ہیں۔ انہی وجوہات کی بنا پر ہمارے سوچ، بچار کے طور طریقوں میں شدید اختلاف پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک روسی یا چینی کے سوچنے کا ڈھنگ ایک امریکی یا ہندوستانی کے سوچنے کے ڈھنگ سے مختلف ہونا لازمی ہے۔ اسی طرح ایک نوجوان کے سوچنے کے ڈھنگ اور ایک عمر رسیدہ بزرگ کے سوچنے کے ڈھنگ میں فرق ہوتا ہے۔ کسی ایک آدمی کا ذہن بھی ہمیشہ ایک ہی رنگ ڈھنگ سے نہیں سوچتا، خوشی، غمی اور غصہ جیسے وقتی جذبات بھی ہماری عقل کے پیمانوں کو بدلتے رہتے ہیں۔ جو پیمانے اتنے ناقص اور غیر معتبر ہوں ان پر پورے طور پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ سچ وہی حقیقت ہے جو صدیاں طے کرتی ہیں۔ جو صدیوں نے طے کیا ہے اسے جھٹلانا اور اسے زنگ آلود فولادی زنجیریں کہہ کر ان سے ماورائیت کا درس لینا سچ سے انحراف ہے۔ جو مناسب نہیں۔ سچ اگرچہ اٹل حقیقت ہے مگر ہر دور اس پر اپنے نئے پسندیدہ رنگوں کا پالش چڑھاتا ہے تاکہ اعلانیہ کہہ سکے کہ دیکھو میں نے اس کا روپ نکھار دیا ہے اور اب یہ کیسا بھلا لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں حقیقت کے معنی بارے بدلے سے لگتے ہیں باوجودیکہ ہر نیا ادبی نظریہ اپنے سے پہلے کے نظریوں کی محض تراش خراش ہی ہوتا ہے۔ معنوی اعتبار سے البتہ ہر دور کا افسانہ واقعی حقیقت پسندی کا مظہر ہوتا ہے۔ اپنے نئے اور نسبتاً زیادہ تندرست و توانا ہونے کا نعرہ رومان پرستوں نے بھی کلاسیکی ادب کے خلاف لگایا تھا اور حقیقت (اور ترقی) پسندوں نے رومان پرستوں کے خلاف۔ آج کے ادبا اور شعرا نے بھی اپنے سے پہلے کے ادبا اور شعرا کی طرح ہی حق اور حقیقت کے معیار اپنے دور کے عام آدمی کے

کلچر اور اس کی عقل و خرد سے پائے ہیں اور اپنے بزرگوں ہی کی طرح ادب کو مزید آگے بڑھانے میں کوشاں ہیں۔

کل آئے گا تو اس کے لبادے اور تیور بھی الگ ہوں گے اور گزرے کل کی نظریوں کی طرح آج کے نظریئے بھی کل کے پوسٹ مارٹم ٹیبل پر پڑے ہوں گے اس وقت بھی اسی ادیب اور شاعر کو زندہ و جاوید مانا جائے گا۔ جو اس زمانے کا ہوگا۔ پرانے ادیب اپنی کوتاہ نظری اور بزرگی کے خول سے باہر نکل کر دور حاضر کے ادب کو پہچانیں تو انہیں اوپر کہی ہوئی بات کا سچ سمجھ میں آجائے گا۔ اور وہ خود بخود سمجھ جائیں گے کہ جدید ادب میں جو نیاپن انہیں کھٹکا اور سفاہ لگتا ہے دراصل ایک نئی اور طاقتور تحریک کا حامل ہے۔

کملیشور آج کا ادیب ہے مگر جب کل آئے گا تو اس کی کئی ایک تخلیقات بھی کلاسک قرار دی جا چکی ہوں گی کیونکہ یہ معیار اور مثال کے ان بلند و مستند مرتبوں تک پہنچنے کا دم خم رکھتی ہیں جو وقت اور فاصلہ کی کسوٹیوں سے متعین ہوتے ہیں۔

یہ دنیا جہاں پر بکاؤ ہے اور ہر لطیف جذبے کے دام چکانے پڑتے ہیں، اپنا سب کچھ بے دام اٹھا دینے والے بھی کم نہیں ہوتے۔ جیسے آندھی کا ہیرو۔ دوسری طرف ہے اس کی لو الہوس من چلی مگر بلند ہمت بیوی جو شوہر کو پیار تو کرتی ہے مگر خود پسند اس سے کہیں زیادہ ہے۔ محبت اور انا کے الجھاؤ میں پڑی اس عورت کو اس کا شوہر اپنا ادھیکار دکھا کر کدھر بھی لے جا سکتا تھا مگر وہ پیچھے ہٹ گیا تھا اور وہ ملیری اپنی ذات کی کھوج میں گیا تازہ دم اور امید پرست ہے یہ حوا کی بیٹی۔ اونچی ہواؤں میں اڑنے کی لگن، پہاڑوں کو پھلانگ جانے کا عزم اور سمندر کی شوخ و تیز لہروں سے الجھنے کی امنگ۔ کیا دم خم ہیں اس لبر ٹیڈ عورت میں۔ اس کے بعد کون اسے بے چاری، بے سہارا ابلا کہنے کی جرأت کرے گا۔

عورت کی بیداری کملیشور کے نزدیک اس دور کا سب سے اہم واقعہ ہے۔ شرت بابو کی طرح اسے عورت کی ذات میں زندگی کا سرچشمہ تاریخ کی چھاتی چاک کر کے ابلتا، اچھلتا اور جوالا مکھی کے لاوے کی طرح چاروں طرف پھیلتا دکھائی دیتا ہے وہ عورت کو مرد کے بستر کی زینت ہی نہیں سمجھتا، اس کا نصف بہتر مانتا ہے اور جہاں کہیں بھی وہ غلط دمگر بظاہر خوبصورت) آدرش کے چکر میں حقیقت کو جھٹلاتی دیتی ہے اسے جھٹکا دے کر، جھنجھوڑ کر جگا دیتا ہے۔ "پھر بھی" آدرش وادی بیٹی اور حقیقت پسند ماں۔

جوانی میں اولین قدم رکھتی ہوئی حساس کنواری بیٹی کی انوکھی مانگوں سے بے نیاز ہے اور جب کی ساری دنیا ماں باپ پیار ہے جو ماں باپ کو ہر لحاظ سے آدرش جوڑی مانتی آئی ہے جس کے سنسکار یعنی پیدائشی رغبتیں اسے باپ دادا سے خون میں وراثت کے طور پر ملے ہیں۔ باپ کی اچانک موت اس کے نزدیک ایک ایسا حادثہ ہے جس کے بعد سب کچھ بے مطلب و بے مقصد ہو گیا ہے۔ اور ایک خاص سانچے میں ڈھلی ہوئی اس کی زندگی موت کی طرح سرد اور بے حس و حرکت ہو گئی ہے وہ بیٹی ہے اور ماں کا احترام کرتی ہے، مگر باپ سے اسے والہانہ پیار ہے مرنے کے بعد اس کی یاد ہی وہ اثاثہ ہے۔ جس کے سہارے کسی طرح جیا سکتا ہے۔ باپ کے اچانک مر جانے کے بعد وہ یہ سمجھ ہی نہیں پا رہی ہے کہ اس کی ماں زندہ کیسے ہے۔ زندگی کے کھیل تماشے میں اب بھی دلچس

طرح کس حق سے شامل ہے۔ اس نے دنیا سے ایک دم علیحدگی کیوں اختیار نہیں کر لی۔ وہ چاہتی ہے کہ اسی کی طرح اس کی ماں بھی مجسم الم بن جائے ہار تھا بالسن کی عورت نہ رہ کر پتھر کا بے حس بت بن جائے۔ مگر ماں عورت ہے۔ بیوہ ہوتے ہوئے بھی عورت ہے جو مرحوم شوہر کو چاہتی تو ہے پیار بھی کرتی ہے۔ اس کے نہ ہونے سے دکھی بھی ہے مگر اس لوٹتے پھوٹے، لٹے لٹے، کھوئے کھوئے پن میں بھی اس کے جواں بھرپور جسم کے کچھ تقاضے ہیں جن کا اپنا ادھیکار ہے۔

ماں بیٹی کے رشتے پر ایسے پس منظر میں اس سے بہتر المیہ کس۔۔۔ نے کہا ہے۔ ر پھر بھی ایسی جزئیات نگاری کی خوبصورت مثالیں کملیشور کی دوسری کہانیوں اور ناولوں میں جا بجا ملتی ہیں۔ کرداروں کے خدوخال ابھارنے کا جو سلیقہ اسے ہے دور جدید کے کسی دوسرے ہندی ادیب میں نہیں۔ اس کے افسانوں میں کوئی ایسا کردار نہیں ملتا جو اپنے یا زندگی کے بارے میں سب کچھ جانتا ہو۔ اپنی ہی کھوج میں سرگرداں کردار البتہ اُس نے کتنے ہی افسانوں کی زینت بنے ہیں۔ اپنے نظریوں کو واضح کرنے کے لئے کملیشور نے استعاروں کا استعمال بھی کیا ہے۔ اور مصوری کا بھی۔ البتہ ابہام سے اس نے جہاں تک ممکن تھا، گریز ہی کیا ہے۔ اس کا ادب واضح فکری بنیادوں پر بڑے خلوص اینٹ پر اینٹ جوڑ کر بڑی تہذیب و ترتیب سے اساری ہوئی عمارات کی طرح ہے جن میں تشنہ لبوں کو امرت اور تھکے ہاروں کو آرام بہم پہونچایا جاتا ہے۔

ماڈرن سائینس کے کرشمات یعنی پریس۔ ریڈیو، ہوائی جہاز وغیرہ نے دنیا کو سکوڑ کر اتنا چھوٹا کر دیا ہے کہ آج کوئی انسان بیرونی خیالات کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا بھلے ہی وہ منکر ہو۔ جو ظاہر ہے کہ پرلے درجے کی ناشکری ہوگی، دنیا کے کسی بھی خطہ کا بڑا واقعہ باقی دنیا کو متاثر کرتا ہے کہیں کوئی شہید ہوتا ہے تو اُس کی موت کا غم ہر ذی ہوش اپنے سینے میں محسوس کرتا ہے۔ یہ احساس، یہ آگاہی، عزیزوں کے غم کو اپنے میں جذب کر لینے کی یہ اہلیت بڑی چیز ہے۔ جہاں ایسے واقعات اور حادثات کے اثرات ایک عام آدمی پر عام طور سے وقتی ہوتے ہیں ایک احساس ادیب کے ذہن کو چھلنی کر کے رکھ دیتے ہیں اور اس کے یہ زخم تب تک نہیں بھرتے جب تک وہ ان اثرات کو سوچ کی بھٹی میں ڈال کر، پگھلا کر اور اپنی ذات میں جذب کر کے نئی تخلیق کو جنم نہیں دیتا۔ ہر دور کا افسانہ اس دور کی زندگی کے تمام تر تضادات دیاس و امید، قنوطیت و رجائیت سکون و ہیجان، محبت اور نفرت، مذہب اور لامذہبیت، تخلیق و تخریب سے کشید کیا ہوا عرق ہوتا ہے۔

بڑی کتابوں اور بڑے ادیبوں کے نظریوں کی تبلیغ کا بھی کچھ ایسا ہی اثر ہوتا ہے۔ آج کے دور میں یہ قطعی ممکن نہیں کہ ادیب ہومر کی طرح اندھے اندھیروں میں بیٹھ کر تخلیق کا کام کرے۔ آج کے ادیب میں بہت کچھ دیکھ کر، بہت کچھ سن کر اور بہت کچھ پڑھ کر ہی تخلیق کی امنگ پیدا ہوتی ہے۔ وہ شیشوں کے زمانے کا ادیب ہے۔ جس کے پاس اپنے عیب چھپانے کا کوئی حیلہ وسیلہ نہیں۔ لہذا ہم اکثر سنتے ہیں کہ فلاں ادیب پر فلاں ادیب کا اثر ہے اور فلاں کہانی یا نظم فلاں کہانی یا نظم کا عکس محض ہے۔ ایسا ہوتا بھی ہے اور نہیں بھی ہوتا اصل چیز مواد نہیں ہوتا، اسلوب ہوتا ہے۔ جو نیا اور انفرادی ہو تو قبول ہوتا ہے، نقالی ہو تو رد کر دیا جاتا ہے لہذا دیکھنے میں آیا ہے کہ غربی دانشوروں کے علاوہ جن کتھا کاروں کا کملیشور کی ادبی تربیت میں خاص دخل دکھائی دیتا ہے ان میں شرت بابو۔ جینیندر کمار، اور موپاساں اہم ہیں۔ ان کے علاوہ اردو افسانہ نے بھی

اُسے خاصا متاثر کیا ہے۔ یہ اثر نمایاں ہے اُس کے اُس دور کے افسانوں پر جو اُس کے بمبئی میں وارد ہونے کے
بعد شروع ہوئے۔

کملیشور نے بہت کم عرصہ میں بہت کچھ لکھ ڈالا ہے۔ افسانے، ناول، سفرنامے، ڈرامے
اور فلمی کہانیوں جیسے تخلیقی کارناموں کے علاوہ اس نے بے حد پُر مغز۔ مضامین بھی قلمبند کئے ہیں۔

کملیشور کا ذہن اپنے خوش رنگ الفاظ کا خاصا عمیق ذخیرہ ہے۔ اظہار کے لئے مناسب الفاظ
کی کمی اُس نے کبھی محسوس نہیں کی۔

عشق و محبت کی دل فریب باتیں، حسیت تیز گام بند شیں، انوکھی تراکیب، صنم دلربا کی شاعرانہ
تصویر کشی، دلی کیفیات، جذبات اور احساسات کی والہانہ شدت از خود رفتگی اور جمالیاتی پرواز ادب کے بنیادی
عناصر مانے جاتے ہیں۔ یہ سب کملیشور کی تصانیف میں بڑے ناز و افتخار سے جھلکتے اور جھانکتے دکھائی دیتے ہیں۔
روزمرہ کی سادہ حیات و حقیقت پر اس کا قلم اٹھتا ہے تو بھی اس نے وہی جوہر دکھائے ہیں جو اس کے عاشقانہ
افسانے میں جھلکتے ہیں۔ جہاں کسی مخصوص طرزِ زندگی کو اس نے اپنے کسی افسانے کا موضوع بنایا ہے۔ حقیقت اور
واقعیت سے کنارہ کش ہو کر نہیں بلکہ موضوع میں پوری طرح الجھ کر، اس میں پوری طرح ڈوب کر۔ فکر اور تخیل سحر
تراشی اور عجز اشی ہر ایسے افسانے کی فضا کچھ ایسی دلکش و دلفریب ہو جاتی ہے کہ دیکھتے ہی بنتا ہے۔

کملیشور کی کہانیاں پلاٹ کے ساتھ اور پلاٹ کے بغیر بھی ہوتی ہیں مگر کردار نگاری اس کی
ہر کہانی کا بنیادی وصف ہے۔ وہ پلاٹ کو بھی اہم مانتا ہے مگر محض پلاٹ کی الجھنوں سے قاری کو پریشان نہیں کرتا
جب بھی محبت کو لے کر اس نے اپنے کسی افسانے، ناول یا ڈرامے کا تانا بانا بنا ہے۔ اپنے دلکش طرز اظہار سے اسے
ایسے تخلیقی کرشمہ کی صورت دے دی ہے کہ قاری ذہن اپنے غموں کو بھول کر محبت کی ماری ان بے چاری برہنوں کے
پیچھے بھاگنے لگتا ہے گویا وہ اسی کے اپنے غم کی پرچھائیاں ہوں۔

کملیشور کی کہانیوں کا ولین کوئی عورت یا آدمی نہیں ہوتا۔ انسانوں کے (مہاکیہ نرنائیک) ستارے
ہوتے ہیں، قدرت ہوتی ہے یا خود خدا ہوتا ہے اور یہ خدا سے واقعی خائف ہو جاتے ہیں۔

اپنے خالق سے ناراضگی کے جذبات ہارڈی میں عام ہیں مگر ہندوستانی ادب میں ایسی
مثالیں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ ان کہانیوں میں جذبات کی شدت کچھ ایسی ہمہ گیر ہو جاتی ہے کہ
لگتا ہے کہ یہ الیکسی زخمی عقاب یا مجروح فاختہ کا کہا ہوا ہے۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ ہے کہ کملیشور
کی اس قسم کی کہانیاں پلاٹ کے اختتام یعنی آخری فل اسٹاپ پر ہی ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ اس کے بعد
بھی چلتی رہتی ہیں۔ قاری کتاب بند کر دیتا ہے تب بھی کہانی چلتی رہتی ہے۔ ایسا کیوں ہوا، کیسے ہوا،
اور یوں کیوں نہ ہوا۔ شرت نے بھی دیوداس کے ساتھ لوگوں کو رلایا تھا۔ پریم چند نے نرملا اور
ہوری کے ساتھ۔ یہ کیا بات ہے ہمارے بنانے والے کی کہ ایسے شعبدہ باز ہر تکنیک میں کہیں نہ کہیں
سے انسانوں کی دکھی آتما کو ان کے آنسوؤں سے دھونے کے لئے آتے رہتے ہیں۔ کیا تیر اندازی
ہے کہ تیر یہ تیر چلاؤ مگر ایسا کہ زخمی تو کرے مگر مارے نہیں گویا تیر کی نوک کی چبھن خلش بن کر
دل میں آ بیٹھے تو بیٹھی ہی رہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ کوئی ذی ہوش آدمی یا عورت کملیشور کی کسی واقعی اچھی کہانی کو ایک نشست میں پڑھ جانے کے بعد ایک دم کوئی دوسری کہانی شروع نہیں کر سکتی، خود کملیشور کی لکھی ہوئی کوئی دوسری کہانی بھی نہیں! اپنی کہانیوں کے کردار وہ کہاں سے لاتا ہے کہاں کے ہیں یہ عجیب و غریب مرد اور عورتیں اور کہاں سے آتے ہیں یہ جو ان فکر جیو کرے اور چھوکریاں! یہ کردار، ظاہر ہے کہ مصنف کے کردار زرخیز ذہن کی اپج نہیں ہیں۔ انہیں یا ان کی کسی ایک جھلک کو مصنف نے ضرور کہیں دیکھا ہے جبھی تو وہ اس کے اپنے ہاتھوں میں بھی پپٹ (puppet) نہیں بنے رہے۔ یوں ہوتا تو ہم اور آپ کیوں بلا وجہ رو دیتے۔ کھلونوں کے دکھ سکھ پر کون روتا ہے۔

اگر یہ لوگ فرضی ہیں محض ادیب کے ذہن کی پیداوار، تو ان کی سوانح حیات پڑھ کر آنسو اپنے آپ کیوں ابل پڑتے ہیں۔ کملیشور ہماری صدی کے چھٹے اور ساتویں دہے کے نمائندہ ادب کی صدائے بازگشت ہے جس نے اپنے سماج اور تمدن کی ہر قابل غور اتھان یا گراوٹ کا صحیح اور ایماندارانہ جائزہ لیا ہے۔ اپنے کئی دوسرے ہم عصروں کی طرح اس نے احمقانہ حد تک جذباتی، بے مقصد، بے کار زندگیوں کی ہائے توبہ کی منظر نگاری کبھی نہیں کی۔ دراصل بے مقصد قصہ ہائے عشق و وفا میں کملیشور کو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے پھر بھی اس کی تصانیف میں رنگینی اور رعنائی حسن اور دلکشی تا کیف و سرور اور سہانی سرمستی بجا مقدار میں جا بجا موجود ہے۔

کملیشور نئی تہذیب کا شیدائی ہے مگر اپنی پرانی تہذیب سے بھی بیزار نہیں وہ ہر اس قدر کا پرستار ہے جس سے انسان کے دل و دماغ کو وسعت، گہرائی، تازگی، شگفتگی اور راحت ملتی ہے۔ سکون اور تسکین ملتی ہے۔ وہ اپنے زمانے کی رگ اور روح کو پہچانتا اور اس کی مانگوں اور اس کے تقاضوں کو بھی جانتا اور سمجھتا ہے۔ وہ حقیقت نگار ہے جو دل کی ہر بات کو سادگی سے کہہ دینے کا قائل تو ہے لیکن ایک ادیب کے رنگ میں، صحافی کے رنگ میں نہیں کیوں کہ وہ ادب اور صحافت کے فرق کو سمجھتا ہے وہ جانتا ہے کہ سادہ سے سادہ بات بھی دراصل اتنی پیچیدہ ہوتی ہے کہ جب تک اس کا گہرا مطالعہ نہ کیا جائے اسے پر اثر انداز میں ان فولڈ (unfold) نہیں کیا جا سکتا، غریبی، مہنگائی، معاشرے کی تنگ نظری، کرپشن وغیرہ کسی سیاسی لیڈر یا اخبار نویس کا نعرہ تو ہو سکتے ہیں ادیب کا نہیں کم از کم تب تک وہ اس موضوع یا واقعہ کے پس منظر میں چھپی اصلی صورت حال سے آگاہ نہیں ہو جاتا۔ اخبار نویس کی حقیقت پسندی ایک دلفریب مبالغہ ہے جس کے نشتر مصنوعی اور کند ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ادیب کی حقیقت پسندی شیشے میں اتاری ہوئی وہ تصویر ہے جسے ایک نظر دیکھ کر ہی اس کا ماڈل بے چین ہو جائے

کملیشور نے خلاقی عناصر یا معاصرانہ رشک و رقابت کے جذبے کے تحت کبھی قلم نہیں اٹھایا اور نہ کبھی غیروں کی تذلیل ہی کی ہے۔

اقتدار اور معقول سماجی حیثیت کا زندگی کے اولین دور میں ہی مل جانا اس کی تخلیقی صلاحیت کا ناٹک بن گیا ہے۔ اور اسے ان ضروری چیزوں کے حصول کے لئے وہ تگ و دو نہیں کرنی پڑتی جو اکثر لکھنے والوں کی زندگی کا واحد (بلکہ محض) نصب العین بنا رہتا ہے۔

کچھ لوگ ادب میں اس کی ساری کامیابی کی وجہ ساریکا جیسے ادارہ سے وابستگی ہی کو مانتے ہیں یہ غلط ہے کیونکہ ساریکا اُس کے ادبی وجود سے پہلے کا واقعہ نہیں اُس کے بعد کا واقعہ ہے اور یہ اُس کا اپنا جنما اور پروان چڑھایا ہوا پرچہ ہے اور اس سے پہلے بھی وہ "کہانی"، "نئی کہانیاں"، "انکھنڈت" اور "نئی دھارا" جیسے جریدوں کا مدیر رہ چکا ہے۔

کملیشور نے جہاں شخصیات کی تضحیک سے گریز کیا ہے وہاں اپنے سماج کی بے اعتدالیوں ماحول و معاشرے کی خامیوں اور طبقاتی برائیوں کی بلا جھجک نندا کی ہے۔

جوگندر پال جو کملیشور کو ذاتی طور پر بھی بڑی اچھی طرح سے جانتا ہے اُس کی شخصیت سے بے حد متاثر ہے وہ اسے ایک بیدار مغز اور پختہ سیاسی سماجی اور ادبی شعور کا آدمی کہتا ہے۔

جنگ، طبقاتی کشمکش اور اہنسا سے بیزاری کا ذمہ دارانہ اظہار کملیشور کے یہاں جہاں کہیں بھی آیا ہے بڑے پُر اثر انداز میں آیا ہے کیونکہ وہ پوری ایمانداری سے اپنے آپ کو وشو ناگرک سمجھتا ہے اور نہ صرف قومی یکجہتی بلکہ بین الاقوامی ایکتا میں بھی پورا ایمان رکھتا ہے۔

جوگندر پال نے اپنے پال کملیشور کے لئے ایک بار قلندر کا لفظ بھی استعمال کیا تھا۔ قدم قدم گن کر چلنے والا جوگندر پال بھی اپنے آپ کو قلندر ہی کہتا ہے۔ خدا نہ کرے کملیشور بھی ایسا ہی ایک قلندر ہو۔

میرے خیال میں میراجی اور منٹو ادب کے پہلے اور آخری قلندر تھے۔ ہر قلندرانہ تخلیق قلندر کے کسی نہ کسی موڈ کا ردِ عمل ہوتی ہے۔ یہ موڈ وقتی ہوتا ہے۔ اگر قلندر چھوٹا ہو جیسے جوگندر پال۔ یہ موڈ طویل بلکہ دائمی بھی ہو سکتا ہے اگر قلندر بڑا ہو جیسے میراجی تھا یا منٹو تھا کسی وقتی موڈ کا ردِ عمل اتنا طویل و عریض نہیں ہو سکتا کہ باقاعدہ ناول کی شکل میں ڈھل جائے اگر میراجی اور منٹو جیسے بڑے قلندر ناول جیسی طویل گاتھا نہ لکھ سکے تو چھوٹے قلندر کیسے لکھ سکتے ہیں۔ یقیناً جوگندر پال جھوٹ بولتا ہے۔ حجاب امتیاز علی کے بعد ایسے پیارے جھوٹ جوگندر پال نے ہی بولے ہیں اور قلندر جھوٹ کبھی نہیں بولتے۔ میراجی کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ہم نے اسے مقامی ٹی ایس ایلیٹ مان لیا۔ منٹو کبھی جھوٹ نہیں بولا ہم اسے اپنا موپاساں، چیخوف یا بالزاک مانتے ہیں۔ جوگندر پال بے پناہ ذہانت کا مالک ہے مگر قلندر نہیں:

کملیشور بھی بے پناہ ذہانت کا مالک ہے مگر قلندر وہ بھی نہیں۔ اگر ایک وقتی موڈ کسی لیکھک سے ایسے ولولے اور ایسی مکمل گرفت کے ساتھ، بدنام بستی، لوٹے ہوئے مسافر، "تیسرا آدمی"، اور آگامی اتیت، جیسے بلند پایہ ایسے لکھوا سکتا ہے تو اس کی صلاحیتوں کو قلندرانہ کہہ کر اس کے جینیس کو ٹالا نہیں جا سکتا۔ میرا ایمان ہے کہ کملیشور کی زندگی میں جو پُر شکوہ تنظیم ہے وہ کوئی ادھار لیا ہوا بہروپ نہیں اور وہ اسے ہمیشہ اسی طرح بنائے رکھے گا۔ ادب کو چھوٹے قلندروں کی نہیں بڑے ادیبوں کی ضرورت ہے۔ نقاد کا کام (خدارا مجھے ناقد نہ سمجھا جائے) ہر ذی ہوش ادیب کو زندگی کی حقیقی عکاسی کے لئے اُکسانا ہوتا ہے۔ مدہوشی سے مقصدیت کی طرف موڑنا ہوتا ہے، کوری حقیقت نگاری کی طرف نہیں شاعرانہ تفصیلی منقبت نگاری کی طرف کیونکہ ایک اچھا ادیب محض فوٹو گراف نہیں ہوتا، بھرپور مقصود ہوتا ہے،

—————— اور یہ ضروری ہے کہ وہ معتبر رہی بنا رہے۔

میں کملیشور کو مدہوش ادیب نہیں کہتا دولت کا للاچ کسی بھی ادیب کو مدہوش کر دیتا ہے میرا اشارہ اس کی نئی صحبت یعنی فلمی دنیا سے ہے جس نے ساحر کو ساحر سیٹھ اور مجروح کو مجروح سیٹھ بنا کر نظم اور غزل کے دو بہترین شاعر چرا لئے ہیں۔

میں کملیشور کو مختلف متوازی صورتوں میں بٹا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس کی شخصیت کی ساخت مجھے پسند ہے۔ اسے اسی طرح اپنے اصلی روپ میں ڈھلے رہنا چاہیے تاکہ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، گھر کے اندر اور باہر، دیوان خانے میں بھی اور خواب گاہ میں بھی وہ کملیشور ہی رہے۔

—————— کملیشور جو سارکا کا مدیر اور نئے لکھنے والوں کا دوست اور راہبر ہے۔ اچھے ادب کے ساتھ ساتھ اچھے ادیب پیدا کرنا تخلیقی تجربہ تو ہے ہی ادب کی بہت بڑی خدمت بھی ہے۔ ہمارے یہاں ادیب نواز تو بہت ہیں ادیب نواز کہیں کہیں ہی ملتے ہیں۔

کملیشور کی فلمی دنیا سے وابستگی جہاں تک فلموں کو سنوارنے بدلنے میں کارفرما دیتی ہے خوش آئند کی مستحق ہے۔ کیونکہ فلم سازی بھی فنون لطیفہ کا ایک جزو ہے۔ مگر پورے طور پر فلم کا ہو کر رہ جانا مناسب نہیں ہوگا۔ کملیشور ادیب ہے اور اسے ادیب ہی رہنا چاہیئے۔ اقتدار، سماجی برتری، ناموری اور دولت ادب سے چھوٹی اشیا ہیں۔

مالش کا دریا، زندہ مردے، بیان، آدھی دنیا، اور مری ہوئی کہانیاں کملیشور کے چند افسانوی مجموعے ہیں۔ سب کے سب ایسے رنگین و معطر گلدستے ہیں جن پر کوئی باغباں بھی بلا جھجک ناز کر سکتا ہے۔

کملیشور نے بے پناہ لکھا ہے۔ پینتالیس سال کی جواں عمر میں آٹھ افسانوی مجموعے، سات ناول، تنقیدی مضامین کے تین بڑے ذخیرے، تین بڑے ڈرامے، اور بچوں کے لئے ڈراموں کی تین کتابیں آٹھ کہانیوں کے انتخابی اور تہذیبی مجموعے اور آٹھ فلم سکرپٹ لکھ ڈالنا ایک معرکہ ہی نہیں باقاعدہ معجزہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک پندرہ روزہ ہندی میگزین کا ایڈیٹر بھی ہے جو مسلسل دس سال سے باقاعدہ عین وقت پر چھپ رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی ریڈیائی مصروفیات، ٹی وی پروگراموں سے وابستگی اور فلمی دلچسپیاں قابل ذکر ہیں۔

یہ ایک کامیاب آدمی کی کہانی ہے۔ یہ ابتدا ہے یا ایک منزل۔ منزل مقصود تو ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہے۔ وہ کیا ہے، کہاں ہے، کتنی دور ہے، یہ ہم اور آپ کہہ سکتے۔ شاید کملیشور خود بھی نہیں جانتا کہ اس کی منزل مقصود کیا ہے۔ اس کا آخری آدرش کیا ہے۔ ممکن ہے وہ اپنی زندگی میں ہی اپنے آدرش، اپنی منزل مقصود کو جا لے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی جلائی ہوئی شمع اس کے بعد بھی وہ راستہ دکھائے جو شکھر کو جاتا ہے، کمال کو جاتا ہے۔

بہر حال اس کا فن بتدریج نشو و نما پا رہا ہے، پھیل رہا ہے کامیابی کا جو تصور بھی اس کے ذہن میں ہے اس کی شرائط پوری کرنے کی صلاحیت اور اہلیت بھی اس میں

روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔
مگر کامیابی ۔ کامیابی کا جو معیار ہر نئی کامیابی کے بعد بنتا ہے دور کی چیز ہے، بہت دور کی چیز۔

مگر ابھی عمر رواں ہے اور فکر جواں ہے

"تو شاید یہی ہے"

❖

.... مسئلہ آزادی کا ہے ۔ یہ سوچنے کا کہ قانون اور سیاسی آزادی کے ساتھ آدمی نے اور کتنی آزادی حاصل کی ہے، اس کی روح کا بوجھ کتنا کم ہوا ہے؟ تفکرات سے کس قدر اسے آزادی ملی ہے؟ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کام کرتے ایک فرد کی حیثیت سے اس کی عزت کتنی ہے؟ سماج برادری میں اس کی کیا اوقات ہے؟ دفتر، کارخانے اور اسکول وغیرہ میں اس کی ضرورتوں کا احساس کتنا ہے اور حال اور مستقبل کو سنوارنے میں اس کی محنت اور جذبات کی کیا قیمت آنکی گئی ہے، یعنی کُل ملا کر آدمی کا قد کتنا ہے ......؟

شیام گووند

کملیشور کی کہانیاں

• شیام گووند ہندی کے نوجوان اور زندہ دل ادیب ہیں۔ ان کی زندگی کی سنگین حقیقتوں پر گہری نظر ہے کیونکہ خود بھی ان سنگینیوں کو بھگتا ہے اس لئے ان کی تحریروں میں سماجی حقیقتیں کھل کر اُبھرتی ہیں یہ تنقیدی مضامین اور تبصرے بھی لکھتے ہیں۔ •

"سڑک پر کھڑا ایک ایک شخص جب تک اپنے مستقبل سے پُر امید اور مطمئن نہیں ہو جاتا، ادبی سطح پر ہماری جنگ ختم نہیں ہوگی۔ صرف سماجی ڈھانچے کو بدلنے سے کچھ نہیں ہوتا، سماجی ڈھانچے میں تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایک ثقافتی، معاشی اور سماجی انصاف بھی ملنا چاہیے۔ اگر یہ انقلاب پُر امن طریقوں سے برپا ہوتا ہے تو ہم بھی اس کے ساتھ ہیں۔"

کملیشور

کسی بھی تخلیق کار کی صلاحیتوں کا محاسبہ اسکی بہترین تخلیقات کی بنیاد پر ہی کیا جاسکتا ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ کملیشور کی کہانیوں کو سمجھنا اپنے وقت کے تقاضوں، گرد و پیش کے تجربات اور اس کے مفہوم کو سمجھنا ہے، انسانی تجربات و جذبات کو پہچاننا ہے۔

واقعاتی کہانی، تجرباتی کس طرح بن سکتی ہے؛ اس کی تمیز ان کی کہانیوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اپنے ہمعصروں میں وہ سب سے زیادہ تازہ دم کہانی کار ہیں۔ ان کی کہانیاں حقیقت اور آرٹ دونوں ہی معیار پر پوری اُترتی ہیں اور عام آدمی راحت محسوس کرتا ہے۔ انھیں پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ انسان فہمی میں بھی دلچسپی شامل کی جاسکتی ہے کملیشور عام انسان کے جذبات اور اسکی راہ میں حائل دشواریوں اور تمام حالات کے کامیاب ترجمان ہیں جیسا کہ "قصبہ کے عام آدمی" سے "اتنے اچھے دن" تک تمام کہانیوں سے ظاہر ہے۔

یہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ اب وہ حقیقت نگاری سے تلخ نگاری کی طرف کوچ کر رہے ہیں۔ جو تاریخی لحاظ سے اہم بات ہے اُن کا اسلوب ان کے دور کا ترجمان ہے، وہ تصورات و امکانات کے بھرم شروع ہی سے توڑ رہے ہیں اور حقیقت کو رومانویت اور معقولات کے حسین امتزاج کیساتھ پیش کرنے میں بھی کامیاب ہیں۔

عافیت لڑنے میں ہے یا بچ کر نکل جانے میں ؛ دوسروں سے لڑنا چہ معنی دارد؟ اپنے ضمیر سے بھی انسان کب تک جنگ کرے؛ اور کیا ضمیر کی جنگ سے فرار اور فرار کے بعد زندگی ممکن ہے؟

کملیشور کی کہانیوں میں کہیں تو انسان بہت ہی سہما ہوا اور اداس ہے، کہیں سوال پر سوال کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن وہ جذبات سے عاری کہیں نہیں ہے، ان ہی جذبات نے اسے لقمۂ نور بنا دیا ہے۔ وہ کہیں بھی منفی پہلو کو اجاگر نہیں کرتا ہے، معاشی محاذ پر بھی جذبات کی اہمیت کو مانا گیا ہے۔ انکی کہانیوں میں کہیں کوئی ویلن نہیں ہے۔

اس طرح انھیں حلم اور اطمینان کی علامت کہا جا سکتا ہے۔

"راجہ نربنسیا" میں یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ زندگی خوشنما خواب کیوں نہیں ہے؟ یہ گھر پاگل خانہ کیوں بن گیا ہے اور لوگ خود کو دیوانہ کیوں محسوس کرنے لگے ہیں! ہنسی کیوں نہیں آتی؟ . . . دراصل انہی سوالات سے اس کہانی کا تانا بانا بُنا گیا ہے۔

اس کہانی میں جامعیت اور شگفتگی ہے، اسلوب بھی بہت سلیس ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسان کو اسکا احساس نہیں ہوتا اور احساس کی اس کمی کے باعث وہ تشنگی محسوس کرتا ہے۔

حقیقت سے قریب ہوتے ہوئے بھی وہ حقیقت سے دور تھا۔ یہی اس کیلئے خطرناک ثابت ہوا اور اس کو خودکشی کرنی پڑی . . . . یہ کہانی تلخ حقائق کو بڑی خوبصورتی سے پیش کرتی ہے اور حقائق کو نئے مفہوم سے آشنا کرتی ہے۔ مصلحت کیلئے اسمیں کوئی جگہ نہیں ہے۔ انھیں غیر حقیقی کہنا زیادہ مناسب ہے۔ یہ ایسی ہی کہانی ہے جو دیومالائی راجہ یا دورِ حاضر کے کسی محرر کی ہی کہانی نہیں . . . اس داستان گو کی بھی کہانی ہے جو اسے سُنا رہا ہے۔

غُربت اس حد تک اسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کو فروخت کر دیتا ہے۔ بہو بیٹیوں کی عزت نیلام کر دیتا ہے۔ ماسٹر یہی کہہ رہا ہے کہ وہ نہیں ٹوٹے گا۔ وہ جتنا ہی اکیلا ہو جائے، معاشی تنگی کتنی ہی پریشان کن ہو جائے، احساسِ شکست کو وہ پھٹکنے نہیں دیگا۔ لایعنی باتوں سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھیگا۔ غریبی سے صف آرائی اس کہانی کا خاص موضوع ہے۔

غریب شخص کیلئے ماضی کا مفہوم بدل گیا ہے۔ ایک زمانے کے حالات دوسرے زمانے سے مختلف ہوتے ہیں۔ ماضی کے ایک لمحہ اور حال کے پسماندہ شخص میں فیصلہ کُن کون ہے۔ یہ کہانی کملیشور کی تلخ نگاری کے رجحان کو شروع ہی سے واضح کرتی ہے۔

حقیقت کا تصورات میں کھو جانا کیا معنی رکھتا ہے؛ انسان کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے بارے میں کیا فیصلہ کیا گیا ہے انسان کس قدر سادہ لوح ہے اور سماج کتنا ظالم۔ "کھوئی ہوئی دشائیں" کہانی کو اس نقطۂ نظر سے بھی پڑھا جا سکتا ہے جسمیں ہیروئن ایک سے بڑی کامیابی کیساتھ پیار اور دوسرے سے ازدواجی زندگی کا نباہ کر رہی ہے۔ وہ کتنا تھکا ہوا ہے اور یہاں کتنا پرایاپن ہے، یہاں سب کچھ اپنا ہے، اپنے دیش کا ہے، لیکن کچھ بھی اپنا نہیں ہے۔ اپنے دیش کا نہیں ہے۔ جذبات بھی اس کے اپنے نہیں ہیں۔ تجربہ کو وہ تخیل سمجھتا ہے۔ ظاہر ہے وہ جھنجھلا جاتا ہے اور کسی کے بارے میں کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ تنہا ہے اور اسی تنہائی نے اسے ذہنی کرب میں مبتلا کر دیا ہے۔ اسے دنیا اور اس کی چیزوں سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ شہروں میں تضیع اوقات کے مختلف بہانے ہیں انسان آئینہ دیکھنے اور دیکھتے ہی رہنے میں کافی وقت برباد کر سکتا ہے۔

انسانی زندگی پر اس کے فکر و خیال کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس حقیقت کو اس کہانی میں بڑی سلیس زبان میں اُجاگر کیا گیا ہے۔

زندگی خوابوں کا نہیں، خوابوں کے ٹوٹنے کا نام ہے، اس حقیقت کی بھی حسین ترجمانی ہے، کہانی ایک شخص کی زندگی، اس کے مسائل اور کہاں ارسطو کی فکر — کملیشور کی کہانیاں غریبوں سے متعلق ذہن کے دریچے کھول دیتی ہے۔ نئے لکھنے والوں پر ان کا اثر ناقابلِ تردید ہے۔ وہ حقائق کو لطیف طنز کے تیروں میں پرونے کا فن جانتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان کی تمام کہانیاں، فکر و موضوع کے اعتبار سے یکساں نہیں ہیں۔ تاہم ان میں ایک قسم کی مقصدیت ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ جیسے "اشلیل کہانی" جو ایک عام کہانی ہوتے ہوئے بھی مقصدی ہے۔ اس میں ایک لڑکی اکیلے پن کی وجہ سے سوکھ جاتی ہے۔ اس کے جسم میں کچھ بچا نہیں ہے، لیکن وہ مشرقیت کی دلدادہ ہے اور جسم کی نمائش سے احتراز کرتی ہے۔

کہانی کار یہ چاہتا ہے کہ عورت نوکری، کاروبار اور ہر محاذ پر اپنی صلاحیت کا مظاہرہ کرے۔

اسلوب کی سلاست اور سجاوٹ دونوں ہی کی کثرت سے کہانی کو نقصان پہنچتا ہے۔ سلاست میں احتیاط لازم ہے ورنہ سلاست اور سپاٹ بیانی کا فرق باقی نہیں رہیگا۔

"دیوا کی ماں"، "سانپ"، "لاش"، "فیصلہ"، "آدھی دنیا" اور "بیان" وغیرہ تمام کہانیوں میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ جذبات نگاری میں انھیں قدرت حاصل ہے۔ لیکن جہاں وہ اس پر کنٹرول حاصل نہیں کر پاتے وہاں کہانی بگڑ جاتی ہے۔ جیسے "نیلی جھیل" اور "رومانس کا دریا"۔ اس کے باوجود ان کی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ متاثر کرتی ہیں۔ جنیندر کمار اور نرمل ورما کی کہانیوں میں یہ خوبیاں ناپید ہیں۔

اس لحاظ سے ان کی سب سے اچھی کہانی "اتنے اچھے دن" ہے۔ اس میں بھی سپاٹ بیانی ہے، لیکن یہ کہانی کے موضوع اور افادیت کو متاثر نہیں کرتی۔ ایسی کہانی کو اور کس طرح بیان کیا جا سکتا ہے؟

اس حقیقت کو بھی قارئین کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔

عاری حقیقت نگاری میں کہانی اور فینٹیسی ایک ہو جاتی ہے۔ وقت کا تعین نہیں ہو پاتا۔ بے بس آدمی بھی ہنسنے لگتا ہے۔ زندگی اس وقت مزاح نہیں، رحم بن جاتی ہے اور اپنی ذات تک محدود ہو کر ہی جینا اور زندہ رہنا، آدمی کا مطمح نظر بن جاتا ہے۔

کہنے والے کچھ بھی کہیں لیکن کہانی کار نے پسماندہ افراد کے رگ و پے میں رچے ہوئے طنز کا احاطہ کیا ہے۔ جو زندگی، قحط کا استقبال کرے وہ کیسی ہوگی؟ اسے سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ ہڈیوں کے ڈھانچے کے درمیان جینے والوں کو بہت دیر میں ہوش آتا ہے۔

اس کے والد کا انتقال ہوا تو اس نے جلایا نہیں، کیونکہ شکر ملوں سے تجارت مقصود تھی ہڈیوں کی؟ اگر اس کی بہن کو ٹرک ڈرائیور نہ لے جاتا تو وہ اسے کہاں سے کھلاتا؟ اس کا اخلاقی نقطۂ نظر کچھ اور ہے۔ پیسے کے عوض اس کی بہن لالہ اور لالہ جیسے دوسرے لوگوں کو اپنا جسم بلا چوں چرا پیش کرتی ہے اور دادی مر گئی مگر پھر بھی اس کی ہڈی مہک رہی ہے

ان حقائق کو کملیشور نے اپنی اس کہانی میں ایسی چابک دستی سے پیش کیا ہے کہ وہ اپنے مقررہ معیار سے بھی اوپر اٹھ گئے ہیں۔ یہاں انھوں نے انسانی مصائب کو انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔

ترجمہ :- شمیم طارق

اپنے دوست

کملیشور

کے

لئے

نیک خواہشات

رامانند ساگر

اور

... جس طرح چیخوف نے کہانی کے پرانے ڈھنگ

کو بدلا اسی طرح کملیشور نے بھی اس کے پرانے

پن کو ختم کیا۔ کہانی کے مزاج کو جس طرح بدل

کر کملیشور نے اسے عام انسان کی زندگی سے

جوڑا ہے، وہ ہمیشہ نئے لکھنے والوں اور

آنیوالی نسلوں کی رہنمائی کرتا رہیگا

— سچدانند دھوم کیتو —

باقر مہدی

(ایک تنقیدی مطالعہ)

اتنے اچھے دن

کملیشور کی کہانی "اتنے اچھے دن" سیدھی سادی کہانی ہے مگر اس کی شعوری سادگی، پیچ در پیچ سوالات اٹھاتی جاتی ہے۔ کملیشور سمانتر رجحان کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ اس رجحان کا اصرار ہے کہ وہ اپنی کہانی کا رشتہ براہِ راست پریم چند سے جوڑتا ہے، یہاں پہلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑنے کی کوشش کیا بذاتِ خود ایک طرح کی رجعتِ قہقری نہیں ہے؟ اور پریم چند کی روایت سے رشتہ ٹوٹا کیسے؟ ترقی پسند افسانے نے اپنی بنیادیں پریم چند کی حقیقت نگاری پر استوار کی تھیں، آخر وہ اس کے ارتقاء میں کیسے سوویت اشتراکی حقیقت نگاری کو اپنا کر پریم چند سے الگ ہو گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ پریم چند کی حقیقت نگاری یک طرفہ تھی اور وہ ہندوستانی کسان کی زندگی کو اس کے سارے پیچ و خم کے ساتھ نہیں پیش کر سکی تھی اور پھر اس حقیقت نگاری کو کیا بدنامِ روزگار سوویت اشتراکی حقیقت نگاری کا نیا روپ نہیں کہا جا سکتا ہے؟

ظاہر ہے میں ان سوالات کو ہرگز نہ اٹھاتا اگر اس کے لکھنے والوں کے دعوے نہایت مبالغہ آمیز نہ ہوتے۔ اس لئے کہ کملیشور ہندی نئی کہانی کے بھی بڑے ہمنوا رہ چکے ہیں اور آج وہ اس "فن" کو رد کر کے پریم چند سے رشتہ جوڑ چکے ہیں۔ کیا یہ ایک ادیب کو سیاسی کارکن بنانے کی مہم نہیں ہے؟ اس لئے کہ میں خود سمجھتا ہوں کہ بغیر کسی جھجک کے ادیب کو اپنے سیاسی مسلک کا اظہار کرنا چاہئے۔ مگر سمانتر رجحان کے چلانے والوں نے حقیقت نگاری کو اس وقت اپنایا جب کہ اندرا گاندھی کا "سورج" عروج پر تھا۔ پوری ایمرجنسی میں کملیشور نے اندرا کی ظالم حکومت کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ یہی نہیں، میری اطلاعات یہاں تک ہیں کہ وہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے ممبر بننا چاہتے تھے۔ میں یہ غیر ضروری باتیں کیوں کر رہا ہوں؟ میرا کام تو اس کہانی کا ایک تجزیہ پیش کرنا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ "اتنے اچھے دن" کی شعوری سادگی ہے۔ غالب نے اسی خیال کو یوں پیش کیا ہے ؎

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

یعنی یہ سادگی دکھاوے کی ہے ورنہ بات تو وہی پرکاری یعنی چالاکی کی ہے۔

عرصہ ہوا مارکسی مفکر آرنسٹ فیشر نے (جنھیں سوویت حکومت غدار اور اسی قسم کے الفاظ سے یاد کرتی ہے۔ اس لئے کہ سوویت یونین ہر قسم کی آزادی کو اور خاص کر فنکار کی آزادی کو علامہ اقبال کی نظر سے دیکھتی

ہے" علامہ اقبال کا مصرعہ ہے ؎ آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد)۔ اپنی مشہور کتاب "آرٹ کی ضرورت" (۱۹۶۳ء) میں عام آدمی سے بحث کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اشتراکی حقیقت نگاری بھی مردم الوہیت کا شکار ہو جاتی ہے جب وہ "عام آدمی" کو آدرش بنا کر پیش کرتی ہے۔ یہی نہیں اس نے یہاں تک کہا ہے کہ "یہ ایک قسم کی مراجعت ہے"۔
(آرٹ کی ضرورت ص ۲۱۳)

متوسط طبقے کے افراد اور اس کے لکھنے والوں کا ایک احساس جرم یہ بھی ہے کہ وہ اپنے آپ کو عام آدمی سے جوڑنے کے خواہاں رہتے ہیں، ظاہر ہے خود کو Declass کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ ترقی پسند ادیب اسی خوش فہمی کے شکار ہیں اعلیٰ طبقہ میں مقبول ہوئے۔ حال ہی میں دالت (Dalit) ادب کے ایک نامور شاعر نامدیو ڈھسال نے صرف اپنے طبقے ہی سے غداری نہیں کی بلکہ اندرا گاندھی کے ہریجن ترجمان تک بن گئے۔ میرا یہ سب باتیں کہنے کا یہ مطلب ہے کہ ؎

مدتوں ہم کو یہی سودا رہا دیکھیں بھلا
کون "باغی" ٹھوکریں کھا کر کہاں سائل بنا؟

★ ★ ★ ★

"اتنے اچھے دن" پڑھنے کے بعد میں نے "کفن" کا مطالعہ کیا۔ یہ چالیس سال پرانی کہانی دو کسانوں یا دو نیم وحشیوں کی زندگی کی چند جھلکیاں پیش کرتی ہے۔ نیم وحشی اس لئے کہ جاگیرداری کی مروت، بھائی چارے کی قدروں کے باوجود ہندو سماج کی ذات پات نے ہریجن کو سماج باہر کر رکھا ہے اور وہ "اچھوت" بن کر آج بھی زندگی گزار رہے ہیں۔ کفن کی کلبیت (cynism —) کو ترقی پسند پسند نہیں کرتے ہیں، مگر پریم چند نے اتنی چابکدستی سے انسانی "کمینگی" کو پیش کیا ہے کہ آج بھی وہ روح فرسا منظر تر و تازہ نظر آتا ہے۔ آلاؤ کے سامنے دو سالے آلو کھا رہے ہیں اور اندر جھونپڑی میں ایک عورت دردِ زہ میں مبتلا چیخ رہی ہے۔ اس کی چیخیں ہمسایوں کو بھی نہیں بلاتی ہیں اس لئے کہ اچھوت کا ہمسایہ کون ہے اور وہ دو سالے بھی اس کی مدد کرنے کی بجائے اس کی موت کے منتظر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت غاروں میں واپس جا چکی ہے۔ ان میں ایک بھی اس ڈر سے نہیں اٹھتا کہ دوسرا زیادہ آلو کھا لیگا۔ پریم چند نے آدمی کی روح کو ننگا کر دیا ہے۔ اس کی ساری اذیت کوشی، ساری وحشت اور ساری سادگی رات کو روزِ روشن کی طرح نظر آتی ہے اور اتنی تیز ہے کہ میں پریم چند کے مقناطیسی مشاہدے کے طلسم میں جکڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی، پریم چند کی یہ کہانی دو بھوکے انسانوں کو ناقابلِ برداشت سماج میں وحشیانہ زندگی گزارتے ہوئے کسی قسم کی رعایت نہیں کرتی، وہ گھیسو اور مادھو کی کاہلی، بے حسی اور بربریت کو عریاں کر کے چھوڑتی ہے مگر ان دو سالوں کی زندگی کو اس دیہاتی سماج کے پس منظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ پریم چند کے یہ جملے ملاحظہ ہوں:۔

"جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت، ان کی حالت سے بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے۔ وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بیں تھا۔ اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کی آئین و ادب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لئے اس کی جماعت کے اور لوگ، گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا

بنے ہوئے تھے، اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے فائدہ بھی نہیں اٹھاتے ۔"

کفن کے یہ جملے اس بات کی صداقت کو پیش کرتے ہیں کہ گھیسو اور مادھو" کام چور" کیوں بنے، اس لئے کہ کام کر کے بھوکے رہنے سے بہتر ہے کام نہ کر کے بھوکا رہنا ۔ !

آخر میں گھیسو اور مادھو اپنی بچی ہوئی پوری کا پتل بھکاری کو دیدیتے ہیں ۔" لے جا! کھوب کھا اور اشیرباد دے ۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی مگر تیرا اشیرباد اسے جرور پہنچ جائیگا ۔ روئیں روئیں سے اسیرباد دے، بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں ۔"

کیا اس سفاک حقیقت پسندی سے رشتہ جوڑنے کے لئے سوویت اشتراکی حقیقت نگاری کی ضرورت ہے ؟ اور کیا یہ حقیقت نگاری سماتنر رجحان کو تقویت پہنچاتی ہے یا ضرب لگاتی ہے ؟ کیونکہ یہ انسان کی بنیادی کمینگی کی بھی نشاندہی کرتی ہے !۔

کملیشور کی کہانی کا اس کہانی سے تقابل کرنا مقصود نہیں ہے ۔ میں نے پریم چند کا ذکر صرف اس لئے کیا کہ سماتنر کے علمبرداروں کو پریم چند سے "عشق" ہے مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اپنی ساری نیچرلزم کے باوجود پریم چند گاندھی وادی تھے یعنی مصلح ۔ بقول ن ۔م ۔ راشد ـــ

مُصلحِ قوم نہیں ہوں کہ میں
آہستہ چلوں
اور ڈروں ۔ قوم کہیں جاگ نہ جائے ۔

کملیشور کی کہانی کی پہلی خوبی اس کا طنز ہے اور اس کا بیان خاصا شاعرانہ ہے ۔ یہ نیچرلزم والی، حقیقت نگاری نہیں ہے مگر اپنی سفاکی میں بھی کم نہیں ہے ۔ اس کے بیشتر جملے دو دھاری تلوار کی طرح چلتے ہیں" قحط ۔ ایک نعمت ہے ۔ ہڈیاں روزگار عطا کرتی ہیں اور یہیں کا لفظ " بھاجا بھی" رحمت الٰہی" معلوم ہوتا ہے ۔

کملیشور منظر نامے لکھتے ہیں اور فلم کی اس تکنک کا ان کی کہانی پر خاصا اثر نظر آتا ہے، ان کا قلمی کیمرہ ایک لانگ شاٹ لیتا ہے اور گاؤں کا منظر پیش کرتا ہے ۔" ٹرک کا اڈا" ریلوے اسٹیشن، سب ہی چند جملوں میں ابھر کر سامنے آجاتے ہیں اور پھر یہ کہانی واحد متکلم میں لکھی گئی ہے اس لئے مصنف کے بجائے اکثر بالا ہی مشاہدہ کرتا ہے اور کہانی کا تانا بانا اسی کی فکر و جہد سے بنتا ہے ۔ شکریل میں ہڈیوں کو استعمال کیا جاتا ہے اور وہ مذہب جہاں ہڈیوں کو پھول کہتے ہیں وہاں کے لوگ یہ پھول جمع کر کے خوب تجارت کر رہے ہیں ۔ آخر آدمی کوئی نہ کوئی جینے کا سہارا ڈھونڈھ ہی لیتا ہے ۔ نظیر میاں نے کیا خوب کہا تھا ؎

کچھ بھی ہو کسی طور کما کھائے مچھندر

شہروں میں کتنے ہی، غریب انسانوں کو بیچ کر جیتے ہیں اور بالا بیچارہ تو صرف اپنے رشتہ داروں اور جانوروں کی ہڈیاں بیچ کر زندگی کے دن گزار رہا ہے اور جب ہڈیاں نہیں ملتیں تو کملی کی ہڈی چھوٹنے والے کتے کچھ نہ کچھ دے ہی جاتے ہیں اور وہ زندگی کے دونوں پاٹوں کے بیچ جیتے رہتے ہیں ۔

کملیشور نے ڈرائیور بلتہ سنگھ کا فعال کردار پیش کیا ہے ۔ بالا تو گدھوں میں ایسا چھپ گیا

تھا کہ کملی کو (ایک بار سلاش کرنا مشکل ہو گیا تھا یعنی بالا بھی ایک علامتی کردار ہے۔ وہ بھی ایک گدھ ہے جو ہڈیاں اپنے مرے ہوئے رشتہ داروں کی۔ بیچ کر زندگی گزار رہا ہے۔ اس کردار میں ارتقاء ہے مگر بہت کم۔ وہ دریا میں نہانے جاتا تھا تو اس کی دادی منع کرتی تھی اور پھر وہ آخر میں دادی کی ہڈیاں ندی میں ڈال دیتا ہے اور پانی خون خون نظر آتا ہے۔

"ہوا تنے لمبے دن" مختلف مناظر میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کو فلم بنانے کے خیال سے لکھا گیا ہے یا نہیں مگر بار بار مجھے یہ خیال آتا ہے کہ یہ ایک منظر نامہ زیادہ اور کہانی کم ہے اور جس کہانی کی بنیادی اساس طنز پر ہو وہ بیان کی نہیں انداز کی کہانی ہوتی ہے جبکہ حقیقت نگاری میں جس کا کہ رشتہ پریم چند سے جڑا ہوا ہے، تفصیل (یا جسے خبریات نگاری کہتے ہیں) بہت ہوتی ہے۔ کہیں تو کملی کا چہرہ، اس کے بدن کے نقوش، حتیٰ کہ اس کے کپڑوں کے رنگ تک کا علم نہیں ہے، کہیں کملیشور نے کردار نگاری کے لئے "کافکا" کا انداز تو نہیں اختیار کیا ہے؟ کافکا نے اپنی محبوبہ کے بارے میں لکھا تھا "میں کبھی کبھی ایف کے بارے میں سوچتا ہوں، مجھے اس کی چند جھلکیاں ہی نظر آتی ہیں، اتنی کم کہ انھیں سمجھا جا سکتا ہے۔ اسی سے اس کا امیج صاف، پاک اور بے ساختہ نظر آتا ہے۔ جس کی تعریف بھی ممکن ہے اور جو ماورائی بھی ہے"۔

مگر نہیں کملیشور تو حقیقت نگاری کو نیا روپ دینا چاہتے ہیں۔ کیا وہ اس کوشش میں اس کہانی میں کامیاب ہیں؟ — متوازی رجحان کے بارے میں جو دعوے کئے گئے ہیں اس سے قطع نظر یہ کہانی خاصی پُر اثر ہے۔ اس کو چابکدستی سے لکھا گیا ہے۔

— اور اس میں جگہ جگہ علامت نگاری کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ شہر یعنی صنعتی اثرات دیہی زندگی کی قدروں کو دیمک کی طرح کھائے جا رہے ہیں اور لوگ خوش ہیں کہ روزگار تو ملا مگر وہ اس نظام سے پہلے بھی تو نیم وحشی زندگی گزارتے تھے۔

مجھے یہ اعتراض ہے کہ کملیشور نے طنزیہ انداز تو اختیار کیا مگر خالص طنز زہریلا ہوتا ہے، بچھو سے زیادہ خطرناک۔ مگر کہانی کا خاتمہ وہ نہایت روایتی انداز میں کرتے ہیں۔ بالا اپنی بہن کے طوائف بننے پر خوش نہیں تو خفا بھی نہیں ہے۔ اس کو زندگی کی سفاک حقیقت سمجھ کر تسلیم کر لیتا ہے وہ اپنے کتنے ہی رشتہ داروں کی ہڈیاں بیچ کر کھا چکا ہے مگر اپنی دادی کی ہڈیاں کو ندی میں "پھول" کی طرح ڈال دیتا ہے، کیا اس سے حقیقت نگاری کم نہیں ہوتی ہے؟ جو انسان کو ہر قیمت پر زندگی کو قبول کرنے کو کہتی ہے۔ کیا اس میں رومانویت کا ایک جز ہی سہی، نہیں آ گیا؟ یا کملیشور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اپنے خاندان کی ہڈیاں بیچ کر بالا بڑا شرمندہ ہوتا ہے اور اس میں ایک قسم کا احساس جرم پیدا ہو جاتا ہے؟ مگر بالا کا کردار اس کہانی کے دوسرے کرداروں کی طرح یکطرفہ نہیں۔ ظاہر ہے ایک مختصر کہانی میں ان کی پہلو دار شخصیت کو پیش ہی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اشارے تو ممکن تھے۔

میں نے کملیشور کی چند ہی کہانیاں پڑھی ہیں اس لئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ ان کی سب سے اچھی کہانی ہے مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ یقیناً ان کی اچھی کہانیوں میں شامل ہوگی۔

کملیشور
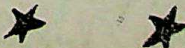
اِتنے اَچھّے دن....

سچ مُچ اتنے اچھّے دن تو کبھی نہیں آئے تھے۔

پاس میں اگر بڑی گودام نہ ہوتا، تو بہت مشکل ہوتی ــــ سب ہی کچھ تو اچھا تھا۔ تین چار گاؤں پاس لگے ہوئے سب کے بیچ میں سوکھی چراگاہ۔ اتنے سارے رشتے داروں کے گھر۔ تین کوس پر بہتی ندی، اونچے نیچے ٹیلوں والا بیابان۔ پاس سے جاتی بستی کی سڑک۔ خاص سڑک پر رات میں ٹرکوں کے رکنے کا اڈا۔ اُس اڈے سے میل بھر بائیں بڑی گودام۔ اُس سے بھی تین میل پر ریل گاڑی کا اسٹیشن چاروں گاؤں میں اگر اتنے رشتے دار اور ڈنگر اور جانور نہ ہوتے، تو بھی کام نہیں چلتا۔ اور بیس میل دور شہر میں شکر کی ملیں نہ ہوتیں تو بھی دقّت ہوتی۔ سڑک اونچے نیچے ٹیلوں والے بیابان سے نہ گزرتی، تب بھی ٹھیک نہیں تھا ــــ!

گھر میں چھوٹی بہن کملی نہ ہوتی تو کیسے کام چلتا۔ اُس بیابان سے ٹرک نہ گزرتے ہوتے، تو بھی دِقّت ہوتی اور ریتا سنگھ ٹرک ڈرائیور اگر رات میں کملی کو اٹھا نہ لے جاتا، تو اُس کی زندگی ہی برباد ہو جاتی۔

سب کچھ اچھا ہی ہوا تھا ــــ۔

سب سے اچھی بات تو یہ ہوئی کہ علاقے میں لگاتار تیسرے سال بھی قحط پڑ گیا۔ قحط نہ پڑے تو گاؤں کے لوگ گھر سے باہر نکلتے ہی نہیں۔ جن کے اپنے کھیت ہیں، وہ تو باہر ہو آتے ہیں ــــ جن کے کھیت ہی نہیں، اُن کا تو کہیں کچھ بھی نہیں ہے۔ کھیت والوں کے کھیت پر مزدوری کرنا اور وہیں گاؤں میں پڑے پڑے مر جانا ــــ کہاں کچھ اور ہوتا ہے ــــ!؟

کملی کے لئے تو اور بھی اچّھا ہوا، وہ کب ــــ کہاں نکل پاتی۔ بالا کے لئے تو پھر بھی ایسا ہے کہ ایک آدھ گاؤں گھوم آئے، ندی تک ہو آئے، درجہ پانچ تک پڑھنے چلے گئے۔

ندی تک بغیر کہے سنے بالا ہو آئے تو ٹھیک تھا ــــ کہہ دیا تو مشکل ہوتی تھی، دادی اُسے جھڑکنے لگتی تھی...... ندی پر مت جایا کر۔ چلے بھی تو نہانا کبھی مت ــــ دادی بولتی تھی تو پیر کی انگلی میں پڑے کالسنے کے چھلّے کو گھماتی رہتی تھی ــــ شاید وہ اسے دکھاتا تھا) دادا بھی یہی بولتا تھا۔!

وہ دونوں مانتے ہی نہیں تھے کہ وہ ندی تک جائے گا اور نہائے گا نہیں — ! اور بالا کو ندی میں اترتے ہمیشہ ڈر لگتا تھا اوپر سے دادی جھوٹ بولتی تھی ...... کہاں ، پانی کا رنگ نہیں ہوتا — !

بالا ہمیشہ کہتا تھا ..... دادی ، میری بات سُن ، میں دیکھ کر آیا ہوں ۔ پانی کا رنگ لال ہے — خون کی طرح لال — !

دادا قہقہہ مار کر ہنس پڑتے تھے ...... کیسی بات کرتا ہے رے .... پانی کا کوئی رنگ نہیں ہوتا — تو ندی پر مت جایا کر ، جائے تو نہانا کبھی مت ۔

دادا — دادی کی یہ باتیں اب اصل میں بالا کو یاد آتی ہیں ۔ ہنسی بھی آتی ہے ۔ اُن کے پاس اور باتیں ہی نہیں تھیں ، اپن کے پاس تو بہت کچھ ہے ۔ بہت کچھ کیا ، سب ہی کچھ ہے — !

سردی سالی کچھ زیادہ ہی تھی — جدھر سے کتھری اُٹھ جاتی ، اُدھر سے ہوا آر جن کے تیر کی طرح لگتی — کملی کھلکھلا رہی تھی ، اُسے لگا — چلو سب ٹھیک ہے ۔ کملی خود تو نہیں چلتی ، پر ڈرائیور کی شیشی میں سے دو چار گھونٹ بچا کر رکھ دیتی ہے ۔ اس کے لئے — اور کیا چاہئے !

سالا کلینر زیادہ ہی کھدر بدر مچائے ہوئے تھا ۔ نہ سوتا تھا ۔ نہ سونے دیتا تھا ، بار بار بیڑی سُلگاتا ہے ، کھانستا ہے ، گودڑی کھینچتا ہے ، ابے اتنا جاڑا لگ رہا ہے تو موبل آئیل ڈال کر آگ جلالے — !

نیند تو ڑدی سالے نے ۔ کیسی مزے کی نیند آتی ہے یہاں اس سرائے میں ۔ کملی یہاں سے تو سب ٹرک والے بستیاں پار کر کے سیدھے یہیں آتے ہیں ۔

رتڑک سرائے ، کے مالک نے بھی پورا انتظام کر رکھا ہے ۔ بڑا سا احاطہ گھیر کر ٹرکوں کی سرائے بنائی ہے ۔ باہر بھی دس بارہ ٹرکوں کی جگہ ہے ۔ دن میں کھانے کی میزیں اور بینچ پڑ جاتی ہیں ، رات کو کھاٹیں — تھکے ماندے ڈرائیور اور کلینر دن میں آرام کر لیتے ہیں ۔ پوری رات گذارنے کے لئے تو پورا انتظام ہی ہے ، ہر طرح کا کھانا ، مرغا درغا کھانا ہو تو سامنے دڑبے میں سے پسند کرو ۔ اپنے سامنے بنواؤ ، پکواؤ اور کھاؤ — بیڑی سگریٹ کی کمی نہیں ۔ گراموفون بھی بجتا ہی ہے ۔ دانت کھودنے کھودنے تصویریں دیکھنا چاہو تو بچا سوں لگے ہیں — بھگوان کی تصویریں اچھی لگیں تو وہیں دیکھو ۔ نانک وانی سننی ہو تو ریکارڈ سنو ۔ عورتوں کی تصویر دیکھنی ہوں تو وہ بھی لگی ہیں ۔ لنگی ، کچھا دھونا ہو تو بٹیا بچھی ہے ، ٹیوب ویل لگا ہے ، سکھانے کے لئے تار بندھے ہیں ۔ مزدوریات سے فراغت کے لئے سوکھے کھیت پڑے ہیں ۔

ابے تو کیوں اُٹھ کے بیٹھ گیا — ؟ سویرا ہونے میں بہت دیر ہے ۔ جاڑا لگتا ہے — ؟

اپن کو تو نا — !

ہے ..... سالا بیڑی سُلگا کر کھینچے جا رہا ہے ، بیڑی کے جلتے پھول میں آنکھیں

کیسی چمکتی ہیں کتوں کی طرح ...... لکھن کلینر کی۔
کتا بھی سالا بڑا بھلا جانور ہے۔!
قحط پڑا تو بھی نہیں بھاگے — گاؤں کے ہی بیابان میں لاشوں کو نوچتے نوچتے مر گئے۔
گدھ سالا بہت تیز ہوتا ہے۔ چار پانچ کتے نہ لگیں تو ایک گدھ کو لاش پر سے ہٹانا مشکل ہوتا ہے۔

...... تو یہاں آیا کیسے؟ لکھن نے پوچھا۔

...... تو بیڑی پی لے، اچھی طرح کھانس لے، بتاتا ہوں، بالا بولا۔!

......ہاں، بتا۔!

...... تو سن! تجھے نیند کیوں نہیں آرہی ہے؟! اچھا۔ اچھا سن!
یہ کملی میری بہن ہے نہ ...... ایک شام .....

...... سچ — ! اور لکھن کملی کی بات پر ہی اٹک گیا۔

— ابے اور کیا۔؟

...... کملی لڑکی اچھی ہے، سمجھ دار ہے۔ ڈرائیور کہیں اور رکتا ہے تو بھی اس کی بات کرتا ہے۔ ایک رات، ٹرک بگڑا تو پیدل لوٹنے کو ہوا تب ہم نے ہی ڈرائیور کو سمجھایا...... اب دس کلومیٹر ہے،
کوئی ادھر جاتا ٹرک لے لو، سویرے لوٹ آنا۔ میں تو ہوں — پھر ٹرک پر لدے ہوئے سامان کی ذمہ داری بھی تھی — سو وہ نہیں گیا۔

...... اچھا۔! تو سن...... یہ سالا بورا بہت مہک رہا ہے۔ پہلے اسے ہٹا دے۔

...... کیا ہے اس میں؟ — لکھن کلینر نے پوچھا تھا۔

— سالی ہڈیاں ہیں!

لکھن کلینر سمجھا نہیں۔ بیڑی پی کر کھانسنے لگا، سردی میں اٹھنے کی ہمت نہیں پڑی تو بورے سے آتی بدبو کو اس نے سہ لیا۔ کلینر بیڑی پیتا ہے تو بدبو دب جاتی ہے۔ بیڑی پھینک کر کلینر اونگھنے لگا۔
اپن کو کیا ضرورت پڑی ہے۔ قصہ سنانے کی سو تو سالے۔!

....

صبح اٹھتے ہی ببول کی ٹہنی توڑ کر اس نے مسواک کی۔ لکھن اب آرام سے سو رہا تھا، اسے جلدی نہیں تھی۔ تب ہی ایک ڈرائیور رضائی میں بھالو کی طرح ہلا۔ اس نے اٹھ کر تہمد باندھی اور دونوں بانہیں چھاتی سے چپکائے ضرورت سے فراغت کے لئے چلا گیا۔
لکھن کا ڈرائیور بنتا سنگھ پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ وہ باہر سے لوٹ رہا تھا۔ چھپری میں پڑی کملی گٹھری بنی سو رہی تھی، اس کی ٹھاٹ کے بانسے پر بنتا سنگھ کی پگڑی اجگر کی طرح لپٹی رکھی تھی۔

جلدی اُسے بھی تھی، اُس نے بورا اٹھایا اور سر پر لاد کر ہڈی گودام کی طرف چل دیا
سالا بورا بہت مہکتا ہے پر دام تو اچھے دیتا ہے...... کملی بھی چار یا پانچ روپے بنا لیتی ہے۔ ایک سو ا
روپے بورے پر ہڈیوں کے مل جاتا ہے۔ چھ روپئے روزانہ کون کماتا ہے سالا۔
یہ تو اچھا ہوا کہ شکر کی ملیں کھل گئیں، اور یہ ہڈی گودام بھی۔ شکر کو چمکانے کے لئے
شورے کی ضرورت پڑتی ہے۔ پتہ نہیں ان سوکھی ہڈیوں میں سے شورا کہاں سے نکلتا ہے۔
نکلتا ہوگا.......

گودام کے کانٹے پر بورا پھینکا کر اُس نے موٹی سی گالی دے کر چندو کو پکارا......
تول کر...... یہ سالی سردی.......

چندو کہیں دکھائی نہیں پڑا پھر گودام میں بھری ٹنوں ہڈیوں کے پیچھے سے آتا وہ دکھائی
پڑا۔ جیسے پنجر اُٹھ کر چلا آرہا ہو۔ آتے ہی اُس نے دانتیں دکھائیں۔ جیسے مسکرا رہا ہو۔

— آج سویرے سویرے آگیا...... بالا......

— شام دیر ہوگئی تھی۔

— کملی ٹھیک ہے؟

وہ اُس کا مطلب سمجھ گیا۔ چندو کے دل میں ایک پھانس ہے، نہیں تو پوچھنے کی کیا ضرورت
تھی۔ کانٹے کے دوسرے پلڑے پر باٹ رکھتے ہوئے چندو نے کہا...... یہ دن پہلے آجاتے تو کاہے ہم تین
سے دو رہ جاتے ۔ !

چندو کا کہنا تو ٹھیک تھا، پر تب یہ سب کاروبار شروع کہاں ہوئے تھے؟ اسی لئے
تو اُس نے سمجھا دیا تھا...... دیکھ چندو تو کملی کی لگن دل سے نکال دے ..... کھانے کو دو
کے لئے نہیں ہے تو تین کے لئے کہاں سے لائے گا......؟

اگر یہ قحط پہلے ہی پڑا ہوتا، اور ہڈیوں کا دھندا شروع ہوگیا ہوتا تو کون سی دقت ۔ !

وہ یہی سب سوچ رہا تھا کہ چندو نے تول کر کے بورا نیچے پٹخ دیا۔ چندو کے من میں بالا کے
لئے خیال تھا، دھیرے سے بولا.......... انگریزوں کے زمانے کی ایک قبرگاہ تین میل اُتر میں ہے۔
قبروں کے پتھر تو سب کھود لے گئے۔ ہڈیاں دبی پڑی ہیں، اُنہیں کھود لا۔!

— ان میں سے شورہ نکلے گا — ؟ بالا نے پوچھا تھا۔

— سب چیز میں ملاوٹ ہوتا ہے۔ ہڈی میں بھی ملا دیں گے! آنکھ دبا کر چندو نے
کہا تھا۔

سالا — ! بالا کے منہ سے من ہی من گالی نکلی تھی۔ دنیا چاہے تو ایک کے پانچ روپے
بھی دے سکتا ہے — وہ نہیں کرے گا، پر یہ سب بتا کر اپنا پن جتائے گا۔ پیسے لے کر وہ چلا آیا
تھا۔

لیکن چندو نے قبرگاہ کی ٹھیک اور صحیح خبر دی تھی - ہڈیاں تازہ تو نہیں تھیں، پر جیسے کوئلے کے کان ہاتھ آگئے تھے - جہاں کھودو وہاں ہڈیاں نکلتی تھیں۔ اُسے لگا تھا، ایسی دو چار کانیں اور ہاتھ آجائیں تو زندگی ہی بدل جائے ! آدمی اچھا ہے - چندو !

پر پرانی ہڈیوں سے زیادہ چلا نہیں ———

• • •

اصل میں جب تیسرے سال بھی قحط پڑا تو بالک کو ہوش آیا تھا - اپنے رشتہ داروں کی ہڈیاں کتنی کی توہیں ! اپنے رشتے داروں کے "ڈھور ڈنگروں" کی ہڈیاں کتنی قیمتی ہیں - ہڈیوں کے لئے تب جہاں بھارت مچا تھا - لوگ بھرا لگانے لگے تھے ...... یہ ہمارے رشتہ دار کی ہڈیاں ہیں ..... یہ اُن کے ڈھور ڈنگروں کی ہڈیاں ہیں ! ان پر ہمارا حق ہے -

تب بالا نے جم کر لڑائی لڑی تھی — گاؤں میں اور آس پاس رہتے رشتہ داروں کی ہڈیوں کے لئے وہ لڑا تھا - ڈھور ڈنگروں کے پنجروں کے لئے اُس نے لڑائی کی تھی .....

تب ہی دادا اور دادی مرے تھے - آٹھ دنوں کی دوری پر — اور ستائیسیں دن بابو مرا - اماں تو آٹھ سال پہلے ہی مر گئی تھی - بابو نے بہت کہا تھا پر بالا نہیں مانا تھا - کہ دادی کی نعش کو جلایا جائے !

——— جلانے سے کیا ملے گا ؟ بالا بابو پر چیخا تھا -

اور بابو چیخا تھا - - - - - ارے کمینے ! تو میری ہڈیاں بیچ کھائے گا - ایسی اولاد سے تو نپوتا ہی مرتا — !

بابو نے جو کچھ کہا ہو ! پر یہ دن کیسے آتے اگر بابو کی بات مان لیتا - کھانے کو کیا تھا — ؟ بیچنے کو کیا تھا ؟ سب طرف تو دھرتی جھلسی پڑی تھی تب ہی تو اُس نے طے کیا تھا کہ تپتی دھرتی کے نیچے اگر نعش دبا دی جائے گی تو ہڈیاں جلدی صاف ہو جائیں گی - گدھ اور کتے صاف کرنے میں دیر لگائیں گے - اِدھر اُدھر کھینچ کے بھی لے جائیں گے - پر رات میں کوئی ہڈیاں کھود نہ لے جائے اسی کے لئے تو اُس نے کملی کو پہرے پر لگایا تھا اور وہیں سے، سڑک کنارے سے نبتا سنگھ اُسے اُٹھا لے گیا تھا -

یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا، اچھے دن آتے ہیں تو ایک ساتھ آتے ہیں، جب بالا کو پتہ چلا کہ کملی ٹرکوں کے سرائے میں ہے تو وہ گیا تھا، بابو اُس وقت زندہ تھا پر اتنا زندہ نہیں کہ سرائے تک آپاتا - وہ بھوک سے دھیرے دھیرے مر رہا تھا - پر پھر بھی بیچنے کا کوئی اور راستہ کھوجنے کے لئے تیار نہیں تھا - اصل میں یہ بہت اندرونی علاقہ تھا، جہاں تک سرکاری مدد بھی نہیں پہونچ پائی تھی، جیسے کھیت میں سرکاری پانی جاتا ہے نا، جس تک پہونچا، پہونچ گیا - اس کے بعد.......

ہونا دہی تھا - بابو کو بھی مرنا تھا — !

پہلے دادا مرا، اُس کے بعد دادی، اُس کے بعد بابو — !

رشتے دار اور اُن کے ڈھور ڈنگر تو مر ہی رہے تھے -

پر تب تک بابو نہیں مرا تھا، شاید اُس کے مرنے سے ایک دن پہلے کی بات ہے، بالا جانوروں کی ہڈیاں بٹور رہا تھا، گدھوں اور کتوں کے بیچ، سالے گھسیٹ گھسیٹ کر بہت دور لے جاتے ہیں تب کملی اُسے کھوجتی آتی تھی وہ بالا کو گدھوں اور کتوں کے جمگھٹ کے بیچ کھوج نہیں پاتی تھی اُن کے بیچ وہ گھٹنے موڑے گدھ کی طرح ہی بیٹھا تھا، صاف ہو گئی ہڈیوں کو چنتا ہوا۔

جب دادی کی لعش زمین کے نیچے دبائے گیا تھا تو کملی نے کہا بھی تھا...... دادی کے پیر کی انگلی میں پڑا چاندی کا چھلا نکال لے۔

——— چاندی نہیں، کانسہ ہے اُس نے پرکھ کر جواب دیدیا تھا۔ کملی اتنا جانتی بھی نہیں تھی، کانسہ ہی ہوگا۔

بھلا ہو شکر کی ملوں اور بنیا سنگھ کا۔ یہ دونوں نہ ہوتے تو یہ دن کیسے آتے —؟ ہڈیوں کی کانیں وہ کیوں کھودتا؟ کملی ٹرکوں کے سرائے میں اتنے آرام سے کیوں رہتی۔؟

یہ سالا چندو تو پاگل ہے جو اب بھی کہیں کملی کی لگن لگائے بیٹھا ہے۔ جو کچھ کملی ادروں سے پاتی ہے وہ چندو سے تو ملنے سے رہا —!

ہو گا وہی، جو اب ہوتا ہے، یہ اور پر چندو کو کھلانا اوڑھے گا! یہی سب سوچتا۔ سوچتا وہ ہڈیوں کی کانوں کی طرف چلا گیا تھا۔ سات آٹھ دن تو اتنا کام رہا کہ فرصت ہی نہیں ملی پورا بھر بھر کر بھجواتا رہا۔ چندو تولتا رہا اور کملی کی بات کرتا رہا پر سالے نے نہ تول میں ساتھ دیا نہ پیسے میں! ہے سالا کمینہ ہے —!

•••

ہڈیوں کی کانوں سے وہ آٹھ دس دن بعد لوٹا تھا۔ رات کو کملی کام سے تھی۔ چپ چاپ گُھتری اوڑھ کر لیٹ گیا تھا۔ سرہانے رکھا ہڈیوں کا بورا بہت بُری طرح مہک رہا تھا۔ کملی کلبلا رہی تھی۔ اُس نے پاس جا کر پوچھا...... کون ہے —؟

——— بستی کا لالہ ہے! کملی نے کہا تھا۔

——— اس سالے سے دس لینا! کہتے ہوئے بالا اپنی کھاٹ پر آ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد سب کچھ شانت ہو گیا تھا۔ یہ اچھا تھا بستی کا لالہ جب بھی آتا تھا تو شروع میں شور زیادہ مچاتا تھا پر آدھے گھنٹے بعد ہی سو جاتا تھا۔ ڈرائیور تو رات بھر ہنگامہ کرتے تھے کملی بھی بری طرح تھک جاتی تھی —

کملی تو سو گئی پر اُسے نیند نہیں آ رہی تھی اُس بورے کے سبب سے من میں بہت بے چینی تھی۔ رہ رہ کر دادی کی یاد آ رہی تھی ———!

آج سردی بھی بہت تھی اور وہ گاؤں کے پاس والے اونچے نیچے بیابان کے ٹیلے سے دادی کی ہڈیاں کھود کر لایا کرتا تھا۔

کملی نے تو رات کاٹ لی تھی، پر وہ اپنی رات نہیں کاٹ پا رہا تھا.........

.......سڑک سے ٹرک اسی طرح آ رہے تھے۔ کچھ سرائے پر رُک بھی رہے تھے۔

کڑاکے کی ٹھنڈی سردی اور ارجن کے تیر کی طرح چلتی ہوا۔ نیم بھی بڑبڑا رہا تھا۔ اندھیرا اتنا گہرا کہ اُٹھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ من ہوا کہ کملی کو جگا کر جھگڑے اور کہے.... کملی دادی کی ہڈیاں اس بورے میں ہیں بہت چھلک رہی ہیں ان کی دھمک کی وجہ سے سو نہیں پا رہا ہوں!

پر کملی تھک کر سوئی تھی۔ بستی والا لالا بھی پڑا تھا۔

اُس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ ایک پل کے لئے نیند آئی تھی کہ تب ہی کوئی ڈرائیور چیخا تھا...... ابے او دینا بیل ۔۔ !

دینا سوتا اونگھتا جا کر ٹھنڈی گدی پر آدھ لیٹا ہو گیا تھا اور وہ ٹرک غرا کر چالو ہوا تھا۔ پھر ہاتھی کی طرح جھومتا سڑک پر جا کر کہرے میں کھو گیا تھا کتھری اوڑھ کر وہ کھاٹ پر بیٹھ گیا تھا اور سڑک پر بکھرے کہرے کو دیکھتا رہا تھا۔

چاروں طرف سناٹا تھا۔ مرغ تک ڈربے میں چھپے تھے۔ کاسوی پھولوں کی بیل پٹرول پمپ کی کوٹھی کے سہارے کانپ رہی تھی۔ سنسناتی ہوا۔ منہ سے نکلتی بھاپ، ٹھٹھرے ہوئے پیڑ، سامنے پھیلے میدان میں رونگٹوں کی طرح کھڑی ہوئی گھاس۔

بالا نے پھر لیٹنے کی کوشش کی لیٹ بھی گیا۔ پر نیند نہیں آئی۔ دادی ناراض مت ہونا ...... یہ دن تو بھی دیکھ لیتی تو شاید کچھ آرام سے مرتی۔ اب کملی بھی بچ گئی ہے اور اپنا بھی کاروبار بھی چل نکلا ہے، یہ (کال) نہ پڑتا۔ اور اتنے جانور، مویشی، رشتے دار نہ مرتے تو اپنا بھی وہی حال ہوتا ــــ پھلا ہوا ہڈی گودام کا۔ چندو وہیں لگ گیا ہے۔ کملی بھی سمجھدار ہو گئی ہے دادی۔ اپنے نے اُس سے بات کی تھی، کہنے لگی...... چندو سے کہہ دے، کیا فائدہ؟ گھر بساؤں گی تو وہیں لوٹ کے وہیں گاؤں کے باہر جھونپڑی ڈالنی ہو گی۔ کنواں سوکھے گا تو پھر اُدھر ہی بھاگنا پڑے گا تب ایک ایک لوٹا پانی کے لئے براہمن، ٹھاکر چھوڑ دیں گے کیا۔؟ اکال تو ہم لوگوں کے لئے پڑتا ہے۔ باقی سب کے پاس تو برسوں کے لئے دانا ہے، پانی ہے...... یہاں کوئی یہ تو نہیں پوچھتا۔۔ "کون ذات ہے؟ ۔۔!" اپنی ضرورت سے لوگ آتے ہیں۔ کل نہیں آئیں گے تو اسی سرائے پر برتن بھاڑے مانجھ دھو کر ملتا رہیگا۔ ایسے دن بار بار ہاتھ نہیں آتے..... چندو سے کہہ دے، کیا فائدہ.......

کملی بہت سمجھدار ہو گئی ہے دادی! تو سن رہی ہے نہ ــــ ! ارجن کا تیر پھر لگا تو اُس نے کس کر کتھری لپیٹ لی۔ پتہ نہیں پھر کب اُٹھ کے بیٹھ گیا تھا، کہرے کی گپھا سے ایک ٹرک نکل کر پھر کہرے کے بادل میں گھس گیا۔ کچھ دیر تک آواز بجتی رہی!

بالا اُٹھا کہ کملی کو جگا لے، پر..........

تب ہی اُس کے لحاف میں کسمساہٹ ہوئی۔ لالہ لحاف سے نکل کر سٹر سٹراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ کملی بولی...... لیٹا رہ...... لیٹا رہ...... بہت سردی ہے!

لیکن لالہ کو تو اندھیرے اندھیرے نکل جانا ہوتا ہے۔ رات کہیں لپیٹ کر لالہ پگڈنڈی

بکھر کر بستی کی طرف چلا گیا۔

بالا ویسے ہی بیٹھا رہا، بورے کی طرف دیکھتا ہوا۔ کملی کی نیند ٹوٹ گئی تھی۔ شاید اس نے لحاف کے اندر سے دیکھا ہوگا۔ وہ پاس آ کے کھڑی ہو گئی تھی۔۔۔۔۔۔ ارے بالا! تو جاگ رہا ہے۔؟

—— نیند آ رہی —!

—— تھوڑی سی اُدھر پڑی ہے ادھے میں، پی لے، نیند لگ جائے گی۔۔۔۔ سوجا سوجا۔۔۔۔ کہتے ہوئے کملی اپنی کھاٹ کی طرف جانے لگی تھی۔

—— سن بالا نے کہا تھا۔

—— بول — !

—— دادی سونے نہیں دے رہی ہے!

—— دادی! کملی نے تعجب سے کہا تھا۔

—— ہاں۔۔۔۔ اس کی کایا اس میں بیٹھی ہے۔۔۔۔۔۔ بورے میں — ! بالا نے کہا تھا۔

—— ارے ہٹ! کملی نے جھڑک دیا تھا۔

—— سچی کملی! وہ تو اچھا ہوا کہ کوئی اور کھود کر نہیں لے گیا۔ اپن ہی پہنچے کھدان پر۔۔۔۔ پورا پنجر نکلا —!

—— ایسے کہہ رہا تھا جیسے پہچان لیا ہو۔ کہتے ہوئے کملی اس کی کھاٹ پہ آدھی گٹھری اوڑھ کر بیٹھ گئی۔

—— دادی کے پیر کی انگلی میں وہ کالنے کا چھلّہ اب بھی پڑا ہے۔۔۔۔ بالا نے کہا تو کملی آگے نہیں بولی۔ بورے کی طرف دیکھتی رہی —

پٹرول کے دونوں پمپ سفید رضائی اوڑھے کانوں میں انگلی ڈالے کھڑے تھے۔ چھپّر کے بالسوں میں لٹکے مائر بتلی نکلی آنکھ کے کٹورے کی طرح دیکھ رہے تھے۔ سڑک کنارے کھڑے نیم کے بڑوں کی گردنیں کہرے کی تلوار نے کاٹ دی تھیں۔ ٹیوب ویل کے ٹھنڈے پائپ کے ہیتھے کچی گومتی کی گرمیں تپتے ہوئے تھے اور وہ دونوں وہیں کھاٹ پر چپ چاپ بیٹھے تھے۔ جاڑا برس رہا تھا۔ اب دونوں کو نیند نہیں تھی وقت کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔

گھٹنوں پر بانہیں موڑے نیم دراز حالت میں کملی بیٹھی تھی۔ پائی کا سہارا لئے بالا بھی نیم دراز تھا۔ تب ہی سامنے دور کہرے کے ٹکڑوں کے پیچھے کالے آکاش میں کچھ ہلچل سی ہوئی تھی کالے بادل کی لوہے کی کناری تھوڑی سی جھکی تھی۔۔۔۔ جیسے اس کے پیچھے آگ کی بھٹی کی ایک دہکتی لپٹ اٹھی ہو پھر لوہا ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ ایک پل بعد کالے لوہے کی کئی کناریوں پر لپٹ کے آثار دکھائی دیئے تھے۔۔۔۔ پھر وہ بجھ گئے تھے۔ پر بھٹی برابر دہک رہی تھی۔ گڑھیا لوہاروں کا کوئی پڑاؤ آسمان کے پیچھے ہے کیا؟ دھونکنی چل رہی تھی اور آگ بڑھ رہی تھی۔ دھیرے دھیرے لوہے کی کناریاں پیلی پڑ گئیں تھیں۔۔۔۔

جگہ جگہ بادلوں کے ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ کہرے کی چمکتی آگ نے سونکھ لئے تھے۔ آسمان میں جگہ جگہ لگ گیا تھا تب گھاس کے کھڑے رونگھٹے سردی سے سہرے ہوئے تھے اور گردن کٹے پیڑوں کے سر نظر آنے لگے تھے۔

بالا کسمسا کر سیدھا بیٹھ گیا تھا۔

کملی نے پوچھا تھا۔۔۔۔۔۔ یہ ہڈیاں گودام لے جائے گا؟

—— ہاں! بالا بولا تھا —— بورا بہت مہک رہا تھا۔

—— سُن بالا۔۔۔۔۔۔ انہیں ندی میں ٹھنڈا کر دے —— !

بالا چونک اٹھا۔ یہی کچھ تو، کچھ اسی طرح کی بات تو وہ بھی سوچ رہا تھا پر یہ نہیں سوچ پایا تھا کہ دادی کی کایا کو ندی میں ٹھنڈا کر آئے۔

۔۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے نہ —— ! کملی نے کہا۔۔۔۔۔ بُرے دن ہوتے تو دوسری بات تھی۔ گودام میں ہی دے آتا۔۔۔۔۔۔۔۔

—— ہاں! وہ بولا۔۔۔۔۔۔۔ تڑکے تڑکے نکل جاتا ہوں۔۔۔۔۔۔ ندی دور ہے۔ دن چڑھے تک لوٹ آؤں گا۔

اور وہ بورا اُٹھا کر سڑک پار کر کے میدان میں اُتر گیا تھا۔ اُس پگڈنڈی پر جو ندی کی طرف جاتی تھی۔ کملی اُسے تب تک دیکھتی رہی تھی جب تک وہ پیڑوں کے جھرمٹ کے پیچھے لاپتہ نہیں ہو گیا تھا۔

• • •

کملی جا کر اپنی رضائی میں گٹھڑی بن کر لیٹ گئی تھی۔ آدمی ساتھ ہوتا ہے تو ٹانگیں پسار کر سونے میں بھی اتنی سردی نہیں لگتی ہے۔ گرمی ملتی رہتی ہے۔ پر نیند بری طرح آ رہی تھی —

لیٹتے ہی اُسے نیند آ گئی، بہت گہری نیند۔

یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ دن پوری طرح کب نکل آیا۔ شور کب ہونے لگا۔ چاروں طرف زندگی اپنی رفتار پر آ گئی تھی۔ ڈربوں میں مرغے کڑکڑ انے لگے تھے۔ کتنے پیٹرول پمپ اور پیٹرول اور سڑک تک دوڑ رہے تھے۔ ٹرک سرائے کی لمبی میزیں دھل گئی تھیں۔ سبزیاں کٹ رہی تھیں۔ انگیٹھیاں جل گئی تھیں رات کو رکے ہوئے ٹرک والے چائے پی کر سفر پر نکل گئے تھے۔ ٹیوب ویل دھک دھک کر رہا تھا ولکنائیزر کی دکان میں مشین پر ربر کا ٹانکا لگانے والے لڑکے آ گئے تھے۔ سرائے کے مالک نے جوجی کا ریکارڈ لگا دیا تھا اگر بتیوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

کملی نیند کی ماری تھی —

بالا لوٹا، تب بھی وہ سو رہی تھی۔ آتے ہی اُس نے جگایا۔ آنکھیں ملتے ملتے کملی نے پوچھا

۔۔۔۔۔۔ ٹھنڈا کر آیا —— !

—— ہاں! اُس کے دانت اب بھی بج رہے تھے۔ اوجن کے تیر تو مل ہی رہے تھے

۔۔۔۔۔۔ اچھا ہوا! کملی بولی۔

۔۔۔۔۔۔ تجھے یاد ہے دادی سے اپن نے ہمیشہ کہا۔۔۔۔۔۔ دادی میری بات سُن!

میں دیکھ کے آیا ہوں۔ پانی کا رنگ لال ہے خون کی طرح لال! دادی مانتی ہی نہیں تھی۔ ضد کرتی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پانی کا رنگ نہیں ہوتا۔۔۔!

سو آج اُس کی کایا کو ٹھنڈا کرتے ہوئے اپن نے اُس سے کہا۔ ۔ ۔ ۔

لے دادی! آج دیکھ لے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کملی نے اُس کی طرف غور سے دیکھا اور تھوڑی سر کاتے ہوئے اور باہوں کو اینٹھنے لگی۔ اُس کے چہرے پر رات کا باسی پن تھا۔ یا شاید ٹھنڈک کی سفیدی۔ وہ اپنے گالوں کو رگڑنے لگی تو بالا نے دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کے بائیں گال کی سانولی چمڑی پر خون کی ایک سفید بوند جمی تھی۔ وہ اُس پر اُنگلی پھرانے لگی تو بالا نے پوچھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا ہوا۔۔۔؟ اُس سالے لالہ نے پھر کاٹا اتنے زور سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ کملی نے معمولی طرح سے کہا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کا وہ ایک سونے کا ہے نہ وہی گڑ جاتا ہے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کہتے کہتے وہ ٹیوب ویل کی طرف منہ دھونے کے لئے چلی گئی۔

۔ ۔ ۔ پاکستان بننے کے بعد جو سب سے بڑا خلاء پیدا ہوا ہے، وہ ہے ثقافتی خلاء۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ کلچرل بحران پیدا ہو گیا ہے کہ کیا ہمارا ہے، کیا ہمارا نہیں ہے۔ جبکہ کوئی بھی قوم اس طرح کا بٹوارہ نہ کر کے ہمیشہ اپنے لئے یہ طے کرتی ہے کہ ہمارے پاس کیا صحیح اور کیا غلط ہے۔ ۔ ۔

کملیشور

کملیشور

دیوا کی ماں

اس کی ماں دریاں بنتی تھی اور وہ بیکار تھا۔ دریاں بننے کا بھی کوئی ایسا بندھا ہوا سلسلہ نہیں تھا جسے کام کہا جا سکے۔ کبھی کوئی اپنی ضرورت سے بنوا لیتا اور کبھی بے ضرورت بھی، اسے کام دینے کی نیت سے دے دیتا، یا برسوں کا کوئی گدا، لحاف جب جواب دے جاتا یا پلہ اور استر پھٹ جاتا اور بدنما رنگ اندر سے جھانکنے لگتا۔ تو اسے کام میں لے آنے کا ایک یہی طریقہ تھا کہ اسے دیوا کی ماں کو دیا جائے اور وہ مہینے دو مہینے میں دری بُن کر دے جائے، محنت مزدوری کا دام دھیرے دھیرے پٹتا رہتا، کیونکہ کوئی دھندہ تو تھا نہیں کہ اس ہاتھ لے اور اس ہاتھ دے یہی کیا کم تھا کہ ضرورت پڑنے پر اسے کہیں نہ کہیں سے پیسے مل ہی جاتے۔

یہاں کے یہ سارے خاندان ایک دوسرے سے بے طرح جلتے تھے، کڑھتے تھے، پر بے وقت کی مار نے ان کی زبانوں کو کند کر رکھا تھا، ہر ایک کی بے بسی نے ایک ان دیکھے دھاگے میں بڑے ہی حیرت انگیز طریقے سے باندھ رکھا تھا، جس کا کوئی سرا نظر نہیں آتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جوان ہوتے ہوئے بھی دیوا کے بیکار رہنے کو، لوگوں نے بڑے فطری انداز میں مان لیا تھا۔

دیوا جب اپنے چاروں طرف نظریں گھماتا تو اسے یہ سب کھلتا۔ خود اپنی ماں کی بے ایمانی چبھتی، جو دریوں کے لئے روہاڑ لیتے وقت پنسیرے پر آدھا سیر زیادہ لینے کی نیت سے، میل کے عوض میں ساڑھے پانچ سیر کیلئے جھگڑتی۔ اور اس طرح آدھا سیر روئی بچا کر آٹھ دس دریوں کے بعد ایک اپنی بجی دری بنا کر بیچ لیتی، وہ اپنے چاروں طرف جب لوگوں کو دیکھتا تو اسے لگتا کہ ان کے چہرے ایک دم ایک سے ہیں، جن پر نفرت، پیار، تعریف یا شکایت، کچھ بھی تو نہیں ابھرتی۔ عجیب سی یکسانیت تھی، جیسے سب شنکر جیسے یوگی ہیں جو زہر پی کر اطمینان سے بیٹھے ہیں، آنکھیں مونده ے۔

★ ★ ★

اسی لئے وہ گھر سے بھاگا بھاگا رہتا۔ مولوی صاحب کے اصطبل میں لگے شاستری کے چھاپہ خانہ میں بیٹھا رہتا تھا۔ وہاں سے ایک جیسی آواز سے جب من اُوبتا تو ٹھاکر کی املی کے نیچے والے چبوترے کی محفل میں پہنچ جاتا۔ قصبے بھر کی سنسنی خیز خبریں اسے شاستری کے چھاپے خانے میں ملتیں۔

رتھین اور سرکار کے کارناموں کی اطلاعیں ٹھاکر کی محفل میں جمع ہونے والے بلیک اور نارمل اسکولوں کے پیچروں اور پنڈتوں سے ملتیں۔ ان دونوں ہی جگہ اسے ایسے آدمی دکھائی پڑتے تھے جو اپنی باتوں اور اپنے مفادات سے الگ ہو کر آس پاس اور دور دور کے سکھ دکھ اور سنگھرش کے واسطے زندہ دکھائی پڑتے تھے۔ یہاں آکر جیسے وہ اپنے کو بھول بیٹھتا اور بہتوں کی قطار میں شامل ہو جاتا اس لئے کبھی کبھی بغیر چاہے بغیر سوچے اسے دیر ہو جاتی۔ صبح سے آجاتا تو باتوں میں وقت کا اندازہ نہیں ملتا۔ دوپہر چڑھے جب گھر پہونچتا تو دل چھوٹا ہونے لگتا۔ خیال آتا۔ اتنا وقت بیکار برباد کر دیا، اس سے اچھا ہوتا کہ اماں کے کام میں ہاتھ بٹاتا، اور کچھ نہیں سہی تو روہاڑ یعنی لوچتا جس سے دھنکنے کے لئے ڈالی جا سکتی یا سوت کی لچھیاں ہی بناتا جس سے رنگنے میں آسانی ہوتی۔ گھر میں گھستا، برآمدے میں ادھ سجا ہوتا، سوت کا جال پورا ہوتا رنگین سوت کی پنڈیاں ادھر ادھر لڑھکتی ہوتیں، کسنے والا ہتھا ایک طرف پڑا ہوتا، اور اماں بیٹھی سوت کاتتی ہوتی یا روہاڑ نوچتی ہوتی آہٹ پاکر اس کی طرف دیکھے بغیر اٹھتی اور کوٹھری میں گھس جاتی۔ ڈبیہ میں سے لمبی زنجیر والی گھڑی نکالتی، گھڑی ہتھیلی پر رکھتی تو زنجیر ہتھیلی کے اس پار جھول جاتی اور اسے کچھ لمحہ دیکھتی۔ ایک ٹک۔ جیسے سوئیوں کی مدد سے پڑھنے میں کچھ اسے یاد آتا ہو۔

اور تبھی دلیوا کا دل بھر آتا، اپنی بے پروائی اور مایوسی پر جھنجھلاہٹ ہوتا، سوچتا، آخر ماں بھی تو گھر میں اکیلی پڑی رہتی ہے۔ کہیں آتی جاتی نہیں۔ کیا اس کا دل نہیں گھبراتا ہوگا؟ پھر ماں پر کچھ جھنجھلاہٹ بھی تو ہوتی کہ یہ کچھ بولتی کیوں نہیں کہ، دیر سے آنے پر ڈانٹتی کیوں نہیں، کچھ پوچھتی کیوں نہیں؟ پر وہ نہیں پوچھتی۔ جیسے سب جان لیا ہو۔ لیکن تب ہی اسے لگتا ہے کہ وہ کتنی غمزدہ اداسی سے پوچھ لیتی ہے۔ جب کوٹھری میں گھڑی دیکھنے جاتی ہے تو شاید وہ اپنے ہی سے جواب مانگتی ہے کہ دلیوا اتنے تک کہاں رہا؟ اور پھر اس کے بعد سوئیوں پر نظر گاڑ کر کہتی ہے کہ، دیکھو تمہارا دلیوا کیسا ہو گیا۔ میرا کچھ بھی خیال نہیں رکھتا، کیا اس کی بھی امید چھوڑ دوں؟

اور تب دلیوا کی آنکھیں نم ہو جاتیں، وہ اپنے کو ساری باتوں کا ذمہ دار پاتا اسے باپ کی یاد آتی، جسے اس نے دیکھا تو تھا پر کبھی محسوس نہیں کیا۔

ماں کوٹھری سے نکلتی، آسن بچھاتی اور کھانا پروس کر دلیوا کو آواز دیتی۔

—— "آ دیو، ذرا پانی رکھ لے دو گلاس ......"

تب دلیوا کو پتہ چلتا کہ ماں بھی کھائے بغیر بیٹھی رہی ہے، کہتا —— "اماں تم کھا لیتیں نہ، میں ذرا ماسٹر جی کے پاس گیا تھا۔ ان کے ہاتھ میں پچاس ساٹھ کی نوکری تو رہتی ہے۔ شاید اب سے اسکول کھلنے پر کچھ خیال کر لیں۔"

پر جھوٹ بولتے اسے کچھ نہ لگتا، کہہ چکنے کے بعد ماں کے چہرے کا سکون اسے دھتکارتا اور وہ اپنے میں سمٹ آتا۔ ماں دھیرے سے مسکرا دیتی اور کہتی، —— "رام لال کی ایک دری بنانی ہے، سوت تو تیار ہے، تو کل رنگریزے سے رنگوا دے، جھٹ پٹ نپٹا لوں۔"

"اماں گھر پر جو رنگ لیں، بازار میں بہت دام پڑتے ہیں؟"

"پکا رنگ تو گھر میں تیار کر لوں، پر کٹائی نہیں ہوتی، بنا کوٹے رنگ نہیں چڑھتا، میرا تو کندھا بیکار ہے، نہیں تو......"

"ارے کٹائی میں کر دوں گا۔ کل تم اونٹ کر رنگ بنا دینا، پھر سب میرا کام۔"

اور دوسرے دن جب دیوا اٹھتا تو خود ہی لہا سلگاتا اور کہتا۔ "اماں، پہلے رنگ اونٹ لو، پھر بیٹھا میں کوٹتا رہوں گا۔ تب تم کھانا بنا لینا۔"

ماں پتیلا چڑھا دیتی، رنگ کی پڑیا چولہے کے پاس رکھ لیتی اور پیڑھ ڈال کر بیٹھ جاتی، تو دیوا دیکھتا۔ کچھ دیر تو لگے گی ہی، ذرا باہر نکلتا، پھر آ کر جھانک جاتا کہ اب ماں پانی میں رنگ ڈالا یا نہیں پھر نکل جاتا اور نکلتا تو نکل ہی جاتا۔ جب واپس آتا تو دھوپ چڑھ آئی ہوتی۔ وہ بہر تپتی ہوتی اور ماں بلیا پر سوت رکھے ہانپتے ہانپتے کوٹتی ہوتی۔ بالوں کی لٹیں روکھی سی جھولتی ہوتیں، ہاتھوں کی رگیں سوت کی طرح ابھر آتیں اور اس کے ہاتھ رنگ سے بدرنگ ہوتے۔ ماں آہٹ سنتی تو لچھیوں کو تار پر پھیلا کر کوٹھری میں گھس جاتی۔

اس طرح دن بیتتے جاتے۔ اور دیوا کو کبھی یہ محسوس بھی نہ ہو پایا کہ آخر یہ سب کیسے چلتا جاتا ہے ماں کن خیالوں میں ڈوبی رہتی اور کیا سوچتی رہتی ہے، اور نہ وہ پوچھ ہی پایا، کیونکہ جب بھی پوچھنے کا موقع آتا تو وہ گھڑی اور اس کی سونے کی زنجیر بیچ میں حائل ہو جاتی۔ ماں اداس دکھائی پڑتی اور وہ خود اپنے اطمینان پر کڑھتا ہوتا۔ اگر وہ کوشش بھی کرتا تو ہمت نہ پڑتی۔ کیونکہ اس گھڑی اور اس کی زنجیر سے اس کے باپ کا پیار جڑا تھا، جو کہیں اسٹیشن ماسٹر تھے۔ اور برسوں سے دوسری شادی کر کے اپنے بال بچوں کے ساتھ رہ رہے تھے۔ اس نے اتنا سنا تھا کہ پانچ سال پہلے وہ کچھ گھنٹوں کے لئے ماں سے ملنے آئے تھے تب دوسری شادی کر چکے تھے ماں نے کہیں سے ادھار لا کر ان کے لئے کھانا بنایا تھا پر انہوں نے کھایا نہیں تھا۔ اس وقت پڑوس کی عورتوں نے ماں سے کہا تھا کہ اپنی اور دیوا کی پرورش کے لئے کچھ ماہوار طے کر لینا چاہئے۔ پر ماں نے وہ بات ہی نہیں اٹھائی۔ چلتے وقت پتا نے ماں سے کہا تھا کہ گھڑی کی ضرورت پڑ جاتی ہے کبھی کبھی، اسے دید و تو لیتا جاؤں۔ تو اماں نے جواب دیا کہ پہلی ایک چیز پاس رہ گئی ہے جو دیوا کو بھی ان کے وقت کا دھیان کراتی رہتی ہے۔ ہاں اگر سونے کی زنجیر کی ضرورت ہو تو وہ لے لیں لیکن پتا نے بات کھل جانے کی وجہ سے اور گھڑی مانگنے کے پیچھے زنجیر کی اصلی خواہش ہونے کی وجہ سے آگے بات نہیں بڑھائی تھی اور چلے گئے تھے۔

ان کے جانے کے بعد بغل کے مکان کی بوڑھی باتوں کا پتہ لگانے آئی تھی کیونکہ اس دن سبھی گھروں میں یہی چرچا تھا۔ پیچھے پیچھے دیوا کی ماں کی برائیاں بھی بڑی ایمانداری سے بیان کی جا رہی تھیں اور اس سے بھی زیادہ ایمانداری اور فکرمندی سے اس کی قوت برداشت، صبر اور مصیبتوں کو دہرایا جا رہا تھا۔

بڑھیا آ کر وہاں بیٹھی اور اس نے پوچھا تھا۔ "کیوں دیوکی ماں، بات چیت کا کیا رویہ تھا ان کا؟"

"ویسا ہی چاچی، سچ مچ کوئی فرق نہیں تھا۔ میں تو سمجھی تھی کہ پتہ نہیں کیسے پیش آئیں، پر طور طریقہ نہیں بدلا۔ تن سے تو ایک دم بدل گئے ہیں۔ میں تو پہلی نظر میں پہچان نہیں سکی، ابھی سے

سامنے کے دو دانت بدلوانے پڑ گئے ہیں۔"

"اچھا ــــ بات کیا کیا ہوئی؟" "تمہاری باتوں کا کیا جواب دیا؟"

"میں تو ان کی سنتی رہی چاچی، بیچ بیچ میں خاموش ہو جاتے تھے، لگتا تھا کہ اپنے کئے پر انہیں کچھ ہو رہا ہے، ایسے میں کیا کر پاتی؟ کہہ رہے تھے۔ دل نہیں لگتا کہیں۔ بڑی دیر تک سمجھاتے رہے کہ کیا کیا سوچ رہے ہیں، فکروں سے پریشان تھے۔ چلتے وقت گھڑی ضرور مجھ سے مانگی تھی، سو مجھ سے دیتے نہ بنی، پتہ نہیں کیا موہ ہو گیا ہے اس سے۔"

"تو ان کی یہ سب فکریں اور دکھ صرف گھڑی ہی کے لئے تھا، اس کی زنجیر تو سونے کی ہے نا" ــــ بوڑھی نے نتیجہ نکالتے ہوئے کہا تھا۔

سو نی چاچی، انہیں لینی ہی ہوتی تو کیا میں انکار کر پاتی۔ میں نے کہا تھا کہ چاہیں تو زنجیر لیتے جائیں۔ پر انہوں نے پھر اس کی بات ہی نہیں کی تھی۔"

"ہمت نہیں پڑی ہوگی، نہیں تو اب وہ تمہیں کیا سمجھتے ہوں گے؟"

"ایسی بات نہیں چاچی، ان میں یہ سب باتیں تھیں ہی نہیں۔ آدمی میں ایسے بھی کھوٹ نہیں ہوتی اسے برے راستے پر تو عورت ہی ڈالتی ہے۔ میں تو گھر رہتی تھی، یہ ڈیوٹیوں پر دوڑتے رہتے تھے، مہینوں بعد آنا ہوتا تھا۔ وہیں وہ مل گئی اور اس نے بہکا دیا۔ عورت چاہے تو اچھے بھلے آدمی کو الجھاتے کتنی دیر لگتی ہے؟ اگر انہوں نے یہ سب سمجھ بوجھ کر ہی کیا ہوتا تو بھلا کہاں آتے؟ اور اصل بات یہ تھی کہ چاچی میں ان سے کھل مل ہی نہیں پائی تھی۔ سسرال میں رہتے گھر کی بھیڑ بھاڑ اور ہائے شرم نے کبھی اپنے حق کی بات ہی نہیں کر پائی۔ انہوں نے مجھے جانا ہی نہیں۔ اور ان جانے میں جو کر بیٹھے وہ تو ہو ہی گیا۔"

"ارے یہ سوچنے سے کام نہیں چلتا، سب اونچ نیچ دیکھا کر و دیو کی اماں آدمی اتنے سیدھے نہیں ہوتے۔ ہر بات کے پیچھے مطلب ہوتا ہے ان کا ــــ تمہیں اپنی پرورش کی بات چلانی تھی" ــــ بوڑھی نے باتوں کا سرا پھر پکڑتے ہوئے کہا۔

"کہا تو، کیا چلاتی میں تو سنتوش کئے بیٹھی ہوں۔ دو تین سال کی اور دیر ہے۔ تب تک دیو کے لے دھرلے لائق ہو جاتا ہے۔ کاہے کو کہیں منہ ڈالوں؟ دیو کی فکر تھی انہیں بھی، کہہ رہے تھے ویسے تو اپنے پاس بلا لیتا، پر میرا ابھی الگ کرو ہنا نہیں ہو پاتا، اسی لئے سوچتا ہوں۔ جیسا وہاں ویسا یہاں۔ اگر رہے تو میری نگاہ کے سامنے رہے۔ نہیں تو تم سے اچھا اور کون ہوگا۔ اس کے لئے؟ اس کے لے بڑی ہدایتیں دیتے رہے تھے۔ کہتے تھے تم ہی سے سب کچھ سیکھے گا۔ آج کل لڑکوں کو ہوا لگ جاتی ہے۔ تمہارا ڈر خوف اگر اس کے اوپر سے اٹھ گیا تو بگڑ جائے گا۔ اپنے کو سنبھالے رہنا، جس گھر میں جنمی ہو اس کا دھیان رکھنا۔ بڑی اونچی شان رہی ہے تمہارے بابو جی کی......."

دیوا اسکول سے آ ہی نہیں پایا تھا ــــ

بوڑھی تھوڑی دیر بعد اٹھ کر چلی گئی تھی۔

تب سے دیوا پر اس کی نظریں اور بھی توجہ اور پیار سے جم گئی تھیں وہ دیوا کو پیٹ کاٹ کاٹ کر

پڑھاتی رہی اور جب وہ پڑھ لکھ کر بیکار بیٹھ گیا، تب بھی وہ اسے اسی طرح دیکھتی رہی۔ اس کے ادھر اُدھر بیٹھنے کو ہوشیار نظروں سے دیکھتی رہی جب جب دیر سے لوٹنے پر اور جھوٹ بول کر وہ اپنے کو بہلاوا دیتا رہا تو اس نے اس کے اس بھرم کو توڑنے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ آخر اس کے بھرم توڑ کر وہ کونسی سچائی اسے دکھا سکتی تھی؟ اس بات کو وہ خوب جانتی تھی۔

ایک روز جب وہ گھر لوٹا تو ہمیشہ کی طرح دیر ہو گئی تھی۔ اس روز اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا، جس کی سائیکل کے پیچھے کتابوں کا ڈھیر بندھا تھا اور سامنے ہینڈل پر لٹکے جھولے میں اخبار بھرے تھے۔ اس آدمی کی آنکھوں میں ایک عجیب سا وشواش تھا اور اس کے چہرے پر محنت کی عظمت کی سختیاں تھیں۔ دیوا دروازے پر کھڑا کچھ دیر اس سے باتیں کرتا رہا اور جب اندر آیا تو اس کی باتوں میں سمجھ ہی نہیں تھی۔ جیسے من کا غبار ایک دم باہر چھوڑ آیا ہو اور اپنی سارتھکتا کا تجربہ کرنے لگا ہو۔ آ کر بولا تھا، "اماں، تم کھا لیا کرو۔ میرے انتظار میں بیٹھا رہنا ٹھیک نہیں۔ میرا تو بیر نکل گیا ہے۔۔۔۔"

سن کر ماں کو ایسا لگا تھا کہ من میں آج تک جو خلا تھا وہ شاید بھر رہا ہے۔ پر اسے کچھ دکھ بھی ہوا تھا کہ کہیں دیوا اس کی طرف سے ایک دم بے پرواہ ہو جائے۔ وہ دن، دن بھر وحشیوں کی طرح گھومتا اور رات گئے دیر تک بجلی کی روشنی میں نہ جانے کیا پڑھتا۔ اب دیر سے آنے میں اسے جھجک نہ ہوتی تو ماں کے دل پر گھونسہ سا لگتا۔ اسے چڑھ بھی ہوتی، دکھ بھی ہوتا اور ایک عجیب انجانی سی خوشی بھی ملتی۔ اسے لگتا کہ دیوا اچھا کر رہا ہے، پر یہ اپنی طرف سے بے پرواہی بھی بری ہے۔

ایک دن اسے پتہ لگا تھا کہ دیوا سیاسی آدمیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے لگا ہے، ان کے ساتھ جھولا ڈالے ادھر اُدھر گھومتا رہتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں یا گھر کے بارے میں اتنا فکر مند نہیں جتنا کہیں دور بیٹھے لوگوں یا تھکے دوسرے لوگوں کے لئے ہے۔ کبھی کبھی رات کو بھی باہر رہ جاتا۔ مکانوں میں دیوا کا چرچا ہوتا کہ وہ اخبار بیچنے لگا ہے۔ نیچ آدمیوں کی طرح گھر گھر جھولا لٹکا پھرتا ہے اور چار پیسے کا اخبار پہنچاتا ہے۔ چرچا اگر برائیوں پر چل پڑتی تو دیوا اور اس کی ماں کو ایک دم کالا قرار دے دیا جاتا اور کبھی اچھائیوں پر مڑ گئی تو اس کی زندگی کی توانائیوں کے سامنے سب سر جھکا دیتے۔

اور وہ سوچتی ـــــ دیوا ابھی سپنوں میں الجھا جا رہا ہے۔ اس میں جو آگ سلگی ہے، جو تحمل آیا ہے، وہ اسے طاقت دے گا۔ پر وہ دن دنیا کی سنگین باتیں کرتا ہے، اس کی باتوں میں کچا پن ہے، پر بچپنا نہیں اور ماں کو لگتا ہے کہ دیوا اب بالکل تنہا نہیں، بہت سوں سے ان دیکھے روپ میں جڑ گیا ہے۔

پر یہ بات بھی اس کے دل میں بہت نہیں جمتی، آخر اس سے ہونا کیا ہے؟ اسی لئے سوچتے سوچتے بات منہ سے نکل پڑی۔ دیوا اخبار بانٹ کر آیا تھا۔ ماں نے کھاتے وقت اس سے کہا تھا ـــ "دیوا تمہارا یہ اخبار بیچنا اچھا نہیں۔"

دیوا چپ ہی رہا تھا۔ جب کھانا کھا کر چلنے لگا تو ماں نے روک کر کہا ـــ "یہ پانچ پیسے، سوت لیتے جاؤ۔ سامنے تلوا کر دینا۔ جب آنا تو رنگوا کر لیتے آنا۔"

دیوا نے سنا اور ایک تھیلے میں سوت بھر لیا۔ پوچھا ـــ "کون سے رنگ میں رنگے گا؟"

"چار سیر نیلا اور ایک سیر پیلا پاؤڈر کے لئے۔"

چلتے چلتے اسے یاد آیا تو بولا — "اماں مجھے وقت نہیں ملے گا، تم میرا کرتہ ذرا دھو کر ڈال دینا۔ استری میں کر لوں گا۔ کل کے لئے کرتہ نہیں ہے۔"

اماں نے ہُوں کی اور وہ چلا گیا۔

ماں نے کرتے کو صابن سے دھو کر، کلف اور نیل لگایا، تار پر پھیلایا اور انتظار کیا، پر دلیوا نہیں آیا۔ کھانا بنا کر بیٹھی رہی، پر وہ نہیں لوٹا۔ رات آئی اور چلی گئی لیکن دلیوا کے واپس آتے پیروں کی آہٹ نہیں سنائی پڑی۔ تلسی کے پودے کے اوپر بندھی الگنی پر اس کا کرتا سوکھ کر سکڑ گیا، پر وہ نہیں لوٹا۔ ماں کی آنکھوں سے نیند اُڑ گئی، کر اسے ڈھونڈتی رہی۔ لیکن کسی سوتے میں بھی وہ واپس نہیں آیا اور ماں نے اسے بھی تسلیم کر لیا۔ الگنی سے کرتہ اتار کر تہہ کر بکسے میں رکھ دیا۔ پتہ نہیں کس وقت آ کر مانگ بیٹھے۔

تیسرے روز پنڈت اپنی دری مانگنے ضرور آ گئے۔ تب اس نے یہی کہا تھا — "چھ سات دن میں پہنچا دوں گی — دلیوا کو سوت رنگنے کے لئے دے دیا تھا۔ پتہ نہیں کس رنگریز کے یہاں ڈال آیا ہے — دلیوا کل پرسوں باہر سے واپس آ جائے گا تو دو چار دن میں بن کر میں خود دے آؤں گی، پریشان نہ ہوں۔"

کل پرسوں دلیوا آ جائے گا؟ کہاں کی کہہ کر گیا ہے؟ وہ سال بھر سے پہلے نہیں آتا، گرفتاری ہوئی ہے کہ مذاق ہے۔"

"گرفتاری؟" ماں نے سن ہو کر کہا تھا۔

"آندولن کیا ہے تو سزا بھگتنی ہی پڑے گی۔"

سن کر ماں نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ بس اتنا پھر کہا کہ — "دری پہنچ جائے گی، جیسے بھی ہو گی۔"

گلی میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ دلیوا جیل چلا گیا ہے، یہاں سے کچھ لوگوں کے ساتھ وہ کریل تحصیل گیا تھا، وہیں گرفتار ہو گیا ہے۔ سزا ایک سال کی ہوئی ہے۔ لیکن دو سو جرمانہ بھر دے تو آدھی سزا کٹ سکتی ہے۔ پر اس کے ساتھیوں میں کوئی جرمانہ بھرنے کی بات کو ٹھیک نہیں سمجھتا۔ دلیوا نے جرم کیا کیا ہے۔ اس کے بارے میں کسی کو ٹھیک ٹھیک نہیں پتہ۔ جب ماں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا تو وہ بدحواس باختہ سی ہو گئی تھی۔ گلی کے لوگ اس لئے بھی کوئی بات نہیں سمجھاتے تھے کہ انہیں روپے کا انتظام نہ کرنا پڑ جائے۔ تب وہ اور کس سے کہتی۔ اکیلی بیٹھتی تو دلیوا کے پتاجی کا دھیان بار بار آتا۔ وہ دلیوا کے لئے کتنے فکرمند تھے۔ سوچا اگر انہیں پتہ چلے گا تو یہی کہیں گے کہ مجھے خبر تک نہیں دی۔ آخر بیٹا تو میرا بھی ہے، اور کون کرے گا اس کے لئے۔ جو ہوا سو ہو چکا، پر کیا خون اور پیار کے فرض چھوٹ جاتے ہیں؟"

تب ایک دن اس نے — "انہیں" چٹھی لکھی تھی — "دلیوا کریل تحصیل میں گرفتار ہو گیا ہے۔ کچھ کہہ کے نہیں گیا۔ تھوڑے دن پہلے پنڈت جی سے یہ خبر ملی ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ دو سو روپیہ جرمانہ دے دیا جائے تو دیوا کی آدھی سزا کٹ جائے گی۔ اتوار کی رات کو گیا تھا۔ یہاں بالکل اکیلی ہوں۔ جی نہیں لگتا، دلیوا کی وجہ سے بڑا سونا لگتا ہے۔ کچھ کام بھی نہیں کر پاتی۔ آپ جو پیروی مناسب

سمجھیں، کر کے اسے چھڑوا لائیں۔ ہو سکے تو یہاں ہوتے ہوئے آپ کر لیں نکل جائیں۔ جو آدمی اپنے کام سے گیا تھا اور دلو کی ماں کا خط لے گیا تھا وہ واپس آیا تو تحریر کے دو لفظ تک ساتھ نہ لایا۔ زبانی اس نے یہی بتایا تھا کہ اسٹیشن ماسٹر جی کا کہنا ہے کہ مجھ سے پوچھ کر اور میری مرضی سے دیلو چلتا تو میں اپنا سر بھی لگا دیتا، اس کا کیا بھروسہ، آج چھڑا یا کل پھر چلا جائے گا۔ نوکری پیشہ آدمی ہوں اور یہ سب کام کرنے کے لئے وقت چاہیئے، اور کہاں سے لاؤں۔ کل ہی مجھے دوسری جگہ ریلیو کرنا ہے۔

دلو کی ماں نے سُنا تو پہلے یقین نہیں آیا۔ سوچا، شاید بے توقع چھٹی ہاتھ میں پڑی ہو، پتہ نہیں دماغ کن پریشانیوں میں پھنسا ہو کہ یہ تیر کھا کر تلملا گئے ہوں۔ جب ٹھنڈے دل سے سوچیں گے تب شاید ڈاک سے چھٹی ڈال دیں۔ یا شاید اپنے گھر کی بات باہر والے کے سامنے نہ کرنا چاہتے ہوں، تو بھی ڈاک سے ہی آئے گی لیکن مہینوں انتظار کے بعد ڈاک سے کوئی چھٹی نہیں آئی۔ وہ اندر کوٹھری میں جاتی، گھڑی ہتھیلی پر رکھتی تو وہی زنجیر ہتھیلی کے اس پار جھولتی، پر کوئی آتا نہیں۔ گھڑی کی سوئیاں وقت بدلتی جاتیں پر وہ سونے پن کی گھڑیاں دم سادھے کھڑی تھیں، اکیلے پن کے پل امٹ ہو گئے تھے جنہیں گھڑی کی سوئیاں نہیں ہٹا پاتیں۔

ادھر پنڈت جی کا دری کا تقاضہ ناراضگی کی شکل اختیار کرتا جاتا تھا، ادھر وہ سارا کاروبار روکے حواس باختہ، ان پرچھائیوں کا انتظار کر رہی تھی جو چلتی ہیں، بنتی ہیں، مٹتی ہیں، پر بولتیں نہیں۔ آخر ایک دن جب پنڈت جی کھری کھوٹی سنا گئے اور سوت رنگنے کی بات کو محض بے معنی اور جھوٹی بات قرار دے کر بڑبڑاتے چلے گئے وہ آنکھوں میں آنسو بھرے چرخہ کاتتی رہی۔ ٹوٹتے سوت سے سوت جوڑنے کی کوشش کرتی رہی۔ اور سسکتی رہی۔ سوچتی رہی، روتی رہی، اس کے سوالات تو ایسے بکھر گئے تھے جو پکڑ ہی میں نہیں آتے تھے۔

جب اندھیرا جھک آیا اور گھر کی بندھی بندھائی فضا میں اوب پیدا ہونے لگی تو وہ ایک گہری سانس لے کر اٹھی تھی، چرخے کی گھرگھراہٹ رکی تو اور بھی خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ کوٹھری میں پہونچی تب نہ جانے کون سا زخم ادھڑ گیا کہ آنکھیں یکایک بھر آئیں۔

اور تب اندھیرے میں بیٹھے بیٹھے اس کے سامنے جیسے سچائی ظاہر ہونے لگی تھی۔ وہ اب تک کن پرچھائیوں پر دشواش کرتی آئی۔ دلو کے پتا جی پر — پر وہ کتنا بڑا فریب تھا۔ کتنا بڑا دھوکہ وہ دیتے آ رہے ہیں۔ کتنی صفائی سے ساری ذمہ داری ٹال گئے تھے۔ اور کتنی خوبصورتی سے اس کی نسوانیت اور بیوی پن کو تسکین دے دی تھی۔ اس لئے کہ وہ کچھ اور نہ سوچ سکے۔ وہ صرف یہی تو چاہتے تھے کہ وہ اسی طرح لنگڑاتی، گھٹتی اور ادھوری رہ کر بھی پتی کے اونچے آدرش کی گرمی میں اپنے کو شاباشی دیتی رہے۔ وہ نیچے اتر کر دھرتی کو نہ چھو سکے۔ کہتے تھے — دلو پر تمہارا ہی اثر پڑے گا۔ اور اس بات میں وہ اس کی عصمت کو کتنی بڑی چنوتی دے گئے تھے۔ پر ...... تب اس کی آنکھ پر کونسا پردہ پڑا تھا۔

اور تب وہ اس اندھیری کوٹھری سے نکلی تھی بسیندور کی ڈبیہ اس کے ہاتھوں میں تھی اور تلسی کے پودے پر چاندنی مسکرا رہی تھی۔ چاروں طرف دودھ سا پھیلا ہوا تھا اور ایک عجیب سی ٹھنڈک تھی

وہ سیندور کی ڈبیہ ہاتھوں میں لئے تلسی کو نہارتی رہی تھی۔ اندر طوفان مچا ہوا تھا۔ کانپتی انگلیوں سے اس نے ڈبیہ کھولی تھی اور سارا سیندور تلسی کی نیلی نیلی پتیوں پر بکھیر کر اپنا سہاگ اسے سونپ، روشن آنکھوں سے اس پودے کو تاکتی رہی تھی، تلسی کی پنکھڑیاں سیندور ملی وہ دھیا چمک سے جیسے اور بھی نیلی پڑ گئی تھیں وہ تلسی کے پودے پر ماتھا ٹیکے اس نپٹ اکیلی رات میں اپنی تنہائی کو سوچ سوچ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی خدشات سے بھر بھرائی تھی۔ ڈر سے گھبرائی تھی، پر کہیں کچھ تھا جو اسے رلاتا اور ڈھارس بندھاتا تھا اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب لاتا تھا اور جذب کر لیتا تھا۔

اس دن سے اس نے مانگ نہیں بھری اور کوئی چارہ نہ دیکھ کر گھڑی کی زنجیر بیچ کر روئی خرید لائی تھی۔ پنڈت جی کی دری بھی بن کر دے آئی تھی۔

تب سے وہ لگاتار خریدی ہوئی روئی کی دریاں بنتی رہتی، سوت کاتتی رہتی اور ایک ایک بن کر تہہ کر کے رکھتی جاتی، کسی کا کام مل جاتا تو کر دیتی، نہیں تو اپنے کاموں میں لگی رہتی۔ دیوا کو بچھڑے تو اتنے دن ہو گئے تھے کہ اب لگتا تھا ــــ وہ دور ہی چلا گیا۔ جب اس کی یاد بہت آتی تو صندوق سے اس کا کرتہ نکالتی، تہہ کھولتی، اسے دیکھتی اور پھر سنبھال کر رکھ دیتی۔

اور جب آج سال بھر بعد دیوا سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تو ماں کا وہی چرخہ چل رہا تھا جس کا ہتھا شیشے کی طرح چمکنے لگا تھا۔ وہی ٹھہراؤ ماں کے چہرے پر چھایا ہوا تھا جو مکمل کھلنے سے آتا ہے، اور سوت کاتتے وقت کی خاموشی ــــ جیسے پوجا کے وقت کی خاموشی۔

دیوا الجھا یا سا کھڑا دیکھتا رہ گیا۔ ماں نے اس کی جھجک کو پرکھا تھا اسے لگا ابھی وہ کچھ ویسی باتیں کرے گا جس میں وہی پرانا بھرم ہوگا۔ اسے لوکری مل جانے والی بات جیسی کوئی ہلکی بحث ہوگی۔ پر دیوا نے ویسی کوئی بات نہیں کہی تو وہ چرخے کی مال پر ہاتھ پھیرتی ہوئی اٹھی اور تب اس نے نزدیک سے دیوا کو دیکھا وہ جیسے پک گیا تھا۔ اس کے رخ پر محنت کی چمک تھی کچا پن کہیں دبک گیا تھا۔ سارے سوال اور جواب اپنے آپ حل ہو گئے۔ سب آسان تھا۔ اس کی آنکھوں میں ممتا بھر گئی، بولی۔ ”دیوا آ گیا تو؟“

”اماں ــ“

اور رک کر وہ بولا تھا ــــ ”بڑی بھوک لگی ہے۔“

”بھوک؟“

اس نے کہا ــ ”سال بھر سے بھوکا ہوں ــ اماں پورے ایک سال سے۔“

تب سارا آسمان سمٹ آیا، سب فطری ہو گیا۔ ماں نے کھانا پروسا، دیوا نے پانی رکھا۔ اور ماں بیٹے بے وقت کھانے بیٹھ گئے۔ کھاتے کھاتے دیوا نے کہا۔

”بابو جی اسپتال میں ہیں۔“

”کیا ہوا ہے؟“ ــــ ماں کے چہرے پر سب نقش تھا۔

”موٹر میں جان پہچان کا خلاصی مل گیا تھا۔ مجھے پہچانا تو اس نے بتایا تھا کہ بابو جی کو پلورسی ہو گئی ہے۔ ایک بار حالت اتنی خراب ہو گئی کہ چوبیس گھنٹے تک بے ہوش رہے، پھر حالت کچھ ٹھیک

ہوئی، پر تین چار روز بعد پھر بگڑ گئی — چھوٹے اسپتال سے بڑے میں چلے گئے ہیں۔"

"کب سے خراب ہے؟"

"ایک مہینہ سے۔ کل جا کر دیکھ آؤں؟" دیوا بولا۔

ماں چپ رہی۔ تین چار لقمے اس نے اور کھائے، غٹ غٹ پانی پیا اور اٹھ گئی۔

شام گہری گہری اُداس تھی۔ دیوا کا دل چاہا کہ اتنے دن بعد جا کر لوگوں سے مل لے۔ لوٹ کر آیا تو ماں چرخے کے تکلے کی نوک پیاری پر گھس رہی تھی۔ آج ماں کی فطری اداسی کا کچھ اور رنگ تھا۔ پختہ اداسی کی جگہ کھویا کھویا موہ تھا۔

رات کو ماں دیئے کی روشنی میں بیٹھی چرخے کی روئی صاف کرتی رہی۔ یہ چرخہ ہی شاید اس کا سب سے بڑا سہارا تھا۔ سوت کاتتے ٹوٹتے ٹوٹتے تار جوڑتے جوڑتے اتھاہ حوصلہ اور اٹوٹ عزم اس کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا۔ ہر بار ٹوٹنے والے تار نے اس کی خفگی، جھنجھلاہٹ اور بے صبری پر قابو پا لیا تھا۔ جیسے اس میں اس کا پھیلاؤ تھا، وہ چرخہ ہی اس کا گو نگا گرو تھا۔

روئی صاف کر لینے کے بعد شاید لیٹتی، پر چرخے کو کھاٹ کے سرہانے رکھ کر وہ اندھی الماری کے پاس کھڑی رہی۔ عرصہ سے رکھی ہوئی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھتی رہی۔ کیل میں لٹکے کرشن جی کے کلنڈر کو دیکھتی رہی اور پھر موم لے کر چرخے کی مالا سوتنے لگی۔

ایک جھپکی کے بعد جب دیوا کی آنکھ کھلی تو دیکھا، ماں سوت کی پونی کے ڈھیر کے سامنے سر جھکائے بیٹھی ہے۔ موہ کا ان دیکھا پردہ اس کے چاروں اور پھیلا ہے اور اس اندھیرے میں اس کا وجود کشمکش میں پڑا ہوا ہے۔ وہ کچھ چاہ رہی تھی — پانا یا کھونا۔ پر جیسے نہ وہ پا سکتی تھی اور نہ کھو سکتی تھی۔ وہاں سے اٹھ کر اس نے دیئے کو بجھایا تو دیوا نے آنکھیں بند کر لیں، اور اس انتظار میں کہ اب ماں لیٹے گی، وہ خود سو گیا۔

صبح کی نرم سردی سے وہ جلد ہی جاگا۔ دیوار کے موکھے سے روشنی کی لکیر آ رہی تھی اور کوٹھری کا اندھیرا بھورا بھورا ہو گیا تھا۔ اسے کچھ اچھا سا لگا۔ ماں کی کھاٹ خالی تھی۔ کچھ کھٹکا من میں ہوا۔ اُٹھ کر کوٹھری کی چوکھٹ تک آیا۔

باہر آنگن میں جیسے کثافت چھائی ہوئی تھی۔ ہلکی سردی اور من کی روشنی کی طرح پھیلا اُجالا۔ اور اس صبح کے سرمئی آسمان سے جھڑتی ہوئی وہ چمکیلی روشنی، جس میں آنگن میں تلسی کا بروا کسی یقین و اعتماد کے انکور کی طرح استھر کھڑا تھا۔ اس کے پشتے پر مٹی کا دیا جل رہا تھا جس کی مت لو میں تلسی کے سائے میں سر ٹیکے، ماں کی سیندور بھری مانگ چمک رہی تھی۔

اچانک اتنی شاندار فضا کو قبول کرنے میں خود کو نا اہل سمجھ کر وہ آنکھیں موند کر اس کمال کو حاصل کرنے کے لئے تن سے چلنے والی ہستی کی مانند کھاٹ پر منہ گاڑ کر لیٹا رہا۔ تھوڑی دیر بعد آہٹ ہوئی تو وہ یکایک آنکھیں نہ کھول پایا۔ کہیں حقیقت گم نہ ہو جائے۔ کمال کا وہ درجہ گم نہ ہو جائے۔

"دیبو...... دیبو......" ماں نے پکارا تھا — "سویرا ہو گیا دیبوا اٹھو، اٹھو......"

اٹھ کر وہ باہر آنگن میں گیا اور ماں کوٹھری میں گھسی رہی جب وہ باہر آئی تو دلیو بولا۔"

اماں، ہم لوگ چل کر بابوجی کو آج ہی دیکھ آئیں؟"

ماں نے ایسے دیکھا کہ کیا وہ سچ مچ ہی یہ بات کہہ رہا تھا اور کیا اس کے لئے کبھی کہہ رہا تھا؟ ماں کو خاموش دیکھ کر وہ بولا — "تم تیاری کرلو، ابھی سویرے دس بجے چل کر رات کی گاڑی سے واپس آجائیں گے۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔" کہتے کہتے ماں کمرے کی طرف مڑ گئی۔

"تم نہیں جاؤ گی؟" دلیو نے جیسے بات سمجھنے کے لئے دوہرائی۔

"نہیں۔" ماں کی آواز میں ایک عزم تھا۔

"تو میں چلا جاؤں؟" دلیو اچانک کہہ گیا۔

"نہیں۔" ماں نے اسی عزم سے کہا اور اپنے کام میں لگ گئی۔"

... اب تک تو تاریخ میں ہمیشہ یہ ہوتے

دیکھا ہے کہ راجہ بدلتے ہیں، پرجا نہیں

لیکن تقسیم ہند کی کہانی، تاریخ کے اس

رُخ کو ہی موڑ دیتی ہے۔ اس تقسیم میں پہلی

بار پرجا بدلی گئی۔ .. ..

کملیشور

کملیشور

راجا نربنسیا

"ایک راجا نربنسیا تھے"۔ ماں کہانی سنایا کرتی تھیں۔ اُن کے آس پاس ہی چار پانچ بچے اپنی مٹھیوں میں پھول دبائے کہانی ختم ہونے پر گوروں پر چڑھانے کے لئے بے چین سے بیٹھ جاتے تھے۔ آٹے کا ایک خوبصورت سا چوک پُرا ہوتا، اُسی چوک پر مٹی کی چھ گوریں رکھی جاتیں جن میں سے اوپر والی کے بندیا اور سیندور لگایا جاتا، باقی پانچوں نیچے دبی پوجا قبول کرتی رہتیں۔ ایک طرف دیپک کی جوت غیر متحرک جلتی رہتی اور پوجا کے پوتر پانی کا گھڑا رکھا رہتا، جس پر ہلدی چونے سے بنی رولی سے سواستک کا نشان بنایا جاتا۔ سبھی بچوں کے چہرے پر پھول چڑھانے کے اتاولے پن کی جگہ کہانی سننے کی بے چینی آجاتی۔

"ایک راجا نربنسیا تھے"۔ ماں سنایا کرتی تھیں، "ان کے راج میں بڑی خوش حالی تھی۔ ہر طبقے کے لوگ اپنا اپنا کام کاج کرتے، کوئی بھی دکھی نظر نہیں آتا تھا۔ راجا کی ایک لکشمی سی رانی تھی، چاند سی خوبصورت اور...... راجا اُسے بہت پیار کرتے تھے۔ راجا راج کاج کی دیکھ بھال کرتے اور اپنی رانی کے ساتھ محل میں سُکھ کے ساتھ رہتے......"

میرے سامنے میرے خیالوں کا راجا تھا، راجا جگپتی! تب جگپتی سے میری دانت کاٹی دوستی تھی، دونوں مڈل اسکول میں پڑھنے جاتے۔ دونوں ایک سے گھر کے تھے، اس لئے برابر کی نبھتی تھی۔ میں میٹرک پاس کرکے ایک اسکول میں نوکر ہوگیا اور جگپتی قصبے کے ہی وکیل کے یہاں محرر۔ جس سال جگپتی محرر بنا اُسی برس پاس کے گاؤں میں اس کی شادی ہوگئی، لیکن ایسی ہوئی کہ لوگوں نے تماشہ بنا دینا چاہا۔ لڑکی والوں کا کچھ وشواس تھا کہ شادی کے بعد لڑکی کی بدائی نہیں ہوگی۔ بیاہ ہوجائے گا اور جب پہلی بدائی کی ساعت ہوگی تب ساتواں پھیرا ہوگا اور تبھی لڑکی اپنی سسرال جائے گی۔ جگپتی کی بیوی تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھی۔ لیکن گھرانے کی ریت کو کون مٹائے بارات بنا بہو کے واپس آگئی اور لڑکے والوں نے طے کرلیا کہ اب جگپتی کی شادی کہیں اور کردی جائے گی، چاہے کانی لولی سے ہو، لیکن وہ لڑکی اب گھر میں نہیں آئے گی۔ لیکن سال ختم ہوتے ہوتے سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا لڑکی والوں نے معافی مانگ لی اور جگپتی کی پتنی سسرال آگئی۔

جگپتی کو گویا سب کچھ مل گیا اور ساس نے بہو کی بلائیاں لے کر گھر کی سب چابیاں سونپ دیں۔ گرہستی کی ریت سمجھادی۔ جگپتی کی ماں نہ جانے کب سے آس لگائے بیٹھی تھی۔ اُس نے آرام کی سانس لی۔ پوجا پاٹ میں وقت گزرنے لگا۔ دوپہریں دوسروں کے گھروں کے آنگن میں بیتنے لگیں۔ لیکن سانس کی بیماری تھی انہیں، ،

سو ایک دن انہوں نے اپنی آخری گھڑیاں گنتے ہوئے چندا کو پاس بلا کر سمجھایا —— "بیٹیا جگپتی بڑے لاڈ پیار میں پلا ہے۔ تمہارے سسر کے گذر جانے کے بعد سے اُس کی چھوٹی چھوٹی ضدیں پوری کرتی رہی ہوں .... اب تم دھیان رکھنا۔" پھر کچھ توقف کے بعد انہوں نے کہا، "جگپتی کچھ لائق ہوا ہے تو رشتہ داروں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا ہے۔ تمہارے باپ نے بیاہ کے وقت نادانی کی جو تمہاری بدائی نہیں کی۔ میرے دشمن دیور جیٹھوں کو موقع مل گیا۔ طومار کھڑا کر دیا کہ اب وداع کروا نا ناک کٹوانا ہے۔...... جگپتی کا بیاہ کیا ہوا کہ ان لوگوں کی چھاتی پر سانپ لوٹ گیا۔ سوچا گھر کی عزت رکھنے کی آڑ میں رنگ میں بھنگ کر دیں ...... اب بیٹیا، اس گھر کی لاج تمہاری لاج ہے ...... آج اگر تمہارے سسر ہوتے، تو بھلا ......" کہتے کہتے ماں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اور جگپتی کی دیکھ بھال اُسے سونپ کر وہ سدا کے لئے خاموش ہو گئیں تھیں۔

ایک ارمان ان کے ساتھ ہی چلا گیا۔ جگپتی کی اولاد کو وہ چار برس انتظار کرنے کے بعد بھی گود میں نہ کھلا پائیں اور چندا نے یہ سوچ کر صبر کر لیا تھا کہ جیون بھر لو جینے کے لئے ایک پتی تو مل ہی گیا ہے۔ گھر میں جیسے ہُن برستا اور پیار کی کمی نہ تھی۔ وہ خود فریبی سے یہ محسوس کرتی کہ گھر کی اندھیاری کوٹھریوں میں امن اور شانتی کا بسیرا ہے۔ گھر کی سبھی کنڈیوں کی کھٹک سے اُس کے کان مانوس ہو گئے تھے ہر دروازے کی چرچراہٹ سے وہ آشنا تھی ......

"ایک روز راجا شکار پر گئے"، ماں سناتی تھیں، "راجا شکار پر جاتے تھے تو ساتویں دن ضرور محل میں لوٹ آتے تھے۔ لیکن اُس دفعہ جو گئے تو ساتواں دن بھی نکل گیا اور راجا نہیں لوٹے۔ رانی بڑی فکر میں پڑ گئیں رانی ایک وزیر کو ساتھ لے کر کھوج میں نکل پڑیں ...."

اور اسی بیچ جگپتی کو رشتے داری کی ایک شادی میں جانا پڑا۔ اس کے دور کے رشتے کے بھائی دیا رام کی شادی تھی۔ کہہ گیا تھا کہ دسویں دن ضرور واپس آ جائے گا۔ لیکن چھٹے دن ہی خبر ملی کہ بارات گھر واپس لوٹنے پر دیا رام کے گھر پر ڈاکہ پڑ گیا۔ کسی مخبر نے ساری خبریں پہونچا دی تھیں کہ لڑکی والوں نے دیا رام کا گھر سونے چاندی سے پاٹ دیا ہے ...... آخر پشتوں سے چلے آئے زمیندار کی اکلوتی بیٹی تھی۔ گھر آئے مہمان لگ بھگ وداع ہو چکے تھے۔ دوسرے روز جگپتی بھی نکلنے والا تھا۔ لیکن اسی رات ڈاکہ پڑا۔ جوان آدمی کھلا خون مانتا ہے! ڈاکوؤں نے جب بندوقیں چلائیں، تو سب کی گھگھی بندھ گئی لیکن جگپتی اور دیا رام نے چھاتی ٹھونک کر لاٹھیاں اُٹھا لیں گھر میں کہرام مچ گیا۔ ڈاکو برابر گولیاں داغ رہے تھے۔ باہر کا دروازہ ٹوٹ چکا تھا۔ جگپتی نے جوانوں کی ہمت بندھاتے اور للکارتے ہوئے کہا، "یہ ہوائی بندوقیں ان تیل پلائی لاٹھیوں کا مقابلہ نہیں کر پائیں گی!"

لیکن دروازے تڑتڑ ٹوٹتے رہے اور آخر کار ایک گولی جگپتی کی ران کو چھید کر نکل گئی دوسری اس کی جانگھ کے اوپر کولھے میں سما کر رہ گئی۔

چندا روتی پیٹتی منتیں مانگتی جب وہاں پہونچی تو جگپتی اسپتال میں تھا۔ دیا رام کو تھوڑی سی چوٹ آئی تھی۔ اُسے اسپتال سے چھٹی مل گئی تھی۔ جگپتی کی دیکھ بھال کے لئے وہیں اسپتال میں مریضوں کے رشتہ داروں کے لئے بنی کوٹھریوں میں سے ایک میں چندا کو رکنا پڑا۔ قصبے کے اسپتال سے دیا رام کا گاؤں چار کوس پر تھا۔ دوسرے تیسرے وہاں سے آدمی آتے جاتے رہتے۔ جس سامان کی ضرورت ہوتی، پہونچ جاتا۔

لیکن دھیرے دھیرے ان لوگوں نے بھی خبر لینا چھوڑ دیا۔ ایک دن میں ٹھیک ہونے والا گھاؤ تو

تھا نہیں۔ جانگھ کی ہڈی چٹخ گئی تھی اور کولہے میں آپریشن سے چھ انچ گہرا گھاؤ ہو گیا تھا۔

قصبے کا اسپتال تھا۔ کمپاؤنڈر ہی مریضوں کی دیکھ بھال کرتے۔ بڑا ڈاکٹر تو نام کے لئے تھا یا قصبے کے بڑے آدمیوں کے لئے۔ چھوٹے لوگوں کے لئے تو "کمپوٹر" صاحب ہی ایشور کا اوتار تھے۔ مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والے رشتہ داروں کی کھانے پینے کی مشکلات سے لے کر مریضوں کی نبض تک سنبھالتے تھے۔ چھوٹی سی عمارت میں اسپتال آباد تھا۔ مریضوں کی صرف چھ سات کھاٹیں تھیں۔ مریضوں کے کمرے سے لگا دوا بنانے کا کمرہ تھا، اُسی میں ایک طرف آرام کرسی تھی اور ایک نیچی سی میز۔ اُسی کرسی پر بڑا ڈاکٹر آ کر کبھی کبھی بیٹھتا نہیں تو بچن سنگھ کمپاؤنڈر ہی جمے رہتے۔ اسپتال میں یا تو نوبد اری کے شہید آتے یا گر گرا کر ہاتھ پیر توڑ لینے والے ایک آدھ لوگ۔ سال چھ ماہ میں کوئی عورت نظر آ گئی تو آ گئی جیسے بیماری انہیں گھیر ہی نہیں تھی۔ کبھی کوئی بیمار پڑتی تو گھر والے حال بتا کر آٹھ دس روز کی دوا ایک ساتھ لے جاتے اور پھر اس کے جینے مرنے کی خبر تک نہیں ملتی۔

اُس دن بچن سنگھ جگپتی کے گھاؤ کی پٹی کھولنے آیا اس کے آنے اور پٹی کھولنے میں کچھ ایسی لاپرواہی تھی جیسے غلط بندھی پگڑی کو ٹھیک سے باندھنے کے لئے کھول رہا ہو۔ چندا اس کی کرسی کے پاس ہی سانس روکے کھڑی تھی۔ وہ دوسرے مریضوں سے بھی بات کرتا جا رہا تھا۔ ادھر منٹ بھر کے لئے دیکھا پھر مہارت سے اُس کے ہاتھ کام کرنے لگتے۔ پٹی ایک جگہ خون سے چپک گئی تھی، جگپتی بری طرح کراہ اُٹھا۔ چندا کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ بچن سنگھ نے چونک کر دیکھا تو چندا منہ میں دھوتی کا پلّو کھونسے اپنی خوفزدہ آواز دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ جگپتی ایک بار مچھلی کی طرح تڑپ کر رہ گیا۔ بچن سنگھ کی انگلیاں تھوڑی سی تھرتھرائیں اور اس کے ہاتھ پر چندا کا آنسو گر پڑا۔

بچن سنگھ کے بدن میں ایک ٹھنڈی لہر سی دوڑ گئی اور اس کے تجربہ کار ہاتھوں کی مہارت کو جیسے کسی روحانی ملائمت نے دھیرے دھیرے چھو لیا ہو۔ آہوں، کراہوں، پُر درد چیخوں اور لوٹتے ہوئے جسموں کے ماحول میں رہتے ہوئے بھی وہ اُس سے الگ رہتا تھا، پھوڑوں کو پکے آم سا دبا دیتا تھا، کھال کو آلو کی طرح چھیل دیتا تھا...... اُس کے دل سے جیسے درد کا احساس ہی اُٹھ گیا تھا لیکن آج وہ احساس پھر بیدار ہو گیا اور وہ بچے کی طرح پھونک پھونک کر پٹی کو نرم کر کے کھولنے لگا۔ چندا کی جانب دھیرے سے نگاہ کرتے ہوئے پھسپھسایا، "تم...... تم...... مریض کی ہمت لوٹ جاتی ہے ایسے......"

لیکن جیسے یہ کہتے کہتے اُس کا دل اپنی بات سے اچٹ گیا۔ یہ لاپرواہی تو چیخوں اور کراہوں کی یکسانیت سے اُسے ملی تھی۔ مریض کی ہمت بڑھانے کے احساس فرض سے نہیں۔ جب تک وہ گھاؤ کی مرہم پٹی کرتا رہا تب تک انہیں دو آنکھوں کا درد اُسے گھیرے رہا۔

اور ہاتھ دھوتے وقت وہ چندا کی اُن چوڑیوں سے بھری کلائیوں کو بلا جھجک دیکھتا رہا جو اپنی خوشی اس سے مانگ رہی تھیں۔ چندا پانی ڈالتی جا رہی تھی اور بچن سنگھ ہاتھ دھوتے دھوتے اُس کی کلائیوں ہتھیلیوں اور پیروں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ دوا خانے کی جانب بڑھتے ہوئے اُس نے چندا کو ہاتھ کے اشارے سے بلا کر کہا، "دل چھوٹا مت کرنا...... جانگھ کا گھاؤ تو دس روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

کولھے کا گھاؤ کچھ دن ضرور رہے گا۔ اچھی سے اچھی دوا دوں گا۔ دوائیاں تو ایسی ایسی ہیں کہ مُردے کو بھلا چنگا کر دیں۔ لیکن ہمارے اسپتال میں نہیں آتیں، پھر بھی ...."

"تو کسی دوسرے اسپتال سے نہیں آ سکتیں وہ دوائیاں؟" چندا نے پوچھا۔ "آ تو سکتی ہیں پر مریض کو اپنا پیسہ خرچ کرنا پڑتا ہے اُن میں ...." بچن سنگھ نے کہا۔

چندا چپ رہ گئی تو بچن سنگھ کے منہ سے بے اختیار ہی نکل پڑا، "کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتانا .... رہیں دوائیاں، سو کہیں نہ کہیں سے انتظام کر کے لا دوں گا۔ محکمے سے منگائیں گے تو آتے آتے مہینوں لگ جائیں گے۔ شہر کے ڈاکٹر سے منگا دوں گا۔ طاقت کی دوائیوں کی بڑی ضرورت ہے اُنہیں۔ اچھا دیکھا جائے گا۔" کہتے کہتے وہ رک گیا۔

چندا نے احسان مند نظروں سے اُسے دیکھا اور اُسے لگا جیسے آندھی میں اڑتے پتے کو کوئی سہارا مل گیا ہو۔ اور وہ جگپتی کی کھاٹ سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کی ہتھیلی لے کر وہ سہلاتی رہی۔ ناخنوں کو اپنے پوروں سے دباتی رہی۔

دھیرے دھیرے باہر اندھیرا بڑھتا گیا۔ بچن سنگھ تیل کی ایک لالٹین لا کر مریضوں کے کمرے کے کونے میں رکھ گیا۔ چندا نے جگپتی کی کلائی دباتے دباتے دھیرے سے کہا، "کمپاؤنڈر صاحب کہہ رہے تھے ...." اور اتنا کہہ کر وہ گویا جگپتی کو متوجہ کرنے کے لئے چپ ہو گئی۔

"کیا کہہ رہے تھے؟" جگپتی نے اُداس سی آواز میں کہا۔

"کچھ طاقت کی دوائیاں تمہارے لئے ضروری ہیں!"

"میں جانتا ہوں!"

"لیکن ......"

"دیکھو چندا، چادر کے برابر ہی پیر پھیلائے جا سکتے ہیں۔ ہماری اوقات ان دوائیوں کی نہیں ہے ..."

"اوقات آدمی کی دیکھی جاتی ہے کہ پیسے کی تم تو ...."

"دیکھا جائے گا۔"

"کمپاؤنڈر صاحب انتظام کر دیں گے۔ اُن سے کہوں گی میں۔"

"نہیں چندا ادھار کھاتے سے میرا علاج نہیں ہو گا .... چاہے ایک کے چار دن لگ جائیں۔"

"اس میں تو ...."

"تم نہیں جانتیں، قرض کوڑھ کا روگ ہوتا ہے ایک بار لگنے سے تن تو گلتا ہی ہے من بھی روگی ہو جاتا ہے۔"

"لیکن ......" کہتے کہتے وہ رک گئی۔

جگپتی اپنی بات پر اڑا رہنے کے لئے منہ پھیر کر لیٹ گیا۔

اور تیسرے روز جگیتی کے سرہانے کئی طاقت کی دوائیاں رکھی تھیں، اور چندا کی کوٹھری میں اُس کے لیٹنے کے لئے ایک کھاٹ پہونچ گئی تھی۔ چندا جب آئی تو جگیتی کے چہرے پر روحانی اذیت کی انگنت لکیروں کا جال بچھا تھا، جیسے وہ اپنی بیماری سے لڑنے کے علاوہ خود اپنی آتما سے بھی لڑ رہا ہو......
چندا کی نادانی اور پیار سے الجھ رہا ہو۔ اور سب سے بڑھ کر مدد کرنے والے کی مہربانی سے بھی دست و گریباں ہو
چندا نے دیکھا تو جیسے وہ یہ سب کچھ برداشت نہ کر سکی اس کے جی میں آیا کہ کہہ دے، کیا آج تک تم نے کبھی کسی سے اُدھار پیسے نہیں لئے؟ پردہ تو خود تم نے لئے تھے اور تمہیں میرے سامنے اس کا اقرار نہیں کرنا پڑا تھا۔ اسی لئے لیتے وقت جھجک محسوس نہیں ہوئی لیکن آج میرے سامنے تمہاری جھوٹی خودداری تلملا اٹھی ہے۔ لیکن جگیتی کے منہ پر بکھری ہوئی اذیت میں جس اصول پسندی کی گہرائی تھی، وہ چندا کے دل میں چور کی طرح گھس گئی اور بڑی اپنائیت سے اُس نے کہا کہ یہ دوائیاں کسی کی مہربانی نہیں ہیں۔ میں نے ہاتھ کا کڑا بیچنے کو دے دیا تھا، اُسی سے آئی ہیں۔"
"مجھ سے پوچھا تک نہیں اور........" جگیتی نے کہا اور جیسے خود دل کی کمزوری کو دبا گیا
—— کڑا بیچنے سے تو اچھا تھا کہ بچن سنگھ کی مہربانی ہی اوڑھ لی جاتی اور اسے ہلکا سا پچھتاوا بھی تھا کہ ناحق وہ رو میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتا ہے، عالموں کی طرح نصیحت کرنے لگتا ہے۔
اور جب چندا اندھیرا ہوتے اُٹھ کر اپنی کوٹھری میں سونے کے لئے جانے لگی تو کہتے کہتے یہ بات دبا گئی کہ بچن سنگھ نے اس کے لئے ایک کھاٹ کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ کمرے سے نکلی تو سیدھے کوٹھری میں گئی اور ہاتھ کا کڑا لے کر سیدھے دواخانے کی جانب چلی گئی جہاں بچن سنگھ آئیلاڈ اکر کی کرسی پر آرام سے ٹانگیں پھیلائے لیمپ کی زرد روشنی میں لیٹا تھا۔ جگیتی کا رویہ چندا کو تنگ گیا تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ کیوں بچن سنگھ کا احسان ابھی سے لادے۔ بستی کے لئے زیور کی کیا اوقات ہے! وہ بے دھڑک سی دواخانے میں گھس گئی۔ دن کی پہچان کی وجہ سے اُسے کمرے کی میز کرسی اور دواؤں کی الماری کہاں دھری ہے اُس کا اندازہ تھا، ویسے کمرہ اندھیرا ہی پڑا تھا۔ کیونکہ لیمپ کی روشنی صرف اپنے حلقے کو زیادہ منور کر کے کونوں کے اندھیرے کو مزید گہرا کر رہی تھی۔ بچن سنگھ نے چندا کو گھستے ہی پہچان لیا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ چندا نے اندر قدم تو رکھ دیا لیکن اچانک سہم گئی، جیسے وہ کسی اندھے کنویں میں خود ہی کود پڑی ہو، ایسا کنواں جو مسلسل تنگ ہوتا گیا ہو...... اور جس میں پانی کی گہرائی پاتال کی پرتوں تک چلی گئی ہو، جس میں گر کر وہ نیچے دھنستی چلی جا رہی ہو، نیچے..... اندھیرا ...... تنہائی گھٹن .... پاپ!
بچن سنگھ حیرت سے تاکتا رہ گیا۔ اور چندا ایسے لوٹ گئی جیسے کسی سیاہ بھوت کے پنجوں سے نجات مل گئی ہو۔ بچن سنگھ کے سامنے لمحے بھر میں ساری صورتحال کوند گئی اور اُس نے وہیں سے انتہائی سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ "چندا!" وہ آواز اتنی بے آواز تھی اور بے معنی ہوتے ہوئے بھی اتنی بامعنی تھی کہ وہ خاموشی پر معنی ہو گئی۔
چندا رُک گئی۔
بچن سنگھ اُس کے قریب چلا گیا۔

سامنے کا گھنا پیڑ بے سدھ کھڑا تھا، اُس کی سیاہ پرچھائیوں کا دائرہ گویا کبھی کبھی پھیل
کر اُنہیں اپنے حلقے میں سمیٹ لیتا اور دوسرے ہی لمحے آزاد کر دیتا۔ دواخانے کا لیمپ اچانک بھڑک کر رہ
گیا اور مریضوں کے کمرے سے ایک کراہ کی آواز دور ویرانے کے اختتام پر جا کر کہیں ڈوب گئی۔
چندا نے ویسے ہی نیچے تاکتے ہوئے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا، "یہ کڑا تمہیں دینے
آئی تھی۔"

"تو واپس کیوں چلی جا رہی تھیں؟"

چندا خاموش رہی پھر کچھ توقف کے بعد اُس نے اپنے ہاتھ کا سونے کا کڑا دھیرے سے اُس
کی جانب بڑھا دیا گویا دینے کی ہمت نہ ہوتے ہوئے بھی یہ کام ضروری تھا۔
بچن سنگھ نے اس کے سراپا کو ایک بار دیکھا اور پھر اپنی آنکھیں اُس کے سر پر جما دیں،
اُس کے سر پر پڑے کپڑے کے اندر نرم چکنائی سے بھرے لمبے لمبے بال تھے، جن کی بھاپ سی مہک پھیلی جا رہی
تھی۔ وہ دھیرے سے بولا، "لاؤ۔"
چندا نے کڑا اُس کی طرف بڑھا دیا۔ کڑا ہاتھ میں لے کر اُس نے کہا، "سنو۔"
چندا نے سوالیہ نظریں اس کی طرف اُٹھا دیں۔
اُن میں جھانکتے ہوئے بچن سنگھ نے اپنے ہاتھ سے اُسکی کلائی پکڑتے ہوئے وہ کڑا اُس کی کلائی
میں پہنا دیا۔

چندا چپ چاپ کوٹھری کی طرف چلدی اور بچن سنگھ دواخانے کی طرف۔ اندھیرا بری طرح
بڑھ گیا تھا اور سامنے کھڑے پیڑ کی سیاہ پرچھائیں مزید گہری ہو گئی تھی۔ دونوں لوٹ گئے تھے لیکن جیسے اُس
اندھیارے میں کچھ رہ گیا تھا چھوٹ گیا تھا۔ دواخانے کا لیمپ جو جلتے جلتے ایک بار بھڑک اُٹھا تھا اُس
میں تیل ختم ہو جانے کی وجہ سے بتی کی لو درمیان سے پھٹ گئی تھی، اُس کے اوپر دھوئیں کی لکیریں بل کھاتی
سانپ کی طرح اندھیرے میں غائب ہو جاتی تھیں۔
صبح جب چندا جگیتی کے پاس پہنچی اور بستر ٹھیک کرنے لگی تو جگیتی کو لگا کہ چندا بہت اداس
ہے۔ لمحہ بہ لمحہ چندا کے منہ پر اَن گنت جذبات آ جا رہے تھے، جن میں پریشانی اذیت اور اُداسی تھی
کوئی غیر محسوس پاپ کرنے کے بعد دل کی گہرائی سے کی گئی توبہ کی دھندلی چمک!......
"رانی وزیر کے ساتھ جب ناکام لوٹیں، تو دیکھا، راجا محل میں حاضر تھے اُن کی خوشی کا کوئی
ٹھکانہ نہ رہا۔" ماں سنایا کرتی تھیں، "لیکن راجا کو رانی کا اس طرح وزیر کے ساتھ جانا اچھا نہیں لگا
رانی نے راجا کو سمجھا دیا کہ وہ تو صرف راجا کے تئیں اٹوٹ پیار کی خاطر اپنے کو نہ روک سکی۔ راجا رانی ایک
دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ دونوں کے دلوں میں ایک بات کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی کہ ان کے کوئی اولاد
نہ تھی...... شاہی خاندان کی شمع گل ہونے کو تھی۔ اولاد کی کمی کے باعث اُن کا لوک پرلوک بگڑا،
جا رہا تھا اور خاندان کی عزت مٹی میں ملنے کا خدشہ بڑھتا جا رہا تھا......"
دوسرے دن بچن سنگھ نے مریضوں کی مرہم پٹی کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اُس کا تبادلہ مین پوری کے

صدر اسپتال میں ہو گیا ہے اور وہ پرسوں یہاں سے چلا جائے گا، جگپتی نے سُنا، تو اُسے بھلا ہی لگا..... آئے دن بیماریاں گھیرے رہتی ہیں، بچن سنگھ اُس کے شہر کے اسپتال میں پہنچا جا رہا ہے، تو کچھ مدد ملتی ہی رہے گی۔ آخر وہ ٹھیک تو ہوگا ہی اور پھر بنی پوری کے سوا کہاں جائے گا؟ لیکن دوسرے ہی لمحہ اُس کا دل ناقابلِ بیان بھاری پن سے بھر گیا ہے۔ پتہ نہیں کیوں، چندا کے وجود کا خیال آتے ہی اُسے اس خبر میں کچھ ایسے نوکیلے کانٹے دکھائی دینے لگے، جو اُس کے جسم میں کسی بھی وقت چبھ سکتے تھے، ذرا سا بے خبر ہونے پر گُھس سکتے اور تب اُس کے سامنے آدمی کے حق اور اُس کے ادھیکار کی تشمن ریکھائیں دھوئیں کی لکیر کی طرح کانپ کر مٹنے لگیں اور دل میں چھپے شک کے عفریت خانہ بدوش جوگی کی طرح آوارگی کرنے لگے۔

اور پندرہ بیس روز بعد جب جگپتی کی حالت سدھر گئی تو چندا اُسے لے کر گھر لوٹ آئی۔ جگپتی چلنے پھرنے لائق ہو گیا تھا۔ گھر کا تالا کھولا، تب رات جھک آئی تھی اور پھر ان کی گلی میں تو شام سے ہی اندھیرے کا راج شروع ہو جاتا تھا۔ پر گلی میں آتے ہی اُنہیں لگا، جیسے کہ بن باس کاٹ کر راج دھانی لوٹے ہوں۔ نکڑ پر جمیا سنار کی کوٹھری میں سُر ہی کھینکی جا رہی تھی، جس کے دراز دروازوں سے لالٹین کی روشنی کی لکیریں جھانک رہی تھیں اور کچّے کمیا کو کا دھواں تنگ گلی کے دہانے پر بری طرح بھر گیا تھا۔ سامنے ہی منشی جی اپنی ڈھیلی کھٹیا کے گڈھے میں دیئے کی مدھم روشنی میں کھاتہ کھتونی بچھائے میزان لگانے میں مشغول تھے۔ جب جگپتی کے گھر کا دروازہ کھڑکا تو اندھیرے میں اس کی چاچی نے اپنے جنگلے سے دیکھا اور وہیں سے بیٹھے بیٹھے اپنے گھر کے اندر اعلان کر دیا کہ ——" راجا نربنسیا اسپتال سے لوٹ آئے ہیں..... سوئی اور دلہن بھی آئی ہیں۔"

یہ الفاظ سُنتے ہی گھر کے اندھیرے برآمدے میں گھومتے ہی جگپتی ہانپ کر بیٹھ گیا اور جھنجلا کر چندا سے بولا، "اندھیرے میں کیا میرے ہاتھ پیر تڑواؤ گی؟ اندر جا کر لالٹین جلا لاؤ نا۔"

"تیل نہیں ہو گا اس وقت ذرا ایسے کام ......"

"تمہارے کبھی کچھ نہیں ہو گا...... نہ تیل نہ ......" کہتے کہتے جگپتی ایک دم خاموش ہو گیا اور چندا کو لگا کہ آج پہلی بار جگپتی نے اُس کے بانجھ پن پر اپنی گہری چوٹ کر دی جس کی گہرائی کا اُس نے کبھی اندازہ نہیں کیا تھا۔ دونوں خاموش، بنا ایک بات کئے اندر چلے گئے۔

رات کے بڑھتے سناٹے میں دونوں کے سامنے دو باتیں تھیں..........

جگپتی کے کانوں میں جیسے کوئی طنز سے کہہ رہا تھا —— "راجا نربنسیا اسپتال سے آگئے!"

اور چندا کے دل میں یہ بات چبھ رہی تھی —— "تمہارے کبھی کچھ نہیں ہو گا۔"

اور سسکتی سسکتی چندا نہ جانے کب سو گئی۔ لیکن جگپتی کی آنکھوں میں نیند نہیں آئی۔ کھاٹ پر پڑے پڑے اُس کے چاروں طرف خیالی مگر خوفناک جال پھیل گیا۔ لیٹے لیٹے اُسے ایسا لگا جیسے اُس کی اپنی ہستی کا خاکہ گھٹتے گھٹتے محض ایک نقطہ سا رہ گیا۔ لیکن اُس نقطہ کے ہاتھ بھی تھے پیر بھی تھے اور دل کی دھڑکن بھی۔ کوٹھری کا گھٹا گھٹا اندھیارا میل سے اٹی دیواریں اور مہیب غاروں کی سی الماریاں جن میں سے بار بار کوئی جھانک کر دیکھتا تھا .... اور وہ لرز اُٹھتا تھا..... پھر گویا سب کچھ تبدیل ہو گیا ہو۔ اُسے لگا کہ اُس کی ہستی کا خاکہ بڑھتا جا رہا ہے۔ بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ آدمی بن گیا، لمبا تڑنگا تندرست مرد

بن گیا، اُس کی شریانوں میں کچھ پھوٹ پڑنے کے لئے بے چینی سے کھول اٹھا۔ اس کے ہاتھ جسم کی نسبت سے بہت بڑے خوفناک اور قدرے بھیانک ہوگئے۔ ان میں لمبے لمبے ناخن نکل آئے...... وہ راکشش بنا پھر آدم خور بن گیا ...... بالکل قدیم وحشی!

اور بڑی تیزی سے سارا کمرہ یکبارگی چکر کاٹ گیا۔ پھر رفتہ رفتہ سب کچھ غیر متحرک ہوتا گیا اور اس کی سانسیں معمول پر آنے لگیں پھر گویا بڑی کوشش کرنے پر گھگھی بندھ جانے کے بعد بمشکل اس کی آواز نکلی، "چندا"!

چندا کی نرم سانسوں کی ہلکی سرسراہٹ کمرے میں جان ڈالنے لگی۔ جگیتی اپنی پاٹی کا سہارا لے کر جھکا۔ کانپتے پیر اُس نے زمین پر رکھے اور چندا کے کھاٹ کے پائے سے سر لگا کر بیٹھ گیا۔ اُسے لگا، جیسے چندا کی ان سانسوں کی آواز میں زندگی کی موسیقی گونج رہی ہے وہ اُٹھا اور چندا کے چہرے پر جھک گیا ..... اُس اندھیرے میں کافی دیر آنکھیں جمائے رہا پھر بہت دیر بعد جیسے خود چندا کے چہرے سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر بکھرنے لگی..... اُس کے نقوش منور ہوگئے اور جگیتی کی آنکھوں کو بصیرت مل گئی وہ بے خودی سے اُسے تاکتا رہا۔

چندا کے بکھرے بالوں میں بالکل نوزائیدہ بچے کے پیدائشی بالوں کی سی مہک..... دودھ کی کچی بو...... جسم کے رس کی سی مٹھاس اور معصوم پیار کی چکناہٹ تھی اور پیشانی پر بالوں کے پاس تمام چھوٹے چھوٹے نرم نرم روئیں...... ریشم سے...... اور اس پر کبھی لگائی گئی سیندور کی بندیا کا مٹا مٹا سا احساس..... ننھی ننھی نازک پلکیں اور ان کے کانٹوں کی طرح باریک ملائم بال اور سانسوں میں مچل کر آتی ہوئی اُس روح کی پاکیزہ آواز کی لے....... پھول کی پنکھڑی سے پتلے پتلے ہونٹ جن میں اچھوتی لکیریں تھیں اور صرف دودھ کی سی مہک!

اُس کی آنکھوں کے سامنے ممتا سی چھا گئی، صرف ممتا اور اُس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا، "بچی"!

ڈرتے ڈرتے اُس کے بالوں کی ایک لٹ کو بڑے جتن سے اُس نے ہتھیلی پر رکھا اور انگلی سے اُس پر جیسے لکیریں کھینچنے لگا۔ اُسے لگا جیسے کوئی معصوم اُس کی گود میں آنے کے لئے چھٹپٹا کر مایوس ہو کر سو گیا ہے۔ اُس نے دونوں ہتھیلیوں کو پھیلا کر اُس کے سر کو اپنے حلقے میں لینا چاہا کہ کوئی سخت چیز اُس کی انگلیوں سے ٹکرائی۔

وہ گویا ہوش میں آگیا۔

بہت ہی آہستگی سے اُس نے چندا کے سرہانے کے نیچے ٹٹولا۔ ایک رومال میں بندھا کچھ اُس کے ہاتھ میں آگیا اپنے آپ کو قابو میں کرتے ہوئے وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا، اُسی اندھیرے میں اُس رومال کو کھولا تو جیسے اُسے سانپ سونگھ گیا، چندا کے ہاتھوں کے دونوں سونے کے کڑے اُس میں لپٹے تھے!

اور تب اُس کے سامنے ساری کائنات دھیرے دھیرے پاش پاش ہو کر بکھرنے لگی۔

یہ کپڑے تو چندا بیچ کر اُس کا علاج کر رہی تھی۔ وہ سب دوائیاں اور طاقت کی ٹانک ...... اُس نے تو کہا تھا 'یہ دوائیاں کسی کی مہربانیاں نہیں ہیں، میں نے ہاتھ کے کپڑے بیچنے کو دیئے تھے ...... لیکن اُس کا گلا بُری طرح خشک ہو گیا۔ زبان جیسے تالو سے چپک کر رہ گئی اُس نے چاہا کہ چندر کو جھنجھوڑ کر اُسے اُٹھائے، لیکن جسم کی ساری قوت بہہ سی گئی تھی، خون پانی ہو گیا تھا۔

اپنے آپ پر قابو پانے کے بعد اُس نے وہ کپڑے اُسی رومال میں لپیٹ کر اُس کی کھاٹ کے کونے پر رکھ دیئے اور بڑی مشکل سے اپنی کھاٹ کی پٹی پکڑ کر لڑھک گیا۔

چندا جھوٹ بولی! لیکن کیوں؟ کپڑے آج تک چھپائے رہی۔ اس نے اس قدر رازداری کیوں برتی؟ آخر کیوں؟ کس لئے؟ اور جگیتی کا دل بھاری ہو گیا۔ اُسے پھر لگا کہ اُس کا جسم سمٹ رہا ہے اور وہ ٹہنیوں سے بنا ڈھانچہ رہ گیا ...... بے عذر ہلکا، تنکے جیسا، ہواؤں میں اُڑ کر بھٹکنے والے تنکے جیسا۔

اُس رات کے بعد جگیتی روزانہ یہی سوچتا رہا کہ چندا سے کپڑے مانگ کر بیچ دے اور کوئی چھوٹا موٹا کاروبار ہی شروع کر دے، کیونکہ نوکری چھوٹ چکی تھی۔ اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد وکیل صاحب نے دوسرا محرر رکھ لیا تھا۔ وہ روز یہی سوچتا لیکن جب چندا سامنے آتی تو نہ جانے کیسے بے یار و مددگار سی اُس کی حالت ہو جاتی۔ اُسے لگتا، جیسے کپڑے مانگ کر وہ چندا سے بیوی کا درجہ بھی چھین لیگا۔ ماں کا درجہ تو بھگوان نے چھین ہی لیا ...... وہ سوچتا آخر چندا کیا رہ جائے گی؟ ایک عورت سے اگر بیوی اور ماں کا درجہ چھین لیا جائے تو وہ اُس کی زندگی کے کیا معنی رہ جائیں گے؟ چندا کے ساتھ وہ یہ بے انصافی کیسے کرے؟ اُس سے دوسری آنکھ کی روشنی کیسے مانگ لے؟ پھر تو وہ بالکل اندھی ہو کر رہ جائے گی! اور ان کپڑوں کو مانگنے سے جس خفیہ تاریخ کی روح عریاں ہو جائے گی، کیسے وہ اُس لاج کو خود ہی کھول کر دُکھا پائے گا؟

اور وہ ان ہی خیالوں میں ڈوبا۔ صبح سے شام تک تلاش معاش میں اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہتا۔ کسی سے اُدھار لے لے؟ لیکن کس بوتے پر؟ کیا ہے اُس کے پاس، جس کی بنا پر کوئی اُسے کچھ دے گا؟ اور محلے کے لوگ ...... جو ایک ایک پائی پر جان دیتے ہیں، کوئی چیز خریدتے وقت دام میں ایک پائی کا فرق ہونے پر میلوں پیدل جا کر ایک پیسہ بچاتے ہیں۔ ایک ایک پیسے کی مسالے کی پڑیا بندھوا کر گیارہ مرتبہ پیسوں کا حساب جوڑ کر ایک آدھ پیسہ اُدھار رکھ کر منتیں کرتے سودا گھر لاتے ہیں! گلی میں کوئی خوانچے والا کھیلنی گیا تو دو پیسے کی چیز کو لے جھگڑ جھگڑ کر۔ چار دانے زیادہ پانے کی نیت سے ۔ دو جگہ بندھواتے ہیں بھاؤ کے ذرا سے فرق پر گھنٹہ بھر بحث کرتے ہیں، کفایت کی خاطر شام کی سڑی گلی ترکاریاں لاتے ہیں ایسے لوگوں سے وہ کس منہ سے مانگ کر اُن کے غریبی کے احساس پر بٹہ لگا کر مارے!

لیکن اُس دن شام کو جب وہ گھر پہنچا تو سامنے ہی ایک سائیکل رکھی نظر آئی۔ دماغ پر بہت زور ڈالنے کے بعد بھی آنے والا کون ہے یہ اندازہ نہ کر سکا۔ اندر کے دروازے پر جب پہنچا، تو اچانک ہنسی کی آواز سنکر ٹھٹھک گیا۔ اُس ہنسی میں ایک عجیب سی خوشی تھی اور پھر چندا کی آواز آئی —

"اب آتے ہوں گے، بیٹھئے نا دو منٹ اور! ...... اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجئے اور انہیں سمجھاتے جائیے کہ ابھی تندرستی اس لائق نہیں کہ دن دن بھر گھومنا برداشت کر سکیں۔"

"ہاں ...... بھئی، کمزوری اتنی جلدی نہیں مٹ سکتی، خیال نہیں رکھیں گے تو نقصان اُٹھائیے گے!" یہ کوئی مردانہ آواز تھی۔

جگپتی پریشانی میں پڑ گیا۔ کیا وہ ایک دم سے اندر گھس جائے؟ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ لیکن جب اُس نے قدم اُٹھائے تو وہ باہر جا رہے تھے۔ باہر سائیکل پر ہاتھ پڑتے ہی اُس کے حواس بجا ہوئے، وہیں سے گویا انجان بنتے ہوئے بمشکل آواز کھولتے ہوئے وہ چلایا "ارے چندا! یہ سائیکل کس کی ہے؟ کون مہربان......"

چندا اُس کی آواز سن کر کمرے سے باہر نکل آئی، گویا خوشخبری سنا رہی تھی، "اپنے کمپاؤنڈر صاحب آئے ہیں۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے آج گھر کا پتہ مل سکا ہے۔ تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں!"

"کون بچن سنگھ؟ ...... اچھا ...... اچھا۔ وہی تو میں سوچ رہا تھا، بھلا کون..."

کہتا جگپتی پاس پہونچا اور باتوں میں اس طرح الجھ گیا جیسے سارے حالات کو اس نے قبول کر لیا ہو۔

بچن سنگھ جب پھر آنے کی بات کہہ کر چلا گیا، تو چندا نے بہت اپنے پن سے جگپتی کے سامنے بات شروع کی، "جانے کیسے کیسے آدمی ہوتے ہیں......"

"کیوں کیا ہوا؟ کیسے ہوتے ہیں آدمی؟" جگپتی نے پوچھا۔

"اتنی چھوٹی جان پہچان میں تم مردوں کے گھر میں نہ رہتے، گھس کر بیٹھ سکتے ہو؟ تم تو الٹے پیروں لوٹ جاؤ گے۔" یہ کہہ کر چندا جگپتی کے چہرے پر خاطرخواہ ردعمل دیکھنے کے لئے گہری نگاہوں سے تاکنے لگی۔

جگپتی نے چندا کی طرف ایسے دیکھا جیسے یہ بات بھی کہنے یا پوچھنے کی ہے! پھر بولا، "بچن سنگھ اپنی طرح کا آدمی ہے، اپنی طرح کا اکیلا......"

"ہوگا ...... پر" کہتے کہتے چندا رک گئی۔

"آڑے وقت کام آنے والا آدمی ہے، لیکن اُس سے فائدہ اُٹھا سکنا جتنا آسان ہے...... اُتنا...... میرا مطلب ہے کہ ...... جس سے کچھ لیا جائے گا، اُسے دیا بھی تو جائے گا۔" جگپتی نے آنکھیں دیوار پر گڑاتے ہوئے کہا۔

اور چندا اُٹھ کر چلی گئی۔

اُس دن کے بعد بچن سنگھ لگ بھگ روز ہی آنے جانے لگا۔ جگپتی اُس کے ساتھ ادھر اُدھر گھومتا بھی رہتا، عجیب سی گھٹن اُس کے دل کو جکڑ لیتی اور زندگی کے تمام تضادات اُس کی نگاہوں کے سامنے آ جاتے۔ آخر وہ خود بھی ایک آدمی ہے ...... بے کار ...... یہ مانا کہ اُس کے سامنے پیٹ پالنے کا ایسا کوئی سنجیدہ مسئلہ نہیں، وہ بھوکوں نہیں مر رہا ہے، جاڑے میں کانپ نہیں رہا ہے، لیکن اُس کے دو ہاتھ پیر ہیں، جسم کا ڈھانچہ ہے جو کچھ مانگتا ہے ...... کچھ! اور وہ سوچتا، یہ کچھ کیا ہے؟ سکھ؟ شاید ہاں، شاید نہیں۔ وہ تو دکھ میں بھی جی سکنے کا عادی ہے، گندگی میں زندگی بتا دینے والا اخیر تناک کیڑا ہے۔ تو پھر ہوس؟ شاید ہاں، شاید نہیں۔ چندا کا جسم پاکر اُس نے لمحاتی تلذذ بھی حاصل کیا تھا تو پھر دھن دولت ...... شاید ہاں، شاید نہیں۔ اُس نے دھن کے لئے اپنے کو کھپایا ہے لیکن وہ بھی اُس نظر نہ آنے والی پیاس کو بجھا نہیں سکا۔ تو پھر؟ ...... تو پھر کیا؟ وہ کچھ کیا ہے، جو اُس کی روح میں ناسور کی طرح رستا رہتا ہے، اپنی نیکی کا بدلہ مانگتا ہے؟

شاید کام ؟ شاید کام ! ہاں، یہی بالکل یہی جو اس کی زندگی کی گھڑیوں کو بالکل سونا نہ چھوڑے، جس میں وہ اپنی قوت لگا سکے اپنا دل لگا سکے، اپنے کو کامیاب محسوس کر سکے، چاہے اس میں سکھ ہو یا دکھ، خطرات ہوں یا سلامتی، آسودگی ہو یا ناسودگی۔ ...... اسے صرف کام چاہیئے ! کرنے کے لئے کچھ چاہیئے یہ تو اس کی فطری ضرورت ہے، پہلی اور آخری مانگ ہے، کیوں کہ وہ اس گھر میں نہیں پیدا ہوا جہاں صرف زبان کی حرکت سے حکم چلانے والے ہوتے ہیں وہ اس گھر سے تعلق رکھتا ہے جو صرف کام کرنا جانتا ہے، کام ہی جس کی آس ہے۔ وہ صرف کام چاہتا ہے کام ! ....

اور ایک دن اس کا کام دھام کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ تالاب والے اونچے میدان کے جنوب میں جگجیتی کی لکڑی کی ٹال کھل گئی۔ نک ٹنگ گیا۔ ٹال کی زمین پر لکشمی پوجا بھی ہو گئی اور ہون بھی ہو گیا لکڑی کی کوئی کمی نہیں تھی۔ گاؤں سے آنے والی گاڑیوں کو، اس کاروبار کے مانے ہوئے آدمیوں کی مدد سے مول تول کروا کے وہاں گروا دیا گیا۔ گانٹھیں ایک طرف رکھ دی گئیں۔ (جیلوں کا چٹا قرینے سے لگ گیا۔ اور کندے چیرنے کے لئے ڈال دیئے گئے۔ دو تین گاڑیوں کا سودا کر کے ٹال چالو کر دی گئی۔ مستقبل میں خود پیڑ خرید کر کٹانے کا طے کیا گیا۔ بڑی بڑی اسکیمیں بنیں کہ کس طرح جلانے کی لکڑی کی کوٹھی بنے گی۔ چیرنے کی نئی مشینیں لگیں گی۔ کاروبار بڑھ جانے پر بچن سنگھ بھی نوکری چھوڑ کر اسی میں لگ جائے گا۔ اور اس نے محسوس کیا کہ وہ کام میں لگ گیا ہے۔ اب چوبیس گھنٹے اس کے سامنے کام ہے.. اس کا وقت کار آمد ہو گیا ہے۔ دن بھر میں وہ ایک گھنٹے کے لئے کسی کا دوست ہو سکتا ہے، کچھ دیر کے لئے وہ شوہر ہو سکتا ہے لیکن باقی وقت ؟ دن اور رات کے باقی گھنٹے ...... ان گھنٹوں کے خلا کو اس کا اپنا کام ہی بھر سکتا ہے ..... اور اب وہ کام والا ہو گیا تھا.......

اب اس کے پاس کام تو تھا، لیکن جب ٹال کی اس اونچی زمین پر پڑے چھپر کے نیچے تخت پر وہ گلا رکھ کر بیٹھتا، سامنے لکڑیوں کے ڈھیر، کٹے ہوئے پیڑ کے تنے، جڑوں کو لڑھکا ہوا دیکھتا، تو ایک اداسی یک بہ یک اس کے دل کو باندھنے لگتی۔ اسے لگتا کہ ایک بے ضرر بھوت کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس کے سامنے ڈال دیا گیا ہے...... پھر ان پر ادر کلہاڑی چلے گی۔ اور ان کے ریشے ریشے الگ ہو جائیں گے اور پھر انہیں تک پر تول کر کسی پیٹنے والے کے ہاتھ بیچ دیا جائے گا۔

اور تب اس کی نگاہیں سامنے کھڑے تاڑ پر اٹک جاتیں، جس کے بڑے پتوں پر سرخ گردن والے گدھ پر پھڑپھڑا کر دیر تک خاموش بیٹھے رہتے۔ تاڑ کا کالا گردرے دار تنا... اور اس کے سامنے ٹھہری ہوئی ہوا میں بے سہارا بے وزن پتیاں چکراتی جھڑتی رہتیں.......

دھول بھری دھرتی پر لکڑی کی گاڑیوں کے پہیوں کی بڑی ہوئی لکیر دھندلی سی چمک اٹھتی اور بغل والے موٹگ پھلی کے بیچ کی یکساں طور پر کھرکھراتی آواز کانوں میں بھرنے لگتی۔ بغل والی کچی پگڈنڈی سے کوئی گذر کر، ٹیلے کے ڈھلان سے تالاب کی گہرائی میں اتر جاتا جس کے گدلے پانی میں کوڑا تیرتا رہتا اور سور کیچڑ میں منہ ڈال کر اس کوڑے کو روندتے رہتے.......

دوپہر سمٹتی اور شام کی دھند چھانے لگتی، تو وہ لالٹین جلا کر چھپر کے کھمبے کی کیل میں

ٹانگ دیتا اور کچھ دیر بعد اسپتال والی سڑک سے بچن سنگھ ایک کالے دھبے کی طرح آتا دکھائی دیتا۔

گہرے ہوتے ہوئے اندھیرے میں اُس کا خاکہ دھیرے دھیرے بڑھتا جاتا اور جگیتی کے سامنے جب وہ آ کر کھڑا ہوتا، تو وہ اُسے بہت لحیم شحیم سا لگنے لگتا جس کے سامنے اُسے اپنا وجود ڈوبتا محسوس ہوتا۔

ایک آدھ بات بکری کی ہوتی اور پھر دونوں گھر کی طرف چل دیتے۔ گھر پہونچکر بچن سنگھ کچھ دیر منڈیر پر کمبل بچھا کر بیٹھتا ادھر اُدھر کی باتیں کرتا، کبھی کبھی جگیتی اور بچن سنگھ کی تھالی ساتھ ہی لگ جاتی۔ چندا سامنے بیٹھ کر دونوں کو کھلاتی۔

بچن سنگھ بولتا جاتا، "کیا ترکاری بنی ہے! مسالہ ایسا پڑا ہے کہ اُس کی کیسی بہار ہے اور ترکاری کا مزہ بھی نہیں مرا۔ ہوٹلوں میں یا تو مسالہ ہی مسالہ رہے گا یا صرف ترکاری ہی ترکاری۔ واہ! واہ! کیا بات ہے اندازے کی!"

اور چندا بیچ بیچ میں ٹوک کر بولتی جاتی، "انہیں تو جب تک دال میں پیاز کا بُھنا گھی نہ ملے، تب تک پیٹ ہی نہیں بھرتا..."

یا — "سرکہ اگر انہیں مل جائے، تو سمجھو، سب کچھ مل گیا۔ پہلے مجھے سرکہ نہ جانے لگتا تھا، پر اب ایسا زبان پر چڑھ گیا ہے ......"

یا — "انہیں کاغذ سی پتلی روٹی پسند ہی نہیں آتی۔ اب مجھ سے کوئی پتلی روٹی بنانے کو کہے، تو بنتی ہی نہیں، عادت پڑ گئی ہے اور پھر جی بھی نہیں چاہتا......"

لیکن چندا کی آنکھیں بچن سنگھ کی تھالی پر ہی جمی رہتیں، روٹی ختم ہوئی تو روٹی پروس دی دال ختم نہیں ہوئی تو بھی ایک چمچہ اور پروس دی۔

اور جگیتی سر جھکائے کھاتا رہتا۔ صرف ایک گلاس پانی مانگتا اور چندا چونک کر پانی دینے سے پہلے کہتی، "ارے تم نے تو کچھ لیا بھی نہیں!" کہتے کہتے وہ پانی دے دیتی اور تب اُس کے دل پر گہری سی چوٹ لگتی، نہ جانے کیوں وہ خاموشی کی چوٹ اُسے بڑی اذیت دے جاتی...... لیکن وہ اپنے آپ کو سمجھا لیتی کوئی مہمان تو نہیں ہیں...... مانگ سکتے تھے۔ بھوک نہیں ہوگی۔

جگیتی کھانا کھا کر تال پر لیٹنے چلا جاتا، کیونکہ ابھی تک کوئی چوکیدار نہیں ملا تھا۔ چھپر کے نیچے تخت پر جب وہ لیٹتا تو اچانک ہی اُس کا دل بھر آتا۔ پتہ نہیں کون کون سے درد ایک دوسرے سے مل کر طرح طرح کی ٹیسیں، کھنچاؤ اور اینٹھن پیدا کرنے لگتے۔ کوئی ایک رگ دکھتی تو وہ سہلا بھی لیتا، جب سبھی نسیں تنی ہوں تو کہاں کہاں راحت کا اکیلا ہاتھ سہلائے!

لیٹے لیٹے اُس کی نگاہ تال کی اُس جانب بنی پختہ قبر پر جم جاتی جس کے سرہانے خاردار ببول کا تنہا پیڑ گم سم کھڑا رہتا۔ اُس قبر پر ایک پردہ نشین عورت بڑے ٹھاٹ سے آکر سویرے سویرے بیلا اور چنبیلی کے پھول چڑھا جاتی...... اُس کا طواف کرتی اندر سر ٹیک کر پھر کچھ قدم اُداس اُداس سی چل کر ایک دم تیزی سے مڑ کر لباطیوں کے محلے میں کھو جاتی۔ شام ہوتے پھر آتی۔ ایک شمع اور کچھ اگربتیاں

جلاتی، پھر مڑتے ہوئے اوڑھنی کا پلّو کندھے پر ڈالتی تو شمع کی لو کانپتی، کبھی کانپ کر بجھ جاتی، لیکن اُس کے قدم بڑھ چکے ہوتے، پہلے دھیمے تھکے اُداس سے اور پھر نیچے تلے اور یکساں طور پر پڑتے اور پھر وہ اُسی محلے میں کھو جاتی اور تب، رات کی تنہائی میں....... ببول کے کانٹوں کے بیچ اُس سائیں سائیں کرتے اونچے نیچے میدان میں جیسے اُس قبر سے کوئی روح نکل کر بالکل اکیلی بھٹکتی رہتی ....

پھر تار پر بیٹھے سرخ گردن والے گدھ منحوس سی آواز میں کلبلا اُٹھتے اور تاڑ کے پتے دہشت ناک طور پر کھڑ بڑا اُٹھتے۔ جگپتی کا بدن کانپ جاتا اور وہ بھٹکتی روح زندہ رہ سکنے کے لئے جیسے قبر کی اینٹوں میں، ببول کے سائے تلے دُبک جاتی۔ جگپتی اپنی ٹانگوں کو پیٹ سے بھینچ کر، کمبل سے منہ چھپا اوندھا لیٹ جاتا۔

تڑکے ہی بھٹکے پر لگے لکڑہارے لکڑی چیرنے آجاتے۔ تب جگپتی کمبل لپیٹ کر گھر کی جانب چلا جاتا.........

"راجا روز ٹہلنے جاتے تھے،" ماں سنایا کرتی تھی، "ایک دن جیسے ہی محل کے باہر نکل کر آئے کہ سڑک پر جھاڑو لگانے والی مہترانی انہیں دیکھتے ہی اپنی جھاڑو کا پنجہ پٹک کر ماتھا پیٹنے لگی اور کہنے لگی، ہائے رام! آج راجا نربنسیا کا منہ دیکھا ہے، نہ جانے روٹی بھی نصیب ہوگی کہ نہیں...... نہ جانے کون سی آفت ٹوٹ پڑے! ' راجا کو اتنا دکھ ہوا کہ اُلٹے پیروں محل کو لوٹ گئے۔ وزیر کو حکم دیا کہ اُس مہترانی کا گھر اناج سے بھر دیں۔ اور سب شاہی لباس اتار کر اُسی لمحے راجا جنگل کی طرف چل پڑے اُسی رات رانی نے خواب دیکھا کہ کل رات اُن کی دلی تمنا پوری ہوگی۔ رانی بہت پچھتا رہی تھی، لیکن فوراً ہی رانی راجا کو کھوجتی کھوجتی اُس سرائے میں پہونچ گئی، جہاں اُن کا قیام تھا۔ رانی کنیز کا بھیس بدل کر رات کو راجا کے پاس پہونچی۔ رات بھر اُن کے ساتھ رہی اور صبح راجا کے بیدار ہونے سے پہلے سرائے کو خیرباد کہہ کر محل میں لوٹ آئی۔ راجا صبح اُٹھ کر دوسرے دیش کی طرف نکل گئے۔ دو ہی دنوں میں راجا کے چلے جانے کی خبر ساری سلطنت میں پھیل گئی، راجا چلے گئے، چاروں طرف یہی خبر تھی......."

اور اُسی دن ٹیلے محلے کے ہر آنگن میں برسات کے مینہہ کی طرح یہ خبر برس کر پھیل گئی کہ چندا کے بال بچہ ہونے والا ہے۔

نکڑ پر جمنا سنار کی کوٹھری میں کھنکتی سُر ہی رک گئی۔ منشی جی نے اپنا میزان لگانا چھوڑ کر متحیر نظروں سے تاک کر خبر سُنی۔ مینی کرانے والے نے کنویں میں سے آدھی گئی رسی کھینچ کر ڈول منڈیر پر ٹیک کر سُنا۔ بدرشن درزی نے مشین کے پہیے کو ہتھیلی سے رگڑ کے روک کر سُنا۔ ہنس راج پنجابی نے اپنی نیل لگی ململی قمیض کی آستینیں چڑھاتے ہوئے سُنا......"، اور جگپتی کی بیوہ چاچی نے عورتوں کے جھگمٹے میں پر وثوق مگر رازدارانہ انداز میں سُنایا —— "آج چھ سال ہوگئے شادی کو...... نہ بال، نہ بچہ..... نہ جانے کس کا پاپ ہے۔ اُس کے پیٹ میں...... اور کس کا ہوگا سوائے اُس مسٹنڈے کمپونڈر کے! نہ جانے کہاں سے کلنکنی اس محلے میں آگئی!...... اس گلی کی تو پشتوں سے ایسی مریادا رہی ہے کہ غیر مرد عورت کی پرچھائیں تک نہیں دیکھ پائے، یہاں کے مرد تو بس اپنی گھر کی عورتوں کو جانتے ہیں،"

اُنہیں تو پڑوسی کے گھر کی زنانیوں کی گنتی تک نہیں معلوم!،، یہ کہتے کہتے اُن کا چہرہ تمتما جاتا۔ اور سب عورتیں دیولوک کی دیولیوں کی طرح سنجیدہ بنی اپنے تقدس کی عظمت کے بوجھ سے دبی دھیرے دھیرے کھسک گئیں۔

صبح یہ خبر پھیلنے سے پہلے جگپتی ٹال پر چلا گیا تھا۔ لیکن سنی اُس نے بھی آج ہی تھی۔ دن بھر وہ تخت پر کونے کی طرف منہ کئے پڑا رہا۔ نہ ٹھیکے کی لکڑیاں چروائیں نہ بکری کی جانب دھیان دیا، نہ دوپہر کا کھانا کھانے گھر گیا۔ جب رات کی چادر اچھی طرح تن گئی تو وہ ایک درندے کی طرح اُٹھ کھڑا ہوا، اُس نے اپنی انگلیاں چٹخائیں، مٹھی باندھ کر قوت بازو کو پرکھا تو نسیں تن گئیں اور بانہہ بری طرح تھرتھرا گئی۔

اُس نے تین چار لمبی لمبی سانسیں کھینچیں اور مضبوط قدموں سے گھر کی طرف چل پڑا۔ میدان ختم ہوا..... کنکر کی سڑک آئی..... سڑک ختم ہوئی، گلی آئی۔ لیکن گلی کے اندھیرے میں گھستے ہوئے وہ سہم گیا، جیسے کسی نے نظر نہ آنے والے ہاتھوں سے اُسے دبوچ کر سارا خون نچوڑ لیا ہو۔ اُس کی اُمنڈ آئی قوت کی نس پر برف سے ٹھنڈے ہونٹ رکھ کر سارا رس چوس لیا ہو اور گلی کے اندھیرے کی حقارت بھری کالک اور بھی بھاری ہو گئی جس میں گھسنے سے اُس کی سانس رُک جائے گی..... دم گھٹ جائے گا۔

وہ پیچھے مڑا لیکن رک گیا، پھر خود پر قابو پاتے ہوئے وہ چوروں کی طرح بے آواز قدموں سے کسی طرح گھر کے اندر پہنچ گیا۔

دائیں طرف باورچی خانے کی دہلیز پر کپتی ٹمٹما رہی تھی اور چندا شاید آسمان تکتے تکتے دیوار سے سر ٹیکے بے ترتیب سو گئی تھی۔ کپتی کی روشنی اُس کے آدھے چہرے کو اُجاگر کئے ہوئے تھی اور آدھا چہرہ گھُپ اندھیرے میں تھا اور نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ خاموشی سے کھڑا تاکتا رہا۔ چندا کے چہرے پر عورت پن کی بلوغت آج اُسے دکھائی دی۔ چہرے کی ساری معصومیت نہ جانے کہاں کھو گئی تھی، اُس کا اچھوتا پن نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ پھولا پھولا چہرہ۔ جیسے ٹہنی سے توڑے پھول کو پانی میں ڈال کر تازہ کیا گیا ہو۔ جس کی پنکھڑیوں میں ٹوٹنے کی وجہ سے سُرمئی لکیریں پڑ گئی ہوں، لیکن بھیگنے سے بھاری پن آ گیا ہو۔

اُس کے پھیلے پیر پر اس کی نگاہ پڑی تو سوچا سا لگا۔ ایڑیاں بھری سوجی سی اور ناخنوں کے پاس عجیب سا سوکھا پن۔ جگپتی کا دل ایک بار مسوس کر رہ گیا۔ اُس نے چاہا کہ بڑھ کر اسے اُٹھا لے اپنے ہاتھوں سے اُس کا سارا جسم چھو چھو کر ساری آلودگی پونچھ دے، اُسے اپنی سانسوں کی آگ میں تپا کر ایک بار پھر پاکیزہ بنا دے، اور اس کی آنکھوں کی گہرائی میں جھانک کر کہے۔ جنت سے کس جرم کی پاداش میں تمہیں یہاں پھینکا گیا ہے، چندا؟ یہ جرم تو امٹ تھا۔

تبھی چندا نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ جگپتی کو سامنے دیکھ کر اُسے لگا کہ وہ ایک دم ننگی ہو گئی ہو۔ بے خد شرمسار ہو کر اس نے اپنے پیر سمیٹ لئے۔ گھٹنوں سے دھوتی نیچے سرکائی اور بڑی احتیاط سے اُٹھ کر باورچی خانے کے اندھیرے میں کھو گئی۔

جگپتی جو اس باختہ سا ہو کر وہیں کمرے کی دہلیز پر.. سر لٹکا کر بیٹھ گیا۔ نظر

کمرے میں گئی تو لگا کئی انجانی آوازیں وہاں گونج رہی ہیں جن میں چندا کی آواز بھی شامل ہے، ہر طرف، گھر کے ہر کونے سے، اندھیرا سیلاب کی طرح بڑھتا آرہا تھا...... ایک عجیب خاموشی (..........) حیرانی! رفتار تو ہے لیکن راستہ نہیں! چہرے ہیں لیکن بے شکل۔

کھانا کھا لیتے۔" چندا کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔ وہ انجان سا ایسے اُٹھ بیٹھا جیسے تیار بیٹھا ہو۔ اُس کی بات آج تک اُس نے نہیں ٹالی تھی۔ کھانے تو بیٹھ گیا لیکن حلق سے کچھ بھی نہیں اتر رہا تھا تب چندا نے بالکل سپاٹ الفاظ میں کہا۔ "کل میں گاؤں جا رہی ہوں۔"

جیسے اس خبر کی اطلاع اُسے پہلے سے تھی، بولا، "اچھا۔"

چندا نے پھر کہا کہ، "میں نے بہت پہلے گھر چھٹی ڈال دی تھی۔ بھیا کل لینے آرہے ہیں۔"

"تو ٹھیک ہے" جگپتی نے کھوئے کھوئے جواب دیا۔

چندا کا باندھ ٹوٹ چکا تھا وہ وہیں گھٹنے میں منہ دبائے سسکیاں بھرنے لگی۔ نہ اُٹھ سکی نہ ہل سکی۔

جگپتی لمحے بھر کے لیئے بے چین ہو گیا لیکن جیسے جم جانے کے لئے اُس کے ہونٹ پھڑکے اور غصّے کے آتش فشاں کو جبراً دباتے ہوئے بھی وہ پھوٹ پڑا، "یہ سب مجھے کیا دکھا رہی ہے؟ بے شرم! بے غیرت! ......اُس وقت نہیں سوچا تھا، جب...... جب...... میری لاش تلے......"

"تب...... کی بات چھوڑ رہے ہو......" سسکیوں کے بیچ چندا کی آواز نکلی، لیکن جب تم نے مجھے بیچ دیا......"

ایک بھرپور ہاتھ چندا کی کنپٹی پر آگ سا لگاتا پڑا اور جگپتی اپنی ہتھیلی دوسری سے دباتا ہوا کھانا چھوڑ کر دوسری کوٹھری میں گھس گیا اور رات بھر کنڈی چڑھائے اُسی کالک میں گھٹتا رہا۔

دوسرے دن چندا گھر چھوڑ اپنے گاؤں چلی گئی۔"

جگپتی پورا دن اور رات ٹال پر ہی کاٹ دیتا، اُسی ویرانے میں تالاب کے بغل، قبر، ببول اور تاڑ کے پاس۔ لیکن دل مُردہ ہو گیا تھا۔ زبردستی وہ اپنے کو وہیں روکے رہتا...... اُس کا دل کرتا کہیں چلا جائے۔ لیکن کمزوری نے کچھ اس طرح اُس کے تن من کو کھوکھلا کر دیا تھا کہ چاہتے ہوئے بھی وہ جا نہیں پاتا تھا۔ حقارت بھری نظریں سہتا، پر وہیں پڑا رہتا۔ کافی دنوں بعد جب نہیں رہا گیا تو ایک دن جگپتی گھر پر تالا لگا کر نزدیک کے گاؤں میں لکڑی کٹانے چلا گیا۔ اُسے لگ رہا تھا کہ وہ معذور ہو گیا ہے بالکل لنگڑا، ایک رینگتا کیڑا۔ جس کے نہ آنکھ ہے نہ کان نہ دل ہے نہ احساس۔

وہ اُس باغ میں چلا گیا جہاں خریدے ہوئے پیڑ کٹنے تھے۔ دو آرے والوں نے پہلے پیڑ کے تنے پر آرا رکھا۔ اور کرر کرر کا شور شروع ہو گیا۔ دوسرے پیڑ پر بنّے اور شکورے کی کلہاڑیاں بجنے لگیں اور گاؤں سے دور اُس باغ میں ایک لے سے بھرپور شور جاری رہا۔ جڑ پر کلہاڑی پڑتی تو پورا پیڑ تھرا جاتا۔

قریب کے کھیت کی میڑھ پر بیٹھے جگپتی کا بدن بھی گویا کانپ کانپ اٹھتا۔ چندا نے کہا تھا، "لیکن جب تم نے مجھے بیچ دیا......." کیا وہ ٹھیک کہتی تھی! کیا بچن سنگھ نے ٹال کے لئے جو روپے دیئے تھے، اُس کا سود اُدھر سے چکایا جاتا تھا؟ کیا صرف وہی روپے آگ بن گئے، جس کی آنچ میں اُس کی خودداری اعتماد اور اصول موم کی طرح پگھل گئے؟

ورش..... کورے! باغ سے لگے پیڑ پر سے کسی نے آواز لگائی۔ شکورے نے کلہاڑی روک کر وہیں سے ہانک لگائی۔ "پرلے کے کھیت سے لیک بنی ہے، ذرا ایڑ مار کر نکالا گاڑی"۔

جگپتی کے خیالات بکھر گئے۔ اُس نے مڑ کر دیکھا تو بھینسا گاڑیاں لکڑی بھرنے کے لئے آپہونچی تھیں۔ شکورے جگپتی کے پاس آکر کہا، "ایک گاڑی تو بھر دی گئی بلکہ ڈیڑھ گاڑی...... اب اس بتوں والے پیڑ کو بھی چھانٹ دیں؟

جگپتی نے اُس پیڑ کی طرف دیکھا جسے کاٹنے کے لئے شکورے نے اشارہ کیا تھا، پیڑ کی شاخیں ہری پتیوں سے بھری تھیں۔ وہ بولا "ارے! یہ تو ہرا ہے ابھی اسے چھوڑ دو۔"

ہرا ہونے سے کیا ہوتا ہے اکھڑ تو گیا ہے، نہ پھول کا نہ پھل کا۔ اب کون سا اس میں پھل پھول آئیں گے۔" شکورے نے پیڑ کی طرف دیکھتے ہوئے استادی انداز سے کہا۔

"جیسا ٹھیک سمجھو تم۔" جگپتی نے کہا اور اٹھ کر نیچے کنویں پر پانی پینے چلا گیا۔

دوپہر ڈھلتے گاڑیاں بھر کر تیار ہوئیں اور شہر کی طرف روانہ ہو گئیں۔ جگپتی کو ان کیسا آنا پڑا۔ گاڑیاں لکڑی سے لدی شہر کی جانب رواں دواں تھیں۔ اور جگپتی گردن جھکائے کچی سڑک کی دھول میں ڈوبا بھاری قدموں سے دھیرے دھیرے انہیں کی بجتی گھنٹیوں کے ساتھ بے جان سا بڑھتا جا رہا تھا......

"کئی برس بعد راجا پردیس سے بہت سا دھن کما کر گاڑی میں لاد کر اپنے وطن میں لوٹ آئے" ماں سنایا کرتی تھیں، "راجا کی گاڑی کا پہیہ محل سے کچھ دور بیتل کی جھاڑی میں الجھ گیا ہر ممکن کوشش کی لیکن پہیہ نہ نکلا۔ تب ایک پنڈت نے بتایا کہ "سکٹ" کے دن پیدا ہونے والا بچہ اگر اپنے گھر کی سپاری لا کر اس میں چھوا دے تو پہیہ نکل جائے گا۔ وہیں دو بچے کھیل رہے تھے انہوں نے یہ سنا تو کود کر پہنچے اور کہا کہ ہماری پیدائش سکٹ کی ہے لیکن اگر تم آدھی دولت دینے کا وعدہ کرو تو سپاری لائیں گے۔ راجا نے بات مان لی۔ بچے دوڑے دوڑے گھر گئے سپاری لا کر چھوا دی پھر گھر کا راستہ بتاتے بتاتے آگے چلے۔ آخر محل کے سامنے انہوں نے گاڑی رکوا لی۔

"راجا کو بڑا تعجب ہوا کہ ہمارے ہی محل میں یہ بچے کہاں سے آگئے؟ اندر پہنچے تو رانی خوشی سے بے حال ہو گئیں۔

لیکن راجا نے پہلے اُن بچوں کے بارے میں پوچھا، تو رانی نے کہا کہ وہ دونوں بچے انہیں کے راجکمار ہیں۔ راجا کو یقین نہ آیا رانی بہت دکھی ہوئیں۔"

گاڑیاں جب ٹال پر آکر لگیں اور جگپتی تخت پر ہاتھ پر ڈھیلے کر کے بیٹھ گیا، تو بگڈنڈی سے گذرتے منشی جی نے اُس کے پاس آکر بتایا، "ابھی اُس دن وصولی میں تمہاری سسرال کے نزدیک

ایک گاؤں میں جانا ہوا تو پتہ چلا کہ پندرہ بیس روز پہلے چندا کو لڑکا ہوا ہے،، اور پھر جیسے پہلے میں سنی سنائی باتوں پر پردہ ڈالتے ہوئے بولا، ,, بھگوان کے راج میں دیر ہے اندھیر نہیں، جگپتی بھیا!،،

جگپتی نے سنا تو پہلے اس نے گہری نظروں سے منشی جی کو تاکا، لیکن وہ تیر کا نشانہ ٹھیک ٹھیک نہیں کھوج پایا اور برداشت کرتے ہوئے بولا، ,,دیر اور اندھیر دونوں ہیں!،،

,,اندھیر تو سراسر ہے........ تریا چرتر ہے سب! بڑے بڑے ہار گئے،، کہتے کہتے منشی جی رک گئے، لیکن کچھ اس طرح، جیسے کوئی بڑی ہی رازدارانہ بات ہے جسے ان کی گول ہوتی ہوئی آنکھیں سمجھا دیں گی۔

جگپتی منشی جی کی طرف تاکتا رہ گیا۔ منٹ بھر منحوس سی خاموشی چھائی رہی، اسے توڑتے ہوئے منشی جی بڑی درد بھری آواز میں بولے، ,,سن تو لیا ہوگا تم نے؟،،

,,کیا،، کہنے کو جگپتی کہہ گیا، لیکن اسے لگا کہ اب منشی جی اس گاؤں میں پھیلی باتوں کو ہی بڑی بے دردی سے کہہ ڈالیں گے، اس نے ناحق پوچھا۔

پھر منشی جی نے اس کی ناک کے پاس منہ لے جاتے ہوئے کہا کہ چندا دوسرے کے گھر بیٹھ رہی ہے..... کوئی مدھوسودن ہے وہیں کا۔ لیکن بچہ دیوار بن گیا ہے۔ چاہتے تو وہ یہی ہیں کہ مر جائے تو راستہ کھلے لیکن رام جی کی مرضی......... سنا ہے بچہ رہتے بھی وہ چندا کو بٹھانے کو تیار ہے۔،،

جگپتی کی سانس گلے میں اٹک کر رہ گئی۔ بس آنکھیں منشی جی کے چہرے پر پتھرائی سی گڑی تھیں۔

منشی جی بولے، ,,عدالت سے بچہ تمہیں مل سکتا ہے...... اب گلے کی شرم اور لحاظ!،،

,,اپنا کہہ کر کس منہ سے مانگوں، بابا؟ ہر طرف تو قرض سے دبا ہوں، تن سے، من سے، پیسے سے، عزت سے کس کے بل پر دنیا سجانے کی کوشش کروں؟،، کہتے کہتے وہ اپنے میں کھو گیا۔

منشی جی وہیں بیٹھے گئے۔ جب رات جھک آئی تو جگپتی کے ساتھ ہی منشی جی بھی اٹھے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے اور اسے گلی تک لائے۔ اپنی کوٹھری آنے پر پیٹھ سہلا کر انہوں نے اسے چھوڑ دیا اور گردن جھکائے گلی کے اندھیرے میں وہ انہیں خیالوں میں ڈوبا ہوں چلتا چلا آ گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن کچھ ایسا بوجھ تھا، جو نہ سوچنے دیتا تھا اور نہ سمجھنے۔ جب چاچی کی بیٹھک کے پاس سے گذرنے لگا تو اچانک اس کے کانوں میں بھنک پڑی ــــــ ,, آ گئے ستیاناسی! گھر کے تباہ کار!

اس نے ذرا نظر اٹھا کر دیکھا تو گلی کی چاچی، بھابیاں بیٹھک میں جمع تھیں اور چندا کا ذکر چھڑا تھا لیکن وہ چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔

اتنے دن بعد تالا کھولا اندر کے اندھیرے میں کچھ سجھائی نہ دیا، تو یکایک وہ رات اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گئی، جب وہ اسپتال سے چندا کے ساتھ لوٹا تھا۔ یہ چاچی کا زہر میں بجھا وہ تیر وہ آ گئے راجا نربنسیا اسپتال سے۔،، اور آج ستیاناسی! گھر کے تباہ کار!،، اور نو داس کا وہ

جلہ، جو چندا کو چھید گیا تھا، "تمہارے کبھی کچھ نہ ہوگا......!" اور اس رات کی بچی چندا!
چندا کے لڑکا ہوا ہے......... وہ کچھ اور جلتی، آدمی کا بچہ نہ جنتی!.........
وہ اور کچھ بھی جلتی، کنکر پتھر وہ ناری نہ بنتی، بچی ہی بنی رہتی، اس رات کی معصوم چندا! لیکن چندا یہ سب کیا کرنے جا رہی ہے؟ اس کے جیتے جی وہ دوسرے کے گھر بیٹھنے جا رہی ہے۔ کتنے بڑے پاپ میں ڈھکیل دیا چندا کو...... لیکن اسے بھی تو کچھ سوچنا چاہیئے۔ آخر کیا؟ لیکن میرے جیتے جی تو یہ سب اچھا نہیں۔ وہ اتنی نفرت برداشت کر کے کیوں جینے کو تیار ہے! یا مجھے جلانے کو! وہ مجھے نیچ سمجھتی ہے، ظالم۔ نہیں تو ایک بار خبر تو لیتی۔ بچہ ہوا تو پتہ تو لگتا۔ لیکن نہیں، وہ اس کا کون ہے؟ کوئی بھی نہیں! اولاد ہی پیار کا وہ محور ہے جو مرد عورت کے بھیوں کو جسم کے دلدل سے نکال آگے بڑھا دیتی ہے.........
ورنہ ہر عورت منڈی ہے اور ہر مرد ہوس کا کیڑا ہے۔ تو کیا چندا...... عورت نہیں رہی؟ وہ ضرور عورت تھی، لیکن خود میں نے اسے دوزخ میں ڈال دیا! وہ بچہ میرا کوئی نہیں، لیکن چندا تو میری ہے۔ ایک بار اسے لے آتا، پھر یہاں رات کے سہانے اندھیرے میں اس کے پھول سے لبوں کو دیکھتا..... نازک سوئی پلکوں کو دیکھتا...... سانسوں کی دودھ سی اچھوتی مہک کو سمیٹ لیتا.........
آج کا اندھیرا! گھر میں تیل بھی نہیں ہے جو دیا جلا لے۔ اور پھر کس کے لیے کوئی جلائے؟ چندا کے لیے...... لیکن اسے تو اس نے بیچ دیا تھا۔ سوائے چندا کے کون سی ملکیت اس کے پاس تھی جس پر کوئی قرض دیتا؟ قرض نہ ملتا تو یہ سب کیسے چلتا؟ کام...... پر کہاں سے کٹتے؟ اور تب سکورے کے وہ الفاظ اس کے کان میں گونج گئے "...... ہرا ہونے سے کیا اکھڑ تو گیا ہے........"
وہ خود بھی تو ایک اکھڑا ہوا پیڑ ہے، نہ پھل کا نہ پھول کا، سب لے کا رہی تھا ہے۔ جو کچھ سوچا۔ اس پر کبھی بھروسہ نہ کر سکا۔ چندا کو چاہتا رہا لیکن اس کے دل میں چاہت نہ جگا سکا۔ اسے کبھی ایک پیسہ مانگنے پر ڈانٹتا رہا۔ لیکن خود لیتا رہا اور آج......... وہ دوسرے کے گھر بیٹھ رہی ہے..... اسے چھوڑ کر...... وہ اکیلا ہے،....... ہر طرف بوجھ ہے، جس میں اس کی نس نس کچلی جا رہی ہے رگ رگ پھٹ گئی ہے......... اور وہ کسی طرح ٹٹول ٹٹول کر اندر گھر میں پہونچ گیا.....
رانی اپنے خاندانی دیوتا کے مندر میں پہونچی، ماں سنایا کرتی تھیں، "اپنے وجود کو پاک کرنے کے لیے انہوں نے سخت تپسیا کی۔ راجا دیکھتے رہے! خاندانی دیوتا خوش ہوئے اور انہوں نے اپنی دیو شکتی سے دونوں لڑکوں کو نوزائیدہ بچوں میں منتقل کر دیا۔ رانی کی چھاتیوں میں دودھ بھر آیا اور پستانوں سے دودھ کی دھار پھوٹ پڑی جو بچوں کے منہ میں گرنے لگی۔ راجا کو رانی کی پاکیزگی کا ثبوت مل گیا۔ رانی کے چرن پکڑ لیے اور کہا کہ تم دیوی ہو۔ یہ میرے بیٹے ہیں! اور اس دن سے راجا نے پھر سے راج کاج سنبھال لیا........"
لیکن اسی رات جگپتی نے اپنا سارا کاروبار چھوڑ چھاڑ کر، افیم اور تیل پی کر خودکشی کر لی۔ کیوں کہ چندا کے پاس کوئی آسمانی قوت نہ تھی اور جگپتی راجا نہیں تھا، بچن سنگھ کمپاؤنڈر کا قرض دار تھا!.....

ور راجہ نے دو باتیں کیں، "ماں سناتی تھیں،" ایک تو رانی کے نام سے انہوں نے بہت بڑا مندر بنوایا۔ اور دوسرے، راج کے نئے سکّوں پر بڑے راجہ کمار کا نام کھدوا کر جاری کر دیئے، تاکہ پرجا کو اگلے دلی عہد کی خبر ہو جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

جگپتی نے مرتے وقت دو پرچے چھوڑے، ایک چندا کے نام دوسرا قالون کے نام۔

چندا کو اس نے لکھا تھا کہ، "چندا! میری آخری خواہش یہی ہے کہ تم بچے کو لے کر چلی آنا۔۔۔ ابھی دو ایک دن میری لاش کی درگت بنے گی، تب تک تم آسکو گی۔ چندا! آدمی کو گناہ نہیں بلکہ احساس گناہ اور پچھتاوا مارتا ہے، میں بہت پہلے مر چکا تھا۔ بچے کو لے کر ضرور چلی آنا۔"

قالون کو اس نے لکھا تھا، "کسی نے مجھے مارا نہیں ہے۔ ۔ ۔ کسی آدمی نے نہیں۔ میں جانتا ہوں میرے زہر کی شناخت کرنے کے لئے میرا سینہ چیرا جائے گا۔ اس میں زہر ہے۔ میں نے افیم نہیں روپے کھائے ہیں۔ ان روپیوں میں قرض کا زہر تھا، اس نے مجھے مارا ہے۔ میری لاش تب تک نہ جلائی جائے جب تک چندا بچے کو لے کر نہ آجائے۔ آگ بچے سے دلوائی جائے۔ بس۔"

ماں جب کہانی ختم کرتی تھیں، تو آس پاس بیٹھے بچے پھول چڑھاتے تھے۔ میری کہانی بھی ختم ہو گئی، لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ اور کچھ بدلا ہو یا نہ بدلا ہو، ہر دیش کا اقتصادی نقشہ جس تیزی اور ہوشیاری سے بدلا گیا ہے، اسے دیکھ کر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ تبدیلی نہ تو اچھائی کے لئے ہے اور نہ تمناؤں کے مطابق۔ اس نام نہاد سوشلسٹ ملک میں سرمایہ دارانہ اتحاد و تنظیم جس سرعت سے ہوئی ہے اس کی مثال کہیں اور نہیں مل سکتی۔

کملیشور

یا کچھ اور

شام جب رات میں ڈھل رہی ہوتی، تب اُس کا دل بہت گھبراتا۔ چھٹپٹاہٹ ہوتی کہ کہیں نکل کر دور بھاگ جائے ایسی جگہ جہاں دن کی پوری روشنی ہو یا رات کا گھپ اندھیرا۔ بڑا عجیب سا لگتا تھا تب، جب آسمان میں روشنی نہیں ہوتی تھی۔ جب آسمان سرمئی سے کالا ہوتا جاتا تھا۔ لالٹینوں کی روشنی پھیکی پھیکی لگتی تھی۔ تب آسمان میں چڑیاں ہوتی تھیں نہ منڈیروں کی روشنی ہی ہلتی تھی۔ گلیوں کے دہانے پرانی سرنگوں کی مانند بند لگتے تھے۔

تاریکی بہت آہستہ آہستہ اترتی تھی۔ سائے آہستہ آہستہ کر آنکھوں میں بھرنے لگتی تھی... گوشوں، کمروں اور الگنی پر ٹنگے کپڑوں کی سلوٹوں میں سمانے لگتی تھی، چاروں طرف گدلا گدلا پانی سا بھر جاتا تھا۔ تب گھر میں رکنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔

رام ناتھ گھر سے نکل کر گلی میں آجاتا، پھر پیر اپنے آپ اٹھتے جاتے تھے۔ وہ بھیڑ بھاڑ کی طرف چلتا جاتا تھا۔ بڑے چوراہے پر پہنچتا۔ جہاں ہار والے کھڑے ہوتے تھے اور کچھ لوگ اس محلے کی طرف جا رہے ہوتے تھے۔ سمندر کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ بساط خانے والی گلی میں گھس جاتا تھا۔ جن کے چھجوں کے نیچے اندھیرا کچھ زیادہ گہرا ہوتا۔ گلی سے نکلتے ہی وہ شکنتلا کے گھر کے سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ ایک پل کے لیے وہ جھجکتا، لیکن پھر کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ سوائے اس خیال کے کہ وہ یہاں آنے کے لئے تو نہیں نکلا تھا...... وہ ہمیشہ یہیں پہنچتا تھا۔

'ثبوت تو کچھ ہے نہیں...' یہ جملہ رام ناتھ کو نہیں بھولتا تھا۔ شکنتلا کو دیکھتے ہی وہ جملہ کبھی کبھی فوراً یاد آجاتا تھا.... کبھی بہت دیر بعد کبھی کبھی یوں بھی ہوتا تھا کہ جب وہ شکنتلا کے پاس سے لوٹتے ہوئے گھر کی جانب آ رہا ہوتا تب اچانک یاد آتا.. ثبوت تو کچھ ہے نہیں۔

پہلی دفعہ جب اس نے شکنتلا کو دیکھا تھا، تب یہ جملہ کہتے وقت اس کی آنکھوں میں بالکل سوناپن تھا۔ وکیل صاحب پوچھ رہے تھے۔ "کوئی کاغذ پتر، چٹھی پتری، لکھا پڑھی.... کوئی چھوٹا موٹا ہی ثبوت ہو!"

تب بھی اس نے یہی جملہ کہا تھا اور یوں دیکھنے لگی تھی جیسے کہیں نہ دیکھ رہی ہو۔

وکیل صاحب دوسری مسل دیکھنے لگے تھے۔ پھر اُس کو اٹھانے کی غرض سے بولے تھے۔ "حق کے لئے ثبوت بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ ایسے مقدمے یہی عدالت میں نہیں لے جاتا۔"

اور وکیل صاحب کے اس جملے سے وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کو کیا کرنا ہے۔ رام ناتھ نے آنکھ کے اشارے سے شکنتلا کو اُٹھ جانے کے لئے کہا تھا۔ اور خود باہر برآمدے میں اپنے ڈیسک پر جا کر بیٹھ گیا تھا۔ شکنتلا آئی تو اس نے سمجھایا۔ "گھر جا کر دیکھو۔ کوئی کاغذ پتر ہو تو کام بن جائے گا۔ نہ ملے تو بھی لوٹ آنا۔ میں سفارش کر دوں گا تو شاید... جائیں... آجانا، کل پرسوں، جب وقت ملے۔"

یہ تو اس کا پرانا عذر تھا جو وکیل صاحب نے اس کو پہلے دن سکھایا تھا۔ تب منشی ہوا کرتے تھے بابو مگن لال اور وہ مسلوں کے کاغذ نقل کیا کرتے تھے۔ مگن لال نے اس کو سب گُر سکھا دیئے تھے۔

جب تک مقدمہ چلا رام ناتھ کو کئی بار شکنتلا کے گھر جانا پڑا تھا۔ کبھی کسی اسٹامپ پر دستخط کرانے یا گواہوں کو کھڑا کرنے کا طریقہ بتانے۔

تین برس مقدمہ چلا... جب بھی ضرورت پڑی تو شکنتلا کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ وکیل صاحب جھڑکتے تو وہ اتنا بھر اور کہہ دیتی۔ "میں قسم کھا کر کہتی ہوں" بس وکیل صاحب بھنّا جاتے تھے۔ بری بھلی بھی کہہ جاتے تھے۔ شکنتلا تب جیسے ہر لگاؤ اور بات سے الگ ہو جاتی تھی۔ لگتا نہیں تھا کہ وہ واقعی مقدمہ کرنا چاہتی ہے۔ کبھی کبھی تو وہ اتنی الگ تھلگ ہو جاتی تھی کہ یوں لگتا جیسے خود اپنے سے مقدمہ لڑ رہی ہو۔

انہی دنوں رام ناتھ کا آنا جانا ہو گیا تھا۔ کوئی بڑی بات ہو ایسا کچھ نہیں تھا۔ شکنتلا نے بلایا ہو... ایسا بھی نہیں۔ جب شام جھکتی تو گھومتا پھرتا وہ بس پہنچ جاتا۔ مقدمہ نپٹ گیا تھا۔ کوئی خاص ہار جیت بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے شوہر کو مرے بارہ سال ہوئے تھے۔ اُن کے رشتہ دار اس کو بس مکان سے بے دخل کرنا چاہتے تھے۔ جھوٹی سچی دستاویزیں اور ہزار طرح کی گواہیاں لائے تھے۔ کچھ الزام بھی انہوں نے لگائے تھے۔ اس کو ڈرایا دھمکایا بھی تھا۔ لیکن خیر سب سلجھ گیا تھا۔

تب اس شام پانچ سات آدمی آئے تھے۔ شکنتلا نے کہا تھا۔ دھمکی دے رہے تھے۔

"بڑے بدمعاش لوگ تھے" رام ناتھ نے کہا تھا۔ شکنتلا نے پنکھا اٹھا کر کھاٹ اس طرح خالی کر دی تھی جیسے وہ بیٹھنا چاہے تو بیٹھ جائے۔ خود بیٹھنے کے لئے اس نے پیڑھے آسن کھینچ لیا تھا۔

اس دن وہ پہلی مرتبہ بغیر کسی مصرف کے بیٹھ گیا تھا۔ وہی ملگجی شام کا وقت تھا۔ گھر میں اندھیرا ابھرتا جا رہا تھا۔ آسمان بہت ویران تھا۔ آنگن کے ٹھیک اوپر آسمان کا ایک چوکھٹا کٹا ہوا تھا۔ جو بھرتے دھوئیں کی طرح کالا پڑتا جا رہا تھا۔ چوکھٹے کے کٹے آسمان پر لوہے کی گہری کالی کالی گوٹ لگی تھی۔

"ڈرنا مت" رام ناتھ نے کہا تھا۔

"کاہے سے؟" شکنتلا نے کہا تو جیسے بات کا سلسلہ ہی کھو گیا۔

"مچھر بہت ہیں" کچھ دیر بعد وہ پھر بولا۔

شکنتلا پنکھا کچھ یوں جھلنے لگی تھی۔ جیسے اس کو بھی ہوا جائے تو کوئی بات نہیں ہے۔ کافی وقت یوں ہی گذر گیا تھا۔ یکایک اس نے معمول کی طرح سے ادھر اُدھر نظر ڈالی تھی۔ اکیلی عورت کا گھر کیسا لگتا ہے!.... سبھی چیزیں بالکل اکیلی لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ سیم کے بیل کے پتے تک اکیلے اکیلے لگتے ہیں۔

پھر ایک دن ذرا بدلا بدلا لگا تھا جب اس نے پہلی مرتبہ کمرے میں اپنی قمیص اتار کر کیل میں ٹانگی تھی۔ مگر کچھ دیر بعد پھر سب کچھ ویسا ہی ہو گیا تھا۔ کچھ دیر وہ آنگن میں کھاٹ پر لیٹا رہا تھا۔ پنکھے کے پاس نیم مردہ لالٹین جل رہی تھی۔ ان دنوں شام کو کچھ خنکی ہونے لگی تھی۔ آسمان تب بہت ذرا سی دیر کے لئے مٹیالا ہوتا تھا۔ ستارے جلدی پھوٹ آتے تھے۔ جب تک ایک آدھ ستارے پھوٹتے، وہ شکنتلا کے گھر ہی ملتا۔ جب آسمان ستاروں سے بھر جاتا تو معلوم نہیں کیوں اس کے دل میں بڑا امید افزا خیال آجاتا تھا۔ تب وہاں سے اٹھ کر چلے جانے میں خلش کچھ کم ہوتی تھی۔ الجھن یا خلش... کچھ ٹھیک معلوم نہیں...

اس رات ایک آدھ ستارے نکلے ہی تھے کہ وہ کمرے میں چلا گیا۔ یہاں تھوڑی سی سردی سی تھی۔ کچھ دیر بعد جب چلنے کے لئے باہر آنگن میں آیا تو نہ جانے کہاں سے بادلوں کے کچھ ٹکڑے آ گئے تھے۔ آسمان مٹیالا ہو گیا تھا۔ چاہتے ہوئے بھی وہ چل نہیں

پایا تھا۔ وہیں کھاٹ پر دراز رہا۔

"سردی لگ رہی ہوگی۔" شکنتلا نے کہا تھا۔

ٹھیک ہے! اس کو اپنے ہی الفاظ غلط لگے تھے۔ لیکن دراصل وہ آسمان صاف ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد ہی آہستہ آہستہ پورے چوکھٹ میں ستارے ابھر آئے تھے۔ وہ اٹھ کر چلا آیا تھا۔

جب آسمان صاف ہوتا تو وہ بساط خانے والی گلی سے نہیں لوٹتا تھا۔ اس دن بھی وہ گلی چھوڑ کر نیٹر گیس سے لوٹا تھا۔ دل میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن چلتے چلتے بپ جوتے کی کناری وہیں رگڑا کھا رہی تھی جہاں شکنتلا کے پیر کے انگوٹھے کا ناخن ذرا سا چبھ گیا تھا۔ جھرجھری سی ہو رہی تھی۔ گھر پہنچا تو سب لیٹ چکے تھے۔ آنگن میں چار کھاٹیں لگی تھیں۔ ایک پر گیان سو رہا تھا۔ دوسری پر آرتی۔ تیسری پر آرتی کی ماں اور اس سے لگی کھاٹ اس کے لئے خالی پڑی تھی۔ قمیض اتار کر وہ لیٹ گیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں؟ یہاں خنکی نہیں لگ رہی تھی۔ نیند آنے سے پہلے پیر کے ناخن کی اُدھڑی کھال پر جھرجھری ہوتی رہی تھی۔

صبح وہ بستہ باندھ رہا تھا کہ سنائی پڑا۔ "آرتی اپنے بابوجی کا کھانا باندھ دے۔ دیکھ لے کیا بن بنا گیا ہے رسوئی میں۔" رام ناتھ ادا کے رخ کو پہچان گیا تھا۔ لیکن ایک لمحے کے لئے وہ ٹھٹکا سا گیا۔ چشمہ چڑھا کر اس نے دیکھا کہ آرتی رسوئی میں چلی گئی ہے وہ کچہری کے لئے دوپہر کا کھانا کٹوردان میں رکھ رہی تھی۔ بہو شاید اچار نکال رہی تھی۔ آرتی کی ماں تلسی کو پانی دے رہی تھی۔ معمولی جھونکا تھا۔ رام ناتھ نے مسل بستہ میں باندھ لی اور چشمہ اتار کر جیب میں رکھ لیا۔

"رات نو بجے وکیل صاحب کا نوکر آیا تھا کسی ضروری مسل کے لئے" آرتی کی ماں نے ذرا تیز آواز میں کہا۔

"اچھا۔" رام ناتھ نے آہستہ سے کہا تھا۔

"اچھا کیا؟"

"اب دے دوں گا۔"

"تو جہاں جایا کرو، بتا کر جایا کرو... یا پھر ایسی جگہ جایا کرو جہاں کسی کو بھیج کر کوئی بلوا تو سکے!" آرتی کی ماں نے اونچی آواز میں کہہ کر کچھ لفظ چبائے تھے "آگ لگے تمہاری جوانی کو!"

رام ناتھ کی ٹانگیں سنسنا کر رہ گئی تھیں۔ ایک سرد لہر سی ریڑھ سے گزر گئی تھی۔ وہ بستے پر اور جھک گیا تھا۔

جوں توں بستہ سنبھال کر وہ باہر نکل آیا تھا۔ بائیں بغل میں بستہ دبا تھا، ہاتھ تھوڑی پڑ رہی تھی۔ جوتا بار بار ایڑی سے سرک رہا تھا۔ ایک پل کے لئے بستہ اس نے قانون گو صاحب کے چبوترے پر رکھ دیا تھا۔ پھر ٹھیک ہو کر چل دیا تھا۔

وہ بہت سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سب آخر کیا ہے کہ ہے؟ کس بات کی شکایت ہے...؟ دکھ، سکھ، تکلیف، آرام، ہاری بیماری کی بات تو سمجھ میں آتی ہے مگر یہ شکایت والی بات تو بڑی عجیب لگتی ہے۔ اس نے خود کبھی یہ سوچا ہی نہیں کہ آدمی کو شکایت ہونی چاہئے۔ کس بات کی شکایت اور کس سے شکایت؟ جب سے اس نے جو کچھ پایا، سب کچھ بنا بنایا ملا۔ جس میں کسی مرضی یا چاہنے نہ چاہنے کا سوال ہی نہیں اٹھا۔ اس قریب بچپن کا ہو گیا، مگر آج تک تو اس نے خود کسی بات کی شکایت نہیں کی۔ نہ گھر کی نہ گھر والی کی۔ نہ بچوں کی نہ قسمت کی۔ اس نے تو کبھی یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ سب جو اس کے چاروں طرف ہے۔ اس کے لئے کوئی ذمہ دار بھی ہے۔ جو کچھ ہے وہ ہے، جو نہیں ہے وہ نہیں ہے۔ جو ہوتا ہے وہ ٹھیک ہے۔ جو نہیں ہو پاتا۔ سو نہیں ہوتا۔

لیکن جب کبھی آرتی کی ماں بڑبڑاتی تو کچہری میں ہوتی سازش کا مطلب جھلکنے لگتا۔ بستوں پر بیٹھے دوسرے لوگ

اٹھتے بیٹھتے فقرے کس دیتے۔ منشی رام ناتھ ایک اجلاس سے دوسرے اجلاس بھاگتے رہتے۔ وڈر وڈ کو وکیل صاحب کی پیشی کی خبر پہنچاتے رہتے۔ چھوٹی موٹی عدالت میں تو خود کھڑے ہو کر وقت کی مہلت مانگ لیتے۔ استغاثے تیار کرتے۔ پریپر کا مضمون بناتے مقدموں کی نئی تاریخیں نوٹ کرتے۔ موکلوں کو اطلاعیں دیتے۔ وکیل صاحب کے حاضر ہونے سے قبل ضمانتوں کی خانہ پُری کر کے اور لین دین نپٹا کر تیار رہتے۔

لیکن بھاگتے دوڑتے بھی وہی باتیں دماغ میں ٹکراتی رہتیں۔ ایک منٹ بستے پر بیٹھتے تو گھبرائے گھبرائے رہتے۔ گھبراہٹ کا سبب بھی پوری طرح سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر اس میں ہے کیا؟ کون ایسی دنیا اوپر کی بات ہو گئی ہے۔ کون سی ذمہ داری سے نکل بھاگے ہیں۔ اس کو تو کسی سے شکایت نہیں۔ جو کچھ جو ہے، سو ہے، اس میں ہے کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ ایسا کیا ہے جو وہ کر رہا ہے، جو نہیں کرنا چاہیے، جو نہیں ہونا چاہیے۔ کبھی اس نے بھی تو کچھ نہیں کہا۔ گیا تو ٹھیک، نہ گیا تو ٹھیک۔ لیکن یہ رہنا بس یونہی ہوتا ہے کہ وہ چلا جاتا ہے۔ جب شام گھرتی ہے تو مٹیالا آسمان بڑا خوفناک لگتا ہے۔ بس کبھی کبھی اتنا بھر لگتا ہے کہ شکنتلا کیا کر رہی ہوگی انتظار تو اس کو کبھی نہیں ہوتا۔ لیکن انتظار کی طرح کی کوئی بات من میں ہوتی ہو تو ہوتی ہو۔ کوئی زور، زبردستی، رونا، کلپنا، طعنے، شکایتیں کچھ بھی نہیں ہے۔ ہاں جیسے مزید سب کچھ ہے۔ ایک انجانی عادت کی طرح۔ اسی طرح اور اتنی ہی معمولی سطح پر یہ بھی ہے۔

گھرتی شام، ندی کے پل یا راجہ صاحب کے باغ میں پتھر والی بینچ پہ نہ گزر رہی۔ بے کور کٹے آسمان کے نیچے گزر گئی۔ جھوٹ کیوں کہے۔ وہاں جو وقت گزرتا ہے اور جیسے گزرتا ہے۔ وہ کچھ تو دوسری طرح کا ہوتا ہے۔ اتنا خالی نہیں ہوتا۔ پل کے نیچے بہتی ندی الگ ڈھنگ بہہ جاتی ہے۔ وہ انگلی دکھا کر کبھی اس کو روک نہیں پائے گا۔ ہمت کرنے پر بھٹکے گی بھی نہیں۔ پھر پل پر بیٹھتے کبھی کبھی ڈر بھی لگتا ہے۔ ندی کی آواز تھکا دیتی ہے۔

بس اتنا بھر ہے کہ جھبتی بتی دیکھ کر کوئی کبھی سر کے نیچے تکیہ کھسکا دیتا ہے یا بالشت بھر دور رکھے گلاس کو ذرا سرکا کے پکڑا دیتا ہے۔

کہیں کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ ایسی ہی بات ہے جس کا خاص مطلب کبھی نہیں۔ سب کچھ قدرتی ہے۔ رکنا، روکنا، رو کے رہنا۔ بھٹکنا، ٹھٹکے رہنا، بیٹھنا، بیٹھے رہنا، چھونا پھر ہاتھ رکھے رہنا۔ ایک معمولی سا لگاؤ ہی تو ہے۔ گزری ہوئی آتی عمر کے باوجود اتنا بھر ہے کہ جو نہیں گزر رہا ہے۔ جو شاید موت کے ساتھ ہی مرنا ہوگا۔ وہ کیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ دل میں شاید خون کا کوئی قطرہ مچلتا ہے۔۔۔ یا کچھ اور ہو۔۔۔ سچ سچ کچھ نہیں معلوم۔ اس سچ کے لئے کوئی ٹھیک سے الفاظ کبھی نہیں ملتے۔۔۔ ثبوت تو کوئی ہے نہیں۔

کوئی شکایت دل میں آئی تو کس سے کرے؟ ایک وقت ایسا تھا جب شکایتیں ہی شکایتیں تھیں۔ دنیا جہان سے، وکیل صاحب سے، سرکار سے، گھر والی سے، لوگوں سے، دفتر والوں اور عدالتوں سے، سپاہی اور چپراسی سے، لیڈر اور بنیا سے، لیکن ایک ہتھوڑا تھا جو اس کے دماغ کو پیٹتا تھا۔ پیٹ پیٹ کر اس نے دماغ کا بھوسا بنا دیا تھا۔ اور اب تو اس کو اتنا بھی یاد نہیں پڑتا کہ شکایتیں کبھی تھیں۔ اب وہ جو کچھ دکھ تکلیف آتی ہے۔ برداشت کر لیتا ہے یا کہو کہ منظور کر لیتا ہے۔

اب دل میں ایسا سا گیا ہے جس کو چاہو تو ڈر کہہ لو یا ڈر سے الگ ایک اداسی۔ شاید اداسی بھی نہیں، کچھ کچھ سی کوئی شئے۔ اسی لئے وہ سوکھے پتے کی طرح کانپ جاتا ہے۔ جب دوسروں کی بات کے مطلب اس کی سمجھ میں نہیں آتے۔ اس کے پاس کسی بھی بات کے دو یا دس مطلب ہیں نہیں، مطلب کا سوال ہی نہیں ہے۔ بس ایک جینا ہے اور جیتے چلے جانا ہے۔ دوسروں کی شرطوں پر۔ سچ پوچھو تو، جو اس کے جیسے ہیں۔ ان کے پاس بھی کوئی خاص شرطیں نہیں ہیں۔ شرطوں کا واہمہ ہے لو دن

شرطوں میں اپنا ایک دولہ ہے۔ آرتی کی ماں کہتی تو نہیں۔ لیکن رویّہ سے کچھ شرطیں لگاتی ہے، کچھ دوسرے لوگ ہیں جو شرطیں طرح طرح ادائیں دکھاتے ہیں۔ یہ سب اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ خود کسی سے کچھ نہیں کہتا۔ جو بھی چاروں طرف ہے۔ اس کو ایسا ہی لگتا ہے۔ جیسے پل کے نیچے سے بہتی ہوئی ندی۔ تھوڑی دیر دیکھتا ہے۔ پھر اکتا جاتا ہے جیسے ندی پر بس نہیں ہے ویسے ہی کسی اور پہ بھی نہیں ہے۔

گھر ہے۔ چلتا جاتا ہے۔ اس کو کہیں جانا نہیں ہے۔ کہیں لوٹنا نہیں ہے۔ موت کا خیال تو نہیں آیا لیکن کبھی شمشان والے راستے کو دیکھ کر یہ ضرور لگا کہ موڑ والی املی کے نیچے اس کی ارتھی رکھ کر لوگ شاید اسی طرح سستائیں گے۔ اگر موسم ہوا تو املی کے دس بیس پھول کفن پہ گر پڑیں گے۔

اس خیال کے ساتھ ہی شکنتلا کا خیال آتا ہے۔ ایک گوشہ میں آنگن کی اینٹوں پر بکھرے سیم کے کمہلائے پانچ سات پھول آجاتے ہیں۔ کیا سوچتی ہوگی شکنتلا۔ ایسا تو نہیں کہ اس کو کچھ محسوس نہ ہوتا ہو۔ دن بھر کچھ سوچتی نہ ہو۔ ہاں جب وہ پہنچ جاتا ہے تو شاید کچھ نہیں سوچتی۔ دن بھر سوچتے ہوئے خیالات سے باہر نکل آتی ہے۔

ایک دفعہ اس نے بھی نہیں کہا۔ کچھ دیر بعد چلے جانا۔ یا کل جلدی آجانا۔ یا کوئی تمنا ہی کی ہوتی۔ کوئی خواب دیکھا ہوتا۔ کوئی حق ہی دکھایا ہوتا۔ دکھاوا کیا ہوتا۔ کسی چھوٹی سی بات سے انکار بھی کیا ہوتا۔ گھمنڈ ہی کرتی کبھی۔ باتیں تو بہت ہوتیں لیکن گونگے کی طرح۔ جتنا جس نے سمجھ لیا، اتنا ٹھیک۔

ایک رکے ہوئے شہر میں وہ بھی رکے ہوئے تھے۔ انتظار بس اتنا ہے کہ انتظار کا نام بھر ہے۔ کون جانے کب کیسے وقت اٹھالے جائے۔ اپاہج کر دے، تب سب ٹھہر جائے گا۔

برسوں سے سب رکا رکا سا ہے۔ ایک راکھی کے دن کلائی میں راکھی بہت کاٹ رہی تھی۔ اس کو اس نے کاٹ کے پائے سے باندھ دیا تھا۔ بدرنگ سوت اب بھی اسی پائے سے بندھا ہے۔ بہت بار شکنتلا نے بھی دیکھا ہوگا۔

نیم شکستہ مکان گلیوں میں جوں کے توں کھڑے ہیں۔ مکانوں کی منڈیروں پر سوکھی گھاس کی جھالر نہ جانے کب سے ٹنگی ہے۔ گلی کے موڑ پر پنڈت جی کی گائے بندھتی ہے۔ گائے تو مر کھپ گئی لیکن گھسا ہوا کھونٹا اور گرہ لگی رسّی کا ٹکڑا وہیں اٹکا ہے۔

دیواروں کے گوشوں میں برساتی پرنالوں سے کچی چھتیں کٹ کٹ کر آئی ہوئی مٹی کے ڈھیر جوں کے توں ہیں۔ ان ڈھیروں پر آم کی گٹھلیاں چپکی ہیں۔ گٹھلیوں سے دو دو کونپلوں کے کلّے پھوٹ آئے ہیں۔

آنگن میں پڑے کوڑے میں پیپل اور نیم کے پودے نکل آئے ہیں۔ بڑے بڑے نیموں کے پھٹے تنوں پر گوند کے موٹے موٹے آنسو چپکے ہیں۔ جڑوں پر لوگوں کے بیٹھنے کے نشان ہیں۔

ہر طرف کچھ ہے لیکن ویسا ہی، جیسا تھا۔ اپنی اپنی جگہ سب جوں کا توں۔ جو جہاں ٹھہر گیا، وہ وہیں ٹھہر گیا۔

کبھی رام ناتھ نے سوچا بھی نہیں کہ اس ٹھہراؤ سے کترا جائے۔ کترائے بھی تو کہاں جائے؟

آرتی کی ماں جب رویہ سے کچھ شرط سی رکھتی ہے تو جی کرتا ہے سب سے الگ ہو جائے۔ کوئی واسطہ نہ رکھے۔ نہ یہاں نہ وہاں۔ بغل والی کوٹھری لے لے اور پڑا رہے۔ لیکن اتنا ہی لگتا ہے کہ آرتی کی شادی ہو جائے۔ گیان کی ہوتی رہے گی۔ لڑکا ہے۔ آرتی کی ماں سے گیان زیادہ بھنبھناتا ہے۔ اناپ شناپ بھی کہہ جاتا ہے باپ کے خلاف۔

کبھی کبھی وہ گھر میں گھستے ہی وہاں کے تناؤ کو تاڑ لیتا تھا۔ گیان بک رہا ہوتا۔ تب بھی وہ اپنے کو غلط تو نہیں پاتا تھا۔ بلکہ عجیب کمزوری محسوس ہونے لگتی تھی۔

لیکن اس کی آہٹ ہوتے ہی سب جیسے کسی سازش میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ باتیں ضرورت بھر کی رہ جاتیں۔
اس غیر تعاون کو وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ تو سمجھتا تھا لیکن اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اتنے طومار کی ضرورت کیا ہے؟ اور آخر کیوں؟ پھر اس کا جی اچاٹ ہو جاتا۔ آگے وہ سوچ ہی نہیں پاتا تھا کیونکہ آگے جو کچھ آتا تھا ... بناوٹی ہوتا تھا۔ اور کسی وجہ سے الگ۔ کسی اور وجہ سے وابستہ۔ لیکن عادت تو وجہ نہیں ہوتی۔ وہ تو ہوتی ہے۔ چاہو تو اچھی یا بری کہہ لو۔ اس میں کیا رکھا ہے۔ ہر آدمی میں کچھ ایسا ہوتا ہے۔ جو کسی دوسرے میں نہیں ہوتا۔ وہی اس کو سب سے پیارا ہوتا ہے۔ شاید وہی۔ جو بس مرتا ہے۔ ختم نہیں ہوتا۔ نام اس کو کوئی نہیں دے پاتا۔ جان بھی شاید نہیں پاتا۔ بس۔ وہ اس وہی کو لئے جیتا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ ضد ہو، خواہش ہو، آرزو ہو یا کچھ اور۔ شاید ڈر ہی ہو یا گھبراہٹ۔

شام جب ڈھلتی ہے۔ جب روشنیاں بھی پھیکی پھیکی ہوتی ہیں۔ آسمان سرمئی سے سیاہ ہوتا جاتا ہے . . . .
تب وہی کچھ تو ہوتا ہے۔ ڈر ہوتا ہوگا یا کوئی گھٹن۔ گھبراہٹ۔ تبھی تو وہ اٹھ کر چل دیتا ہے۔ کہیں جانے کے لئے نہیں۔ جاتا تو کہیں نہیں۔ پہنچ جاتا ہے، کیا کرے!

اور پھر ایسا کیا ہے۔ جس سے وہ بھاگتا ہے؟ وہ تو کبھی بھاگا نہیں۔ کون سی ایسی ذمہ داری ہے جس سے اس نے انکار کیا ہو۔ تب شکایت کیوں؟

آرتی کی شادی بھی طے کر آیا تھا۔ انتظار رہا کہ ہو جائے۔ جب شادی کا وقت آیا تو وہ بساط بھر سب کچھ کرتا رہا۔ ایک معمولی گھر والا غریب جتنا کچھ کرتا۔ ڈاکخانہ سے سب روپیہ نکال لایا۔ جو کچھ ادھار مل سکا، وہ بھی اٹھا لایا۔ دن رات لگ کر سب انتظام مکمل کر دئے۔ لیکن درمیان میں بار بار شکایتیں اٹھتی رہیں۔ آرتی کی ماں جب تب یہی کہتی رہیں۔ "جی سے کرنا ہو تو کرو۔ نہیں تو رہنے دو۔ میرے کون دس بیس بیٹھی ہیں۔ اکلوتی لڑکی ہے۔ میں سب کر لوں گی۔"

وہ سن لیتا۔

"تمہارے من میں کوئی امنگ ہی نہیں۔ سوتیلی تو نہیں ہے آرتی! تم بیٹھو، میں کر لوں گی۔" جب وہ یہ کہتی تو اسے بڑا دکھ ہوتا۔ رام ناتھ سمجھ ہی نہیں پاتا کہ اور کیا کرے؟

شام کو پنڈت جی آئیں گے . . . تمہیں فرصت ملے تو جلد لوٹ آنا۔ نہ ملے تو کوئی بات نہیں! . . . آرتی کی ماں نے یہ کہا تو وہ گھبرا کے رہ گیا۔ پنڈت تو بہت رات گئے آئے۔ لیکن وہ شام کو نہیں نکل پایا۔ بیکار کے تناؤ سے اس کا جی گھبراتا تھا۔ ایک آدھ مہمان آگئے تب تو اس کا جی اور بھی دھڑکتا رہتا تھا۔ کہیں کام سے بھی گیا تو دس منٹ اوپر لگ گئے۔ بس آرتی کی ماں سیدھی آنکھ دیکھتی تھی . . . .

کمرے کونے میں اکیلے مل جاتی تو دھیرے سے جیسے اس کو سنا کر بھگوان سے دعا مانگتی۔ "ہے ایشور! ان کو ٹھیک رکھنا۔ ہماری عزت رکھنا۔"

وہ سنتا تو گھبرا جاتا۔ اس کو ڈر اپنے سے اتنا نہیں تھا جتنا آرتی کی ماں سے تھا۔ آخر کیا کیا ہے اس نے؟ . . .
وہ گھر میں ہی رہتا۔ شام کو دروازے پر چھڑکاؤ کر کے کرسیاں، مونڈھے لگاتا اور عزت دار باپ کی طرح خاموش بیٹھا رہتا۔

گھر کے اندر کی رونق سے اس کے دل میں بڑی خوشی بھرتی تھی۔ برسوں بعد گھر میں شامیانہ گڑا دیکھ کر جی بہکنے لگتا۔

رات ساڑھے آٹھ بجے روانہ تھا۔ سب انتظام مکمل ہو گیا تھا۔ بہو، بیٹیاں کمروں میں کپڑے بدل رہی تھیں۔
آنگن میں گیس کے ہنڈے ٹنگے ہوئے تھے۔ کہار سکورے اور مٹی کے پیالے دھو رہے تھے۔ پنجی والے گھر سے گھی اور پوریاں

تلنے کی مہک آرہی تھی۔ آدھے آنگن میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ کچوری کی دال اور پیٹرومیکس کی اسپرٹ کے ساتھ ہی دھلے ہوئے کورے دیپالیوں کی سوندھی تیکھی خوشبو چاروں طرف بھری ہوئی تھی۔ شامیانے میں جگہ کے بیچ چھید آگئے تھے۔ کھمبے سے بندھی بانس کی لمبی ٹہنی کو اوپر تک دیکھتے کو نظر گئی اور آسمان پر اٹک گئی۔

ابھی دس بیس تارے ہی ابھرے تھے۔ اوپر سناٹا تھا۔ دل یکایک ڈوبنے لگا تھا۔ چپ چاپ وہ اندر آرتی کی ماں کے پاس گیا اور دھیرے سے بولا تھا "... وہ... وہ... تم نے وہاں بلاوا بھجوا دیا تھا"

"کہاں؟" آرتی کی ماں کی آنکھوں میں چنگاریاں تھیں۔

وہ چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر بولا "ہم نے کہا تھا تم سے..."

"وہ یہاں نہیں آئے گی! خواہ کچھ بھی ہو" آرتی کی ماں بپھری تھی۔

"ٹھیک ہے" رام ناتھ بولا "دیکھو اپنا..."

"کیا؟"

"ہاں"

اور وہ نکل کر چلا آیا تھا، گلی میں۔ گلی کے باہر سب کچھ وہی تھا، ویسا ہی۔ جیسا ہوتا تھا۔ نالیوں سے نکلی گندگی کی بدبو۔ دھول کی وہی کسکساہٹ۔ درختوں تلے ویسا ہی اندھیرا۔

شکنتلا کے گھر کا آنگن اسی طرح چوکھٹے میں جڑا ہوا تھا۔ کالی فولادی گوٹ لگی تھی۔

"کس چیز کی ضرورت پڑ گئی؟" شکنتلا نے پوچھا تھا۔

"نہیں... یونہی چلا آیا" لیکن شکنتلا کچھ بھانپ گئی تھی۔ وہ پریشان تھی۔ وہ بھی دل ہی دل میں گھبرایا ہوا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اس نے کیا کیا ہے! صحیح یا غلط! یا کچھ بھی نہیں! ایک ایک لمحہ دونوں پر بھاری پڑ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے خلاف تھے۔ اور شاید ایک دوسرے کے محتاج تھے۔ شکنتلا شاید اس کو باہر بھیج کر دروازہ بند کر لینا چاہتی تھی۔ وہ کہیں بھی جائے خواہ وہاں یا اور کہیں۔

لیکن اس کے دماغ میں کچھ بھی گھس نہیں رہا تھا۔ آخر شکنتلا وہیں آنگن میں پڑے آسن پر بیٹھ گئی۔ اور یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہیں نہ دیکھ رہی تھی۔ آج بھی اس کے پاس ثبوت تو کچھ ہے نہیں۔ نہ اس کا، نہ اُس کا۔

وہ کچھ ہے؟ ثبوت تو کچھ ہے نہیں۔ اس نے تو نہیں روکا! ثبوت تو کچھ ہے نہیں۔ اس نے چاہا کہ یہ وہیں جائے... ثبوت تو کچھ ہے نہیں... ایک دفعہ وہ مضطرب ہوا تھا۔ جوتوں میں پیر بھی ڈال لیے تھے۔ لیکن پھر دراز ہو رہا تھا۔ جب تو کچھ ہوگی کچھ بھی نہیں۔ کوئی شکایت؟ کچھ بھی نہیں۔ کوئی دوسری بات؟ کچھ بھی نہیں۔ تب یہ کیا؟ ضد، خواہش، ڈر یا کچھ اور۔ کوئی آرزو... وہ سوچ ہی نہیں پاتا۔ آگے کا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ سب کچھ بے صبری طرح ٹھہر جاتا ہے، اٹک جاتا ہے لیکن مرتا نہیں۔

گیان دو مرتبہ آکر لوٹ چکا تھا۔ تیسری مرتبہ پھر آیا تھا۔ لیکن رام ناتھ لیٹا ہوا تھا۔ وہ ایسے نہیں جائے گا۔

"ابھی سب کو یہی معلوم ہے کہ آپ کہیں کام سے گئے ہوئے ہیں" گیان نے رام ناتھ سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے... مگر میں اکیلا نہیں آؤں گا"

"اچھا میری خاطر چلے جاؤ" شکنتلا نے کہا تھا۔

"یہ آئے گی اور آرتی کا کنیا دان لے گی! سمجھے، لو چلو آؤ" یہ کہہ کر رام ناتھ نے سر جھکا لیا تھا۔ گیان چلا گیا تو

وہ یہ کہہ کر بھی جیسے خود اپنے کو پھر ہمت بندھا رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ وہ یہی چاہ رہا تھا یا اس سے کچھ اور زیادہ جو کوئی اور نہیں دے سکتا۔ اس معمولی سی شے کے پرے بھی ہے جو دیا جاتا ہے۔ الفاظ میں تو ظاہر ہو نہیں پاتا۔۔ ضد۔۔۔ یا ڈر۔۔۔ یا کوئی خواہش۔۔۔ آرزو۔۔۔ یہ سب لفظ بھی اس کو نہیں کہہ پاتے۔ شاید کوئی بے بسی جیسی چیز ہے یا کچھ اور۔۔۔ بے بسی سے بھی زیادہ بے بس۔ ایک دم قدرتی۔ بے حد معمولی۔

گیان پھر آیا تھا "اماں نے کہا ہے۔ آپ کہیں، تو وہ آکر خود لے جائیں۔"

ایک لمحہ اس کو اکھرا تھا۔ چاہا تو یہی تھا لیکن اس طرح نہیں۔ کیوں ایسا ہوتا ہے کہ وہ سب مل جاتا ہے جو آدمی چاہتا ہے۔ لیکن اس طرح نہیں جس طرح وہ چاہتا ہے۔ پچھتاوا نہیں ہوتا ہے! یا کہ بھی۔ ہوتے ہوتے بات بیکار لگنے لگتی ہے۔ اس کی خوبصورتی ختم کیوں ہو جاتی ہے۔ شاید بات ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ اس کا ہونا یا نہ ہونا نہیں۔

گیان اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شکنتلا نیم مردہ سی کھڑی تھی۔ وہ اپنا جانتی تھی۔ یہ غرور اس کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن دل میں اتنا کہہ رہا تھا کہ وہ کہیں وابستہ ہے۔

"تمہاری اماں کیوں لینے آئے گی؟ خودداری کا سوال تو ہے نہیں۔ یہ خود چل سکتی ہیں۔" رام ناتھ نے کہہ کر جوتے پہن لیے۔ "تم انہیں لے کر آؤ۔"

وہ آگے چل رہا تھا پیچھے پیچھے گیان شکنتلا کے ساتھ آ رہا تھا۔ سڑکوں پر تاریکی تھی۔ گلی کا دہانہ پرانی سرنگ کی طرح بند معلوم ہو رہا تھا۔ گھر کے باہر بڑی رونق تھی۔ اندر بھی دھوم دھام تھی۔ دروازے پر کرسیاں پڑی تھیں۔ اوپر چاندنی تنی تھی۔۔۔ کاغذ کے ستارے کھلے تھے۔ چھڑکاؤ ہو جانے سے سوندھی سوندھی مہک پھوٹ رہی تھی۔ پانچ سات رشتہ دار وہیں بیٹھے تھے۔ رام ناتھ وہیں ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ باتوں میں مشغول ہو گیا۔

گیان شکنتلا کو لیے ہوئے اندر چلا گیا۔ شکنتلا اندر پہنچی تو آرتی کی ماں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اندر کمرے میں لے جا کر دھوتی تبدیل کروا دی تھی۔ نائن کو بلا کر مہاور لگوا دیا تھا۔

چاروں طرف چہل پہل تھی۔ رام ناتھ بیٹھا سب سے باتیں بھی کر رہا تھا۔ لیکن کوئی بات اس کے دماغ میں ٹک نہیں رہی تھی۔ دل میں اس وقت کچھ بھی آ جا نہیں رہی تھی۔ شاید وہ اچھوتا تھا سب باتوں سے۔ غلط یا صحیح سے۔ اچھے یا برے سے۔ نہ خاص کچھ ملا تھا۔ نہ دے پایا تھا۔ لیکن اس خالی پن میں کچھ تھا، جو پہلے نہیں تھا۔ جواب تک انجانا تھا۔ جان تو اب بھی نہیں پایا تھا معلوم نہیں کیا تھا *

کملیشور

کھوئی ہوئی دشائیں

سڑک کے موڑ پر لگی ریلنگ کے سہارے چندر کھڑا تھا۔ سامنے دائیں بائیں آدمیوں کا سیلاب تھا۔ شام ہو رہی تھی اور کناٹ پلیس کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ تھکان سے اس کے پیر جواب دے رہے تھے۔ کہیں دور آیا گیا بھی تو نہیں۔ پھر بھی تھکان تمام بدن میں بھری ہوئی تھی۔ دل و دماغ اس قدر تھکا ہوا تھا کہ معلوم ہوتا تھا وہی تھکان آہستہ آہستہ بدن میں پھیلتی جا رہی ہے۔

سارا دن برباد ہو گیا۔ یہی کھڑا سوچ رہا تھا۔ گھر لوٹنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ آتی جاتی ایک سی عورتوں کو دیکھ کر دل اور بھی ڈوبنے لگتا تھا۔

بھوک... معلوم نہیں لگی ہے یا نہیں، وہ دماغ پر زور ڈالتا ہے... سویرے آٹھ بجے گھر سے نکلا تھا۔ ایک پیالی کافی کے علاوہ تو کچھ پیٹ میں نہیں گیا... اور تب اس کو احساس ہوا کہ تھوڑی تھوڑی بھوک لگ رہی ہے۔ دماغ اور پیٹ کا ساتھ ایسا ہو گیا ہے کہ بھوک بھی سوچنے سے لگتی ہے۔

نگاہ دور آسمان پر اٹک جاتی ہے۔ جہاں چیلیں اڑ رہی ہیں اور سورج کی صورت میں کٹا ہوا آسمان نظر آ رہا ہے۔ اس گدلے آسمان کے نیچے جامع مسجد کا گنبد اور مینار نظر آ رہا ہے۔ ان کی نوکیں بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی ہیں۔

عقب والی دوکان کے باہر چولیوں کا اشتہار ہے۔ ریگل بس اسٹاپ کے نیم کے درختوں سے آہستہ آہستہ پتیاں جھڑ رہی ہیں۔ بسیں جوں جوں کرتی آتی ہیں ایک لمحہ ٹھٹکتی ہیں ایک جانب سے سواریوں کو اگلتی ہیں اور دوسری جانب سے نگل کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ چوراہے پر قمقمے لگے ہیں۔ قمقموں کی آنکھیں لال پیلی ہو رہی ہیں۔ آس پاس سے سینکڑوں لوگ گزرتے ہیں۔ لیکن کوئی اس کو نہیں پہچانتا۔ ہر آدمی یا عورت لاپرواہی سے دوسروں کی نفی کرتا یا جھوٹے غرور میں ڈوبا ہوا گزر جاتا ہے۔

اور تب اس کو اپنا وہ شہر یاد آتا ہے جہاں سے تین سال پہلے وہ چلا آیا تھا۔ گنگا کے سنسان کنارے پر بھی اگر کوئی انجان مل جاتا تو اس کی نظروں میں پہچان کی ایک جھلک تیر جاتی تھی۔

اور یہ راجدھانی! جہاں سب اپنا ہے، اپنے دیش کا ہے... لیکن کچھ بھی اپنا نہیں ہے۔ اپنے دیش کا نہیں ہے۔

تمام سڑکیں ہیں جن پر وہ جا سکتا ہے لیکن وہ سڑکیں کہیں نہیں پہنچاتیں۔ ان سڑکوں کے کنارے گھر ہیں، روشنیاں ہیں لیکن کسی بھی گھر میں وہ نہیں جا سکتا۔ ان گھروں کے باہر پھاٹک ہیں۔ جن پر کتوں سے ہوشیار رہنے کی تنبیہ لکھی ہے۔ پھول توڑنے کی ممانعت ہے اور گھنٹی بجا کر انتظار کرنے کی مجبوری ہے۔

... گھر پر نرملا انتظار کر رہی ہوگی۔ وہاں پہنچ کر بھی پہلے مہمان کی طرح کرسی پر بیٹھنا ہوگا کیونکہ بستر پر کمرہ کا تمام سامان [illegible]

ہوگا اور وہ ہیٹر پر کھانا بنا رہی ہوگی۔ بے نیاز ہو کے وہ ہوا کے جھونکے کی مانند کمرہ میں گھس بھی نہیں سکتا۔ اور نہ اس کو بازوؤں میں بھر کے پیار ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ گپتا جی ابھی مل سے لوٹے نہیں ہوں گے۔ اور مسز گپتا بیکاری میں بیٹھی گپ لڑا رہی ہوں گی یا کسی سویٹر کی بنائی سیکھ رہی ہوں گی۔ اگر وہ چلا بھی گیا تو کمرے میں بہت ادب سے گھسے گا۔ پھر مسز گپتا سے ادھر ادھر کی دو چار باتیں کرے گا۔ تب بیوی کھانا کھانے کی بات کہے گی اور کھانے کی بات سن کر مسز گپتا گھر جانے کے لئے اٹھیں گی۔۔۔

اور پھر اس کے بعد بڑی کھڑکی کا پردہ کھسکانا پڑے گا۔ کسی بہانے کھرانا کی طرف والی کھڑکی کو بند کرنا پڑے گا۔ گھوم کر میز کے قریب پہنچنا ہوگا۔ اور تب پانی کا ایک گلاس منگانے کے بہانے وہ بیوی کو بلائے گا۔ اور تب اس کو بازوؤں میں بھر کے پیار سے یہ کہہ سکنے کا موقع آئے گا بہت تھک گیا ہوں۔

لیکن ایسا ہوگا نہیں۔ اتنے لمبے احساس میں گزرنے سے قبل ہی اس کا دل جھنجلا اٹھے گا۔ اور یہ کہنے پر مجبور ہو جائے گا۔ "اے بھئی۔ کھانے میں کتنی دیر ہے؟" سارا پیار اور تمام پہچان نہ جانے کہاں چھپ چکی ہوگی۔ عجیب سا بیگانہ پن ہوگا۔ بیکری والوں کے یہاں بھرائی آواز میں ریڈیو بج رہا ہوگا۔ اور گولاٹی کے تھکے قدموں کی کھوکھلی آواز زینہ پر سنائی پڑے گی۔

گلی میں کوئی اسکوٹر آ کر رکے گا۔ اور اس میں سے کوئی ان پہچانا آدمی کسی جانب کے گھر میں چلا جائے گا۔ موٹروں کی مرمت کرنے والے گیراج کے مالک۔ سردار چابیاں لے کر گھر جانے کے انتظار میں آدھی رات تک بیٹھا رہے گا۔ کیونکہ اس کو پندرہ سال پرانے میکینک پر بھی شاید بھروسہ نہیں ہے۔

اور سامنے رہنے والے لبشن کپور کے آنے کی آہٹ پھر ملے گی۔ گذشتہ دو سال سے اس نے نام کی پلیٹ دیکھی ہے۔ لبشن کپور جرنلسٹ ۔۔۔ اور اس کی شکل کے بارے میں صرف یہ جانتا ہے کہ سامنے والی کھڑکی سے جب بجلی کی روشنی چھننے لگتی ہے اور سگریٹ کا دھواں سلاخوں سے لپٹ لپٹ کر باہر کی تاریکی میں ڈوب جاتا ہے تو لبشن کپور نام کا ایک آدمی اندر ہوتا ہے۔ اور صبح جب اس کی کھڑکی کے نیچے انڈے کا چھلکا، ڈبل روٹی کا ریپر اور جلی ہوئی سگریٹیں تیلیاں اور راکھ بکھری ہوئی ہوتی ہیں تو لبشن کپور نام کا آدمی جا چکا ہوتا ہے۔

سوچتے سوچتے اس کو لگا کہ موزے کی بدبو اور بھی تیز ہوتی جا رہی ہے۔ اور اب ریلنگ کے قریب کھڑا رہنا مشکل ہے جیب سے ڈائری نکال کر اس نے اگلے دن کی ملاقاتوں کے بارے میں جان لینا چاہا۔

۔۔۔ انگریزی ڈیلی میں پہلے فون کرنا ہے پھر وقت طے کر کے ملنا ہے۔ ریڈیو میں ایک چکر لگانا ہے۔ پچھلا چیک ریزرو بینک سے کیش کرانا ہے۔ اور گھر ایک منی آرڈر بھیجنا ہے۔ کل کا پورا وقت بھی اسی میں نکل جائے گا۔ کیونکہ اخبار کا مدیر وقت نہیں ہے جو فوراً بلا لے اور بے تکلف بات کرے اور کوئی بات طے ہو جائے۔ ریڈیو میں بھی کوئی بات دس منٹ میں طے نہیں ہو سکتی اور ریزرو بینک کے کاؤنٹر پر الہ آباد والا امرناتھ نہیں ہے جو فوراً چیک لے کر روپیہ لا دے۔ ڈاکخانہ میں بیوپاریوں کے چپراسیوں کی بھیڑ ہوگی۔ جو دس دس منی آرڈر کے فارم لئے لائن میں کھڑے ہوں گے۔ اور ایک کالم پہ پوری رقم اور منی آرڈر کمیشن کا میزان لگانے میں مشغول ہوں گے۔ ان میں سے کوئی بھی اس کو نہیں پہچانتا ہوگا۔

ایک لمحہ کی جان پہچان کا سلسلہ صرف پین ہوگا، جو کوئی نہ کوئی دو حرف لکھنے کے لئے مانگے گا۔ اور لکھ چکنے کے بعد اپنا خط پڑھتے ہوئے وہ بائیں ہاتھ سے اس کو قلم لوٹا کے شاید دھیرے سے تھینک یو کہے گا۔ اور ٹکٹ والے کاؤنٹر کی طرف بڑھ جائیگا۔

اور تب اس کو جھنجلاہٹ سی ہوئی۔ ڈائری ہاتھ میں تھی اور اس کی نگاہیں پھر دور کی اونچی عمارتوں پر اٹک گئی تھیں۔ جن پر بجلی کے قمقمے جگمگا رہے تھے۔ اور ان ناموں میں سے وہ کسی کو نہیں جانتا تھا۔ الہ آباد میں سب سے بڑے کپڑے والے کے متعلق اتنا تو معلوم تھا کہ پہلے وہ بہت غریب تھا اور کندھے پر گٹھر رکھ کر پھیری لگاتا تھا۔ اور اب اس کا لڑکا ولایت میں پڑھنے گیا ہوا ہے۔ اور وہ خود بہت مذہبی آدمی ہے جو اب پیشانی پر چھاپہ تلک لگا کر حسب منشا منافع وصول کرتا ہے۔ اور کارپوریشن کا الیکشن لڑنے کی تیاری

گر رہے ہیں۔ یہاں کچھ بھی پتہ نہیں چلتا۔ کسی کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں پڑتا۔

کناٹ پلیس میں کھلے ہوئے لان ہیں۔ تنہا درخت ہیں۔ اور ان دور دور کھڑے تنہا درختوں کے تلے کار پوریشن کی بنچیں ہیں جن پر تھکے ہوئے لوگ بیٹھے ہیں اور لان میں ایک آدھ بچے دوڑ رہے ہیں۔ بچوں کی شکلیں اور شرارتیں تو بہت پہچانی سی لگتی ہیں۔ لیکن گول گپے کھاتی ہوئی ان کی ممی اجنبی ہے کیونکہ اس کی آنکھوں میں معصومیت اور گرم جوشی سے بھری محبت نہیں ہے۔ اس کے جسم میں شفقت کی خوب صورتی اور غرور بھی نہیں ہے۔ اس پر صرف ایک خمار ہے۔ اور ایک بہت بے معنی اور گھسی پٹی ہوئی للکار ہے۔ جس کو نہ قبول کیا جا سکتا ہے اور نہ انکار کیا جا سکتا ہے۔ وہ للکار سب کانوں میں گونجتی ہے اور سب بہروں کی طرح گمنام جلتے ہیں۔

لان پر کچھ لمحہ بیٹھنے کو جی چاہا لیکن اس کو لگا کہ وہاں بھی کوئی ٹھکانہ نہیں۔ ابھی کل ہی تو چور کی طرح دبے پاؤں گھاس میں بہتا ہوا پانی آیا تھا اور اس کے کپڑے بھیگ گئے تھے۔

تنہا کھڑے درختوں اور ان کے نیچے سمٹتے اندھیرے میں عجیب سا خلا رہتا تھا۔ تنہائی ہی سہی لیکن اس میں خلوص تو ہو۔ وہ تنہائی کبھی کسی کی نہیں ہے کیونکہ ہر دس منٹ بعد پولس کا آدمی ادھر سے گھومتا ہوا نکل جاتا ہے۔ جھاڑیوں کی سوکھی ٹہنیوں میں آئس کریم کے خالی کاغذ اور چنے کی خالی پڑیاں الجھی ہوئی ہیں۔ بے گھر بار آدمی شراب کی خالی بوتل پھینک کر چلا گیا ہے۔

ڈائری پر پھر اس کی نظر جم گئی ہے۔ اور شور شرابے سے بھرے اس سیلاب میں وہ بہت اکیلا سا محسوس کرتا ہے اور لگتا ہے کہ ان تین سالوں میں ایسا کچھ بھی نہیں ہوا جو اس کا اپنا ہو جس کی خلش ابھی تک ہو۔ جوش یا درد اب بھی موجود ہو۔ ریگستان کی طرح پھیلی ہوئی تنہائی ہے۔ انجان ساحلوں کی طرح خاموشی اور ویرانی ہے اور پچھاڑ کھاتی ہوئی لہروں کا محض شور ہے جس سے وہ خاموشی مزید گہری ہوتی ہے۔

موزے کی شکل میں کٹا ہوا آسمان ہے اور جامع مسجد کے گنبد کے اوپر چکر کاٹتی ہوئی چیلیں ہیں۔ عورتوں کا تعاقب کرتے ہوئے پھول بیچنے والے اور یتیم بچوں کے ہاتھ میں شام کی خبروں کے اخبار ہیں۔

... اور تبھی چندر کو لگا کہ ایک عرصہ ہو گیا۔ ایک زمانہ گزر گیا۔ وہ خود اپنے سے نہیں مل پایا۔ اپنے سے باتیں کرنے کا وقت ہی نہیں ملا۔ یہ بھی نہیں پوچھا کہ آخر تیرا حال چال کیا ہے اور تجھے کیا چاہیئے؟ ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی اور اس نے ہر جمعہ کے آگے نوٹ کیا۔ خود سے ملنا ہے شام سات بجے سے نو بجے تک .... اور آج بھی تو جمعہ ہی ہے۔ یہ ملاقات آج ہی ہونی چاہیئے۔ گھڑی پر نظر جاتی ہے۔ سات بجا ہے۔ لیکن دل کا چور حاوی ہو جاتا ہے۔ کیوں نہ ٹی ہاؤس میں ایک پیالہ چائے پی لی جائے؟ نہ جانے کیوں دل اپنے سے ملنے میں گھبراتا ہے۔ رہ رہ کر کتراتا ہے

تبھی اس پار سے آتا ہوا آنند نظر آتا ہے۔ وہ اس سے کبھی نہیں ملنا چاہتا تھا۔ بڑا برا مرض ہے آنند کو۔ وہ اس جھوٹ سے بچا رہنا چاہتا ہے۔ آنند دنیا میں دوست تلاش کرتا ہے۔ ایسے دوست جو زندگی میں گہرے نہ اتریں لیکن اس کے ساتھ کچھ دیر رہ سکیں اور بات کر سکیں۔ اس کی باتوں میں عجیب سا بناوٹی پن ہے۔ وہ بناوٹی پن جو آدمی کتابوں سے سیکھتا ہے۔ اور اس کو لگتا ہے کہ وہی بناوٹی پن خود اس میں کہیں نہ کہیں ہے... جب کالج اور یونیورسٹی کی کلاسوں میں بیٹھ بیٹھ کے وہ کتابوں سے زندگیوں کی مری ہوئی تفصیلات پڑھ رہا تھا۔

اور اب آج اس کو لگتا ہے کہ وہ سارا وقت بڑی بے رحمی سے برباد کیا گیا ہے۔ اس نے ان کھنڈروں میں وقت برباد کیا ہے جن کی داستانیں نیم تعلیم یافتہ گائیڈوں کی زبان پر رہتی ہیں جو ہر بار ان مری ہوئی کہانیوں کو ہر ناظر کے سامنے دہراتے جاتے ہیں۔

یہ دیوانِ خاص ہے۔ ذرا نقاشی دیکھئے یہاں ہیرے جواہرات سے جڑا تختِ طاؤس تھا۔ یہ زنانہ حمام ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں سے بادشاہ اپنی رعایا کو درشن دیتے تھے۔ یہ محل سردیوں کا ہے یہ برسات کا اور یہ ہوادار محل گرمیوں کا اور ادھر کیجئے سنبھل کے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں پھانسی دی جاتی تھی۔

اور تب ہی ایک جوڑا اندر آتا ہے۔ عورت سجی بنی ہے اور جوڑے میں پھول بھی ہیں۔ آدمی کے چہرے پر عجیب سا غرور ہے اور دونوں فیملی والی سیٹ پر آمنے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ بیٹھنے سے پہلے ان میں کوئی تعلق نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف اتنا کہ جب عورت بیٹھنے کے لئے مڑی تھی تو ساتھ والے آدمی نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر سہارا دیا تھا۔ اتنا سا ساتھ تھا دونوں میں

ان کے پاس بھی بات کرنے کے لئے شاید کچھ نہیں۔ عورت اپنا جوڑا ٹھیک کرتے ہوئے ادروں کو دیکھ رہی ہے اور ساتھ والا آدمی پانی کے گلاس کو دیکھ رہا ہے۔ کسی کے دیکھنے میں کوئی مطلب نہیں ہے۔ آنکھیں ہیں اس لئے دیکھنا پڑتا ہے۔ اگر نہ ہوتیں تو سوال ہی نہ تھا۔ ایک جگہ دیکھتے دیکھتے آنکھوں میں پانی آ جاتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ادھر اُدھر دیکھا جائے

بیرا اُن کی میز پر سامان رکھ جاتا ہے اور دونوں کھانے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کوئی بات نہیں کرتا۔ آدمی کھا کر دانت کریدنے لگتا ہے اور وہ عورت رومال نکال کر انداز سے لپ اسٹک ٹھیک کرتی ہے۔ آخر میں بیرا آ کر پیسے لوٹاتا ہے۔ آدمی کچھ ٹپ چھوڑتا ہے۔ جسے عورت غور سے دیکھتی ہے اور دونوں لاپروائی سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر ان دونوں میں ہلکا سا سمبندھ اسے نظر آتا ہے۔ وہ آدمی ٹھٹھک کر ساتھ والی عورت کو آگے نکلنے کا اشارہ کرتا ہے اور اس کے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہے

چندر کا من اور بھاری ہو جاتا ہے۔ اکیلے پن کی گرفت اور بھی سخت ہو جاتی ہے۔ اپنے پاس بیٹھے ہوئے انجان دوست کی طرف وہ گہری نظروں سے دیکھتا ہے اور سوچتا ہے۔ اجنبی ہی سہی، لیکن اس نے پہچانا تو — اتنی پہچان بھی بڑا سہارا دیتی ہے۔

چندر کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے وہ ساتھ والا دوست کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن جیسے اسے کچھ یاد نہیں آتا۔ پھر اپنے کو سنبھال کر اس نے چندر سے پوچھا —

"آپ تو شاید کامرس منسٹری میں ہیں؟ مجھے یاد آتا ہے کہ . . . ."

کہتے ہوئے رک جاتا ہے۔ چندر کا پورا بدن جھنجھنا اٹھتا ہے۔ اور ایک گھونٹ میں بچی ہوئی کافی پی کر وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں جواب دیتا ہے —

"نہیں میں کامرس منسٹری میں کبھی نہیں تھا۔"

وہ آدمی اور قیاس کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ سیدھے سیدھے اس انجان سمبندھ کو مضبوط بناتے ہوئے کہتا ہے —

"آل رائٹ پارٹنر! پھر کبھی ملاقات ہوگی۔"

اور سگریٹ سلگاتا ہوا اٹھ جاتا ہے۔

چندر باہر نکل کر بس اسٹاپ کی طرف بڑھتا ہے۔ مدراس ہوٹل کے پیچھے بس اسٹاپ پر چار پانچ آدمی کھڑے ہیں اور پولیس والا اسٹاپ کی چھتری کے نیچے بیٹھا سگریٹ پی رہا ہے۔ چندر وہیں آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ سب جاننا چاہتے ہیں کہ بس کب تک آئے گی۔ لیکن کوئی کسی سے کچھ نہیں پوچھتا۔ پیڑ کے اندھیرے میں وہ چپ چاپ کھڑا ہے۔ نیچے پیلے پتے پڑے ہیں جو اس کے پیروں سے دب کر چرمرانے لگتے ہیں اور پیلے پتوں کی وہ آواز اسے

برسوں پیچھے کھینچے جاتی ہے ۔ اس آواز میں ایک بہت گہرا اپنا پن ہے ۔ اسے بڑی راحت سی ملتی ہے ۔ ایسے ہی پیلے پتے پڑے ہوئے تھے اس راہ پر ..... بہت سال پہلے اندرا کے ساتھ ایک دن وہ چلا جا رہا تھا ۔ کچھ بھی نہیں تھا اس کے سامنے ۔ وہ کھنڈروں میں اپنی زندگی خراب کر رہا تھا اور تب اندرا ہی نے اس سے کہا ــــ

" چندر! تم کیا نہیں کر سکتے ؟ "

وہی پہچانی ہوئی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکراتی ہے ۔ " تم کیا نہیں کر سکتے ؟ " اور یہ کہتے کہتے اندرا کی آنکھوں میں بے پناہ یقین جھلک آیا تھا ۔ اندرا کی ان پیار بھری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اس نے کہا تھا ۔

" میرے پاس ہے ہی کیا ؟ سمجھ میں نہیں آتا زندگی کہاں لے جائے گی اندرا ؟ اس لئے میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی زندگی میری خاطر بگاڑ لو ۔ پتہ نہیں کس کنارے لگوں ، بھوکا مروں ، یا پاگل ہو جاؤں ــــ "

اندرا کی آنکھوں میں پیار کے بادل اور گہرے ہو گئے تھے اور اس نے کہا تھا ــــ

" ایسی باتیں کیوں کرتے ہو چندر ، میں تمہارے ساتھ ہر حال میں سکھی رہوں گی ۔ "

چندر نے اسے بہت غور سے دیکھا تھا ۔ اندرا کی آنکھوں میں نمی آگئی تھی ۔ اس کی کٹیلی آنکھوں سے وشواس بھری معصومیت جھلک رہی تھی ۔ ماتھے پر آئی ہوئی لٹ چھونے کو اس کا دل چاہنے لگا تھا ۔ پر وہ جھجھک کر رہ گیا تھا ۔ اندرا کے کانوں میں پڑے ہوئے کنڈل پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کی طرح جھلک جاتے تھے اور تب اس نے کہا تھا ــــ

" آؤ ، ادھر پیڑ کے نیچے بیٹھیں گے ۔ "

وہ دونوں ساتھ ساتھ چل دیئے تھے ۔ سرس کے پیڑ کے نیچے ایک سمنٹ کی بنچ بنی تھی ۔ راہ پر پیلی پتیاں بکھری ہوئی تھیں ۔ ان کے کچلنے سے ایسی ہی آواز آئی تھی جیسی اس نے ابھی ابھی سنی تھی ــــ وہی پہچان بھری آواز ۔ دونوں بنچ پر بیٹھ گئے تھے اور چندر دھیرے سے اس کی کلائی پر لکیریں کھینچنے لگا تھا ۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے ، بہت سی باتیں تھیں ، جو وہ کہہ نہیں پا رہے تھے ۔ کچھ لمحہ بعد اندرا نے آنکھیں چراتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور شرما گئی تھی ، پھر اسی بات پر آگئی تھی ، جیسے اسی ایک بات میں ساری باتیں چھپی ہوں ۔

" تم ایسا کیوں سوچتے ہو چندر ، مجھ پر بھروسہ ؟ "

تب چندر نے کہا تھا ــــ

" بھروسہ تو بہت ہے اندرا ، پر میں خانہ بدوشوں کی طرح زندگی بھر بھٹکتا رہوں گا ۔ ان پریشانیوں میں تمہیں کھینچنے کی بات سوچتا ہوں تو برداشت نہیں کر پاتا ۔ تم بہت اچھی اور پر آسائش زندگی گزار سکتی ہو ۔ میں نے تو سر پر کفن باندھا ہے ۔ میرا کیا ٹھکانہ ؟ "

تم چاہے جو کچھ بنو چندر ، اچھے یا برے ، میرے لئے ایک سے رہو گے ۔ کتنا انتظار کرتی ہوں تمہارا ۔ پر تمہیں کبھی وقت ہی نہیں ملتا ۔ پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے پوچھا ــــ " ادھر کچھ لکھا ؟ "

" ہاں ۔ " آہستہ سے چندر نے کہا تھا ۔

" دکھاؤ " اندرا نے مطالبہ کیا تھا ۔

اور تب چندر نے سہمے ہوئے ہاتھوں سے ڈائری بڑھا دی تھی ۔ اندرا نے فوراً اس ڈائری کو اپنی کتابوں

میں رکھ لیا تھا اور بولی تھی ۔۔۔ "اب یہ کل ملے گی۔ اس بہانے تو اب آؤ گے۔"

"نہیں نہیں۔ میں ڈائری اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ مجھے واپس دو۔" چندر نے کہا تھا تو اندرا شیطانی سے مسکراتی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پیار کی گہرائیاں اور بڑھ گئی تھیں۔ ہار کر چندر واپس چلا آیا تھا۔ اور دوسرے دن اپنی ڈائری لینے پہنچا تھا۔ اندرا نے کہا تھا ۔۔ "اس میں کچھ میں نے بھی لکھا ہے، پڑھ کر پھاڑ دینا ضرور اسے۔"

"میں نہیں پھاڑوں گا۔"

"تو کٹی ہو جائے گی۔" اندرا نے بڑی معصومیت سے کہا تھا۔ اور اس وقت اس کے منہ سے وہ بے حد بچپنے کی بات بھی بڑی اچھی لگی تھی۔

اور ایک دن....

ایک دن اندرا گھر آئی تھی۔ ادھر ادھر سے گھوم گھام کر وہ چندر کے کمرے میں پہنچ گئی تھی۔ تب چندر نے پہلی بار اس کو بالکل اپنے پاس محسوس کیا تھا۔ اس کے ماتھے پر رنگ سے بندی بنا دی تھی۔ اور کتنی دیر تک بے خود بنا اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اور انجانے میں اس نے ہونٹ اندرا کی پیشانی پر رکھ دیئے تھے۔ اندرا کی پلکیں بند ہو گئی تھیں اور اس کے روئیں روئیں سے خوشبو پھوٹ اٹھی تھی۔ اس کی انگلیاں چندر کی باہوں پر تھر تھرانے لگی تھیں اور ماتھے پر آیا پسینہ اس کے ہونٹوں نے جذب کر لیا تھا۔ ریشمی روئیں پسینے سے چپک گئی تھیں اور کیف کے ان لمحوں میں دونوں نے عہد کیا تھا۔ وہ عہد جس میں الفاظ نہیں تھے اور ہونٹوں تک بھی نہیں آیا تھا۔ تب سے اسے یہ الفاظ ہمیشہ یاد رہتے ہیں ۔۔ "تم کیا نہیں کر سکتے؟"

اور تب ہی ایک دوسرے نمبر کی بس آتی ہے اور ٹھٹھک کر چلی جاتی ہے۔ چندر کو احساس ہوتا ہے کہ وہ بس اسٹاپ پر کھڑا ہے، وہ گہری پہچان ۔۔ کہیں کوئی تو ہے۔ اور وہ بہت دور بھی تو نہیں۔

اندرا بھی تو یہیں ہے دلّی میں۔

دو مہینے پہلے ہی تو وہ ملا تھا۔ تب بھی اندرا کی آنکھوں میں وہی چار برس پہلے کی پہچان تھی! اور اپنے پتی سے کسی بات پر کہا تھا ۔۔ "ارے چندر کی عادتیں میں خوب جانتی ہوں۔"

اور اندرا کے پتی نے کھلے دل سے کہا تھا ۔۔ "تو پھر بھائی ان کی خاطر واطر کرو۔"

اور اندرا نے مسکراتے ہوئے چار برس کے پہلے کی طرح چڑھانے کے انداز میں کہا تھا ۔۔ "چندر کو دودھ سے چڑھ ہے اور کافی انہیں دھنواں پینے کی طرح لگتی ہے، چائے میں اگر دوسرا چمچ چینی ڈال دی جائے تو ان کا گلا خراب ہو جائے گا۔" کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی اور اس بات سے اس نے پچھلی باتوں کی یاد تازہ کر دی تھی۔ سچ مچ چندر دو چمچ چینی نہیں پی سکتا۔

بس آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

کھڑے کھڑے چندر کو لگا کہ اس انجانی اور بغیر جان پہچان سے بھری نگری میں ایک اندرا ہے جو اتنے سالوں کے بعد بھی پہچانتی ہے، اب تک جانتی ہے۔ اس کا جی اندرا سے ملنے کے لئے چاہنے لگا تاکہ یہ اجنبیت کسی طرح ختم ہو۔ تبھی ایک پھٹ پھٹ والا آواز لگاتا ہوا آتا ہے "گردوارہ روڈ، قرول باغ، گردوارہ روڈ۔" چندر ایک دم آگے بڑھتا ہے اور وہ سردار کو دیکھتے ہی جیسے ایک دم پہچان جاتا ہے۔ "آئیے بابوجی قرول باغ، گردوارہ روڈ۔" اس کی آنکھوں میں پہچان کی جھلک دیکھ کر چندر کا من ہلکا ہو جاتا ہے۔ آخر ایک نے تو پہچانا۔ چندر سردار کو پہچانتا ہے

بہت بار وہ اسی سردار کی پھٹ پھٹ میں بیٹھ کر رہ کناٹ پلیس آیا ہے۔
آنکھوں میں پہچان دیکھتے ہی چندر پلٹ کر پھٹ پھٹ پر بیٹھ جاتا ہے۔ تین سواریاں اور آجاتی ہیں۔ اور دس منٹ بعد ہی گردوارہ روڈ کے چوراہے پر پھٹ پھٹ رکتا ہے۔ چندر ایک چونی نکال کر سردار کی ہتھیلی پر رکھ دیتا ہے اور پہچان بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے چلنے لگتا ہے۔
تبھی پیچھے سے آواز آتی ہے ۔ "اے بابو جی، کتنا پیسہ دیا ہے؟" چندر مڑ کر دیکھتا ہے تو سردار اس کی طرف آتا ہوا کہتا ہے ۔ "دو آنے اور دیجئے صاحب۔"
"ہمیشہ چار آنے لگتے ہیں سردار جی؟" چندر پہچان جتاتے ہوئے کہتا ہے۔ پر سردار کی آنکھوں میں پہچان کی پرچھائیں تک نہیں۔ وہ پھر کہتا ہے ۔ "سردار جی آپ کی پھٹ پھٹ پہ ہی بیسیوں بار چار آنے دے کر آیا ہوں۔"
"کسی ہور نے لئے ہوں گے چار آنے۔ اسی نے چھ آنے توں گھٹ ہیں لندے بادشاہو۔" سردار اس بار پنجابی میں بولا تھا۔ اور اس کی ہتھیلی پھیلی ہوئی تھی۔ بات دو آنے کی نہیں تھی، چندر نے باقی پیسے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے اور اندرا کے گھر کی طرف مڑ گیا۔ اور اندرا اس سے ملی تو ویسے ہی۔ وہ اپنے پتی کا انتظار کر رہی تھی۔ بڑی اچھی طرح اس نے چندر کو بٹھایا اور بولی ۔ "ادھر کیسے بھول پڑے آپ؟" پھر آنکھوں میں وہی پہچان کی پرچھائیاں تیر گئی تھیں۔ چند لمحے بعد اندرا نے کہا تھا۔ "اب تو نو بج رہے ہیں۔ یہ آٹھ ہی بجے فیکٹری بند کر کے لوٹ آتے ہیں۔ پتہ نہیں آج کیوں دیر ہو گئی۔ اچھا چائے پیو گے؟"
"چائے کے لئے انکار تو نہیں کی جا سکتی۔" چندر نے بڑی امنگ سے کہا تھا اور کرسی پر آرام سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی ساری تھکن اتر گئی تھی۔ من کا اکیلا پن ڈوب گیا تھا۔
نوکرانی آ کر چائے رکھ گئی۔ اندرا نے پیالے سیدھے کر کے چائے بنائی تو وہ اس کی بانہوں، چہرے اور ہاتھوں کو دیکھتا رہا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا ۔ ۔ ۔ ویسا ہی تھا، جانا پہچانا۔ تبھی اندرا نے پوچھا ۔ "چینی کتنی دوں؟"
ایک جھٹکے سے سب کچھ بکھر گیا۔ اس کا گلا خشک سا ہونے لگا۔ اور جسم پھر تھکن سے بوجھل ہو گیا۔ ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ پھر بھی اس نے پہچان کا رشتہ جوڑنے کی ایک ناکام کوشش کی اور بولا ۔ "دو چمچ ۔" اور اسے لگا کہ ابھی اندرا کو سب کچھ یاد آ جائے گا۔ وہ کہے گی کہ "دو چمچ چینی سے گلا خراب نہیں ہوتا؟"
پر اندرا نے پیالے میں دو چمچ چینی ڈال دی اور پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ زہر کے گھونٹوں کی طرح وہ چائے پیتا رہا۔ اندرا ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ گھر آئے کا مہمان نوازی کی بو آ رہی تھی! اور چندر کا جی چاہ رہا تھا کہ اندرا کے پاس سے کسی بھی طرح بھاگ جائے۔ اور کسی دیوار سے اپنا سر ٹکرا لے۔
جیسے تیسے اس نے چائے پی اور پسینہ پونچھتا ہوا باہر نکلا۔ اندرا نے کیا کیا باتیں کیں۔ اسے بالکل یاد نہیں۔ سڑک پر نکل کر وہ ایک گہری سانس لیتا ہے۔ اور کچھ دیر کے لئے کھڑا رہ جاتا ہے اس کا گلا بری طرح خشک ہو رہا ہے اور منہ کا مزا بے حد بگڑا ہوا ہے۔
چوراہے پر کچھ ٹیکسی ڈرائیور نشے میں گالیاں بک رہے ہیں اور ایک کتا دور سڑک پر بھاگا جا رہا ہے۔ مچھلیاں تلنے کی مہک یہاں تک آ رہی ہے اور پان والے کی دکان پر کچھ جوان لوگ کوکا کولا کی بوتلیں منہ میں لگائے کھڑے ہیں اسکوٹروں میں کچھ لوگ بھاگے جا رہے ہیں اور شہر سے دور جانے والے لوگ بس اسٹاپ پر اب بھی انتظار میں کھڑے ہیں۔ کاریں، ٹیکسیاں، بسیں اور اسکوٹر آ جا رہے ہیں۔ چوراہے پر لگی بتیوں کی آنکھیں اب بھی لال پیلی ہو رہی ہیں۔

چندر تھکا ماندہ اپنے گھر کی طرف لوٹ رہا ہے۔ انگلیوں پر جوتا کاٹ رہا ہے اور موزے کی بدبو اور بھی تیز ہو گئی ہے۔ آخر وہ تھکا ماندہ گھر پہنچتا ہے اور مہمان کی طرح کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نرملا اس کو دیکھ کر مسکراتی ہے اور دھیرے سے بانہوں پر ہاتھ رکھ کر پوچھتی ہے۔

"بہت تھک گئے؟"

"ہاں!" چندر کہتا ہے اور اس کو بہت پیار سے دیکھتا ہے۔ اس کا من اندر سے امڈ آتا ہے۔ وہ کرائے کا مکان بھی اس لمحے اس کو راحت دیتا ہے اور یوں معلوم دیتا ہے جیسے وہ اسی کا ہو۔

نرملا کھانا لگاتے ہوئے کہتی ہے "ہاتھ منہ دھو لو..."

"ابھی کھانے کا جی نہیں ہے۔" چندر کہتا ہے تو وہ بہت پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھتی ہے "کیوں کیا بات ہے؟ آج بھی تو کھا کے نہیں گئے تھے۔ دوپہر میں کچھ کھایا تھا؟"

"ہاں!" وہ کہتا ہے اور نرملا کو دیکھتا رہ جاتا ہے۔

نرملا کچھ ہچکچاتی ہے اور کچھ دیر بعد تھکی سی اس کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔

چندر کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے کمرے کی ہر چیز کو دیکھتا رہتا ہے۔ اور بیچ بیچ میں بڑی گہری نظروں سے نرملا کو تاکتا ہے۔ نرملا کوئی کتاب کھول کر پڑھنے لگتی ہے اور چندر اس کو تکے جا رہا ہے۔

پیچھے سے پڑتی ہوئی روشنی میں نرملا کے بال ریشم کی طرح چمک رہے ہیں۔ اس کی پلکیں ملائم کانٹوں کی طرح لگ رہی ہیں۔ اور کنپٹی کے قریب ریشمی بالوں کے سرے اپنے آپ گھوم گئے ہیں۔ پلک کے نیچے پڑتی ہوئی پرچھائیں بہت پہچانی سی لگ رہی ہے۔ اس نے کرتا آدھی کلائی تک سرکا لیا ہے۔

چندر کی نگاہیں اس کے اعصاب میں پرانی پہچان تلاش کر رہی ہیں۔ اس کے ناخنوں، انگلیوں اور کانوں کی گدازلویں اٹھ کر وہ پردے کھینچ دیتا ہے اور آرام سے لیٹ جاتا ہے۔ اس کو لگتا ہے جیسے وہ اکیلا نہیں ہے۔ اجنبی اور تنہا نہیں ہے۔ سامنے والا گلدستہ اس کا اپنا ہے۔ پڑے ہوئے کپڑے اس کے اپنے ہیں۔ ان کی خوشبو وہ پہچانتا ہے۔ ان سبھی چیزوں میں ایک گہری پہچان ہے۔ گھور اندھیری رات میں بھی وہ انھیں ٹٹول کے پہچان سکتا ہے۔ کسی بھی دروازے سے بغیر ٹکرائے نکل سکتا ہے۔

... تبھی زینہ پر گلاٹی کے تھکے قدموں کی کھوکھلی آہٹ سنائی پڑتی ہے اور اس کو گھبراہٹ سی ہوتی ہے۔ وہ دھیرے سے نرملا کو اپنے قریب بلاتا ہے۔ اسے لٹا کر چھاتی پر اپنا ہاتھ رکھ لیتا ہے۔

کچھ لمحوں تک وہ اس کی سانس سے زیر و بم ہوتی چھاتی کو محسوس کرتا ہے... اور چاہتا ہے کہ نرملا کے بدن کا انگ انگ اور دل کی ہر دھڑکن اس کو پہچان کی گواہی دے... گہرے خلوص اور تعلقات کا احساس دے۔

تاریکی ہی میں وہ اس کے ناخنوں کو ٹٹولتا ہے۔ اس کی پلکوں کو چھوتا ہے۔ اس کی گردن میں منہ چھپا کر کھو جانا چاہتا ہے۔ ڈھلے ہوئے بالوں کی جانی پہچانی خوشبو اس کے روئیں روئیں میں رسنے لگتی ہے اور اس کے ہاتھ پہچان کے لئے پور پور پر تھرتھراتے ہوئے سرکتے ہیں۔ نرملا کی سانس بھاری ہو آتی ہے۔

وہ اس کی گداز بانہوں کو محسوس کرتا ہے اور گول گداز شانوں پر ہاتھ سے تھپ تھپاتا چلا ہے۔ نرملا کا بدن کا انگ انگ انوکھی نسبت سے کھنچا سا آتا ہے۔ اس کا رواں رواں اس کو پہچان رہا تھا۔ جوڑ جوڑ شدید گرفت سے جکڑا ہوا تھا۔ رگ رگ کے اندر گرم خون کے دھارے دوڑ رہے تھے اور ہر سانس تازگی کھینچی جا رہی تھی۔ اعصاب اور انگلیوں کے پور پور میں ایک گہری

پہچان تھی۔

تبھی لشن کپور کی کھڑکی میں اُجالا ہوتا ہے اور دھواں سلاخوں سے لپٹ لپٹ کے گلی کی تاریکی میں ڈوبنے لگتا ہے۔ اور اس کا تنہا من تنہائیوں کو چھوڑ کے اس جاتی پہچانی خوشبو جانے پہچانے سانسوں اور پہچانے لمسوں میں ڈوبتا جاتا ہے۔ اس کو اور کچھ بھی نہیں چاہئے... جہاں پہچان کا ایک مطالبہ ہے اور اس تاریکی میں وہ سانس سے خوشبو سے تن کے ٹکڑے ٹکڑے سے پہچان چاہتا ہے۔

چاروں طرف سناٹا طاری ہے۔

اور اس خاموشی میں وہ مطمئن ہوتا ہے۔ وہ دونوں ہاتھوں میں اس کو بھر لیتا ہے۔ جوار اور اُٹھتا ہے۔ بدن کی گرمی اور بڑھتی ہے اور روئیں روئیں میں ملاپ کا ساگر لہرانے لگتا ہے۔

آہستہ آہستہ نرملا کی تیز سانسیں دھیمی پڑتی ہیں اور مقناطیسی کشش ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ کھچاؤ ٹوٹنے لگتا ہے۔ اور اعصاب کے جوار اترنے لگتے ہیں...

چندر کس کے اس کی باہوں کو جکڑے رہتا ہے... اترتا ہوا جوار اس کو پھر اکیلا چھوڑے جا رہا ہے... انجان کناروں پر چھوڑی ہوئی سیپی کی مانند۔

نرملا اپنی دبی ہوئی باہنہ نکال لیتی ہے اور گہری سانس لے کر ڈھیلی سی لیٹ جاتی ہے۔

دھیرے دھیرے سب کچھ سو جاتا ہے اور رات بہت نیچے اتر آتی ہے۔ کہیں کوئی آواز نہیں۔ کوئی آہٹ نہیں۔

آہستہ سے نرملا کروٹ بدلتی ہے اور دوسری طرف منہ کر کے گہری نیند میں ڈوب جاتی ہے۔

کروٹ بدل کے لیٹی ہوئی نرملا کو وہ کافی دیر سے دیکھتا رہتا ہے...

اور چندر پھر اپنے کو بے حد اکیلا محسوس کرتا ہے... وہ نرملا کے شانے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ چاہتا ہے کہ اس کی کروٹ بدل دے۔ لیکن اس کی انگلیاں بے جان ہو کر رہ جاتی ہیں۔ کچھ لمحہ وہ تاریکی میں ہی نرملا کو ادھر منہ کئے لیٹا ہوا دیکھتا ہے اور مایوس سا خود بھی لیٹ جاتا ہے۔ معلوم نہیں کب اس کی پلکیں جھپک جاتی ہیں۔

اور پھر بہت دیر بعد ہمسائے کا گھڑیال دو کے گھنٹے بجاتا ہے اور اس کی نیند ٹوٹ جاتی ہے۔ نیند کے خمار میں ہی وہ چونک سا پڑتا ہے۔ کمرے کی خاموشی اور ویرانی سے اس کو ڈر سا لگتا ہے۔ تاریکی میں ہی وہ نرملا کو ٹٹولتا ہے۔ تکیے پر بکھرے اس کے بالوں پر اس کا ہاتھ پڑتا ہے اور وہ ان بالوں کی چکنائی کو محسوس کرتا ہے۔ سر جھکا کے وہ انھیں سونگھتا ہے...

پھر وہ نرملا پر ہاتھ رکھتا ہے۔ اس کے گول شانوں کو چھوتا ہے۔ وہ لمس بھی پہچانا ہوا ہے... آہستہ آہستہ وہ اس کے پورے بدن کو پہچاننے کے لئے ٹٹولتا ہے اور اس کی سانسوں کی ہلکی آواز کو سننے اور پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔

نرملا اب بھی کروٹ لئے پڑی تھی وہ دھیرے سے کسمساتی ہے۔ چندر کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ کہیں نرملا جاگ نہ جائے۔ انجانے میں ہی اس لمس سے اجنبیوں کی طرح چونک نہ جائے۔

نرملا سوتے سوتے ایک مرتبہ رک رک کر سانس لیتی ہے جیسے اس کو ڈر سا لگ رہا ہو... یا کوئی خوفناک خواب دیکھ رہی ہو... چندر سہم سا رہ جاتا ہے... کیا وہ اس کے لمس کو نہیں پہچانتی؟

اور پھر وہ نرملا کو جھنجوڑ کے اٹھاتا ہے۔ "نرملا... نرملا" وہ بدحواسی میں کہتا ہے۔

نرملا چونک کر اٹھتی ہے اور آنکھیں ملتے ہوئے کھڑے ہونے کی کوشش کرتی ہے۔

اور بجلی جلا کر وہ نرملا کو دونوں کندھوں سے پکڑ کے اپنا منہ اس کے سامنے کر کے ڈری ہوئی آواز میں پوچھتا ہے۔

"مجھے پہچانتی ہو؟ مجھے پہچانتی ہو نرملا؟"
نرملا آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہ جاتی ہے۔ دھیرے سے حیرانی بھرے لہجہ میں کہتی ہے "کیا ہوا؟"
اور وہ نرملا کو تکتا رہ جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر کچھ تلاش کرتی رہ جاتی ہیں۔

...۔ آج زندگی کی سچائیاں لمحوں

میں چلتی ہیں۔ تاڑ کے پیڑوں کی

طرح حقیقتیں شانہ بہ شانہ

کھڑی ہیں۔

جس نے جتنی جھوٹی زندگی

بسر کی ہے، اتنی ہی سچائیوں

کا اس نے خون کیا ہے...

کملیشور

کملیشور

گرمیوں کے دن

چُنگی دفتر خوب رنگا چُنگا ہے۔ اسکے دروازے پر سات رنگ ڈیزائن کے بورڈ لگے ہیں۔ سید علی پینٹر نے بڑے فنکارانہ انداز میں بورڈ بنائے ہیں۔ دیکھتے دیکھتے شہر میں بہت سی دکانیں ہوگئی ہیں۔ جن پر سائن بورڈ لٹک گئے ہیں۔ سائن بورڈ لگانا گویا اپنی وقعت میں اضافہ کی دلیل اور علامت بن چکا تھا۔ بہت دن پہلے جب دینا ناتھ حلوائی کی دکان پر سائن بورڈ لگا تھا تو وہاں دودھ پینے والوں کی تعداد یکایک بڑھ گئی تھی پھر تو گویا سیلاب آگیا اور نئے نئے طریقے اور بیل بوٹے ایجاد کئے گئے۔ "ॐ" یا "جے ہند" سے شروع ہو کر "ایک بار ضرور آزمائیے" یا "ملاوٹ ثابت کرنیوالے کو ایکسو روپے نقد انعام" کی تحریروں اور للکاروں پر تحریروں یا سائن بورڈوں کی عبارت کا خاتمہ بالخیر ہونے لگا۔

چُنگی دفتر کا نام تین زبانوں میں لکھا ہے۔ چیئرمین صاحب بڑے عقلمند آدمی ہیں۔ انکی سوجھ بوجھ کا ڈنکا بجتا ہے۔ اس لئے ہر سائن بورڈ ہندی، اردو اور انگریزی میں لکھا جاتا ہے۔ دُور دُور کے نیتا لوگ بھاشن دینے آتے ہیں۔ دیس بدیس کے لوگ آگرہ کا، تاج محل دیکھ کر پورب کی طرف آتے ہوئے یہیں سے گزرتے ہیں۔ ان پر اثر پڑتا ہے بھائی اور پھر موسم کی بات۔ میلے، تماشوں کے دنوں میں حلوائی، جولائی، اگست میں کتاب، کاغذ والوں، تیوہاروں میں کپڑے والوں اور خراب موسم میں وید اور حکیموں کے سائن بورڈوں پر نیا رنگ روغن چڑھتا ہے۔ خالص دیسی گھی والے سب سے اچھے، جو چھپروں کے اندرونی حصوں کی دیواروں پر چاک (کھریا) پنسل یا پتھر کے ٹکڑوں سے لکھ کر کام چلا لیتے ہیں۔ اس کے بغیر کام نہیں چلتا۔ اہمیت جتاتے ہوئے وید جی نے کہا۔ بغیر پوسٹر چپکائے سینما والوں کا کام بھی نہیں چلتا۔ بڑے بڑے شہروں میں جائیے تو مٹی کے تیل بیچنے والے کی دکان پر بھی سائن بورڈ مل جائیگا۔ بڑی ضروری چیز ہے۔ بال بچوں کے نام تک "سائن بورڈ" ہیں، ورنہ نام رکھنے کی ضرورت کیا ہے؛ سائن بورڈ لگا کر سکھدیو بابو کمپاؤنڈر سے ڈاکٹر ہوگئے۔ بیگ لے کر چلنے لگے۔

پاس بیٹھے رام چرن نے ایک اور نئے چمتکار کی خبر دی۔ "ارے کل انھوں نے "بھدئی والا" تانگہ گھوڑا خرید لیا ہے؛

ہانکے گا کون؟ ـــ رتن کی کرسی پر بیٹھے پنڈت جی نے پوچھا۔

"یہ سب جیب کاٹنے کے طریقے ہیں"۔ وید جی کا دھیان "ایکے" کی طرف زیادہ تھا۔ "مریض سے کرایہ وصول کرینگے۔ سائیس کو بھی بخشش دلائینگے، بڑے شہروں کے ڈاکٹروں کی طرح۔ اس سے پیشے کی بدنامی ہوتی ہے۔ پوچھو کہ مریض کا علاج کرنا ہے کہ رعب و مرتبہ دکھانا ہے۔ انگریزی آلے لگا کر مریض کی آدھی جان تو پہلے ہی خشک کر دیتے ہیں۔ آیورویدک طریقے سے نبض دیکھنا تو دُور، چہرہ دیکھ کر مرض بتا دیجیے! تانگہ، گھوڑا اس میں کیا کریگا؟۔ تھوڑے دن بعد دیکھنا، ان کا سائیس، کمپاؤنڈر ہو جائیگا"۔ یہ تقریر جھاڑ کر وید جی بڑی کمینہ ہنسی ہنسے اور پھر بول پڑے۔ "کوئی کیا کہے بھئی، ڈاکٹری تو تماشہ بن

گئی ہے۔ وکیل مختار کے لڑکے ڈاکٹر ہونے لگے۔ بات تو خون اور تربیت سے بنتی ہے، تبھی ہاتھ میں اثر آتا ہے۔ وید کا بیٹا ہی وید ہوتا ہے۔ آدھی جانکاری تو بچپن میں جڑی بوٹیاں کوٹتے، پیستے آجاتی ہے۔ تولہ، ماشہ، رتی کا ایسا اندازہ ہو جاتا ہے کہ دوائیں کم زیادہ ہو ہی نہیں سکتیں، دواؤں کا جادو اس کے بنانے کی ترکیب میں ہے دھنونتری"۔ ویدجی کچھ اور کہنے جا رہے تھے کہ ایک شخص کو دکان کی طرف آتا دیکھ کر چپ ہو گئے اور بیٹھے ہوئے لوگوں کی طرف کچھ اس طرح دیکھنے اور گھورنے لگے، جیسے یہ سب گپ شپ میں وقت برباد کرنے والے نہیں، ان کے مریض ہیں۔

اس شخص کے دکان پر چڑھتے ہی ویدجی نے بھانپ لیا، مایوس ہو کر انھوں نے اسے دیکھا اور اداس ہو گئے لیکن دنیا میں دکھاوا بھی کچھ اثر رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کل یہی آدمی بیمار پڑ جائے یا اس کے گھر کے دوسرے کسی فرد کو کوئی مرض آ دبوچے، اس لئے اپنا برتاؤ درست اور پیشے میں بڑا پن برقرار رکھنا چاہئے، یہ سوچ کر انھوں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا:۔ "کہو بھائی اچھے تو ہو؟"۔ اس شخص نے رسمی جواب دیتے ہوئے ایک کنستر سامنے کر دیا اور بولا:۔ "یہ ٹھاکر صاحب نے بھجوایا ہے۔ اسے رکھئے، وہ ایک ڈیڑھ بجے کے قریب منڈی سے لوٹتے ہوئے اسے لیتے جائیں گے"۔

"اس وقت دکان بند رہیگی"۔ ویدجی نے اس بیگار سے جھلّا کر کہا۔ "حکیم ویدوں کی دکانیں دن بھر نہیں کھلی رہتیں بیلپاری، تھوڑے ہی ہیں بھائی"۔ لیکن ایک دم خیال آیا اور کسی دوسرے دن اور موقع کی اُمید نے جیسے زبردستی کہلوایا:۔ "خیر انھیں دقت نہیں ہوگی، ہم نہیں ہونگے تو بغل والی دکان سے اٹھا لینگے، میں رکھتا جاؤں گا"۔

اس شخص کے جاتے ہی ویدجی نے پھر "چھان پھٹک" شروع کر دی، کہنے لگے "شراب بندی سے کیا ہوتا ہے؛ جب سے ہوئی ہے تب سے کچّی شراب کی ناجائز بھٹیاں گھر گھر چالو ہو گئی ہیں۔ اس گھی کے بھاؤ بکنے لگا ہے اور ان ڈاکٹروں کو کیا چاہئے ان کی دکانیں بڑھ گئی ہیں۔ لائسنس ملتا ہے دوا کی طرح استعمال کرنے کا۔ لیکن دھنجر کھلے عام فروخت ہوتا ہے۔ کہیں کچھ نہیں ہوتا، ہم بھنگ، افیم کی ایک پڑیا چاہیں تو تفصیل دینی پڑتی ہے"۔

"ذمّہ داری کی بات ہے"۔ پنڈت جی بولے۔

"اب ذمّہ دار وید ہی رہ گئے ہیں، سب کی تو رجسٹری ہو چکی بھائی! ایرے غیرے، پنچ کلیانی جتنے گھس آئے تھے، ان کی صفائی ہو گئی، اب جس کے پاس رجسٹری ہوگی، وہی وید کا پیشہ کر سکتا ہے، چورن فروش تک وید بن بیٹھے تھے۔ سب ختم ہو گئے۔ لکھنؤ میں صحیح جانچ پڑتال کے بعد رجسٹری ہوتی ہے"۔

ویدجی کی باتوں سے اُکتا کر پنڈت جی اٹھ گئے، ویدجی نے اندر کی طرف قدم بڑھائے اور دواخانے کے بورڈ لکھنے والے چندر سے بولے۔ "سفیدہ گاڑھا ہے بابو، تارپین ملا لو"۔ اور پھر خود ہی ایک بوتل اٹھا لائے جس پر "اشوکارشٹ" کا لیبل تھا۔

اسی طرح نہ جانے کن کن دواؤں کی جسم نما بوتلوں میں کس کس کی روح بھری ہے۔ سامنے کی اکیلی الماری میں بڑی بڑی بوتلیں رکھی ہیں، جن پر مختلف ادویات کے نام کے لیبل اور چٹ چپکی ہوئی ہیں، صرف پہلی قطار میں شیشیاں کھڑی ہوئی ہیں۔۔۔۔ ان کے پیچھے ضرورت کے اور سامان ہیں۔ سامنے کی میز پر سفید شیشیوں کی ایک قطار ہے۔ جس میں کچھ ذائقہ دار چورن، لون بھاسکر وغیرہ ہیں، باقی میں جو کچھ بھی بھرا ہے اسے ویدجی جانتے ہیں!۔

تارپین کا تیل ملا کر چندر لکھنے لگا "پروفیسر کوی راج نتیانند تیواری"۔ اوپر کی سطر میں "شری دھنونتری اوشدھالیہ" خود ویدجی لکھ چکے تھے۔ سفیدی کے حروف ایسے لگ رہے تھے جیسے روئی کے پھاہے چپکا دئے گئے ہوں، اوپر خالی جگہ دیکھ کر ویدجی

بولے۔ "بابو اوپر 'رجے ہند' لکھ دینا اور یہ جو جگہ بچ رہی ہے اس میں ایک طرف ذرا اچھا سو کی بوتل بنا دینا اور دوسری طرف کھرل کی تصویر کاڑھ دینا" پھر بولے۔ "چندر بابو! آرٹ ہمارے پاس مڈل تک تھا۔ لیکن یہ تو مشق اور ہاتھ منجھنے کی بات ہے۔"

چندر بھی تنگ آ گیا تھا۔ سوچنے لگا، خواہ مخواہ پکڑا گیا۔ لکھائی اچھی ہونے کا یہ انعام اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا بولا۔ "کسی پینٹر سے بنوا لیتے۔ اچھا خاصا لکھ دیتا۔ میری لکھائی میں شاید وہ بات نہیں آئیگی؟"

اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے اس نے برش نیچے رکھ دیا۔

"پانچ روپے مانگتا تھا بابو . . . . دو لائن کے ۵ روپے! اپنی محنت کے ساتھ یہ سائن بورڈ دس بارہ آنے کا پڑا۔ یہ رنگ ایک مریض دے گیا۔ بجلی کمپنی کا پینٹر، بدہضمی سے پریشان تھا۔ دو خوراکیں بنا کر دیدیں۔ پیسے نہیں لئے چنانچہ وہ دو تین قسم کے رنگ اور تھوڑی سی وارنش دے گیا۔ دو صندوق رنگے جا چکے تھے۔ یہ بورڈ بھی بن گیا اور ایک آدھ کرسی بھی رنگ جائیگی۔ تم بس اتنا لکھ دو۔ لال رنگ کا شیڈ ہم دیتے رہیں گے . . . . حاشیہ ترنگا کھلیگا؟ ویدجی نے پوچھا اور خود ہی منظوری بھی دیدی۔

چندر گرمی سے پریشان تھا۔ جیسے جیسے دوپہر قریب آتی جا رہی تھی، سڑک پر دھول اور لو کا زور بڑھتا جا رہا تھا۔ تکلف میں چندر کچھ بول نہیں پا رہا تھا۔ حالانکہ اس کا جی یہی چاہ رہا تھا کہ ویدجی کا بورڈ نہ لکھے۔ پنکھے سے اپنی پیٹھ کھجلاتے ہوئے ویدجی نے اُجرت کے کام والے، پٹواریوں کے بڑے بڑے رجسٹر پھیلانا شروع کیا۔

سورج کی حدت۔ اور تپش سے بچنے کے لئے دکان کا ایک کواڑ بھیڑ کر ویدجی خالی رجسٹروں پر "خسرہ کھتونیاں" منتقل کرنے لگے۔ چندر نے اپنا پیچھا چھڑانے کے لئے پوچھا "یہ سب کیا ہے ویدجی؟"

ویدجی کا چہرہ اتر گیا۔ بولے "خالی بیٹھنے سے اچھا ہے کہ کچھ کام کیا جائے، نئے لیکھ پالوں کو کام دھام آتا نہیں روز ہی قانون گو، یا نائب صاحب کی ڈانٹ پھٹکار سنتے ہیں۔ جھک مار کر ان لوگوں کو یہ کام اجرت پر کرانا پڑتا ہے، اب وہ پرانے گھاگ پٹواری کہاں رہے، جن کے پیٹ میں قانون بسا ہوتا تھا۔ روٹیاں چھن گئیں بیچاروں کی۔ لیکن سچ پوچھو تو اب بھی سارا کام پرانے پٹواری ہی ڈھو رہے ہیں نئے لیکھ پالوں کی تنخواہوں کا سارا روپیہ اسی اجرت میں نکل جاتا ہے۔ پیٹ تو ان کا بھی ہے . . . . اُلٹا سیدھا کر کے کسانوں سے نکال لاتے ہیں۔ نہ لائیں تو کھائیں کیا؟ دو تین لیکھ پال اپنے ہیں ان ہی سے کبھی کبھار ہلکا بھاری کام مل جاتا ہے۔ منتقلی کا کام۔ رجسٹر بھرتے ہیں۔"

باہر سڑک ویران ہوتی جا رہی تھی۔ دفتر کے بابو لوگ جا چکے تھے۔ سامنے چُنگی میں خس کی ٹٹیوں پر چھڑکاؤ، شروع ہو گیا تھا دور سے لو کے ساتھ پیپل کے شور کی آواز آ رہی تھی۔ تب ہی ایک آدمی نے کواڑ سے اندر جھانکا۔ ویدجی کی بات جو شاید لمحہ دو لمحہ کے بعد درد سے بوجھل ہو جاتی، رک گئی۔ ان کی نگاہ نے آدمی کو پہچانا اور وہ سنبھل گئے، فوراً بولے۔ "ایک بورڈ آگرہ سے بنوایا ہے، جب تک وہ نہیں آ جاتا، اسی سے کام چلیگا۔ فرصت کہاں ملتی ہے جو ان سب بکھیڑوں میں پڑیں اور پھر ایک دم مصروفیت کے انداز میں انھوں نے اس آدمی سے سوال کیا۔ "کہو بھائی کیا بات ہے؟"

"ڈاکٹری سرٹیفکیٹ چاہئے، کوسما اسٹیشن پر خلاصی ہوں صاحب۔" ریلوے کی نیلی وردی پہنے ہوئے خلاصی نے اپنی غرض و غایت بتائی۔

اس کی ضرورت کا پورا اندازہ کرتے ہوئے ویدجی بولے۔ "ہاں! کس تاریخ سے کب تک کا چاہئے؟"

"پندرہ دن پہلے آئے تھے صاحب، سات دن کا اور دیدیجئے۔"

کچھ حساب جوڑ کر ویدجی بولے "دیکھو بھائی، سرٹیفکیٹ پکا کر کے دینگے، سرکاری رجسٹر نمبر دینگے اور چار روپے لینگے"۔ ویدجی نے جیسے خود چار روپے پر اس کے بھڑک جانے کا احساس کرتے ہوئے کہا "اگر پچھلا نہ لو تو دو روپے میں کام چل جائیگا"۔ خلاصی مایوس ہو گیا۔ لیکن اس کی مایوسی سے زیادہ ملال ویدجی کے پسینے میں بھیگے چہرے پر ظاہر ہو گیا۔ بڑی لجاجت سے خلاصی بولا "سوبرن سنگھ نے آپ کے پاس بھیجا تھا۔ اس کے کہنے سے کچھ ایسا لگا جیسے یہ اس کا کام نہ ہو، سوبرن سنگھ کا کام ہو۔ مگر ویدجی نبض پر ہاتھ رکھ چکے تھے۔ بولے "وہ تو ہم پہلے ہی سمجھ رہے تھے۔ بغیر جان پہچان کے ہم سرٹیفکیٹ دیتے بھی نہیں، عزت کا سوال ہے ہمیں کیا معلوم تم کہاں رہے؟ اب سوچنے کی بات ہے؟... اعتبار کر کے یہ خطرہ بھی مول لینگے۔ پندرہ دن پہلے سے تمہارا نام رجسٹر پر چڑھا لینگے۔ مرض کیا تھا وہ درج کر لینگے، ہر تاریخ کے آگے نام لکھیں گے، تب جا کر بات بنیگی، گھر کی کھیتی نہیں ہے..." کہتے کہتے انہوں نے چندر کی طرف مدد کیلئے دیکھا، چندر نے بھی بات نبھاتے ہوئے کہا۔ "سچ تو ہے، اب انھیں کیا پتہ کہ تم بیمار رہے کہ ڈاکہ ڈالتے رہے... سرکاری معاملہ ہے"...

"پانچ سے کم میں دنیا کا کوئی ڈاکٹر نہیں دے سکتا؟... یہ کہتے کہتے ویدجی نے سامنے لکھا لیکھا پال والا رجسٹر کھسکاتے ہوئے جوش میں کہا "ارے دم مارنے کی فرصت نہیں ہے، یہ دیکھو۔ دیکھتے ہو نا... مریضوں کو چھوڑ کر سرکار کو دکھانے کیلئے یہ تفصیل دار رجسٹر بنانے پڑتے ہیں۔ ایک ایک مریض کا نام، مرض، آمدنی.... ان ہی میں تمہارا نام چڑھانا پڑیگا۔ اب بتاؤ کہ مریضوں کو دیکھنا ضروری ہے کہ دو چار روپے کیلئے سرٹیفکیٹ دیکر اس سرکاری "جھگڑے" میں پھنسنا" یہ کہتے ہوئے انھوں نے تفصیل والا رجسٹر ایک جھٹکے سے بند کر کے سامنے سے ہٹا دیا اور صرف لعاب کرنے کیلئے تیار ہونے جیسی صورت بنا کر قلم سے کان کریدنے لگے۔

ریلوے کا خلاصی ایک منٹ تک تو بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ پھر ویدجی کو سر جھکائے اپنے کام میں مشغول دیکھ کر دکان سے نیچے اتر گیا۔ ایک دھچکا سا لگا اور ویدجی نے اپنی غلطی محسوس کی۔ انھیں احساس ہو گیا کہ انھوں نے بات غلط جگہ توڑ دی اور ایسے توڑی کہ ٹوٹ گئی۔ کچھ فوری طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آیا تو اسے پکار کر بولے۔ "ارے سنو! ٹھاکر سوبرن سنگھ سے ہمارا "جے رام جی" کہدینا۔ ان کے بال بچے تو اچھے ہیں نا؟"

"ہاں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔" رک کر خلاصی نے کہا۔

اسے سنانے کیلئے ویدجی نے چندر سے کہا" دس گاؤں چھوڑ کر سوبرن سنگھ علاج کیلئے یہیں آتے ہیں اور یہی بات تو یہ ہے بھائی کہ ہم بھی ان کیلئے ہمیشہ حاضر ہے"۔ چندر نے ورڈ پر آخری حرف پورا کرتے ہوئے پوچھا... "چلا گیا کیا؟"

"ارے لوٹ کے پھر یہیں آئیگا" ویدجی نے جیسے اپنے کو سمجھایا اور اس کے لوٹ کے آنے کے یقین کو پکا کرتے ہوئے بولے "گاؤں کے وید اور وکیل ایک ہی ہوتے ہیں۔ سوبرن سنگھ نے اگر ہمارا نام لیا ہے تو وہ ضرور واپس آئیگا۔ گاؤں والوں کی سمجھ ذرا مشکل سے کھلتی ہے۔ کہیں بیٹھ کے سوچیگا، سمجھیگا، تب آئیگا"۔

"اور کہیں سے لے لیا تو؟" چندر کے لہجے میں تشویش تھی۔

مگر ویدجی نے جھٹ بات کاٹتے ہوئے کہا "نہیں بابو۔ ایسا نہیں ہوگا" اور پھر بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "وہ بھئی! چندر بابو! سائن بورڈ بچ گیا... کام چلیگا۔ یہ پانچ روپے جو میں پینٹر کو دیتا، مریضوں سے وصول کرنے پڑتے۔ تانگہ گھوڑا اور یہ خرچ! بات ایک ہے۔ چاہے ناک سامنے سے پکڑ لو، چاہے گھما کر۔ سید علی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بورڈ مریضوں کو اچھا تو نہیں کر دیتا۔ اپنی اپنی سمجھ کی بات ہے" کہتے ہوئے وہ دھیرے سے ہنس پڑے۔ پتہ نہیں، وہ اپنی بات سمجھ کر اپنے آپ پر ہنسے تھے یا دوسروں پر!۔

اسی وقت ایک شخص آیا۔ ایسا لگا کہ خلاصی آگیا، مگر وہ پانڈو مریض تھا۔ دیکھتے ہی ویدجی کا چہرہ پرسکون ہوگیا۔ وہ اندر گئے اور ایک تعویذ لاتے ہوئے بولے "اب اس کا اثر دیکھنا۔ بیس پچیس روز میں ہی اس کا چمتکار ظاہر ہوجائیگا۔ پانڈو مریض کے بازو پر تعویذ باندھ کر اور اس کے کچھ آنے اور پیسے جیب میں ڈال کر ویدجی قدرے گمبھیر سے ہوکر بیٹھ گئے۔ مریض جب چلا گیا۔ تو بولے "یہ علم بھی میرے پتاجی کے پاس تھا۔ ان کی لکھی کتابیں پڑی ہیں۔ بہت سوچتا ہوں، انھیں پھر سے نقل کرلوں ... بڑے تجربے کی باتیں ہیں۔ اعتقاد کی بات ہے بابو۔ اکہ ایک چٹکی دھول سے آدمی اچھا ہوسکتا ہے۔ ہومیوپیتھک اور بھلا ہے کیا؟ ایک چٹکی شکر۔ جس پر بھروسہ ہوجائے اور بس!"

چندر نے جاتے جاتے کہا۔ "اب تو دواخانہ بند کرنے کا وقت ہوگیا۔ کھانا کھانے نہیں جائیے گا؟"

"تم چلو، ہم پانچ دس منٹ بعد آئینگے" ویدجی نے تحصیل والا کام اپنے آگے سرکا لیا۔ دکان کا دروازہ بھیڑ کر بیٹھ گئے۔ باہر دھوپ کی طرف دیکھنے سے آنکھیں چندھیاتی تھیں،

بغل والے دکاندار بچن لال نے دکان بند کرکے، گھر جاتے ہوئے ویدجی کی دکان کھلی دیکھ کر پوچھا "آپ کھانا کھانے نہیں گئے؟"

"ہاں، ایسے ہی ایک ضروری کام ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں چلے جائینگے" ویدجی نے کہا اور زمین پر چٹائی بچھائی، کاغذ اور رجسٹر میز سے اٹھا کر نیچے پھیلالئے۔ لیکن گرمی تو گرمی! پسینہ رکتا ہی نہیں تھا۔ رہ رہ کر پنکھا جھلتے، پھر نقل کرنے لگتے۔ کچھ دیر تو جبر کرکے کام کیا، پھر ہمت چھوٹ گئی۔ اٹھ کر پرانی دھول پڑی شیشیاں جھاڑنے لگے۔ انھیں قطار سے قرینے سے رکھا۔ لیکن گرمی کی دوپہر۔ وقت جیسے رک گیا تھا۔ ایک بار انھوں نے کواڑوں کے درمیان سے منہ نکال کر دیکھا۔ سڑک پر نظر دوڑائی۔ ایک آدھ لوگ نظر آئے۔ ان آتے جاتے لوگوں کی موجودگی سے جیسے ڈھارس بندھ گئی۔ اندر آئے۔ بورڈ کا تار سیدھا کیا اور اسے دکان کے سامنے لٹکا دیا۔ "دھنونتری اوشدھالیہ" کا بورڈ دکان کی گردن میں تعویذ کی طرح لٹک گیا۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔ آخر انہوں نے ہمت کی۔ ایک لوٹا پانی پیا اور جانگھوں تک دھوتی سرکا کر مستعدی سے کام میں جٹ گئے۔ باہر کچھ آہٹ ہوئی تعجب سے انہوں نے دیکھا۔

"آج آرام کرنے نہیں گئے ویدجی؟" گھر جاتے ہوئے جان پہچان کے ایک دکاندار نے پوچھا۔

"بس جانے کی سوچ رہا ہوں۔ کچھ کام بچ گیا تھا، سوچا کرتا چلوں"۔۔ یہ کہکر ویدجی دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گئے۔ کرتا اتار کر، ایک طرف رکھ دیا۔ اکہری چھت کی دکان، آنچ سے تپ رہی تھی۔ ویدجی کی آنکھیں نیند سے بری طرح بوجھل ہورہی تھیں۔ ایک جھپکی آگئی۔ کچھ وقت ضرور بیت گیا تھا۔ نہیں رہا گیا تو رجسٹروں کا تکیہ بنا کر انھوں نے کمر سیدھی کی۔ مگر نیند آتی اور پھر اچٹ جاتی۔ نہ جانے کیا ہوگیا تھا۔

اچانک ایک آہٹ نے انھیں چونکا دیا۔ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بچن لال دوپہر کے کھانے اور لوٹ پوٹ لینے کے بعد واپس آگیا تھا

"ارے! آج آپ ابھی تک گئے نہیں؟" اس نے پوچھا۔

ویدجی بولے۔ "نہیں" اور زور زور سے پنکھا جھلنے لگے۔ بچن لال نے دکان سے اترتے ہوئے پوچھا۔ "کسی کا انتظار ہے کیا؟"

"ہاں! ایک مریض آنے کو کہہ گیا تھا... ابھی تک آیا۔ ۔ ۔" ویدجی نے بچن لال کو جاتے دیکھا تو جملہ ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ چپ ہوگئے اور پسینہ پونچھنے لگے۔

★ ★

کملیشور

برِج کینڈی

"اس رات وہ مجھے بریچ کینڈی پر ملی تھی اور تعجب کی بات یہ کہ دوسری صبح سورج پچھم سے نکلا تھا۔"

سچ مچ یہ عجیب کی بات تھی، بارش میں مچھیرے سمندر میں نہیں جاتے اور وہ بھی رات میں، رات بھیگی اور گہری تھی۔ بہت گہری کالی نہیں۔ بمبئی میں راتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ دھندلا دھندلا سب کچھ نظر آتا رہتا ہے۔ بارش میں تو دھرتی آکاش کا الگ ہونا پتہ ہی نہیں چلتا، جیسے سب ایک ہو جاتا ہے۔

دور جہاں سمندر سلیٹی لکیر کی طرح منزلوں سے جا ملتا ہے۔ وہاں پر کچھ روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں بجھتی جلتی۔ جیسے کوئی ناویں سمندر پر ہوں اور کوئی سگنل دے رہی ہو۔ لیکن روشنیوں کے جلنے بجھنے کا کوئی خاص مطلب نہیں تھا۔ وہ بس ٹمٹماتی تھیں اور بجھ جاتی تھیں۔ رات میں تو سمندر اور آکاش اور بھی ایک ہو جاتے ہیں۔ گہرا سلیٹی پھیلاؤ، پہاڑیوں کے پاس سے شروع ہو کر دھنسی کر گندے لحاف کی طرح پلٹ کر اوپر آ جاتا ہے۔ موسلا دھار برستے پانی کی طرح پانی کے موتی کی طرح جھلملاتی ڈوریاں، آکاش سے سمندر تک تنی رہتی ہیں۔ سمندر کی کوئی لہر اونچی اٹھتی ہے، تو لگتا ہے کسی پیراشوٹ کا کونا ہواؤں میں پھڑپھڑا رہا ہے۔ الٹا گرا ہوا پیراشوٹ۔

اس وقت آدھی رات تھی۔ مالابار ہل کے پیچھے مکان، بحیرۂ عرب میں جہاز کی طرح کھڑے تھے۔ لنگر ڈالے ہوئے، مطمئن، چھوٹے، اونچے اور اونچے جہاز! اُن سے چھن کر آتی ہوئی روشنی کی سنہری، دودھیا دھول۔ کھڑکیاں، کھڑکیاں، کھڑکیاں۔ روشنی کے چوکور ٹکڑے۔ روشنی کے چوکور ٹکڑے، سنہری دودھیا دھول، سنہری دودھیا دھول، دودھیا دھول، تیز ہوائیں اوپر اٹھتی ہوئی، اڑتی ہوئی بارش۔ عمارتوں کی اوپری منزلوں سے چھنتے بھیگے دوپٹے کی طرح لپٹی اڑتی ہوئی اور اس بھیگے دوپٹے سے ریت کے ذرّوں کی طرح جھڑتی پھوار۔ نیچے صرف ہوا کا جھونکا جیسے بگولے کبھی کبھی سینے میں اٹھتے ہول۔

سمندر کی اپنی ایک آواز ہوتی ہے۔ گھگھراتی ہوئی۔ تھرتھراہٹ سے بھری۔ جیسے آدمی کے سینے میں ہوتی ہے۔ کان لگا کر سنو تو سنائی دیتی ہے۔ سمندر اسی طرح بول رہا تھا۔ ساتھ میں ہوا کی سنسناہٹ، چٹانوں پر پچھاڑ کھاتی لہریں، لہریں، لہریں، حد نظر تک پھیلی ہوئی آسمان تک جاتی ہوئی کھڑکیوں کی سیڑھی۔ پاس میں انھیں سہارا دیئے بند دروازے۔ دروازے۔ دروازے۔ انجلی کی طرح نکلے پھیلے ہوئے بارجے، بارجے، بارجے۔ تازیوں کی طرح کندھوں پر سیدھی عمارتیں، عمارتیں، عمارتیں۔

سمندر پر ٹمٹماتی، بجھتی روشنیوں سے لگتا تھا کہ کچھ ناویں وہاں ہیں۔ تین یا چار یا زیادہ۔ لائٹ ہاؤس کی بیم دو ایک چکر کھا کر بجھ گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا۔ عرب ساگر سے اس وقت کوئی جہاز بھی اب آنے والا نہیں تھا۔ تب وہ ناؤ والے ہرہراتے سمندر پر کیا کر رہے تھے؟ برسات میں تو مچھیرے بھی جال ڈالنے نہیں جاتے۔ ناؤں کا کوئی مددگار بیڑا ہوتا تو لائٹ ہاؤس کی روشنی چکر کاٹتی رہتی۔ ایسی تیز بارش میں کون جاتا ہے سمندر پر۔!

بارش کی ہلکی روشنی کا احساس چاروں طرف بھرا ہوا تھا۔ بس بریچ کینڈی کی بڑی خالی بنچیں آئسکریم کی طرح،

رس رہی تھیں، چمکتی اور برستی ہوئی چٹانوں پر لہریں ٹوٹ رہی تھیں۔ بھیگی ہوئی سڑک پر کوئی نہ تھا۔ ایک ٹیکسی تک نہیں۔ سمندر، بارش اور عمارتوں کا سناٹا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ تبھی کیمپس کارنر کی طرف سے ایک ٹیکسی کی روشنیاں چمکی تھیں، پٹرول پمپ کے پاس ٹیکسی ادھر ہی آ رہی تھی۔ سڑک چمکیلی ہو رہی تھی۔ رفتار تیز ہو تو سڑک چرچراتی ہے۔ ٹیکسی کی روشنی میں بارش چھنتے ہوئے پردے کی طرح چمک رہی تھی، پردہ اٹھتا ہوا ادھر ہی چلا آ رہا تھا۔ یکایک ٹیکسی بریک لگاتی ہے۔ وہ ملک بودھ کے پاس رکتی ہے۔ روشنیاں بجھتی ہیں اور بارش کا پردہ ہلکے سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ کچھ پتہ نہیں لگتا اس میں کون ہے۔ ڈرائیور تو ہوگا ہی۔ کچھ لمحوں بعد ہی دروازہ کھلا اور ایک آدمی برساتی ڈالے ہوئے اترا۔ پھر ایک عورت نکلی۔ آدمی نے برساتی کا ایک پلّہ ڈال کر اس عورت کو چھپانا چاہا۔ عورت نے برساتی کا کنارہ کاندھے پر کھینچ لیا۔

جہاں وہ اترے تھے، وہاں کوئی عمارت بھی نہیں تھی۔ ٹیکسی یکایک رکی تھی۔ جیسے وہاں رکنے کا پہلے سے کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ دونوں ہی یہاں کے نہیں تھے، ہوتے تو گھر کے پاس اترتے۔ تیز بارش میں کھلی سڑک پر کون اترتا ہے۔ ٹیکسی بل کھا کر وارڈن روڈ کے موڑ پر چلی گئی۔ شاید ان دونوں کو کہیں اور جانا تھا، لیکن وہ یہاں اتر گئے تھے۔

عورت برساتی سے آدھی باہر تھی۔ آدمی بھی جیسے برساتی میں چھپنا نہیں چاہتا تھا۔ پہلی بوچھار جھیلنے کی شاید ایک عادت بھر تھی یا اسے آسان بنا لینے کا طریقہ۔

ناؤں کی روشنیاں اسی طرح جل بجھ رہی تھیں۔ لیکن اب کچھ نزدیک لگ رہی تھیں۔ جیسے وہ کنارے کی طرف آ رہی ہوں۔ یا شاید یہ بھرم ہی تھا کہ وہ لوٹ رہی ہیں۔ لہریں۔ لہریں۔ لہریں۔ اسی طرح چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں نزدیک سمندر کی سطح سے کچھ لہریں جیسے بیلا، چمیلی کے پھولوں کے ڈھیر کے ڈھیر لئے بھاگتی ہوئی آتی تھیں اور چٹانوں پر انڈیل کر غوطہ لگاتی تھیں۔ چٹانوں کی گود میں پھول بکھر جاتے تھے۔ پھر پتہ نہیں کہاں چلے جاتے تھے۔ چٹانیں گیلی گود لئے بیٹھی رہتی تھیں۔ لہریں، لہریں، لہریں۔ گود بھرے سفید پھول، سفید پھول، سفید پھول۔

اب وقت کچھ اور گزر گیا تھا۔ کھڑکیوں کی چوکور روشنی، چوکور روشنی۔ پھر اندھیرا، اندھیرا، اندھیرا۔ پھر ایک چوکور روشنی۔ بیچوں بیچ آسمان میں سنسناتی ہوا اور سُروں کی طرح ... اتار چڑھاؤ سی تھرکتی بارش۔

آدمی اور عورت بریچ کینڈی پر پڑی بنچوں میں سے ایک کے پاس رک گئے تھے۔ کچھ دیر تک وہ ہہراتے سمندر کو کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر آدمی نے برساتی بنچ پر پھیلا دی۔ عورت بھیگتی کھڑی رہی۔ آدمی ایک لمحے بعد بنچ کے کونے پر بیٹھ گیا۔ مطمئن سا۔ بنچ کی پیٹھ پر اس نے بائیں بانہہ ٹکا لی۔ پاؤں سامنے والی ٹھگنی دیوار پر رکھ لئے۔ عورت کھڑی سمندر کو دیکھتی اور بھیگتی رہی۔ پھر اس نے ماتھے پر بہہ آئی لٹوں کو سمیٹا۔ بارش کا پانی منہ سے صاف کیا اور آدمی کی طرف دیکھ کر وہیں اس کی بغل میں بیٹھ گئی۔ ان میں ابھی بھی کچھ دوری تھی۔ آدمی نے بنچ کی کارنس پر گردن ٹکا کر منہ آسمان کی طرف کر لیا۔ بارش کی ڈوریاں اور ہلکے ہلکے ریت ذرّوں کی طرح بکھرتی بوندیں اس کے چہرے کے چاروں طرف تھیں، عورت ماتھے پر آئی لٹوں کو بار بار ہٹا رہی تھی۔

رات اور بھی خاموش ہو گئی تھی۔ صرف ایک آدھ چوکور کھڑکیاں، چوکور کھڑکیاں، چوکور کھڑکیاں، لہروں کے سفید پھول، سفید پھول، سفید پھول۔

ناویں اب بیچ بیچ پاس آ رہی تھیں۔ کنارے سے کچھ ہی دور۔ یہاں تو اترنے لائق کنارہ بھی نہیں تھا۔ یہ لوگ یہاں کیوں آ گئے؟ ناویں کل تین تھیں۔ ان پر اٹھتے بیٹھتے آدمیوں کی گنتی مشکل تھی۔ اب روشنی صاف ہو گئی تھی وہ ٹارچیں تھیں جو اب برابر جل رہی تھیں۔ بجھتی تھیں تو معلوم ہو جاتا تھا کہ بجھائی گئی ہیں۔ ناؤں پر کچھ آدمی کھڑے ہوتے تھے۔ وہ کالی کالی لٹھوں کی طرح لگتے تھے۔ بارش اب بھی ان کے اوپر جال کی طرح تنی ہوئی تھی۔

وہ دونوں بنچ پر بیٹھے اب بھی ویسے ہی بھیگ رہے تھے۔ آدمی نے بایاں ہاتھ کچھ سمیٹا تھا۔ عورت نے شاید بالوں میں رینگتے پانی کو نچوڑا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے جوڑا کھول لیا۔ سفید پھولوں کی مہک، سفید پھولوں کی مہک، پھولوں کی مہک۔

وہ دونوں آہستہ آہستہ مورتیوں میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ بارش کچھ اور تیز ہو گئی تھی۔ وہ اتنے بھیگ چکے تھے کہ لگتا تھا ان کی نسوں میں بارش کا پانی دوڑنے لگا ہوگا۔ عورت کی ساڑی کا پلّو ہوا میں پھڑپھڑا کر بنچ کی پیٹھ سے چپک کر خاموش ہو گیا تھا۔

★ ★ ★

ناویں بائیں طرف کنارے آ لگی تھیں۔ جہاں وہ دونوں بیٹھے تھے۔ ان سے دور دو آدمی چٹانوں پر اتر آئے تھے اور ایک ناؤ کو سادھے تھے۔ وہ اس میں سے کچھ نکال رہے تھے۔ لیکن اب بارش شاید انھیں زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ جہاں پر وہ ناؤ والے اتر رہے تھے۔ وہاں کی چٹانیں، چٹانوں سی لگ رہی تھیں، یا بارش جھڑ رہی تھی، وہ کھسکا سا تھا۔ ایک آدمی اور نیچے آ گیا تھا۔ اب وہ گنے جا سکتے تھے۔ وہ چھ تھے۔ تین کشتی پر تھے، تین نیچے تھے۔ ناؤ والے آدمیوں نے سنبھل کر کچھ اٹھایا تھا۔ نیچے والے اسے لینے کے لئے تیار تھے۔ یہ شاید ایک عورت کی لاش تھی۔ ہو سکتا ہے آدمی کی لاش ہو۔ وہ سب کے سب پانی کے پتلے لگ رہے تھے، صرف وہ لاش گوشت و پوست کی تھی، شاید یہ پانی کے پتلے سمندری پولیس کے لوگ تھے۔ اب انھوں نے ٹارچیں بجھا لی تھیں۔ وہ سب اس لاش کو پٹرول پمپ کے پاس لے آئے تھے۔ ان میں سے چار آدمی کچھ دیر بعد چلے گئے۔ دو لاش لئے بیٹھے رہے۔

★ ★ ★

آدمی اور عورت اب بھی اسی طرح بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ دونوں جیسے بارش میں کچھ گھل سے گئے تھے۔ ان کے آکار پتلے ہو گئے تھے۔ آدمی نے عورت کے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

آخر کار میں نے ان کے پاس جا کر پوچھا:۔ سنو تمہارے دکھ کہاں ہیں؟

کیوں؟ ہمارے پاس ہے! عورت بولی تھی۔

یکایک لہروں نے آنچل بھر سفید پھول بکھیر کر غوطہ لگایا۔ میں نے عورت کی طرف غور سے دیکھا۔ اسے یہ خلل اندازی پسند نہیں آئی تھی شاید۔ پھر بھی میں نے ایک اور سوال پوچھ لیا۔ گھر یہ؟ کہاں ہے گھر؟

"کافی دور ہے یہاں سے۔ ورلی سے آگے"۔ اس بار آدمی نے جواب دیا۔

"کیسے جاؤ گے؟ اس بارش میں ٹیکسی بھی نہیں ملیگی"۔ میں نے کہا۔

"پیدل جائیں گے"۔ آدمی بولا۔

"کہاں کام کرتے ہو"؟ میں نے پھر پوچھا۔

"کہیں نہیں"۔ وہی بولا۔

"یہ تمہاری کون ہے؟" میرا اشارہ عورت کی طرف تھا۔

"کیوں؟ بیوی ہے۔ ادھر سے جا رہے تھے، ذرا سا رک کر بیٹھ گئے۔ ابھی چلے جائیں گے۔" آدمی نے کہا۔ وہ شاید مجھے پولیس کا آدمی سمجھ کر زیادہ صفائی دینے لگا۔ لیکن عورت ذرا زیادہ بے باک تھی۔ بولی "کیوں یہاں بیٹھنا منع ہے کیا؟"۔

"نہیں۔ نہیں" میں نے کہا اور وہاں سے ہٹ آیا۔ انھیں خلل اندازی پسند نہیں آئی تھی۔ وہ بارش میں بیٹھے بیٹھے گھل جانا چاہتے تھے۔ میں اور دور چلا آیا تھا تاکہ وہ خود کو اکیلا محسوس کر سکیں۔ لیکن وہ ویسے ہی بیٹھے رہے خوب بھیگتے ہوئے۔ ایک دوسرے کے پاس پاس اور الگ تھلگ۔

★ ★ ★

پٹرول پمپ کے پاس وہ دونوں آدمی لاش لئے بیٹھے تھے۔ تبھی روشنی کی دو شہتیریں سڑک پر چمکیں۔ ایک وین آکر ان کے پاس رکا۔ کچھ دیر تک کچھ حرکت سی ہوئی۔ پھر وین کے پچھلے دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی اور وہ وہیں سے مڑکر کیمپس کارنر کی طرف چلا گیا۔

پچھلی لال روشنی کی دو کانپتی لکیریں کچھ دیر سڑک کے شیشے میں جھانکتی رہیں۔ پھر کھو گئیں۔ وہ شاید پولیس کی گشتی گاڑی تھی۔ عمارتوں کی طرف روشنیاں بھی بجھ گئیں۔ ان کے بجھتے ہی عمارتیں بارش میں مل گئیں۔ ان کا صرف ہیولیٰ نظر آ رہا تھا۔ لپکپاتے ہوئے ہیولے ایسا لگا کہ جہاز لنگر اٹھا کر عرب ساگر میں چلے گئے۔

اب چاروں طرف گہرا اسرمئی اندھیرا تھا۔ سمندر کی آواز تھی۔ جیسے سینے میں کبھی کبھی ہوتی ہے "موسلا دھار بارش کی ڈوریاں تھیں، آسمان سے سمندر تک تنی ہوئی تھی۔

لہریں۔ لہریں۔ لہریں۔ سفید پھول۔ سفید پھول۔ سفید پھول۔ بھیگی گود لئے بیٹھی ہوئی چٹانیں۔ چٹانیں، چٹانیں۔

بنچیں خالی پڑی تھیں۔ ورلی کی طرف جاتی سڑک کی بائیں پٹری پر وہ دونوں چلے جا رہے تھے۔ ابھی بہت دور نہیں پہنچے تھے۔ وہ ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ اسی طرح بھیگتے ہوئے... دھولتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ آگے موڑ تھا۔ موڑ پر سے گزرتے ہوئے انھیں کافی وقت لگا تھا۔ بڑی دیر تک وہ وہاں نظر آ رہے تھے۔ جیسے رکے ہوئے ہوں لیکن وہ جا رہے تھے۔ بارش میں بھی کبھی کچھ رکا ہوا ہونے کا تجربہ ہوتا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ پگھلنے سے گئے تھے، پھر اوجھل ہو گئے۔ بارش کے پردے پر ان کا صرف عکس رہ گیا تھا۔ شاید تھا بھی یا نہیں۔ مگر بار بار یہی لگتا تھا کہ وہ موڑ پر ہیں اور چلے جا رہے ہیں کہ وہ ہیں اور جا رہے ہیں۔

یکایک بارش اور تیز ہو گئی۔ پٹرول پمپ کے پاس خوفناک سناٹا تھا۔ لوگوں کے ہیولے ڈراؤنے سے لگ رہے تھے۔ آخر میں اس بنچ کے پاس سے ہوتا ہوا واپس آنے لگا۔ جہاں وہ عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ بنچ پر اسی جگہ جہاں وہ بیٹھی تھی۔ ایک بھیگا ہوا پھول پڑا تھا۔ شاید اس کے جوڑے کا تھا۔ ایک پن نیچے پڑا تھا۔

لوٹتے ہوئے میں نے پھر ادھر دیکھا۔ وہ جا رہی تھی۔ وہ آدمی بھی ساتھ تھا۔ وہ بنچ پر بھی بیٹھے تھے۔ پٹری پر بھی وہ جا رہے تھے۔ موڑ پر بھی وہ نظر آ رہے تھے۔ رکے اور چلتے ہوئے، جاتے اور رکے ہوئے کہ وہ ہیں اور جا رہے ہیں۔

★ ★

کملیشور
کا
غیر ملکی سفر

میں ۱۹۷۱ میں ایک لمبے سفر پر بدیش گیا تھا۔

سب سے پہلے مصر پہنچا۔ قاہرہ میں رکا۔ وہاں سے اٹلی گیا۔ اٹلی سے ہالینڈ۔ یہ تو ہوائی سفر تھا۔ اس کے بعد شروع ہوا سڑک کا سفر۔

انگلینڈ کی بندرگاہ ڈوور سے میں ایک اسٹیشن ویگن جہاز پہ لاد کر چلا۔ وہاں سے آئس لینڈ کی بندرگاہ پر اترا۔ یہ بلجیم میں ہے۔ آئس لینڈ کی بندرگاہ ہندوستانی اور پاکستانی لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ لیکن یہ لوگ وہاں دکھائی نہیں دیتے۔ دکھائی اس وقت پڑتے ہیں جب آپ بھی بغیر ویزا کے انگلینڈ میں داخل ہونا چاہتے ہوں۔

ایشیا کے محنت کش آدمیوں کے لئے انگلینڈ میں آباد ہونے کا یہ سمندری دروازہ ہے۔

بلجیم سے ہم نے سڑک پکڑی۔ وہاں سے لکسمبرگ گئے اور پھر ہالینڈ۔ دس دنوں بعد ڈنمارک کے لئے کوچ کیا۔ آپ کو تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ جو سگریٹ میں نے ہالینڈ میں جلائی تھی، اس کا ٹوٹا ڈنمارک میں پھینکا۔ پتہ نہیں سگریٹ بڑی تھی یا سڑک چھوٹی۔

ڈنمارک سے سمندر پار کر کے سوئڈن پہنچا۔ وہاں سے ناروے۔ واپسی میں ڈنمارک ہوتے ہوئے مغربی جرمنی کے شہر ہمبرگ کے سٹیلائٹ ایریا میں پڑاؤ کیا۔ وہاں سے سڑکیں ناپتے آسٹریلیا جا پہنچے۔ آسٹریلیا سے یوگوسلاویا۔ یوگوسلاویا سے اٹلی ہوتے ہوئے سوئزرلینڈ پہنچے۔ سوئزرلینڈ میں پیسے ختم ہو گئے اور وہاں آزادی کے مسئلے پر تقریر کرنے کی بنا پر پولیس کے ذریعے کار پکڑ لی گئی اور ہم فرانس کی سرحد پر انہیں کے خرچ سے بھیج دیے گئے۔ فرانس میں لکچر دینے پر بہت پیسے ملے۔ مالا مال ہو کر اٹلی آیا۔ اٹلی اور ہندوستانی کیریکٹر میں کوئی خاص فرق نہیں۔ سارا پیسہ اٹلی میں لٹ گیا۔ وہاں سے پھر مصر، الجزائر، یونان اور عرب ہوتے ہوئے کراچی کو چھو کر بمبئی آنے کی تمنا تھی۔ لیکن جہاز کراچی ہو کر نہیں آیا۔ سوچا تھا کہ کراچی کو سلام کرتا آؤں گا مگر اسی وقت بمبئی اور کراچی میں فوجی سلامیاں شروع ہو گئیں۔ بہر حال اتنا تو ضرور لگتا تھا کہ میں کہیں کراچی کے پاس سے گذر رہا تھا۔ دیکھنے کی کوشش کی تو بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ بادل بمبئی تک چھائے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں لگا کہ کراچی کے بادل کہاں ختم ہوئے اور بمبئی کے کہاں سے شروع ہوئے۔

آخر کئی مہینوں کے سفر کے بعد گھر پہنچ گئے۔

اسی دوران جو سچائیاں دیکھیں وہ کہانیاں بن کر سامنے آئیں جن میں سے چار یہ بھی ہیں۔

کملیشور

کملیشور

☆

ہوا ہے، ہوا کی آواز نہیں ہے

باہر سردی ہے!

پت جھڑ شروع ہو چکا ہے، سامنے کی پہاڑی پر اُگے پاپلر کے پیڑ ننگے ہو گئے ہیں۔ لگتا ہے پوری پہاڑی پر انار چھوٹ رہے ہوں! پاپلر کی ننگی سفید شاخیں رہ رہ کر چمک جاتی ہیں، ہوا ہے، ___ ہوا کی آواز نہیں ہے؛ کھڑکی کے دھندلے شیشے سے سردی جمتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ یوں تو کمیون میں دس لوگ اور ہیں ___ مجھے ملا کر گیارہ ___ پر خاموشی گہری ہے۔ پورے سوئٹزرلینڈ میں ہی بڑی خاموشی ہے۔ اس پر سے لوزان شہر۔ الگ تھلگ اور لوزان کا بھی باہری علاقہ ___ اس علاقے میں بھی بستی سے دور۔ اس چھوٹی سی پہاڑی پر بنے کاٹیج میں یہ کمیون! اس کمیون میں رہنے والے وہ سب ___ جو کسی نہ کسی بات سے ناراض ہیں۔ کوئی اپنے دیش سے ناراض ہے، کوئی دیش کے قانون سے، کوئی دنیا کی حالت سے، کوئی سوئس سرکار کی داخلی پالیسی سے۔

ہیوبرٹ کہہ رہا تھا ___ تمہیں معلوم ہے؟ میرا دیس، بیوٹی بیتیوں کا بونجی تی ہے۔ دنیا کی ساری دولت یہاں سوئٹزرلینڈ میں آتی ہے۔

ہم سود بیاج پر جیتے ہیں۔ ہماری دوائیوں کی عالمی شہرت رکھنے والی کمپنیاں، ہماری گھڑیوں کی ساری کاریگری ترکی، یوگوسلاویہ اور اٹلی کے مزدوروں پر منحصر ہیں۔ جو ہر ہفتے اپنے دیش سے کام کرنے آتے ہیں۔۔ انہیں یہاں کی شہریت نہیں دی جاتی!

ہیوبرٹ تو اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا ___!

پردیسی لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی کمیون پر چھائی ہوئی سناٹگی مجھے ناگوار لگ رہی تھی۔ سناٹگی کی وجہ تو بعد میں معلوم ہوئی۔ جب ماریا میرے کمرے میں آئی۔ وہ گھبرائی ہوئی نہیں تھی۔ اس نے دھیرے سے کہا ___ تم عجیب سا محسوس کر رہے ہو گے۔ پر بات کچھ ایسی ہی تھی ___!

___ کیا بات ہے؟ میں نے پوچھا تھا

___ ایک بات ہو تو بتاؤں! ماریا نے کہا تھا۔

میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ تب ہی وہ بولی تھی ___ اور باتوں کو چھوڑ بھی دیں، تو دو باتیں اہم ہیں۔ پہلی یہ کہ پولس کا فون آیا تھا۔۔ پولس کا حکم ہے کہ تمہیں راتوں رات فرانس کی سرحد تک چھوڑ دیا جائے۔۔۔

___ لیکن کیوں؟ میں نے حیرت کے ساتھ ماریا سے پوچھا تھا۔

صبح کی میٹنگ میں تم نے جو کچھ جنیوا میں کہا ہے، اسے پولس خطرناک سمجھتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ بنگلہ دیش کے انقلاب کے بہانے تم نے یہاں کی حکومت کے خلاف باتیں کی ہیں ـــــ ماریانے مجھے سمجھایا۔!

ـــــ ٹھیک ہے! میں نہیں چاہتا کہ کمیون کے ساتھی الجھن میں مبتلا ہوں۔ اس لیے تم مجھے فرانس کی سرحد تک پہنچنے کا ذریعہ بتا دو، میں چلا جاؤں گا۔ میں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا ـــــ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے سبب کمیون کے ساتھی پریشانی مول لیں!

یہ بھی مجھے معلوم تھا کہ کمیون کے سب لوگ یہاں چھپ کر نہیں رہتے ہیں پھر بھی وہ پولس کی نظروں میں بھی کھٹکنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ماریا نے خود انتہا پسند تھی لیکن اس کے خیالات سوئس حکومت کی اس پالیسی کے خلاف تھے۔ جو ترقی پذیر ممالک کی مخالف تھی۔ ماریا خود ہند نواز تھی۔ وہ مانتی تھی کہ تیسری دنیا کے ترقی پذیر ملکوں کو بھارت ہی راستہ دکھائے گا۔ . . . وہ دکھی تھی کہ اس کا دیس، پاکستان کو فوجی ہتھیاروں اور اوزاروں کے لیے زبردست مدد دیتا ہے۔

لیکن یہ باتیں دیگر تھیں۔ میں کمیون کے ساتھیوں کی پریشانی جانتا تھا۔ ماریا نے تب بتلایا تھا کہ ہم نے پولس کو بہت سمجھایا، پر سارجنٹ تم سے ملنے یہاں آ رہا ہے۔

ـــــ ٹھیک ہے، میں تو اس سے ہی کہوں گا کہ وہ مجھے فرانس کی سرحد تک چھوڑ دے۔ افسوس صرف یہ ہو گا کہ میں دوستوں کے ساتھ یہاں دو ایک روز اور رہنا چاہتا تھا لیکن وہ اب ممکن نہیں ہو گا . . میں نے اداس لہجے میں کہا تھا۔

ـــــ پر مسئلہ تمہارا ہی نہیں ہے، پیئرے کا معاملہ تو اور بھی گمبھیر ہے۔ ماریا بولی۔

ـــــ وہ کیا ہے؟ میں نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

ـــــ کل صبح اسے جنیوا پہونچ کر ملٹری ٹریننگ کے لیے رپورٹ کرنا ہے، تم جانتے ہو وہ جنگ اور ہتھیاروں کے نام سے بگڑتا ہے" وہ بولی تھی۔

ـــــ ہاں، یہ تو صحیح ہے، پر کیا اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ ملٹری ٹریننگ کے لیے جائے؟ میں نے پوچھا تھا۔

ـــــ ہاں! یہ ہمارے دیس میں لازمی ہے۔ اگر وہ نہیں جائے گا تو گرفتار ہو جائے گا۔ ٹرائل ہو گا ـــــ پھر کچھ مہینوں کی سزا ـــــ وہ بولتی جا رہی تھی ـــــ یہ دونوں اہم مسئلے تھے انہیں کی وجہ سے ہم پریشان تھے۔

ـــــ اس میں پریشانی کیا ہے؟ ـــــ میں سوئٹزرلینڈ چھوڑ کر راتوں رات فرانس کی سرحد تک چلا جاؤں گا۔ پیئرے، جنیوا چلا جائے۔ جب ملٹری ٹریننگ لازمی ہے تو اسے جانا ہی پڑے گا۔ میں نے کہا تھا۔

ماریا نے مجھے حیرت سے دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ کچھ رکتے ہوئے وہ قدرے سختی سے بولی تھی ـــــ ہم نے تو سنا تھا کہ ہندستانی اپنے ضمیر کی صحیح آواز کے لیے جان تک دیدیتے ہیں . . . وہ ضمیر کو مانتے ہیں . . . پر تم . . .

ماریا کے چہرے پہ دلی تکلیف کی کیفیت کو میں نے دیکھ لیا تھا۔ لیکن میرا مطلب وہ نہیں تھا جو وہ سمجھی تھی۔ میں نے اسے سمجھایا کہ دراصل میں اسے کہنا کیا چاہتا تھا۔ میں پرائے دیس میں اور کیا کر سکتا تھا؟ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ کمیون کے دوسرے لوگوں کا ردعمل کیا تھا؟ میری وجہ سے اگر کوئی مصیبت آئی ہے تو اسے ٹالنے کا کوئی ذریعہ ڈھونڈنا ضروری تھا۔

ابھی ہم ہال میں کھڑے یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ہمارے کاٹیج کی چھوٹی سی پہاڑی پر نیچے سے آتی ہوئی کار کی ہیڈلائٹ چمکی ـــــ ماریانے دیکھا اور کہا ـــــ سارجنٹ آگیا۔

ـــــ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔

ـــــ یہاں اور کون آئے گا، وہی ہوگا، وہ بولی ـــــ وہ بالکل یقین کے ساتھ بولی ـــــ

ماریانا کی بات صحیح تھی۔ جب بند جیپ رکی تو شیشے کی آڑ سے ہم نے سارجنٹ کو گاڑی سے نکلتے دیکھا۔ ماریانے دروازہ کھول دیا۔ فرنچ زبان میں اس سے کچھ رسمی بات چیت کی۔ سارجنٹ کے ساتھ ہی تیز سرد ہواؤں کے تیر بھی اندر آئے۔ ماریانے اس کے اندر آنے کے ساتھ ہی دروازہ بند کر دیا۔

سارجنٹ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ ماریا شاید کمیون کے دوسرے لوگوں کو اطلاع دینے چلی گئی۔ سارجنٹ کھڑا کھڑا ہال کی دیواروں پر لگے پوسٹروں اور دوسرے سامانوں کو دیکھتا رہا۔

یہ ہال سب کے استعمال میں آتا تھا۔ اصل میں ساتھ بیٹھ کر کھانے کا یہ کمرہ تھا۔ ایک عجیب سا میوزیم جس میں طرح طرح کی چیزیں بکھری تھیں۔ عام دروازہ والی لکڑی کی دیوار پر مارکس کا ایک بہت بڑا سا فوٹو فریم لٹکا ہوا تھا۔ دروازے کی دوسری طرف جیسے گویا را کی بڑی سی تصویر تھی... تکونی شکل میں بنی ـــــ اسی کے نیچے ایک پوسٹر اور ـــــ جس میں بھیڑوں کا ریوڑ سر جھکائے چلا جا رہا تھا اور نیچے لکھا تھا ـــــ "ریتور آلا ر نورمیل" ـــــ یعنی سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ یہ پوسٹر ایک طنز نگار آرٹسٹ کا تھا۔ جس میں فرانس کے مزدوروں کی ہڑتال کی ناکامی پر طنز کیا گیا تھا ـــــ داہنی دیوار پر ایک دوسرے طنز نگار کا پوسٹر تھا ـــــ نکسن اٹلی آیا ہے۔ وہ ہوائی جہاز کی سیڑھیوں سے ہاتھ میں ہائیڈروجن بم لئے اتر رہا ہے اور نیچے اٹلی کے پادری ہاتھوں میں صلیب ـــــ اور مقدس عصا لئے اس کے قدموں میں بچھے ہوئے ہیں۔

تیسری دیوار پر ایک اور پوسٹر لگا ہے، شہر کے کسی بہت بڑے "کنزیومرس اسٹور" کا ـــــ لکھا ہے، جو مال آپ ہمارے یہاں سے خریدیں گے، اس سے ہمیں جو منافع ہوگا۔ اس میں سے دس فیصد ہم بنگلہ دیش کی مدد فنڈ میں جمع کریں گے۔

سارجنٹ نے سب پوسٹر دیکھے ـــــ کنزیومرس اسٹور کا پوسٹر پڑھ کر وہ مسکرایا۔ اس میں کیا لکھا ہے یہ کل شام کو ہی جارج مجھے سمجھا چکا تھا ـــــ سمجھاتے ہوئے بولا تھا ـــــ اسے ہم نے اس لئے چپکایا ہے کہ اس کنزیومرس سوسائٹی کی منافع کمانے کی ذہنیت کو سمجھا جا سکے۔ جس کے لئے بنگلہ دیش کی مدد بھی منافع کمانے کا ایک ذریعہ ہے۔

سارجنٹ مسکرایا تو میری ذہنی پریشانی کم ہوئی، تب تک کمیون کے سب لوگ ہال میں اکٹھا ہو گئے تھے۔ ماریانے، ریتھ، بھارتی، اینی لیبرے ـــــ چاروں لڑکیاں اور چھ لڑکے ہیوبر، جارج، پیٹرے، البرٹ، کورے اور برگاسس ـــــ اب ہم بارہ تھے ـــــ مجھے اور سارجنٹ کو ملا کر ـــــ!

سب کے آتے ہی سارجنٹ سے باتیں شروع ہو گئی تھیں۔ میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ یہ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ باتیں فرنچ زبان میں ہو رہی ہیں یا جرمن میں یا اٹالین میں! بیچ بیچ میں کچھ اشارے میری طرف ہوتے یا "انڈیا" کا نام آتا تو لگتا کہ بحث میرے بارے میں ہو رہی ہے۔

سردی بڑھتی جا رہی تھی ـــــ باہر کی پہاڑیاں اب پوری طرح کہر میں ڈوب گئی تھیں۔ سوائے سفید دھند

کے اب کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سارجنٹ کے ساتھ ہو رہی بحث کبھی کبھی بہت تیز ہو جاتی تھی۔ سارجنٹ بھی تلخی پر اتر آتا تھا۔ اور میں اپنے بارے میں کئے جا رہے فیصلے کے بابت بے چین تھا۔

بیچ بیچ میں اس محفل سے اٹھ کر بھارتی اور البرٹ باہر نکل آتے تھے۔ وہ ہال میں لگے بڑے بلیک بورڈ پر لکھی ہدایتوں کو پڑھتے اور اسی کے مطابق کھانے کی میز سجائے جا رہے تھے۔ اصل میں ہال میں رکھا وہ بلیک بورڈ بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اسی بورڈ پر ہر دن کا کام اور اس کے ذمہ دار حضرات کا نام لکھا رہتا تھا۔ کون کھانا پکائے گا۔ کھانے میں کیا کیا ہوگا۔ پلیٹ کون صاف کرے گا۔ کچرے کا بیگ باہر کون پھینکے گا۔ گھر کی صفائی کون کرے گا۔ . . . رات کے کھانے کے بعد دوسرے دن کا پروگرام بلیک بورڈ پر لکھ دیا جاتا تھا۔ ساتھ ہی کام کرنے والوں کے نام بھی۔ آج بھارتی اور البرٹ کے ذمہ رات کے کھانے کا انتظام تھا۔

بھارتی کو سردی بہت لگی تھی۔ بیچ بیچ میں آتے جاتے البرٹ اسے اپنے سے چپکا لیتا تھا — اس کے ہاتھوں کو رگڑ رگڑ کر گرم کر دیتا تھا۔ پھر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا تھا۔

کھانے کی میز تقریباً لگ گئی تھی۔

الجیریا کی تبور کا وائن کی چار سبز بوتلیں تھیں۔ مٹی کے ایک بڑے سے پیالے میں سلاد بھرا تھا۔ سلاد البرٹ نے کاٹا تھا۔ بھارتی نے اس میں لہسن کے ٹکڑے، سرکا اور تیل ملا کر تیار کر دیا تھا۔ پاس ہی مٹی کا ایک اور بڑا سا برتن تھا۔ بھارتی اس میں آڑو کاٹ رہی تھی۔ البرٹ نے روٹی لا کر رکھ دی تھی۔

تب ہی یکایک پیٹرے کی بہت اونچی آواز سنائی دی۔ بحث کرتے کرتے شاید وہ چیخ ہی پڑا تھا۔ سارجنٹ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ریتھ پیٹرے کی بغل میں خرگوش کی طرح خاموش کھڑی تھی۔ میں بھی بالکل سہم گیا تھا۔ ایسا لگا تھا کہ باتوں باتوں میں کوئی دھماکہ ہو گیا ہے — پیٹرے شاید سارجنٹ سے لڑ پڑا ہے اور اب کمیون پر آفت آنے والی ہے، یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے — یہ سوچ کر میں اور بھی گھبرا اٹھا تھا۔ ہو سکتا ہے کچھ بات پیٹرے کی وجہ سے بگڑ گئی ہو۔ کیونکہ وہ لازمی ملٹری ٹریننگ کے لئے جرمنی جانا نہیں چاہتا تھا۔ شاید اسی بات پر بحث کے دوران کچھ جھگڑا ہو گیا ہو . . .

اسی وقت بھارتی میرے پاس آئی . . . اس نے اپنا منہ میرے قریب کر دیا، مطلب سمجھ گیا۔ اسے بری طرح سردی لگ رہی تھی۔ میں نے اپنے اونی مفلر سے اس کے رخسار، گردن، کان، ناک رگڑ کر گرم کر دئے تو وہ اور بھی چپک کر کھڑی ہو گئی۔

میں نے اس سے پوچھا — بھارتی! کیا بات ہو گئی ہے؟

— سارجنٹ بہت پر لطف شخص ہے۔ ہاں! پیٹرے بگڑ رہا ہے کہ میں اس سوسائٹی . . . اس سڑی ہوئی منافع خور اور جنگ خور سوسائٹی کے لئے ملٹری ٹریننگ لینے سے انکار کرتا ہوں۔ ٹھیک ہے ٹرائل ہو . . . مجھے سزا ہو! جو کچھ ہوتا ہے — ہو! میں فکر نہیں کرتا۔ بھارتی نے مجھے وہ سب بتایا جو پیٹرے نے اونچی آواز میں کہا تھا —!

تب ہی ماحول ایک دم بدل گیا تھا . . . سارجنٹ نے کچھ کہا تھا اور سب کی چھت پھاڑنے والی آوازیں گونج گئی تھیں، وہ سب خوشی میں چیخ رہے تھے۔ اخیر میں Hell - Hell کی آوازیں آئی تھیں اور ماریا نے البرٹ سے کہا تھا — موم بتیاں جلا دو اور کھانا شروع کرو —!

بھارتی نے تین موم بتیاں کھانے کی میز پر جلا دیں۔ مٹی کی پلیٹیں سامنے رکھ دی گئیں اور مٹی کے ہی پیالوں میں وہ تبورہ کا وائن ڈالنے لگی تھی۔ سب لوگ میز کے ارد گرد جمع ہو چکے تھے۔ کرسیاں کم تھیں پر دوسرے سامانوں سے بیٹھنے کی کرسی کا کام لے لیا گیا تھا۔

سارجنٹ نے پیالہ اٹھا کر "چیرس" کہتے ہوئے میری سمت دیکھا تھا اور انگریزی میں بولا تھا "ہم جانتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں... کہ ہمارے ہتھیار یا مغربی ممالک کے ذریعہ دیے جا رہے ہیں، جنگ کے سامان کو لیس اور استعمال کرتے رہنے کے لئے ہمارا ملک جو اقتصادی مدد آپ لوگوں کے ملکوں... یعنی تیسری دنیا کے ملکوں کو دے رہا ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟!

ماریانے تب تک سفید Rum کی بوتل لے آئی تھی۔ سارجنٹ کہہ رہا تھا۔ میں پولس محکمہ میں ہوں لیکن کیا سمجھتا نہیں ہوں؟؟ لڑائی بُری چیز ہے، پر ہم ادھر جیسے دیش لڑائیوں کے سہارے ہی گلچھرے اڑا رہے ہیں۔ پاکستان کے ٹینک اور ہوائی جہاز ہندوستان نے ۱۹۶۵ء میں برباد کر دیے تو انہیں پھر سے قابل استعمال بنانے، ضروری پرزے خریدنے کے لئے ہمارا ملک، پاکستان کو مالی مدد دے رہا ہے اور اب وہی مدد بنگلہ دیش میں اپنے ہی بھائیوں کو مارنے کے کام آ رہی ہے... ہاں... ہم جانتے ہیں... ہم سب جانتے ہیں...!

میں نے راحت کی سانس لی تھی اور شراب کا پہلا گھونٹ اطمینان سے بھرا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سارجنٹ پر کیا جادو ہوا ہے۔ ماریانے سفید رم کی بوتل کھول کر کٹے ہوئے آڑوؤں پر ڈال دی تھی اور ان ٹکڑوں کو رم میں اچھی طرح ڈبو دیا تھا۔ پیٹر نے اپنی لائٹر سے رم میں شعلے جگا دیے — رم کی نیلی لپٹیں اٹھنے لگیں۔ بھارتی نے ہاتھ سینکنے کے لئے برتن پکڑ لیا تھا۔

رسیتھ پیٹر کے شانے سے سر ٹکائے بیٹھی تھی۔ اداس اور غیر جانبدار سی — البرٹ اور ماریا نے کچھ دیر بعد چمچے سے آڑوؤں کو ہلا کر نیلی لپٹوں کو بجھا دیا۔ بھارتی نے نیلی بوتل سے پھر شراب انڈیلنا شروع کر دیا تھا۔

اب کھانے کی محفل اچھی طرح جم گئی تھی، پتہ نہیں کب ہیوبرٹ نے جون وائیز کا گیت لگا دیا تھا۔

باہر سردی اور کہر تھی...

اندر جون وائیز کی آواز گونج رہی تھی —

فادر! یس، آئی ایم اے پرزنر! فادر

"fother! yes, I am a prisoner, fother.
fear not to relay my crime...
the crime is loving the forsaken..
Only silence in shame!
Only silence in shame!
fother! yes I am a prisoner... fother..."

ہیوبرٹ اور سارجنٹ، جون وائیز کے ساتھ گانے لگے تھے۔ ماریانے پھر رم ڈال کر آڑو کے ٹکڑوں کو نیلی لپٹوں میں لپیٹ دیا تھا۔ باہر سردی تھی — کہر تھی — لکڑی کی میز پر اور فرش پر سب کے ہاتھ اور پیر تھاپ دے رہے تھے۔ جون وائیز کی آواز تیز ہوتی جا رہی تھی —

The shameless lies that man have told

will ever more be Paid in gold ...
father ... yes, I am a Prisoner ...
Only silence is Shame ... father ...

اس وقت وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا، نہ سردی تھی — نہ کہر — نہ رات — نہ اندھیرا .... صرف جون دائز کی آواز تھی ... —

father! Dont be ashamed to tell my Crime ...
the Crime of love and brother hood
Only silence is Shame ... father ...

کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کون کہاں ہے .... لکڑی کے بنے چمچوں سے سب آڑو کے ٹکڑے کھا رہے تھے اور گرم رم پی رہے تھے۔ سب پر ایک مستی طاری تھی۔ سب جھوم رہے تھے۔ لگ رہا تھا کہ یہ پوری دنیا ایک ہے ... اس پوری دنیا کے مسئلے ایک ہیں ... آواز ایک ہے ....

لیکن اس پورے ماحول میں ہیرئیٹ اور ریتھ الگ تھلگ بیٹھے تھے۔ ریتھ، ہیرئیٹ کے سینے پر سر ٹکائے تھی اور ہیرئیٹ اس کے سنہرے بالوں پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ کبھی کبھی بڑی اداس نظروں سے ریتھ، ہیرئیٹ کو دیکھ لیتی اور ہیرئیٹ، بڑی معصومیت سے اسے چوم لیتا تھا۔

سارجنٹ مستی میں تھا۔ اس نے نہ جانے کتنے ریکارڈ بجا ڈالے تھے۔ جارج مستاکی، فیربیٹ اور ماری کے تھیوڈورا کس کے ... اور بیچ بیچ میں وہ چیختا تھا — میں جانتا ہوں ... میں سب جانتا ہوں ....

پھر وہ میرے پاس آیا تھا اور انگریزی میں بولا تھا، مسٹر کملیشور! جو کچھ جنیوا کی میٹنگ میں آپنے کہا تھا وہ سچ ہے میں اس سے متفق ہوں ... پر میں پولس محکمہ میں ہوں!

— میں آپ کی پوزیشن جانتا ہوں، آج کا زمانہ ہی ایسا ہے کہ آدمی کو من مار کر زیادہ تر وہی کام کرنے پڑتے ہیں جن میں اس کا یقین نہیں ہوتا — پر کیا کیا جائے؟" میں نے کہا تھا۔

— آپ نہیں جانتے! یہاں کی حکومت اور انتظام بہت سخت ہیں۔ جن ممالک میں بھی صحیح انقلاب یا تغیر ہوتے ہیں، انہیں ہمارا ملک اپنے مفاد کی خاطر منظور نہیں کر پاتا — یہ دنیا میں وہی توازن اور معیار باقی رکھنا چاہتے ہیں جس میں غریبوں کو اور غریب اور کمزور بنائے رکھنے میں ہی ان کا بھلا ہے — میں جانتا ہوں — میں سب جانتا ہوں —! کہتے ہوئے وہ تھیوڈورا کس کے گیت پر جھومنے لگا تھا۔

تھیوڈورا کس — گریس کا گلوکار —!

پتہ نہیں البرٹ کہاں سے پیچا نکال لایا ہے۔ شاید oven — سے! اور ساتھ میں ہیں سرکے میں ڈوبے کھیرے کے ٹکڑے۔ پیچا — پر سارڈین مچھلیاں ہیں۔ چھری سے کاٹ کاٹ کر سب نے پیچا کے ٹکڑے اٹھا لئے ہیں۔

ہیرئیٹ نے تپتے ہوئے رم میں ڈوبے چمچے کو ریتھ کے ہونٹوں سے لگا دیا ہے۔ ریتھ نے بہت تھوڑا سا رم چوس کر ہیرئیٹ کی طرف دیکھا۔ باقی رم ہیرئیٹ نے پی لی۔

البرٹ نے تب تک بلیک بورڈ صاف کر دیا۔ اس پر کل صبح کے سارے کام کی نوٹس لکھا جانا ہے۔

تھیوڈورا کس کے گیت کی آواز پر ہیرئیٹ بے دل ہو گیا ہے۔ گریک آواز اور فرنچ بول۔ تھیوڈورا کس کی آواز

گونج رہی ہے ـــــ

دوستو، میں اکیلا کہاں ہوں!

میرے ساتھ میرا اکیلا پن ہمیشہ ہے....

دوستو! میں سوتا ہوں تو وہ اکیلا پن میرے ساتھ سوتا ہے..

جاگتا ہوں تو ساتھ جاگتا ہے....

میں اکیلا کہاں ہوں!

دوستو! ـــــــــ

پیئرسے کی ضمیر میں جیسے گھٹن ہو رہی ہے... فرکس کا گرہ بجو بیٹ ہے۔ اس کی آنکھوں میں جیسے آٹو کے ٹکڑے جل رہے ہیں ۔۔ جلتی رَم کی لپٹیں اٹھ رہی ہیں ـــ اس کی لمبی ناک رہ رہ کر پھڑک رہی ہے۔ ریتھ کا سر اس نے دیوار سے ٹکا دیا ہے۔ ریتھ اب کہیں اور دیکھ رہی ہے ــ کھڑکی کے شیشے کے پار بکھرے ہوئے کہر کو ــ!

اچانک پیئرسے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر کے لئے ایک عجیب سی خاموشی ماحول پر چھا گئی۔ ریتھ وہیں میز سے سر ٹکا کر سو گئی....

اور تھیوڈوراکس کا ریکارڈ بجتا رہا ــ دوستو، میں اکیلا کہاں ہوں، دوستو ــ!

سب لوگ لست اور مست ہو گئے ہیں۔ میز پر کھانے کی خالی پلیٹیں، پیالے، بڑے بڑے مرتبان، چمچے اور بوتلیں پڑے ہیں۔ سارجنٹ اب جانے کی اجازت چاہتا ہے!

ریتھ وہیں میز پر سر رکھے اسے الوداع کہتی ہے۔ ماریا نے دروازہ کھولتی ہے تو ہم سب سارجنٹ کو الوداع کہنے باہر آتے ہیں۔ غضب کی سردی ہے، کہر ہے ــ سناٹا ہے، بھیگا پن ہے، ہوا ہے ہوا کی آواز نہیں ہے ـــ سیڑھیوں کے پاس کھڑی کار کو سارجنٹ ہاتھ رکھ کر دیکھتا ہے... ایک دم ہاتھ ہٹا لیتا ہے جیسے سردی سے ہاتھ جل گیا ہو۔

ماریا ہنستے ہوئے بتاتی ہے ـــ یہ پیئرسے کی گاڑی ہے۔

چلتے چلتے سارجنٹ مجھ سے کہتا ہے۔ مسٹر کملیشور! آپ فکر نہ کریں... آرام سے ہمارے نہیں، میرے دیش میں رہیں۔ دیکھئے ہر دیش میں، ایک اور دیش ہے! نہیں؟! میں جانتا ہوں، میں سب جانتا ہوں.... آدمی کی مکتی کے لئے آپ کو جو کچھ کہنا ہو، یہاں کہہ کے جائیے۔ جب خطرہ ہوگا میں آجاؤں گا۔ اور آپ کو آرام سے فرانس کی سرحد تک پہنچا کر لوٹ آؤں گا... میرا فرض بھی پورا ہو جائے گا اور آپ کا پیسہ بھی بچ جائے گا ــ نہیں ــ؟! میں سب جانتا ہوں...

اب تک سارجنٹ ہم سب کا ہی حصہ ہو چکا تھا۔ ماریا نے کہا بھی ــ صبح چلے جائیے گا۔ پر سارجنٹ نہیں مانا۔ اسے ڈیوٹی پر پہنچنا ہی تھا۔ چلتے چلتے اس نے اتنا ہی کہا تھا ــ پیئرسے سے کہئے گا۔ کہ وہ ٹریننگ کے لئے چلا جائے... اسے یہیں رہنا ہے... اسی دیش میں ــ! اسے اس دیش کو منظور کر کے ہی اسے بدلنا ہے.... اسے سمجھائیے گا بچپنا نہ کرے... بہت مشکل میں پڑ جائے گا۔ اپنے وشواسوں کے لئے اسے مجبوریاں منظور کرنی چاہئیں.... مجبوریوں کو توڑنے کا وقت بھی آئے گا...

سردی اور بے آواز چیرتی ہوا کے سبب سے حالت خراب ہو رہی تھی۔ سارجنٹ نے جاتے ہوئے جملہ کا یزکی ایک لائن دہرائی تھی ـــ

With me I have my love, my innocense!
The workers and the poor.
for all of This I am safe
I am strong
and hope is mine!
father, tell me, my crime!

سارجنٹ چلا گیا۔ ہم سب کے جسم اب تک برفیلے ہو چکے تھے۔ اندر آئے تو راحت ملی۔ ماریا نے دروازہ بند کیا۔ دور اترتی سڑک پر سارجنٹ کی گاڑی کی پچھلی سرخ روشنیاں چمک جاتی تھیں۔

ہم سب بکھر کر اپنے اپنے کمروں کی طرف جانے لگے تو ماریا نے پنسل اٹھا کر بلیک بورڈ پر صبح کا پروگرام لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ البرٹ نے اسے روک دیا۔ اب صبح لکھ دینا۔۔۔ رہنے دو۔۔۔!

ماریا نے پنسل وہیں رکھ دی تھی اور ریتھ کو اٹھا کر وہ اس کے کمرے میں پہنچا آئی تھی۔

سب کمروں کی روشنیاں بجھ گئی تھیں!

اب پورا سناٹا تھا ۔۔۔!

باہر سردی تھی، کہر تھی، ہوا تھی، پر ہوا کی آواز نہیں تھی ۔ ایک نیند تو میں سو یا تھا۔ پھر نہ جانے کیسے نیند ٹوٹ گئی تھی۔ لگا تھا کوئی گیت اس سناٹے میں ابھر رہا تھا۔۔۔ تھیوڈوراکس کا وہی گیت! مجھے لگا، کہیں وہم تو نہیں۔۔۔ پر نہیں، بہت دھیمی آواز میں ریکارڈ بج رہا تھا۔۔۔ پیئرے اور ریتھ کی چہل قدمی کی آہٹ بھی آ رہی تھی۔ شاید وہ دونوں ہال میں تھے۔

پھر کوئی شک نہیں رہ جاتا۔۔۔ کچن میں برنر جلتا ہے، کچھ دیر بعد ریتھ کی آواز آتی ہے ۔ پیئرے! چائے۔۔۔!

ضرور ریتھ نے سینتھل کی چائے بنائی ہوگی۔ پیئرے کو وہی پسند ہے۔ لکڑی کی میز پر پیالے رکھنے کی ہلکی آہٹ آئی تھی اور بڑی دیر تک ہال سے تھیوڈوراکس کے اسی گیت کی دھیمی دھیمی آواز تیرتی آتی رہی تھی۔

"دوستو! میں اکیلا کہاں ہوں۔۔۔
سوتا ہوں تو وہ اکیلا پن ساتھ سوتا ہے۔۔۔
پتہ نہیں کب مجھے نیند آئی!

صبح سب سو کر اٹھے ہیں، چاروں طرف بادل بکھرے ہوئے ہیں۔ گھاٹی میں بھی بادل ہیں۔ پاپلر کے پیڑ بھی چھپے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سکون ہے۔ بھارتی چائے لے کر کمرے میں آئے، یہ اچھا نہیں لگا۔ اس لئے میں خود ہال میں چلا گیا۔ اس نے مجھے چائے کا پیالہ دیتے ہوئے بلیک بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ بلیک بورڈ پر پیئرے صرف دو لفظ لکھ کر چلا گیا تھا ۔۔۔۔ خدا حافظ ۔!

اس کی گاڑی بھی باہر نہیں تھی۔ نہ معلوم پیئرے ملٹری ٹریننگ کے لئے رپورٹ کرنے چلا گیا تھا یا کہیں بھاگ گیا تھا ۔۔۔! ▲

کملیشور

ویپنگ ولو

ہیمپٹن کورٹ پیلیس سے نکل کر گرم چائے پینے کی طلب ستا رہی تھی۔ پرانے قلعوں یا محلوں سے نکل کر جیسی فضولیات اندر بھر جاتی ہے ویسی ہی بیکار چیزیں دل میں بھری ہوئی تھیں۔ ایک بہت ہی بیکار سا احساس! اُداسی بھی... مگر ا کھڑی اکھڑی۔ کہ آدمی اپنی اداسی میں بھی نہ ڈوب سکے۔ کبھی تم نے سوچا ہے کہ شام کے وقت دل کیوں گھبرایا سا رہتا ہے۔ عجیب بدحواسی میں کانپتا ہوا۔ کیونکہ تب نہ روشنی ہوتی ہے اور نہ اندھیرے کا گہرا سمندر، جس میں آدمی غرق ہو جائے۔ پرانی عمارتوں یا تواریخ سے گذر کر لوٹنا اتنا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے۔

وہ تو کہو، وہاں ٹیمز تھی، کچھ کشتیاں تھیں۔ اگر ٹیمز ندی وہاں نہ ہوتی اور وہ کشتیاں نہ ہوتیں تو دل کا کیا حال ہوتا۔ یہ سوچ سکنا کتنا مشکل ہے۔

پت جھڑ کی وہ پہلی شام تھی۔ ہو سکتا ہے پت جھڑ پہلے جا چکا ہے۔ مگر میں نے اسے اسی شام دیکھا۔ ٹیمز کے ساحل کے درخت پتوں کا دان کر رہے تھے۔ جھڑتے ہوئے پتے ندی کے پانی پہ آہستہ آہستہ تھرکتے ہوئے بہہ رہے تھے۔

ندی... وہ چاہے ٹیمز ہو یا گنگا، سندھ ہو یا وانگا... ہمیشہ اتنا احساس تو دیتی ہی ہے کہ یہ زندگی صرف تواریخ نہیں ہے۔ تواریخ کے آگے بھی آدمی کو جانا ہوتا ہے۔

اگر میں ٹیمز کے ساحل پر نہ اترتا تو شاید ریگینا سے ملاقات نہ ہوتی۔ میں ادھر اتر کر جھڑتے ہوئے پیڑ کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ تھا جیسے کبھی دلّی کی پارلیمنٹ اسٹریٹ کے نیم کے جھڑکتے درختوں کے نیچے کھڑا ہو جاتا تھا۔ تم چاہو یا نہ چاہو، یادیں ہمیشہ اپنے کو دہرا لیتی ہیں۔ پھر یادوں کا نیا لمحہ ایک اور چھوٹا سا عنصر جوڑ کر چلا جاتا ہے۔

جیسے ریگینا ہی کی بات ہے۔ بہت مختصر سی ملاقات ہوئی... مگر ریگینا ان تمام یادوں میں کچھ اور اضافہ کر کے وہیں بیٹھی رہی۔

اُس ساحل پر کشتیاں کھڑی تھیں۔ ریگینا بھی اُدھر ہی تھی۔ ٹیمز کا پاٹ یہاں چوڑا نہیں تھا۔ اس لئے وہ بہت قریب لگ رہی تھی۔ پتہ نہیں، مگر میرے ساتھ ہمیشہ یہی ہوتا ہے... یہی کہ بھیڑ بھاڑ میں یا کہیں اکیلے میں کوئی دکھائی پڑتا ہے تو یکایک محسوس ہونے لگتا ہے کہ میرا اس سے کچھ مطلب ہے۔ یہی ریگینا کے بارے میں بھی ہوا۔

ٹیمز کے اس پار پہنچا تو یکایک فوٹ میں راست راحت نظر آیا۔ چائے کی طلب نے زور مارا اور میں راست راحت میں گھس گیا۔ چائے کا پیالہ لے کر میز پر بیٹھا ہی تھا کہ ریگینا دوسری میز پہ دکھائی دی۔ اس کا رنگ غمازی کر رہا تھا کہ وہ مشرق کی ہے۔ مغرب کی تو قطعاً نہیں۔ اس سے قبل کہ میں اسے دوبارہ دزدیدہ نگاہوں سے دیکھوں، وہ میری میز کے قریب آ کر کھڑی

ہوگئی۔ دھیرے سے انگریزی میں بولی "تم ہندوستانی ہو؟"

"ہاں" میں نے کہا۔

وہ میرے مقابل بیٹھ گئی۔ بولی "میں نٹال کی ہوں۔ ساؤتھ افریقہ۔ نٹال۔ عیسائی ہوں۔"

"یہاں گھومنے آئی ہو؟"

"نو میں، گھومنا کیا ہوتا ہے؟ بس کہیں چلے جانا۔ کہیں سے اوب کر اکھڑ جانا۔ اسے تم گھومنا کہو گے؟" اس نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

"تو ہیمپٹن کورٹ پیلیس دیکھنے آئی تھیں؟"

وہ قدرے جھجکی یا شاید میرے اس سوال پر اس نے مجھے اچھی طرح سمجھنا چاہا۔ یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میں نے کوئی بہت غلط سوال کر دیا ہے۔ تب ہی گویا وہ اپنے خول میں سما گئی۔ بولی۔ "میرے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔ وہ پیلیس دیکھنے گئے ہیں۔ میرا دل نہ چاہا کہ میں وہاں جاؤں۔ کہہ دیا، یہاں انتظار کروں گی۔ بس اسی لئے رکی ہوئی ہوں۔ دیر ہوگئی، اب وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔"

بات یہاں پر ایک طرح سے ختم ہو جانی چاہیے تھی، پھر بھی بوٹ ہاؤس ریسٹ ہاؤس کا خالی خالی ہال دیکھ کر دل چاہا کہ سناٹے کو جمنے نہ دیا جائے۔ کچھ رک کر میں نے کہا۔ "آپ ہندوستانی ہیں؟"

"نہیں" وہ بولی۔ "بہت عرصہ پہلے میرے گرینڈ فادر نٹال آئے تھے انڈیا سے۔ وہ ہندو تھے۔ پھر میرے پتا نے عیسائی مت قبول کر لیا۔ میں عیسائی ہوں۔ تم نے کبھی سوچا ہے کہ مذہب بدلنے سے آدمی کی خواہشات بھی بدل جاتی ہیں۔"

میں کیا جواب دیتا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو یوں ہی میں نے کہہ دیا۔ "میں نے ابھی تک تو مذہب تبدیل نہیں کیا۔"

"تبدیل کرنا بھی مت۔" وہ جیسے چیختی ہوئی بولی۔ "عیسائی ہو عیسائی رہنا۔ ہندو ہو تو ہندو رہنا۔ مسلم ہو تو مسلم رہنا۔ مذہب بدلنے سے آدمی کو پرانی تہذیب کا پاس کرنا ہوتا ہے، جو ہمیں الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتی ہے، پھر ہمیں جوستی ہے اور تمہیں علم ہے۔" کہتے کہتے وہ رکی اور اس نے اپنا سوال بدل دیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نام! کملیشور۔ کیوں؟ یکایک آپ کو میرے نام کی ضرورت کیوں پڑ گئی؟" میں نے پوچھا۔

"اس لئے کہ اس تہذیب میں آدمی بے نام ہو گیا ہے۔ مجھے نام نہ معلوم ہو تو بہت کھویا کھویا سا محسوس کرتی ہوں۔ تم نے اپنا صحیح نام بتایا ہے؟" کہتے ہوئے اس نے مجھے قدرے اعتماد سے دیکھا۔

"ہاں" میں نے کہا۔

"چلو تسلیم کئے لیتی ہوں، ورنہ تمہارا پاسپورٹ دیکھتی۔" چائے کا آخری گھونٹ لے کر اس نے بات کا آخری سرا پکڑا۔ "تہذیب و تمدن ایک بیوپار ہے کملیشور..... اور آج کا آدمی اس بیوپار کی کرنسی ہے۔ ہم تم کرنسی ہیں۔"

میں نے نظر چرا کر گھڑی پر نگاہ ڈالی کیونکہ ہیمپٹن سے مجھے پانچ بج کر بیس منٹ کی گاڑی واٹرلو کے لئے پکڑنی تھی۔ رینگینا کے ساتھی ابھی تک نہیں آئے تھے۔ اس نے مجھے تاڑ لیا تھا۔ بولی۔ "تم جاؤ۔" وہ چاہتی تھی یا خود بھی شاید اپنے کو بچانا چاہتی تھی۔ بولی۔ "تم جاؤ۔ یہ کرو کہ یہاں سے بوٹ سے واٹرلو چلے جاؤ۔ صرف چار گھنٹے لیتی ہے۔"

میں نے اس کی طرف بغور دیکھا۔ ہیمپٹن سے واٹرلو تک ۴۵ منٹ میں پہنچا جا سکتا ہے، وہ چار گھنٹے والا راستہ اختیار کرنے کو کیوں کہہ رہی ہے..... مجھے دیکھتا دیکھ کر وہ مسکرا دی۔ پھر دھیرے سے بولی۔ "وہ ہمیشہ اس راستے

ستے جاؤ جو دیر ہی کہیں پہنچتا ہو۔ سمجھے۔ سمجھے۔ کیونکہ راستہ ہمیشہ تمہیں بہتر آدمی بناتا ہے۔ جیسا کہ وہ کسی بھی دھرم میں پیدا ہوتا ہے، نیچرل!"

وہ بھی اب کچھ سپلٹا رہی تھی۔ میں اس کے اندر کی گھبراہٹ کو بھی دیکھ رہا تھا۔ ہم بوٹ میں راست راحت سے نکل کر اسٹیشن کی طرف چلنے لگے تھے۔ میں نے پھر گھڑی دیکھی اور بیجا نچانے میں ایک بیہودہ سوال کر بیٹھا۔ "پانچ بج کر ۱۵ منٹ ہو رہے ہیں پیلیس تو شاید ساڑھے چار بجے بند ہو جاتا ہے۔ آپ کے ساتھی لوگ ابھی نہیں آئے۔۔۔ اور اب آپ یہاں اکیلی۔۔۔"

اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ بولی "تم جہاں جہاں جاؤ وہاں سے ایک پکچر پوسٹ کارڈ بھیجتے جانا۔"

"لیکن آپ کا پتہ؟" میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

"پتہ لکھو۔ رینگینا میوالال، کیئر آف انڈر دی بلو اسکائی۔"

اس کے اس مذاق سے میں نے کچھ گھٹن محسوس کی۔ کیا اس نے مجھے راہ چلتے دل پھینک آدمیوں کی طرح سمجھا ہے! میں نے نوٹ بک جیب میں رکھ لی۔

"تم نے مجھے غلط سمجھا" رینگینا نے یکایک پگھلتے ہوئے کہا۔ "میرا پتہ سچ مچ کوئی نہیں ہے۔ جب کسی کے پاس وہ سب کچھ نہ ہو جسے لے کر وہ اکیلا رہ سکے، تب اس کا کوئی پتہ نہیں ہوتا۔"

مجھے محسوس ہوا، وہ اپنے میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔ میں اسٹیشن کی طرف بڑھا تو اس نے کہا، "تم جاؤ۔ میرے ساتھی آتے ہوں گے۔ بائی۔"

اور میں اسٹیشن کی طرف بڑھ گیا۔ وہ ٹیمز کے ساحل کی طرف چل دی۔ میں اپنی ہڑبڑی میں تھا۔ ٹکٹ لے کر پلیٹ فارم پر پہنچا تو گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ ہیمپٹن کچھ دور دراز کا اسٹیشن تھا، اس لئے لندن تک کی گاڑیاں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے چلتی تھیں۔ اب میرے پاس پھر قریب چالیس منٹ کا وقت تھا۔

وقت گذاری کے لئے میں ایمبینکمینٹ کے سہارے آکر کھڑا ہو گیا۔ دیوار کے نیچے موزے کی شکل میں گھاس کا چھوٹا سا قطعہ پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بعد بھیگا ہوا کنارہ تھا۔ داہنی طرف تین چار کشتیاں کھڑی تھیں۔ اس پار والا درخت خاموش کھڑا تھا۔ کبھی کبھار ایک آدھ پتے چپ چاپ چکراتے ہوئے جھڑتے اور خاموشی سے گھاس پر لیٹ جاتے۔

موزے کی شکل میں پھیلا ہوا گھاس کا چھوٹا سا میدان اور بھی زیادہ خاموش لگ رہا تھا۔ دور پر، اس کی ایڑی کے پاس ایک وپینگ ولو کا درخت بال بکھرائے کھڑا تھا۔ اس کے بال دھیرے دھیرے سرسرا رہے تھے جس سے احساس ہو رہا تھا کہ ہوا ابھی کہیں چل رہی ہے۔

وپینگ ولو کے نیچے بینچ تھی اور اس بینچ پر رینگینا چپ چاپ بیٹھی تھی، وہ ٹیمز کی روانی دیکھ رہی تھی یا بادلوں کا بکھرنا۔ اس کا کچھ علم ادھر سے نہیں ہو رہا تھا۔ کیونکہ اس کی پشت اس طرف تھی۔

میرا دل چاہا کہ نیچے اتر کر جاؤں اور چپ چاپ اس کی بغل میں بیٹھ جاؤں۔ اس وپینگ ولو کے درخت کے نیچے، مگر اس کی تنہائی کو توڑ دینے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس کا سفری سامان بھی بنچ پر رکھا ہوا تھا۔ جسے میں نے اس سے قبل نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس پر کہنی ٹکائے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ شاید اپنے میں پوری طرح مستغرق یا اپنے سے بہت دور!

رینگینا کے ساتھی اب تک نہیں آسکے تھے۔ اس کے کوئی ساتھی یقیناً آنے والے تھے یا نہیں، اس کا ٹھیک سے پتہ نہیں تھا۔

وقت جیسے رک گیا تھا۔ ابھی کل پانچ منٹ گذرے تھے، وپینگ ولو کے نیچے بیٹھی رینگینا اتنی بے حس و حرکت تھی کہ وہ ایک مجسمے کی طرح لگ رہی تھی۔ پھر وہ نہیں ہلی۔ پورے تیس منٹ میں اسے دیکھتا رہا۔۔۔ ٹیمز بہہ رہی تھی۔ وپینگ ولو

کے بکھرے بال کانپ رہے تھے مگر رینگینا بے حس و حرکت تھی۔

میں اسٹیشن کی طرف چلا آیا تھا۔

دوسرے دن انّا کو پکچر پوسٹ کارڈ بھیجتے ہوئے میں نے لکھا تھا۔ "ہیمپٹن کورٹ پیلیس کے سامنے ٹیمز ہے۔ ٹیمز کے دائیں کنارے پر موزے کی شکل میں کٹا ہوا گھاس کا چھوٹا سا قطعہ ہے۔ اس کی ایڑی پر ہیننگ ووڈ کا ایک درخت ہے۔ درخت کے نیچے بینچ پر رینگینا نامی ایک لڑکی کا مجسمہ ہے جو اپنا سفری سامان لئے وہاں بیٹھی ہے۔ کبھی انگلینڈ آنا تو اس مجسمے کو ضرور دیکھنا۔ اس کا پتہ ہے۔ کیئر آف انڈرڈی ملوا سکائی۔" ★

اے میرے وقت کے انسان! سن، تیرا ساتھ کوئی نہیں دے گا۔ میرے دوست صرف ادیب دے گا۔

پریم چند! میں آپ کا شکرگذار ہوں، محتاج نہیں۔

روی ٹھاکر! تم نے بہت چھلا ہے آدمی کی روح کو۔ اب بند کرو۔

سارتر بابو! آپ کا ہم وجودی فلسفہ جد وجہد کرنیوالے آدمی کو کمزور بنائے گا۔

مارکیوز اور دیبرے! تم نے ذہنی انقلاب کا سامان دیا۔ تاریخ تمہیں معاف نہیں کرے گی۔

معاشی طور پر بدحال میں دنیا اپنا حق مانگ رہی ہے۔ کون ہے جو اس بنیادی سنگھرش میں ساتھ دے گا۔ اقتصادی آزادی کے بعد بھی دوسری آزادیوں کی بات لڑے گی۔

بایاں بازو لازوال ہے۔

آدھی دنیا

جہاز چھوٹنے میں کچھ دیر تھی۔ جیٹی کے مستول پر بیٹھی چڑیاں اجنبیوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں۔ جیسے وہ اڑنے کے لیے قطعی تیار نہ ہوں۔ کھولتے ہوئے پانی کے بلبلوں کی طرح ان میں سے ایک دو دھیرے سے پھدکتی تھیں اور پھر وہیں سما جاتی تھیں۔ کہیں کوئی ہڑبڑی نہیں تھی۔ پاس کنٹرول گیٹ ابھی کھلا ہوا تھا۔ ٹرین جہاز میں لد چکے تھے۔ بیڑیوں کی طرح پٹری زنجیریں اسے جکڑے ہوئے تھیں۔ پاس کنٹرول کے ارد گرد کچھ لوگ الگ تھلگ کھڑے تھے۔

دوپہر ہو چکی تھی، پر سب کچھ بجھا بجھا سا تھا۔ سورج پر بادل نہیں تھے۔ اوپر تک چھایا ہوا کہرا تھا۔ سورج جلیٹن کے گول ٹکڑے کی طرح صرف دکھائی دے رہا تھا ——— ٹھنڈا ٹھنڈا ——— ڈوبر کی سیدھی سپاٹ چٹانیں چپ چاپ کھڑی تھیں اپنے اوپر مٹی کی لیپ لگائے۔ چٹانوں پر اُگی ہوئی پتلی گھاس سمندری ہوا سے دھیرے دھیرے کانپ رہی تھی۔ کاروں کی آخری قطار بھی اپنا آخری چکر کاٹ کر اوپری ڈیک کے گیریج میں سما چکی تھی۔ اوپری ڈیک کے گیریج میں کوئی کھڑکی نہیں تھی، وہاں رکنا مشکل تھا۔ کوئی رک بھی جائے تو ساڑھے تین گھنٹے کیا کرے؟ . . . آخر ہم دونوں کار سے اتر آئے۔ اب اوپر جا کر کسی کھڑکی کے پاس بیٹھے سمندر دیکھتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا!

لندن سے ڈوبر تک ہم اتنی باتیں کر چکے تھے کہ اب کوئی خاص بات کرنے کو نہیں رہ گئی تھی۔ اسے زمبیا میں جدا ہو گئی اپنی محبوبہ کی یاد بھی ستا رہی تھی۔ لیکن وہ محبوبہ کے بارے میں جب بھی وہ بات شروع کرتا تو کافی بناوٹی لگتا تھا، پر سات آٹھ جملوں کے بعد جب وہ خاموش ہو جاتا تو لگتا تھا اس کی باتوں میں ڈھونگ نہیں ہے۔

گیریج سے ہم ابھی اوپر پہنچے ہی تھے کہ لگا جہاز پانی پر دھیرے سے کھسک کر پھیلنے لگا ہے۔ دوسرے ہی لمحہ لگا کہ جیٹی پر بیٹھے پنچھیوں کی قطار پیچھے کھسک رہی ہے۔ ہم کھڑے ہیں اور وہ پھیلی ہوئی پست عمارت، جیٹی اور ڈوبر بندرگاہ کی چٹانوں والی لمبی دیوار پیچھے کھسکتی جا رہی ہے!

ہمیں بھوک لگ چکی تھی۔ ریستوراں میں جانے کے پہلے پیسے بدل لینا ضروری تھا۔ اصل میں مارتھا مجھے وہیں ملی تھی ——— بینک کاؤنٹر کے پاس قطار میں کھڑی ——— اسے بھی پیسے بدلنے تھے! اگر اس کے ساتھ وہ تین خاصے ڈراؤنے کتے نہ ہوتے تو شاید ہماری بات بھی شروع نہ ہوتی! ہاتھ میں دستانہ پہنے ہوئے وہ تینوں کی زنجیر پکڑے ہوئے تھی۔ بہت سختی سے نہیں! میں کیو میں کچھ فاصلہ چھوڑ کر کھڑا ہوا تھا۔ وہ میری دقت سمجھ گئی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس نے کہا تھا ——— "ڈرو مت، پاس آ جاؤ، یہ بڑے معصوم ہیں ——— !"

میں کچھ پاس چلا گیا تھا۔ کیو میں انتظار کرتے کرتے وہ بولی ——— اپنے وطن جا رہے ہو؟

—— نہیں، ابھی تو بلجیم —— پھر آگے —— میں نے کہا تھا!

—— بلجیم میں رکو گے؟ اس نے پوچھا تو مجھے لگا، وقت کاٹنے کی یہ معمولی باتیں ہیں۔ اس کے ہونٹ اگر بے حد خوبصورت نہ ہوتے تو شاید میں فالتو باتوں کے اس جھمیلے میں نہ پڑتا۔!

—— 'ہاں رکوں گا'! میں نے کہا۔

—— پیٹرس لومبا (Patris Lomumba) کے قاتلوں کے ملک میں تم رکو گے؟ ایسی کیا ضرورت پڑ گئی ہے! پیٹ کی خاطر؟ وہ خوبصورت ہونٹوں سے ابھی تک دیکھ رہی تھی۔ اس بار میں نے اس کی آنکھیں دیکھیں۔ وہ بھی بہت خوبصورت تھیں۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کوئی بھٹکتا ہوا ایشیائی ہوں۔ جو روزی روٹی کے لئے اپنے وچاروں کو رومال میں باندھ کر بھٹک رہا ہے۔

—— نہیں، میں شاید ان لوگوں کو بتا سکوں کہ انقلاب اب بھی ہوتے ہیں۔ ... میں کہہ ہی رہا تھا کہ اس نے بات بیچ میں سے کاٹ دی —— لیکن تم ویتنامی نہیں ہو! نہیں ہو نا ——؟

—— اس سے کیا فرق پڑتا ہے، میں بنگلہ دیشی کا ہو سکتا ہوں!

ہماری اس دلچسپ بات کا سلسلہ جاری رہتا، پر ایکس چینج کاؤنٹر کا بالو طاق جیسی کھڑکی پر تھاپ دے کر ما تھا کو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔ وہ چونکنا ہو کر دھیرے سے مسکرائی اور اپنے پیسے بدلنے لگی۔ اس کے کتے اب بے چین ہو رہے تھے۔ وہ اس بری طرح سے اسے کھینچ رہے تھے کہ ڈیوائڈر کی چھڑی بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹی جا رہی تھی۔ سنبھلتے ہوئے اس نے کہا —— میرا پیسہ تم لے لو، میں ابھی آئی ——!

اپنے پیسے بدلوا کر میں انتظار کرتا رہا۔ وہ کتوں کو لئے ہوئے پتلی گیلری سے نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ میں سگریٹ سلگا کر کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ اس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ پاس کے کاؤنٹر سے عورتیں سستے عطر اور آدمی سگریٹ و سگار خرید رہے تھے۔ میں پتلی گیلری سے ہوتا ہوا ریستوراں کا چکر کاٹ کر وہیں واپس آ گیا۔ وہ اب بھی نہیں آئی تھی عجیب سی الجھن اور بھوک میں پھنسا ہوا میں کرنسی گنتا رہا اور حساب لگاتا رہا کہ دس پونڈ کے کتنے فرینک مجھے ملے ہیں۔ اتنے میں وہ آ گئی۔ ہنستے ہوئے اس نے معافی مانگی —— میرے شوہر سن ڈیک پر چلے گئے تھے۔ کتوں کو ان کے پاس چھوڑ کر آتی تو راستہ بھول گئی۔ آؤ، بیئر پئیں!

پھر اسی پتلی گیلری سے گذرتے ہوئے ہم نے رسمی تعارف کی رسم پوری کر لی تھی۔ مارتھا کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں ہندوستانی ہوں۔ اور مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ وہ گریک ہے۔ تعارف کو خوشگوار کرنے کے لئے لگتی ہوئی بات میں نے کہی —— گریک بہت اچھے ہوتے ہیں! تمہاری تہذیب اور تمہارا تمدن، ...

—— بکواس مت کرو، اس نے ایک دم کہا تو میں چکرا گیا تھا —— خدا کے لئے بکواس مت کرو! کسی کے لئے یہ کیوں ضروری ہو کہ وہ ایسی باتیں کرتا رہے؟ تم جیسے لوگوں کے لئے تو یہ قطعی ضروری نہیں ہونا چاہئے!

—— تمہیں کیسے معلوم کہ 'میں' —— 'جیسے لوگوں میں' ہوں! میں نے پوچھا۔

—— جو پیلر پیو گے یا ...؟ وہ بیئر کے بارے میں پوچھ رہی تھی!

—— مجھے نہیں معلوم کون سی پینی چاہئے!

—— تم جو پیلر ہی پیو! اس کے بعد موول کھائیں گے!

—— موول ..؟

مچھلی! تلی ہوئی! تم پسند کرو گے!

ہم بیئر کے گلاس لے کر حرکت کرتی ہوئی میزوں کے پاس آکر بیٹھ گئے! کھڑکی سے سمندر جھانک رہا تھا۔ مارتھا کے ہونٹ اب بھیگ کر اور بھی خوبصورت ہو گئے تھے۔ اس نے بیئر کا گلاس ٹیبل میں بنے گھیرے حصوں میں پھنسا کر رکھ دیا، پھر اس نے مجھے غور سے دیکھا ۔۔۔ وہ شاید کچھ بات شروع کرنا چاہتی تھی ۔ مجھے مائیکل کا دھیان آرہا تھا۔ جو اتنی دیر سے اکیلا چھوٹ گیا تھا ۔ شاید وہ وہیں کھڑکی کے پاس بیٹھا اپنی سیگرڈ محبوبہ کے خیالوں میں ڈوبا ہوگا۔ یا سمندر کو دیکھتا دیکھتا سو گیا ہوگا! تیسری بات ہوتی تو وہ تلاش کرتا ہوا آر کی طرف ہی آیا ہوتا۔ جہاز اتنا بڑا نہیں تھا کہ آدمی کھو جائے۔ اصل میں وہ ایک بڑا بوٹ تھا، جو ڈوبر سے اوسٹنڈ تک جاتا تھا۔

مارتھا یہ جان کر کہ میں خاموش رہنا چاہتا ہوں، موٹے اور بھدے شیشے کی کھڑکی کے باہر کانپتے سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ کھڑکی میز پوش کی شکل کی بنی تھی۔ لوہے کا فریم بڑے بھدے بولٹوں سے کسا ہوا تھا۔ بولٹ بھی پرانے تھے۔ ایکا ایک وہ بڑے بھدے سے بولٹ میرے احساس میں چبھنے لگے۔ نیچے میز کا پایا بھی جس حصے سے جڑا تھا، اس میں بھی بولٹ لگا ہوا تھا۔ سب کچھ صرف دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا، سمندر، میز، بار، بار کی الماریاں، بوتلیں گلاس، فرش پر پڑا ہوا ریپر، ٹیبل کے سوراخ میں پھنسا ہوا مارتھا کا گلاس، کہ تب ہی میز پوش کی طرح تنی اور جکڑی ہوئی کھڑکی کی فریم میں ایک پرندہ آگیا تھا۔ اس کے پنکھ وغیرہ میں سُروں کی طرح لہراتی ہوئی جنبش ہوتی ہوئی دکھائی نہ پڑتی تو شاید ایسا لگتا کہ وہ بھی کھڑکی میں چپکی ہوئی ہے۔ مارتھا اسے دیکھتے دیکھتے اٹھی اور میری بغل میں آکر بیٹھ گئی۔ دور پڑے گلاس کو اٹھا کر میں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ایک پورا گھونٹ لے کر اس نے پنچھی کی طرف اشارہ کیا۔ دھیرے سے بولی، ـــــ یہ اکیلا پنچھی ڈوبر سے ساتھ ساتھ اڑتا ہوا آرہا ہے ـــ کتنا عجیب ہے نا ـــ اکیلی روح کی طرح اڑتا ہوا وہ پنچھی ـــ!

مجھے لگا کہ وہ جذباتی ہو رہی ہے، میں نے یونہی کہا ـــ پورٹ پر تمہیں کوئی چھوڑنے آیا ہوگا.. شاید وہ تمہیں چھوڑ نہیں پایا۔ اس کی ادھوری خواہش کو لے کر وہ پنچھی تمہارا پیچھا کر رہا ہے ـــ کیوں، شاید ـ؟

مارتھا نے بہت خوش ہو کر ایک بار پنچھی کو، پھر مجھے دیکھا ـــ میں نے کہا ـــ ہاں، نہیں، ایسا کچھ نہیں لگتا ـ!

ادھوری خواہشوں کو لے کر اُڑ سکتا .... پنچھی کی طرح ... سوچ کر بہت اچھا لگتا ہے نا ـ ایسا ہوتا ہے ـ؟ وہ گلاس کو تھامے ہوئے جواب کا انتظار کرنے لگی ـ!

ـــــ شاید، میں نے کہا ـ!

کچھ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا، لگا کہ وہ اندرونی طور پر کسی گہری بے چینی اور ہلچل میں الجھ گئی ہے۔ وہ لگاتار مجھے تاکتی جا رہی تھی، اس کے خوب صورت ہونٹ جو ابھی ترو تازہ تھے، ہلکے ہلکے سوکھ گئے تھے۔ دھیرے سے اس نے اپنا ہاتھ میرے بالوں میں پھنسا لیا تھا اور بولی تھی ـــــ تمہارے بال بہت خوب صورت ہیں ـ

میں نے اس کا ہاتھ تو نہیں ہٹایا، پر اسے اسی کی بات ضرور یاد دلا دی ـ.. تم جیسے لوگوں کو اس طرح کی فکروں کی ضرورت نہیں ہونی چاہیئے ـ!

ـــــ تم غلط سمجھے۔ وہ بولی ـ۔ یہ تو اپنے من کے بوجھ ہیں۔ ایک من دوسرے من سے انہیں ادھار بھی لے سکتا ہے، لیکن تم جو جملہ بولے تھے وہ رٹا ہوا جملہ تھا ـــــ بیئر اور پی لیں ـــ کہتے ہوئے وہ پہلے

کی طرح میں پھر بیئر پینے چلی گئی۔ اس بار اس نے جلدی جلدی بیئر پی لی۔ اور گلاس خالی کر کے سوراخ میں پھنسا دیا۔ پھر اٹھ کر کھڑی ہو گئی ۔۔۔ اب کھانا کھائیں! میں اپنے شوہر کو بلا لاتی ہوں۔ تم ادھر آجاؤ ۔۔۔!

۔۔۔ میرے ساتھ ایک دوست بھی ہے۔!

۔۔۔ ٹھیک ہے! انہیں بھی بلالو! کہتے ہوئے وہ بار کاؤنٹر سے گذرتے ہوئے ادھر چلی گئی جہاں ڈیک پر جانے والی سیڑھی تھی۔ لگتا تھا سمندر طوفانی ہو گیا ہے۔ مجھے اتنی بیئر نہیں پینی چاہئے تھی۔ لوہے کی ٹھنڈی دیوار کا سہارا لیتا ہوا میں ادھر گیا جہاں مائیکل بیٹھا تھا۔ پر وہ وہیں سیٹ پر اپنا چھوٹا سا بیگ دبائے، پیر موڑے گہری نیند میں سو رہا تھا۔ میں نے اسے جگایا ۔۔۔ مائیکل! چلو کھانا کھالیں!

نیند میں ہی اس نے جواب دیا ۔۔۔ "میں نے کھالیا ہے"

۔۔۔ کب؟ ۔۔۔ کیا کھالیا ہے؟

۔۔۔ آلو اور بیئر! اچھا تھا ۔۔۔ تم بھی کھا آؤ۔ ویسے ہی لیٹے لیٹے اس نے کہا۔ وہ نیند میں تھا۔ مائیکل رسم و رواجوں میں زیادہ یقین نہیں کرتا اس لئے یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ یہ اندازہ لگا کر کہ مارتھا کو اوپر سے آنے میں کچھ وقت لگے گا، میں وہیں بیٹھ گیا۔ جہاز اب بھی کافی ڈگمگا رہا تھا۔ یوں تو زیادہ تر انگلش چینل شانت رہتی ہے۔ شاید ہوا تیز تھی یا سمندر کے رخ بدلنے کا وقت تھا۔ چھوٹے سے سفر کے لیے نکلے ہوئے لوگ اب زیادہ تر اونگھ رہے تھے۔ یا جہاز کے جھٹکوں سے ان کی نیند اڑ گئی تھی۔ سیلانی لوگ اوپر سن ڈیک پر تھے ۔۔۔ اپنی اپنی کرسیاں ڈالے ہوئے۔

وقت کا اندازہ کر کے میں ریستوراں کی طرف چل دیا۔ وہاں بھی کوئی بھیڑ نہیں تھی۔ شاید زیادہ تر لوگ اپنا کھانا ساتھ لائے تھے۔ بیئر کے ساتھ انہوں نے سینڈوچز کھا کر کھانا ختم کر دیا تھا۔ ایک میز پر مارتھا دکھائی دی۔ اس کے پاس بیٹھا ہوا ایک لگ بھگ بوڑھا سا آدمی تھا۔ شوہر کے سوا کون ہو سکتا تھا؟ میں جا کر تیسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ مارتھا کا تقریباً بوڑھا شوہر ضرورت سے زیادہ کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے مسکرا کر میرا استقبال کیا۔ اور اس سے پہلے کہ کھانا آئے، وہ کچھ اس طرح سے بولا، جیسے وہ مجھے برسوں سے جانتا ہو ۔۔۔ اب آپ ہی اسے سمجھائیے! آپ اس کے عاشق ہیں، آپ کی بات یہ مان جائے گی۔

۔۔۔ جی! میں نے حیرت زدہ ہو کر، بلکہ اچنبھے میں قریب قریب چیخ کر کہا۔۔۔!

۔۔۔ ہاں! آپ ہی اسے سمجھائیے! میری بات یہ نہیں مانتی، وہ تقریباً بوڑھا آدمی رومال نکال کر ناک صاف کرنے لگا تھا۔ میں نے کچھ سمجھا ۔۔۔ یہ خاص انگریزی عادت ہے، بات کو ذرا جاننے کے لیے میں نے پوچھا ۔۔۔ آپ انگریز ہیں؟

۔۔۔ نہیں تو! بوڑھا بولا اور گندہ رومال اس نے انگریزوں کی طرح تہہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس کی ناک کے سرے پر رستے خون کی سی سرخی چھا گئی تھی۔

مارتھا ہلکے سے ہنسی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ بوڑھا شخص بالکل شکستہ یا مایوس نہیں تھا بلکہ اس کی آنکھوں میں وشواس کی چمک تھی۔ ایک عجیب سے بھولے پن میں ملی جلی ۔۔۔!

مچھلی کی پلیٹ میرے سامنے آگئی تھی۔ مارتھا بھی سول (مچھلی) ہی لے رہی تھی۔ بوڑھے نے آلو، سبزیاں اور پنیر لیا تھا ۔۔۔ بات کا سرا پکڑتے ہوئے بوڑھے نے پھر کہا ۔۔۔ آپ نے میری بات پر غور نہیں کیا۔۔!

۔۔۔ پر بیچ میں مارتھا بول اٹھی ۔۔۔ تم آرام سے کھانا کھاؤ! بوڑھے نے کانٹا چھری روک کر پھر اسی ۔۔۔ لا معلوم وشواس سے بھری نگاہوں سے اسے دیکھا ۔۔۔ ایک لمحہ رک کر وہ مجھ سے بولا ۔۔۔ یہ مانتی ہی نہیں! ۔۔۔ میں کہتا

ہوں تم جوان ہو، حسین ہو اور وہاں فوجی حکومت ہے . . . .

بات کو سمجھنا بڑا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے مشکل میں پڑتے ہوئے پوچھا ـــ کہاں ! ـــ کہاں کی بات آپ کر رہے ہیں ؟

ـــ اپنے پیارے دیش کی ! آپ بتائیے یہ وقت وہاں جانے کا ہے ، لوگ گریس چھوڑ چھوڑ کر باہر آ رہے ہیں، اور یہ وہاں جا رہی ہیں ۔ . . . . 'ہے نہ غلط بات !' سارا سامان باندھ لائی ہے ۔ کہتی ہے گیسٹ ہاؤس بیچ دو ۔ خیر، گیسٹ ہاؤس تو میں نے نہیں بیچا، لیکن . . . . وہ بوڑھا اب بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا ۔

ـــ دھیرے دھیرے سب باتیں سامنے آتی جا رہی تھیں ۔ ـــ مارتھا، اس بوڑھے فوکس کی تیسری بیوی تھی ۔ اور یہ کہ اب وہ گریس جانا چاہتی ہے ۔ اسے انگریز پسند نہیں آئے تھے ۔ فوکس کھلتے پھلتے کاروبار کو چھوڑ کر لوٹنے کو حماقت سمجھتا تھا ۔

وہ چاہتا تھا کوئی مارتھا کو سمجھائے ۔ اصل میں فوکس، یوگوسلاویہ تک اسے چھوڑنے جا رہا تھا ۔ اس کے بعد فوکس کی مرضی کے خلاف جو کچھ ہونے والا تھا اس کا ذمہ دار وہ بننا نہیں چاہتا تھا ۔

ـــ تم کسی بات کے ذمہ دار بننا نہیں چاہتے ! مارتھا تقریباً چڑ کر اپنے شوہر سے بولی تھی ـــ کیا ہوگا میرے ساتھ ؟ ـــ فوجی مجھے کھا تو نہیں جائیں گے !

معمر شخص نے رحم کے ساتھ اسے دیکھا ۔ پھر وہ اپنا پنیر کھانے میں مشغول ہو گیا تھا ۔ وہ آخری ٹکڑا کھا رہا تھا ۔ میں کھانا ختم کر چکا تھا ۔ آخر ہم تینوں چپ چاپ اٹھ آئے ۔ ریلنگ پکڑ پکڑ کر بوڑھا سن ڈیک پر چلا گیا ۔ پیچھے پیچھے مارتھا اور میں بھی ـــ کچھ دیر ہم یوں ہی ادھر اُدھر دیکھتے رہے ۔ بوڑھا جیب سے روٹی نکال کر چمنی کے پاس چلا گیا ۔ وہیں سے وہ چڑیوں کے لئے ٹکڑے پھینکتا رہا ۔ پر چڑیاں وہاں نہیں تھیں ۔ وہ اکیلا پرندہ بھی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا ۔ جہاز اب ایک مستقل رفتار سے چلا جا رہا تھا ۔ آسمان میں ٹھنڈا سورج دمک رہا تھا ۔ اور جہاز کے پیچھے دور تک پانی کی کیچڑ آلود سطح چمکتی دکھائی دے رہی تھی ۔ !

ـــ 'چلو نیچے چلیں !' مارتھا نے آ کر کہا ۔

ہم دونوں نیچے آ کر بیٹھ گئے ۔ ایکا ایک اس نے پوچھا ـــ 'کیوں، میں غلطی کر رہی ہوں ؟'

ـــ میں کچھ بھی سمجھ نہیں پایا ہوں، کیسے کچھ کہہ سکتا ہوں ۔ ! ؟

ـــ میں بتاتی ہوں، دیکھو ـــ میں نہایت معمولی لڑکی ہوں ۔ سیدھی سی بات ہے ۔ میں اپنے دیش جانا چاہتی ہوں ۔ تمہیں معلوم ہے وہاں اکال پڑا ہوا ہے ؟ اس نے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا ۔ !

ـــ اکال ـــ یونان میں ؟ میں نے تو نہیں سنا !

ـــ اناج کا نہیں . . . . وچاروں کا ! میرے شوہر سمجھتے ہیں، سات بکسوں میں سامان بھر کر لائی ہوں ۔ ان میں صرف کتابیں ہیں، رسالے ہیں ۔ میرے دیش میں فوجی حکومت ہے ۔ کتابیں، اخبار نہیں نکلتے . . . . جو کچھ جمع کر پائی وہی سب لے جا رہی ہوں ۔ کچھ غلط کر رہی ہوں ؟ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا . . سرحد پر وہ مجھے روک لیں گے ۔

ـــ روک رکھیں گے اور کیا ـــ ؟ وہ جذباتی ہو گئی !

ـــ تمہارے شوہر کو دوسری فکر ستا رہی ہے ، تم اتنی جوان ہو ـــ میں نے کچھ شیطانی سے کہا ـــ !

ـــ کیا میں تب ہی تک جوان ہوں جب تک بیوی ہوں ! بیوی ہونے سے پہلے کیا میں جوان نہیں تھی ؟

یا بیوی بن کر رہنے کے بعد جوان نہیں رہ جاؤں گی؟ — پہلے کس نے فکر کی تھی، بعد میں کون کرے گا۔؟ چھوڑو... چلو کچھ پئیں گے! مارتھا نے کہا تھا اور وہ مجھے زبردستی باہوں سے پکڑ کر اٹھا لائی تھی۔

ہم پھر بار کاؤنٹر پر تھے۔ میں اپنے آپ کو عجیب سے بھنور میں پھنسا پا رہا تھا۔ کھانے کے بعد پینا میرے بس میں نہیں — میں نے بیئر پی تھی، مارتھا نے وہسکی! ہم اسی میز پر پھر بیٹھے تھے۔ وہی کھڑکی تھی، اور وہی جھانکتا ہوا سمندر —!

— میں نے کہیں پڑھا ہے کہ.... 'اب ہم صرف انسان رہ گئے ہیں۔ ہندوستانی یا گریک یا جاپانی بنے رہنا غلط ہے؟ کیوں —؟ ہے نا —! وہ اب شانت ہوتی جا رہی تھی۔

کچھ دیر تک میز پوشں نما کھڑکی سے باہر دیکھنے کے بعد وہ پھر بولی۔ — پر نارے بھی اب نہیں ہیں — سمندر کتنا اداس اداس لگ رہا ہے —! نہیں؟

— ہاں، میں نے کہا — شاید اسٹینڈ آ رہا ہے!

— میں شوہر کو یہیں سے واپس بھیج دوں؟

— میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں؟ میں نے شبہ کے ساتھ کہا!

— دیکھو تم بلجیم ہوتے ہوئے اسکینڈی نیویا چلے جاؤ گے۔ میں جرمنی، یوگوسلاویہ، آسٹریا ہوتی ہوئی گریس، پر مجھے معلوم ہے کہ ہم تم ملتے رہیں گے! وہ بولی —!

مجھے لگا کہ وہ پھر جذباتی ہو رہی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ میں ابھی آئی — کہہ کر وہ چلی گئی، لوٹی تو شوہر کے ساتھ تھی۔ کتے بھی ساتھ تھے۔ وہ اپنے شوہر کی باہوں میں باہیں ڈالے ہوئے تھی۔ وہ دونوں وہیں آ کر بیٹھ گئے۔ وہسکی آ گئی تھی اور اس کا شوہر بڑے اطمینان سے پی رہا تھا۔ رہ رہ کر وہ شوہر کو پیار کرنے لگی تھی۔

جب تک اسٹینڈ آیا، وہ میاں بیوی — مارتھا اور فوکس — وہیں بیٹھے پیتے رہے۔ میں مائیکل کے پاس جانے کے لئے چلنے لگا تو وہ اتنا ہی بولی — تمہیں جلدی نہ ہو تو رکنا۔ جہاز سے اتر کر رکنا —!

کچھ ہی منٹوں بعد جہاز کنارے لگ گیا تھا۔ میں اور مائیکل اپنی کار اتار کر نیچے لے آئے تھے۔ ہم مارتھا کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ نشے میں دھت، شوہر کے ساتھ، کتوں کی زنجیریں پکڑے آئی۔ اور اپنے شوہر کو میرے حوالے کرتے ہوئے بولی — ان کا بکنگ کرا دوں، ذرا سنبھالنا —!

اور وہ اس کاؤنٹر پر پہنچ گئی تھی۔ جہاں سے واپس جانے والے جہاز کا ریزرویشن ہو رہا تھا۔ جس سے ہم آئے تھے، وہی واپس جانے والا تھا۔ مارتھا اپنے شوہر کو وہیں سے واپس بھیج رہی تھی۔ ٹکٹ لے کر وہ آئی اور شوہر کو لے کر واپس جہاز میں جانے لگی۔ تو تقریباً بوڑھے شوہر نے اختلاف کیا — میں نہیں جاؤں گا، تم نہیں سمجھتیں۔...

مارتھا نے اسے ہونٹوں پر چوم کر بہت پیار سے آگے سرکایا، پھر سہارا دے کر لے جانے لگی۔ مائیکل کتے پکڑے کھڑا رہا۔ جہاز میں جاتے جاتے بھی اسے بوڑھے شوہر کا بڑبڑانا سنائی دے رہا تھا، تم جوان ہو اور وہاں........

پاس کنٹرول پر ہمیں دیر لگی۔ بہت سخت چیکنگ تھی۔ مارتھا اپنے کتے لے کر ٹرین کی طرف چلی گئی تھی۔ جہاز سے اترے ٹرین کے ڈبے ٹرانس یوروپین ایکسپریس میں جڑ گئے تھے۔ وہ گاڑی گریس ہوتی ہوئی ترکی جا رہی تھی — ڈوبتا سورج کافی نیچے سرک آیا تھا۔ دھند گہری ہو رہی تھی۔ جیٹی پر کچھ پرندے سکڑے بیٹھے تھے۔ دور جہاں ٹرین کھڑی تھی شیشے کے اندر تین کتے سے دکھائی دے رہے تھے۔ انہیں کے بعد دھندلی سی کھڑکی پر مارتھا کھڑی سی لگی تھی۔

کملیشور

تتلی

کیرین اداس تھی۔ اسے پتہ تھا کہ صبح ہمیں چلا جانا ہے۔ لیکن اداس تو وہ یوں بھی رہتی تھی۔ اس دن بھی اداس ہی تھی جب پہلی بار ملی تھی۔ ہم ہالینڈ کے گاؤں کا راستہ بھول کر اینٹورپ کے ایک انجانے سے چھوٹے شہر میں پہنچ گئے تھے۔ زبان کی بھی دقت تھی۔ فرنچ سے کام چل سکتا تھا۔ پر یہ فلیمش علاقہ تھا۔ ٹیورن کی ادھیڑ عمر عورت مدد تو کرنا چاہتی تھی، پر وہ فرنچ بولنا نہیں چاہتی تھی آخر اس نے بیئر کا گلاس سامنے رکھا اور فون کرنے لگی۔

جب تک اس نے فون کیا اور پتہ معلوم کر کے کیرین لینے آئی، میں اس چھوٹے سے ٹیورن کو دیکھتا رہا، ادھیڑ عورت کو دیکھتا رہا جو بار بار بیئر گلاس بغیر کہے بھر دیتی تھی، چھوٹے سے بلیئرڈ روم میں ان اسپینیوں کو دیکھتا رہا جو کھیلنے سے زیادہ ہنس رہے تھے جب میں راستہ بھولا تھا، اس وقت شام ہو چکی تھی۔ پلاسٹک کی طرح چکنی سڑکوں کے کنارے لگی بجلی کی بتیاں، گلابی سے لال اور اس کے بعد لال سے پیلی ہو گئی تھیں۔ کہرا بہت تھا۔ کیرین کے آنے تک ادھر ادھر دیکھنے اور سوچنے کے علاوہ کرنے کیلئے کچھ نہیں تھا۔ زبان کی اجنبیت اور عدم واقفیت کی وجہ سے گفتگو بھی مشکل تھی، سوائے چند لفظوں کے۔ دیر ہو جانے کے باعث طبیعت الجھ بھی رہی تھی۔ جب جب وہ ادھیڑ عورت بیئر کا گلاس بھرتی، میں آہستہ سے "میرسی واکد" کہہ کر اسے دیکھنے لگتا۔ وہ مسکرا دیتی اور کاؤنٹر کی طرف چلی جاتی۔

کیرین کے انتظار کے علاوہ اور کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اسی دوران اپنا وطن بھی یاد آیا۔ پھر ان یورپی ملکوں میں دھیان بٹ گیا۔

گلدستے کی طرح سجے یہ شہر اور دیش... اور... اسی لمحے گولکنڈہ کی یاد آئی۔ اینٹورپ اور گولکنڈہ۔ ایک ہے ایک تھا ہیروں کی منڈی، گولکنڈہ کی ہیروں کی اس منڈی میں اب غریب درزی اور سبزی والے بیٹھتے ہیں۔ ویٹس کا گلاس ٹھنڈا ہوا تو اچھا لگا۔ کچھ دیر غور سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا۔ آنے جانیوالے زیادہ نہیں تھے۔ اس لئے کیرین جب آئی تو پہچان لینے میں دقت سے زیادہ جھجک حاوی ہوئی۔ شاید اس لئے کہ وہ اداس لگ رہی تھی۔ جی میں آیا کہ اس وقت میرا راستہ بھول جانا اور اس کا لینے آنا یہ کچھ ٹھیک نہیں ہوا ہے۔ شاید اسے بہت اچھا نہیں لگا ہے۔ لیکن میری بھی مجبوری تھی۔ بڑھتی رات میں، میں اور کہیں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ اینٹورپ میں کسی کو جانتا بھی نہیں تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان لمحات کے بھاری پن کو منظور کر کے میں کیرین کے ساتھ نرمی سے پیش آنے کی کوشش کروں۔

ابتدا میں تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ مسکرائیگی نہیں۔ لیکن وہ مسکرائی۔ بوجھل پن کچھ کم ہوا۔ سامنے بیٹھتے ہوئے اس نے ادھیڑ عورت کو اشارہ کیا کہ ویٹس اسے نہیں چاہیئے اور پھر کہا۔ "گھر کا راستہ بھی کبھی کوئی بھولتا ہے؟" پھر بولی "کتنا اچھا ہوتا اگر میں راستہ بھول گئی ہوتی اور کوئی مجھے لینے آتا"...

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کے سنہرے بالوں کی لٹ سامنے جھول آئی تھی اور کچھ ایسا بھی لگا جیسے آنکھیں بڑی بڑی ہو گئی تھیں۔ جیسے کبھی کبھی گہری اداسی میں ہو جاتی ہیں۔ بات جاری رکھنے کے لئے میں نے کہا۔ "گھر کا راستہ بھولنا شاید آسان نہیں ہوتا"۔۔۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ مجھے لگا کہ اتنی خاموشی میں اب ہال گاؤں تک کا راستہ کیسے طے ہوگا؟ اور یہ کہ کیرین کے گھر میں ٹھہرنا کہاں تک درست ہوگا۔ لیکن کوئی دوسری صورت نہ تھی۔ خفت، خجالت اور قدرے پچھتاوے کے ساتھ یہ رات تو مجھے گزارنی ہی تھی۔ سردی بڑھ رہی تھی اور کہر بھی گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ بد قسمتی کہ میری گاڑی میں Fog Lights بھی نہیں تھے۔

اس سے پہلے کہ میں بے دلی کا اظہار کروں اور ساتھ ہی جانے کی ضرورت کی کشمکش کا اظہار کروں۔ کیرین کاؤنٹر پر میرا بل ادا کر کے آئی اور بولی۔ "چلیں"۔

تمہارے ملک کی شاہراہیں بہت خوبصورت ہیں۔ میں نے خموشی توڑنے کے لئے پھر بات شروع کی۔

"یہ ہٹلر کی دین ہے۔۔۔ خفیہ راستے۔۔۔ فوجوں کے لئے بنائے گئے یہ راستے، اسی کی دماغی اُپج ہے۔ تاکہ فوجیں، بستیوں کے باہر سے ہی گزر جائیں۔ ان کی سرگرمی کا پتہ نہ چلے، دوسرے ممالک کی سرحدوں پر پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔ اب ایسے ہی راستے تقریباً سب ملکوں نے بنا لئے ہیں۔۔۔ یہ بتاتے بتاتے اس نے اپنی کار کا دروازہ کھولا۔۔۔ بولی۔ "تم پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ ہم تیسری لین میں چلیں گے۔ گاؤں، قریب قریب ۵۰ کیلومیٹر ہے۔ بس آہستہ آہستہ چلے آؤ۔ ٹھیک ہے نا؟

کہرے میں لپٹا ہوا یہ فاصلہ تکلیف دہ اور لمبا ہو گیا تھا۔ سفید دھوئیں کی سرنگ میں کیرین کی عقبی روشنیاں دیکھتے دیکھتے چلتے رہنے کی یکسوئی گراں گزرنے لگی تھی۔ شاہراہ پر کوئی ٹریفک نہ تھا۔ رات کے ساڑھے گیارہ بج چکے تھے۔ آخر بائیں طرف مُڑ کر ایک کالی پہاڑی سی دکھائی دی۔ لیکن حقیقتاً وہ جنگل تھا اور اس میں داخل ہوتے ہی روشنی کا ایک دھبہ اور سفید دیوار دکھائی دی تو میں نے سمجھ لیا کہ اب ہم پہنچ گئے ہیں۔

وہ ایک خوبصورت کاٹج تھا۔ اونچے اونچے پیڑوں کے بیچ میں۔ میں بستر اتارنے لگا تو کیرین نے کہا۔۔۔ تمہارا بستر لگا ہوا ہے۔ سامان بندھا رہنے دو۔ صبح اتار لینا اور اپنے ہاتھوں میں دستانے پہنتی ہوئی وہ کاٹج کی پچھلی طرف چل دی۔

گھاس کی نمی، اس سوکھی ٹھنڈک میں کچھ زیادہ ہی اچھی لگی۔ پتلون کے پائینچے بھیگ کر اب موزوں کو بھی بھگونے لگے تھے۔

وہ آؤٹ ہاؤس لکڑی کا تھا۔ خاص کاٹج کے پیچھے۔ گھنے پیڑوں کے درمیان۔ بھیگے ہوئے درختوں میں جیسے سردی چھپی بیٹھی تھی۔ ایک لمحہ بعد ہی بھیگی گھاس چبھنے لگی تھی۔ کیرین نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ کاٹج۔ یعنی لکڑی کا ایک کمرہ جس میں چیڑ کی مہک بھری ہوئی تھی۔ ایک کونے میں پتھروں سے گھرا آتشدان تھا۔ جس میں لکڑیاں جل کر انگارے بن چکی تھیں۔

کیرین نے بستر دکھاتے ہوئے کہا۔۔۔ ٹھیک ہے؟ یہ لکڑیاں رکھی ہیں۔ پودینے کی چائے پیو گے؟

اب بہت رات ہو گئی ہے۔۔۔ بتانے میں۔۔۔ میری بات ادھوری ہی رہ گئی۔ کیرین جھٹ بولی۔

میں چائے بنا کر تمہیں دینے گئی تھی۔ اب بس اسے گرم کرنا ہے۔ میں نے سوچا کہ آخر تم ہندستانی تو ہو ہی! چائے ہی پسند کرو گے؟

اب صبح پیونگا۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں!۔

اچھا! گڈ نائٹ۔۔۔ اور کیرین چلی گئی۔

میں بستر میں گھس کر لیٹ گیا، دہکتے انگاروں اور لکڑی کی تپتی دیواروں پر گرم اور تیز سرد ہوا کی جیسے ملائم تہیں چڑھ رہی تھیں۔ چیڑ کی مہک بکھری ہوئی تھی، بستر کی اپنی مہک تھی، کچھ دیر بعد جب ذہن میں سب کچھ رس بس گیا۔ وہ جنگلی اندھیرا، چیڑ کی مہک، سرد اور گرم ہوا کی نیلی ریشمی لپٹیں اور بستر کی مہک، تب اپنے آپ نیند آ گئی۔

اور پھر صبح ہوئی، یعنی آنکھیں کھلیں۔ گھڑی میں وقت دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ صبح ہو گئی ہو گی۔ آتشدان میں انگاروں کی دودھیا راکھ سوکھے چمپا کے پھولوں کے ڈھیر کی طرح جمی ہوئی تھی۔ بڑا سا چمٹا پاس پڑا تھا۔ لکڑیوں کا ڈھیر خاموش تھا۔ دروازے کے پاس نائیلون کی کترنوں کی بنی جھالریں چپ چاپ تاگوں کے ساتھ لٹک رہی تھیں۔

بے حد عجیب تھی وہ صبح۔ آواز سے محروم صبح۔ سب کچھ خاموش اور گم۔ کھڑکی کھولی تو اس کی آواز سے لگا کہ کہیں کوئی آواز ہو سکتی ہے۔ لکڑی کے فرش پر دھپ دھپ کیا تا کہ کوئی آواز تو ہو! کچھ تو کہیں سے سنائی دے۔ بھوج اور دیودار کے اونچے درختوں میں بھی آواز نہ تھی۔ گھاس جیسے بھیگ بھیگ کر دم توڑ چکی تھی۔ سڑی ہوئی گھاس پر پڑے بھوج کے سوکھے پتے تازہ مردے کی آنکھوں کی طرح تاک رہے تھے ... بھیانک سناٹا ... میں نے ہتھیلیاں رگڑیں، سردی سے بچنے کیلئے نہیں، سرسراہٹ کی آواز پیدا کرنے کیلئے۔ کہ دیکھیں یہاں ان میں آواز ہوتی ہے یا نہیں۔

پھر لکڑیوں کو چمٹے سے کھڑکھڑایا ... آواز ہوئی ... زور زور سے لکڑی کے فرش پر چلا ... پھر آواز ہوئی۔ لیکن یہ کھیل بھی بہت بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ آواز ہوتی تھی اور مٹ جاتی تھی۔ اس کی کوئی بازگشت یا گونج نہیں ہوتی تھی۔ یہ کیسے درخت تھے، کیسا جنگل تھا، کیسی گھاس تھی، کیسی ہوا تھی۔ جنہیں کوئی آواز نہ تھی، جیسے سب سناٹا پیدا کرتے ہوں میں نے کھانس کر دیکھا، کھانسی بھی بکھر گئی۔ جتنی آواز پیدا کر لو ... بس اتنی ہی ..

سامنے کاٹیج کو غور سے دیکھا۔ بے جان کاٹیج کھڑا تھا۔ کیسا منظر تھا یہ؟ جیسے رات میں ہی کیرین اور اس کے ماں باپ کا قتل ہو گیا ہو اور اس مردہ ماحول میں، میں اکیلا رہ گیا ہوں۔ ذہن پریشان ہو گیا، جی گھبرانے لگا۔ میں نے گانے کی کوشش کی۔ آواز فوراً غائب ہو جاتی، اپنی ہی آواز ڈراؤنی لگی۔ کوئی گانا ایسے کیسے گایا جا سکتا ہے۔ آخر اپنے سے گھبرا کر میں بستر میں پھر دبک گیا اور آنکھیں بند کر کے اپنے ہی ساتھ سو جانے کا ناٹک کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بیکار۔ بےچینی جب اور بڑھی اور دم گھٹنے لگا تو بستر سے نکل کر میں نے پھر فرش پر پیر پٹخنے کا عمل دہرایا، وہی دھپ دھپ۔ اور اس کے بعد وہی گہری خموشی ...

اچانک ایسا لگا کہ اگر سب ہی جنگل، پیڑوں یا گھاس سے، یا آس پاس سے آواز نہ پھوٹی تو پاگل ہو جاؤں گا۔ ہوا چاہے نہ ہو، لیکن آواز تو ہو اور اسی پاگل پن کی حالت میں لگ بھگ دروازہ توڑتا ہوا سا ... باہر ٹھنڈی گھاس پر نکل کر ایکدم زور سے چیخا تھا ...

کیرین ...

پھر بھی کوئی آواز نہیں ہوئی ... صرف بے آواز کیفیت غالب رہی۔ کاٹیج کا پچھلا دروازہ کھلا۔ ہاتھ میں چھوٹی سی ٹرے لئے کیرین دکھائی دی۔ ہلکے ہلکے مسکراتے ہوئے۔ اس کے چل کر آنے اور مسکرانے سے ماحول میں ایک ذرا سا ارتعاش پیدا ہوا۔ مگر سناٹا پھر بھی نہیں ٹوٹا۔

"گڈ مارننگ" اور کیرین کے ٹرے میں برتنوں کے ڈھیر سے کھڑکھڑا جانے کا احساس ہوا۔ جیسے ایک سانس آئی "تم نے کپڑے کیوں اتار رکھے ہیں؟"۔

کپڑے!! میں نے اپنے کو غور سے دیکھا۔ ہاں! سچ مچ! میں ننگے بدن کھڑا تھا، اس بھیانک سردی میں۔ مجھے بالکل ہوش نہ تھا کہ کس کیفیت کے تحت اور کب، گھٹتی سانسوں سے نجات پانے کیلئے میں نے کپڑے اتار دئے تھے، رات میں تو میں، پوری آستینوں والا سوئیٹر تک پہنکر سویا تھا۔

"گرمی لگ رہی تھی"۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"سردی کھا کر بیمار پڑ سکتے ہو!" کیرین نے دھیرے سے کہا۔ "عجیب ہے، کپڑے پہن لو۔ میں چائے بناتی ہوں"۔

میرے کان کھڑے ہو گئے تھے، کیرین کی ہلکی سانسوں کی سرسراہٹ، کیتلی کے ڈھکنے کے دھیرے سے ہل کر بند ہو جانے کی آہٹ، پھر کیرین کے ہاتھ سے چمچہ چھو جانے اور پیالی سے چمچے کے ٹکرانے کی ہلکی سی آواز۔ پھر پیالے میں چائے گرنے کی آواز کا احساس اور پھر شکر ملانے کے لئے چمچے کا بار بار پیالی کی تہہ میں گھسٹنے سے آواز کا احساس...!

مجھے سردی لگنے اور کپڑے پہننے کی خواہش کا اور زندہ ہونے کا احساس بھی ہوا۔

کیوں! چائے اچھی نہیں لگی! کیرین نے پوچھا۔

"بہت اچھی ہے"۔

"تم کہو تو چھٹی لے لوں، تمہیں سیر کرا دوں" "گراں کافے" میں اچھی چائے بھی پلا دوں۔ تم تیار ہو جاؤ تو چلا جائے کیا کہتے ہو! تو بجے نکل چلیں"۔ یہ کہکر وہ اٹھ گئی۔

مجھے معلوم تھا کہ کیرین کے ماں باپ، اسی سامنے والے کاٹیج میں تھے۔ لیکن تعجب ہو رہا تھا کہ ان سے ملنے ملانے کی بات وہ نہیں کر رہی تھی۔ شیشے کی کھڑکیوں پر بھی آتے جاتے ہوئے ان کی جھلک نہیں دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا انحصار کہ ان سے ملاقات ہو کیرین کی مرضی پر تھا۔ اس سے پہچان بھی پرانی نہ تھی۔ پھر ہم اتنے بے تکلف بھی نہیں ہوئے تھے کہ بلا جھجک ایک دوسرے سے پوچھ سکیں۔

ٹھیک ۹ بجے وہ اسی دروازے میں دکھائی دی جس میں سے وہ صبح چائے لیکر آئی تھی۔ آتے ہی بولی۔ چلیں!!

"ہوں"۔ میں نے کہا۔ تو وہ مسکرائی۔

اور ہم گاؤں سے نکل کر عام سڑک پر آ گئے۔ لوم کے پاس سے گزرے تو مٹی جلنے کی بو آ رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔ یہ مٹی جلنے کی بو کیسی ہے؟۔

"شکر ہے تم نے بات تو کی"۔ کیرین نے گاڑی کی رفتار دھیمی کرتے ہوئے کہا اور پھر بتایا "یہ اینٹوں کا بھٹہ ہے۔ اچھا یہ بتاؤ۔ تم سگریٹ پینا بند نہیں کر سکتے؟

میں خفیف بھی ہوا۔ شرمندگی کی بات بھی تھی۔ شاید ایئر کنڈیشنڈ گاڑی میں دھوئیں کے ذریعے منڈلاتی ہوئی سگریٹ کی مہک اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے دروازے کا چڑھا ہوا شیشہ اتار کر اس مہک اور بو کو دور کر دینا چاہا تو وہ پھر مسکرائی۔ "تم میری بات سمجھے نہیں!..

"کیا؟"۔

"سگریٹ والی بات۔ میں چاہتی ہوں تم کچھ بات کرو۔ سگریٹ تمہیں بات کرنے نہیں دیتی۔ تنہا بنا دیتی ہے یہ خاموشی تمہیں نہیں کھلتی؟ کوئی بات ہوتی رہے تو کتنا اچھا ہو"!۔

اس کے یہ کہتے ہی صبح والا بوجھل پن یکایک لوٹ آیا اور مجھے لگا کہ شاید کیرین بھی اتنی ہی پریشان ہے

میں نے کہا۔ "اچھا تم یہاں کی تفصیلات اور مقامات کے بارے میں بتاتی چلی جاؤ۔"
داہنی طرف اینٹورپ چھوڑ کر اب ہم بروسلس کی طرف نکل آئے ہیں۔
اور...
"میرے ملک کی آبادی ایک کروڑ ہے۔"
اور...
"ہم بہت خوشحال ہیں۔"
یہ کیسے اور کیوں؟...
"کیونکہ ہم کٹانگا اور بیلجین کانگو کی کانوں سے سونا اور تانبہ کافی مقدار میں حاصل کر چکے ہیں اور اس معدنی دولت نے ہمیں خوشحال بنا دیا ہے۔"
اور...
یہ بی پی ہے... برٹش پیٹرول، لیکن ہم اسے "بوائر پس" یعنی "گنوار کا پیشاب" کہتے ہیں۔
اور...
بروسلس آگیا ہے۔ اب ہم تمہیں چائے پلائیں گے۔
"یہاں اتنے کم لوگ کیوں ہیں؟ کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ میں چاہوں تو تمہاری راجدھانی کی سڑکوں پر آتے جاتے لوگوں کی گنتی کر سکتا ہوں"۔
"گنتی کرنے لگ جاؤ گے تو پھر باتیں بند ہو جائیں گی"۔ یہ کہتی ہوئی وہ میرا ہاتھ پکڑ کر "گراں پلاش" میں آگئی۔ کار ہم نے باہر چھوڑ دی تھی۔ "گراں پلاش" پتھریلی اینٹوں کا چھوٹا سا چوک تھا... خالی خالی اور سونا سونا سا۔ اس نے قدرے فخر سے کہا "گراں کا فے اور گراں پلاش"۔
ایک بہت پرانا کیفے۔ اجڑا اجڑا سا، پرانا اور تھکا ہوا سا۔ بیچوں بیچ کھڑا ہوا ایک مردہ گھوڑا۔ ادھر ادھر، دیواروں اور محرابوں پر لٹکتے ہوئے لکڑی کے گھوڑے، چھتوں سے لٹکتے تانبے کی تبیوں کے گچھے۔ ہم لکڑی کے زینے پر چڑھ کر اوپر پہنچ گئے۔ چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کے پاس لگی ہوئی میزیں بھی اداس تھیں۔ کیرین نے چائے کے لئے کہہ دیا تھا۔ شراب کے پیالوں میں گرم پانی آگیا تھا اور اس گرم پانی میں تلی چائے کی پوٹلی دھیرے دھیرے رنگ چھوڑ رہی تھی۔
"تمہارا ملک کتنا خوبصورت ہے؟"
بہت!
"بہت کیا ہوتا ہے... کچھ بتاؤ تو"... کیرین نے ضد کی۔
تمہارے بالوں کی طرح خوبصورت! مگر بے حال...
وہ تھوڑا سا شرمائی۔ پھر انگلی پر ایک لٹ لپیٹتے ہوئے بولی۔ "یہ سچ مچ خوبصورت ہے۔ خیر چھوڑو! یہ بتاؤ کہ کیا انگریزوں نے تمہیں بہت لوٹا ہے؟"
"بہت زیادہ!"
"لوگ بہت غریب ہیں؟"

زیادہ تر!

کچھ دیر وہ چپ رہی - پھر موضوع بدلتے ہوئے اس نے کہا - "کل صبح تم ہالینڈ چلے جاؤ گے ؟ -

ہاں ! . . .

تو آؤ - تمہیں کچھ اور مقامات کی سیر کرا دوں - یا گھر چلنا ہے ؟

"گھومتے پھرتے گھر نکل چلیں گے -"

گھر ؟!

"تم گھر سے گھبراتی کیوں ہو ؟" -

گھبراتی کہاں ہوں ، صرف اتنی سی بات ہے کہ گھر - گھر نہیں لگتا -"

"کیوں ! ماں باپ سے کچھ" ؟!

نہیں ، وہ تو بہت اچھے ہیں - انھیں خود گھر ، گھر نہیں لگتا - ہم خود کو قدرتی مناظر میں گھرا رکھنا چاہتے تھے - اسی لئے ہم نے حال ہی میں یہ گھر بنوایا تھا - سوچا تھا پھول ہونگے ، چڑیاں ہونگی ، تتلیاں ہونگی ، گلہریاں ہونگی -

لیکن جرمنی ! . . .

" جرمنی ! جرمنی سے اس کا کیا لینا دینا ؟ ملک تمہارا ہے ، قدرت کے دئے ہوئے سارے خزانے تمہارے ہیں ، گھر بھی تمہارا ہے " . . .

ہاں ہے تو - لیکن . . . اور یہیں پر اس نے سلسلۂ کلام منقطع کر دیا -

* * * *

ہم گھومتے پھرتے گھر لوٹ آئے تھے ، رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم یو دینے کی چائے پی رہے تھے ، سردی اور کہرا بہت تھا - کیرین نے آتشدان میں لکڑیاں دہکا دی تھیں ، وہ بار بار اپنے بالوں کی لٹ انگلی میں لپیٹ رہی تھی - میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے سامنے ، کاٹج کی طرف دیکھ لیتا تھا - جہاں صرف ایک کھڑکی روشن دکھائی دے رہی تھی - کیرین بھی بار بار میری بھٹکتی نظروں کو دیکھ رہی تھی - آخر میں نے ہی خاموشی کو توڑا - "میں تم سے ناراض ہوں " -

کیوں ؟ وہ میرے قریب کھسک آئی -

"تم نے اپنے ماں باپ سے بھی اب تک نہیں ملوایا ؟ " -

ماں تو خیر بیمار ہے - وہ اٹھ نہیں سکتی - والد آج ہی شام میں تم سے ملنے کیلئے آنیوالے تھے - لیکن آج ہی ، انہوں نے پیر زخمی کر لیا ہے - محض پاگل پن میں !!

" پاگل پن میں ؟ " -

اور کیا -

" تمہاری باتیں میں پوری طرح سمجھ نہیں پاتا " -

مشکل تو کچھ نہیں ہے - اگر سمجھنا چاہو تو ! لیکن شاید تم میری . . . سمجھ نہیں پاؤ گے !

" تم بہت اکیلی - تنہا تنہا سی ہو " -

کیا مطلب ؟

"مرد کی کمی" ! ؟ — میں نے جھجک توڑتے ہوئے کہا۔

وہ آہستہ سے ہنسی۔ پھر بولی ۔۔۔ بس یہیں تک دماغ کام کرتا ہے؟ تم مرد نہیں ہو کیا؟ اس وقت تم میرے بالکل قریب ہو۔ مرد کی کمی کہاں ہے۔ وہ تو کہیں بھی مل جاتا ہے۔ مل سکتا ہے۔ لیکن صرف گھر اور مرد ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ کیا گھر اتنی باتوں سے بن جاتا ہے؟ —

اس کے چہرے پر اداسی کے بادل چھا گئے۔ وہ ایک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ باہر سے سردی اور آتش دان سے گرمی کی ریشمی لپٹیں پھر حملہ کر رہی تھیں۔ اس نے چپ چاپ دونوں پیالیاں اٹھا کر ٹرے میں رکھ دیں اور ہاتھ پھیلا کر اپنی ہتھیلیوں کو بغور دیکھنے لگی۔

"دوپہر میں تم پھولوں اور تتلیوں کی کچھ بات کر رہی تھیں"؟ میں نے پوچھا۔

ہاں — جرمنی کی بھی! —

"یہ جرمنی بار بار کیوں گھس آتا ہے؟" —

ہمارا گاؤں سرحد کے بالکل قریب ہے۔ جرمنی کا عظیم صنعتی مرکز "ڈوسلڈروف" جب سے قائم ہوا ہے، ہمارے دیش کی قدرتی دولت ہم سے چھن گئی ہے۔ اب نہ یہاں پھول کھلتے ہیں، نہ چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ زہریلا صنعتی دھواں سب چاٹ گیا۔ اس ویرانگی کا تصور کرتے ہی ۔۔۔؟ ہم اسی لئے شہر چھوڑ کر یہاں آئے تھے کہ "بے رکھ" ہونگے۔

"بے رکھ"؟ —

ہاں یہ سفید چھال والے خوبصورت پیڑ ۔۔۔ اس نے بھوج کے درختوں کی جانب اشارہ کیا، جس کا تنا کھڑکی سے دکھائی دیتا تھا ۔۔۔ اس نے پھر کہا۔ لیکن سب اجڑ گیا۔ جب سے ڈوسلڈروف کا زہریلا دھواں دیش بھر میں پھیلا ہے۔ ہمارے ہرے بھرے درختوں سے ہریالی روٹھ گئی ہے وہ سوکھتے اور مرجھاتے جا رہے ہیں۔ نئی پتیاں بھی اس طرح نکلتی ہیں جیسے کوئی ان پر جبر کر رہا ہو۔ پھولوں کا کھلنا عرصہ ہوا بند ہو گیا۔ چڑیاں نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ گلہریوں نے آنا بند کر دیا ۔۔۔ والد صاحب پاؤں زخمی کر بیٹھے، اور بتاؤں ایسا کیونکر ہوا؟ — میں اور تم تو بروستس میں تھے۔ دوپہر میں وہ نکلے تو ایک زمانے کے بعد ایک جگہ گلہری پھدکتی اور دوڑتی دکھائی دی۔ بچوں کی طرح خوش ہو گئے۔ گلہری کو قریب سے دیکھنے کی خواہش میں ننگے پاؤں دوڑ پڑے۔ مگر ایک خشک جھاڑی کی ٹوٹی ہوئی نوکدار شاخ نے ان کا پیر پھاڑ دیا۔ گلہری تو پتہ نہیں کہاں جا چھپی مگر پاپا اب پٹی باندھے بستر پر پڑے ہیں ۔۔۔ صبح تمہیں ملواؤنگی۔ چڑیاں تو اب آتی ہی نہیں۔ کتنا سناٹا لگتا ہے یہاں۔ گھر، گھر نہیں لگتا۔ کہیں جاؤ تو گھر لوٹنے کے خیال سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔" رہ سکتے ہو ایسے زہریلے۔ ہولناک سناٹے میں تم؟" —

میں چپ چاپ کیرین کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ اس نے انگڑائی لی اور انگلیاں چٹخاتی ہوئی بولی "اپنے وطن پہنچکر خط لکھا کرو گے نا؟" —

"کیوں تمہیں شک ہے کہ ۔۔۔"

نہیں! لیکن کیا پتہ ۔۔۔ شاید ہم ایک دوسرے کو یاد تو رکھ پائیں مگر یہ بھول جائیں کہ کون کس جذبے کے تحت ملا تھا؟! — اچھا۔ گڈ نائٹ۔

اور وہ ٹرے لیکر چلی گئی۔ میں کاٹج کے دروازے پر کھڑا ہو کر اسے گھاس بھری پگڈنڈی سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اپنے کاٹج تک پہنچی۔ دروازہ کھلا۔ پھر بند ہو گیا۔ کچھ دیر کے لئے روشنی ہوئی پھر تاریکی۔ ایک لمحہ بعد اوپر والی کھڑکی میں روشنی ہوئی۔

اس کا ایک پلہ کھلا۔ کیرین کا ایک ہاتھ باہر نکلا۔ شب بخیر کے اشارے کے لئے۔ کھڑکی کا پلّہ پھر بند ہوا۔ روشنی بھی بجھادی گئی۔ اب پھر بھیانک سناٹے کی حکمرانی تھی۔

صبح سامان لاد کر چلنے سے پہلے میں کیرین کے ماں باپ سے ملنے گیا۔ ماں تکیہ کے سہارے نیم دراز تھی۔ باپ پیر میں پٹی باندھے بچوں کی طرح شرماتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ کیرین کچھ چھوٹے چھوٹے پیکیٹ لئے کھڑی تھی۔ اس کے ماں باپ سے رسمی اور رخصتی کلمات کہہ کر جب میں روانہ ہوا تو وہ بھی ساتھ ہی نیچے آگئی۔ بولی۔

پٹرول پمپ تک تمہیں چھوڑ آتی ہوں۔ سفر لمبا ہے۔ کار کی چیکنگ بھی کروا دونگی۔ گیس بھی لے لینا اور ہاں ۔۔۔ یہ پیکیٹ رکھ لینا۔

"اس میں کیا ہے؟" ۔ میں بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

"کچھ ہے۔ بس یونہی ۔ دوسرے دیش پہنچنا تو دیکھ لینا۔"

اس نے وہ چھوٹے چھوٹے پیکیٹ وہیں نشست پر رکھ دیئے۔ خود بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ پٹرول پمپ تک ساتھ چلنے کے لیئے۔

"تمہیں جلدی لوٹنا ہوگا۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

قریب ہی تو ہے۔ اس کا جواب تھا۔

پٹرول پمپ سے آگے سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میں نے کیرین سے بھی رسمی الوداعی الفاظ کہے اور باوجود کوشش کے اس سے اور کچھ نہ کہہ پایا۔

"میں تمہیں خط لکھونگا۔"

اچھا تو یہ ہے کہ نہ لکھنا۔ خطوط سے خاموشی میں بڑا بوجھل اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہو سکے تو پھر کبھی آنا۔ بہت سی باتیں کرینگے۔ اچھا ۔۔۔ کیرین پھر اداس ہو گئی۔ سڑک پر مڑتے ہوئے میں نے اسے ایک بار پھر دیکھا۔ وہ ہاتھ ہلا رہی تھی۔

——— ★ ★ ★ ———

آخر وہ وہیں چھوٹ گئی۔ ہالینڈ کی سرحد پر آکر پاس کنٹرول پر جب میں اپنے کاغذات پر مہریں لگنے جانے کا انتظار کر رہا تھا تو کیرین کے دیئے ہوئے پیکیٹ کھول کر دیکھے۔ ایک میں "مینیکین پیس" کی چھوٹی سی مورتی تھی۔ اسی پیشاب کرتے ہوئے بچے کی جو "گراں پلاس" کے پاس والی گلی میں سردیوں سے سکڑتا ہوا پیشاب کر رہا تھا۔

دوسرے میں مشہور سوتی لیس لگے ہوئے کپڑے پہنے ایک گڑیا تھی۔ تیسرے پیکیٹ میں اس کے سنہرے بالوں کی ایک لٹ اور جو تھے میں کپڑے کی بنی ایک تتلی ۔ ۔ ۔

-- --- ★ ★ ★ ----

محبوب کہانی کار

کملیشور

کو

نذرانۂ خلوص

ایم۔ جی۔ حشمت

(گیت کار)

مشہور ادیب اور ٹیلی ویژن اسٹار

کملیشور

کے متعلق

فن اور شخصیّت کے کملیشور نمبر پر

دِلی مُبارکبادُ

پیش کرنے کا فخر حاصل کرتا ہوں

حاجی مستان مرزا

بیت السرور، وارڈن روڈ، بمبئی ۲۶

اتنے اچھے دن

راتیں

اور

بیان

جیسی لازوال کہانیوں کے خالق

کملیشور

کی نذر

——— گلشن باورا

(گیت کار)

آئینہ خانے میں

★ ہندوستان کی مختلف علاقائی زبانوں
بشمول ہندی و اردو کے مستند ادیبوں
نے کملیشور کی شخصیت کو جو خراجِ عقیدت
پیش کیا ہے وہ اِس حصے میں پیش کیا
جا رہا ہے۔ کملیشور نے نہ صرف ہندوستان
کی تمام زبانوں کے ادیبوں کو قریب لانے
کی کوشش کی ہے بلکہ زبان اور علاقے کی
دُوری کو مٹا کر ایکتا کے رشتے میں جوڑا
ہے۔

اصل میں کملیشور ایک ہندوستانی ادب
کی تخلیق میں سرگرداں ہیں، جسے
دوسرے ادیبوں نے بھی محسوس کیا ہے
اور اُن کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا ہے۔
زیرِ نظر مضامین میں کملیشور اور اُنکے
ساتھی قلم کاروں کی اسی کوشش کی
گُونج ملے گی۔

—— اِدارہ

جوگندر پال

جس طرح میں اسے جانتا ہوں

جوگندر پال اردو کے ہی ادیب ہیں۔ افسانہ نگاری میں ان کا خاص مقام ہے۔ زیر نظر مضمون میں انہوں نے کملیشور کے ادب اور شخصیت کا ہمہ گیر جائزہ لیا ہے۔ جس سے کملیشور کے فن اور شخصیت سے ان کی گہری واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔

اس کا دوسرا مفید پہلو یہ ہے کہ کملیشور کے بارے میں پھیلی ہوئی، بہت ساری غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہوتا ہے۔

★

میری طالب علمی کے زمانے میں مغربی پنجاب کے ہندو گھرانوں میں ہندی، عورتوں تک محدود تھی اور مردوں کی قریبی زبان اردو تھی۔ انگریزی کا یہ تھا بوڑھی نسل میں عام طور پر مرد اور عورت دونوں کو نہیں آتی تھی اور نوجوانوں میں دونوں کو بھونڈے سے سرکاری اظہار و بیان کی حد تک اس پر عبور حاصل تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بوڑھے مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے چپ چاپ پیار کرتے تھے اور نوجوانی کے کولیٹر پڑھ کر احساس ہوتا تھا کہ واقعی محبت کرنے کی بجائے ایک دوسرے کو نوکری کی درخواستیں لکھتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی تھا کہ پنجابی، پنجاب سے باہر کے ہر شخص کو ہندوستانی کہا کرتا تھا اور اسے پردیسی سمجھتا تھا ۔۔۔ ترسیل کی اس نوع کی اولین تربیت کے باعث یہ امر میرے لئے تعجب خیز نہیں کہ اڑتالیس برس کی عمر تک کملیشور جیسے دلچسپ انسان سے ملنا نہ ہو پایا۔

چھٹے اور ساتویں دہے میں نیروبی کی بیشتر خوبصورت خواتین سے کملیشور کی کہانیوں کے چرچے سنتا رہا اور یہ سن کر ٹالتا رہا کہ صنفِ نازک کی بالی ٹہنیوں میں اگا اگا سا ہلکا پھلکا خوش رنگ سا پھول ہوگا، دیکھنے دو، ہمیں کیا؟ ۔۔۔ اور پھر ہم اورنگ آباد میں آبسے یہاں کی خاص خوبیوں میں ہندی کے لوگوں کا میٹھا پن بھی ہے۔ اتنے شیریں ہیں کہ وہ دراصل لڑنا چاہ رہے ہونگے مگر آپ کا یہ گمان نہ ٹوٹے گا کہ وہ آپ کی زبان پر شہد ٹپکا رہے ہیں۔ بس چین سے آنکھیں بند کر کے پنگھوڑے میں پڑے زبان چاٹتے رہئے۔ ان لوگوں نے بھی کئی بار کملیشور کا بڑا پرتپاک ذکر کیا تو بڑی لذت آگیں خوشی ہوئی، مگر بس اتنی سی خوشی!

اور پھر اتفاق سے کملیشور کو پڑھنے کا موقعہ مل ہی گیا۔ اردو "آجکل" کا کوئی ہندوستانی کہانی نمبر تھا۔ کہانی کا پہلا صفحہ سرسری انداز میں پڑھتے ہوئے ذہن میں جھٹکے لگے تو اسے از سر نو بڑے انہماک سے پڑھنا شروع کر دیا اور یوں کملیشور سے پہلی بار متعارف ہوا۔

ہندی کہانی کے تعلق سے میرے دل میں ایک تعصب سا جاگزیں تھا کہ لجلجی اور گیلی گیلی سی ہوتی ہے۔ ادھر آپ نے ہاتھ لگایا ادھر ٹوٹی! (کملیشور کی طرح موہن راکیش کے فن سے واقفیت بھی مجھے اپنی جہالت کے باعث بہت بعد میں نصیب ہوئی) تاہم کملیشور کی کہانیاں مجھے بہت سنبھلی ہوئی معلوم ہوئیں۔ فن کے اسی ٹھہراؤ سے ہی اس میں ازدواجیت اور ضمیر کی پائیداری پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ یہ دو چار دس منٹ کے رشتے سے آگے نہیں بڑھ پاتا۔۔ فن اور زندگی

اندر سے تو سیلے رہتے ہی ہیں، مگر اگر وہ باہر سے سوکھے نہ لگیں تو کیچڑ ہیں ان کی شکلیں نہیں بن پاتیں۔ کملیشور کے فن کا یہی خاصہ ہے کہ اندر سے باہر کی طرف دفعتاً امڈ آنے کی بجائے چھڑکاؤ کرتا ہوا چلا آتا ہے، جس سے مٹی کا ناک نقشہ کیچڑ نہیں ہوتا اور ساری شکلیں جوں کی توں بنی رہتی ہیں۔

میں نے کملیشور کی ذات اور شخصیت کی تلاش میں یہ مضمون شروع کیا ہے لیکن اس کے فن کی باتیں بھی اس لیے چلی آ رہی ہیں کہ اولاً ان ہی کی وجہ سے مجھے اس سے جان پہچان کی خواہش پیدا ہوئی ـــ کملیشور کی ذات سے متعلق سوچتے ہوئے چند ماہ پہلے کی اورنگ آباد دکن کی وہ شام میرے ذہن میں بے اختیار گھس آئی ہے جب ہم چند دوست "کہانیوں کی رات" کی ایک تقریب میں شرکت سے پہلے بیٹھے پی رہے تھے اور خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہوا کملیشور اچانک اداس نظر آنے لگا اور بڑی گمبھیر اور تنی ہوئی آواز میں اپنی یہ واردات بیان کرنے لگا۔

"اُن دنوں میں دلّی میں رہتا تھا۔ آمدنی کا کوئی وسیلہ نہ تھا۔ صبح کو گھر سے نکل کر رات گئے لوٹتا چھوٹا۔ مالوٹ آتا کہ سو کر پھر جُٹ جاؤں گا۔ میں گھر لوٹتا تو میری چھوٹی سی بچی سو چکی ہوتی۔ صبح کے وقت وہ اسکول چلی جاتی تو میری آنکھ کھلتی"۔ کملیشور کو اپنے اندر سے امڈنے کا احساس ہوا تو اس نے اپنے مخصوص فنی ٹھہراؤ سے کام لے کر اپنے کو شعوری طور پر دبا لیا۔ "مجھے محبت کے وسائل ہی نصیب نہ تھے تو میں اپنی بچی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے کیونکر گلے لگا لیتا۔ یہ سارے سال میں نے اپنے آپ کو موقعہ ہی نہیں دیا کہ کبھی اس کے ساتھ بیٹھوں، جی بھر کے اس کے بارے میں اس سے پوچھوں، اسے سمجھوں"۔ وہ اپنے گلاس سے گھونٹ بھرنے کے لئے ذرا ٹھہر گیا۔ "میری یہ بچی میری محبت کے بغیر ہی پل کر بڑی ہو گئی ہے۔ میرے پاس آج محبت کے سارے وسائل ہیں۔ لیکن اب میں کبھی بے اختیار آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لینا چاہتا ہوں تو وہ شرم سی، محسوس کر کے میرے بازوؤں سے نکل جاتی ہے"۔ کملیشور کو شاید اپنے اندر کہیں آگ بھڑکنے کا احساس ہوا اور وہ گلاس کو صرف پانی سے تیز تیز بھر کر منہ کی طرف لے گیا۔ "ارے!" پانی پی کر اس نے گھڑی دیکھی تو چونک پڑا۔ "ہم ابھی تک یہاں اندر ہی پڑے ہیں"۔ وہ اپنی ذات کے دروں خانے سے بھی جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے باہر آ رہا تھا۔ "اس وقت تو ہمیں پنڈال میں ہونا چاہئے تھا"۔

مجھے لگتا ہے کہ کملیشور زندگی کو بھی اپنی کہانی کی مخصوص عادتوں سے ہی برتتا ہے۔ ہنستے ہنستے ہی رو کر ہلکا ہو لینا۔ بڑے غور سے بے دھیان ہو کر کسی کو سنتے چلے جانا۔ ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے نہ ہی نہ کہتے چلے جانا، جیتے جاگتے کرداروں کو بڑی کھلی بات چیت سے اتنا گھما دینا کہ بے چارے اپنے بھوت معلوم ہونے لگیں۔ یا بھوتوں کے کانوں میں جادو پھونک کر انہیں ہو بہو انسان بنا دینا، بنے بنائے موضوعات کے سنگار کو اس طرح کھرچنا، گویا سنگار کو فائنل ٹچ دیا جا رہا ہو، الگ الگ کہانیوں کو جوڑ کر انہیں درس دینا، دیکھو، لمبی عمر چاہئے تو اس طرح ایک قالب زندہ رہو۔ اس آخری پوائنٹ کی دلچسپ مثال پیش کرتا ہوں۔ کملیشور ایس بی کالج، اورنگ آباد دکن کے طلباء کے سالانہ اجتماع کا مہمان خصوصی تھا۔ کوئی تین ہزار طلباء بڑے شوق سے اس کے بھاشن کا انتظار کر رہے تھے۔ اس امید سے کہ ہر سنٹ پر ایک نہ ایک ـــ قہقہانے ہوئے لطیفے سے پیٹ میں بل پڑنے لگیں گے، لیکن کملیشور نے ہندوستانی لبانوں کی نہایت

سنجیدہ قسم کی پانچ چھ کہانیوں کو بڑے جاذب انداز میں ایک ہی قالب میں ڈھال کر اس قدر حساس اور پُر کار سادگی سے نئی زندگی کے موضوع کو سمیٹ لیا کہ جب وہ 'بھاشن' ختم کر کے واپس کرسی پر بیٹھ چکا تھا، بے چین اور شریر طلبا گویا اس وقت بھی بدستور منہ کھولے، کان کھڑے کئے اسے خاموشی سے سنتے جا رہے تھے۔ پھر کیا ہوا؟ —
مختلف لوگوں کی کہانیوں کو ایک ہی جان میں رچا بسا دینا کملیشور کے اس فن کی بھی خوبی کا آئینہ کرتا ہے کہ وہ، زندگی کے بکھرے ہوئے واقعات کو کیونکر کسی ایک ہی واضح یا غیر واضح عنوان میں آباد کر لیتا ہوگا۔

کملیشور اپنی بات میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے لطیفہ گوئی سے کام نہیں لیتا، بلکہ اپنے بیان کی چستی سے ہی تاروں کو جوڑ کر بجلی پیدا کر لیتا ہے۔ ایک میڈیکل کالج کے طلباء کو خطاب کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہیں۔ اس نے اپنے خطبے کو کچھ اس طرح سے شروع کیا:— آپ اپنی زندگی میں جو کام کرنے جا رہے ہیں اس میں پُرچین سماعت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ بیمار لوگوں کی بے تکی باتوں کو بھی بڑے اطمینان سے سنتے چلے جانے سے آپ ان کے مرض تک پہنچ سکتے ہیں، لیکن آپ اگر خود شور مچانے لگیں گے تو بیمار بیچارہ تو آپ کی بیماری کا علاج کرنے سے قاصر ہے۔ سامعین کی تالیوں کے وقفے کے بعد اس نے اپنے بیان کو جاری رکھتے ہوئے انہیں بتایا — میرا کام تو صرف باتیں کرنا ہے اور خوش قسمتی سے میرے پیشے کے آدمی محض باتوں سے کسی کو، نقصان نہیں پہنچا سکتے، مگر آپ کو کام کرنا ہے، اگر آپ سنجیدگی سے اپنے کام کی طرف راغب نہیں ہونگے تو ڈگری شاید آپ کو مل جائے مگر انجانے میں ہی آپ سے اتنے قتل سرزد ہو جائیں گے کہ کسی ڈاکو سے بھی نہ ہوئے ہوں۔

کملیشور کی ادبیت شاید اس لئے زیادہ قابلِ یقین معلوم ہوتی ہے کہ وہ جینے جھیلنے کے مسائل کو خالص ادبی عینک چڑھا کر نہیں پرکھتا، بلکہ اور پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ادب کو بھی زندگی کا ہی ایک حیلہ قرار دیتا ہے۔ سائنس دانوں کی صحبت میں وہ اپنے آپ کو ان کے سائنسی نقطۂ نظر کا مطیع کر لیتا ہے، مزدوروں میں ان کی موٹی موٹی باتوں کی باریکیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور ایجوکیشن پر کسی بحث میں حصہ لیتا ہے تو اس کے لہجے میں کسی تجربہ کار استاد کی فراوانی آ جاتی ہے۔ غرضیکہ وہ ہر موضوع سے اتنی بے تکلفی سے پیش آتا ہے کہ سمجھاتے سمجھاتے ساری بات اس کی اپنی سمجھ میں بھی آ جاتی ہے۔ زندگی کو اس طرح کامن سنس سے کرنے سے لکھنے والے کے تجربے اور ویژن کا "آن کامن" حد تک گہرا ہوتے جانا عین فطری ہے۔ تخلیقی ملکہ خداداد ہو یا نہ ہو، زندگی میں ایسی ہی بھرپور شرکت سے کسی ادیب کی بستی گنجان ہوتی ہے۔

ایک اور بات:— ظاہر ہے کہ کملیشور بنیادی طور پر فکشن کا آدمی ہے لیکن اس نے اپنے گھر کے دروازے پر یہ تختی نہیں لٹکا رکھی ہے کہ یہاں اسی کو داخلے کی اجازت ہے جو صرف فکشن سے وابستہ ہو۔ اسے معلوم ہے کہ اس کی بنیاد بے شک فکشن پر ہو لیکن دیرپا فکشن کی بنیاد اسی ایک شئے لطیف پر ہوتی ہے جو نہ صرف ادب کی تمام اصناف کی بنیاد ہے۔ بلکہ جس سے مصوری، موسیقی، سنگ تراشی اور دوسرے سبھی فنون بھی پرورش پاتے ہیں اور وہ سارے عام فنون اور سارے کام بھی، جنہیں انسان اپنی روح سمو کر انہیں انجام دیتا ہے۔ ایسے ہی کہانی کاروں کی کہانیوں میں ممکن ہے کہ پتھروں میں پودے لہلہانے لگیں، واقعات یکے بعد دیگرے ادا کرنے کی بجائے تصویروں کے مانند بیک وقت بیان کر دیں اور بوٹوں کی چرمر پر طبلے کی تھاپوں کا گمان ہو۔

مرہٹواڑہ یونیورسٹی کے ہندوستانی زبانوں کے لکھنے والوں کے سیمینار میں دو تین روز مجھے، اس کے خیالات سے روشناس ہونے کا موقعہ ملا۔ میں نے محسوس کیا کہ کملیشور کا ضمیر ایک خالص ادیب کا ضمیر ہے۔ وہ صرف ہندی کے ادیب کی بات کی پیش کشی پر اصرار نہیں کرتا بلکہ اپنی جڑوں سے الگ نہ ہونے کے باوجود دوسری زبانوں کے ادبی منظر میں بھی ویسے ہی شریک رہتا ہے۔ اردو کہانی کے سیشن کی چیئر اسی کے سپرد تھی۔ اپنے آخری بیان میں اس نے بڑے خلوص سے حاضرین کو بتایا کہ ہندی کہانی کے بناؤ میں اردو کہانی نے کیونکر اتنا فعال رول ادا کیا ہے۔

میں نے اردو رسم الخط کے ضمن میں کسی کانفرنس کی رپورٹ پڑھ کے یہ نتیجہ اخذ کر رکھا تھا کہ کملیشور چاہتا ہے، اردو لپی کو دیوناگری لپی میں تبدیل کر دیا جائے، اس سے میرے ذہن میں ایک گانٹھ سی بندھی ہوئی تھی۔ سو میں نے اس سیمینار میں اس سے پوچھ ہی لیا۔" کیوں صاحب، آپ ہم اردو والوں کی کھال کیوں اُدھیڑ لینا چاہتے ہیں"؟

"کیا مطلب ؟"۔

" لپی کھال ہی تو ہوتی ہے کملیشور جی"۔

میری ساری بات سن کر کملیشور نے دو ٹوک جواب دیا کہ اس سلسلے میں اس کے بارے میں غلط افواہیں، پھیلائی گئی ہیں۔ اسے تسلیم ہے کہ ہر زبان کی باشندگی اس کے اپنے ہی جغرافیائی علاقے کی آب و ہوا میں مناسب ہے۔ اردو کی ترویج بھی اس کے اپنے ہی رسم الخط میں ممکن ہے۔ کملیشور کو اردو سے جو مناسبت ہے اس کا اظہار اس کی اپنی بھاشا سے بھی ہوتا ہے یہ وہی بھاشا ہے جس سے متعلق ایک دفعہ ہندی اور اردو کے یکساں پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے سعادت حسن منٹو نے کہا تھا کہ بھئی اسے سوڈا لیمن مکسڈ کہہ لیجئے اور اسے لیمن سوڈا مکسڈ۔

کملیشور کے فکری اور تخلیقی ابعاد کے مطالعے سے بے اختیار یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس قدر منجھی ہوئی شخصیت، مجلسیت کی رائیگانی سے بچاؤ کی پیہم تدبیریں کرتی رہے۔ وہ یقیناً ایسا ہی کرتا ہوگا۔ لوگ باگ تو چاہیں گے کہ آم کافی پک گیا ہے اسے توڑ کر کھا لیا جائے۔ لیکن آم کو ابھی اور میٹھا ہونا ہے، اپنی توانائیوں کے ساتھ ابھی اور پیڑ پر تنہا لٹکنا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کملیشور ضرور اپنے آپ سے الجھتا ہوگا کہ تخلیق کی فرصتیں کیوں نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔ ابھی میرے وجود میں ان گنت ان کہے گیت چھپے پڑے ہیں، کیوں نہ کھوپڑی کے غار میں پھر سے دھونی رما کے بیٹھ جاؤں؟ مجھے یقین ہے کہ وہ خود بھی اپنے لئے ایک اور چھوٹے سے بن باس کا انتظار کر رہا ہے۔

گلاب داس بروکر

تازہ ہوا کا جھونکا

گلاب داس بروکر، گجراتی کے مشہور ادیب ہیں، جو اپنے قلم ہی کے سہارے زندہ ہیں۔ آپ کی تخلیقات دنیا کی مختلف زبانوں میں، ترجمہ کی صورت میں پھیل کر شہرت پا چکی ہیں۔ ۶۸ سالہ مسٹر گلاب داس بروکر ساہتیہ اکیڈمی کے بھی ممبر ہیں۔

★

گرچہ میں کملیشور کو پچھلے کئی برسوں، کم سے کم دس برسوں سے جانتا ہوں، لیکن پھر بھی میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں ان کا دوست ہوں۔ اس کے باوجود میں ادیب کملیشور کے بارے میں اتنا تو جانتا ہی ہوں کہ "فن اور شخصیت" کے کملیشور نمبر کے لئے ایک چھوٹا سا مضمون لکھ سکوں۔

کملیشور ہندی کے ان چار پانچ ادیبوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے چند سال پیشتر ہندی کہانی کے رنگ روپ کو بدلا۔ موہن راکیش، راجندر یادو اور کملیشور کے آتے ہی ہندی کہانی کے افق پر تازہ ہوا کے جھونکے محسوس ہونے لگے۔ جن کے بارے میں، پہلے کبھی سوچا بھی نہیں گیا تھا۔ ان کہانی کاروں نے اپنی کہانی کو نئی کہانی کا نام دیا تھا۔ یہ نام چل نکلا اور اس کے لکھنے والے بھی شہرت پانے لگے۔

کملیشور اب اتنے جوان نہیں ہیں، نئے ادیب بھی اب اپنی کہانیوں کو نئے افکار اور روپ رنگ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔ انھوں نے نئی کہانیوں کے بانیوں کو اسی طرح چنوتی دینی شروع کر دی ہے جیسے انھوں نے اپنے پیشروؤں کو دی تھی۔ لیکن ادبی تجربات کی اگر اہمیت ہے اور یہ نمو پذیر بھی ہیں تو ان کو دوام بھی ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ جینندر کمار اور یشپال وغیرہ کی کہانیاں کملیشور اور ان کے ہمعصروں کی کڑی تنقیدوں کے باوجود آج بھی زندہ ہیں اور یہی سبب ہے کہ نئی نسل کی سخت تنقید کے بعد بھی کملیشور اور ان کے رفیقوں کی کہانیاں بھی زندہ ہیں اور باقی رہینگی۔

کملیشور کی کہانیاں بھی زندہ ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ صرف ان کے موضوع ہی جاندار نہیں ہیں بلکہ ان کا اسلوب بھی انوکھا اور منفرد ہے۔ ساتھ ہی ساتھ تمام پسماندہ طبقہ کے لئے ان کے دل میں جو درد ہے۔ اس کی بدولت وہ اپنے پڑھنے والوں کی محبت اور اپنائیت کے حقدار بن گئے ہیں۔ ان کی فنی صلاحیتیں قابل رشک ہیں۔ ان کے فکر کا دامن اور میدان بڑا کشادہ اور کینواس بہت وسیع ہے۔ ہندی والوں میں ان کا نام عرصے تک زندہ رہیگا۔

اگر میں کملیشور کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہ کہوں تو یہ مختصر سا مضمون بالکل ہی تشنہ رہ جائیگا۔ ان کی فاتحانہ مسکراہٹ، ان کی کشادہ قلبی اور دوست نوازی، ان کی بلا کی خود اعتمادی اور ان کی معلومات کا خزانہ، ان سے ملنے والے ہر آدمی کو ان کا گرویدہ بنا دیتا ہے۔

یہ سب کہنے کے بعد، کیا مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ کبھی کبھی کسی آدمی کو یہ شبہ بھی ہو سکتا ہے کہ کملیشور میں ہلکا سا غرور بھی ہے یا اپنی صلاحیتوں کا احساس کر کے وہ ضرورت سے زیادہ چوکنا ہے۔ میں یہاں اقرار کرونگا کہ کم از کم مجھ کو ایسا ہی لگتا تھا۔

میرا احساس دو سال پہلے تک باقی تھا۔ پھر ایکبار ہمیں ایک ساتھ فضائی سفر کا موقع ملا۔ ہم بمبئی سے ناگپور جا رہے تھے۔ ہوائی جہاز پر ایک ساتھ بیٹھے باتیں کرتے جا رہے تھے۔ میں نے ان سے ہندی میں چھپنے والی نئی اور اچھی کتابوں کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے تین کتابوں کے نام لئے۔ جن میں ایک ناول تھا۔ جہاں تک مجھ کو یاد پڑتا ہے، جس ناول کا انھوں نے نام لیا تھا اس کے خالق بھیشم ساہنی تھے۔ مجھے خوشی ہوئی تھی کہ بھیشم میرے دوست (اور بلراج ساہنی کے چھوٹے بھائی) ہیں۔ میں نے کملیشور سے پوچھا، "یہ ناول کیا واقعی اتنا اچھا ہے؟"۔

"ہاں! بہت اچھا ہے"۔

انھوں نے کہا، اور بولے ـــ "بروکر جی! آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں؟"۔

"ہاں بتائیے"۔

کملیشور بولے۔ "میں یہ مانتا ہوں کہ بھیشم مجھ سے بہتر لکھتے ہیں۔ لیکن ہم میں سے کئی کا پرچار بہت ہو گیا ہے۔ اس لئے زیادہ مشہور سمجھے جاتے ہیں، ورنہ!!"۔

کملیشور میں غرور ہے، میرے اس خیال اور شک کو دور کرنے کیلئے اتنی بات کافی تھی۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا، یہ خوبی بہت سے ادیبوں کے ہاں بڑی مشکل سے آتی ہے۔

★ ★

سمریش باسو

وہ کملیشور جا رہے ہیں

سمریش باسو، بنگلہ کے مشہور ادیب ہیں۔ آپ نے بنگلہ افسانوی ادب کو ایک نئے انقلاب سے روشناس کرایا ہے۔ خوش مزاج اور دلکش شخصیت رکھنے والے سمریش باسو کا پیشہ پڑھنا پڑھانا ہے۔

★
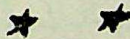
آج سے کوئی بارہ سال پہلے، پربودھ کمار مجمدار نے لکھنؤ میں میری ملاقات کملیشور سے کرائی تھی۔ کملیشور کے نام سے میں واقف تھا۔ ممکن ہے وہ بھی مجھ سے غائبانہ طور پر متعارف ہوں۔ مگر پہلی ملاقات ہی میں وہ اس طرح ٹوٹ کر مجھ سے ملے، جیسے برسوں کا بچھڑا کوئی دوست ملتا ہے۔ کملیشور کی اس ادا سے میں بے حد متاثر ہوا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بالکل گھل مل گئے۔ ذرا ذرا سی بات پر قہقہہ لگانے لگے۔ ان کا قہقہہ، ان کی کھلی اور دلچسپ شخصیت کی دلیل ہے۔ صاف دل والے ایسے دلچسپ آدمی سے بے تکلف ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے۔

کملیشور نے جھٹ پٹ ایک ادبی جلسے کا بھی انتظام کیا تھا جسمیں زیادہ تر نوجوان ادیب اور طالبعلم شریک ہوئے تھے اور ادبی مسائل پر خوب کھل کر باتیں ہوئی تھیں۔ کملیشور کا دماغ جس قدر روشن ہے دل بھی اتنا ہی بڑا ہے۔ دل بڑا نہیں ہوتا تو دوسری زبان کے ادیب یا نوجوانوں کو کیوں عزت بخشتے۔

انہوں نے ہندی کے افسانوی ادب میں ایک تحریک کو جنم دیا ہے۔ اس تحریک کی بدولت انہوں نے سینکڑوں افسانہ نگاروں کو ابھرنے کا موقعہ دیا ہے۔ نئی کہانیاں ہو یا ساریکا۔ کملیشور کی ادارت میں یہ دونوں ہی پرچے نئے ادیبوں کا پلیٹ فارم بنے ہیں۔ اس کے علاوہ رسالوں میں دلچسپی پیدا کرنا تو کوئی ان سے سیکھے۔

ساریکا میں انہوں نے "گردش کے دن" کے عنوان سے ادیبوں کے ذاتی تجربات کو پیش کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کے تحت انہوں نے مجھکو بھی لکھنے کی دعوت دی تھی۔ اور پربودھ مجمدار سے میری کہانیوں کا ہندی میں ترجمہ کرنے کی فرمائش کی تھی۔ یہ ان کی فراخدلی ہے۔ اصل میں وہ ہندستان کی تمام زبانوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی کوشش کرتے رہے۔ کوشش ہی نہیں بلکہ یہ ان کے مشن میں داخل ہے۔

مگر ہمیں افسوس ہے کہ ان کی کہانیوں کا ہندستان کی دوسری زبان میں خاص طور پر بنگلہ میں زیادہ ترجمہ نہیں ہوا ہے۔ پربودھ مجمدار سے میں نے اس کا تقاضہ بھی کیا تھا مگر ابھی تک ہماری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی ہے۔ اس سے بنگلہ ادب ہی کا نقصان ہوا ہے

ورنہ کملیشور کی کہانیاں ہندستانی زبانوں کے علاوہ اطالوی، فرانسیسی اور انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکی ہیں اور ساری دنیا ان کی معترف ہے۔ اردو میں "فن اور شخصیت" ان پر ضخیم نمبر نکال رہا ہے۔

مجھ کو دوسرا افسوس اس بات کا بھی ہے کہ کملیشور جب کلکتہ آئے تھے تو ان سے ملاقات ضرور ہوئی تھی مگر یہ بڑی مختصر ملاقات تھی اور میں ان کی کوئی خاطر مدارات نہیں کر سکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں میں کلکتہ سے ۲۵ میل دور، نئی ہٹی میں رہتا تھا۔

کملیشور خود جس فراخدلی اور فیاضی کا ثبوت دیتے ہیں یا وہ جتنے کھلے دل و دماغ کے مالک ہیں، ویسے بہت کم آدمی ہوتے ہیں۔ ان کے مقبول اور عظیم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ جس پر ان کے دوست جتنا بھی فخر یا رشک (اپنے اپنے حوصلے کے مطابق) کریں، کم ہے۔ مجھ کو تو اس پر فخر ہے۔

مگر ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب کملیشور پر رشک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اس کی مثالیں تو اور بھی بہت ہونگی مگر میں ایک ہی مثال دینے پر اکتفا کرونگا۔ ٹی وی پر وہ اتنا دلچسپ اور کارآمد پروگرام پیش کرتے ہیں کہ جگ کا بھلا تو ہوتا ہی ہے، ان کا بھی ہوتا ہے۔ ان کا بھلا اس طرح ہوتا ہے کہ وہ کسی فلمی ہیرو کی طرح پہچانے جاتے ہیں۔ راستہ چلتے ہوئے لوگ انھیں پہچان لیتے ہیں اور لڑکے ایک دوسرے سے کہتے ہیں "وہ کملیشور جا رہے ہیں"۔ لیکن اس سے بھی زیادہ رشک کی بات یہ ہے کہ اپنے بالوں میں سفیدی آجانے کے باوجود کملیشور لڑکیوں کو لبھا سکتے ہیں۔ ★★

... آر ایس ایس والوں پر کبھی بھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ تاریخ کے بارے میں ان کا نظریہ عجیب و غریب ہے۔ آریائی خون کی برتری کا تصور ویسا ہی خطرناک ہے جیسا نازیوں کا تھا۔ آر ایس ایس والے اپنے دفاع کا نعرہ بلند کرتے ہیں مگر جب ملک خطرات سے گھر تا ہے اور واقعی دفاع کا وقت پہنچتا ہے تو یہ اپنے رضاکاروں کو وطن کی آبرو کی حفاظت کرنے سرحدوں پر نہیں بھیجتے۔ آخر کیوں؟

--- کملیشور

ڈاکٹر کرشن پرساد مشر

خون کے آنسو بہانے والا

۱۹ اپریل ۳۳ء میں جنم لینے والے ڈاکٹر کرشن پرساد مشر اڑیسہ کے محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے کناڈا کی ٹورنٹو یونیورسٹی سے ۱۹۶۳ء میں فلسفہ میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ فی الحال اتکل یونیورسٹی کے شعبۂ فلسفہ کے ریڈر ہیں۔ وہ پایہ کے ناول نگار اور افسانہ نویس بھی ہیں۔ انکی کئی کتابیں چھپ کر دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ★

کملیشور عمر میں مجھ سے سولہ سال بڑے ہیں۔ مگر ان سے میری ملاقات ۶۹ء میں ہوئی، جو ہم دونوں کے مشترکہ دوست، بولا نگیر کے سرخواس ادگاتا کی رہینِ منت ہے۔ مسٹر ادگاتا نے کملیشور کی کہانیوں کو "نیلا ...." کے عنوان سے اڑیہ زبان میں کٹک اسٹوڈنٹس اسٹور سے شائع کرایا ہے۔ اتفاق سے اس اشاعتی ادارے سے میرا بھی تھوڑا بہت تعلق ہے۔

کملیشور سے پہلی قربت کا شرف ۷۱ء میں حاصل ہوا جب وہ "وشو ملن" کے ادبی جلسے میں شرکت کیلئے کٹک آئے تھے۔ انکی چمکتی مگر فکر میں ڈوبی آنکھوں کو دیکھ کر میں چونک پڑا تھا، کیونکہ کملیشور کی آنکھوں کو دیکھنے پر ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے کائنات کی گتھیوں کو سلجھا لیا ہے۔ کملیشور کے افسانوں اور کہانیوں سے بھی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ سماجی حالات پر انکی نظر گہری ہے اور اپنے کرداروں سے انہیں بے حد لگاؤ ہے، وہ کسی روحانی مسلک کے علمبردار نہیں ہیں لیکن انسانی مسائل کو جس نزاکت سے اور ہمدردی کیساتھ چھیڑتے ہیں کہ انکے صوفی ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔

کملیشور کے مردانہ کرداروں کے مقابلے میں نسوانی کردار زیادہ جاندار ہوتے ہیں اور قارئین پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے چند نسوانی کردار قابلِ ذکر ہیں:— اندرا، نرملا، دیوما، سوشیلا، پاروتی، جگنو اور چندا۔ جنہیں فراموش کرنا آسان نہیں۔ ان کے ناول آندھی اور آگامی اتیت کے نسوانی کردار بھی زبردست اور بااثر ہیں۔ آگامی اتیت میری ادارت میں نکلنے والے اڑیہ رسالے "مانس" کے پوجا انک میں ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا تھا تو ہمارے ہاں کی عورتوں نے بھی اس ناول کو بے حد سراہا تھا۔

بہر کیف کملیشور سے میری ملاقات ہے، ان سے باتیں ہوئی ہیں، کچھ دیر ایک ساتھ رہے بھی ہیں اور خط و کتابت بھی ہوتی ہے لیکن پھر بھی میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں نے کملیشور کو پورے طور پر جان لیا ہے۔ ان کے ناول اور افسانوں کو پڑھنے اور ان پر بنی ہوئی فلموں کو دیکھنے کے باوجود میں ان کی ادبی حیثیت کا جائزہ نہیں لے سکتا کیونکہ زندگی کی حقیقتوں کو دیکھنے اور ان کو الفاظ کا جامہ پہنانے کا ان کا طریقہ اور ان کا اسلوبِ بیان اور تجربات کی تصویر کشی کے طریقے سے میں صرف لطف اندوز ہوتا رہا

ہوں۔ کیونکہ وہ حقیقتوں کو بیان کرنے کے ساتھ فن کے جمالیاتی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں اور منفرد انداز سے کرتے ہیں۔ یہاں ہمیں کملیشور کی کہانی نیلی جھیل کا مہیش پنڈت یاد آتا ہے جو اپنی بیوی پاروتی کے دئیے ہوئے روپے سے مندر بنانے کی بجائے نیلی جھیل خرید لیتا ہے اور اس جھیل میں ڈیرہ ڈالنے والے پرندوں کے شکار کی اجازت نہیں دیتا۔ کملیشور کی آنکھوں میں درد مندی کی جو جھلک ملتی ہے اس کا سبب شاید یہی ہے کہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ لوگ ستائے جا رہے ہیں۔ ★

ترجمہ:۔ امجد عثمان

... کملیشور اسٹوری رائٹر ہیں' اسٹوری ٹیلر ہیں۔ وہ کہانیاں لکھتے نہیں بلکہ کہتے ہیں۔ عموماً کہانی کہتے ہیں۔ کبھی کبھار لکھتے بھی ہونگے تو یہ دوسری بات ہے۔

اردو میں شعر لکھا نہیں جاتا' کہا جاتا ہے۔ کہے ہوئے شعر کو کاغذ پر اتارنے کو شعر لکھنا نہیں کہا جائیگا۔ اسی طرح کہانی اپنے اصلی اور فطری روپ میں شروع ہی سے کہنے کی چیز رہی ہے۔ مطلب یہ کہ تحریریں بھی جب کہنے کا انداز اختیار کرتی ہیں تب ہی وہ حقیقی' فطری اور موثر ہوتی ہیں۔ کملیشور نے اپنے ہمعصر کہانی کاروں کے مقابلے میں زیادہ تر حقیقی' فطری اور موثر کہانیاں دی ہیں۔ مطلب یہ کہ انہوں نے زیادہ تر کہانیاں کہی ہیں۔ انہوں نے کچھ نئی کہانیاں لکھی بھی ہیں جو نئی کہانی کے تخلیقی عمل میں اچھی اور معیاری تسلیم کی گئی ہیں۔ لیکن مجھے ان کی کہی ہوئی کہانیاں ہی زیادہ حقیقی اور موثر لگتی ہیں ...

ادم پربھاکر

نواروِن ورما

انتظار اور ابھی

نواروِن ورما، آسامی کے ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ مختصر عرصے میں انہوں نے اپنی زبان و ادب میں ایک مخصوص جگہ بنالی ہے۔ آپ کی تخلیقات، اپنے ماحول اور زمانے کی عکاسی ہوتی ہیں۔

زندگی کے کچھ لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں جو ساری زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔ ورنہ بیشتر وقت تو ضائع ہی ہوجاتا ہے اور انہی لمحات کی بدولت زندگی معطر رہتی ہے یہی وہ رنگین لمحات زندگی کو سدا بہار بنائے رہتے ہیں۔

۱۲ سال قبل کا وہ واقعہ مجھے ابتک یاد ہے، جب میں الہ آباد گیا ہوا تھا کہ عظیم ادیبوں سے نیاز حاصل کرونگا اور ان سے کچھ حاصل کرونگا۔ سرسوتی کے مہان اور مقبول سپوتوں سے ملنے کا تصور بڑا مسرت آمیز تھا۔

اس سے پہلے آسامی زبان کے عظیم شاعر امبیکا گری رائے چودھری سے مل کر میں فیض حاصل کر چکا تھا۔

اور اسی جستجو میں قومی زبان، ہندی کے عظیم ادیبوں اور دانشوروں سے ملنا اور ان سے کچھ پانا چاہتا تھا۔ لیکن الہ آباد میں اس سلسلے میں جو تلخ تجربات ہوئے اس سے دل بھر گیا۔ ایک غیر ادبی شخصیت نے کہا کہ آپ بیکار اس تلاش میں بھٹک رہے ہیں۔۔ یہاں سب گروپ بازی میں مبتلا ہیں اور سچا خلوص دینے والا کوئی نہیں ہے سوائے شمشیر بہادر سنگھ کے۔ جو معلوم نہیں کہاں چلا گیا ہے۔

میں احساس شکست لئے لوٹ رہا تھا کہ ایک صاحب نے کہا۔ "نئی کہانیاں" کا ایڈیٹر کملیشور آیا ہوا ہے، آپ چاہیں تو "لوک بھارتی" کے دفتر میں مل سکتے ہیں۔

یاد آیا کہ کملیشور نے کہیں سے میرا پتہ حاصل کر کے آسامی زبان کی کسی اچھی کہانی کا ترجمہ "نئی کہانیاں" کیلئے بھیجنے کیلئے کہا تھا اور میں نے بھیجی تھی اور وہ "نئی کہانیاں" میں شائع بھی ہوئی تھی۔ اس طرح ملاقات کی خواہش پیدا ہوگئی۔ سوچا تجربہ تو ہو ہی جائیگا تلخ یا شیریں۔

"لوک بھارتی" میں یہ ملاقات رسمی ہوتے ہوئے بھی بہت خاص تھی۔ اگرچہ اس ملاقات کا کوئی خاص تاثر نہ تھا اور میں کملیشور کی شخصیت سے کوئی خاص متاثر نہیں ہوا تھا۔ لیکن کملیشور نے میرا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا تھا۔ ان کے الفاظ تھے" او بھائی۔ آپ"۔

★

اس کے بعد گفتگو ہوتی رہی۔ میرے لہجے میں جدوجہد اور ناامیدی کا ملا جلا انداز دیکھ کر کملیشور نے کہا تھا۔
"آپ جدوجہد کرتے رہئے، ایک وقت آئیگا جب ہم کامیاب ہونگے۔ یاد رکھئے ہم سب ایک ہیں۔ اور میں پھیکی مسکراہٹ بکھیر کر رہ گیا تھا۔

کملیشور کو اسی روز دہلی لوٹنا تھا۔ اسی لئے عجلت میں گفتگو ہوتی رہی۔ وہ مجھے ہاتھ پکڑ کر کافی ہاؤس لے گیا جہاں دوستوں سے ادبی اور غیر ادبی گفتگو ہوتی رہی۔ کملیشور قہقہہ لگا کر ہنستا رہا۔ مجھکو بھی الہ آبادی کافی کا ذائقہ لینا پڑا۔ میں سوچتا رہا کہ یہ شخص کملیشور نام نہاد عظیم ادیبوں سے کتنا مختلف ہے۔

الوداع کہتے ہوئے اس کے الفاظ تھے "کبھی دلی آیئے" اور ناامید نہ ہوں! میری زندگی تو جدوجہد کیلئے وقف ہے"۔
یہ ملاقات میری زندگی کا اہم واقعہ بن گئی اور اس شام کی یاد خوشنما چاندنی بن کر ذہن پر چھا گئی۔ تمام تلخ یادیں ختم ہو گئیں چونکہ میں آسامی زبان کا نومشق لکھنے والا تھا۔ کملیشور نے میری حوصلہ شکنی نہیں کی۔ بلکہ "بھائی" کہکر حوصلہ افزائی کی۔

آج جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے اس تھپکی کے اثرات آج بھی باقی ہیں جو انہوں نے الوداع کے وقت میری پیٹھ پر دی تھی۔ ایک ہی ملاقات میں کملیشور نے مجھے اپنا دوست بنا لیا۔ اس کے بعد ان سے میری ملاقات نہیں ہو سکی لیکن ان کے خطوط سے ان کے خلوص کی خوشبو آتی رہی۔

جب مجھے "میرے ہمدم میرے دوست" میں کملیشور پر مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا تو اجنبیت محسوس نہیں ہوئی۔ بیشک وہ ہمدم اور دوست ہے، وہ دلی بمبئی کے جریدوں کا معروف ایڈیٹر ہے اور میں گوہاٹی کا ایک ہندی ادیب۔

اس کے مضامین اور تبصروں میں سچائی کا احساس ہوتا ہے۔ ہندی ادیبوں سے دور ہونے کے سبب میں گروپ بندی اور چشمک کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکا ہوں۔ لیکن جب کسی چھوٹے رسالے کی جانب سے کملیشور پر "نقلی ترقی پسند" اور "پونجی واد کا معاون" جیسے مضامین پڑھتا ہوں تو عجیب پس وپیش میں پڑ جاتا ہوں۔

موہن راکیش، دھرم ویر بھارتی اور کملیشور پر جو الزامات عائد کئے جا رہے تھے۔ ان میں راکیش تو مقابلہ آرائی میں فتحمند رہا۔ دیکھئے باقی دو کا کیا حال ہوتا ہے۔

کملیشور کی ادبی خدمات بلاشبہ عظیم ہیں۔ لیکن میں انہیں "عظیم ادیب" اس لئے نہیں کہتا کہ ممکن ہے ایسا کرنے سے الہ آباد کے نام نہاد عظیم ادیبوں کی طرح ان کا دروازہ بھی بند ہو جائے۔

میں نہیں سمجھتا ہوں کہ محض پونجی وادی اداروں میں کام کرنے سے کوئی شخص پونجی وادی (سرمایہ پرست)، ہو جاتا ہے پونجی وادی، آدمی اس وقت ہوتا ہے جب اس کے دل ودماغ کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

کملیشور کی یہی بہت بڑی خوبی ہے کہ وہ کبھی عوامی نقطہ نگاہ کو نہیں بھولتے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے پسماندہ، اوسط اور قصبہ کے لوگوں کا کردار پوری ایمانداری سے پیش کیا ہے۔ "راجہ نربنسیا" سے "مانس کا دریا" تک کملیشور، سب کچھ نہیں سمیٹ سکا ہے۔

عالمی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی عدم تکمیل کے سلسلے میں کہا ہے۔

"میرے لہجے کے نامکمل ہونے کی بنیاد پر میری جو نکتہ چینی کی جاتی ہے اسے میں تسلیم کرتا ہوں کہ میری شاعری مختلف سمتوں کا احاطہ کرنے کے باوجود ہمہ جہت نہیں ہے"۔

کملیشور کی تخلیق میں جب مجھے شہر کے فٹ پاتھ، کارخانہ مزدور، گاؤں میں استحصال کیا جانیوالا طبقہ اور اچھوت

کردار کم نظر آتے ہیں تو میں انھیں موردِ الزام نہیں ٹھہراتا۔ کیونکہ اس نے ترقی پسندی کے نام پر نعرہ بازی کا نقلی چہرہ نہیں لگایا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے لفظوں میں "شوقین مزدوری نہیں اپنائی ہے"۔

کملیشور نے ایسے لوگوں کے جذبات و کردار کو پیش کیا ہے جو نہ تو بالکل ہی کچلے ہوئے ہیں نہ ہی ابھر کر سامنے آسکے ہیں۔ ایسے لوگوں کی جدوجہد اور جذبات میں اس نے قابلِ رحم صورتحال کا معائنہ کیا ہے۔

ایک طرف جاگیرداری کے کھنڈر دوسری طرف قصبوں میں سسکتی ہوئی انسانیت۔ ان ہی کے بیچ کملیشور کی تخلیقی کائنات ہے۔

کملیشور کو اپنی عدم تکمیل کا احساس ہے اور "ساریکا" میں "میرا پنا" لکھتے وقت اسے یہی احساس بے چین کئے رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کتنی ہی کہانی تحریک سے اس نے تعلق پیدا کیا اور اس میں گڑبڑ محسوس کرتے ہی اس سے ناطہ توڑ لیا اور اس کی قیمت اسے کم نہیں چکانی پڑی ہے۔ لیکن اس نے اپنی انفرادیت باقی رکھی ہے۔ پارٹی اور نعرہ بازی کی بجائے، انسانیت دوستی اسے زیادہ عزیز ہے اور اسی انسانیت دوستی نے اسے ہندستان گیر بنا دیا ہے۔

ہندی اور غیر ہندی کے فرق کے بغیر اس نے سبھی طرف نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔
اپنی ادارت کے زمانے میں اس نے مختلف زبانوں کی تخلیقات اور ادبی تحریکوں کو ہندی سے جوڑنے کی کوشش کی ہے، جو ہزاروں مذاکروں اور لیکچروں سے نہیں ہو سکتا تھا۔ کملیشور کی یہی خصوصیت اسے ممتاز کرتی ہے۔
اپنی ادارت میں اس نے "نئی کہانیاں" کو تو ہندستانی کہانیوں کا اسٹیج بنا دیا تھا۔ جس کے لئے ہندستانی ادب ہمیشہ اسے نہ صرف یاد رکھیگا بلکہ اس کا شکر گزار ہوگا۔
کملیشور کی سبھی تخلیق اچھی ہے، لیکن سب سے اچھی تخلیق کا ابھی انتظار ہے۔

ترجمہ:- شمیم طارق

ناپرتھا سارتھی

ہندستان کے قومی ادیب

ناپارتھا سارتھی۔ تمل زبان کے بے مثال ادیب ہیں آپ کی پیدائش ۱۸ دسمبر ۱۹۳۲ء کو مدورائی کے ایک کسان خاندان میں ہوئی تھی۔ تعلیم کی تکمیل پر کچھ دنوں پڑھنے پڑھانے کے بعد تصنیف و تالیف سے فطری لگاؤ کے سبب تمل صحافت میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۶۵ء میں اپنا ادبی جریدہ "دیپم" جاری کیا جو تمل زبان کا بہت ہی گرانقدر رسالہ سمجھا جاتا ہے۔ ان کے ۲۵ ناول، ۱۵ افسانوی مجموعے، مضامین اور شعر و شاعری کی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ ان کی تخلیقات کا دوسری ہندستانی زبانوں کے علاوہ اردو میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے ★

کملیشور ہمارے آپ کے عہد کے ایک ممتاز ادیب ہیں۔ گرچہ وہ ہندی کے ادیب ہیں مگر اپنے جذبات اور خیالات کی ترسیل کے لئے، انگریزی کا سہارا بھی لیتے ہیں۔ ان کی تخلیقات انگریزی اور تمل میں بھی منتقل ہو چکی ہیں۔ اس لئے ان زبانوں کے وسیلے سے میں ان کے ادب سے بڑی حد تک واقف ہوں میں نے ان کی لکھی ہوئی آندھی، موسم اور پھر بھی جیسی فلمیں بھی دیکھی ہیں۔ کملیشور اپنے پڑھنے والوں کے شعور کو جلا بخشنے کے لئے "میرا پنا" کے عنوان کے تحت جو اداریے لکھتے ہیں ان کا بھی تمل زبان میں ترجمہ چھپ چکا ہے اور مجھے یہ کہنے میں فخر محسوس ہو رہا ہے کہ ان کے یہ ترقی پسندانہ اداریئے میرے پرچے "دیپم" ہی میں چھپے ہیں اور تمل دانشوروں کو روشنی اور راحت بخشتے رہے ہیں۔

صحتمند تصنیف کے ساتھ انھوں نے ہر زبان کے ہم عصر ادب میں توانا اور صحتمند رجحان داخل کرنے کے لئے جو "سمانتر" (متوازی) تحریک شروع کی ہے اس کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ اس تحریک کے زیر اثر ادب کو سستے پن، سنسنی خیزی اور تفریح کا ذریعہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ ادیب کو عام آدمی کی وکالت کرنے اور قلمی جدوجہد کرنے کے لئے بھی آمادہ کیا جاتا ہے۔

سمانتر تحریک کے ذریعے کملیشور نے اگر ایک طرف ادب کو تنگ وادی اور تنگ نظری سے باہر نکالا ہے تو پروپگنڈہ کا آرگن بھی نہیں بننے دیا ہے۔ روایتی بندھن کو توڑا ہے تو ادب کے حسن و لطافت کو بھی باقی رکھا ہے۔ اس تحریک کا ایک بھرپور فکری پس منظر بھی رہا ہے جسے ہر جگہ سراہا اور قبول کیا جاتا ہے۔

کملیشور بنیادی طور پر ایک انسانیت نواز شخص ہیں۔ وہ اپنے قلم اور زبان کے ذریعے اپنے مسلک کا پرچار کرتے ہیں اور لاکھوں عوام کو اپنا گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ محض قلم کی روانی یا زور خطابت سے عوام کا دل نہیں جیتا جا سکتا۔ اس کے لئے بےحد درجہ کا خلوص بھی چاہیئے۔ کملیشور اپنی ان خوبیوں کی بدولت ہر زبان کے ادیبوں کے بھی چہیتے ہیں۔ مجھے بھی ان کی دوستی اور قربت کا فخر حاصل ہے۔

میرے دوست سوری راجن، کملیشور کی تخلیقات کو اپنی زبان میں منتقل کر کے تمل عوام کو ان کی گرانقدر تخلیقات سے روشناس کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب

تک عوام کملیشور سے بھی اچھی طرح واقف ہو جائیں گے جس طرح سرت چندر کھانڈیکر، تھہازی سیوشنکرن پلے اور ایس کے پوٹیکٹ وغیرہ سے واقف ہیں۔ کملیشور کی ادبی تخلیقات اور تحریک کے پس پشت جو وسعت نظری کارفرما ہے اس کی روشنی اور دردمندی کے ساتھ وہ ہندوستانی عوام کی تمناؤں اور آرزوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں اور انہیں آگے بڑھنے کا حوصلہ بخشتے ہیں، اس طرح وہ ہندوستان کی صحت مند اور صالح ادبی روایات کی بنیاد ڈال رہے ہیں۔ ہماری تمنا ہے کہ وہ اپنے عظیم مقصد میں کامیاب ہوں۔

...کملیشور بہت ہی دلکش اور دلچسپ شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی باتیں اگر کوئی گھنٹوں سنے تو وہ کسی طرح نہیں تھک سکتا۔ وہ ہندی کے مشہور و معروف افسانہ نگار اور فلمی کہانی کار ہیں۔ ان کی کہانیاں ہوں یا فلمیں، ان میں صرف عشق و محبت کی داستان نہیں ہوتی بلکہ نئے سبجیکٹ ہوتے ہیں۔ ان کی کہانی کی ہیروئنوں کے بارے میں پڑھ کر اپنے عورت ہونے پر کمتری کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔ ان کے بعض کردار اور ان کے حالات بھلائے نہیں بھولتے۔

اصل میں فنکار جب من کا سچا ہوتا ہے تو اس کی تخلیقات میں بھی اثر آتا ہے۔ کملیشور چاہے جس حال میں بھی ہوں ان کی فطری شرافت جھلکتی رہتی ہے۔ اس لئے وہ اپنے سے کمتر درجہ کے لوگوں سے بھی باتیں کرتے ہیں تو ان کی سطح پر اتر کر۔ وہ ان کی مشکلوں، دشواریوں اور دکھوں کو محسوس کرتے ہیں۔ اپنے ٹی وی پروگرام میں ایسے ہی لوگوں کو پیش کر کے ٹی وی دیکھنے والے کے دلوں میں بھی یہی احساس جگاتے ہیں۔

حالانکہ ان لوگوں کو پیش کرتے وقت کملیشور خود جس کرب میں مبتلا ہوتے ہیں وہ ان کے چہرے سے جھلکتا ہے مگر بے بسی کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے ذہن، قلم اور دوسرے تمام وسائل سے عام آدمیوں کے دکھوں کو ختم کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ وہ مایوسی کے اندھیرے میں روشنی کی چمک پیدا کرنا چاہتے ہیں...

خدیجہ اختر

تعریف آسان نہیں

ڈاکٹر منو بھائی پاندھی

(پیدائش ۱۶ ستمبر ۱۹۱۴ء کراچی) ہوشیار ڈنٹل سرجن ہیں۔ کراچی سے مانڈوی (کچھ) میں آکر آپ نے پریکٹس شروع مگر اس کے ساتھ مشق سخن بھی جاری رکھا۔ کبھی افسانہ نویسی کے میدان میں ان کا اپنا مقام ہے۔ آپ اپنے ارد گرد کی زندگی کو کہانی کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔ ★

مجھے کہنے دیا جائے کہ میرے دوست کملیشور ایک غیر معمولی انسان ہیں۔ عام زندگی پر ان کی نظر گہری اور ان کا اسلوب بیان بے مثال ہے۔ ممکن ہے اوروں کی طرح ان کے ہاں ہزار رنگ نہ ہوں، لیکن جو بھی ہے ان کا اپنا ہے اور وہ شوقیہ یا فن برائے فن کے لئے نہیں لکھتے بلکہ لکھنا ان کی ضرورت ہے۔ کیونکہ قلم کو انھوں نے ہتھیار بنالیا ہے۔ جس کے بل بوتے پر وہ عوام کی زندگی میں خوشحالی لانے کے لئے لڑتے ہیں۔

اپنے ادب کے ذریعے زندگی کی ترجمانی کرتے ہوئے بھی انھوں نے فن کے تقاضوں کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ مقصد کے ساتھ وہ جمالیات کا بھی پورا لحاظ رکھتے ہیں۔

ہندستان کے بدلتے ہوئے ماحول میں یہاں کے باشندوں کی نفسیات اور ذہن میں جو تبدیلی آئی ہے کملیشور کو اس کا پورا پورا ادراک ہے اور ان باطنی سچائیوں کو وہ نہایت چابکدستی اور فنکاری سے پیش کرتے ہیں۔ انھوں نے دیہات، چھوٹے بڑے شہر کی زندگی اور وہاں کے باشندوں کا تیز مشاہدہ کیا ہے اور یہاں کی ادلتی بدلتی زندگی کی عکاسی اپنے شاہکار افسانوں میں کی ہے۔

معمولی لوگوں کی کہانی وہ گھن گرج یا فلسفیانہ رعب داب سے نہیں بلکہ عام آدمیوں کی کہانی عام فہم انداز میں اس طرح سناتے ہیں کہ قاری کے دل میں اتر جاتی ہے اور ہر شخص اسے اپنی کہانی سمجھنے لگتا ہے۔

انسان کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے تار کو چھیڑنے کا ملکہ بھی انھیں خوب ہے۔ اس لئے اجنبی اور کم گو آدمی بھی ان کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیتا ہے۔ کملیشور اور عام آدمیوں کے درمیان اجنبیت کے پردے کے اٹھ جانے پر کملیشور ان کے دل کا حال جان لیتے ہیں اور پھر اسے سیدھی سادی زبان میں کہانی بنا کر پیش کر دیتے ہیں۔ جس زبان میں کملیشور کہانیاں لکھتے ہیں وہ متوازی ادب کی جان ہے۔ ان خوبیوں کے ساتھ کملیشور نے دنیائے ادب کے خزانہ کو مالا مال کیا ہے۔ انھوں نے جو کچھ دیا ہے اس کی تعریف کرنا آسان نہیں۔

ترجمہ

انجم عثمان

عابد سورتی

گستاخی معاف

کملیشور، کہانی کار ہیں، ناول نویس ہیں، ڈرامہ نگار ہیں، نقاد ہیں، پریکرما ہیں، کیا کچھ نہیں ہیں؟ ٹھیک ہے، یہ سب آپ جانتے ہیں، میں بھی جانتا ہوں، پر کملیشور ایک نازک دل بھی ہیں، یہ شاید بہت کم لوگ جانتے ہونگے۔ وہ خوش ہوتے ہیں تو انکی خوشی کسی سے چھپی نہیں رہتی، وہ دکھی ہوتے ہیں تو انکا چہرہ پوسٹر کی طرح ظاہر کر دیتا ہے۔ کیا آپ یہ سوچ سکتے ہیں کہ کملیشور جیسی شخصیت دس لوگوں میں بھی ایک معصوم بچے کی طرح آنسو بہا سکتی ہے؟۔

وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے، وہ دن منگل کا تھا، پریکرما پروگرام کیلئے میں ان ہی کے گھر سے انکے ساتھ ہو لیا تھا۔ نجانے کیوں وہ کچھ اکھڑے اکھڑے سے لگ رہے تھے۔ اپنی عادت کے مطابق میں نے ان سے وجہ نہیں پوچھی، کار میں خاموش بیٹھا، کنکھیوں سے اُنکے چہرے کو پڑھتا رہا۔ مجھے احساس ہوا کہ یہ آدمی اپنے غم کو کچلنے کی انتہائی کوشش کر رہا ہے یعنی اپنا ہی گلا گھونٹ کر آنسوؤں کو روک رہا ہے، پر یہ اس کے بس کی بات کہاں تھی؟

ٹی وی سنٹر پہنچتے پہنچتے انکی آنکھیں بھیگ گئیں اور پریکرما پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہی آنسو چھلک گئے، تب مجھکو پتہ چلا کہ ان کے ایک عزیز دوست اور ہندی کی نئی نسل کے شاعر اور غزل گو شری دشینت کمار کا بھوپال میں ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ ایک دوست جو ان سے میلوں دور تھا، ایک دوست جس سے شاید ہی سال بھر میں وہ ایکبار مل پاتے ہونگے، پھر بھی اُسکا اتنا غم؟ لیکن یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا تھا کملیشور نازک دل بھی ہیں۔ چاہے دوست انکے قریب ہوں یا دور، وہ انکے دل میں سمائے رہتے ہیں۔ دوست کو دیکھتے ہی انکا سینہ پھول جاتا ہے۔

کچھ ہی دنوں پہلے میں اپنے خاندان کیساتھ وارڈن روڈ پر ٹہل رہا تھا۔ کملیشور کی نظر پڑ گئی، وہ فوراً دوڑتے ہوئے آئے اور مسکراتے ہوئے کہا "عابد! جس سمت تم رہتے ہو ادھر ہی میرا گھر بھی ہے"۔ میں انکے چہرے کی طرف دیکھتا رہا شاید اس لئے کہ میں نہ کوئی پروڈیوسر تھا اور نہ کروڑپتی۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میرے سامنے جو شخص کھڑا تھا، وہ انسان تھا۔ کبھی کبھی میرے مشترکہ دوست اسٹوڈیو آجاتے ہیں تو کملیشور کا ذکر بھی چھڑ جاتا ہے، کچھ انھیں تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہیں کچھ پیار کی نظروں سے دیکھتے ہیں، کچھ ان پر تبصرہ کرتے ہیں تو کچھ انکی تعریف بھی کرتے ہیں لیکن اس بات سے سبھی متفق ہیں کہ پچھلے دس برسوں میں زمانہ کافی بدل چکا ہے مگر کملیشور آج بھی وہی ہے، ہیں۔ نئے نئے بمبئی آنیوالے اور آج عروج حاصل کر لینے والے کملیشور میں کوئی فرق نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ کملیشور کو کملیشور جی کہکر مخاطب کرنیوالوں میں میں نہیں ہوں، اپنوں سے جی یا صاحب جوڑ کر دوری کی گستاخی میں تو نہیں کر سکتا۔

گجراتی کے جانے پہچانے ادیب عابد سورتی کئی خوبیوں کے مالک ہیں۔ یہ اچھے افسانہ نگار ہی نہیں، بہترین مصور اور مشاق فوٹوگرافر بھی ہیں۔ انھوں نے مووی فلمیں بھی بنائی ہیں، جو ان کے آرٹ کی طرح منفرد ہیں۔ خود ان پر اور ان کے فن پر ایک ڈاکومینٹری فلم بن چکی ہے ★

چندر کانت بخشی

چلنا چلنا مدام چلنا

۵۴ سالہ چندر کانت بخشی، گجراتی زبان کے مشہور ادیب ہیں، ان کی تعلیم کلکتہ میں مکمل ہوئی۔ بمبئی کے سیٹھی بائی کالج میں تاریخ و سیاسیات کا درس دیتے ہیں۔ چندر کانت بخشی سولہ ناول، آٹھ افسانوی مجموعے، ڈراموں، ادبی تنقید اور تاریخ کی کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مجموعی طور پر ان کی ۴۴ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ہر مہینہ کے پہلے بدھ کو سمولدیکا کے نام سے آل انڈیا ریڈیو سے یوورشن کے نام سے بمبئی ٹی وی سے اپنا خصوصی پروگرام پیش کرتے ہیں۔

★

جدید ہندی کہانی کے دو بہت نمایاں دور ہیں۔ کملیشور سے پہلے اور کملیشور کے بعد۔ زبان، روانی اور جذباتی اعتبار سے کہانی میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ طوفانی رفتار سے ایک شخص کہانی کے میدان میں اُبھرا جسے "کھوئی ہوئی سمتوں" کی تلاش تھی اور اس نے اپنی اس تلاش میں نام نہاد "جدیدیت" کو ماضی کی چیز بنا دی۔ اس آدمی کی جڑیں بہت گہری تھیں، نگاہیں بہت تیز تھیں، اصول پسندی کا زہر اس کے خون میں نہیں تھا اور نہ ہی اسے سطحی حق پرستی پر یقین تھا، مروجہ اصولوں سے اس کے فن کو نقصان پہنچانا ناممکن تھا۔ اس کی دوربینی حیرت انگیز تھی۔

بمبئی میں آنے سے پہلے کملیشور "شہشی کا کہانی کار" تھا، بمبئی نے اسے لکھے جانے اور بولے جانیوالے الفاظ کا "ہندستانی فنکار" بنا دیا۔ اس نے جس کسی چیز کو چھوا بڑے انہماک سے چھوا۔ چاہے وہ "پریکرما" جیسا ٹی وی پروگرام ہو یا کسی فلم کا منظرنامہ یا ساریکا کا اداریہ۔ ساریکا کہ اس نے ہندی سے ذرا اٹھا کر اسے ہندستانی بنا دیا جسمیں تمام قومی زبانوں کی معیاری تخلیقات جگہ پانے لگیں، افسانچے، کہانیاں، ناول سب ہی اسمیں چھپنے لگے، کہانی نے اسکے شعور کو لہولہان کیا تھا اور میرا خیال ہے اسکا خاتمہ بھی کسی کہانی ہی میں ہوگا کسی ادھوری کہانی میں۔

کملیشور حقیقت پسند ہے لیکن حقیقت پسندی کا کھردراپن اور ناہمواری اس کے یہاں نہیں ہے، ہمکو کبھی کبھی ڈر سے میں کہونگا کہ "وہ سچائیوں کو پیش کرتا ہے لیکن اسمیں الٹوپٹ اور امر رجائیت بھی ہے، اسکے ہاں سماج کی پسماندگی اور بدحالی کی اہمیت زیادہ ہے۔ انفرادیت پسندانہ نقطۂ نظر شاید سرمایہ دارانہ نظام کی دین ہوتا ہے۔ کملیشور کی تحریروں کا سماجی کمزور ہو چکا ہے۔ لیکن اسمیں مسیحائی کا انداز ہے۔

کملیشور کا اور میرا ساتھ بہت پرانا ہے، ان تمام برسوں میں، میں نے اسے اپنے ہی "امیج کو" توڑتے اور اس سے اوپر اٹھتے دیکھا ہے، اسکے ذوق، کارکردگی اور باریک بینی پر مجھے ہمیشہ حیرت ہوتی ہے، کملیشور میں "اعتماد" اور "بے اعتمادی" کا عجیب امتزاج دیکھنے میں آتا ہے۔ اسکی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں سے میں ہمیشہ متاثر و مرعوب ہوا ہوں، کبھی کبھی ایک خیال آتا ہے "اسکی لو بڑی پیاری ہے، لیکن وہ دن رات جل رہا ہے۔ اس کے کام کی رفتار غیرمعمولی ہے۔ جو اسکی بے چین فطرت کی آئینہ دار ہے۔

کملیشور کے ارتقاء کی تفصیل بڑی رشک انگیز ہے، وہ کبھی رکا نہیں ہے۔ وہ کبھی رکیگا بھی نہیں۔

★ ★ ★

کوملا وردھن

کملیشور کو قبول کرلو

کوملا وردھن، تمل کی مشہور ادیبہ ہیں۔ آپ کی تخلیقات میں عام آدمیوں کی ضرورتوں تمناؤں اور خواہشات کا ہمدردانہ اظہار ملتا ہے۔

کوملا وردھن، باصلاحیت آرٹسٹ اور رقاصہ بھی ہیں۔ فوٹوگرافی بھی آپ کے مشغلے میں شامل ہے۔

کملیشور کے بارے میں کچھ لکھنے کا جو مجھ کو موقع ملا ہے اس سے میں بہت خوش ہوں۔ ان سے میری ملاقات زیادہ پرانی نہیں ہے۔ پہلی بار ہم لوگوں کی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب انھوں نے ٹی وی کے اپنے مشہور پروگرام "پریکرما" کیلئے، مجھ سے انٹرویو کیا تھا۔

یہ نومبر ۱۹۷۵ء کی بات ہے۔ انٹرویو کی تیاری کے لئے وقت بڑا ہی مختصر تھا لیکن کملیشور جی نے مجھ سے جس طرح کے سوالات کئے تھے اور پندرہ منٹوں کے اندر، انھوں نے جس طرح میری شخصیت کی پوری تصویر پیش کی اس سے مجھے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوگیا تھا۔

اس انٹرویو کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ وہ مجھ سے ہندی میں سوالات کر رہے تھے اور میں انگریزی میں جواب دے رہی تھی، کیونکہ ہندی سے میں برائے نام واقف ہوں۔ پھر بھی کملیشور جی نے اس پروگرام کو تاثر انگیز بنا دیا تھا۔

میں تمل (Tamil) میں لکھتی ہوں، لیکن اس شخص کی میرے دل میں بے انتہا عزت ہے جس نے ہندی کی ادبی دنیا میں نام و نمود حاصل کیا ہے اور جو صحیح معنوں میں تخلیقی صلاحیتوں کا مالک بھی ہے، روزمرہ کی زندگی میں مختلف لوگوں کے سوچنے اور محسوس کرنے کا کیا ڈھنگ ہوتا ہے۔ ان کی ذہنی کیفیت کیسی ہوتی ہے۔ اپنی کہانیوں میں ان ہی باتوں کو پیش کرنے پر میں بھی یقین رکھتی ہوں۔

اسی لئے میرا خیال ہے کہ نئے افسانہ نگاروں کو کملیشور جی کے اثر کو قبول کر لینا چاہیئے، تاکہ وہ زندگی کی صحیح ترجمانی منفرد انداز سے کرسکیں۔

اوم گوسوامی

قلم ایشور

کملیشور کا نام کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ لیکن کملیشور کی شخصیت اور اس کی کارکردگی کا جائزہ لیتے وقت صحیح و سچی اور دلکش باتیں اس قدر زیادہ ہو جاتی ہیں کہ تعریف کا انبار لگا دکھائی دیتا ہے۔ کملیشور ایک ایسی شخصیت ہے کہ جس کے "کہنے اور کرنے" میں بڑی مطابقت نظر آتی ہے۔ اس نے ہمارے دور کی "ہپاکریسی" کے خلاف پوری ایمانداری کے ساتھ، دو ٹوک باتیں کی ہیں۔

جس نے بار بار اپنے مضامین کے ذریعے کہانی کا مقصد کو بتایا ہے کہ افسانہ نگاری عیش پرستی کا اکھاڑہ نہیں بلکہ اپنے وقت کی تلخیوں کو پہچان کر اسے ظاہر کرنے کی سنجیدہ پکار ہے۔ آج کی ہندستانی زبانوں کے افسانوں کو سب سے زیادہ متاثر کرنے والی دھارا "سمانتر سوچ" کا عروج کملیشور کی زرخیز سوچ کا نتیجہ ہے۔ اس کے کٹر مخالفوں میں بھی آج تک ہمت نہ ہوئی کہ "سمانتر" کے خلاف کوئی ٹھوس دلیل پیش کر کے اپنا نقطۂ نظر سامنے لائیں۔ اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ "سمانتر" دورِ حاضرہ کی حقیقی نمائندگی کرتا ہے۔ اس حقیقت کی جانب کملیشور نے ۱۹۵۰ء کے آس پاس بھی اشارہ کیا تھا اور جب زندگی کے ساتھ ساتھ کہانی کو چلانے کی چاہ نے نئی کہانی کا نام پایا تھا۔ کملیشور اس دور میں بھی صحیح تھا اور آج بھی صحیح ہے۔ سیاسی پیچیدگیوں میں عام آدمی کی دینداریوں کا تجزیہ کرنے میں وہ ایسا حیرت انگیز و پختہ مصنف ہے جو ہمیشہ صحیح ہوتا ہے ہندستان کی تمام ادبی زبانوں میں کملیشور کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ "کتھا دھارا" اور "جیون دھارا" کو دو متوازی خطوں کی مانند تسلیم کر کے کملیشور نے تخلیقی قوتوں کو نیا افق دیا ہے۔ کہانی میں اس کا قلم اپنے دور کی تمام تکلیفوں کو ہمدردی کی سطح پر کندہ کرتا ہے۔ مکالمہ نگاری میں تو اسی قلم سے لاوا پھوٹنے لگتا ہے عام طور پر دیکھنے میں آتا ہے کہ کوئی بڑا اچھا نقاد یا قابل مکالمہ نگار، اچھی کہانیاں نہیں لکھ پاتا۔ لیکن کملیشور میں یہ دو مخالف باتیں حیرت انگیز حد تک یکجا دکھائی دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے کملیشور کا نام ان گنے چنے ادیبوں میں آتا ہے جنہوں نے قلم سے اپنے دور کو نئے موڑ دیئے

اوم گوسوامی نے ۴ ستمبر ۴۸ء میں جموں میں آنکھیں کھولیں۔ تب سے کشمیر کی خوبصورت وادیوں میں قیام ہے۔ ان کا تعلیمی کیریئر بڑا ہی شاندار ہے۔ جموں یونیورسٹی سے انہوں نے زبان و ادب میں اول درجہ میں ایم اے پاس کیا۔ جو ان کی غیر معمولی ذہانت کی دلیل ہے۔ وہ بیک وقت، ڈوگری، ہندی اور اردو میں لکھتے ہیں۔ ان کی کہانیوں کے چار اور ایکانکی کا ایک مجموعہ ڈوگری زبان میں چھپ چکے ہیں۔

اوم گوسوامی سردست جموں و کشمیر کے آرٹ، اینڈ کلچر اینڈ لینگویجیز میں ڈوگری زبان کے ایڈیٹر ہیں۔

زاویئے اور نئی فکر و سوچ بخشی ہے۔

بچپن میں، میں "فینٹم" کی تصویری کہانیاں پڑھا کرتا تھا، جس کا کردار لگاتار برائیوں کے خلاف جدوجہد میں مبتلا دکھایا جاتا ہے، آج کی عملی زندگی میں اس کردار کا رول کملیشور کو ادا کرتے دیکھتا ہوں۔ اس کے قلم نے دو دھاری تلوار کی طرح "بیہڑوں" میں راستے بنائے ہیں۔ ادبی انانیت کو بے پردہ کیا ہے اور "جینوئین کہانی" کو طاقت بخشی ہے۔ غلط باتوں کے خلاف میں نے اسے ہمیشہ جھنڈا اٹھائے بلند آواز میں پکارتے دیکھا ہے۔ یہاں کملیشور لگاتار جدوجہد کرنے والی شخصیت کے روپ میں ابھرے ہیں۔

آج انھیں قلم کا سپاہی کہا جارہا ہے۔ لیکن کملیشور کو "قلمیشور" یا "قلم کا خدا" کہنے میں مجھے نہ کوئی عار ہے اور نہ میں، یہ کہنے سے گریز کروں گا۔

کملیشور میرے سامنے ایک دوسرے روپ میں بھی آتے ہیں اور وہ روپ ہے اردو کے اُستاد شاعروں کی طرح استاد کہانی کار کا۔ یعنی آج کے کئی سلجھے ہوئے کہانی کاروں کو کملیشور کی اصلاح اور ہدایت حاصل ہے، ابھرتے ہوئے کہانی کاروں کے لئے کملیشور مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ★ ★

... مذہبی جنونیوں کے لئے ہندو بھارت کا تصور بڑا دلکش ہے۔ آر ایس ایس والے چاہتے ہیں کہ اسرائیل کی طرح ہندستان بھی ایک مذہبی ریاست ہو جہاں ہندو امن سے رہ سکیں۔ ورنہ ہندوؤں کی آبادی تو گھٹتی جارہی ہے اور دوسری اقلیتوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، اس کی وجہ سے ایسا وقت بھی آسکتا ہے جب ہندو اقلیت میں رہ جائیں۔ اس وقت شاید ان کا اپنی جنم بھومی میں رہنا مشکل ہو جائے۔ لیکن یہ کتنا مضحکہ خیز تصور ہے...

کملیشور

اروند کمار

دھندلے کانچ کی دیوار

اروند کمار، نوجوان ترقی پسند ادیب، صحافی اور دلچسپ و دلنواز شخصیت کے مالک ہیں

دلّی میں سریتا اور کارواں کے ادارتی شعبہ سے منسلک تھے - آج کل ٹائمس آف انڈیا کے ہندی فلمی رسالہ مادھوری کے ایڈیٹر ہیں ---

انگریزی کا ایک محاورہ ہے "گرجا گھر کے جتنے پاس، خدا اسے اتنی ہی دور"۔
یقیناً کچھ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔
جیسے میں!

میرے اور کملیشور کے دفتر کے درمیان صرف دھندلے کانچ کی دیوار حائل ہے۔۔ اور بوقت ضرورت ہم ایک دوسرے کو دستک دے کر بلا لیتے ہیں اور ملاقات ہو جاتی ہے اس کے باوجود ہماری ہفتوں ملاقات نہیں ہوتی۔ زیادہ صحیح یہ ہے کہ ملاقات ہو نہیں پاتی۔ کبھی کبھی میں مصروف ہوتا ہوں اور بیشتر کملیشور۔ کثرت کار نے دستک کے عمل کو بھی ختم کر دیا ہے۔

کچھ مہینے قبل تقریباً روز ہی ملاقات ہوتی تھی، ساتھ ہی میں دوپہر کا کھانا بھی کھاتے تھے۔ دھیرے دھیرے معلوم ہوا کہ کملیشور کو کام سے باہر جانا پڑتا ہے، سنسر کے لئے، فلمیں دیکھنے کیلئے۔۔۔ کام بڑھتے گئے اور معلوم ہوا کہ کملیشور صبح اتنا ناشتہ کر کے آتے ہیں کہ دوپہر کے کھانے کی حاجت نہیں ہوتی۔۔۔ لیکن میں مشکوک ہوں کہ انہیں کھانے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ دلیل کے طور پر عرض کروں گا کہ میں نے دوپہر کے کھانے کے وقت انہیں اکثر کام کرتے ہوئے یا ملاقاتیوں میں گھرے ہوئے دیکھا ہے۔

چلو ملاقات کا یہ موقعہ بھی گیا۔
وہی گرجا اور خدا والی بات۔

دھرم ویر بھارتی - مہاویر ادھیکاری - آنند پرکاش جین - سریندر دھما اور خود کملیشور جانتے ہیں کہ میں انہیں ایک مثالی شخصیت مانتا ہوں۔ جیسے بھگوان کو "مریادا پرشوتم" مانا جاتا ہے۔ کیوں مانتا ہوں، یہ بعد میں بتاؤں گا فی الحال "خدا اور گرجا" والی بات پر ہی رہتا ہوں۔

ابھی اسی دن کی بات ہے۔ صابر دت سے باتیں ہو رہی تھیں۔۔۔ کملیشور پر ایک خاص نمبر نکالنے سے متعلق۔ اس سے پہلے کہ صابر دت مجھے اس خاص نمبر میں لکھنے

کرنے کے لئے مدعو کریں ۔ میں نے خود کو لکھنے کے لئے تیار کر لیا ۔ اس سے پہلے انھوں نے جو نمبر نکالے تھے ان میں ایک دو پیراگراف سے زیادہ نہیں لکھ پایا تھا ؟ کیونکہ ان لوگوں سے متعلق خاطر خواہ معلومات نہیں تھیں ۔ لیکن کملیشور کو تو بہت قریب سے جانتا ہوں ۔ ان کے متعلق صفحات کا ڈھیر لگا دونگا ۔

مگر اب میری اور صبا بردت دونوں کی حالت خراب ہے ۔

میں بار بار کوشش کرتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کدھر سے شروع اور کیسے آغاز کروں ؟ اور ادھر صبا بردت لحاظ و تکلف میں مبتلا تھے ۔ نہ انتظار کرتے بنتا تھا نہ چھوڑتے ' اور میں ' جو کملیشور کو بیس سال سے ' قریب سے جاننے کا مدعی ہوں ' محسوس کر رہا تھا کہ کچھ نہیں جانتا ۔

وہی گرجا گھر اور خدا والی بات ۔

لیکن تسلی یہی ہو رہی تھی کہ خدا شناسی کا دعویٰ کرنیوالے خدا کو کتنا جانتے ہیں ؟ پھر میں تو میں تھا ۔ کور عقل و خرد جو یہ بھی نہیں جانتا کہ خدا کا وجود ہے ۔ لیکن مثالی شخصیت خدا نہیں ہوتی ۔ لفظی معنیٰ میں مثالی شخصیت ، وہ ہے جسکی تقلید کی جانی چاہئے اور جس کے نقش قدم پر چلا جانا چاہئے ۔

کملیشور کے عادات و اطوار میں ہر وہ چیز ہے جو موجودہ سماج میں اپنی حفاظت کی خاطر ہر بشر کیلئے قطعی ضروری ہے ایمانداری ، خلوص ، غمگساری ، محنت ' سبھی کچھ ہے ۔ پر اس سے ہی آج کی دنیا میں کام نہیں چلتا ۔ چل بھی سکتا ہے ، مگر پس جانا پڑیگا ۔ کولھو کے بیل کی طرح جُتے رہنا ہوگا ۔

اپنے کو بچائے رکھنے کیلئے لوگ الگ الگ تدابیر اختیار کرتے ہیں ۔ کچھ لوگ اپنے گرد پیش پتھر کی دیوار کھڑی کر کے محصور ہو جاتے ہیں ۔ کچھ لوگ خود کو پتھر کا صنم بنا کر مندر میں بیٹھ لیتے ہیں اور بعض لوگ امر ہو جانے کی کوشش میں خودکشی کر لیتے ہیں ۔

کچھ پاگل کتوں کی طرح اس اندیشے میں بھونکتے ہیں ' بھونکتے ہی چلے جاتے ہیں کہ کہیں آسمان نہ ٹوٹ پڑے کچھ اپنے ماحول سے لاپرواہ ہو جاتے ہیں ۔

کچھ اپنے آپ کو Establishment کا حصہ بنا لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دنیا کا کاروبار ان ہی سے چل رہا ہے ۔ حفظ ما تقدم کے طور پر ہمارے دانشور جو طریقے اختیار کرتے ہیں ' ان میں سب سے عام منکسر المزاجی ہے ۔

لیکن کملیشور کا طریقہ ہمارے لئے ہمیشہ بہتر اور جُدا گانہ رہا ہے ۔

اس نے کبھی خود کو چھوٹا نہیں سمجھا ۔ کبھی سماج سے نہیں ڈرا ۔ کبھی اس کے اوسان خطا نہیں ہوئے ۔ اس کا راستہ فہم و فراست کا ہے ، سماجی جکڑ بندیوں سے ہٹ کر وہ شرارت سے مسکراتا ہے ۔ لیکن یہ ہنسی استہزائیہ نہیں ہوتی ، وہ صرف دوستوں میں خوشی بانٹنے کے لئے ہنستا ہے ۔ کسی کا مذاق اڑانے کیلئے نہیں ۔

مجھے کملیشور ہندستان کا خواجہ نصیر الدین لگتا ہے ۔ جانے کیوں خواجہ نصیر الدین کی جو تصویر میرے ذہن میں بن گئی ہے ، وہ کملیشور جیسے پستہ قد ، گول مٹول آدمی کی تصویر لگتی ہے ۔ کھلکھلا کر ہنسنے والا ' اپنے کو سب کے برابر ماننے والا ۔ سماج کی رگ پہچاننے والا ۔ چٹکلے سنانے میں ماہر ' مذاق کرنے میں استاد ' دوستوں کا دوست ' ان کیلئے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ۔ ان کی یاد میں ان کے قصے ' کہانیاں سنانیوالا ' اپنے آنسوؤں کو چھپا لینے والا ۔ دن میں ۲۷ گھنٹے بتا دینے والا ' حد درجہ محنتی ' ہر کام کو حسن و خوبی سے انجام دینے والا ۔

اور بہت ساری باتوں کے ساتھ دن میں سیکڑوں چٹھیاں لکھنے والا۔

کتنی چٹھیاں لکھتا ہے وہ ؟ !

چھوٹے چھوٹے نگینوں جڑے، خوبصورت الفاظ لکھتا رہتا ہے، لکھتا رہتا ہے۔ کئی مرتبہ میں نے کہا: تمہیں تو ڈاکخانے کے باہر چٹھیاں لکھنے والا ہونا چاہئے تھا۔ مگر اس کے ایک من میں بستے سارے لوگ بسے ہیں کہ وہ دن میں بہتّر گھنٹے کام کر کے بھی ان کی چٹھیاں پوری نہیں کر سکتا۔

کچھ لوگوں کی اصول پسندی ناقابل تحریف ہوتی ہے، راجپوتی آن بان۔ اکڑ فوں والی۔ جس میں اصول کی ترکیب کی گنجائش نہیں ہوتی، جیسے سوکھا کاٹھ۔ ٹوٹ جائیگا، مڑیگا نہیں، کیونکہ مڑنا اس کے لئے نفرت انگیز صلح کا دوسرا نام ہے۔

کملیشور کا اپنا ایک فلسفہ ہے جو بار بار اپنی جگہ بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ان لوگوں کو جو اس کی محتاط طبیعت کو نہیں جانتے لیکن میں نے اسے گزشتہ بیس برسوں سے اس جگہ سے ہٹتے نہیں دیکھا ہے جو اس نے اپنے لئے چُن لیا ہے۔ ہیر پھیر کر وہ اسی مرکز پر آجاتا ہے۔

اسی کملیشور سے میری پہلی ملاقات ۵۷-۵۹ سنہ میں دہلی میں ہوئی تھی اور اس وقت ہوئی جب میں سریتا، کارواں میگزینوں میں تھا۔ جھنڈے والان میں ہمارا دفتر بنا تھا۔ کملیشور کا نام بہت سنا تھا، اس کی تحریر کم پڑھی تھی۔ پڑھی تو ابھی بھی کم ہی ہے (وہی گھر جا گھر اور خدا) لیکن کچھ کچھ جاننا ضرور ہے۔

تو وہ پہلی ملاقات شام کو دفتر بند ہونے کے وقت ہوئی تھی اور بعد میں ٹہلتے ٹہلتے ہم کافی دور تک چلے گئے تھے اور باتیں بھی کافی ہوئیں۔ پہلی ملاقاتوں والی، رسمی اور پُر تکلف۔ لیکن صرف رسمی ہی گفتگو ہوئی ہوتی تو ہم ساتھ ساتھ آگے کیوں بڑھتے ؛ اس میں کہیں کہیں کھلا پن بھی تھا، سادگی تھی، اثر تھا۔ جدوجہد کے نشان تھے جو مسکراہٹ کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہے تھے اور اس کی اس مسکراہٹ پر بھی ایک اور صفت حاوی تھی اور وہ تھی خود اعتمادی۔ یہ اعتماد کہ آج بھی اس کا ہے اور کل بھی اسی کا ہوگا۔

اس ملاقات کے بعد ہی میں نے اس کا ناول" ایک سڑک ستاون گلیاں" (بدنام گلیاں) پڑھا تھا۔ روزمرہ کی زندگی کے معمولی واقعات اور آس پاس کے جانے پہچانے کردار کو لیکر کسی مبالغہ کے بغیر، کوئی ڈرامائی رنگ دئے بغیر اس ناول میں زندگی کے تناؤ، تقاضے، خواہشیں پھیلی پڑی تھیں۔ برابر ان کے اور اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

پتہ نہیں پہلے کملیشور کہاں رہتا تھا۔

ان ہی دنوں اس نے قرول باغ کے ناگ دالان میں گردوارہ روڈ بس اسٹینڈ کے پاس ایک کمرہ لے لیا۔ وہ اور بیمار بیوی گائتری سامنے والے کمرے میں آ گئے۔ بقول میرے ایک اور خاص دوست نریندر ربیدی کے۔ اس گھر کو یار لوگوں کا اڈہ بننا ہی تھا۔

وہ فاقہ مستی، الست، بے ارادہ، وہ ہمدردی، وہ دوست، وہ قہقہے، کمرے میں وہ چٹائی، اس پر بیٹھ کر، لیٹ کر، اس کا وہ لکھنا، باتیں کرنا۔ اب تک وہ گھر میں فرش پر ہی اسی طرح اسی طریقے سے کام کرتا ہے، ویسے ہی باتیں کرتا ہے ۱۹۶۶ء کے آخر میں، میں بمبئی آگیا۔ مادھوری نکالنے کیلئے۔

ہم نے کبھی ایک دوسرے کو چٹھی نہیں لکھی۔ خبریں ملتی رہتیں۔ ٹیلی ویژن میں نوکری، پھر اسے چھوڑ دینا۔ کہتے ہیں، اسکی ایک کہانی اسٹیبلشمنٹ کو پسند نہیں آئی۔ جارج پنجم کی ناک۔ پر کملیشور کو تو پوری اسٹیبلشمنٹ ہی کبھی پسند نہیں اس نے اسٹیبلشمنٹ کو صرف موقع دیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ کم سے کم پروگرام میں شریک ہو جائے۔ اگر یہ کملیشور کیلئے موزوں ہے

تو۔ اور وہ کم سے کم پروگرام ہے جو لہے کا، چھت کا، دوا کا۔ اس پروگرام میں اسٹیبلشمنٹ کا ساتھ نہ ملا تو نہ سہی۔ یہ بات اسٹیبلشمنٹ سے زیادہ اس کے غلاموں کو بہت ناگوار گزرتی ہے۔

کچھ سال بعد! شاید ڈھائی سال بعد کملیشور بھی بمبئی۔

وہی قہقہے بمبئی آ گئے۔

آتے ہی انہیں "سلپ ڈسک" ہوگئی۔ اس کی وجہ سے وہ کاٹھ کے بستر پر درد سے کراہتا رہا۔ تب بھی سہمی ہوئی آنکھوں کی مسکان، ہونٹوں کی تھرکن، پردہ سے باہر آنے کا موقعہ تلاش کرتی رہتی تھی۔

★ ★

کبھی کبھی لگتا ہے کہ وہ کوئی جنونی چیز ہے۔

دلی میں "نئی کہانی" تھی۔ کہانی کا آندولن۔ نئی کہانیاں نام کے رسالے کی ادارت بھی تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تنگی کے ان دنوں میں بھی دوستوں کی خاطر اس نے نئی کہانیوں کی ذمہ داری لے لی تھی۔ ایک شاندار نوکری قبول نہیں کی تھی۔ جو اس کے انتظار میں تھی۔

اب بمبئی سے سمانتر (متوازی) کہانی آندولن۔

مجھے معلوم ہے کہ اسمیں کملیشور نے کیا اضافہ کیا ہے۔

آرٹ، فلم وغیرہ وغیرہ کی بات چل رہی تھی، ہندی میں فلم کاروں کی ایک نئی پود سامنے آرہی تھی۔ ہندی میں ان فلموں کو میں نے متوازی یا سمانتر آندولن کا نام دیا تھا۔

لیکن۔

یہ لیکن بہت بڑی ہے۔

لیکن سمانتر سنیما کے پیچھے کوئی نظریۂ حیات نہیں تھا، یا کوئی خاص نظریہ نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو نفسیاتی سطح پر تھا، فارم کی سطح پر تھا۔ بمبئی میں بننے والی نقلی، بازاری، بھونڈی، بدمذاق فلموں سے ہٹ کر جو کوئی بھی فلم بنائے ہم اسے سمانتر سنیما کے ضمن میں شریک کر لینا چاہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وسیع بنیاد (Broad Base) بنانے کے چکر میں پیچھے سے بنیاد ہی غائب ہوگئی۔ براڈ بیس بیچاری اکیلی کیا کرتی؟

کملیشور کو "نئی کہانی" کا تجربہ تھا۔ نئی کہانی کچھ بھی رہی ہو اس کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ ۱۹۶۰ء تک پہنچتے پہنچتے ہندی کے کئی کہانی کار موضوع کو چھوڑ کر اسلوب کی ندرت کے بھلاوے کے پیچھے دوڑنے لگے تھے اور درمیانی طبقے کے تعصبات اور رکاوٹوں کو پورے سماج کا آئینہ دار سمجھتے تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ نئی کہانی آندولن اسی وجہ سے بکھر رہا تھا۔ اگر وہ چلتا بھی تو کملیشور کا اس میں زیادہ دیر تک ٹکے رہنا ممکن نہیں تھا

کملیشور نے کہانی کے میدان میں سمانتر کی اصولی تشریح کی۔ اسے عام آدمی کی زندگی سے جوڑا، موضوع اور اسلوب سے۔ فارم سے نہیں۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ سمانتر (متوازی) کہانی کا آندولن کب تک چلیگا۔ کوئی آندولن تو ہمیشہ نہیں چل سکتا۔ کامیابی اور ناکامی کی جانچ اس پر ہوگی کہ اس تحریک نے کیسی کہانیاں دی ہیں۔ میں نے پہلے ہی کہا کہ میں نے کملیشور کو بہت کم پڑھا ہے۔ ہاں کچھ لوگوں کی کہانیاں اس دوران پڑھنے میں آئیں، اگر وہی سمانتر (متوازی) کہانی ہے۔ اس کے لکھنے والے تو اسے سمانتر (متوازی)

کہانی کہتے ہیں۔ تو بڑی زبردست چیز ہے یہ سماتر۔ کہانی آندولن۔!!۔

حالانکہ یار لوگوں نے، میں نے خود دیکھا ہے کہ کملیشور کو کبھی نظرانداز نہ کر سکے۔ رسالے، پرچے، مضمون، ریویو۔ جدھر دیکھو ادھر تعریف یا گالی۔

کملیشور پڑھتا ہے، فاتحانہ انداز سے مسکراتا ہے، ہنستا نہیں، خوش ہوتا ہے۔ ایک طرف رکھ دیتا ہے۔

کچھ لوگوں کے دماغ پر جنون یا شیطان نہیں کملیشور طاری رہتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ لوگ خواب بھی معشوق یا مستقبل کے بارے میں نہیں دیکھتے ہونگے۔ وہ بیچارے خواب دیکھ ہی کہاں پاتے ہونگے؟ آنکھ لگتے ہی کملیشور ہوّے کی طرح ان کے سامنے آجاتا ہوگا۔ رات بھر جاگ کر وہ لوگ کملیشور کو گن گن کر گالیاں دیتے رہتے ہونگے۔

★ ★

کملیشور ایک نہیں، کئی کام ایک ساتھ کرتا ہے۔

کہانیاں، ناول لکھتا ہے، ایڈیٹری کرتا ہے، تحریک چلاتا ہے، ٹی وی پر "پریکرما" دیتا ہے، فلمیں لکھتا ہے۔

اور سب بڑی خوبی سے کرتا ہے۔

واہ واہ لوٹتا ہے، رشک کماتا ہے۔

دن میں بہتر گھنٹے ان کاموں کیلئے کم ہیں۔

دوستوں کے بیچ قہقہے کم ہو رہے ہیں۔

دوستوں کو اس سے شکایت ہے۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ اس کا دل چاہتا تو کملیشور دوستوں کیلئے وقت نکال ہی لیتا۔

اس کا دل ٹوٹ گیا ہے، کچھ دوست، کچھ اپنے، جو اس کے بالکل اپنے تھے، اب نہیں ہیں، ہمیشہ کیلئے چلے گئے ہیں۔

اب بھی کملیشور ہنستا ہے تو آنکھیں بھرنے لگتی ہیں۔

اس کی شرارت بھری دوستانہ آنکھیں، ان میں اب سیاہ سایہ منڈلاتا ہے۔

وقت سب کو بدلتا ہے۔

کملیشور وقت سے بڑا نہیں ہے۔

★ ★

ہر طرف اس کا چرچا ہے، لوگ اسے گھیرے رہتے ہیں۔ فلموں کا، مصاحبت کا ماحول، تحریک میں کئی طرح کے پچھ لگو، پبلشروں کے ذریعے اشتہار بازی میں بھاری بھرکم لفاظی۔

کئی بار "کرخنداری" لب و لہجے میں یہ "سیر" کہنے کو جی چاہتا ہے ؎

جمانہ تیرے پہ کیسا ہو رہا ہے

پھلاطم پھلاطم، یہ کیا ہو رہا ہے

مجھے معلوم ہے کہ کملیشور وقت سے بڑا نہیں ہے، لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کملیشور تعریفوں سے کہیں بلند ہے۔

★

ترجمہ :- امجد عثمان

دُشینت کمار

میرا ہمدم میرا دوست

دشینت کمار ہندی کے ایک ذہین ادیب اور شاعر تھے۔ آپ کی پیدائش ۳۳ء میں ہوئی اور موت دسمبر ۷۵ء میں ہوئی۔ اس کم مدت میں بھی انہوں نے نثر و نظم کے میدان میں اپنا لوہا منوا لیا تھا۔ کہانیوں اور ناولوں کے علاوہ ہندی ادب میں انہوں نے غزل کی صنف کو روشناس کرایا اور بہت ہی انوکھے انداز سے شاعری کی۔ ان کی موت سے ہندی کا ہی نہیں ہندستانی ادب کا زبردست نقصان ہوا ہے۔

جس دن سے کملیشور کا دنش بدلا، لگ بھگ تب ہی سے میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ اگر ابتک آپ کی ملاقات اس شخص سے نہیں ہوئی ہے تو اب ضرور ملیئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہ بے حد خوش مزاج، خوش لباس اور ملنسار آدمی ہے۔ لطیفوں اور چٹکلوں کی پھلجھڑیوں سے وہ محفلیں گلزار رکھتا ہے اور بات کو موثر کر بات پیدا کرنے میں اس کا جواب نہیں۔

آج یہ سب ہے مگر جب وہ یونیورسٹی میں میرے ساتھ تھا، بہت خاموش رہتا تھا ہم دونوں بی۔ اے میں تھے۔ اگرچہ اس میں شروع ہی سے سادھارن سے کہیں زیادہ صلاحیت سوجھ بوجھ اور ذوق تھا۔ مگر میں صرف شرافت کی وجہ سے اس کی طرف کھنچا تھا۔ وہ بہت سادہ دل، سرل اور خاموش طبع تھا۔ گرچہ وہ بے حد بے رحم حالات اور کشاکشی سے گزر رہا تھا لیکن اسکی پیشانی پر کبھی بل پڑتے نہیں دیکھا۔ مجھے اس کا بھی علم تھا کہ اس کے پاس چار جوڑوں سے زیادہ کپڑے نہیں مگر اس کے باوجود اس کا لباس ہمیشہ بے داغ ہوتا۔

وہ ایک کھٹارا سائیکل پر یونیورسٹی آیا کرتا تھا اور جب طلب اور خواہش ہوتی، کسی جھاڑی کے پیچھے یا کسی سنسان گوشے میں چھپکر بیڑی سگریٹ پیا کرتا تھا۔ شاید اس کا نام، ہر ماہ پابندی سے فیس نہ دینے والوں کی فہرست میں بھی شامل ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ جیب خرچ نام کی کوئی چیز اس کے پاس نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے فیس کے روپئوں میں سے کچھ نہ کچھ وہ ہمیشہ خرچ کر دیتا تھا اور وقت پر اس کے پاس پورے پیسے نہ ہوتے تھے۔ بھائی۔ جس کے پاس وہ رہتا تھا، اس سے مزید پیسے مانگنے میں اسے جھجک ہوتی تھی، کیونکہ اس کے بھائی تنہا کمانے والے تھے اور سارے خاندان کا بوجھ ان پر تھا۔

ان دنوں وہ تھوڑا بہت لکھا کرتا تھا، خاص طور سے ایک ڈائری۔ ایک لڑکی تھی جس کے بارے میں وہ کبھی کبھی بات کیا کرتا تھا۔ وہ لڑکی بھی اسے چاہتی تھی۔ تب اس کی دنیا بہت چھوٹی تھی۔ یونیورسٹی میں پڑھنے آتا، وہاں سے لوٹ کر وہ ایک گھٹیا قسم کے رسالے کے دفتر میں کام کرتا تھا جہاں سے اسے ۵۰ روپیہ ماہوار ملا کرتے تھے اور شام میں وہ تنہا رہنا پسند کرتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو قطعی محدود کر لیا تھا۔ رات کو گھر لوٹ وہ اپنے نہایت چھوٹے سے

کمرے میں بیٹھ کر لکھا کرتا تھا۔

وہ کس طرح کام کرتا تھا، یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا۔ ان دنوں بھی خود دار اتنا تھا کہ اپنی بات کسی سے نہیں کرتا تھا۔ مجھے وہ دن یاد ہیں جب وہ اپنے آپ میں "سروودئے" (خادم خلق) ہو گیا تھا۔ ونوبا بھاوے سے بھی پہلے۔ صابن بنانے سے لیکر اپنی سیاہی (روشنائی) تک خود بناتا تھا۔ اس کے بھائی کے گھر نوکر بھی تھا لیکن کملیشور اپنے کام خود کرتا تھا۔ وہ اس قدر جھجک کا مارا تھا کہ کھانا بھی پیٹ بھر کر نہیں کھاتا تھا۔ اس کی ماں نے ہی مجھے ایکبار بتایا تھا "کیلاش (یہی اس کا گھریلو نام ہے) اتنی جھجک کرتا ہے کہ دوبارہ روٹی بھی نہیں مانگتا۔ مجھے زندگی بھر اس کا افسوس رہیگا کہ میرے بیٹے نے مجھ سے کبھی روٹی یا پیسہ نہیں مانگا۔"

جس زمانے میں اس نے لکھنا شروع کیا تھا اور جس سخت دور سے وہ گزر رہا تھا اور گزر کر آیا تھا اس نے کملیشور کو دور اندیش بنا دیا تھا۔ اس کے آدرش وادی (اصولی) پیار نے آگے چل کر اسے اور بھی توڑ دیا۔

وہ دن بھی مجھے یاد ہیں جب وہ کرتا، پائجامہ پہنے اپنی اسی جھکر طاہر ایک شام میرے پاس آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی اور چہرہ ایکدم اترا ہوا تھا۔ چائے پیتے ہوئے اس نے بڑی آہستگی سے کہا تھا "اب میں اکیلا رہ گیا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ اپنے لکھنے کے شوق میں اس نے اپنی وہ چیز کھو دی تھی' جسے وہ اس وقت سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس کی ایک ہی دلیل تھی۔ "دشینت! زندگی میں سب حاصل نہیں ہوتا۔ انتخاب تو کرنا ہی ہوگا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔" اور اس نے اپنے لئے ادب کا راستہ چن لیا تھا۔

اس کے بچپن کا وہ فیصلہ جو اس وقت اس نے جذباتیت میں کیا تھا۔ آج صحیح ثابت ہو چکا ہے، کیونکہ اس وقت مجھکو خاص طور پر مارکنڈے کو یہ قطعی امید نہ تھی کہ کملیشور اس زندگی کو سہہ پائیگا۔ شاید کملیشور نے بھی محسوس کیا ہو کہ شرافت اور وضعداری کے دوشالے اوڑھ کر شخصیت کو پرکشش تو بنایا جا سکتا ہے، لیکن اس کی اندرونی اہمیت کو نہیں بڑھایا جا سکتا۔ ادھر اس کا مزاج اور صلاحیت اسے اپنا مخصوص مقام بنانے کیلئے اکسا رہی تھی نتیجے کے طور پر وہ بڑی سنجیدگی سے کہانی لکھنے کی طرف مائل ہوا اور اسے بے انتہا کامیابی ملی۔

ادب کے میدان کو چن کر اپنے گھیروں کو توڑنے کا کام اس نے اپنے حوصلے سے اور سماجی، ذہنی اور شعور کی دیوانی پابندیوں کو اس نے اپنے قلم کے زور سے ختم کیا۔

وہ تمام واقعات جنمیں کملیشور ایک نہایت تیز و طرار شخص نظر آتا ہے میری نگاہوں کے سامنے پھیل گئے ہیں:۔

الہ آباد کی گرمی:۔ کملیشور اور میں تین میل پیدل چلکر ریڈیو اسٹیشن پہنچتے ہیں، کام ختم کرنے کے بعد سوال اٹھتا ہے۔ اب کیا کریں؟ آرام یا تین میل پیدل مارچ؟۔ جیب میں پیسے بھی کم ہیں۔ تب ہی ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی، ریڈیو اسٹیشن سے نکلتے ہیں اور اپنی موٹر کی طرف بڑھتے دکھائی دیتے ہیں (واضح رہے کہ ان دنوں بھارتی جی نے جو موٹر خریدی تھی وہ الہ آباد کے ادیبوں کی تفریح سے زیادہ رشک کا سبب بن گئی تھی) بھارتی جی پوچھتے ہیں: "ارے بھائی! سول لائنز چل رہے ہو؟"۔

میں لپک کر موٹر تک پہنچ جاتا ہوں۔ کملیشور ہاتھ جوڑ کر ٹھٹک جاتا ہے، بھارتی جی اس کی جھجک مٹانے کو کہتے ہیں۔ "ارے بھائی آؤ بھی!" کملیشور اور بھی نرمی سے کہتا ہے۔ "بات یہ ہے کہ مجھے ذرا جلدی ہے۔ میں رکشہ سے آتا ہوں۔ آپ موٹر سے جائیے۔"

ایک پوری کتاب کملیشور کی ایسی باتوں پر لکھی جا سکتی ہے مگر اس کے بعد بھی اس کی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔

کیونکہ اس کی شخصیت میں نہ تو طنز کا مادہ ہے اور نہ مزاح کا۔ طبیعتاً وہ سنجیدہ اور جذباتی آدمی ہے، بلکہ دردمند دل کا مالک ہے۔ جس کے باعث اس کا طنز بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اس کی پھبتی سے آپ کو کہیں ذرا بھی چوٹ پہنچی تو شاید پہلا آدمی وہی ہوگا جو اس بات کو فوراً بھانپ لیگا اور اکثر ملتے ہی جھجکتے ہوئے آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اس قدر پیار سے دبائیگا کہ اس کی ہتھیلیوں کی گرمی میں آپ (اگر آپ تھوڑے بھی سمجھدار ہوں تو) اصل کملیشور کو ڈھونڈ نکالنے میں غلطی نہیں کریں گے

میں نے اصل کملیشور کو اس لئے بھی اور جلدی ڈھونڈ نکالا کہ وہ میرے ساتھ بہت رہا ہے۔ ویسے اس کی کچھ عادتیں تو بڑی بے ہودہ ہیں۔ ان میں سے ایک عادت کی وجہ سے، اس کے ساتھ سڑک پر چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ راستے میں اسے جو بھی راہگیر پریشان یا گمنام آدمی بھی ملے گا، وہ سبھوں کیلئے رک جاتا ہے۔ الہ آباد میں شروع شروع میں جب وہ بہت مشہور نہیں ہوا تھا، اس کے یہاں بہت سے ادیب جمع رہتے تھے اور یہ جانتے ہوئے بھی کہ ادبی شعور نسخے دیکر نہیں پیدا کیا جا سکتا، وہ حتی الامکان سب کی دلداری کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔

کملیشور کی جو سب سے بڑی خوبی ہے وہ یہ ہے کہ آپ سو فیصد یہ طے کر کے جائیں کہ اس سے لڑ کر لوٹیں گے۔ لیکن آپ لڑ کر نہیں لوٹ سکتے۔ کیونکہ کٹر مخالف کو بھی وہ اپنی شخصیت کی نرمی کا مروت، عقل اور پُراعتماد آنکھوں سے جیت لیتا ہے، وہ، انانیت پسند یا اپنی ذات کے خول میں سمٹا ہوا نہیں ہے بلکہ اس کے یہاں اپنائیت کا جذبہ موجیں مارتا ہے۔

★　　★　　★

یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران اس کی یہ شخصیت تشکیل پذیر تھی۔ الہ آباد کے ماحول کے ساتھ اسکی شخصیت کو کسی روک ٹوک کے بغیر بننے میں اس کے گھر والوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ خاص طور پر اس کے بھائی اور بھابی کا۔

الہ آباد میں وہ عموماً رات کے گیارہ بارہ بجے تک میرے یا دوسرے دوستوں کے ساتھ گپیں لڑایا کرتا تھا۔ گھر جاکر کھانا اور ڈانٹ کھاتا تھا۔ رات گئے تک لکھتا رہتا اور صبح اسی تازگی اور حوصلہ سے کام شروع کر دیتا تھا۔ اسی چستی اور حوصلہ مندی سے اپنی چھکڑا سائیکل اٹھاتا، تین میل الٹا چل کر میرے پاس آتا، میری تساہلی اور کسلمندی والی طبیعت پر لعنت بھیجتے ہوئے خود چائے بناتا۔ پھر تین میل یونیورسٹی کا سفر طے کرتا۔ دوپہر کو سینٹ جوزف سیمنری میں کیتھولک پادریوں کو پڑھانے جاتا۔ شام کو وہ ایک خاص راستے سے گزر کر اپنی محبوبہ سے ملتا اور پھر سول لائنز میں دوستوں سے آملتا۔ اس طرح روزانہ بیس بائیس میل کا چکر کاٹ کر رات کو گھر پہنچتا تو اس کے ذہن میں صرف دو ہی باتیں ہوتیں۔ بھائی صاحب کی پیار بھری ڈانٹ اور کہانی کا پلاٹ۔

یہ اس کے سخت جد و جہد کے دن تھے، وہ اپنے چھوٹے سے قصبے "مین پوری" سے اتنی ذہنی وابستگی رکھتا تھا کہ الہ آباد میں رہ کر بھی وہ مین پوری ہی کی باتیں سوچا کرتا تھا۔ ہر مہینہ مین پوری بھاگ جایا کرتا تھا اور تین چار انوکھے پلاٹ لے آیا کرتا۔ ان ہی دنوں اس نے "مردوں کی دنیا" کہانی لکھی تھی، وہ کہانی کملیشور ہی لکھ سکتا تھا کیونکہ وہ اپنے ماحول سے شعوری طور پر وابستہ تھا اس کے دل میں ایک کسک تھی اپنے چھوٹے ہوئے شہر کے باشندوں کے لئے۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ فکری الجھنوں میں گھر گیا تھا۔ اپنے ٹوٹتے ہوئے جاگیردارانہ ماحول سے وہ نکل آیا تھا۔ لیکن زندگی کے عقائد کے جو تار و پود بکھرے تھے انھیں از سر نو جوڑنا اور زندگی سے قریبی رشتہ جوڑنے کی جس کشمکش میں وہ مبتلا تھا اسے میں نے دیکھا تھا۔ میں نے دیکھا ہے کہ کملیشور نے کبھی بھی کسی "ڈاگما" سے متاثر ہو کر لکھنے کی کوشش نہیں کی، اسکی ہر کہانی زندگی کے تجربوں کی دین ہے۔ اس نے کتابوں سے تجربے حاصل نہیں کئے ہیں بلکہ خود جھیل کر پایا ہے۔

"راجہ نربنسیا" کہانی لکھنے سے پہلے بھی وہ اندرونی کشمکش میں مبتلا رہا تھا۔ اس کا چھوٹا ہوا شہر، تب بھی لوک کہانیوں اور کتھاؤں کے آدرشوں (مثالوں) کے تحت جی رہا تھا۔ لیکن الہ آباد کے حالات مختلف تھے۔ وہ افراد کے بدلتے رشتوں ہی کو نہیں،

وقت اور تاریخ کے بدلتے رشتوں کا بھی مشاہدہ کر رہا تھا۔ اسی لئے اس کی ہر کہانی زندگی سے قریبی تعلق رکھتی ہے۔ اسکی شاید ہی کوئی ایسی کہانی ہو جس کی جڑیں زندگی میں نہ چھپی ہوں۔ کیونکہ وہ بہت خوبی سے باہمی آدمیوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کی ہر کہانی کی حقیقی بنیاد ہے، جہاں سے وہ اسے اٹھاتا ہے اور اپنے موضوع کو فنکاری کیساتھ پیش کرتا ہے۔ مجھے بہت سے وہ واقعات لوگ اور حالات، خیالات اور پس منظر کردار یاد ہیں جنھوں نے اس کی زندگی بخش کہانیوں کو جنم دیا ہے۔ کملیشور اس معاملے میں بالکل بنجارہ ہے، وہ لگاتار سفر کرتا ہے۔ لکھنے کا سامان اکٹھا کر کے اگربتیاں جلا کر بیٹھے یا ہار سنگھار کے پھول سامنے رکھ کر یا چاکلیٹ کھاتے ہوئے نہیں لکھتا۔

اسی لئے راجندر یادو کہا کرتا ہے "یار اس آدمی میں کتنا 'اسٹیمنا' (دم) ہے، دن بھر گھوم سکتا ہے، بیل کی طرح کام کر سکتا ہے، رات بھر جاگ کر دوستوں کے ساتھ قہقہے لگا سکتا ہے، پھر بھی چہرے پہ تھکن یا شکن نہیں۔ جانے کس مٹی کا بنا ہے۔" اور کملیشور اسے یا دوسرے ادیب دوستوں کو کبھی کبھی چونکانے کیلئے ایسے جھٹکے بھی دیا کرتا ہے۔ منو بھنڈاری کی ادارت میں نکلنے والے رسالے "نئی کہانیاں" کے خاص نمبر کیلئے اسکی کہانی حاصل کرنے کی خاطر جب راجندر یادو نے اسے باقاعدہ گھیر ہی لیا تو وہ قلم لیکر بیٹھ گیا اور بولا "اچھا تم شیو کرو، میں کہانی شروع کرتا ہوں" اور اس نے یہ کہہ کر لکھنا شروع کر دیا۔ راجندر یادو نے شیو کا سامان اکٹھا کر کے رکھا تو وہ بولا "راجندر دیکھو! ہیروئن دروازے پر آ گئی ہے"۔ یادو نے جتنی دیر شیو کا پانی گرم کیا، تب وہ پھر بولا "دیکھو اب ماحول پیدا کر رہا ہوں" اور اس نے ماحول پیدا کر دیا۔ یادو نے شیو ختم کی تو وہ بولا "اب ایک مرحلہ ختم ہو گیا۔"

جب تک یادو نے اپنی عادت کے مطابق چار یا پانچ "تاریخی" قسم کے خط لکھے، غسل کیا اور کپڑے تبدیل کئے، تب تک کملیشور نے کہانی مکمل کر کے یادو کو تھما دی اور یادو بھونچکا رہ گیا۔ وہ کہانی بھی بعد میں اہم کہانی قرار دی گئی۔ لیکن یہ صرف ایک جھٹکا تھا۔ ورنہ اس کے لکھنے کا طریقہ یہ بالکل نہیں۔ وہ تو اس وقت لکھتا ہے جب وہ تنہا ہو اور اس کے ذہن پر کوئی بوجھ ہو۔ خیالات کا یا معاش کا۔ یا ایسا ہی کوئی بوجھ۔

الٰہ آباد میں ایک دوپہر کو گھر لوٹتے ہوئے اس نے ایک ننگی جوان عورت کو چار آدمیوں کے بیچ گھرا اور چلاتا ہوا پایا۔ اس وقت اس کے شعور پر جو اخلاقی دباؤ اور بوجھ پڑا، وہ کئی برسوں تک اس کے ذہن پر قائم رہا۔ جب تک اس نے ایک مختصر کہانی لکھ کر اس بوجھ کو نہیں اتار لیا۔ چھوٹے چھوٹے واقعات بھی کیونکہ اس کے ذہن پر حاوی ہو جائیں گے، یہ کہنا مشکل ہے۔ جب اس کے ذہن پر اس طرح کا بوجھ ہوتا ہے تو وہ ان دیکھے، انجان رستوں کا تصوراتی سفر کرنے نکل کھڑا ہو جاتا ہے، معمولی اور نامعلوم تکلیفوں کے بارے میں سوچ سوچ کر کڑھتا رہتا ہے۔ انگلیاں چٹخاتا اور کسمساتا ہے، لیکن ظاہری طور پر وہ پر سکون، دکھائی دینے والی اس صورتحال کو اس کی ساری الجھنوں، گھٹن اور تکلیفوں کو بھی برداشت کرتا اور لکھتا رہتا ہے۔ ہاں جب وہ ان سے نجات پاتا ہے، تب دوستوں کی کھال ادھیڑتا ہے، چٹکلے اور لطیفے گھڑتا ہے، سگریٹیں پھونکتا ہے، نئی پرانی شرارتوں کو دہراتا ہے، حسب معمول چٹھیاں لکھتا ہے اور گھر کے کام کاج میں دلچسپی لیتا ہے۔

اس طرح جہاں ایک طرف وہ اپنے عہد کی الجھنوں، پیچیدگیوں اور مخالفتوں کو جذب کر کے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، وہیں ان سے بے تعلق ہو کر لگاتار دیکھنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ دونوں ہی حالات میں اس کا نقطہ نظر قنوطی نہیں بلکہ رجائی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی غرض پہلے مرحلے سے اب تک اس نے ہر مرحلے اور ہر حالت میں ترقی پسندانہ عناصر کو پہچانا اور ان کی ترجمانی کی ہے۔

آگے بڑھنا انقلاب کی ضمانت ہے۔ کملیشور نے اسی انقلاب کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور خود آگے بڑھا

ہے۔ اس کی کہانیاں، زبان اور موضوع سماج کے بدلتے ہوئے مختلف حالات کی دین ہیں۔ اس کا اسٹیمنا، تبدیلی کی تیز سے تیز رفتار میں اس کا معاون ہوتا ہے۔ اس میں کملیشور کبھی پیچھے رہتا ہے اور نہ ہی کوششوں سے باز آتا ہے۔ جب وہ مین پوری قصبے سے الہ آباد میں پہنچا تب بھی اور اب جب الہ آباد جیسے شہر سے دلّی اور بمبئی جیسے مہانگر میں آباد ہوا تب بھی "آنے اور آباد ہونے" کے درمیانی وقفے میں بھی وہ ذہنی طور پر جدوجہد کرتا رہا اور ادبی سلسلے کو جاری رکھا ہے۔

"راجہ نربنسیا" سے "قصبے کا آدمی" کے بعد "نیلی جھیل" سے "کھوئی ہوئی دشائیں" تک اس کی کہانیاں، درمیانی طبقے کی زندگی کی عکاسی کرتی رہی ہیں اور اس کے ساتھ بڑے شہروں کے جدید رنگ اور ذہن کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اور میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ کملیشور چاہتا تو "قصبہ کی کہانی" کی تختی لٹکائے اوروں کی طرح ایک اور اسکول کھول بیٹھتا ہوتا۔ مگر اس نے فنکاروں کے اصول کو اپنایا ہے، مٹھ کے ادھیکاریوں کا نہیں۔ وہ لگاتار جدوجہد کرتا اور اپنی اصلاح اور ترقی کرتا آیا ہے۔

میرے خیال میں اس کے ادب کا مواد کتابی نظریہ نہیں بلکہ زندگی کے ٹھوس حقائق اور نجی تجربے ہیں"۔ زندگی کی طرح تخلیقات میں بھی اپنے عہد کے متضاد حالات میں امتزاج پیدا کرنا، ایک نئی صحیح اور آبرومندانہ روش ڈھونڈ نکالنے کی تڑپ اس کے اندر ہمیشہ رہی ہے۔

کملیشور پر ہی نہیں بلکہ ہر فنکار کیلئے ضروری ہے کہ وقت کے ساتھ کافی دور تک اور دیر تک چلتا ہے اور خود اپنے سے اُلجھتا اور ٹکراتا ہے۔ جہاں تک کملیشور کا تعلق ہے، اس کی غیر معمولی کامیابی کا راز ہے، خود اپنے سے ٹکر لینے کی ہمت، ہر بعد وہ ایک نئی لڑائی کا مورچہ سنبھالنے کے لئے تیار رہتا ہے۔

★　★　★

اس کی لڑائی دو سطح پر ہے۔ خود اپنے سے اور اپنے عہد کے تضادات سے۔ اس لڑائی میں وہ ہر ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ اسی لئے اس کی شخصیت کے خارج میں مخالفت کی توانائی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اندرونی یا تحت الشعور کے مقابلے میں اس کا شعور کہیں تیز ہے... اسکی شخصیت کے باہر ایک پہریدار بیٹھا ہوا ہے، لیکن اس کے اندر ایک نرم دل انسان ہے۔ لہٰذا اس باہری پہریدار سے ٹکرائے بغیر اس کے اندر چھپے ہوئے انسان سے ملاقات نہیں ہو سکتی۔ وہ ہوشیار پہریدار آپ کو طنز، چٹکلوں اور چست فقروں سے چھید ڈالتا ہے۔ تیز سے تیز تر آدمی کو کند کر دیتا ہے، اس کا دماغ سنگین حقائق کی تلاش میں معروف ہو۔ اور جب وہ میز پر ہاتھ پٹخ پٹخ کر مجھ سے کسی سچائی کو منوانے کی کوشش کرتا ہے۔ تب ممکن ہے وہ اپنے ذہن میں کسی مخالف سچائی کو تسلیم کر رہا ہو

اسی طرح کے حالات میں وہ اپنی لکھی گئی یا لکھی جانیوالی کہانیوں کے بارے میں بھی اعلان کرتا ہے.. چاہے خود ان اعلانات پر اسے یقین نہ ہو۔ کچھ دنوں پہلے اس کی ایک کہانی دہلی میں لمبی چوڑی تمہید کے ساتھ سننے میں آئی..... پیارے وہ کہانی تیار ہوئی ہے۔ وہ کہانی تیار رہوئی ہے کہ "سنکر فلیٹ" ہو جاؤ گے۔ ان اعلانات کے ساتھ کہانی سن لینے کے بعد میں نے اپنی رائے دی کہ یہ بہت معمولی اور لچر ہے تو وہ فوری طور پر ساری باتیں بھول کر پاس کھسک آیا اور بولا "یار بات تو ٹھیک کہہ رہا ہے"۔ اور پھر بچوں کی سی معصومیت کے ساتھ کہانی کی خامیوں کو خود بھی گنانے لگا اور کھل کر ایک ایک سطر پر اپنی تنقید سنانے اور تبادلۂ خیال کرنے لگا

دراصل اب سے نہیں بہت پہلے سے یہ اس کی عادت رہی ہے کہ وہ ذہن میں پیدا ہونیوالے خیالات کو پہلے ہی ظاہر کر دیتا ہے اور تب وہ اس خیال کو عملی شکل دینے کیلئے اخلاقی پابندی محسوس کرنے لگتا ہے۔ مگر اس سے اسے نقصان بھی اٹھانے پڑتے ہیں کیونکہ ہر سوچی ہوئی بات پوری نہیں ہوتی۔ مگر وہ جو سوچ لیتا ہے اسے اپنی دسترس میں سمجھنے لگتا ہے۔

لکھنے اور لکھنے کے فوراً بعد کا وقفہ اس کیلئے بڑا نازک ہوتا ہے۔ یوں اپنی کہانیوں کے بارے میں وہ جتنے بھی اعلانات کرتا اور ڈینگیں مارتا پھرے، مگر تخلیقی مرحلے سے جب تک وہ نہیں گزرتا اسے اطمینان نہیں ملتا ... ہاں دوسروں کی تخلیقات کا وہ بڑا اچھا نقاد ہے۔

کامیاب ادیب کی حیثیت سے آج جو اس کی شہرت ہے اس کے باوجود وہ ایمانداری سے محسوس کرتا ہے کہ اس کی تمام تر تخلیقات قابل فخر نہیں ہیں، ویسے وہ جو ڈینگیں مارتا ہے اس کے پیچھے اچھی تخلیق کی خواہش جھلکتی ہے اور اس کا یہی جذ اس کے تخلیقی عمل کو باقی رکھے ہوئے ہے۔ وگرنہ اس کی شخصیت کی تار و پود ایسے عناصر سے تیار ہوئی ہے جن میں نرمی، جھجک، لجاجت وغیرہ صفات غالب ہیں۔ اپنی فطرت کی ان خصوصیات کے باعث، خارجی زندگی میں اسے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں، زیادہ تر سمجھوتے وہ اس لئے بھی کرتا ہے کہ دوسروں کے جذبات کو کوئی صدمہ نہ پہنچے اور کچھ اس لئے بھی کہ سماج میں نیک نام رہے۔

★ ★ ★

کملیشور ان تضادات میں گھرا ہوا ہی نہیں بلکہ ان سے تجربے بھی حاصل کرتا اور لکھنا بھی جاری رکھتا ہے، تحریر میں غیر معمولی ہونے پر بھی وہ عام زندگی میں بالکل معمولی آدمی ہے، اوسط سے چھوٹا قد اور سانولا رنگ، ناک نقشہ تیکھا، آنکھوں میں ایسی کشش کہ جو دیکھ لے بچکر جانے نہ پائے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ملازمت کرنے کے باعث اس کی زبان جو پہلے بھی میٹھی تھی اب اور شیریں ہوگئی ہے، خوش مذاقی اس کی خصوصیت ہے۔ پیسہ اس کے پاس ٹکتا نہیں، دوسرے ضرورتمند کو اپنے پاس سے دے کر خود اپنی ضرورت کے لئے وہ گھومتا نظر آتا ہے۔

وہ دوستوں کی محفل میں مل جائیگا، کسی مریض کی تیمارداری کرتا ہوا بھی مل سکتا ہے، کسی سستی سی دوکان میں چائے پیتا ہوا یا کسی بڑے ہوٹل میں نفاست سے کھاتا ہوا بھی مل سکتا ہے، وہ دوسروں کے دکھ میں دکھی، ان کی پریشانیاں سلجھاتا ہوا اور اپنے دکھوں میں ہنستا ہوا بھی مل سکتا ہے، گھر پر ملنا چاہتے ہوں تو رات کے دو بجے کے بعد بھی مل سکتا ہے، جہاں کہیں بھی ملیگا، خلوص اور اپنائیت سے، مگر خطرے کی بات یہ ہے کہ وہ آپ کے اندر چھپی ہوئی بات کو بھی بھانپ لے گا اور پھر کبھی ملنے پر آپ کے سامنے ہی مزے لے لیکر سنائیگا۔

اس بات کا اگر آپ برا مانیں گے تو وہ پہلا آدمی ہوگا جو اس کی تہہ تک پہنچ جائیگا اور بڑھتے ہی آپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لےکر اس پیار سے دبائیگا کہ آپ ان ہاتھوں کی گرمی میں پگھل کر اصل کملیشور کو ڈھونڈ نکالنے میں بھول نہیں کرینگے۔

(ترجمہ :- سعود الٰہی)

ڈاکٹر عالم شاہ خاں

ایک معمولی آدمی : ایک غیر معمولی فنکار

کملیشور : جو کنول تھا اور پتھر ہو کر کملیشور بن گیا۔

ہندی کے مایۂ ناز ادیب، عظیم فنکار اور منفرد حیثیت کا مالک صرف آدمی ہے، کیونکہ آدمی میں ہی ادیب اور فنکار ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے، ادب کے سارے مرحلے طے کر کے اور من کی تمام گہرائیوں اور بلندیوں کو پا کر بھی آدمی بونا رہ جاتا ہے، اگر وہ آدمیت سے دور ہو جائے، اسے بھلا دے۔ کملیشور پہلے آدمی ہے اور پھر ادیب یا فنکار یا کچھ اور۔

اس نے اپنی چوتھائی صدی کی زندگی میں بیشمار چنوتیاں، روٹی روزی سے عقیدے تک کی جھیلی ہیں۔ لیکن اپنی آدمیت سے بندھے عقیدے سے کبھی گریز نہیں کیا ہے، اس کے قلم کی نوک پر آدمی چڑھا ہے، خون خرابہ، پیار، پسینہ، چاہ، چوٹ اور انقلاب پسند مزاج جو آدمی اس کی تخلیق سے ابھرا ہے اسے ہندی میں کملیشور یہ آمی کہا جا سکتا ہے۔ کملیشور کے قلم نے جس آدمی کی تخلیق کی ہے اس میں غم ہے تو غصہ بھی، غصہ ہے تو پیار بھی، پیار ہے تو للکار بھی اور للکار ہے تو زندگی کو بدل ڈالنے کا حوصلہ بھی، یہ حوصلہ رومانی راستوں سے نہیں، سائنٹیفک نقطۂ نظر کے اس مقام سے آیا ہے جسے ہم انسانیت کا تاریخی ارتقاء:۔
(Historical Process of Human development)
کے نام سے جانتے ہیں۔

کملیشور پہلے افسانہ نگار ہے اور بعد میں کچھ اور۔ اس کے افسانوں نے سب سے پہلے اگر کسی پر چوٹ کی ہے تو خود افسانے پر ۔ ۱۹۵۰ء کے آس پاس ہندی افسانہ ایک نئی شاہراہ کی تلاش میں ہی نہیں تھا بلکہ ایک نیا جنم پانے کیلئے بھی بیتاب تھا۔ پنر جنم کی اس گھڑی میں کملیشور کا ہی قلم تھا جس نے اسے خوبصورت دوشیزاؤں کے ریشمی آنچل کی سرسراہٹ اور فرسودہ ونکام قدروں کے گھیرے سے ہی، آزاد نہیں کیا بلکہ فرقہ وارانہ تنگ نظری، وطن پرستی کے تحت بننے والے رجعت پسند نظام کا پردہ بھی فاش کیا۔

کملیشور نے افسانے کے فن کو ہی نہیں اس کے فکر اور فورم (form) کو بھی اس قدر بدل دیا ہے کہ اس کے اور اس کے قلمی دوستوں کے افسانوں کو اس وقت کی سوچ میں نئی کہانی

آپ کی تاریخ پیدائش ۳۱، مارچ ۱۹۳۶ء ہے، ۶۱ء میں، ہندی میں ایم اے اور، ڈاکٹریٹ کرنے کے بعد اسسٹنٹ پروفیسر آف ہندی، شعبۂ ہندی یونیورسٹی آف اودے پور ہیں۔

ممبر:۔ راجستھان ساہتیہ اکادمی۔ کنوینر، شعبۂ ادب اور متعلقہ مضامین ساہتیہ اکادمی۔ بانی ممبر:۔ ریشنل فورم اودے پور۔۔

تصنیفات:۔۔
۱) راجستھانی وچنکائیں۔
۲) ونش بھاسکر ایک ادھین۔
۳) راجستھان کے ہندی کہانی کار (زیر طبع)
۴) ملک کے اردو اور ہندی کے مختلف جرائد و رسائل میں شائع شدہ افسانے و مقالے۔

★

اور نئی تحریک سے جانا جانے لگا۔

کملیشور ٹھہراؤ کا حامی نہیں، بہاؤ کا بانی ہے۔ اس نے اپنے ادبی جہاز کی پال کبھی نہیں باندھی۔ وہ سمے اور ساگر کی روانی کے ساتھ بڑھتا رہا ہے۔ اس نے کبھی نہیں سوچا کہ اس نے وقت کی پوری سچائی کو پالیا ہے اور اسے یہیں ٹھہر کر جینا اور لکھنا ہے۔ وقت نے کملیشور کو بدلا ہے اور کملیشور نے وقت کو۔ نئی کہانی کا بانی بن کر جب وہ، ہندی نئی کہانی کے علمبرداروں کی صف میں آگے کھڑا تھا، تبھی اس نے نئی کہانی کے خلاف بغاوت کر دی۔ ہندی کہانی کی تاریخ میں یہ ایک بڑا حادثہ ہے اور پھر "نئی کہانی کے بعد" کے نام کی اپنی کتاب میں اس نے اپنی نئی نسل سے اور اپنے آپ سے سوال کئے اور پھر اب تک کے اپنے ادبی سفر کو طے شدہ سفر قرار دیکر نئی راہ گزر کی تلاش میں نکل پڑا۔ کملیشور کی رفتار اتنی تیز اور اس کا ذہن اس قدر انقلاب پسند ہے کہ اس کے ساتھی اس سے قدم ملا کر نہیں چل سکے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جہاں تھے وہیں رہ گئے اور کملیشور آج سمانتر کہانی تک چلا آیا ہے۔

متوازی یا سمانتر سوچ کی شکل میں کملیشور نے ہندی ہی میں نہیں ملک کی دوسری علاقائی زبانوں میں لکھنے والوں کے خیالات میں بھی انقلاب برپا کر دیا ہے۔ گذشتہ سات سال کے وقفے میں سمانتر نے باقاعدہ مہم نہیں، ہو کر بھی ایک زبردست تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اس سے بڑی کامیابی ایک ادیب کے لئے اور کیا ہو سکتی ہے؟ لیکن کملیشور نے سمانتر سوچ کو بھی ایک دم حرفِ آخر قرار نہیں دیا ہے۔

بلکہ اس نے اپنے وقت کی سچائی کو سمجھنے کی نظر اور آج کی زندگی کے شانہ بشانہ چلنے والا نظریہ کہا ہے، آج اسی ادبی دنیا میں سمانتر سوچ کو لے کر بڑا واویلا مچا ہوا ہے۔ نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ کملیشور یا سمانتر سوچ کا ذکر کئے بغیر آج کی کہانی کا جائزہ لینا محال ہو گیا ہے۔

کملیشور نے پہلی مرتبہ پر زور الفاظ میں ادیبوں سے اپنے خیال (ideology) کی وضاحت کرنے کی درخواست کی ہے۔ کسی پارٹی سے وابستگی کے بغیر بھی ادیب کے لئے یہ ظاہر کرنا لازم ہے کہ وہ کن لوگوں کے لئے کن طاقتوں سے لڑ رہا ہے۔ اسے اب اپنی طرفداری کا اظہار کرنا ہی پڑیگا۔ سیاسی ادب اور ادبی سیاست ایک عرصے سے اندھیر مچائے ہوئے ہے۔ اب یہ سب چالیں ٹکنے والی نہیں ہیں کیونکہ کوئی جھنجھنا نہیں جس سے آدمی کو تھوڑی دیر کیلئے بہلا کر اپنے وقت سے جدا کر دیا جائے بلکہ ادب وہ حوصلہ ہے جو ہتھیار نہ ہو کر بھی ادب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے والوں کا ذہنی رویہ ہے۔ بات بہت صاف ہے کہ ادب رائفل نہ ہو کر رائفل کی لبلبی (trigger) کو مناسب وقت پر دبانے کے حوصلے کا نام ہے۔ فن کے نام پر اندھی گولیاں پھینک کر کاغذی دفتیاں بنانے کا کام اب ادیب نہیں کرتے مجمع باز کرتے ہیں۔

سمانتر سوچ کے خلاف ہلہ بولنے والے زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو ترقی پسندی کا نقاب پہن کر سماج دشمن عناصر کے ہاتھوں میں کھیلتے ہوئے اپنے مخصوص فنی انداز میں انقلابی رجحانات کی راہ میں روڑے بنے ہوئے ہیں۔ سمانتر نے ان طاقتوں اور اس کے بندوں کو بے نقاب کیا ہے۔ مذہبی احساس، ادبی شعور، اخلاقی نقطۂ نظر اور وطن پرستی کے نعرے اچھال کر چند نام نہاد ادیبوں نے سرمایہ داروں کے اشارے پر ادنی آدمی کو غریبی کی لکیر (Line of Poverty) کے بھی نیچے لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ پھر بھی ان کی ہوس ہے کہ وہ وہیں رہیں اور اسی ذہنیت کے ساتھ زندہ رہیں۔ جو کچھ ہوا ہے اور آگے جو کچھ ہونا ہے اسے اپنا مقدر مان کر بیٹھ جائیں۔ سمانتر ادب نے اس سازش کو ننگا کیا ہے۔ روایتی تہذیب اور بوتر روا ذہنیت کا چشمہ چڑھا کر مخالفین اس ننگے پن کو دیکھ کر کبھی کبھی تو کرتے ہیں لیکن یہ بتانے سے گریز کرتے ہیں کہ انسانیت کے اس ننگے پن کا ذمہ دار کون ہے؟ سمانتر سوچ نے انہی خودساختہ نقادوں اور مہذب آدمیوں

کی بلیتنترے بازی کو سمجھا ہے اور انہیں کملیشور کے ساتھیوں نے صاف صاف الفاظ میں انسان دشمن ایجنسیوں کا ایجنٹ قرار دینے کا حوصلہ دکھایا ہے۔

سمانتر قلمکاروں کی اس آئیڈیولوجیکل عقیدتمندی کے اظہار کو مخالفین نے سیاسی حربہ جیسے فتوے دیکر اس پر طرح طرح کے لیبل لگائے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ سمانتر پر کوئی فتویٰ عائد ہوتا ہے تو صرف یہ کہ سمانتر سوچ اور تخلیق ادنیٰ آدمی کی طرفدار ہے اور اگر اس کا کوئی لیبل ہے تو اس پر لکھا ہے "برابری کی انسانی زندگی جینے کا حق ہر آدمی کو ہے"۔ زندگی جینے کیلئے کوئی شرط نہیں ہو سکتی نہ دین و دھرم کی، نہ سرمائے و سیاست کی، نہ رنگ و نسل کی۔ آدمی صرف اس لئے بڑا ہے کہ وہ آدمی ہے۔ فنکار یا خود فن کا درجہ بھی اس سے بڑا نہیں ہے۔ یہیں کملیشور عام آدمی کے حق میں کھڑا غیر معمولی ادیب ہو کر بھی خود کو عام آدمی ماننے پر فخر کرتا ہے۔

سمانتر سوچ اب اکیلے کملیشور کا کمال نہیں رہا، اس سے اب پچاسوں کہنہ مشق اور تازہ دم ادیب جڑے ہوئے ہیں، یہ بات اور ہے کہ "سمانتر سوچ" کو بلندی پر پہنچانے کا شرف کملیشور کو حاصل ہے۔ کملیشور نے "ساریکا" میں لکھے گئے "میرا پنّا" میں "سمانتر سوچ" کی صحیح تشریح کی ہے اور آج عالم ہے کہ "ساریکا" میں افسانوں سے پہلے لوگ "میرا پنّا" کی تلاش کرتے ہیں "سمانتر سوچ" میں شریک لوگ، ویسے تو کسی مخصوص نقطۂ نظر سے بندھے ہوئے نہیں ہیں لیکن زندگی کے دیکھنے اور اس کی ادب میں عکاسی کرنے کا نظریہ تقریباً ایک سا ہے۔ اسی رشتے سے سمانتر کے ساتھی بندھے ہیں۔ یہ رشتہ برابری کا ہے، ان میں، کوئی چھوٹا بڑا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "سمانتر سوچ" کا پیشرو ہو کر بھی کملیشور کو خوشی اس بات کی ہے کہ سچائی کو جاننے کیلئے اس کی بات مانی نہیں جاتی اس پر بے لاگ تنقید اور بحث ہوتی ہے، سچائی کو جاننے کیلئے۔

کملیشور کے اس جمہوری رویہ نے نہ صرف ہندی بلکہ اردو، پنجابی، مراٹھی، گجراتی، بنگالی، اُڑیہ، تمل، تیلگو اور ملیالم وغیرہ مختلف زبانوں کے ادیبوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے، غرض، آج سمانتر ادب ایک آل انڈیا سطح کا ایک ادبی فورم بن گیا ہے۔

چھوٹے ادیب کی طرح بڑا ادیب بھی مرتا ہے۔ سب کی طرح کملیشور کا بھی ایک دن معیّن ہے، لیکن کملیشور اس لحاظ سے بھی بہت بڑا ادیب بنا رہیگا کہ جہاں دوسرے ادیب صرف اپنی کتابوں میں زندہ رہتے ہیں، وہاں وہ اپنی کتابوں کے علاوہ آنیوالی نسل کے ادیبوں میں بھی زندہ رہیگا۔

کملیشور ایک بے حد ضدی اور تلخ آدمی ہے، اس کی ضد ہے کہ انسان کی شکل میں جو آدمی پیدا ہوا ہے اسے انسان کا مرتبہ ملنا ہی چاہئے، وہ تلخ ہے اس سارے نظام کے خلاف جو آدمی اور آدمی میں تفریق کرتا ہے۔

کملیشور کے قلم میں جادو ہے کہ جو چاہے تو دو سال میں چالیس کتابیں پیدا کر دے لیکن اس کے لئے بالائی دلدل حسین، لذت پسندی کی دلدل کا کنول بننا پڑیگا جو اسے ہرگز قبول نہیں ہے۔ اس کی زندگی کا کنول تو سنگین زندگی کی چوکھٹ پر سر مار کر ادنیٰ آدمی کی قسمت کا جادو جگاتے جگاتے خود پتھر بن گیا ہے اور اس کا نام ہو گیا ہے کملیشور۔ ہماری دلی خواہش ہے کہ وہ پتھر ہی بنا رہے، کیونکہ طلسمات سے پُر جس فلمی دنیا میں آج اس کا گزر ہے وہ اس کی امیج کو توڑنا چاہے تو خود ٹوٹ جائے اور پتھر کا کملیشور برقرار رہے، اپنی اس ادنیٰ آدمی کی دھج کے ساتھ۔

گریش رنجن

صحیح فلموں کی تلاش

گریش رنجن بنیادی طور پر فلم کے آدمی ہیں۔ عرصے تک بڑے فلمی فنکاروں کے ساتھ رہنے اور بے انتہا تجربہ حاصل کرنے کے بعد آپ نے کملیشور کے ناول ڈاک بنگلہ کو بھی اسی نام سے فلمایا۔ یہ فلم ایک تجربہ ہے۔ ویسے آپ لکھتے بھی ہیں

کملیشور ـ یہ نام پردۂ سیمیں پر بہت تیزی سے ابھر رہا ہے۔ ان ناظرین کے لئے یہ نام نیا نہیں ہے جو پچھلے بیس پچیس برس سے ادب کا مطالعہ کر رہے ہیں اور اس میں آئی ہوئی تبدیلیوں کو محسوس کر رہے ہیں۔ کملیشور نے افسانوی ادب میں قدم رکھتے ہی اس کے طرزِ فکر کو بدل دیا۔ کوئی تبدیلی یا کوئی انقلاب بلا وجہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے پسِ پشت میں برسوں کی ریاضتیں اور قربانیاں ہوتی ہیں۔ اپنی اس تجرباتی دنیا میں کملیشور نے مستقل مزاجی کے ساتھ کوشش کی ہے، یہ کوشش محدود نہیں بلکہ ان تمام شعبوں میں کی گئی ہے جس کا سماج یا انسانی معاشرہ سے تعلق ہے، اس جذبے کو لے کر اٹھنے والا اس وقت تک سکون سے نہیں بیٹھتا ہے جب تک وہ اس میں کامیابی حاصل نہیں کر لیتا ہے۔ ریڈیو ٹیلی ویژن سے لے کر سینما میں کہانی اور ڈائیلاگ لکھنے تک کملیشور نے ایک جد وجہد کی ہے۔ مختلف لوگوں تک پہنچنے کے اس ذریعے کو بھلا کملیشور کس طرح ہاتھ سے جانے دیتے۔ یہ ایک عظیم چیلنج تھا جسے کملیشور نے قبول کر لیا۔

فلموں میں کملیشور کی شمولیت بلا مقصد ہی نہیں تھی، جس شے کی تخلیق صرف تفریح طبع کے لئے کی گئی تھی وہ انسانوں تک پہنچنے کا ایک اہم ذریعہ بن جائیگی یہ خیال بھی محال تھا غیر ممالک میں فلم کو اپنے فن کے اظہار کا ذریعہ بنایا گیا لیکن ہندستان میں آج بھی اسے ایک تفریح سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہے۔ تاہم اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ چونکہ اسے سماج اور سیاست سے منسلک کر دیا گیا ہے لہٰذا سنجیدہ طبقہ ان حالات میں اپنی بے بسی کے اظہار کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا تھا مگر یہ کب تک ہوتا؟ ـ بے بسی اور کچھ کر ڈالنے کے جذبے نے بیچین کر دیا۔ اس کی ابتدا کملیشور نے اپنی کہانیوں سے کی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس قسم کی فلموں کا کیا کیا جائے، اسے کیا نام دیا جائے؟ یہ فلمیں سب سے الگ تھیں۔ ان میں زندگی کے اصلی روپ کو پیش کیا گیا تھا۔ چاہے وہ بدنام بستی نہ ہو یا "پھر بھی" یا "ڈاک بنگلہ" ان میں زندگی کی ایک اچھوتی جھلک تھی۔ جو ایک گھسے پٹے فلمی رواج سے بالکل الگ تھی، جسے ہم آج "نیو ویو" یا نئی لہر کہہ سکتے ہیں۔ یہ ویسی ہی تحریک تھی جیسی تحریک کملیشور نے "ورنا پورو" پر چلایا تھا۔ اس نئی تحریک کو چلانے والا گروپ جب تیار ہو گیا تو اب ضرورت ایسے ہی لوگوں کی ہوئی جن کے لکھنے پڑھنے سوچنے اور سمجھنے کا طریقہ بالکل الگ ہو۔ چنانچہ اس تحریک میں وہی،

شامل ہو سکا جس نے کملیشور کی آواز پر لبیک کہا۔ موہن راکیش، راجندر یادو، منو بھنڈاری وغیرہ کی تخلیق کو نئے طریقہ پر بڑھا جانے لگا۔ ارون کول۔ باسو چٹرجی، شتوبندر سنہا، پریم کپور۔ کمار ساہنی۔ باسو بھٹاچاریہ وغیرہ پروڈیوسر ڈائرکٹروں پر کملیشور کی انمٹ چھاپ ہے۔ ان میں کتنے ہی کملیشور سے کہانیاں، ڈائیلاگ اور دوسرے کام لینے کے لئے تیار تھے۔ راجندر یادو کی فلم "سارا آکاش" کی کہانی اور ڈائیلاگ کملیشور ہی کے لکھے ہوئے ہیں لیکن پردہ پر کہیں کملیشور کا نام تک نہ تھا مگر کملیشور نے اسے بھی برداشت کیا۔ صرف اس لئے کہ کہیں کملیشور کے مقصد کو آپسی پھوٹ سے نقصان نہ پہنچ جائے ایسی اور بھی کتنی فلمیں ہیں جن کی کہانی سے لے کر ڈائیلاگ تک کملیشور ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن کملیشور نے بغیر کسی شرط کے اسے مکمل کر دیا۔

لیکن نظریاتی اختلافات کی بنا پر یہ دیرپا ثابت نہ ہو سکا۔ جن کی فلمیں آج بازار میں کامیاب ہو گئیں وہ آج کامیاب ڈائرکٹر ہیں۔ کامیابی کے باوجود ہدایت کار و پروڈیوسر کو کملیشور کے قلم کا لوہا ماننا پڑا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ کملیشور میں ایک نئی فکر پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ تمام لوگ جو قدیم روش پر گامزن تھے، کملیشور کی طرف رجوع ہوئے۔ کل تک جو منشی کی کہانیوں اور ناول پر فلم بناتے تھے آج وہ کملیشور کے پاس آئے۔ گلزار نے "کالی آندھی" اور "آگامی اتیت" ناولوں پر "آندھی اور موسم" بنا ڈالی۔ "آندھی اس قدر متنازعہ فیہ فلم بنی کہ اس کی ریلیز کے بعد چند مہینوں تک اس پر پابندی عائد کی گئی۔ یہ فلم سیاست پر ضرب کاری کے ساتھ ساتھ فلمی زندگی کی کھلی ہوئی دستاویز تھی۔ عام طبقہ سے لے کر تعلیم یافتہ طبقہ تک کے لوگوں نے کملیشور کی اس فلم کو ایک نئی تخلیق مانا ہے۔ اس کے بعد 'موسم' آئی۔ موسم میں جس تخیل کو پیش کیا گیا ہے، وہ عام انسانوں کی کہانی ہے۔ فلمی دنیا میں کملیشور کے نام نے ہلچل مچا دی۔ ٹی وی پر "پریکرما" پیش کرنے والا کہانی کار بھی ہے کیا؟ جب لوگوں کو پتہ چلا کہ پہلے کہانی کار ہے بعد میں کچھ اور۔ تو انہیں تعجب ہوا۔ سبھی اپنے اپنے مستقبل کے پروگراموں کو لے کر آنے لگے۔ کوئی کہانی لینے آیا تو کوئی ڈائیلاگ لکھوانے کے لئے۔ کچھ تو فلم کی پوری ذمہ داری کملیشور کو سونپ دینے کیلئے تیار ہو گئے۔ فلمی دنیا میں ہر ایک شخص کوئی نئی چیز پیش کرنا چاہتا ہے۔ کملیشور کی کہانیاں مکمل ادبی ہیں۔ انھوں نے بنگالی ادیبوں کی طرح فلم کو دھیان میں رکھ کر تخلیق نہیں کی ہے بلکہ دوسروں کی کہانیوں پر اسکرین اور ڈائیلاگ لکھنے کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ "آمانُش" صرف ایک ایسی فلم تھی جس کے صرف ڈائیلاگ کملیشور نے لکھے ہیں۔

اس فلم کا تذکرہ یوں بھی ضروری ہے کہ اب تک بنگالی زبان سے ترجمہ کر کے ہندی میں جو فلمیں بنی ہیں ان میں ڈائیلاگ بھی بنگالی سے ہندی میں ترجمہ کر کے لکھے جاتے تھے۔ "آمانُش" پہلی فلم ہے، جس کے ڈائیلاگ ہندی سے بنگالی میں ترجمہ کئے گئے ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ کملیشور ہندی کے پہلے ادیب ہیں، جنہوں نے فلموں میں قدم رکھا ہے، منشی پریم چند۔ امرت لال ناگر۔ سدرشن۔ بھگوتی چرن ورما جیسے مشہور ادیبوں کا کوآپریشن فلموں کو رہا ہے۔ لیکن یہ ادیب آئے اور دو ایک فلمیں لکھ کر چلے گئے اور ٹِک نہ سکے۔ جو بھی وجہ رہی ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ زمین انھیں اچھی نہیں لگی اور اگر یوں کہوں تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ اس طریقۂ کار سے وہ اپنے کو مانوس نہ کر سکے۔ ایک طرف ادب جو صرف تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتا ہے تو دوسری طرف فلم کے ذریعے عام انسان کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ منشی پریم چند جب "مزدور" فلم لکھنے لگے تو ان کے "سیوا سدن" پر بھی فلم بنانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ فلم بنی بھی تھی، پر منشی جی کو "سیوا سدن" کی اسکرین کہانی اچھی

نہیں لگی اور انہوں نے ہمیشہ کے لئے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دیا۔ یہی حشر تقریباً ان سارے ادیبوں اور شاعروں کا ہوا جو ادب میں اپنی دھاک جما کر آئے تھے۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے کیونکہ دونوں فنیا ذی طور پر الگ الگ ہیں۔ ادب کچھ اور ہے فلم کچھ اور۔ ایک کہانی کار صرف اپنی تخلیق کے زور پر ہی فلم میں کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ فلم کے تفریحی حصے پر بھی اس کی گرفت مضبوط ہونی چاہئے۔ ان ادیبوں کی بات دوسری ہے جو صرف اپنی کہانیوں اور ناولوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں لیکن وہ لوگ جو فلم کو کچھ دینا چاہتے ہیں جو اپنا contribution چاہتے ہیں تو وہ اسی وقت کامیاب ہونگے جب انھیں اسکرین رائٹنگ کا صحیح علم ہو۔ حالانکہ کہانی کاروں کا خیال ہے کہ فلمی کہانی ناٹک ہی کا دوسرا نام ہے جبکہ دونوں بالکل الگ الگ چیزیں ہیں۔ ایک طرف ناٹک صرف بات چیت اور ظاہری دکھاوے کی بنا پر باعثِ تفریح بنتا ہے، وہاں فلموں کے بہت سے مناظر دل کی گہرائیوں تک اتر جانے کا وصف رکھتے ہیں۔ ایک طرف جب قدرتی حسن کی تعریف میں کہانی کار یا ادیب، صفحات کے صفحات لکھ ڈالتا ہے وہیں پر کیمرے کے ذریعے نکلتے ہوئے سورج سے لے کر کھلتے ہوئے پھولوں کو مختصر کر کے ایک شاٹ میں، ناظرین کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ کہانی کار جب تک کیمرے سے آنکھیں ملا کر نہیں دیکھتا اس وقت تک اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ جہاں تک پختہ کاری کا سوال ہے وہ بہت بعد کی بات ہے۔ ایک ہی دن میں کسی کی کایا نہیں پلٹتی۔ صرف ایک فلم کی کہانی لکھ کر ہی قدیم زاویۂ نگاہ اور طریقۂ فکر کو بدلا نہیں جا سکتا۔ کسی بھی میدان میں تبدیلی کی امید صرف ایک دن میں نہیں کی جا سکتی ہے۔ آہستہ آہستہ ہی اس لڑائی کو جیتا جا سکتا ہے۔ فلم کہانی کا اصلی روپ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے نظریہ بھی ہے، اس پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ کملیشور نے خود ہی یونین بینک کے ایک سوشیل اجتماع میں اپنی صدارتی تقریر میں کہا تھا کہ "فلم ایک کاروباری فن ہے، یہ آزاد فن بھی نہیں ہے، بلکہ ادب، موسیقی، تصویر کشی کے ذریعے مرتب ہوتا ہے۔ اس پیسہ خرچ ہوتا ہے۔"

انکر اور رجنی گن دھا، کو اسی قسم کی تجارتی فلم مانتا ہوں جو کہ باکس آفس پر کامیاب ہو کر بھی اپنے سماجی رشتوں سے منسلک ہیں۔ جب کملیشور نے یہ تقریر کی تھی اس وقت تک وہ فلمی دنیا میں پوری طرح نہیں آئے تھے یا یہ کہا جائے کہ وہ بہت زیادہ فلمیں نہیں لکھ رہے تھے۔ مگر ان کو فلمی دنیا کی ان تمام کمزوریوں کی آگاہی تھی، لہٰذا ان کے خیال میں یہ تھا کہ ایک کامیاب فلم بنا کر ہی اپنی بات کو کہا جا سکتا ہے۔ میں نے کملیشور کے دوستوں اور نقادوں کو کہتے سنا ہے کہ کملیشور اب ادیب نہیں بلکہ فلمی کہانیوں کے رائٹر ہیں، انھوں نے مفاہمت کر لی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ادیب اپنے حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتا؟ پریم چند نے اپنے شاہکار "گئودان" کو ایک ہزار روپے میں پبلشر کو سونپ دیا تھا۔ شرت نے اپنے "دیوداس" کو چالیس روپیہ میں نیو تھیٹرس کے ہاتھوں بیچ دیا تھا۔ اقتصادی حالات میں کب اور کہاں کسے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے یہ کون جانتا ہے۔ جہاں تک صحتمند فلموں کا سوال ہے کملیشور اکیلے یہ انقلاب نہیں لا سکتے۔ کل تک فلم جن لوگوں کے یہاں غیر اخلاقی بات سمجھی جاتی تھی انھیں چاہیئے کہ اسے نفرت کی نظر سے نہ دیکھ کر اس وسیع اظہار کو مضبوط بنائیں اور اس کی حقیقت بیانی پر زور دیں۔

یہ سچ ہے کہ آج کل ان کے پاس بہت سی فلمیں ہیں۔ کسی میں کہانی لکھ رہے ہیں تو کسی میں ڈائیلاگ اور اسکرین۔ بی آر چوپڑہ، شکتی سامنت، رامانند ساگر، وجے آنند، سنیل دت، ہیما مالنی، دلال گوہا جیسے چوٹی کے پروڈیوسرس، ہدایتکار اور فنکار کی بھی فلمیں کملیشور کے پاس ہیں۔ وہ لکھتے لکھتے تھک جاتے ہیں، اپنی ان مصروفیتوں کے باوجود بھی کملیشور ہارے نہیں ہیں۔ تحریر سے زیادہ وہ اسے ایک سماجی سدھار مانتے ہیں۔ یہ وقت ہی بتلائیگا کہ ہندی فلموں میں کملیشور کا کیا حصہ ہے اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ صحتمند اور صحیح فلموں کی تلاش میں کملیشور ہمہ تن مصروف ہیں ==

ترجمہ:- ظہیر عباس رضوی

خواجہ احمد عباس

ٹیلیویژن اسٹار: کملیشور

کملیشور کی شخصیت کے کتنے ہی پہلو ہیں۔

وہ سب سے پہلے ایک کہانی کار ہے۔ اس نے سینکڑوں کہانیاں لکھی ہیں۔ جن میں سے اکثر بہت اچھی ہیں۔ ترقی پسند ہیں۔ سچائی کا آئینہ ہیں۔

ہندی کہانی کے ارتقاء میں اس کا خاص حصہ ہے۔

ساتھ ہی وہ ناولسٹ بھی ہے۔ معلوم نہیں کہاں سے اچھے ناول لکھنے کے لئے وہ وقت نکالتا ہے۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ کمال کا ناولسٹ ہے جو زندگی کے قریب کے کرداروں کو اپنے ناولوں میں پیش کرتا ہے۔

وہ آہستہ آہستہ فلم کے میدان میں بھی آ رہا ہے۔ کئی اسکرین پلے اور سنیریوں اپنی کہانیوں سے ہی پلاٹ لے کر اس نے لکھے ہیں۔ مجھے اس کی "پھر بھی" اور "موسم" بہت پسند آئے ہیں۔

"ساریکا" کا وہ ایڈیٹر ہے۔ پہلے وہ "نئی کہانیاں" کا ایڈیٹر تھا۔ ایڈیٹری آسان کام نہیں ہے۔ خصوصاً کہانیوں کے ایک ماہوار رسالے کا۔ ڈھیر ساری کہانیوں میں سے کہانیوں کا چناؤ کرنا بہت مشکل کام ہے۔ لکھنے والوں میں سے اکثر ایڈیٹر کے ذاتی تعلقات ہوتے ہیں۔ کہانی نہ چھاپی تو غلط فہمی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لیکن ایڈیٹر کی کرسی پر جب کملیشور بیٹھ جاتا ہے تو وہ دوست نہیں رہتا۔ ایک سخت نقاد بن جاتا ہے۔ آپ اس کے چناؤ کو نہ مانیں مگر اس کی ایمانداری اور خلوص کو ماننا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ بڑی ایمانداری سے کہانیوں اور مضامین کی پرکھ اور چناؤ کرتا ہے۔

وہ بہت سی سرکاری کمیٹیوں اور غیر سرکاری سنستھاؤں کا ممبر اور کارکن بھی ہے۔ اکثر ہوائی سفر میں رہتا ہے۔ کانفرنسوں اور جلسوں میں بھی شرکت کرتا ہے۔

وہ دوست بھی ہے۔ جب دوست بلاتے ہیں تو وہ فوراً وقت نکال کر دوستوں کی محفلوں میں بلا تکلف پہنچ جاتا ہے۔ وقت کی کمی کا بہانہ نہیں کرتا ہے۔

اس ہشت پہلو انسان کی سب سے نئی اور انوکھی خصوصیت جو اسے ہزاروں انسانوں کی زندگی سے قریب لاتی ہے وہ ہے ایک ٹیلی ویژن اسٹار کی ہے۔

فلم اسٹار تو ہم نے دیکھے ہیں۔

مگر ہمارے ملک میں ٹیلی ویژن اسٹار ہونا نئی چیز ہے۔

یہ شخصیتیں ابھی پانچ چھ برس سے ابھر رہی ہیں۔

کملیشور نمبر

دو دہلی دیہرن اسٹار تو بتن پرکھو اور یعقوب سعید ہیں جن کا "ہاس پریہاس" پروگرام ہر اتوار کی صبح کو پیش ہوتا ہے۔ ہنسنے ہنسانے کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

ایک ٹی وی اسٹار پینٹل ہے جو اپنے "اڑو سنگھ" میں جمائے پورے سماج کو آئینہ دکھاتا ہے۔ ہنساتا بھی ہے اور تھوڑا بہت سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

ایک اور ٹی۔ وی اسٹار ہماری پرانی دوست تبسم ہے جو عام طور سے تو فلمی دنیا کی گھسی پٹی شخصیتوں کو پیش کرتی ہے اور ان کے بہانے سے فلمی گانوں کو پیش کرتی رہتی ہے لیکن کبھی کبھی "پرشورام" جیسے لوگوں کو پیش کر کے فلمی دنیا کے تضادوں اور اقتصادی اونچ نیچ کے بارے میں ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ایک ٹی وی اسٹار دہلی کے ڈی میلوٹ صاحب ہیں جو اپنے PERSPECTIVE پروگرام میں آج کے ہندوستان کی ترقی، ٹھہراؤ یا تنزل کی ہفتہ وار ایک تصویر پیش کرتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کا پروگرام سچ مچ چونکا دینے والا ہوتا ہے۔ کبھی وہ سماجی ٹریجڈی کو آئینہ دکھاتے ہیں اور ہم رو پڑتے ہیں۔ (مثلاً جب کوڑھیوں کے ساتھ کیسا سلوک ہوتا ہے اسے پیش کرتے ہیں) مگر عام طور سے ان کا مقصد سماجی اور اقتصادی مسئلوں کو پیش کر کے ہمیں سوچنے پر آمادہ کرنا ہوتا ہے۔

ایک اور دہلی دیہرن اسٹار ہمارے کملیشور صاحب ہیں جو اپنے پروگرام "پری کرما" کے ذریعہ ہماری معلومات اپنے جیسے انسانوں کے بارے میں بڑھاتے ہیں اور ان انسانوں کے ذریعہ ہمارے سماج کے دکھتے ہوئے حصوں پر ہاتھ رکھ کر دکھاتے ہیں۔

پہلے جب یہ پروگرام شروع ہوا تو انہوں نے پڑھے لکھے لوگوں کو دکھایا۔ ان کے سماجی مسائل پر ان کو بولنے کا موقع دیا اور ان سے بحث و مباحثہ کیا۔ سوال ایسے تیکھے کئے کہ ریا کاری (اور کچھ ریا کاری پر خلوص بھی ہوتی ہے) کا پردہ ہٹ گیا اور ہمیں اپنے سماج کے خدوخال ان کرداروں میں دکھائی دینے لگے۔

یہ پروگرام چلتا رہا اور ایک کے بعد ایک طبقے کے نمائندے ہمارے سامنے آتے رہے۔

پروفیسر۔

لیکھک۔

ودوان۔

آلوچک۔

شکشک۔

ڈاکٹر۔

ساہتیہ کار۔

کوی اور شاعر۔

یہ سب آئے۔ اپنا اپنا دکھڑا روئے اور چلے گئے۔

پھر کملیشور کے پروگرام نے پلٹا کھایا اور عوام کی زندگی کے اور قریب آگیا۔

دس روپے فی کس حجامت بنانے والے نائی سے لے کر چوتی میں بال کاٹنے والے نائی۔

مکان بنانے والے مزدور۔

وکٹوریہ چلانے والے ،
کھانے کے ڈبے سر پر اٹھا کر پہنچانے والے ،
جھونپڑ پٹی میں رہنے والے ۔

یہ تھا کملیشور کا امتحان بہ حیثیت ایک انسان کے ، انسان دوست کے ، بہ حیثیت ایک سوشلسٹ لیکھک کے اس امتحان میں وہ پورا اترا ۔

ایسے ایسے سوال کئے اس نے اور چونکا دینے والے جواب پائے جو ہماری اونچ نیچ اور تضادوں کو نہ صرف دکھاتے ہیں ملکہ ان کے بارے میں ہماری معلومات بھی بڑھاتے ہیں اور سچ مچ کے انسانوں سے ہماری ملاقات اور دوستی کراتے ہیں ۔

یہ ٹیلی ویژن کا سماجی اور سوشلسٹ تصور تھا جو کملیشور کے "پری کرما" پروگراموں سے اُجاگر ہوا ۔

جو کام وہ ایک کہانی لکھ کر کر سکتا تھا ۔ مگر کتنے لوگ کہانی پڑھ سکتے ہیں ؟ ۔۔۔ وہ کام اس نے ان کرداروں کو ہمارے سامنے لا کر کے اُن سے ایسے ایسے سوال کر کے جو پورے طبقے کے اقتصادی اور سماجی سوالوں پر روشنی ڈالتے ہیں ۔

ٹیلی ویژن اسٹار کملیشور کی ایک اور انفرادی حیثیت ہے ۔ وہ ایک خوش رو (مگر فلمی ہیرو جیسا نہیں) نوجوان (میں تو نوجوان ہی کہوں گا) آدمی ہے جو معمولی شرٹ اور پینٹ میں دکھائی دیتا ہے ۔ لگتا ہے کسی دفتر سے کوئی بابو اٹھ کر چلا آیا ہے ۔

وہ پروگرام سے پہلے ایک تعارفی تقریر کرتا ہے ۔ تقریر کہنا تو اس کی بات چیت کا مذاق اڑانا ہے ۔ اس کی بول چال دھیمی آواز میں ہوتی ہے ۔ جیسے وہ ہر ایک ٹی ۔ وی دیکھنے والے سے فرداً فرداً بات کر رہا ہے ۔ وہ ہماری توجہ ان کرداروں (اور ان طبقوں) کی طرف مبذول کراتا ہے جو اس دن کے پروگرام میں حصہ لیتے ہیں ۔

پھر وہ اُن ہستیوں سے ہماری ملاقات کراتا ہے جنہیں وہ نہ جانے کہاں کہاں گھوم پھر کر یہاں لاتا ہے ۔

مگر وہ اوپر سے ان سے سوال نہیں کرتا کہ وہ Self - Conscious ہو جائیں ۔ وہ ان سے دوستوں کی طرح باتیں کرتا ہے ۔ خواہ وہ کوئی بھی ہوں ۔ اور یہی اس کا کمال ہے ، اُس کا آرٹ ہے ، اُس کا نظریۂ زندگی ہے وہ ہر ایک کو ایسے اطمینان سے بٹھاتا ہے کہ وہ بھول جاتے ہیں کہ وہ ٹیلی ویژن کیمرے کے سامنے ہیں ۔ وہ ایسی ہمدردی سے بات کرتا ہے کہ وہ اسے ایک دوست سمجھنے لگتے ہیں جو ان کی زندگی اور اس کے مسائل سے دلچسپی رکھتا ہے ۔

اور اُن سے بات چیت کر کے جب وہ بات چیت کا لب لباب سناتا ہے تو آپ کو ایسا لگتا ہے کہ جتنا کچھ بولا گیا ہے وہ کملیشور نے اپنے حساس دماغ سے جذب کر لیا ہے ۔

یہ ٹیلی ویژن اسٹار معمولی آدمیوں کو انٹرویو کرنے میں مہارت رکھتا ہے اس لئے کہ وہ خود ایک حساس لیکھک ہے ۔ اور سچا لیکھک دنیا بھر کے دُکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتا ہے ، جب ہی تو اس کے لٹریچر میں ۔۔۔ اس کی کہانیوں اور ناولوں میں ۔۔۔ جان پڑتی ہے ۔

کملیشور ایک سماجی سوشلسٹ تصور رکھنے والا لیکھک ہے جس کا آرٹ ٹیلی ویژن کے ذریعہ دس بارہ لاکھ ٹیلی ویژن دیکھنے والوں تک پہنچتا ہے ۔ ▲

سچدانند دھوم کیتو

نئے ادیب اور کملیشور

دسمبر ۱۹۳۹ء میں پیدا ہونے والے سچدانند دھوم کیتو نے کہانیاں، ناول، مضامین، ایکانکی، غرضیکہ نثر کی ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ابھی بہار میں سرکاری ملازم ہیں۔

★

۲ر دسمبر ۷۵ء:... چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ بہار کے راجگیر مقام پر ننھی پتیوں اور پھولوں کی مہک سے پورا جنگل معطّر ہے۔ ڈھاک بجنے کی آواز.....

صبح ۸ بجے تھے۔ ملک کے طول وعرض سے آئے ہوئے ادیب، کانفرنس میں شرکت کے لئے تیاریوں میں مصروف تھے۔ لیکن ٹورسٹ بنگلہ کے گھاس بھرے راستے پر ایک شخص پتلون اور سوئٹر زیب تن کئے خاموش بیٹھا تھا اور اس کے چاروں طرف نئے لکھنے والے اور نوجوان اکٹھا تھے اور وہ شخص انھیں سیکولرزم اور مذہب کے نت نئے بدلتے پہلوؤں کے بارے میں بتا رہا تھا کہ موجودہ حالات میں ایک ادیب کس طرح اپنے ادب کی تخلیق کرے۔ نوجوان سوالات کر رہے تھے اور وہ ٹیوٹر کی طرح بڑی شفقت اور روانی سے انھیں جواب دے رہا تھا..... یہ شخص تھا کملیشور۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ۱۲ر دسمبر ۷۶ء کو پیش آیا۔ ناگری پرچارنی سبھا کے وسیع ہال میں ملک کے دانشور، پروفیسر، وکیل، صحافی اور ادیب، جنمیں امرکانت، اجیت، پسکل، مدھوکر سنگھ، ڈاکٹر ٹھاکر، راکیش، جیوتی پرکاش، سبھاش پنت، ڈاکٹر سریندر چودھری قابلِ ذکر ہیں، موجود تھے۔ ان میں کمیونسٹ پارٹی کے ممبروں کی بھی موجودگی محسوس کی جا رہی تھی جب کملیشور تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔

خصوصاً تقریر کے اس حصے پر:

"ضرورت ہے کہ گاؤں، قصبوں اور شہروں سے نئے لکھنے والوں کو تلاش کیا جائے جو عام لوگوں میں رہ کر ان کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں اور ان کی بنیاد پر اپنے ادب کی تخلیق کرتے ہیں۔"

اور تقریر کے بعد جب ڈاک بنگلہ میں دوسرے ادیب ہلکی پھلکی اور طنز و مزاح لئے ہوئے، بات چیت سے تھکن مٹا رہے تھے، کملیشور زمین پر ایک معمولی دھوتی کرتا پہنے ہوئے بیٹھا ہوا تھا اور اپنے چاروں طرف بیٹھے ہوئے نوجوان لکھنے والوں کو، جو بہار کے مختلف شہروں سے آئے تھے، بدلتے ہوئے سماجی، معاشی اور سیاسی ماحول میں ادب کی حیثیت،

اس کا رول اور نئے ادیبوں کی ذمہ داریوں کے بارے میں بتا رہا تھا اور انھیں عوام میں رہ کر ان کے مسائل کو سمجھنے اور سدھارنے کا مشورہ دے رہا تھا۔

کتنی سادہ اور تصنع سے پاک ہے اس کی شخصیت۔ غیر معروف اور غیر اہم لوگوں کے بیچ بیٹھ کر ان کے سوالوں کے جواب اور آٹوگراف دینے اور اپنی دن بھر کی تھکان بھلا کر وہ کون سا جذبہ تھا جو اسے مسلسل بیتاب کئے رہتا تھا۔ ظاہر ہے اسے نئے لکھنے والوں میں صلاحیت کی تلاش تھی جن پر آنیوالا ادب ناز کریگا۔ وہ نئے لکھنے والوں کو پسماندہ، پچھڑے ہوئے، غریب عوام میں جانے اور ان کے مسائل کی بنیاد پر ادب کی تخلیق کرنے کا پیغام دے رہا تھا۔ انھیں نئے شعور اور نئی قدروں سے مسلح کر رہا تھا۔

سامعین کی نظریں اسی پر جمی ہوئی تھیں، وہ بے لوث تھا۔ اسی بے لوث سامعین بھی ملے، جو اسے سُنکر بے پناہ جوش میں بھر گئے تھے اور وہ اپنی تحریک کو تیز تر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اپنی تخلیقات میں سماجی قدروں کو اجاگر کرنے کے لئے وہ اسی طرح تیار تھے، جس طرح ایک سپاہی اپنے کپتان کے حکم پر مر مٹنے کے لئے تیار رہتا ہے۔

ادبی گفتگو ختم ہونے لگی، رات بڑھتی رہی لیکن کملیشور اپنے مداحوں سے گفتگو کرتا رہا۔ کیا تعلیم ہے، گھر میں کتنے فرد ہیں، فصل کیسی ہے۔ وغیرہ۔

گفتگو ختم ہونے پر وہ کافی مطمئن نظر آ رہے تھے، جیسے انھیں ان کی وہ منزل مل گئی ہو جس کی انھیں تلاش تھی۔ تصنع، تکلف سے پاک، خلوص کا پیکر، اقتدار کی ہوس سے دور۔ خدمت خلق کے لئے ہمیشہ تیار۔

اس نے ادب کی راہ میں لمبا سفر کیا ہے، لیکن آج تک اپنی شخصیت کو کسی پر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے عروس البلاد کی تمام آرائشیں اور آسائشیں میسّر ہیں لیکن وہ انھیں چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے قصبے، دیہات اور گاؤں میں ادبی نشستوں کے لئے جاتا رہتا ہے۔ مظفر پور، راجگیر وغیرہ میں، میں نے اسے چلچلاتی دھوپ میں، تارکول، ننگی سڑک، ناہموار راستوں، پہاڑیوں اور دھول سے اٹے ہوئے کچے راستوں پر چلتے ہوئے دیکھا ہے اور ساتھ ہی اس کے چاہنے والوں کا ہجوم۔

اس چاہت و محبت کا سبب ہے اس کی شخصیت، اس کا اسلوبِ نگارش، اس کی کہانیوں کا حقیقی موضوع۔ دل کو چھو لینے والا خیال۔ اس کے مداحوں کی جانب سے اس کی تعریف حقیقت پر مبنی ہوتی ہے۔

چلتے وقت اسے سواری نہیں چاہئے۔ اسٹیج پر اسے ہاروں کی تمنا نہیں ہوتی۔ وہ سب کے ساتھ مل کر ایک عام انسان کی طرح جینا چاہتا ہے۔ در اصل وہ ادب اور قلم کا مزدور ہے۔

بغیر کسی تمہید کے میں یہ عرض کرونگا کہ کملیشور نے کہانی کو نئی زمین دی ہے، نیا موضوع اور اچھوتا انداز دیا ہے، نئے چہرے اور نئی صلاحیتیں دریافت کی ہیں اور ان کی تربیت کی ہے۔

کملیشور نے ادق الفاظ، غیر واضح اسلوب اور پیچیدگی میں اپنی صلاحیت نہیں گنوائی ہے۔ اس کی کہانی میں فطری اثر اور حقیقی زندگی کا عکس ہوتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ کملیشور نے اس تلاش کا آغاز کیوں کیا؟ تخلیقِ ادب میں کن عناصر اور کن حقیقتوں کو فراموش کیا جاتا رہا ہے؟ ہمارے مستند ادیبوں نے کن مسائل سے دامن بچایا تھا؟

تاریخ گواہ ہے کہ "اندو متی ۹ ۱۹۰۰ء" اور "دلاری بائی ۱۹۰۷ء"۔ غیر حقیقی کہانیاں ہیں، اسی طرح "سرسوتی"

"انند" "سدرشن" اور بھارت متر میں شائع ہونے والی بزرگوں کی کہانیوں کو پیداوار اور استعمال کی کہانیاں کہا جاسکتا ہے
۱۹۱۶ء سے ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، جب "پنچ پرمیشور" لکھی گئی۔ اس کے بعد پریم چند ہندی کہانی کے بے تاج بادشاہ تھے۔ حقیقت نگاری، سماجی پس منظر، ان کی کہانیوں کا مثبت اور خوب تر پہلو ہیں۔ پریم چند نے واقعات پر لمحات کو فوقیت دی ہے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ایک دوسری تحریک بھی چل رہی تھی، جے شنکر پرساد کی۔ پریم چند اور جے شنکر پرساد اگرچہ ہمیشہ ساتھ رہے لیکن نظریاتی یگانگت نہ ہو سکی۔ ایک سماج میں یقین رکھتا تھا دوسرا فرد میں۔ ایک نے وقت کے تقاضوں میں خود کو ڈھال لیا تھا، دوسرا ماضی کے کھنڈروں سے جڑا ہوا تھا۔

رائے کرشن داس، ونود شنکر ویاس، چنڈی پرساد، ہردیش، گووند بلبھ پنت کے بعد یہ تحریک رک گئی اور اس کی جگہ فطرت نگاری اور تلخ حقیقت نگاری نے لے لی۔

۱۹۲۸ء میں جینندر اپنی کہانی "کھیل" لے کر آئے۔ اسے کہانی کا تیسرا دور کہنا چاہئے۔ پریم چند نے پسماندہ طبقات کو اپنی کہانی کا موضوع بنایا تھا اور جینندر نے عورتوں کی نفسیات کو اپنی کہانی میں جگہ دی۔

کہانی جب نفسیات کی مکڑی کے جال میں پھنسی ہوئی تھی، یشپال نے پریم چند کی روایت کو زندہ کیا۔ لیکن وہ شہر کے بچھڑے ہوئے لوگوں کے سوا اور کسی کو موضوع نہیں بنا سکے۔ پریم چند کی طرح پورے ہندستانی سماج کی تصویر ان کے یہاں نہیں ملتی۔

آزادی کے بعد، نئی کہانی کے تعارف سے قبل، کہانی مختلف خیموں، نظریوں اور روایتوں میں تقسیم تھی۔ جس پر تصنع اور بناوٹ کا غلاف چڑھا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ اندر ناتھ مدان کو لکھنا پڑا کہ دورِ حاضر کو انھوں نے ایک Process کی شکل میں نہ اپنایا ہوتا، کہانی کے موضوع کو انفرادی اور سماجی حیثیت سے تقسیم نہ کیا ہوتا اور اشاریت وحقیقت پسندی کا حصار قائم نہ کیا ہوتا تو شاید آج کی کہانی کو نعرہ لگانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

آزادی کے بعد ایک طویل عرصے تک بکھرے ہوئے بناوٹی کہانی کے موضوع کو جب ایک انداز ملا تو اس کا کہانی پن، اس کی ہندستانیت اور اس کی حقیقت ابھر کر سامنے آئی۔

سیاسی اثرات کو خیرباد کہہ دیا گیا، اقرباپروری کا خاتمہ ہوا، مفاد پرستی دور ہوئی اور سماجی رشتوں سماجی حقوق و ذمہ داری نیز نفسیاتی سطح پر لکھی گئیں۔

"قصبہ کا آدمی" ۱۹۵۵ - "راجہ نربنسیا" ۱۹۵۶ - "نوکری کا پتہ" ۱۹۵۶ - "ملبے کا مالک" ۱۹۵۶ - "جانور اور جانور" ۱۹۵۶ - "جہاں لچھمی قید ہے" ۱۹۵۷ - "تیسری قسم" ۱۹۵۷ - "بھوکے اور ننگے لوگ" ۱۹۵۸ء - "نیلی جھیل" ۱۹۶۰ "دکھ بھری دنیا" ۱۹۶۲ - "کھوئی ہوئی دِشائیں" ۱۹۶۷ - "کمرہ اور گلی" ۱۹۶۲ - "دنیا بہت بڑی ہے" ۱۹۶۳ - "فولاد کا آکاش" ۱۹۶۳ - "لوٹنا" ۱۹۶۳ - "فیصلہ" ۱۹۶۴ - "بدبو" - "سات بچوں کی ماں" - "کرم ناشہ کا ہار"۔

نئی کہانیوں کا دور تقریباً ایک دہائی تک رہا۔ کملیشور، موہن راکیش اور راجندر یادو کے علاوہ جو نئی کہانیوں کے جنم داتا تھے، ادیبوں کا ایک اچھا خاصا گروہ زندگی کے مسائل سے متعلق کہانیاں لکھتا رہا۔ اچانک ۶۶ء کے بعد کہانی نگاری میں انقلاب آیا اور غیر حقیقی موضوع پر کہانیاں لکھی جانے لگیں۔ خود کملیشور ۶۶ء میں "بھرے پرے ادھورے" کہانی کے بعد بہت سی سطحی کہانیوں کی تخلیق سے خود کو نہیں روک سکے۔

۱۹۶۶ کے بعد کی کہانیوں میں نیاپن کے نام پر زندگی کا سطحی اور بالکل غیر حقیقی تجزیہ پیش کیا گیا۔ موضوع غیر حقیقی ہے، کردار الجھے ہوئے ہیں، رومانی ڈھنگ میں انفرادی حقائق ہیں، اس کی وجہ تھی، صلاحیت سے قبل شہرت کی تمنا

موہن راکیش، کملیشور اور راجندر یادو کی صف میں جلد از جلد پہنچنے کے لئے انھوں نے عوام کے نام پر عوام ہی کا چہرہ بگاڑنا شروع کر دیا تھا۔ ان کی کہانیوں کے کردار الجھ گئے اور وقت کے انقلاب میں یہ انداز تحریر خود ہی گم ہو گیا۔

کہانیوں پر اس قدر چھریاں چلیں کہ اس کا چہرہ ہی مسخ ہو گیا۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ ہمارے کہانی نویس اپنے جذبات سے زیادہ متاثر تھے اور سماجی حقائق سے کم۔

کہانی کے اس بکھراؤ کا جب دوسرے ادیب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ کملیشور نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر سہارا دیا اور دورِ حاضر کے تقاضوں کو انسانی قدروں سے ہم آہنگ کرتے ہوئے نئے ادب کی تخلیق کی۔ یہی مارکسی فکر ہے، یہ غلط فہمی میں مبتلا نہیں کرتی بلکہ نیا نقطۂ نظر دیتی ہے۔

محاورہ یا اشاریت انھیں پسند نہیں ہے، وہ واضح اور سلیس لفظوں میں گفتگو کرتے ہیں اور اپنے مقصد کو واضح کرتے ہیں۔

جس طرح کملیشور نے نئی کہانیوں کو قبولِ عام بخشنے میں اہم رول ادا کیا ہے اسی طرح اس کی مخالفت بھی کی۔ جس طرح چیخوف نے کہانی کے پرانے ڈھنگ کو بدلا اسی طرح کملیشور نے بھی اس کے پرانے پن کو ختم کیا۔

کہانی کے مزاج کو جس طرح بدل کر کملیشور نے اسے عام انسان کی زندگی سے جوڑا ہے، وہ ہمیشہ نئے لکھنے والوں اور آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتا رہیگا۔

نئی کہانی کے ملبے پر جب کچھ کہانی کار اپنی کاوشوں کو لوگوں کے ذہن میں اتارنے کی کوشش کر رہے تھے، کملیشور نئے ادب کے ساتھ ساتھ "نئے ادیب" کی تخلیق کر رہا تھا۔

جس کام کو ڈاکٹر جانسن نے انگریزی ادب، آندرے ژید نے فرانسیسی ادب اور تانجاکی نے جاپانی ادب کے لئے کیا، وہی ادب ہندی ادب کے لئے کملیشور نے کیا۔

اسی طرح کملیشور ادب اور ادیب ساز بھی ہیں اور نئے ادب کی علامت بھی۔

ترجمہ:- شمیم طارق

سبھوں کا دوست

ستیش جمالی

ستیش جمالی ہندی کے نوجوان ادیب ہیں اور افسانہ نگار ہیں۔ افسانہ نگاری ان کا خاص میدان ہے۔ زندگی اور ملکی حالات پر ان کی نظر گہری ہے۔ اس لئے اس کم عمری ہی میں وہ چونکانے والی کئی کہانیاں پیش کر چکے ہیں

★

کملیشور ہندستان کے ان ممتاز ادیبوں میں ہیں جنھوں نے اپنی لازوال تخلیقات سے ادب کے دامن کو مالامال کیا ہے اور اپنے بعد کی نسل کے ادیبوں کو متاثر کیا ہے۔

کملیشور نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا جوہر ہندی میں دکھایا ہے اس لئے وہ امرکانت۔ مارکنڈے اور بھیشم ساہنی کی طرح ہندی کے صف اول کے ترقی پسند کہانی کاروں میں ہیں۔ پریم چند اور یشپال کے بعد خاص طور پر ہندی کے یہی چار ادیب ہیں، جنھوں نے ترقی پسند ادب میں اپنا مقام پیدا کیا ہے۔ ان چاروں کہانی کاروں کی پانچ پانچ سات سات ایسی اہم تخلیقات ہیں، جنہیں بیسیوں سال بعد بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا اور ذوق و شوق سے پڑھا جائیگا۔

کملیشور کی سب سے پہلی کہانی میں نے "راجہ نربنسیا" پڑھی تھی۔ یہ بہت پہلے کی بات ہے۔ کملیشور ان چند خوش قسمت کہانی کاروں میں سے ہیں جو اپنی ابتدائی تخلیقات سے ہی مشہور ہوگئے۔ اس وقت نئے ادیبوں اور پڑھنے والوں کے "جھنڈ کے جھنڈ" ان فن پاروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ وقت کہانی یا نئی کہانی کا سنہری دور تھا۔ یہ پچپن اور ساٹھ کے بیچ کی بات ہے۔ عددی اعتبار سے اس دور میں جتنی اچھی تصنیفات سامنے آئی ہیں اتنی اس کے بعد نہیں لکھی گئیں۔ کملیشور کے ساتھ ہی موہن راکیش، مارکنڈے، راجندر یادو، امرکانت، نرمل ورما، بھیشم ساہنی، شیکھر جوشی، ان ہی دنوں ایک دم سے ہندی کہانی پر چھا گئے تھے۔

میں نے ان ہی ادیبوں کی تخلیقات کو پڑھ کر اپنے ادبی ذوق کی ابتدا کی اس لئے میں ان ادیبوں کا ممنون ہوں۔ پریم چند، دستوودسکی، گورکی اور دنیا کے دوسرے عظیم ادیبوں کو میں نے بعد میں پڑھا۔

اس سلسلے میں ایک پیاری یاد اور دلچسپ قصہ کو بھی دوہرانا چاہونگا۔

"میں اپنے چھوٹے سے قصبہ نما شہر پٹھان کوٹ میں تھا۔ پندرہ سولہ سال کی عمر تھی، میٹرک کر چکا تھا۔ پڑھنے کا شوق بھی پیدا ہو چکا تھا۔ مگر اردو کے "چترا" دلیکی کے علاوہ پڑھنے کو کچھ اور نہیں ملتا تھا۔ شہر کا ماحول بھی ایسا تھا کہ کچھ بہت ہی گھٹیا قسم کے اردو شاعر وہاں پائے جاتے تھے۔ اسلئے ایک عجیب سی بے چینی میں گھرا رہتا تھا۔ لیکن اُس وقت یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے نہ کس کس کو پڑھنا چاہئے۔ لیکن ایک جستجو تھی اور اپنی اسی تلاش میں ایک دن میں ریلوے بُک اسٹال پر کھڑا فلمی اور جاسوسی پرچے الٹ پلٹ رہا تھا کہ اپنے سے لگ بھگ ایک دو سال بڑے لڑکے سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کا لڑکا رمیش چندر ملہوترہ تھا۔ کچھ دیر کی بات چیت کے بعد وہ مجھ کو اپنے کوارٹر میں لے گیا اور اس نے مجھے "کہانی" رسالے کا

وہ ضخیم شمارہ دیا جس میں کملیشور کی انعام یافتہ کہانی "راجہ نربنسیا" بھی چھپی تھی۔

کملیشور سے میرا پہلا تعارف اسی کہانی کے ذریعے ہوا تھا۔ یہ کہانی مجھے بہت پسند آئی تھی۔ اس کے بعد میں ان کی کہانی ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنے لگا۔ نئی کہانیوں کا انتظار کرتا۔ مختلف جریدوں میں ان کی تخلیقات برابر شائع ہوتی رہتی تھیں۔ ان دنوں ان کی جو اہم کہانیاں چھپی تھیں ان میں "دلی کی ماں" "قصبے کا آدمی" اور "نیلی جھیل" وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

تب تک میں کالج کی پڑھائی ختم کر کے بیکاری کے دن کاٹنے لگا تھا۔ میرا لکھنے لکھانے کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا جو برابر جاری تھا۔

ان ہی دنوں کملیشور کا ایک بہت ہی عمدہ ناول "ایک سڑک ستاون گلیاں" پڑھنے کو ملا۔ کافی دنوں بعد ۱۹۷۱ء میں اسی ناول کی بنیاد پر فلم "بدنام بستی" بنی تھی۔ اسی سال بمبئی آئی آئی ٹی کے تھیٹر میں جب اس فلم کا پریس شو دیکھا تو ادیب دوستوں، جتندر بھاٹیہ، کامتا ناتھ، سدیپ، ابراہیم شریف، ایس۔ آر یاتری، مدھوکر سنگھ، رمیش اپادھیائے، دامودر سدن، مردولا گرگ، نروپما سیوتی اور رام اروڑہ، وغیرہ کے ساتھ خود کملیشور بھی ہمارے ساتھ تھے۔ مگر جن دنوں یہ ناول میں نے پڑھا تھا تب یہ سوچنا محال تھا کہ مستقبل میں کبھی اس ناول پر فلم بنیگی اور اسے دیکھتے وقت کملیشور بھی ہمارے ساتھ ہونگے۔ وہ تو ایسا سماں تھا کہ کملیشور جیسے بڑے بڑے ادیبوں کا رعب ہمیشہ طاری رہتا تھا۔ ملاقات کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی اور نہ کبھی یہ سوچا تھا۔

کملیشور سے میری پہلی ملاقات الہ آباد ہی میں ہوئی تھی، یہ ۱۹۶۹ء کی بات ہے، اس وقت میں کہانی میں کام کرنے لگا تھا اور وہیں رہتا تھا۔ کملیشور بھی یہاں اپنے گھر آئے ہوئے تھے۔ ان کے گھر ہی پر ان سے ملاقات ہوئی تھی اور پہلی ہی ملاقات میں انھیں میں نے بہت نیک انسان پایا تھا۔

بعد میں ان سے کئی بار تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ اکیلے بھی، دوستوں کے ساتھ بھی اور شراب کی محفل میں بھی۔ کملیشور ایک نہایت شریف، سچے، ذمہ دار اور سب سے بڑی بات یہ کہ ایک بہت اچھے دوست ثابت ہوئے

کملیشور اپنے سے چھوٹے اور نئے ادیبوں پر کبھی کوئی بڑائی نہیں جتاتے اور کبھی بھی اپنے کو بڑا نہیں منواتے بلکہ وہ اپنے سے چھوٹے اور نئے ادیبوں کے ساتھ بھی ساتھی اور دوست بن کر پیش آتے ہیں۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ یہ بمبئی کی بات ہے اور ۱۹۷۱ء کی۔ کامتا ناتھ۔ ایس آر یاتری، ابراہیم شریف، سدیپ، رام اروڑہ، جتندر بھاٹیہ، مدھوکر سنگھ اور دامودر سدن وغیرہ تمام دوست بمبئی جھیل سے سیر کر کے لوٹ رہے تھے۔ کملیشور بھی ہمارے ساتھ تھے۔ شام ہو رہی تھی، سب لوگ تھکے ہوئے تھے۔ اسی درمیان کسی نے شراب کی بات چھیڑ دی اور پھر شراب کی تلاش بھی شروع ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ صرف ٹھرا مل سکتا ہے، مگر یہ بھی خوشخبری سے کم نہ تھی۔ اس لئے یہ سن کر ہی سب جھومنے لگے تھے۔ ہم لوگ ایک جھونپڑ پٹی نما دکان میں پہنچے جب میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید کملیشور یہاں بیٹھنے کو تیار نہ ہوں اور کسی بہانے سے نکل جائیں۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بلکہ کملیشور بھی اس موج اور خوشی میں سب کے برابر بلکہ بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے دوست سے کہا تھا کہ "کملیشور اتنے سینئر رائٹر ہیں، مگر وہ کوئی فرق محسوس نہیں ہونے دیتے"۔

ادب کے میدان میں ادیبوں میں اٹھا پٹخ، بحث مباحثہ اور اختلاف رائے کا سلسلہ جاری رہتا ہے

دو تین ادیبوں کی دوستی ممکن ہے، مگر پانچ سات ادیب ہم خیال ہو کر زیادہ دنوں تک کام نہیں کر سکتے۔ کوئی نہ کوئی بات، کوئی نہ کوئی سوال انھیں ایک دوسرے پر چھینٹے اڑانے پر مجبور کر دیتا ہے اور پھر باہمی ناراضگی، لڑائی جھگڑا سب شروع ہو جاتا ہے۔ کملیشور سے بھی بہت سارے لوگ ناراض رہتے ہیں۔ ان کے بعض ہم عصر ان کے بعد کے اور نئی نسل کے ادیب بھی ان سے ناراض رہتے ہیں۔ ہر ایک کی ناراضگی کی اپنی الگ وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ ناراض لوگ کملیشور کے بارے میں چاہے جو بھی کہیں مگر .. کملیشور کی کہانیوں کے بارے میں جب بھی بحث چھڑتی ہے، سب ہی متفقہ طور پر تعریف کرتے ہیں۔

کملیشور کی پچھلے آٹھ نو برسوں میں لکھی گئی کہانیوں پر بہت تنقید ہوئی ہے۔ یہ شاید اس لئے کہ انھوں نے "سکہ بند ادبی" نظریہ سے بغاوت کر کے اپنی کہانیوں میں نئے نئے تجربے کئے ہیں۔ ان کہانیوں میں جوکھم، برج کینڈی، راتیں، لاش اور کتنے پاکستان، بہت ہی اہم کہانیاں ہیں۔ کملیشور کی ان کہانیوں کے نئے تجربے مجھ کو بہت پسند آئے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رکھنے کی ہے کہ ان کہانیوں میں صرف تجربات نہیں کئے گئے ہیں بلکہ یہ کہانیاں تکنیک کے اعتبار سے بھی بڑے پایہ کی ہیں۔

کملیشور ترقی پسند نظریہ رکھنے والے بہت اہم ادیب ہیں۔ انھوں نے ہمیشہ عام آدمیوں کی حمایت کی ہے۔ نئی نسل کے کچھ ادیب "سمانتر کہانیوں" میں ان کے ساتھ ہیں۔ اتنا ہی نہیں، نئی نسل کے بہتیرے ادیبوں میں بھی کملیشور کا اپنا مقام ہے۔

مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب میں کملیشور کی تخلیقات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بڑے چاؤ سے پڑھا کرتا تھا۔ ان کی "قصبے کا آدمی، راجہ نربنسیا، دیوا کی ماں، جارج پنجم کی ناک، دلی میں ایک موت، مانس کا دریا، کھوئی ہوئی دشائیں اور جوکھم" جیسی معیاری کہانیوں کو میں نے کئی کئی بار پڑھا ہے اور آج بھی میں ان کی تخلیقات اسی ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں۔

غیاث احمد گدی

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں

اور سچ تو یہ ہے کہ سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں۔
کملیشور کے ناول "کھویا ہوا آدمی" میں ہم دو جہازوں سے متعارف ہوتے ہیں۔ ایک وہ جس پر شیام لعل کا کنبہ سوار ہے اور دوسرا وہ جس پر بیرن مامور ہوا ہے اور جو اُسے لے کر مشرقِ بعید کی سمت نکل گیا ہے۔

شیام لعل کے کنبے میں وہ خود ہیں۔ اُن کی بیمار بیوی رمی ہے، اُن کی بڑی لڑکی تارا ہے، چھوٹی لڑکی سمیرہ، اور اس سے بھی چھوٹا لڑکا بیرن ہے، جو بعد میں نیوی میں بحال ہو کر مشرقِ بعید کی جانب چل کھڑا ہوتا ہے۔

دِلی کا ایک گراؤنڈ فلور دو ڈھائی کمروں کا خستہ حال سا فلیٹ۔ ایک کچن اور ایک باتھ روم کے ساتھ۔ گھر کا کرایہ، راشن والے کے پیسے، حلوائی کے پیسے اور چھوٹے چھوٹے کئی ایک قسم کے اخراجات۔ لیکن شیام لعل بیکار ہیں۔ اور یوں ہم دیکھتے ہیں کہ شیام لعل کے جہاز کے عرشے کی لکڑی جابجا سڑ گئی ہے، جگہ جگہ اس کی کیلیں نکل آئی ہیں۔ اسی طرح جہاز میں پانی گھُسنے لگتا ہے۔ شیام لعل دَوڑ دَوڑ کر دوبارہ کیلیں لگاتے ہیں۔ لکڑیوں کو الٹ پلٹ کر دوبارہ انہیں اُن کی جگہ پر فِٹ کر دیتے ہیں۔ لیکن از کار رفتہ تختے اور زنگ آلودہ کیلیں آخر کب تک چلیں گی۔

چھوٹی لڑکی سمیرہ اُوپر کی منزل پر رہنے والوں کی پرچھائیوں کو ایک خاموش تماشائی کی طرح دیکھتی ہے۔ یہ پرچھائیاں کمرے سے ملی ہوئی دیوار پر نمودار ہوتی ہیں اور پھر غائب ہو جاتی ہیں، ٹھیک اسی طرح جیسے اس کے چھوٹے سے شہر کے لوگوں کی اور اس کی سہیلیوں کی پرچھائیاں اس کے ذہن کے اُفق پر ڈوبتی ابھرتی رہتی ہیں۔

شیام لعل جی روز صبح پتلون، کوٹ، موزے، جوتے اور پرانی ٹائی سے لیس ہو کر تیار ہوتے ہیں اور پھر اپنی کھاٹ پر کمبل اوڑھ کر لیٹ رہتے ہیں۔ اُن کے رہنے سے گھر کا سناٹا اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ لڑکیوں کی ماں رمی کچن میں رہتی ہے۔ بیرن اسکول چلا جاتا ہے اور تارہ اور سمیرہ خاموش سی اِس سناٹے کا دُکھ جھیلتی ہیں۔

شیام لعل جی اپنے چھوٹے سے شہر میں ایک ٹرانسپورٹ کمپنی میں بکنگ کلرک تھے۔ کمپنی نے دلّی میں اپنا دفتر کھولا تو اس نے دلّی کے دفتر کے لئے شیام لعل کو بھیجا۔ وہ کمپنی کے چار ٹرکوں کے ساتھ دلّی چلے آئے۔ ایک ٹرک پر ان کا سامان تھا۔ یہاں پہنچ کر ایک دن شیڈ میں چوری ہوگئی اور شیام لال برخاست کر دیے گئے۔ اس واقعے کو سات سال گذر گئے اور تب سے شیام لعل جی بیکار ہیں اور بڑے شہر کے کچھ چلتے پھرتے کاموں سے بدقت تمام زندگی کے اس ٹوٹے پھوٹے جہاز کو سخت طوفانوں میں کھینچے لئے جا رہے ہیں۔

ہربنس تکیے کے غلاف پر بیل بوٹے بنوا کر بیچتا تھا۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا شوروم تھا۔ شیام لعل جی گھروں میں گھوم گھوم کر اس کے لئے آرڈر بک کرتے اور اپنا کمیشن بنا لیتے۔ تب ہی گھر میں ہربنس کا آنا جانا شروع ہوگیا۔ وہ تارہ اور سمیرہ سے تکیے غلاف کے لئے اجرت پر عمدہ سے عمدہ ڈیزائن بنوانے لگا۔

اب یہاں دو مختلف اخلاقی قدروں کا تصادم ایک عجیب صورت حال اختیار کر لیتا ہے۔ NOSTAL-GIA میں گھرے شیام لعل اور رمی اپنے اس چھوٹے سے شہر کو یاد کرتے ہیں جہاں عورتیں پردے میں رہتی تھیں جہاں ان کا باہر نکلنا سخت معیوب تھا اور وہ مندر بھی اس طور پر جاتی تھیں کہ یکّے میں پردہ لگا کر انہیں وہاں پہنچایا جاتا تھا اور وہاں پہنچ کر دونوں جانب سے چادریں تان کر انہیں مندر کے اندر داخل کرایا جاتا تھا۔ یہ ماضی قریب کی زندگی تھی۔ لیکن وہ ان عوامل تک پہنچنے سے قاصر ہیں جس سے دلّی کی زندگی ان کے چھوٹے سے شہر سے یکسر مختلف تھی۔ وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ فیوڈل اخلاقیات کا اثر چھوٹے شہروں میں ہنوز باقی ہے کیونکہ وہاں زندگی نے دلّی جیسی کروٹ نہیں لی ہے۔ وہ شہر COSMOPOLITAN نہیں ہیں، وہاں ابھی COMMERCIAL AGE نہیں آیا ہے۔ دلّی تو ایک بے حد SOPHISTICATED سوسائٹی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ بڑے شہر اور چھوٹے شہر کی اس ANTI-THESIS کو کملیشور نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

لیکن ان کے یہ احساسات اس وقت شدید ہو جاتے ہیں، جب تارہ ہربنس کے یہاں نوکری کر لیتی ہے۔ اور سر شام ہربنس اسے چھوڑنے گھر آتا ہے۔ شیام لعل جی اندر ہی اندر کھولتے ہیں، لیکن پھر انہیں مکان مالک کے تقاضے اور بنئے اور سود دینے والوں کی دستکیں اور ان کی جھڑکیاں یاد آجاتی ہیں اور وہ حالات سے مفاہمت کر لیتے ہیں۔ ادھر رمی کے باب میں تو یہ ہے کہ مفاہمت اور مصالحت اس کی زندگی بن چکی ہے۔

بیرن کالج میں پڑھ رہا تھا کہ اسے نیوی میں نوکری مل جاتی ہے۔ سب خوش ہو جاتے ہیں اور گھر پر ماہ بہ ماہ منی آرڈر آنے لگتے ہیں۔ اسی درمیان ایک DEVELOPMENT یہ ہوتا ہے کہ ہربنس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تارہ اس کا ایک نذرانہ قبول کر لیتی ہے۔

گھر میں بڑا بھونچال آجاتا ہے، لیکن یہ ایک ایسا بھونچال ہوتا ہے جس سے در و دیوار تک واقف نہیں ہوتے، کیونکہ اس شہر کی اخلاقیات یہ ہے کہ سب کچھ دل میں رکھو، بڑے سے بڑا طوفان، بڑی سے بڑی قیامت۔

انہیں خوف یہ ہے کہ کہیں پاس پڑوس والوں کو خبر نہ ہو جائے، لیکن ایک ایسے شہر میں جہاں ہر فرد ایک تنہا اقلیم بن چکا ہے، کسی کو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ رمی ایک ہمدرد پڑوسن کے یہاں اپنا دکھ درد لیکر جاتی ہے لیکن اسے بڑی حیرت ہوئی کہ پڑوسن نے ان باتوں کو اس طرح سنا جیسے یہ کوئی غیر معمولی حادثہ نہ ہو ایک بڑی نارمل سی بات ہو۔ پھر انہوں نے کچھ مفید مشورے دیے۔

لیکن ہربنس نے یہ کہہ کر وہ تارہ سے شادی کر رہا ہے، ان کے سروں پر خوف کی لٹکتی تلوار کو اپنے ہاتھوں سے توڑ دیا۔

تارہ اور ہربنس کی شادی ہو جاتی ہے۔ سمیرہ گھر میں اکیلی رہ جاتی ہے۔ شیام لعل جی داماد کے لئے آرڈر لانے کا کام بند کر چکے ہیں۔ وہ اب نیلام گھروں میں سب سے پہلے جا کر مال خرید لیتے ہیں اور پھر وہیں بیٹھ کر کباڑیوں کے ہاتھوں تھوڑا منافع لیکر بیچ دیتے ہیں۔ وہ نیلام گھر والے کو ایسا چیک کاٹ کر دے دیتے ہیں جو کبھی HOUNOR نہیں ہو سکتا۔ اور تب اُن کی جان بس ایک آس میں اٹکی رہتی ہے کہ مال کباڑی اٹھالیں۔ کباڑیوں سے پیسے لینے کے بعد وہ چیک کی رقم بینک میں جمع کر دیتے ہیں۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کباڑی بیچ کے آدمی کا منافع دینے کو کسی طرح تیار نہیں ہوئے اور یوں انہوں نے ہزار خوشامدوں کے بعد مال دام کے دام بیچ دیا۔ اس طرح ان کی جان بچی اور انہوں نے ہمیشہ کے لئے اس کاروبار سے توبہ کر لی۔

بیرن کا خط آیا کہ وہ کسی امریکن پارٹی کے ساتھ قطب کی طرف جا رہا ہے چنانچہ اب وہ چار مہینے بعد گھر لوٹے گا۔ وہ پارٹی قطب پر کچھ سائنسی تجربے کرنے جا رہی تھی۔

ادھر منی آرڈر بند ہوا، اُدھر سمیرہ کی پڑھائی بند ہوئی۔

مالک مکان اور سودے والوں کے تقاضے زور پر تھے۔

قطب کی منظر کشی اچھی کی گئی ہے، پر بیرن کو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ وہاں صرف سائنسی تجربے نہیں کرتے بلکہ اپنے ملک کا جھنڈا بھی گاڑ دیتے ہیں۔

اچانک بیرن کو میرٹھ واپس جانے کا حکم ملا۔ وہ پرتھ پہنچ کر اپنے جہاز کا انتظار کرنے لگا۔

بیرن کے آنے کی خبر سے سبھی بے حد خوش تھے۔

لیکن آنے سے پہلے ایک رات شیام لعل اور رمی کو رات گئے دروازے پر کچھ عجیب دستکیں سننے کو ملیں دستکیں جو کہتی تھیں کہ میں ہوں مگر میں نہیں ہوں کیونکہ دروازہ کھولنے پر وہاں کوئی بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔

یہاں کملیشور نے روحانی رشتوں کی بات کی ہے اور سہمے ہوئے دلوں کی خوبصورت نفسیات پیش کی ہے۔

بیرن دوسرے دن نہیں آیا۔ کئی دن بڑی پریشانیوں میں گذرے۔ بالآخر ایک روز ایک شخص انہیں ڈھونڈتے ڈھانڈتے پہنچا۔ اُس نے بتایا کہ وہ بھی اسی جہاز پر ملازم ہے جس پر بیرن ملازم ہے اور یہ کہ بیرن

لاپتہ ہے۔

گھر میں سخت کہرام مچا۔ اس چھوٹے سے کنبے پر آفتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ تب ہی ہربنس نے انہیں ان ملاحوں کی کہانی سنائی جو اپنے جہاز کے غرقاب ہو جانے پر بہتے بہتے ایک جزیرے میں جا نکلے تھے اور کئی برسوں کے بعد ایک جہاز نے انہیں وہاں سے برآمد کیا تھا۔ انہیں اس کہانی سے کسی قدر تسلی ہوئی۔ آس پاس کے کچھ لوگ بھی ان کے غم میں شریک ہوئے اور انہیں دلاسا دیا۔

پھر فوج کے دفتر نے تفتیش کا سلسلہ شروع کیا۔ علاقے کا پولیس انسپکٹر شیام لعل کے پاس بیرن کے متعلق دریافت کرنے کے لئے آیا۔ پھر وہ تقریباً ہر ہفتے آنے لگا۔ اس کے علاوہ خفیہ والے بھی محلے میں پوچھ تاچھ کرتے رہے۔

تھک ہار کر انسپکٹر نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس بات کو مان لیں کہ بیرن مر چکا ہے تاکہ اسے مرے ہوئے لوگوں کی فہرست میں ٹانک لیا جائے اور اس کیس کو ختم کر دیا جائے۔

لیکن ملاحوں کی کہانی انہیں کسی ایسے دور افتادہ جزیرے میں پہنچا دیتی جہاں سے ایک نہ ایک دن بیرن کو واپس آنا تھا۔

رمی پوچھتی۔ "کیوں سمیرہ، کتنے برس بعد ملاح لوٹے تھے؟"

اور سمیرہ ہربنس کی کہانی کو دہرا دیتی ——

مالک مکان نے پھر تقاضہ شروع کر دیا تھا۔ تنگ آکر اس نے ان سے ایک کمرہ لیکر اس میں ایک کرایہ دار بسا دیا۔

ہربنس کے اصرار پر وہ لوگ اس بات کے لئے بالآخر تیار ہو گئے کہ بیرن کی موت کا اعلان کر دیا جائے۔ اور فوج سے معاوضہ لیا جائے۔

تب سارے دنیاوی کھڑاگ پھیلائے گئے۔ تارہ نے بیرن کا سیاپا منایا اور ہربنس نے ایک ایم۔ پی سے کہہ کر اس کی فائل MOVE کرائی۔

سمیرہ ان باتوں سے قطعی بے تعلق تھی۔

مجبوریاں ہمارے ضمیر کو بازار کی جنس بنا دیتی ہیں۔ شیام لعل اور رمی پر کنبے کی ذمے داریاں تھیں۔ تارہ ہربنس کے ساتھ رہ کر کافی دنیادار ہو گئی تھی۔ بس ایک سمیرہ تھی جس کے یہاں کوئی ایسی مجبوری نہیں تھی اس لئے وہ اس ڈرامے سے بے حد دل برداشتہ تھی۔

لیکن شیام لعل اور رمی کو تو پیسے کی سخت ضرورت تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنا سیاہ و سفید ہربنس کو سونپ دیا ہے، وہ جو چاہے کرے۔

شیام لعل کو نجف گڈھ کی ایک فیکٹری میں دربان کی نوکری مل جاتی ہے اور وہ وہیں نوکروں کے کوارٹر میں جارہتے ہیں۔ ہربنس کوشش پیروی کر کے سمیرہ کو نرسوں کے ٹریننگ سینٹر میں داخل کرادیتا ہے اور وہ ہوسٹل میں چلی جاتی ہے۔

رمی کو ہربنس اپنے یہاں لے آتا ہے۔ وہ تارہ کی بچی کو کھلاتی ہے۔ کپڑے دھوتی ہے اور کبھی کبھی کھانا بھی پکا لیتی ہے۔

گھر کا سارا اثاثہ بوروں میں بند کر کے ہربنس کے گھر میں مچان پر رکھ دیا جاتا ہے۔

اس طرح تین چار افراد کا یہ کنبہ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔ کاروباری عہد کی اس ٹریجڈی کو کہ خانگی ساخت میں تیزی سے دراڑیں پڑ رہی ہیں، کملیشور نے کمالِ حسن وخوبی سے پیش کیا ہے۔

معاوضے کا چالان بن جاتا ہے۔

بیرن کا سامان انہیں مل جاتا ہے۔ اس کے ٹرنک سے سمیرہ نمتا کے خطوط برآمد کرتی ہے۔ نمتا جو ہمیشہ گلی کی ڈاک پر نظر رکھتی تھی اور جو رمی کو گلی میں پڑی ہوئی بیرن کی چٹھیاں لاکر دیتی تھی۔

وہ خاموش خاموش سی لڑکی جس نے سمیرہ تک کو اپنے راز میں شریک نہیں بنایا تھا، بیرن کا ٹرنک کھلتے ہی ایک جھنجھناہٹ کے ساتھ، شیشے کی کرچیوں سے لہولہان، بھرپور طریقے سے ہمارے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔

پھر ایک زنجیر در زنجیر EXPLOITATION کا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ بیٹی ماں کا استحصال کرتی ہے، باپ کا استحصال کرتی ہے اور بہن کا استحصال کرتی ہے۔ وہ داماد کی بنائی ہوئی اسکیموں میں اس کا ساتھ دیتی ہے۔ وہ لوگ ایک چھوٹی سی گرہستی کو کس طرح توڑ پھوڑ کر رمی کو اپنے یہاں نوکرانی کی طرح رکھ لیتے ہیں، تارہ کو سمیرہ کا اپنے یہاں آنا جانا کچھ پسند نہیں ہے۔ غالباً وہ ہربنس کے رویّے سے مطمئن نہیں ہے۔ یہ اس نئے کاروباری عہد کے تہذیبی خط وخال ہیں جو تیزی سے ہمارے اردگرد جال بُن رہا ہے۔

لیکن کملیشور کہیں کہیں اس کہانی کو ایک سمت بھی دے دیتے ہیں اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کہیں بیرن کا خون C I A کی بین الاقوامی سازشوں کا نتیجہ تو نہیں تھا؟ یوں کہ بیرن ان کے سائنسی تجربوں کے راز سے واقف ہوگیا تھا۔

صرف ویت نام میں امریکی مظالم کا ذکر کیوں؟ ہنگری اور چیکوسلاواکیہ میں سوویٹ مظالم کیوں نہیں؟

ان چھوٹے چھوٹے سوالوں سے قطعِ نظر جو کہانی پر کوئی بڑا IMPACT نہیں ڈالتے، ہمیں کہانی میں تیزی سے بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں کا احساس ملتا ہے۔ اسکے علاوہ ملک کے چھوٹے اور بڑے شہر کی ANTI-THESIS۔ فرد کے ٹوٹنے کا عمل — ایک ایسا استحصالی سماج جہاں اپنی زیست کیلئے ماں باپ اور بہن تک کا استحصال جائز قرار دیا جاچکا ہے — یہ وہ تصویریں ہیں جنہیں کملیشور نے بڑی خوبصورتی سے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ ●

گایتری کملیشور

جتنا میں انہیں جانتی ہوں

کسی پر کچھ لکھنا آسان ہو سکتا ہے پر اپنے پتی پر لکھنا میرے لئے اتنا مشکل ہو رہا ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ چاہتی ہوں کہ اُنیس سال اُن کے ساتھ اب تک جو بتائے ہیں اُن کا حال تفصیل سے لکھ دوں تاکہ سُکھ دُکھ کے سبھی دنوں کی صحیح تصویر لوگوں تک پہنچے اور ان تصویروں میں لوگ ادیب کملیشور کو ایک فرد کی حیثیت سے ڈھونڈ سکیں۔ مگر ان ساری باتوں کو لکھنے کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔

صابر دت جی کے کہنے پر میں نے پہلے بھی اپنے پتی کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا مگر ہر بار ایسا لگا کہ میں اپنی بات صحیح ڈھنگ سے نہیں کہہ سکی ہوں۔ لیکن پھر یہ احساس بھی ہوا کہ ادیب کملیشور کو جتنا میں جانتی ہوں اتنا کوئی اور نہیں جانتا۔ کیونکہ میں نے تو اس شخص کے ساتھ تقریباً اپنی نصف زندگی گذاری ہے۔ گھر میں ان کے ہر مُوڈ کو، ہر پل کو بہت نزدیک سے دیکھا ہے اور یہ جانا ہے کہ شروع سے وہ جن اقدار کو لیکر چلے ہیں اس میں ابھی تک کوئی فرق نہیں آیا ہے یہاں تک کہ ان کے کھانے پینے میں، پسند اور ناپسند میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ انہیں آج بھی اُرد کی دال کباب اچھا بنا میٹ، دہی بڑے وغیرہ بے حد پسند ہیں۔ ہاں عمر کے ساتھ ان کی ظاہری شکل وصورت میں تبدیلی ضرور آئی ہے۔

شروع شروع کے دن تھے۔ شاید شادی کا تیسرا دن ہوگا۔ ہم لوگوں کی شادی بزرگوں کے ذریعے طے کی گئی تھی اس لئے میرا تعارف اُن سے شادی کے بعد ہی ہوا۔ اس سے پہلے میری ان کی نہ کبھی ملاقات ہوئی تھی اور نہ گفتگو۔ ہاں اتنا ضرور لگا تھا کہ شادی کے دوسرے دن سے کملیشور جی مجھے اپنا سمجھ کر ہر چیز پر ادھیکار مانگنے لگے تھے۔ اور مجھے یہ بات اچھی لگی تھی۔

میں بات کہہ رہی تھی شادی کے تیسرے دن کی۔ میں نے دیکھا کہ شادی کے دن کے بعد کملیشور جی نے کسی دن اپنی داڑھی نہیں بنائی۔ تب میں نے سوچا کہ کیسے آدمی ہیں کہ اپنی داڑھی بھی نہیں بناتے۔ مگر اس کے بارے میں مجھے ان سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بس میں نے یہ سوچ لیا کہ شاید ادیبوں کے یہی رنگ ڈھنگ ہوتے ہوں گے۔ چوتھے دن جب انہوں نے مجھ سے اپنی اٹیچی سے بلیڈ نکالنے کے لئے کہا تو میں ان کی طرف دیکھنے لگی۔ تب ہی کملیشور جی بولے۔ "میری داڑھی دیکھ کر تم گھبرا گئی ہوگی۔ میں نے تو تمہاری آزمائش کی تھی کیونکہ ادیبوں کی زندگی میں ایسے بھی دن آ سکتے ہیں جب میں بلیڈ بھی نہ خرید سکوں۔ اُس وقت میرا ساتھ دوگی یا نہیں؟" میں ان کی طرف دیکھ کر صرف

مسکرا دی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اب تم میرے پتی ہو، تمہاری ہر حالت مجھے منظور رہے۔

اس وقت کملیشور جی نے کہا تھا۔

"گایتری آدمی کو اس طرح چلنا چاہیئے کہ زندگی بھر نبھ سکے۔ تمہیں شاید میں وہ سب سکھ نہ دے سکوں جو تم سوچ کر آئی ہوگی، پر اتنا ضرور ہے کہ من سے میں کوئی بُرا آدمی نہیں ہوں۔ جہاں تک ممکن ہوگا میں تمہیں ذہنی تکلیف نہیں دوں گا۔"

اس دن کے بعد سے کملیشور جی نے اپنے گذشتہ دنوں کی مجھے تفصیل بتائی جسے سن کر بہت تکلیف ہوئی تھی ــــ یہ آدمی کتنا اکیلا ہے جو اپنے بڑوں سے اپنی تکلیف بھی نہیں کہہ سکتا ہے ــــ اُن کو کھانے پینے کا، صاف ستھرے کپڑے پہننے کا شروع ہی سے شوق تھا۔ پر کبھی کسی چیز کے لئے اُنہوں نے فرمائش نہیں کی۔

ان دنوں ہم لوگ ان کے بڑے بھائی صاحب کے ساتھ ہی الٰہ آباد میں رہتے تھے۔ کافی رات کو کملیشور جی جب اپنے چھاپے خانے سے لوٹتے تھے تب جو بھی کھانا ملتا چپ چاپ کھا لیتے تھے۔ کیونکہ بھائی صاحب کی مالی حالت اوسط طبقے جیسی تھی۔ لیکن یہ اپنے کپڑے ضرور "سن لائٹ ڈرائی کلینر" سے دھلواتے تھے جس کا خرچ وہ اپنی کہانیوں کی آمدنی سے پورا کرتے تھے ــــ ان کے پاس کپڑے جو تھے ــــ چھ کرتے اور چھ پاجامے بس۔ پینٹ بش شرٹ تو بعد میں دلّی آتے پر ان کو پہننا پڑی کیونکہ اس وقت انہیں ٹی وی میں اسکرپٹ رائٹر کی جگہ مل گئی تھی۔

میں یہاں کملیشور جی کا ایک خط نقل کرنا چاہوں گی۔ ان کے خط میری زندگی کی امانت ہیں جن کے سہارے مجھے وقتاً فوقتاً طاقت ملتی رہی ہے اور آج میں جب کملیشور جی کو خط پڑھواتی ہوں تو کہتے ہیں کہ "اس وقت بھی گایتری میرا نظریہ بالکل واضح تھا اس لئے اب تک کسی بات پر میرے دل میں پشیمانی نہیں ہے۔"

اس خط کی یوں بھی اہمیت ہے کہ یہ کملیشور جی کا وہ پہلا خط ہے جو شادی کے بعد انہوں نے میرے میکے فتح گڈھ لکھا تھا:-

۳۴۷ بادشاہی منڈی۔ الٰہ آباد ۳

۲۶-۸-۵۸

ڈیئر گایتری

تمہارے دونوں خطوں سے بڑی تسلّی ملی۔ لیکن ایک بات ذرا کھٹکی بھی اور اچھی بھی لگی، وہ یہ کہ تم نے میرے ادب میں ایسی کون سی بات ڈھونڈ نکالی جس کے لئے تم مجھے مہان جیسے خطابات سے نواز دیتی ہو۔ میں جب بھی سوچتا ہوں تو یہی لگتا ہے کہ میرے پاس ایسا کچھ نہیں ہے جس سے ایک عورت مطمئن ہو پائے۔ اور پھر یہ سماج کی روایت رہی ہے کہ

کہیں اس آگ سے گھبرا نہ جاؤ۔ یہ اگنی پتھ ہے میری گایتری اور میں تمہیں اس پر گھسیٹ لایا ہوں... جبکہ میں پہلی ملاقات میں تمہاری کومل ہتھیلیوں پر پھول اور کلیاں رکھتا، میں نے ان پر انگارے رکھ دیے۔ زندگی کی ہنسی خوشی سے دور لیجا کر سنسان گورستان میں لا کھڑا کردیا شاید ایسا نہیں سوچا ہوگا تم نے۔ جبکہ میں تم سے صرف پیار کی باتیں کرتا تب میں نے تمہیں دوسروں کے دکھ کی کہانیاں سنائیں۔ جب میں تمہارے پاس تنہائی میں بیٹھتا تب میں اپنے کام میں لگا رہا اور راتوں کو جب میں پلک جھپکائے بغیر تمہیں نہارتا تب میں تھکن سے بھرا ہوا سو گیا... تم میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں اور میں سوتا رہا۔ شاید پہلی ملاقات کے اتنے بے کیف دنوں کا تم نے تصور نہیں کیا ہوگا — سچ سچ میں تمہارے ساتھ ہر لمحہ تنہائی میں بیٹھنا چاہتا تھا، ہر رات باتیں کرتے گذار دینا چاہتا تھا پر میں ایسا نہیں کر پایا۔ میرے دل میں یہ کھٹک اب بھی ہے — پر تمہیں کتنا سونا سونا لگا ہوگا میرے ساتھ، یہ جب سوچتا ہوں میرا من بھر آتا ہے۔ سچ بتانا تم نے کتنی رنگین کلپنائیں کی تھیں اور جب وہ پوری نہیں ہوئیں تو کتنا دکھ ہوا تھا — میں تمہارے ان ٹوٹے سپنوں کے لئے دکھی ہوں۔ میری دوستی اور پیار تمہارے لئے امڈتا ہے پر میرے پاس کوئی ایسا وسیلہ نہیں کہ میں اسے عملی شکل دوں، پر سچ مانو — میں اس دل سے تمہیں وہ سب کچھ دیتا رہوں گا جو میرے بس میں ہے۔ میرے ساتھ اس محروم زندگی میں جیسے بھی ہو خوش رہ لینا۔

تم پر مجھے بڑا وشواس ہے — میری اس اوٹ پٹانگ زندگی سے گھبرانا مت، حوصلہ رکھنا، شاید تمہارے اس دھیرج کے سہارے میں اس زندگی میں کچھ کر جاؤں، کچھ ایسا کہ آنے والے زمانے مجھے اپنا کہہ کر یاد رکھ سکیں۔ اور تمہیں یہ بھی بتادوں کہ یہ راستہ میں نے کسی مجبوری سے نہیں، خوب سوچ سمجھ کر چنا ہے کیونکہ مجھے اپنی زندگی کی معنویت اسی میں دکھائی دی۔ اگر میں نوکری ہی کرنا چاہتا تو کرسکتا تھا اور آٹھ دس بچوں کا باپ بن کر مر جاتا، پر میری آتما میں شروع ہی سے نہ جانے کیسی بغاوت پل رہی تھی کہ اپنے کو نہ روک پایا۔ اس بغاوت نے لکھنے کی شکل لے لی۔ زندگی کتنی چھوٹی ہے اور مجھے کتنا لکھنا ہے — بس ایک ہی بات کا یقین دلانا ہے کہ تمہیں آرام نہ دے پاؤں پر تم میری طرف سے دکھی نہیں ہوگی کیونکہ تم نے سب کچھ جانتے ہوئے میرے ساتھ قدم رکھا ہے اور میرے لئے ایک ٹیکار کی طرح ہے۔

جتنے دن تم یہاں رہی ہو وہ میرے سب سے خوش آنند لمحے تھے۔

یہ خط میں یہاں ختم کرتا ہوں کیونکہ جن لفظوں نے مجھے یہاں تک جینے میں بہت بڑی

ادیب بیکار لوگ ہوتے ہیں حالانکہ یہ بھی صحیح ہے کہ ادیب ہی اپنے خون کو سُکھا کر اس کے لئے مرتا ہے۔ میں اپنی بات جانتا ہوں — میری زندگی میں ایسی کوئی زبردست کمی یا دکھ نہیں تھا کہ میں اپنی بات کہنے کے لئے قلم سنبھالتا۔ سچ سچ میری کوئی بھی ذاتی غرض نہیں تھی۔

لیکن اپنے چاروں اور پھیلے ہوئے دکھ اور غربت، بے انتہا مجبوریاں اور اُداس چہرے نہیں دیکھ پایا۔ مجھے ہمیشہ ایسا لگتا رہا کہ میرے چاروں طرف جو لوگ ہیں، جن کے ساتھ میں اٹھتا بیٹھتا کھیلتا اور ہنستا ہوں — یہ جھوٹی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی ہنسی کھوکھلی، ان کے چہروں کی چمک مصنوعی ہے اور ان کے دلوں میں محرومی اور درد کا سمندر موجیں مار رہا ہے۔ اتنا درد پی کر بھی میرے ساتھی چُپ ہیں کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ اس کا علاج کیا ہے۔ میں یہ کہنے کا دعویٰ کروں کہ ان کا علاج میں جانتا ہوں تو یہ بھی غلط ہوگا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں انہیں اُن ہی کی صورت دکھا کر بیدار ضرور کر سکتا ہوں۔ میں نے اسی مقصد سے قلم اٹھایا تھا اور اسی کے لئے قلم پکڑے رہوں گا میں چاہتا ہوں کہ لوگ جانیں کہ وہ کہاں ہیں، ان کی حالت کیا ہے؟

آدمی جب اپنی حالت سے واقف ہو جاتا ہے تو وہ اپنا راستہ خود ڈھونڈ لیتا ہے شاید میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ باتیں تمہیں اس لئے لکھ گیا کہ اب تم میری زندگی کی ساتھی ہو، میری تمام الجھنوں اور تفکرات کی شریک ہو۔ لیکن مجھ کو یہ سوچ کر افسوس ہوتا ہے کہ میں تو ایسی دھونی رمائے ہوں اور تم ابھی سے میرے ساتھ اس دکھ اور درد کے جنگل میں پھنس جاؤ گی۔ میں تمہارے لئے وہ سب کر پاتا جو اور لوگ اپنی محبوباؤں کے لئے کرتے ہوں گے۔ میں بڑا افسر ہوتا، ہزار بارہ سو کماتا ہوتا، تمہیں زندگی کی ساری آسائشیں مہیا کر پاتا، تمہیں تصورات کی دنیا میں اڑا کر لے جاتا اور تمہارے سب کچھ مہیا کر کے تمہیں بھر دیتا .... پر بتاؤ، کیا کروں؟ میں تو ادب کے لئے اپنی زندگی وقف کر چکا تھا۔ پتہ نہیں تمہیں کیسا لگا ہوگا میرے ساتھ۔ اس راستے پر چلنے والے بہت جلد تھک جاتے ہیں کیونکہ ادبی مشغلہ کا Return بہت دیر سے ملتا ہے، بڑے دھیرج سے رہنا پڑتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ نئی پیڑھی کے ادیبوں میں مجھے مقبولیت اور پیسہ سب سے زیادہ ملا یعنی ابھی مجھ کو جتنا ملنا چاہئے تھا اس سے کہیں زیادہ۔ لیکن کیا تمہیں اس سے سنتوش ہو سکتا ہے؟ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے اتنا بھی پا لیا، نہیں تو ادیب مرنے کے بعد ہی پاتے ہیں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ عورت کی خواہشیں کچھ اور بھی ہوتی ہیں۔ تمہیں میری وجہ سے بہت سی باتیں سننی اور سہنی پڑیں گی اور تمہیں زندگی میں میرے ساتھ اسی طرح جلنا ہوگا جس طرح میں جل رہا ہوں

طاقت دی ہے وہ بھی تھے۔

ان خطوط کے تین سال بعد شروع ہوئے میرے دلّی کے تنگی بھرے دن۔ جن میں دُکھ زیادہ تھے، سکھ لمحاتی۔ دکھ کی اصل وجہ تھی کملیشور جی کی تنگدستی۔ اگرچہ میں اور مانو ملا کر ان کی چھوٹی سی گرہستی تھی مگر ان پر اکتیس ہزار کے قرض کا بھی بوجھ تھا۔ الٰہ آباد میں انہوں نے شرم جیوی پرکاشن جو کھولا تھا اسی کا قرض تھا۔ دلّی میں رہتے ہوئے تو مجھے اس قرض کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ ہاں بمبئی آنے پر ہوئی اور وہ بھی اس وقت جب کسی ناشر نے ان پر دعویٰ ٹھونک دیا اور انہیں کورٹ سے نوٹس ملا۔

ہوا یہ تھا کہ انہوں نے مدھیہ پردیش کی لائبریریوں کو کتاب سپلائی کرنے کے لئے اڑتالیس ہزار روپے کا آرڈر حاصل کیا تھا مگر ان کے پاس پیسے نہیں تھے اس لئے انھوں نے ستنا کے ایک بک سیلر کو اپنا حصہ دار بنا لیا تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ یہ بک سیلر ناشروں سے کتاب لے کر ان کے نام سے سپلائی کریگا۔ سرکار سے تین مہینے سے پہلے بل کی ادائگی نہیں ہوتی اس لئے یہ بک سیلر نقد روپے بھر دے گا اور سرکار سے بل مل جانے پر دونوں حصہ دار اپنی اپنی رقم بانٹ لیں گے۔ یہ اپنی دوستی کے سہارے کتابیں حاصل کر کے سپلائی کرتے رہے مگر مارچ میں جب سرکار سے رقم ملی تو ستنا کے بک سیلر نے رقم وصول کر کے دبالی اور اپنی دوکان بڑھادی۔

بیسیوں کی انہوں نے نہ کبھی فکر کی اور نہ کبھی اس کے پیچھے بھاگے۔ جیب کا آخری پیسہ بھی خرچ کر دیتے اور اگلے دن کی فکر میں گھلتے نہیں۔ انہوں نے ہمیشہ نوکری ہی کی مگر نوکری کے غلام نہیں بنے بلکہ ہمیشہ نیا کنواں کھودنے کو تیار رہتے ہیں۔ جب کوئی دشواری پیش آتی ہے تو اس کا مقابلہ ہنستے کھیلتے کرتے ہیں۔

مگر دلّی میں میں انہیں ایک زمانے میں تفکرات میں ڈوبا دیکھتی تھی تو الجھن ہوتی تھی کیونکہ اپنی زبان سے یہ کچھ بتاتے نہ تھے۔ وہاں کیا پریشانی تھی اس کا حال بھی مجھے بمبئی آکر ہی معلوم ہوا۔ غربت اور تنگدستی سے یہ نہیں گھبراتے۔ ہاں قرض ان کے لئے سوہانِ رُوح اور شرمندگی کا باعث ہوتا ہے اس لئے ہم نے بھی تہیہ کر لیا کہ غربت میں گذارہ کر لیں گے مگر قرض لیکر کبھی نہیں جئیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کوئی کرانہ والا یا دودھ والا ہماری کنڈی کھٹکھٹانے نہیں آیا اور نہ ہم کسی دوست یا رشتہ دار کے زیر بار احسان ہوئے۔ کیونکہ ہم نے اپنوں کو بھی اپنے حال کی ہوا ہی نہیں لگنے دی۔

ٹیلی ویزن پر جب نوکری کرتے تھے تو انہیں دو سو بہتر روپے تنخواہ ملتی تھی جس میں سے پچاس روپے یہ اپنی ماں کو بھیجتے تھے اور ڈیڑھ سو روپے مکان کا کرایہ دیتے تھے کیونکہ گندے مکان میں یہ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے اتنے زیادہ کرائے کا مکان چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔ بہتر روپے میں گھر کا خرچ چلتا تھا مگر اس شخص کے ماتھے پر کبھی بل تک نہیں آیا۔

برسوں سے دیکھ رہی ہوں کہ یہ شخص لگاتار محنت کرتا ہے اور محنت کی کمائی کرتا ہے مگر یہ محنت سے گھبراتا ہے اور نہ کبھی تھکتا۔ اپنی محنت ہی کی بدولت اس تنگی کے زمانے میں بھی یہ پیسوں کا انتظام کرتے تھے اور کھانا پینا چل جاتا تھا۔

اس حال میں انہوں نے ناول ڈاک بنگلہ، تیسرا آدمی اور بہت ساری کہانیاں بھی لکھیں۔ لکھتے وقت میں نے انہیں اکثر اداس دیکھا ہے۔ ناول لکھتے وقت کافی مست اور موج میں۔

اسی زمانے میں انہوں نے کہانی جارج پنجم کی ناک لکھی تھی جس کو لیکر سرکار نے انہیں بہت پریشان کیا تھا کیونکہ اس کہانی کے ذریعے سرکار پر تیکھا طنز کیا گیا تھا اور سرکار نے ان پر کمیونسٹ ہونے کا الزام لگایا تھا اصل میں اس زمانے میں جسے ستانا ہوتا تھا اسے کمیونسٹ کہہ کر ستایا جاتا تھا۔ لوگوں نے انہیں مشورہ دیا کہ اس وقت کے ہوم منسٹر لال بہادر شاستری سے ملو، مگر انہوں نے یہ مشورہ قبول کرنے کی بجائے دلی ٹی وی سنٹر میں اپنے کمرے کے باہر لگی نام کی تختی اکھاڑ کر چلے آئے۔

اس کے بعد ہم لوگوں کی حالت اور بھی خستہ ہو گئی۔ انہوں نے مجھے اپنی ماں کے پاس بھیج دیا اور خود زندگی سے لڑتے رہے۔ مجھے کبھی اپنا غم نہیں بتایا۔ ماں کے نام پچاس روپے کا منی آرڈر بدستور آتا رہا۔

یہ ہماری زندگی کا بڑا تکلیف دہ دور تھا۔ لوگ طرح طرح کی افواہیں پھیلا رہے تھے۔ کچھ لوگ تو میرے کان بھی بھرنے آتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ کملیشور بہت پینے پلانے لگے ہیں۔ خود میری ایک رشتہ دار خاتون نے مجھ سے یہ آکر کہا تھا کہ وہ کوئی اور شادی کرنا چاہتے ہیں۔

یہ سب سن کر مجھ کو صدمہ تو ضرور ہوتا تھا مگر میں کسی کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتی تھی۔ کیونکہ میں کملیشور جی کو اچھی طرح جانتی تھی۔ انہیں کسی اور کا پتی کہلانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں دوسری عورتیں اور لڑکیاں ان کے قریب آنا ضرور چاہتی ہیں۔ مگر عورتوں کے بارے میں ان کا رویہ بڑا صاف ستھرا تھا۔ بچپن سے ان کی کوئی بہن نہیں تھی اس لئے وہ عورتوں کو اسی نظر سے دیکھتے اور اُن کی عزت کرتے تھے۔ مگر بعض عورتوں نے ان کی اس نیکی سے بھی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، جس پر طرح طرح کی افواہیں پھیلائی جانے لگیں۔ اس سے انہیں بے حد دکھ پہنچتا۔ لوگ انہیں دکھ پہنچانے سے باز نہیں آئے مگر کسی نے ان کی اندرونی تکلیف کا اندازہ لگانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

یہ باتیں سن کر میں بھی پریشان ہو جاتی تھی اور ان سے پوچھتی تھی تو وہ بڑے دھیرج سے جواب دیتے تھے

— "گایتری تم گھبراتی کیوں ہو۔ ان باتوں کا جواب میری زندگی خود دے گی۔" بیس برسوں سے میں ان کی رفیقِ حیات ہوں اور یہ دیکھ رہی ہوں کہ ادیب بن کر انہوں نے نہ کبھی غیر ذمے داری برتی اور نہ عام سطح سے اٹھ جانے کی کوشش کی۔ بلکہ میرے پتی پروش اور ساتھی، اپنی بچی کے پاپا، اپنے بڑے بھائی کے چھوٹے بھائی اور جٹھانی کے دیور رہے۔

اسی اندھیرے دور میں رسالہ "نئی کہانیاں" کی ادارتی ذمے داریاں انہیں سونپی گئیں تو ہماری معاشی تنگی میں بھی کچھ کمی آگئی۔ یوں تو پچھلے قرض کا بوجھ تھا ہی۔ مگر پھر بھی ایسا لگتا تھا کہ اب ہمارے اچھے دن آگئے۔ میں اپنی بچی مانو کے ساتھ خوش تھی۔ مگر ان کی پریشانیوں اور الجھنوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ان کی جدوجہد جاری تھی۔ ادارت کی ذمے داری نبھانے کے بعد اپنے ادبی ذوق کی تسکین بھی کرتے۔ قرضوں کی ادائگی کے ساتھ ادبی بحثوں میں بھی حصہ لیتے تھے۔ اس زمانے میں موہن راکیش، راجندر یادو، جواہر چودھری اور منو بھنڈاری کے ساتھ گذرے ہوئے دلی کے یہ دن بہت بھرے پُرے دن تھے۔ میرا ایک بہت بڑا پریوار تھا جو اس زمانے کے تمام نوجوان ادیبوں شاعروں اور چترکاروں پر مشتمل تھا۔ یہ سب آدرش وادی لوگ خوابوں کی دنیا سجاتے اور پھر زندگی کی تلخ حقیقتوں سے بھی آنکھیں ملاتے تھے۔

انہی دنوں کملیشور جی کی بڑی بھتیجی کی شادی ہوئی جس کے لئے انہوں نے چیٹ فنڈ سے قرض لیا۔ "نئی کہانیوں" سے انہیں سات سو روپے تنخواہ ملتی تھی۔ — ڈھائی سو کا مکان، ڈھائی سو چیٹ فنڈ کی ماہوار قسط پچاس روپے ماہوار ماں کو اور ڈیڑھ سو میں ہم لوگ مہینے بھر کا خرچ چلاتے تھے۔

تنگی اب بھی تھی مگر ان کے دوستوں اور مہمانوں کے آنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور ہمارا گھر قہقہہ زار بنا رہتا تھا جس پر مجھ کو تعجب بھی ہوتا تھا کہ یہ لوگ اتنا ہنس کس طرح لیتے ہیں۔ ان دوستوں میں عجیب طرح کا اپنا پن تھا اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتے تھے۔

ان دنوں موہن راکیش جی کی گھریلو زندگی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ بمبئی جا رہے تھے۔ یہ انہیں ایرپورٹ پر چھوڑ کر لوٹے تو دن کا کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ہی ایک پولیس والے نے دروازے پر دستک دے کر پوچھا۔ "مسٹر کملیشور ہیں؟"

اصل میں راکیش جی انیتا کو، جو اُن کی دوسری بیوی بنیں، بمبئی لیکر چلے گئے تھے اور ان دونوں کو بمبئی بھیجنے میں کملیشور جی نے مدد پہنچائی تھی۔ انیتا کے گھر والوں نے پولیس میں شکایت کی تھی اور پولیس انسپکٹر کملیشور جی کو تھانے لیجانے آیا تھا۔ انسپکٹر کے ساتھ انیتا کی ماں، پتا جی، نانا جی اور انیتا کے پتا جی کے ایک دوست بھی تھے۔

کملیشور جی نے ان لوگوں کو نہیں بتایا کہ راکیش انیتا کو لیکر کہاں گئے ہیں۔ صرف اتنا کہتے رہے کہ وہ دونوں ساتھ ہیں اور اچھی طرح ہیں۔ انسپکٹر کی سمجھ میں بات آگئی کہ معاملہ ایسا سنگین نہیں ہے جس انداز سے انیتا کے گھر والوں نے رپورٹ کی ہے، اس لئے وہ لوٹ کر چلا گیا۔

اس کے بعد انیتا کے بھائی اپنے ساتھیوں کو، جو ہاکی اسٹک اور ڈنڈوں سے لیس تھے، لیکر آگئے۔ کملیشور جی ارادہ بھانپ کر لوہے کی سلاخ پیچھے چھپائے ان لوگوں سے بات کرتے رہے۔ لڑکوں کی بھی سمجھ میں جب بات آگئی تو وہ لوگ انیتا کے بھائی اروند ہی کو ڈانٹ پھٹکار کر لوٹ گئے۔

بات آسان لگتی ہے مگر وہ بڑی سنگین صورت حال تھی اور اپنے دوست کی خاطر وہ سب کچھ جھیل رہے تھے۔

کملیشور جی کی ابتدائی زندگی یتیمی، غربت اور تنہائی میں گذری۔ ان کی ماں نے حالات کا سختی سے مقابلہ کیا۔ انہوں نے بھی اپنے اندر یہ خوبی پیدا کر لی ہے۔ خراب حالات میں گھبرانے کی بجائے ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کی مستقل مزاجی کا نتیجہ ہے کہ جو ٹھان لیتے ہیں اسے پورا کر کے چھوڑتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ضدی ہیں۔

یہاں ایک بات بتاتی چلوں۔

راج کمل پبلی کیشنز کی ملکیت جب بدلی تو انہوں نے اچانک نوکری چھوڑ دی۔ نئے مالک لاکھ کہتے رہے کہ آپ کو زیادہ تنخواہ دی جائے گی، گھر پر فون لگوا دیا جائے گا، ایک معاون ایڈیٹر دیا جائے گا، آپ کے لئے ضروری نہیں ہوگا کہ دفتر آئیں، آپ گھر بیٹھے ہی کام کر دیا کیجیے۔ مگر کملیشور جی اپنے فیصلے پر اٹل رہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اوم پرکاش جی (پہلے مالک) نہیں ہوں گے تو میں یہاں کام کر ہی نہیں سکتا۔

یہ سب جانتے تھے کہ اوم جی سے ان کی پٹتی نہیں تھی مگر نظریاتی اختلاف سے قطع نظر انہیں دوستانہ ماحول میں کام کرنا زیادہ پسند ہے۔ اس کے علاوہ یہ دکھیوں کا ساتھ دینے میں زیادہ فخر محسوس کرتے ہیں۔ اپنے غربت کے دنوں میں انہوں نے جو قدریں اپنائی ہیں ان پر اب تک قائم ہیں۔ جب جب ایسے موقع آتے ہیں مجھے ان کا وہ پہلا خط یاد آجاتا ہے جسے میں اوپر نقل کر چکی ہوں۔ آج بیس سال گذر جانے پر بھی وہ اپنے اس اصول پر سختی سے قائم ہیں۔ اور مجھے طاقت ملتی ہے۔ وہ دستاویزی خط ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کے بارے میں انہوں نے جو قسم کھائی تھی اس کا اظہار میرے سامنے بھی کیا تھا۔

یہ الجھنوں اور مشکلات سے گھبراتے نہیں بلکہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں۔ 'نئی کہانیاں' چھوڑنے کے بعد پھر فاقہ مستی کے دن شروع ہو گئے۔ مگر کسی پر کچھ ظاہر نہیں ہوا۔ بلکہ لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ پہلے ہی کی طرح جاری رہا۔ حالانکہ کبھی یہ ہم لوگوں کی حالت ظاہر ہوتی تو وہ گھبرا اٹھتا۔ مگر کملیشور جی مطلق نہیں

گھبرائے بلکہ پھر جدوجہد میں لگ گئے۔ اس زمانے میں مشنری جذبے سے ہفتہ وار انگت نکالا۔ اس پرچے کی مالی حالت اچھی نہیں تھی اس لئے معاوضہ کے طور پر انہیں تین سو روپے ماہوار ملتے تھے۔ اس پرچے میں یہ کئی کئی نام سے مختلف موضوع پر مضامین لکھتے تھے۔ چار روپے فی فارم کے حساب سے پروف بھی پڑھتے تھے۔ موسم سے بے پروا یہ اپنے کام کی دھن میں لگے رہتے تھے۔

ان کے پاس گرم کپڑے نہیں تھے جسے دیکھ کر سودرشن چوپڑا نے جو ریلوے میں ٹی ٹی آئی تھے، ایک خلاصی کا اونی اوور کوٹ ۶ روپے میں خرید کر انہیں پہنا دیا تھا۔ مگر سردیوں کی بارش سے بچنے کے لئے یا تھک کر وہی اوور کوٹ پہنے پریس ہی میں سو جایا کرتے تھے۔ یا کیچڑ میں لت پت گھر لوٹتے تھے تو جوتے پہنے ہی تھوڑی دیر کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ رہتے تھے کہ دس پندرہ منٹ آرام کرنے کے بعد انہیں پھر بھاگ کر کوئی اور کام سنبھالنے جانا ہوتا تھا۔ جب نہیں آتے تھے تو میں اور ماتو اکیلے میں دبکی ہوئی سو جاتی تھیں۔

کھانے کے لئے روٹی، آلو کی سبزی اور اُڑد کی دال پکتی تھی۔ کملیشور جی کو ارد کی دال پسند ہے مگر گھی کے ساتھ۔ میں کسی طرح دو چمچے گھی کا بندوبست کرتی تھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ دو سو گرام گھی خریدنے کے لئے گھر میں ڈھائی روپے بھی نہیں تھے تو میں نے ردی اور پرانے جوتے بیچ دئے۔ جس سے چھ روپے آئے اور پھر گھر میں گھی بھی آ گیا۔

مگر یہ ایک بار نہیں ہوا تھا۔ بلکہ پورے تین سال تک ایسا ہی چکر چلتا رہا۔ یہ صبح کو پریس سے لوٹتے وقت ردی سمیٹے اور سبزی خرید کر لاتے تھے۔ وہ جب ردی بیچنے کو دیتے تھے تو ہم دونوں ایک دوسرے کو ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا کرتے تھے اور ماتو اپنی گندی گڑیا سے کھیلتی اور ہنستی رہتی تھی۔

لیکن ہمیں اپنی غریبی کا دُکھ نہیں تھا کیونکہ ہمارے اِردگرد ہم سے بھی زیادہ بدحال لوگ زندہ تھے۔ ہاں افسوس اس بات کا ہوتا تھا کہ ہم لوگ کیسے نظام میں جی رہے تھے کہ محنت کا بھی صحیح معاوضہ نہیں ملتا۔ بہرکیف کملیشور جی نے غربت میں بھی کس طرح زندگی بسر کی ہے اس کی اہمیت نہیں ہے بلکہ غربت میں بھی وہ اپنے نظریے پر قائم رہے اور دوسروں کے دُکھ درد میں شریک رہے جس پر ہمیں فخر ہے۔

اب تو بمبئی میں ہمیں سب کچھ میسر ہے۔

لیکن ان کی جدوجہد ختم نہیں ہوئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر پیشے کا آدمی ریٹائر ہوتا ہے ادیب کبھی ریٹائر نہیں ہوتا بلکہ ساری عمر جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ زندگی اور ماحول کو بدلنے کے لئے۔

کملیشور

(ڈائری کے چند اوراق)

★ کملیشور اپنے داخلی محسوسات اور
خارجی واقعات کو اپنی ڈائری کے صفحات
میں محفوظ کر لیتے ہیں جنہیں وہ سبڑی
احتیاط سے سنبھال کر رکھتے ہیں۔ یہ
معلوم ہو جانے پر کہ اپنے ادبی سفر کے
ساتھ انھوں نے ڈائری لکھنی بھی شروع
کی تھی، ہم نے اس کے بھی چند نمونے
قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہا
مگر کملیشور اپنی ڈائری کسی کے حوالے کرنے
کو تیار نہیں تھے۔ اور کوئی ایسا وقت نہیں
ملتا تھا جب وہ تنہا ہوں۔
آخر ایک دن آدھی رات سے صبح تک
ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کی ڈائری کی ورق گردانی
کرنے کے بعد ایسے چند صفحے منتخب کئے
جن کے چھپنے پر کملیشور کو بھی کوئی
اعتراض نہیں تھا۔ یہ صفحات بھی
لطف سے خالی نہیں ہیں، ملاحظہ کیجئے۔

——— ادارہ

نئی دلی

۲۳-۱-۷۳

ماں اور دوست

یہ اندر ایسا کیا ہے جو اس سال ڈائری لکھنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ایک لمبا عرصہ ہوا ڈائری نہیں لکھی۔ کچھ ایک دنوں کی باتیں ادھر لکھی پڑی ہیں تو بے ترتیب — کیا میں یکایک بہت اکیلا ہو گیا ہوں؟ یا میں اپنے کو اکیلا کر لینا چاہتا ہوں؟ سیدھی سی بات ہے — راکیش[1] اب یہاں نہیں ہے۔ وہ اب دلی میں نہیں ملتا۔ اماں اب مین پوری میں نہیں ہیں وہ الہ آباد میں بھی نہیں ملیں گی۔ ۲۔ پوری طرح سے پریٹ کر گیا ہے، لہولہان کر کے چھوڑ گیا ہے۔ ۳ دسمبر کی شام کو ساڑھے چھ بجے راکیش نہیں رہا۔ ۷ دسمبر کی رات کو ½ ۹ بجے اماں چلدیں۔ دونوں ذرا سا ہٹ کر جاتے تو کیا بگڑ جاتا؟ روکتا کون؟ لیکن پھر بھی ... اس سے اچھی تو پتنگ ہے، کٹتی ہے تو دور تک جاتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہاں؟ مرنے سے پہلے اگر ایک بار موت سے مل پاتا تو بڑی شان سے کہتا — ہلو! اور پوچھتا اس بیہودگی میں کیا مزہ ہے؟ ہم مانتے ہیں کہ مرنا طے ہے، پر یہ تو کوئی طریقہ نہیں، یہ سراسر غنڈہ گردی ہے! بہت خوب آپ آئیے اور مجھے پیٹ کر چلے جائیے۔ یہ ایشور کا نیم ہے۔ مجھے تو ہنسی آتی ہے۔ اگر موت ایشور کے ذریعے طے کی گئی ہے تو یہ ایشور صرف ایک شکاری ہے۔

جو بھی ہو۔ ایشور کی تعریف کرنا میرا مطلب نہیں۔ اس طاقت کو ہمیشہ حقارت سے دیکھنا میری مجبوری رہی ہے۔ ایشور شکاری اور پونجی پتی۔ کیا فرق ہے ان میں؟

تمام باتیں ہیں۔ پہلی جنوری سے آج تک۔ بہت یاد کر رہا ہوں لیکن یاد نہیں آتا کہ نئے سال والے دن میں نے کیا کیا تھا۔ اتنی جلد دماغ سے سب کچھ نکل جاتا ہے۔ اور کیا ہوا ہو گا۔ سو کر صبح اٹھ گیا ہوں گا، برش کیا ہو گا اور چائے پی کر دہی اپنی کتابوں کے بیچ بیٹھ گیا ہوں گا۔ لیکن یہ طے ہے کہ نئے سال میں خود سے کچھ وعدے میں نے قطعی نہیں کئے تھے۔ اپنے سے وعدے کرنا یعنی اپنی سادگی کو کہیں توڑنا! کیا یہ وعدہ کافی نہیں ہے کہ ہم جئیں گے۔ ہم آشاؤں کی سیمائیں نہیں ناپیں گے۔ وقت کی لکیروں پر نہیں چلیں گے۔ یہ وقت بہت بے وقت آتا ہے۔ اپن ذرا موڈ میں ہوتے، پہلی جنوری آتی تو شاید اس سے کوئی وعدہ کر بھی لیتے۔ ایسے نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ہم ہی وقت کے مطابق چلتے رہیں، کبھی وقت بھی تو ہمارے مطابق چلے۔ پہلی تاریخ کو ہی پہلی تاریخ کیوں؟ اور کیوں ہم اداس ہوں؟ یہ بوجھ لیکر کیوں نیا سال شروع کریں کہ ہم نے یہ نہیں کیا وہ نہیں کیا۔ آخر ہم نے کچھ تو کیا ہی ہو گا، ایسا جو ہمیں اچھا لگا ہو گا۔ یا وقت نے زبردستی ہم سے کروا لیا ہو گا۔ لیکن یہ طے

---

[1] موہن راکیش، ہندی کے ادیب اور کملیشور کے جگری دوست

ہے کہ وقت نے مجھے کہیں بخشا نہیں۔ اور میں نے بھی اسے بھرپور جیا ہے۔ چاہے چپ چاپ لیٹ کر جیا ہو یا اپنے کرب مسلسل کے ساتھ جیا ہو، یا اس گھیرے بندی کے خلاف لڑتے ہوئے جیا ہو۔ یہ کچھ بڑی بات لگتی ہے ۔۔ لڑتے ہوئے جینا ۔ پر اپنے سے کیوں شرما رہے ہو دوست۔ لڑے تو تم ہو، لڑنا اور لڑتے رہنا تمہاری فطرت ہے۔

.... گذرے سال کے دسمبر سے پہلے موت کا خیال کبھی نہیں آیا۔ یہ دونوں لوگ ــــ راکیش اور اماں یکایک مجھے موت کی وادی میں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

ماں اور دوست ــــ ان کی عمر نہیں ہوتی۔ ان کے سوا شاید ہر ایک کی ایک عمر ہوتی ہے۔ ماں اور دوست کو اپنے ساتھ مرنا چاہئے۔ یوں الگ الگ چل دینے کا طریقہ کچھ پسند نہیں آیا۔

نئی دلی

۲۸-۱-۷۳

عام آدمی کی اہم زندگی

منشی کملیشور جی! یہ ڈائری لکھنا آپ کے بس کا نہیں۔ یا تو آپ جیٹ کی اسپیڈ سے کام کرتے ہیں یا پھر اجگر کی طرح پڑے رہتے ہیں۔ اپنے دماغ کو سکون دینے کے لئے۔ جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے اسے سمیٹنا آسان نہیں۔ یا تو اسے زندگی میں سمیٹ لیجیے یا ان کاغذوں پر سمیٹتے رہیے۔ یو لیے منشی جی کیا چھنتے ہیں؟ زندگی آپ سے چھوٹے گی نہیں اسلئے ڈائری میں وہ سب لکھنے سے رہ جائے تو ملال مت کیجیے گا۔ ڈائری آپ کے پیچھے چلتی ہے آگے نہیں۔ آپ کسی صحافی کی زندگی تو گذار نہیں رہے ہیں۔ آپ پردھان منتری یا راشٹرپتی کی غیر اہم واقعات کی زندگی بھی نہیں گذار رہے ہیں۔ آپ ایک عام آدمی کی بے حد اہم زندگی بسر کر رہے ہیں ــ جسے شملہ ہسوری، کشمیر اور ملتان میں گرنے والی برف سے بھی لینا دینا ہے، مہاراشٹر میں پڑے اکال سے بھی واسطہ ہے، ویتنام میں ہونے والے معاہدۂ امن سے بھی متاثر ہونا ہے اور اپنے کچے کٹ گئے ناخن سے بھی پریشان ہونا ہے۔ اور ابھی ابھی کان کے پاس مارے بلیڈ کی چھنچھناہٹ بھی سہنی ہے اور مانو[1] کے کان میں پڑی بالی سے پک گئے چھید کا خیال بھی کرنا ہے اور سردی سے جھلس گئے سامنے کے پیڑ کو بھی دیکھنا ہے۔ اس پھٹے سوئٹر والے رکشا والے کو بھی نہیں بھولنا ہے۔ کارنس میں دبکی بیٹھی چڑیا کو بھی دیکھنا ہے اور من میں امنڈتے طرح طرح کے

---

[1] کملیشور کی اکلوتی لڑکی۔

بیلاؤں کو بھی سنبھالنا ہے۔ گایتری[1] کو یاد بھی کرنا ہے۔ پُروا[2] کو گود میں لیکر پیار کی ندی میں ڈوبنا ہے۔ ڈبڈباتی آنکھوں سے دنیا کو دیکھتی انیتا[3] سے راحت کی باتیں بھی کرنا ہیں۔ بھائی صاحب کی بیماری کے تفکرات لئے ہوئے الہ آباد کی طرف بھاگتے اس من کو دلاسا بھی دینا ہے۔ اماں کے بغیر اس چھوٹے ہوئے مین پوری کے گھر کے اس سناٹے کو بھی سہنا ہے۔ بار بار راکیش کو یادوں سے ہٹانا بھی ہے، اور نہ ہٹا پانے کی تکلیف کو برداشت بھی کرنا ہے۔ تو بتائیے آپ کے پاس وقت کہاں ہے ان کاغذوں میں بندھنے کا؟ کہانیاں اور ناول اور کیا ہیں؟ وہ بھی تو آپ ہی لکھ رہے ہیں۔

لگتا ہے ڈائری اپنی تنہا زندگی گذارنے کا ایک طریقہ ہے۔ یا تو کوئی بے حد اکیلا ہو تب لکھ سکتا ہے' یا پھر بے حد سنگھرش میں ڈوبا ہوا ہو اور اپنی تنہائی ڈھونڈ رہا ہو تب لکھ سکتا ہے .... یعنی نتیجہ یہ ہے نلشی جی کہ آپ نے اپنی ہی دلیل سے اپنی بات کاٹ دی ہے اور آپ ڈائری لکھیں گے ضرور' اس لئے افسوس مت کیجئے کہ اسے لگاتار نہیں لکھ پا رہے ہیں۔ اُٹھیے اور نہائیے۔ اسے بند کیجئے — اب زندگی شروع ہو رہی ہے۔

بمبئی
۳-۲-۷۲

دوسرے نمبر کے مجرم

.... ایک شریمتی جی کا فون آیا۔ مجھے ان کا نام بھی صحیح معلوم نہیں۔ ان فلم سنسر بورڈ کی عورتوں سے میں پریشان ہوں۔ یہ صاحبہ بھی کسی صنعت کار کی بیوی ہیں۔ اپنے شوہر کی دولت میں چور اور اُنہی کی حاصل کی ہوئی شہرت میں ڈوبی ہوئی یہ مغرور عورتیں — اِن عورتوں کو دیکھ کر کبھی کبھی سخت تکلیف ہوتی ہے۔ فلم سنسر بورڈ کے سلسلے میں کبھی کوئی پارٹی، چائے، ریسپشن یا وداعی پارٹی ہوتی ہے تو میری روح کانپتی رہتی ہے۔ موٹی موٹی مغرور اور پھولی ہوئی عورتیں .... پیسے کو ساڑیوں میں پھولوں کی طرح ٹانکے ہوئے، غیر ممالک کتوں، کلبوں اور دیش کی عزت کی باتیں کرتی ہوئی یہ عورتیں جب پارٹیوں میں چُست دکھنے کی کوشش کرتی ہیں تو بہت مضحکہ خیز ہو جاتی ہیں — کدّو کی طرح پھولے ہوئے کولہے، بھیگے ہوئے کپڑے کے ڈھیر کی طرح تھلتھلاتی ہوئی جانگھیں اور بھیتر سے سڑی ہوئی لوکی کی طرح بانہیں۔ تھیلیوں میں بند باسی دہی کی طرح تھرتھراتی ہوئی چھاتیاں۔ انگلیوں میں چھپکلیوں کی آنکھوں کی طرح چمکتے ہوئے نگوں اور ہیروں کی انگوٹھیاں رنگے

---

[1] کملیشور کی بیوی [2] موہن راکیش کی لڑکی [3] انیتا اولک، موہن راکیش کی بیوی

ہوئے بال اور پورے بدن سے آتی دواخانے کی مہک کو دباتے ہوئے مہکتا سنٹ، سونف، سپاری، الائچی میں دبا ہوا گندی سانس کا بھبھکا۔ یہ شاید بُری عورتیں نہیں ہیں۔ شیفون اور نائلون کی ساڑی نما تھیلیوں میں بند مرتی ہوئی مچھلیاں ہیں۔ جب بھی کبھی ان کے بیچ پارٹیوں میں شریک ہونا پڑتا ہے تو ہمیشہ ایسا تجربہ ہوتا ہے جیسے مینڈکوں سے بھرے تالاب میں اترنا پڑ رہا ہو۔ من گھبرایا ہوا، گھنایا ہوا اور اچٹا اچٹا رہتا ہے۔

ان کے خلاف کوئی کیا کہے؟ کہیں یہ بھی لگتا ہے کہ یہ بیچاری بھی کچھ نہ کچھ کرتے رہنے اور خود کو مفید محسوس کرانے کی کوشش کرتی ہیں۔ کہیں تو انہیں ان کا فالتو پن ستاتا ہوگا..... پر انہوں نے صرف یہ نہیں جانا کہ ان کے گھر پریوار کے نام پر استحصال کی وہ کون سی نلیاں ہیں جنہیں لگا لگا کر ان کے صنعت کار اور تاجر شوہروں نے مظلوموں کا خون کھینچ کھینچ کر ان کی رگوں میں بھر دیا ہے۔ صرف اگر اترائیں نہ، تو شاید انہیں معصوم مانا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ اتنی نادان بھی نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہیں وہ ہتھکنڈے معلوم نہیں جن سے دوسروں کا خون اور محنت پسینہ بدلا جاتا ہے، پر دنیاوی عیش و عشرت کی دوڑ میں یہ اپنے خونخوار شوہروں کے ساتھ ہوتی ہیں اور خون بھرنے والی مشکوں کے طور پر کام آتی ہیں۔

اے وقت! یہ اتنی نادان نہیں ہیں جتنی لگتی ہیں۔ انہیں معاف مت کرنا۔ ان کا گناہ دوسرے نمبر کا ہے، پر ہے۔ اور یہ سب فلم سنسر بورڈ کی زنانہ ممبروں کے بارے میں نہیں، ان سب کے لئے ہے جن سے میں پچھلے پانچ چھ سالوں میں ملا ہوں۔ اس اونچے طبقے کے بیچ — تاج محل، اشوکا، او بیرائے انٹر کانٹی نینٹل، ہوٹل ائرلن، سن اینڈ سینڈ، ہل ٹاپ امبیسیڈر، ہی میں نہیں، مالا بار ہل، وارڈن روڈ، کارٹر روڈ اور نہ جانے کن کن پوش علاقوں کے گھروں میں۔ بیتی ہوئی مہارانیاں، مارواڑی سیٹھوں کی سیٹھانیاں، افریقہ اور ہانگ کانگ میں تجارت کرنے والے گجراتی اور سندھیوں کی بیویاں — پر سب سے دُکھ بھرا ہے ان کا حال جو دو نمبر کی بیوی کی قطاریں کھڑی ہیں۔ ہیروں جواہروں اور میک اپ سے لدی پھندی، سیدھا اور عیش و عشرت میں پلی بڑھی مگر بستروں پر اکیلی — یا دلدل ہو گئے بستروں میں گلے تک ڈوبی ہوئی اور جینے کے لئے بھاری بھاری سانسیں۔ شاید اس پورے نظام اور سماجی معاشی استحصال کے اس بھیانک اور گنہگار حلقے کو سمجھنے اور اسے نہایت آسانی سے نفرت کر سکنے کے لئے یہ سب دیکھنا، جاننا اور سمجھنا ضروری ہے۔ اے وقت! انہیں معاف مت کرنا۔ خون بھرنے کے کام کی یہ مشکیں زندہ کھال کی ہیں! یہ مردہ کھال کی ہوتیں تو شاید معاف کیا جا سکتا تھا۔

فن اور شخصیت
بمبئی
۱۰-۲-۷۳

خوشتر گرامی

(سابق ایڈیٹر بلیسویں صدی)

خوشتر گرامی۔ بیسویں صدی کے ایڈیٹر۔ دریا گنج میں سیڑھیوں سے چڑھ کر پہلی منزل پر ان کا دفتر۔ خوشتر صاحب کافی بزرگ۔ ہندی میں انہوں نے نئی صدی نکالی۔ اپنے لڑکے کرشن کمار کے لئے۔ کرشن کمار بہت مانتا تھا مجھے اور چاہتا تھا کہ نئی صدی میں میں اس کے لئے کالم لکھوں۔ شروع کر دیا۔ بریکرما۔ سو روپے فی کالم لیتا تھا میں۔ کرشن کمار نے اس رقم کے لئے جیسے تیسے اپنے باپ کو راضی کیا تھا۔ آخر نئی صدی نہیں چلی۔ پر میرا کیا قصور؟ میں دو مہینوں کے کالم دے چکا تھا اور ان کا معاوضہ دو سو روپے لے چکا تھا۔

ایک دن دیکھا نئی کہانیاں کے دفتر میں خوشتر صاحب چلے آ رہے ہیں۔ بٹھایا تو معلوم ہوا دو سو روپیہ واپس لینے آئے ہیں۔ ساتھ میں میرے لکھے ہوئے کالموں کی ایک کمپوز کی ہوئی کاپی ہے اور ایک مسودہ۔

"یہ دونوں کالم آپ کو واپس کر رہا ہوں"۔ خوشتر صاحب نے کہا۔

"میں کیا کروں گا، میں نے تو اسی کالم کے لئے لکھا تھا"۔ میں بولا۔

"نئی صدی تو بند کرنی پڑی۔ آپ ان کا استعمال نئی کہانیاں میں ایڈیٹوریل کی جگہ کر لیجیے"۔ خوشتر صاحب بولے۔

"ایڈیٹوریل دوسرے لہجہ میں لکھے جاتے ہیں"۔ میں بولا۔

"خیر چھوڑیئے۔ ان کا استعمال کریں نہ کریں، ان کے دو سو روپے مجھے واپس کر دیجیے"۔ خوشتر صاحب بولتے ہیں۔

"یہ تو زیادتی ہے"۔ میں نے کہا۔

"وہ سن کر چپ ہو گئے تو لگا کہ یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی ہے۔ تسکین ہوئی۔

سات آٹھ دنوں بعد یونہی ان کے دفتر گیا۔ دیکھا مردانہ کمزوری کے مریضوں کو ایک الگ کوٹھری میں لیجا کر دوائیاں دینے کا ان کا کاروبار میگزین نکالنے سے زیادہ تھا۔ جو بھی جانگھ کھجلاتا سیڑھیاں چڑھ کر آتا تھا اس کا سواگت پہلے ہوتا تھا ادیب کا بعد میں۔

ایک دن دنگ رہ گیا۔ نئی کہانیاں کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ عدالت سے چپراسی آیا۔ اس نے ایک کاغذ دیا۔ دو سو روپے کی ڈگری۔ خوشتر نے یکطرفہ ڈگری کر دالی تھی۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ تلملا کر رہ گیا۔ مفلسی کے ان دنوں میں کسی دوست سے ادھار لے کر چکا دیئے پر من پر جو بیتی وہ آج تک یاد ہے ۔۔۔ یہ سن ۶۳، ۶۴ کی بات ہے۔

اور اب سن ۷۲۔ وہی خوشتر صاحب بمبئی ایرپورٹ پر مل جاتے ہیں۔ ہم دونوں دلی جا رہے ہیں۔

تپاک سے ملنا ہوتا ہے۔ ہم دلی اترتے ہیں، تو یکایک خوشتر صاحب بہت پریشاں حال نظر آتے ہیں۔ ان کا پورٹ فولیو بمبئی ایر پورٹ پر سامان تلواتے وقت کاؤنٹر کے پاس چھوٹ گیا تھا۔ وہ پسینہ پسینہ تھے اور ایر پورٹ مینیجر سے چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ اجی اس میں بہت ضروری کاغذات تھے۔ سات سو روپے نقد بھی ہیں۔ ذرا فون کر کے بمبئی سے معلوم کروا لیجئے۔

آخر آٹھ سال بعد مجھے موقع ملا۔ میں نے آگے بڑھ کر افسوس ظاہر کیا۔

"خوشتر صاحب پانچ سو روپوں کے لئے مجھے سخت افسوس ہے۔"

"اجی کملیشور صاحب پانچ سو نہیں پورے سات سو تھے۔"

"دو سو ڈگری کرواکے آپ مجھ سے وصول کر چکے ہیں اس لئے مجھے افسوس صرف پانچ سو کا ہے۔"

میں نے کہا تو سنتے ہی خوشتر صاحب اپنی پینٹ کمر پر چڑھاتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔

مہابلی پورم (تملناڈو)

۴-۹-۷۳

رات ساڑھے گیارہ بجے

یہ کیسی تنہائی ہے؟

اسکرپٹ کے بتیس صفحات لکھے۔ بیچ پر ٹہلے۔ کچھ ٹوٹی سیپیاں بٹوریں جو بعد میں پھینک آئے۔ بہت دیر ریتیلی گھاس کو دیکھتے رہے۔ سُتلی کی طرح پھیلی ہوئی بھاگتی ہوئی شاخیں۔

پنچھی کیوں نہیں ہیں یہاں۔ صبح صرف تین ابابیلیں دیکھی تھیں۔ دوپہر میں ایک کوے کی صرف آواز سنی تھی۔ شام کو کچھ ٹڈیاں آئی تھیں۔ ان کے پنکھوں میں ہوا بھری تھی۔

کوئی آواز نہیں ہے سوائے سمندر کے ہرہرانے کے۔ یا تیز ہوا سے شیشے کے فریم والی دیوار کے ڈھک ڈھک بولنے کے۔

ابھی جب اندھیری ریتیلی سڑک سے واپس کاٹج میں آیا تھا تو صابودانے کا پیڑ بولا تھا — کرکر کر — تیز ہوا میں اس کی پتیاں ایک دوسرے سے لڑ رہی تھیں۔

پھر سناٹا۔

ہلو مانو بیٹے۔!

مانو سو رہی ہے۔

ہلو گایتری!

گایتری بھی سو رہی ہے۔

ہلو

ہلو

ہلو

کوئی جواب نہیں۔

آج چھپکلی بھی نہیں بول رہی ہے جو کل رات چگ چگ کر رہی تھی۔

ہلو چھپکلی

خاموشی

سمندری ہوا شیشے کی دیوار سے ٹکرا رہی ہے۔ ڈب ڈھب ... ڈب ڈھب ...

کتنا سنسان ہے یہ۔

میں کسے آواز دینا چاہتا ہوں، کچھ پتہ نہیں۔

میں تنہا ہو کر جینا چاہتا ہوں، الگ ہو کر نہیں۔ اے میرے وقت کے انسان! سُن میں تجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

تیرا ساتھ کوئی نہیں دے گا میرے دوست صرف ادیب دے گا۔

پریم چند جی! میں آپ کا شکر گذار ہوں، محتاج نہیں۔

روی ٹھاکر! تم نے بہت چھلا ہے آدمی کی روح کو ... اب بند کرو۔

او کبیر! یہ سنیاسی من تمہارے ساتھ ہے۔

ہمنگوے! تم گولی کی طرح پھٹتے ہو میرے دماغ میں۔

سارتر بابو! آپ کا ہم وجودی فلسفہ جدوجہد کرنے والے آدمی کو کمزور بنا دے گا۔

مارکیوزا اور دیبرے! تم نے ذہنی انقلاب کا سامان دیا۔ تاریخ تمہیں معاف نہیں کرے گی۔

معاشی طور پر بدحال یہ دنیا اپنا حق مانگ رہی ہے۔ کون ہے جو اس بنیادی سنگھرش میں ساتھ دیگا، اقتصادی آزادی کے بعد بھی دوسری آزادیوں کی بات آئے گی۔

بابا بازو لازوال ہے۔ !

تب تک ایشور کے ہاتھ سے نکل کر یہ کائنات آدمی کے ہاتھ میں نہیں آجاتی۔ اگر ایشور ہے تو بابا بازو بھی لازوال ہے کیونکہ انسان کو ایشور یا ایشور کے نام پر کھڑی طاقتوں سے لڑنا ہے۔

جو بھی نیینتر ہے، وہ ایشور ہے۔ انسان خود مختار ہے، آفاقی قوت ہے۔ وہ پابندیوں کو قبول نہیں کرے گا۔ آج کی پابندی ہے سرمایہ داری، سامراج واد نوآبادیت ــ محدود اور شکنجہ میں جکڑا اقتصادی نظام اور جنگی جنون۔

ان کے خلاف ہے بائیں بازو کی بھومیکا، اور ان کے بعد ہے دوسری انسان مخالف قوتوں کے خلاف صف آرا بائیں بازو کی لازوال بھومیکا۔

ہلو ... کوئی سن رہا ہے؟

نپٹ سناٹا۔

بمبئی

۲۱-۹-۷۳

گاندھی کے قاتل

بیس کی رات کو ڈاکٹر بھاردواج (جن سنگھ) کا فون آیا کہ گوپال گوڈسے مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ فون پر زیادہ نہیں سوچ پایا۔ صبح کا وقت دے دیا۔

پر کیوں؟

گاندھی کے قاتل ناتھورام گوڈسے اور گوپال گوڈسے!

مجھے ملنا چاہیئے۔ من بے حد پریشان۔ اس آدمی کا سماجی بائیکاٹ ہونا چاہیئے۔ اُنیس سال کی قید کاٹ کر آیا ہے۔ ناتھورام گوڈسے کو تو پھانسی ہو گئی۔ اسے عمر قید کی سزا ملی تھی کیونکہ اس نے گولی نہیں چلائی تھی۔

صبح باتھ روم سے نکلا تو کمرے ہی سے اندازہ ملا کر کرسیوں پر دو آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہی تھے ــ گوپال ونائک گوڈسے اور ڈاکٹر بھاردواج۔

یکایک میں نے گاندھی کے قاتل کو غور سے دیکھا۔ سادہ دُھلی قمیص پینٹ، کان کچھ سامنے کی طرف نکلے ہوئے، کھچڑی بال، چھوٹی آنکھیں، بولنے میں شائستہ لیکن چہرے پر ایک ظالمانہ تاثر، نئے لگے ہوئے دانت، لمبا قد، گلابی قلم پنسل کی کیپ والا سستا سا۔

کچھ باتیں ہوئیں۔ گایتری نے کچھ پوچھا جیل کے بارے میں۔ کچھ سوال تھے جن کو پوچھ کر میں گوپال گوڈسے کو شرمندہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"نظریات کے لحاظ سے میں آپ کا کٹر مخالف ہوں۔ سچ پوچھئے تو آپ کا تو کوئی نظریہ ہے ہی نہیں۔ جو شخص ہنسا کا زندہ نمونہ ہو اس میں نظریہ کہاں؟"

گوپال گوڈسے شانت رہا۔ نشچل۔

اس کا وہی ہندو پن جو ہندوؤں کے لئے کلنک ہے۔

آخر وہ بولا۔

"ہم اہنسا کا راستہ صاف کرنا چاہتے، گاندھی کو مار کر"۔

میں چپ رہا۔

اس شخص سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ شرمندہ بھی نہیں ہوگا۔ آج بھی کہیں پشیمانی جیسی کوئی چیز اس کے اندر نہیں"۔

'گاندھی کا قاتل اور میں'

اور 'گاندھی کا قتل کیوں'۔

یہ دو کتابیں اس نے دیں اور کہا۔۔۔

"میں آپ سے ملنے ہی کے لئے آج رُکا تھا۔ نہیں تو پونا لوٹ جاتا۔ سنا تھا نظریات کے اختلاف کے باوجود آپ دوسرے کی بات سنتے ہیں"۔

میں چُپ رہا۔ اس کے بعد گوپال گوڈسے اور بھارت بھردواج مہاراشٹر جن سنگھ کے صدر سے ملنے چلے گئے۔

بمبئی

تھما ہوا وقت

آج رات ۸ بجے مین پوری جانا ہے۔ یہی طے کیا ہے۔ اماں کی موت کے بعد پہلی بار۔ گھر کی چابیاں بھی نہیں ہیں۔ اماں کے نہ رہنے کے بعد اب مین پوری پرایا ہو گیا اور میں ایک اجنبی۔ اجنبی کی طرح جا کے اتر جاؤنگا جیسے کسی پردیس میں پہنچنا ہوتا ہے۔ اماں کا نہ رہنا آج پہلی بار نہ جانے کیوں جھنجھوڑ رہا ہے' بھیتر سے۔ پتہ کیسے جاؤں گا اور اس شہر کے اسٹیشن پر کیسے اتروں گا۔ کیسے منظور کروں گا کہ اب کوئی نہیں گھر پر۔ کیسے رکشہ کرونگا کیسے اور کیوں جاؤں گا گھر۔

گھر۔۔؟

اب اپنا تو کوئی گھر نہیں۔

اتنے بڑے دیش میں کہیں کوئی گھر نہیں۔

وہی گرمیوں کے دن۔ نیم میں آئی نئی کونپلیں، آک کی پھٹتی ہوئی بونڈیاں اور لو کے ساتھ اڑتے

ہوئے کپاسی پھول، راجہ کے باغ میں پھولتی مہکتی مہندی، بیلا اور چنبیلی کے پھول، گھر کی دیواروں کے کونوں میں چھتہ بناتی بریں، ٹپکتا ہوا مہوا، صبح صبح اترتی ہوئی تاڑی اور پکنے سے پہلے گدرائے ہوئے دیسی آم، ٹھنڈک کی تلاش کرتے ہانپتے کتے، پیاسے گھوڑے اور بیل، املی میں آیا ہوا بور اور اڑتی ہوئی دھول، سناٹے سے بھری دوپہریا اور چھڑکاؤ کے بعد سوندھی مہک چھوڑتی شامیں —— رات کو کچی چھتوں پر لگی کھاٹیں اور منڈیروں پر رکھی صراحیاں۔

اور تدری میں بیٹھی اماں، پھول کی بڑی کٹوری میں نیم کی کٹوری میں کونپلیں اور جلتے دیئے کی کالک —— کو رگڑ رگڑ کر بناتی کاجل۔

اب کچھ بھی نہیں ہے ... کہیں کچھ نہیں ہے۔ کیا پتہ یہیں سے میں نہ بھاگ جاؤں۔ مین پوری جا بھی پاؤں گا یا نہیں۔

او ماں! تمہیں نہیں معلوم کہ تم کیا کر گئی ہو۔

راجہ کے باغ کا سیمبل کا پیڑ اب ننگا کھڑا ہو گا۔ لو نے سیمبل کے کویوں کو چٹکا کر سارا سیمبل بکھیر دیا ہو گا۔ پھٹی اور سونی آنکھوں کی طرح سیمبل کے کویے تاک رہے ہوں گے ... میری ان آنکھوں میں بھی اب کیا بچا ہے؟ ابھی ابھی یادوں کی لو نے ان کے آنسو نچوڑ دیے ہیں اور یہ آنکھیں سیمبل کے خالی کویوں کی طرح رہ گئی ہیں۔

سامنے شیشے میں دیکھا — اپنی ہی آنکھیں ایسی لگیں جیسی مورتیوں کی ہوتی ہیں جن میں نہ پانی ہوتا ہے اور نہ پتلیاں۔

اماں! تمہاری انگلیوں کے گھسے ہوئے ناخن یاد آتے ہیں اور انگوٹھے کا وہ ٹیڑھا کٹا ہوا ناخن، تمہاری ٹھوڑی کے پاس کا وہ خوبصورت سا مسا اور داہنے انگوٹھے کا اوپری پور جو سبزی والے چاقو کی دھار سے ہمیشہ جگہ جگہ کٹا رہتا تھا اور کٹاؤ کی وہ لکیریں کالے بال کی طرح چمکتی تھیں اور تمہاری ہتھیلی میں سوکھے چونے کی سفیدی جھلکتی رہتی تھی۔

بروں نے چھتے بنا کے انڈے دے دیئے ہوں گے۔ میدانوں میں دھول کے بھوت چکرا رہے ہوں گے۔ شیشم کی پتیاں ہوا کے ساتھ جھڑ رہی ہوں گی۔ پیپل میں لال پات آ گئے ہوں گے اور مین پوری اب وہ مین پوری نہیں رہی ہو گی۔ اپنی تکلیفوں کا یہ سفر مجھے اکیلے ہی بھگتنا ہے۔ میں مین پوری پہنچوں گا۔

* * *

مین پوری

ابھی صبح کی گاڑی سے آ گیا ہوں۔ دلی، شکوہ آباد —— مین پوری۔ شنکر کو چابیاں دیکر منادادا نے

الہ آباد سے بھیج دیا تھا۔ شنکر چپراسی کل صبح ہی آ گیا تھا۔ دیکھتے ہی اس نے سامنے والے بڑے کمرے کا تالا کھولا۔ میں اندر داخل ہوا۔

تو اماں میں آ گیا ہوں۔

سب کچھ وہی ہے۔ گھڑی ۱۷ - ۳ پہ رکی ہوئی ہے۔ ریڈیو پر جھالر پڑی ہے۔ پاندان کا ڈھکنا کچھ ڈھیلا بند ہے۔ ایک طرف سے اچکا ہوا۔ بائیں طرف کی الماری میں تمہارا چائے کا سامان اسی طرح رکھا ہوا ہے۔ کرسی پر تمہارے ہاتھ کا بنایا ہوا ہرا آسن بچھا ہے۔ پردے وہی ہیں۔ سیکچوں کے کواڑوں کے ڈھیلے کنڈے میں بڑی کیلیں اسی طرح پھنسی ہوئی ہیں۔ انگیٹھی میں کچھ راکھ باقی ہے۔ اسٹوو کے پاس پن اور اسپرٹ ہے۔ کانچ کے گلاس اوندھے رکھے ہوئے ہیں اور وہ چاقو رکھا ہوا ہے جو تمہارے انگوٹھے کو چھیل دیتا تھا۔

.... اور داہنی طرف والی الماری جس کا تالا تم ہمیشہ مانو کے لئے کھول دیتی تھیں آج کھلا ہوا ہے۔ دیوار کے کونے میں دو جھینگور ضرور بیٹھے ہیں اور ریڈیو کے پیچھے بڑی مکڑی چپکی ہوئی ہے .... اور وہی پیالی جسے تم میری ایش ٹرے بنا دیتی تھیں، ٹھیک اسی طرح اسی جگہ رکھی ہوئی ہے جہاں تم میری آسانی کے لئے رکھ دیتی تھیں۔

یعنی کچھ ایسا ہے جس سے لگتا ہے تم نہیں ہو۔ اور کچھ ٹھیک ٹھیک ویسا ہی ہے جس سے لگتا ہے تم ہو۔ جو چیزیں تم استعمال کرتی تھیں ان سے لگتا ہے کہ تم نہیں ہو۔ جو چیزیں تم میرے استعمال کے لئے رکھتی تھیں ان سے لگتا ہے کہ تم ہو۔ تمہارا لکڑی کے ہینڈل والا جھولا ذرا ٹیڑھا سا لٹک رہا ہے، پر وہ ہینگر جو تم مجھے دیتی تھیں وہیں سیدھا لٹک رہا ہے۔

انگور کی بیل میں گچھے لٹکے ہوئے ہیں۔ اوپر کے گچھے بندر کھا گئے ہیں اور سوکھی پتیاں جھلس کر الجھی ہوئی ہیں۔ انگور میں آئے گچھوں سے لگتا ہے — تم ہو — سوکھی الجھی پتیوں سے لگتا ہے — تم نہیں ہو۔

تلسی اسی طرح ہری ہے۔ پر بادامی منجریوں نے اسے ہر طرح سے ڈھک رکھا ہے۔

تلسی کا ہرا ہونا — لگتا ہے تم ہو۔ پر بادامی منجریوں کا ہونا — لگتا ہے تم نہیں ہو۔ تم ہوتیں تو پکی منجریوں کو نیچے کیاری کے کونے میں بکھرا دیتیں تاکہ برسات میں پچاسوں تلسی کے پودے اُگ آئیں جنہیں تم الہ آباد بھابھی کے لئے یا بمبئی گایتری کے لئے بھیج سکو۔

بندروں کو ڈرانے والی چھڑی بجلی کے پوائنٹ کے قریب ٹنگی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ کسی اور نے لٹکائی ہے۔ تم یہاں نہیں لٹکاتیں۔

اوہ .... یہ تمہارا تولیہ، جو الہ آباد جاتے وقت تم صوفے کے کندھے پر سوکھنے کے لئے پھیلا گئی ہوگی، اسی طرح پھیلا ہوا ہے۔ الماری کھلی تھی۔ پلہ کھولا تو دیکھا تمہارے ٹھاکر جی کے سنگھاسن

پر ایک موٹا چوہا بیٹھا تھا۔ آواز سن کر بھاگ گیا۔ تمہاری مورتیاں میں نے پھر سجا دی ہیں۔ تمہارے ٹھاکر جی کو ٹھیک سے بٹھا دیا ہے۔ بس یہ گھڑی چلانے کو من نہیں چاہتا۔ تمہارے بغیر اب اس گھر کے وقت سے میرا کیا لینا دینا رہ گیا ہے۔ اب چاہے دوپہر ہو یا شام، دس بجیں یا پانچ، کیا فرق پڑتا ہے۔ پنکھے کی آواز کے سوا آج اس کمرے میں نپٹ سناٹا ہے۔ میں جانتا ہوں تم کہتیں — کیلاش گھڑی چلا دو۔ اپنی گھڑی سے ملا دو۔

اچھا ماں! آج شام واپس جانے سے پہلے گھڑی چلا کر جاؤں گا۔ پنڈولم ہلا ہلا کر اس کے گھنٹے ٹھیک کر جاؤں گا۔ پر جب تک دوبارہ آؤں گا یہ پھر مجھے بند ملے گی۔ ہر بار۔

یہ دیوار گھڑی وقت سے کٹا ہوا وقت ہے۔

کشمیری لال ذاکرؔ

ٹکڑوں میں بٹا ہوا آدمی

○ ایک شخصی مطالعہ

اُس اجنبی خاتون
کے نام
جس نے مجھے
کملیشور
کے گھر پہنچایا

کشمیری لال ذاکر

ٹرین جب دادر اسٹیشن پر رکی تو میرے ساتھ بیٹھی خاتون نے جو سورت سے سوار ہوئی تھی، پوچھا۔

"آپ پہلے بھی بمبئی آ چکے ہیں؟"

"جی ہاں کئی بار آیا ہوں"

"چنڈی گڑھ کے مقابلے میں یہ شہر کیسا ہے؟"

"بڑا نا سٹ۔ چنڈی گڑھ تو بڑا سویا ہوا خاموش شہر ہے۔"

میرا جواب سُن کر وہ خاتون مُسکرائی — اس دوران میں اس نے اردو، ہندی اور مراٹھی کے کئی ادیبوں کے نام لئے تھے جنہیں وہ جانتی تھی — ان سب کو وہ کتنا جانتی تھی، یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن اس کی باتوں سے لگتا تھا کہ اُسے ادب سے دلچسپی تھی۔

"بمبئی میں کہاں ٹھہریں گے آپ؟"

"جن دوستوں اور عزیزوں کے گھر مجھے معلوم ہیں اس بار میں اُنکے ہاں نہیں ٹھہر رہا۔"

"تو کہاں جائیں گے پھر آپ؟"

"میں ایک ایسے دوست کے گھر جاؤں گا جسے میں بہت برسوں کے بعد مل رہا ہوں اور جس کا ایڈریس میری جیب میں ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے کملیشور کا خط اُس خاتون کی طرف بڑھا دیا۔ جس میں اُس نے اپنے گھر کا ایڈریس۔ وہاں تک پہونچنے کی ہدایتیں اور اپنا ٹیلیفون نمبر بھی دے رکھا تھا۔

"تو آپ کملیشور صاحب کے پاس ٹھہریں گے؟"

"جی۔"

"وہ آپ کو ریسیو کرنے آئیں گے اسٹیشن پر؟"

"آئیں گے تو سہی لیکن پانچ بجے۔ کیوں کہ میں نے لکھا تھا کہ ڈی لکس ٹرین ممبئی سنٹرل پانچ بجے کے قریب پہونچتی ہے۔"

"لیکن ٹرین تو ساڑھے تین بجے ہی پہونچ جائے گی۔ بس دادر کے بعد ممبئی سنٹرل ہی تو ہے۔"

"تو مجھے ذرا سمجھا دیجئے کہ میں اُن کے گھر کیسے پہونچ سکتا ہوں۔"

"میں بھی اُسی ایریا میں رہتی ہوں، آپ کو شمبر ساگر میں ڈراپ کرتی ہوئی آگے نکل جاؤں گی۔"

خاتون نے کملیشور کا خط مجھے لوٹا دیا جسے میں نے تہ کر کے دوبارہ جیب میں ڈال دیا۔
ٹرین بمبئی سنٹرل پر رُکی۔ تو میں نے اُسے کچھ دیر پلیٹ فارم پر رُک جانے کے لئے کہا۔ اس خیال سے کہ ممکن ہے کملیشور نے ٹرین ٹائمنگز کے بارے میں دریافت کر لیا ہو اور وہ خود یا صابر دت، اسٹیشن پر موجود ہو۔ لیکن اُن میں سے کسی نے بھی ٹرین کے پہونچنے کا صحیح وقت معلوم نہیں کیا تھا۔ کچھ منٹ پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر نگاہ ڈالنے کے بعد اُس خاتون نے بھی سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"تو آیئے ٹیکسی لیں اور چلیں۔ وہ لوگ تو پانچ ہی بجے آئیں گے۔"
میں اُس خاتون کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا اور جدھر جدھر سے ٹیکسی گزرتی گئی وہ مجھے گلیوں اور عمارتوں کے نام بتاتی رہی۔ صوفیا کالج روڈ کی طرف گھما کر ٹیکسی جب کچھ آگے پہونچی تو اُس خاتون نے ڈرائیور سے کہا۔

"بس بس بلڈنگ کے گیٹ کے اندر چلو۔"
ٹیکسی شنکر ساگر کے پورچ میں رُکی اور بلڈنگ کا چوکیدار ٹیکسی کے قریب آ گیا۔
"صاحب کو کملیشور جی کے فلیٹ میں لے جاؤ۔" اُس خاتون نے ٹیکسی سے باہر نکل کر میرا سامان نکلوا دیا اور بڑے ہی سلیقے سے آداب عرض کر کے دوبارہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔
"آپ بھی تشریف لایئے کچھ دیر کے لئے۔"
"میں اجازت چاہتی ہوں۔"
میں لمحہ بھر ٹیکسی کے اسٹارٹ ہونے کا انتظار کرتا رہا اور پھر چوکیدار کے ساتھ کملیشور کے فلیٹ میں آ گیا۔ اُس کے نوکر دلیپ نے دروازہ کھولا۔ میرا سامان اندر رکھا اور مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ معلوم ہوا کہ کملیشور تین بجے تک آنے کو کہہ گیا تھا اور اب آتا ہی ہوگا۔
اور پھر ڈرائنگ روم میں اکہرے بدن کی ایک مسکراتی ہوئی مہیلا داخل ہوئیں۔ یہ گائتری جی تھیں۔ کملیشور کی شریک حیات۔

"ہم لوگ تو کئی دنوں سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"
"جی ہاں آنے کی تاریخیں ہی ٹھیک سے طے نہ ہو پا رہی تھیں۔"
"لوبیا اور صابر آپ کو پانچ بجے اسٹیشن پر دیکھیں گے۔"
"خواہ مخواہ پریشانی ہوگی بے چاروں کو۔"
گائتری جی سے اس طرح کی گفتگو ہو رہی تھی کہ کال بیل گونجی۔ کملیشور آ گیا تھا۔
اُسی تپاک اور خلوص سے ملا جیسے وہ پہلی بار مجھے دہلی میں ملا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب وہ راج کمل میں نئی کہانیاں ایڈٹ کرتا تھا۔ کھدر کا کرتہ پاجامہ پہنے جب وہ مجھے لئے راج کمل کے دفتر پہونچا تو مجھے لگا تھا کہ کملیشور بڑا Stimulating آدمی ہے اور کھرا ہے اور پُرخلوص ہے اور بے باک ہے۔
دو تین برس پہلے اُس سے ساریکا کے دفتر میں ملا تھا۔ لیکن چند لمحوں کے لئے مجھے جانے کی

جا رہی تھی۔ کوئی ڈھنگ کی بات نہ ہو پائی تھی۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ فلمی دنیا میں آنے کے بعد کہیں وہ بدل نہ گیا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ اُس کی شخصیت میں کہیں سے کوئی جھول آ گیا ہو۔ اس لئے جب تک میں نے اپنا سامان اسی طرح پڑا رہنے دیا تھا۔ بلکہ ہاتھ منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ سوچا تھا کہ اگر پندرہ برس پہلے والا کملیشور اتنے لمبے سفر کے بعد کہیں دھول میں اٹا ہوا دکھائی دیا تو میں اُسے پہچان نہیں پاؤں گا۔ اور اگر اُسے پہچانوں گا نہیں تو پھر اُس کا مہمان کیسے بنوں گا۔ ایک دم چلا جاؤں گا۔ کسی ایسے عزیز دوست کے پاس جن کے گھر مجھے معلوم تھے اور جو مجھے پہچانتے تھے جن کے یہاں میں اس لئے نہیں ٹھہرا تھا کہ اس بار مجھے کملیشور ہی کے پاس رکنا تھا۔ مجھے لگا کملیشور میں تبدیلی آ گئی تھی۔ اس کے خلوص اور جذبات میں نہیں صرف جسم میں۔ ذرا بھاری ہو گیا تھا۔ وہ تو میں بھی بدل گیا تھا۔ یہ تبدیلی تو وقت کے ساتھ ہر شخص میں آنا قدرتی ہے۔ لیکن اُس پر لمحوں کی کوئی گرد نہیں جمی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ ویسی اُجلی، اُس کا خلوص ویسا ہی پیارا اور اُس کے احساسات ویسے ہی خوبصورت تھے۔ وہ جو ایک ذہنی تناؤ تھا مجھ میں ایک دم ری لیکس ہو گیا۔ میں نے جوتے اتار دیئے اور اپنے پاؤں ٹھنڈے فرش پر لگا دیئے۔ بڑے سکون کا احساس ہوا۔ ایک پیارا دوست مجھے کئی برسوں کے بعد مل رہا تھا۔

رات دیر تک، ادب، سیاست اور دوستوں کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ اُن دوستوں میں کچھ پرانے دوست تھے جن کے ساتھ کملیشور نے زندگی کے ابتدائی سال گزارے تھے۔ کچھ نئے دوست تھے جو اُس کے طویل ادبی سفر میں کسی نہ کسی ادبی موڑ پر اُس سے آ ملے تھے۔ پرانے دوستوں کی بات کرتے ہوئے اُسے الہ آباد کی دنیا اُس کا ماحول۔ وہاں کے دوست یاد آتے رہے اور اُن کے ساتھ اُسے اپنے پرانے قصبے کی یاد آتی رہی جہاں وہ پیدا ہوا تھا اور جہاں اُس نے بچپن اور لڑکپن کے دن گزارے تھے۔ وہ قصبہ مین پوری تھا۔ جب وہ مین پوری کا ذکر کر رہا تھا تو اس کی آنکھیں کہیں کھوئی کھوئی سی لگتی تھیں۔ جیسے اُس قصبے کی گلیاں، کنوئیں، مکتب سب اُس کے سامنے تھے۔ اور وہ لوگ جن کے درمیان وہ جیا تھا اور پروان چڑھا تھا اور دکھ درد جھیلے تھے اُسے یاد آ رہے تھے۔ وہ اُس سے بڑی عمر کے لوگ بھی تھے اور اُس کی اپنی عمر کے وہ دوست بھی تھے جو اُس کے چھوٹے چھوٹے غموں اور خوشیوں کے گواہ تھے جو اُسے اُس گاؤں کی دھرتی سے ملی تھیں اور جنہیں اُس نے درد کی ایک پوٹلی میں باندھ کر اپنے دل کے نہاں خانے میں چھپا لیا تھا۔ وہ اس پوٹلی کو پچھلے چالیس سالوں سے اپنی شخصیت کے اندر بڑی حفاظت سے رکھے ہوئے ہے اور جب اکیلے میں اندھیری راتوں کی چادر بچھا کر اُس پر رکھ کر یہ پوٹلی کھولتا ہے تو اُس کے ماضی کے لمحے چھوٹے چھوٹے کم قیمت والے سکوں کی طرح بکھر جاتے ہیں اور پھر وہ ہر سکے کو اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے سہلاتا رہتا ہے اور پھر دھیرے دھیرے سبھی سکوں کو دوبارہ اُسی پوٹلی میں باندھ کر اُسے دل کے اُسی نہاں خانے کے اندر چھپا دیتا ہے جہاں سے کچھ دیر پہلے اُس نے اُسے نکالا تھا۔ اپنے اُس گاؤں سے اُسے جنون کی حد تک لگاؤ ہے۔ کبھی کبھی تو وہ جنون کی اس حد تک پہونچ جاتا ہے کہ اُس کا جی شدت سے یہ چاہنے لگتا ہے کہ وہ مین پوری کی گلیوں، اُس کے کنوؤں اپنے گھر کی عمارت اور بازار کے جیتے جاگتے نقشوں کو اپنے فلیٹ کے کمروں میں آویزاں کر دے اور اُسے محسوس ہوتا رہے کہ بمبئی

جیسے اتنے بڑے شہر میں رہ کر بھی وہ اپنے اُسی قصبے کی زندگی گذار رہے جہاں اُس کی زندگی کا وہ دور گذرا ہو جسے اُس نے وہ کملیشور بنایا جسے لوگ اب جانتے ہیں۔ ورنہ تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ کملیشور تنہا ہی نہ صرف اپنے گھر میں پکارے جانے والا اکیلا شخص ہی بنا رہتا اور ان عام انسانوں کی طرح جیتا اور مرتا رہتا جو صرف مین پوری ہی میں نہیں، دہلی، لکھنؤ، کلکتہ، اور بمبئی میں بھی رہتے ہیں اور جیتے ہیں اور اچانک مر جاتے ہیں اور کسی کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ فلاں نام کا فلاں شخص کب کا مر چکا ہے اور اس کے گھر والے اُسے رو پیٹ چکے ہیں۔

کملیشور بہت چھوٹا تھا جب اُس کے والد کا انتقال ہو گیا۔ اُس کے والد جگدمبا پرشاد نے دو شادیاں کی تھیں اور کملیشور اُن کی دوسری بیوی کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا۔ بہن اُس کی کوئی نہیں تھی۔ اُس کے سب سے بڑے بھائی رامیشوری پرشاد الہ آباد میں ملازم تھے اور ان سے چھوٹا بھائی سدھارتھ جو ایک لحاظ سے مین پوری والے گھر میں کنبے کا سب سے بڑا فرد تھا اور کملیشور کو اُسی طرح سے ٹریٹ کرتا تھا۔ اُن کے گھر کی بیٹھک کی دیواروں پر پرانی تصویریں لٹکی تھیں۔ سدھارتھ کبھی کبھی کملیشور سے ان تصویروں کی بات کرتا جن سے اُن کے خاندان کی کہانی بنی تھی۔ ایک دن سدھارتھ نے اپنے والد کی تصویر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا تھا۔

”جانتے ہو یہ کون کی تصویر ہے؟“

”نہیں۔“

”یہ ہمارے باپو جی کی تصویر ہے۔ تمہیں کچھ یاد نہیں۔“

”نہیں۔“

واقعی کملیشور کو کچھ یاد نہیں تھا۔ اب اُس نے جانا تھا کہ سیلن سے خراب ہوتی جا رہی وہ تصویریں اُس کے کائستھ متوسط طبقے کے خاندان کی بڑی اہم کڑیاں تھیں اور پھر جب اُس کے دادا کی تصویر بے حد خراب ہونے لگی اور اگر کچھ وقت اور گذرتا تو اتنی خراب ہو جاتی کہ اُسے پہچاننا مشکل ہو جاتا تو سدھارتھ نے اُس تصویر کو اتار کر ایک نئی تصویر بنائی اور پھر اُس نئی تصویر کو پرانی تصویر کی جگہ لگا دیا۔ ایک نئی تصویر نے پرانی تصویر کی جگہ لے لی تھی۔ ٹھیک اُسی طرح جیسے نئی چیزیں پرانی چیزوں کی جگہ لیتی ہیں۔ نئی قدریں پرانی قدروں میں بدل جاتی ہیں اور نئے لوگ پرانے لوگوں کا مقام حاصل کر لیتے ہیں اور نئی نسلیں اپنے سے پہلے والی نسلوں کی جگہ پہونچ جاتی ہیں اور نئی پشتیں پرانی پشتوں کے نشانات پر اپنے نئے اور بلند جھنڈے گاڑ دیتی ہیں۔

مین پوری کے گھر میں اگر کچھ نہیں بدلا تھا تو کملیشور کی ماں شانتی دیوی تھی جو اُس گھر کی مالکن تھی اور جس پر ایک اُجڑی ہوئی گرہستی چلانے کی ذمہ داری تھی۔ وہ ایک ایسی ماں تھی جس کے دل میں ویسا ہی پیار تھا جو ہر عورت کے دل میں اپنی اولاد کے لئے ہوتا ہے اُس کی آنکھوں میں ایسے ہی خواب تھے جو ہر ماں کی آنکھوں میں ہوتے ہیں۔ وہ بھی کملیشور کو چھوٹی چھوٹی کہانیاں سنایا کرتی تھیں اور کہا کرتی تھی جب تم بڑے ہو جاؤ گے تو میری ان چھوٹی چھوٹی کہانیوں کو لمبی اور

طویل بنا کر لکھنا۔ جب بڑے ہو کر کملیشور نے اپنے ہی قصبے کے کرداروں اور ماحول پر کہانیاں لکھنا شروع کیں تو اس کی ماں نے ایک روز ہنستے ہوئے کہا۔

" یہ وہی کہانیاں تو ہیں جو میں تجھے سناتی رہتی تھی۔ مجھے معلوم تھا، کملیشور ایک دن ضرور کہانیاں لکھے گا۔"

جب کملیشور نے لکھنے کو ہی اپنا پیشہ بنا کر قلم کے ہتھیار سے پرانی قدروں اور اپنے ارد گرد پھیلی نفرت اور احتجاج اور ناانصافی کے اندھیرے کے خلاف لڑنا شروع کیا تو سب سے زیادہ خوشی اس کی ماں کو ہوئی۔ وہ یہ بھول گئی کہ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کملیشور کے لئے اچھے کپڑے بھی نہیں ملتے تھے۔ اور جب سدھارتھ کی اچانک موت ہو گئی تھی تو کافی عرصہ تک وہ سدھارتھ کے کپڑے پہنتا رہا تھا اور پھر ایسے بھی مواقع آئے تھے جب اُس کے سب سے بڑے بھائی مہیشوری کے کپڑوں کو تراش کر اُس کے سائز کے بنائے جاتے تھے اور گھر میں اس کی سلائی ہوتی تھی اور قمیصوں کے کالر غلط ہوتے تھے اور پاجامے بھی اونچے اور بڑے چھوٹے ہوتے تھے۔ کملیشور نے ایک مدت ایسے ہی کرتے پاجامے پہن کر مین پوری کے قصبے کے کرداروں کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا۔

کملیشور کی ماں یہ چاہتی تھی کہ کملیشور دسویں کے بعد آگے پڑھے چنانچہ وہ اپنے بڑے بھائی مہیشوری پرشاد کے پاس چلا گیا۔ اور انٹرمیڈیٹ کی سائنس کلاس میں داخلہ لیا۔ میں جب گائتری سے کملیشور کے بارے میں بات کر رہا تھا تو انہوں نے بتایا کہ کملیشور کو اپنے بھائی اور بھابھی سے بے حد عقیدت تھی۔ اور ان کے بچوں سے بے حد پیار تھا۔ اُس کے بھائی کو بچے پیدا کرنے کا بڑا شوق اور یہ شوق عمر کے ساتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔ اور زمانہ ایسا بھی آ گیا جب کہ سب سے چھوٹے لڑکے اور اُن سے بڑی لڑکی کی عمر میں صرف ایک ہی سال کا فرق رہ گیا تھا۔ حالانکہ اس سے پہلے بچوں کی عمروں میں چار اور تین اور دو سال کا فرق تھا۔ عمر کے ساتھ یہ گیپ گھٹتا گیا تھا۔ کملیشور اپنے بھتیجے بھتیجیوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ انہیں نہلاتا تھا۔ کپڑے پہناتا تھا۔ اور چھٹی کے دن اُن کی مالش کرتا تھا۔ میں نے ہنستے ہوئے گائتری جی سے کہا۔

" کملیشور کو مالش کا بہت شوق تھا؟"

" جی ہاں بچوں کی بہت مالش کرتے تھے۔"

" اُن کا ہاتھ بہت نرم ہے۔"

" آپ کو کیسے معلوم؟"

میرے اس سوال پر گائتری جی لجا گئیں۔ جیسے میں نے اُن سے پوچھ لیا ہو کہ کیا کملیشور نے اُن کی بھی مالش کی تھی۔ جب وہ میری بات پر شرما گئیں تو میں نے پوچھا۔

" کملیشور کی مالش کرنے کی عادت کیسے چھوٹی؟"

" مجھے معلوم نہیں؟"

کتنی معصومیت سے مسکراتی ہیں گائتری دیوی،

" تو میں بتاتا ہوں۔ اُس کی یہ عادت اب تک نہیں چھوٹی۔ جب اُس نے چھوٹے بچوں کی

مالش کرنا بند کر دی تو بڑے لوگوں کی مالش شروع کر دی۔"

"وہ کیسے؟"

ادب کے میدان میں جو لوگ اپنے آپ کو بہت بڑا مان سکتے تھے اور اندر سے کھوکھلے تھے کملیشور نے ان کو قبول نہیں کیا اور ان کی کھینچائی کی ہے یہی تو ہے مالش کا ریورس۔"

یہ ایک حقیقت ہے اور نئی ہندی کہانی کا سارا عمل اس بات کا گواہ ہے کہ کملیشور نے ادب کے کسی ازم کو نہیں مانا اور پرانی اور بوسیدہ پرمپراؤں کے اس سومنات پر ہمیشہ ہتھوڑے برساتا رہا۔ اس نے پرانے بتوں کو مسمار کرنے کی تحریک کے ساتھ نئے اور خوبصورت اور جاندار سانس لینے لوگوں کے ایک قافلے کو تشکیل دی اور وقت کے ساتھ ساتھ پچھلے ۲۵ سالوں کی مختلف ادبی تحریکوں نے ہندی ادب میں ایک نئی پیڑھی کو نئی قدروں کے نئے راستے پر گامزن کیا۔ کملیشور کا ہندی ادب کے میدان میں یہ ایک بہت بڑا کام ہے۔ یہ ٹھیک ہے اس سے کچھ لوگ اس کے ایک دم خلاف ہو گئے اور اپنی وہی پرانی بات کو نئے نئے زاویوں سے پیش کرنے لگے لیکن اس کے ساتھ نئے لکھنے والوں کا جو ایک پورا کارواں سامنے آیا وہ ایک سیلاب کی طرح پرانی راستوں کو بہا لے گیا اور پرانی بوسیدہ عمارتوں کے اوپر سے گذر گیا۔

الہ آباد سے جب کبھی وہ مین پوری اپنی ماں سے ملنے آتا تو اس کی ماں کو بڑے فخر کا احساس ہوتا۔ اس کا لڑکا اونچی تعلیم حاصل کرنے کے لئے الہ آباد گیا ہوا تھا اور وہاں سے وہ اونچی تعلیم حاصل کر کے کوئی بہت بڑا افسر بن جائے گا۔ اور اس کے گھر کی تصویر بدل جائے گی لیکن کملیشور کو جب انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں نقل کرنے کے جرم میں دو سال کے لئے کالج سے نکال دیا گیا تو اسے بڑا صدمہ ہوا۔ امتحان میں بیٹھے ایک امیدوار نے کملیشور کے پاس والے کینڈیڈیٹ کو ایک پرچی پھینکی تھی وہ اس تک نہ پہونچی تھی اور کملیشور کے قریب ہی گر پڑی تھی۔ نتیجے کے طور پر انوجی لیٹر نے کملیشور کو اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا اور اسے دو سال کے لئے کالج سے نکال دیا تھا اور وہ اس طرح سے ایک ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح کھیل کے میدان میں سے گھر لوٹ آیا تھا۔

اگر کملیشور امتحان سے نہ نکالا جاتا تو اس کی شادی ہو جاتی کیونکہ اس کی سگائی ہو چکی تھی۔ لڑکی کے والد نے یہ سگائی اس لئے توڑ دی کہ وہ امتحان میں نقل کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا۔ اگر اس کی شادی ہو جاتی تو جب تک وہ اپنی تعلیم مکمل کرتا اس کے دو تین بچے بھی ہو جاتے۔ اور وہ مکمل طور پر ایک گرہستی بن جاتا اور پھر یہی بوجھ ڈھوتا رہتا اور پھر شاید اسے اس جان توڑ بوجھ کا احساس نہ ہوتا جس سے اس کے ارد گرد جیسے مفلوک الحال لوگ کھینچے جا رہے تھے۔ ازدواجی زندگی کے بوجھ سے بچنے کا مطلب یہ ہوا کہ اسنے اپنے جیسے ہزاروں دوسرے انسانوں کا بوجھ بانٹنا شروع کر دیا جن کے دل میں بے شمار درد نہاں تھے ان کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ وہ چیخنا چاہتے تھے لیکن چیخ نہ سکتے تھے اور رونا چاہتے تھے لیکن ان کی آنکھیں بے نور تھیں۔ ان کے پاس چھوٹے آنگن تھے لیکن ان میں دھوپ نہیں تھی ان کے بچے تھے لیکن ان کے ہونٹوں پر کلیاں نہیں کھلتی تھیں۔ ان کی بیویوں کی مانگوں میں سیندور نہیں تھا

لیکن اُس میں سرخی نہیں تھی۔ اُس کی کلائیوں میں کانچ کی چوڑیاں تھیں لیکن وہ کھنکتی نہیں تھیں۔ وہ سب ایسے لوگ تھے جو زندہ تھے لیکن زندگی کی حرارت اور بہار سے محروم تھے۔ کملیشور نے ان محروم اور بدحالی لوگوں کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا اور انہیں یہ بتانے کی کوشش کی کہ ایک اچھی زندگی اور ایک خوبصورت مستقبل اُن کا حق تھا۔ وہ بھکاری نہیں تھے جن کی جھولیوں میں زندگی کی بھیک ڈالی جائے۔ وہ زندگی کے اوپر اتنی وسیع اور افق تک پھیلی ہوئی زندگی اُن کی تھی۔ کسی کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ اس زندگی سے انہیں محروم کرے اور انہیں عزت اور وقار سے جینے سے روکے۔

الہ آباد میں قیام کے دوران کملیشور انقلابی سوشلسٹ پارٹی کا بھی ممبر بن گیا اور اس طرح ادب کا سیاست سے وہ رشتہ جوڑا جس نے کملیشور سے راجہ نربنسیا "مُردے کی دنیا، قصبے کا آدمی، بھٹکے ہوئے لوگ۔ بے کار آدمی، قسم کی کہانیاں لکھوائیں۔ کملیشور کا یہ کہنا کہ اُس کے ہاں رومانی کہانیوں کی بے حد کمی ہے ———— دراصل رومانی کہانیاں لکھنے کے لئے جس قسم کا مزاج ہونا چاہیئے وہ کملیشور کے پاس نہیں تھا۔ فن کی ریاضت ہمیشہ رومان کے راستے میں حائل ہوئی۔ وہ عشقیہ کہانیاں تو نہ لکھ سکا لیکن عشق کے پیچ پیچ راستوں میں الجھ ضرور گیا۔ کالج کی تعلیم کے دوران میں بھی اسے اپنے بڑے بھائی کی سسرال سے تعلق رکھتی ہوئی ایک لڑکی سے عشق ہو گیا۔ وہ ایک اونچے گھرانے کی لڑکی تھی اور کملیشور متوسط طبقے کے ایک نچلی سطح کا نمائندہ۔ یہ طبقاتی دوری جذباتی قربت نے دور کر دی۔ لیکن یہ فاصلہ زیادہ دیر تک نہ ٹوٹ سکا۔ حسن کے جو تقاضے تھے اُنہیں پورا کرنا کملیشور کے بس کی بات نہیں تھی۔ اپنی محبوبہ کی آنکھوں کی جھیلوں میں تیرتے ہوئے خوبصورت خواب وہ دیکھ سکا لیکن اُن خوابوں کی تکمیل اُس کے بس میں نہیں تھی۔ لڑکی کا یہ اصرار تھا کہ وہ کہانیاں لکھنا چھوڑ دے اور کسی مقابلے کے امتحان میں بیٹھ کر پروانشل سروسز میں آجائے اور کہیں بڑا افسر بن کر تعینات ہو جائے۔ اُس کے پاس ایک اچھا مکان ہو۔ خدمت کے لئے نوکر ہوں۔ گھومنے پھرنے کے لئے گاڑی ہو اور ایک سنہری زندگی ہو۔ اسے یہ ادبی آوارگی پسند نہ تھی اور کملیشور اپنی اس صحرانوردی کو چھوڑنے پر راضی نہ تھا۔ اُس کے پاس دو ہی راستے تھے یا تو وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کے درد اور غم اور دکھ سے منہ موڑے اور ان سے اپنا رشتہ منقطع کرے یا پھر حسن اور عشق کی وادیوں میں گھومتا رہے اور کوئی سرکاری نوکری لے کر اپنا گھر بسا لے اور اپنے خاندان کے افراد میں اضافہ کرتا رہے۔ یہ ذہنی کشمکش شب و روز تک کملیشور کو کچوکتی رہی اور وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ اُس کے سامنے جو راستے تھے اُن میں سے کسے چنے۔ اُسے لگا جیسے جن لوگوں کے درمیان جی رہا تھا انہیں وہ نہیں چھوڑ سکتا۔ وہ غریب، محتاج، اور ضرورت مند عام لوگ جیسے اُس کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اور اُسے حسن و عشق کی حسین وادیوں کی طرف بڑھنے سے روک رہے تھے۔ اُسے محسوس ہوا کہ ان لوگوں کے تقاضے حسن اور پیار کے تقاضوں سے کہیں زیادہ اہم تھے۔ عشق تو وہ دوبارہ بھی کرے گا۔ لیکن ایک بار اگر اُس نے اس دھرتی سے اپنی جڑیں اُکھاڑ لیں جہاں سے اب تک اُسے جینے کے لئے تازہ خون مل رہا تھا۔ تو اُس کا وجود ہی ختم ہو جائے گا اور اُس کے وہ آدرش جنہیں وہ لے کر اتنی دور نکل آیا تھا مٹی کا ڈھیر ہو کر رہ جائیں گے۔

اور اُڑتی ہوئی کالی آندھیوں کے ریلے اس مٹی کے ذروں کو اڑا اُڑا کر جانے کہاں کہاں بکھیر دیں گے وہ زندگی بھر ان بکھرے ہوئے مٹی کے ذروں کو ایک جگہ اکٹھا نہ کر سکے گا اور ان میں اپنے پسینہ ملا کر اُسے گیلا کر کے اپنے احساس کی چاک پر گھما کر وہ سب کبھی تیار نہ کر سکے گا جو اس کی ذہنی اور دماغی ضرورتوں کی نشاندہی کر رہے تھے۔ آدرشوں کا ٹوٹ جانا پیار کے رشتے کے ٹوٹ جانے سے کہیں زیادہ جان لیوا تھا۔

چنانچہ اُس کے پیار کے کچے سوتی دھاگے ٹوٹ گئے اور وہ ان بندھنوں سے مکت ہو گیا۔ اس کی محبوبہ کی شادی ہو گئی اُسے جس قسم کا خاوند چاہیئے تھا اُسے مل گیا تھا۔ یہ بات دوسری تھی کہ اس سب کے باوجود اُس کے افسر خاوند کو بہت دنوں تک لگتا رہا کہ اس کی بیوی اب بھی کملیشور میں دلچسپی رکھتی تھی اور اُس کے بارے میں دوسروں سے پوچھتی رہتی تھی۔ کملیشور نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے بڑے کھلے گلے کی ہنسی ہنستے ہوئے بتایا کہ اُس افسر خاوند نے دھیرے دھیرے وہ سب عادتیں اپنے لئے پیدا کر لیں تھیں جو کملیشور میں تھیں اور جنہیں اُس کی محبوبہ پسند کرتی تھی۔ افسر خاوند نے کملیشور کی طرح چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھنا شروع کر دیں، سگریٹ پینے لگا اور شراب کی لت بھی ڈال لی۔ کتنا ظلم کر رہا تھا وہ شخص اپنی شخصیت کی عمارت ڈھا دینے میں۔

الہ آباد کے قیام کے دنوں میں اُس نے پریم چند کے آدرشوں کو تو قبول کیا لیکن اُس نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کہ وہ لوگ جو پریم چند کی پرمپراؤں کے دعوے دار تھے وہی ادب کی حقیقی خدمت کر رہے تھے۔ اُسے دات سٹائین کی نفرت یا تیت اور جلندر کمار کی بوسیدہ انفرادیت کو ماننے سے انکار تھا۔ وہ ڈنکے کی چوٹ کہتا تھا کہ اُس کا پریم چند وہ کھلے والا تھا جس نے اُسے ایک بار جب وہ راون جلانے کے بعد جلتے ٹوٹے بانس کی کھپچی سے پاؤں جلا کر آیا تھا تو کہا تھا۔

بیٹے اس دنیا کا کوئی باپ نہیں، چاہے جتنے راون جلاؤ۔ چاہے جتنے رام سجاؤ۔

اور یہ اُن دنوں کی بات تھی جب وہ اندھے کنوئیں میں جھانک کر اپنے مرحوم پتا کو آوازیں دیا کرتا تھا۔ اور اندھے کنوئیں میں سے اس کی اپنی ہی آواز گونج کر اُسے جواب دیا کرتی تھی۔ اُسے اپنے مرحوم باپ کی تلاش تھی جسے وہ ہر جگہ تلاش کرتا تھا اور اسی تلاش میں مارا مارا پھر تا رہتا تھا۔ لیکن اس کا مرحوم باپ اُسے نہیں ملا تھا اور اسی کھوج میں وہ اپنی شخصیت کے اندھے کنوئیں میں کود کر اپنے آپ کو تلاش کرنے لگا تھا اور اپنے آپ کو تلاش کرنا کتنا کرب انگیز ہے یہ وہی لوگ جانتے ہیں۔ جنھیں کبھی اس قلبی اور ذہنی کشمکش کے دور سے گزرنا پڑا ہو۔

اسی سفر اور تلاش میں اُسے وہ ساتھی ملے جو خود بھی نئی سمتوں کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اور وہ ساتھی تھے دشینت۔ جلندر، ادم پرکاش سرلواستو، مرکانت اجنیت، وریندر چندر کانت سمار کنڈے، ستیش پانڈے، پرکاش چندر گپت۔ آشا رام۔ بھارتی۔ رگھوونش۔ لکشمی کانت ورما۔ امرت رائے۔ اشک۔ بھیرو پرشاد گپت۔ بلونت سنگھ۔ شیکھر جوشی اور کئی دوسرے دوست۔

بس یہی دور تھا جب ادبی گھمسان لڑائیاں شروع ہوئیں اور ایک مدت تک

جاری رہیں۔ نئی کہانی تحریک۔ الہ آباد کا ساہتیہ کار سمیلن، ابھینو رنگ شیل پر چھہ اور پر گتی شیل لیکھک سنگھ کی گوشٹھیاں۔ دہلی۔ علی گڑھ۔ میرٹھ۔ چنڈی گڑھ۔ ناگپور اور کلکتہ کا کتھا کار سمیلن اور ان سب ادبی لڑائیوں میں کملیشور کے نئے ساتھی پوری شدت سے شامل تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اُس نے کھوئی ہوئی دشائیں، اپنے دیش کے لوگ، دلی میں ایک موت، ماس کا دریا، نیلی جھیل، کچھ نہیں ہے۔ بیمار شہر قسم کی بے مثال کہانیوں کی تخلیق کی۔

مین پوری اور الہ آباد کے درمیان کا سفر کملیشور کی ادبی زندگی کے لئے بے حد اہم ثابت ہوا۔ یہ عرصہ ایک ایسا سنگ میل تھا جس کے قریب کھڑے ہو کر کملیشور اپنی منزل کے کنارے کو پوری توجہ سے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنے راستوں اور منزل کا تعین کر لیا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو پوری طرح اس تحریک سے وابستہ کر دیا تھا جس میں ادب الگ الگ نہیں رہتے بلکہ دونوں کا وجود ایک دوسرے میں پوری طرح مدغم ہو جاتا ہے۔

الہ آباد میں گذری زندگی کملیشور کی منزل کا ایک بہت بڑا اہم سنگ میل تھا۔ اس سنگ میل کے ساتھ کھڑا ہو کر جب وہ اپنے آگے اور پیچھے دیکھتا تھا تو اس کے ذہن کی کیفیت ایک نو بیاہتا لڑکی کی طرح ہوتی تھی جو شادی کے بعد پہلی بار سسرال آئی ہو۔ اس کے پیچھے اس کا لڑکپن کھڑا آنکھ مچولی کھیل رہا تھا اور آگے ایک بھرپور زندگی اور اس کی رعنائیاں اور ذمہ داریاں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ کملیشور کے پیچھے اس کی مین پوری کی زندگی تھی جو اس کے کردار کی اساس ہے اور اس کے آگے وہ زندگی تھی جس کا بلیو پرنٹ وہ رات کی خاموشیوں میں بنایا کرتا تھا، ایک کامیاب اور ذمہ دار ادیب کا مستقبل۔ اور یہیں سے اس کے بڑے بھائی اور بھابی کے دماغ میں خیال آیا کہ اس کے پاؤں میں ویسی ہی بیڑیاں ڈال دی جائیں جو ان کے اپنے پاؤں میں تھیں۔ ازدواجی زندگی کی مضبوط بیڑیاں جن کو پہن کر بھی انسان اپنے آپ کو آزاد اور خود مختار سمجھتا ہے اور وہ اس کے جبر کو بھی بھول جاتا ہے جس کے خلاف کئی لمحوں میں بغاوت کرنے کی بھی سوچتا ہے۔ فانی بدایونی کا شعر کتنا لاجواب ہے حالانکہ اس نے اس میں زندگی کی مجموعی تصویر اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں　　　　ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

انسان انجانے میں کبھی اپنے پاؤں میں بیڑیاں ڈال لیتا ہے جنہیں اس نے خود تیار کیا ہوتا ہے۔ جو بجتی ہیں تو کبھی خوبصورت نغمہ لگتی ہیں اور کبھی محض شور سلاسل۔ کملیشور کے بھائی اور بھابھی نے بھی اس کے لئے ایسی ہی بیڑیوں کو تلاش کر لیا تھا۔ انھوں نے فتح گڑھ کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کی ایک لڑکی اس کے لئے چن لی تھی جس کا نام گایتری تھا۔ سگائی ہو گئی لیکن کملیشور کو شادی کی جلدی نہیں تھی سگائی تین سال تک لٹکی رہی اور کملیشور اس دوران میں کہانیاں لکھ کر گایتری پر رعب جماتا رہا۔ اس رعب کا پروسیس بھی عجیب و غریب تھا۔ کملیشور کہانیاں لکھتا رہتا اور اس کی بھتیجیاں یہ کہانیاں گایتری کو

بھیجتی رہتیں۔ گایتری ان کہانیوں کو پڑھتی اور سوچتی کہ اس کے ماں باپ نے جلنے اس لڑکے میں کیا دیکھ کر اس کی شادی کر ڈالی تھی۔ وہ تو جیسے زندگی کو سنجیدگی سے لے ہی نہ رہا تھا۔ بس ویسے ہی جئے جا رہا تھا جیسے اس سے اسے کوئی زیادہ سروکار نہیں تھا۔ اس کا ہونے والا شوہر اس قدر لاابالی اور بے نیاز ہوگا اسے یہ گمان نہیں تھا۔

تین سال کے اس تعطل کے بعد سن اٹھاون کے وسط میں شادی کی تاریخ طے ہوئی۔ اور دولہا میاں برات کے ساتھ فتح گڑھ پہونچ گئے۔ لیکن بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ ایک ادھیڑ عمر کے باراتی کو دولہا کی طرح سجا دیا گیا تھا اور وہ خود یوں گھوم رہا تھا جیسے وہ دولہا نہیں بلکہ ایک براتی تھا۔ دوپہر کے بعد اشتیاق کے طور پر لڑکی والوں کی طرف سے کچھ لوگ براتیوں کو چائے پلانے کے ساتھ ساتھ دولہا کو دیکھنے بھی آئے۔ کملیشور غائب تھا اور نقلی دولہا صاحب بن ٹھن کر چارپائی پر براجمان تھے۔ ستم ظریفی یہ کہ بڑی عمر کے ساتھ ساتھ اس کا ایک آدھ دانت بھی غائب تھا۔ وہ لوگ جب لڑکی والوں کے گھر واپس گئے تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ گائتری کا دولہا تو ایک بوڑھا آدمی تھا۔ ظاہر تھا کہ ان سے دھوکا کیا گیا تھا۔ اب گائتری کی یہ حالت کہ بے چاری ایکدم کاٹھ ہو گئی۔ کسی سے کہے بھی تو کیا۔ لیکن اس سارے واقعے کا ردعمل یہ ہوا کہ برات کے سواگت کے لئے جو تیاریاں ہو رہی تھیں اور سائبان تنک رہے تھے اور جھنڈیاں ٹانگی جا رہی تھیں اور روشنیوں کا انتظام ہو رہا تھا وہ سب رک گیا۔ یہ تو مسئلہ ہی دوسرا نکل آیا تھا۔ گایتری کے پتاجی بڑی پریشانی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے لڑکا خود دیکھا تھا اور پسند کیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ان سے دھوکا کیا گیا ہو۔ کملیشور کے بڑے بھائی بڑے شریف قسم کے آدمی تھے۔ ان سے تو ایسی توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی کہ انہوں نے کوئی غلط بات کی ہو۔ جھگڑا یہ تھا کہ رواج کے مطابق لڑکی کا والد جب تک برات ان کے گھر نہیں آ جاتی، نوشہ کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن یہاں تو سوال اُن کی لڑکی کی تمام زندگی کا تھا۔ رواج جائے بھاڑ میں۔ گایتری کے پتاجی نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خود اُس ریسٹ ہاؤس جائیں گے جہاں برات کے ٹھہرنے کا انتظام تھا اور لڑکے کو دیکھیں گے۔ اس سے پہلے گایتری کا بھائی بھی وہاں ہو آیا تھا۔ اس نے بھی بڑی حوصلہ شکن رپورٹ دی تھی۔ جب اس نے ریسٹ ہاؤس میں جا کر کسی براتی سے دولہا کے بارے میں پوچھا تو کہا گیا کہ وہ نہا رہا تھا۔ نہا تو کملیشور بھی رہا تھا لیکن وہ غسل خانے میں تھا اور جو نقلی دولہا تھے وہ ایک طرف بڑے اطمینان سے بالٹیاں لئے تسلی سے نہا رہے تھے۔ گایتری کے بھائی نے بھی اُس نقلی دولہا کو ہی دیکھا اور وہ بڑا مایوس اور دل برداشتہ ہو کر لوٹ آیا۔ سب کے حوصلے پست ہو گئے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ گایتری کے پتا خود جا کر تسلی کریں۔ وہ بے چارے بے حد پریشانی میں ریسٹ ہاؤس میں پہونچے۔ سب سے پہلے ان کی ملاقات کملیشور کے بھائی سے ہی ہوئی۔ اُن بیچاروں کی تو ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"کیلاش کہاں ہے بھائی صاحب؟" انہوں نے پوچھا۔

"وہ سامنے تو کھڑا ہے۔"

اور گایتری کے پیتا نے ذرا فاصلے پر درخت کے نیچے کھڑے کیلاش کو دیکھا جو کرتا پاجامہ پہنے بڑے اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔

وہ مسکرا دیئے۔

"اچھا مذاق ہے۔"

"کیوں؟"

"اور وہ نقلی دلہا صاحب کہاں ہیں۔"

"ارے صاحب کیا کہیں یہ چھوکرے تو نہ پوچھو کچھ انٹ شنٹ کرتے ہی رہتے ہیں۔"

گایتری کے والد خوش خوش گھر پہونچے۔ ان کی بات سن کر سارے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

گایتری بے چاری تو یوں جانیے مرتے مرتے بچی۔

"ایسے مذاق بھی کر لیتا ہے یہ شخص؟" اس نے یہ سوال اپنے آپ ہی سے کیا۔ کسی دوسرے سے نہیں پوچھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ جو مذاق زندگی نے اب تک کملیشور سے کئے تھے وہ تو اس سے کہیں زیادہ کڑے اور بے درد تھے۔

جب گایتری نے مجھے یہ قصہ سنایا تو مسکراتے ہوئے بولی۔ "جب برات ہمارے گھر پہونچ گئی تو میرے من میں پھر بھی دھڑکا لگا ہی رہا۔ میں نے کملیشور جی کے گلے میں جے مالا ڈالنے سے پہلے کنکھیوں سے دیکھ لیا کہ کہیں اس ادھیڑ عمر کے بے دانت والے نوشہ کے گلے میں تو جے مالا نہیں ڈال رہی تھی۔ بھائی صاحب مذاق کی بھی تو حد ہوتی ہے۔"

"مذاق کی کوئی حد نہیں ہوتی بھابھی۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ مذاق ہی کیا جس کی حدیں مقرر کر دی جائیں۔"

"یہی نہیں، اس کے بعد بھی تو حضرت بدلے کہاں۔"

"کیوں؟"

"ہم سوچ رہے ہیں کہ کملیشور صاحب ہمیں بڑے پیارے اور خوبصورت خط لکھیں گے اور وہ ہمیں بڑے الجھے ہوئے فلسفیانہ قسم کے خط لکھنے لگے، میری سمجھ میں خاک نہیں آتا تھا۔"

"ایسے کوئی خط ہیں آپ کے پاس؟" میں نے پوچھا۔ ہائے کتنی سادہ اور پرخلوص ہے یہ خاتون۔

"سب ایک رومال میں باندھ کر رکھے ہیں۔" یہ جواب دینے کے بعد وہ آپ سے آپ شرما گئیں۔

"ایک خط دکھایئے تو سہی۔"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں بھائی صاحب؟"

"یہ لکھنے والے کم بخت سبھی ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔ وہ بھائی ہوں یا بیٹے ہوں یا خاوند ہوں۔ ان سب کی برادری ایک ہی ہے۔"

اور پھر وہ خاموشی سے اٹھی اور گاڈریج کی آہنی الماری میں سے واقعی ایک پوٹلی نکال کر لے آئی۔ بہت سے پرانے خط اس نے یوں سنبھال کر رکھے تھے جیسے اپنے بہت ہی قیمتی زیور سنبھال کر رکھے ہوں۔

"لیجئے ایک خط کے اقتباسات آپ بھی پڑھیے۔ یہ غالباً دوسرا خط تھا جو کملیشور نے شادی کے کچھ دن بعد اگست اٹھاون میں گایتری کو لکھا تھا۔

"میں جب بھی سوچتا ہوں تو یہی لگتا ہے کہ میرے پاس ایسا کچھ بھی نہیں جس سے ایک ناری سنتشٹ ہو پائے۔ اور پھر یہ سماج کی دھارنا ہی ہے کہ ٹھیک ویر رتھ کے جیو ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی سہی ہے کہ ٹھیک ہی اپنے لہو کو سُکھا کر اس (سماج) کے لئے مرتا ہے۔ میں اپنی بات جانتا ہوں کہ میری زندگی میں ایسی کوئی خاص کمی یا دکھ نہیں تھا کہ میں اپنی بات کہنے کے لئے لکھنے کا کام شروع کرتا۔

لیکن میں اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے دُکھی اور دین لوگوں، ان کی بہت سی مجبوریاں اور اُداس چہرے نہیں دیکھ پایا۔ مجھے ہمیشہ ایسا لگتا رہا کہ میری چاروں طرف جو یہ لوگ ہیں، جن کے ساتھ میں اٹھتا بیٹھتا، کھیلتا اور ہنستا ہوں، یہ سب جھوٹی زندگی جی رہے ہیں۔ ان کی ہنسی کھوکھلی ہے۔ ان کے چہروں کی چمک بناوٹی ہے اور ان کے دلوں میں محرومی اور درد کا ساگر پچھاڑیں کھا رہا ہے۔

میں نے اسی کے لئے قلم اٹھایا اور اسی کے لئے پکڑے رہوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ جانیں کہ وہ کہاں ہیں اور ان کی حالت کیا ہے۔ اور جب انسان اپنی حالت جان لیتا ہے تو وہ اپنا راستہ خود کھوج لیتا ہے۔ شاید میں ایسا کرنے میں کامیاب ہو سکوں۔

یہ سب تمہیں اس لئے لکھ گیا کہ اب تم میری شریک حیات ہو۔ میرے ہر جذبے اور احساس کو جاننے لگی ہو۔ مجھے یہی سوچ کر کشٹ ہوتا ہے کہ میں تو ایسے دھونی رمائے ہوئے ہوں اور تم میرے ساتھ ابھی سے اس دکھ اور درد کے جنجال میں پھنس جاؤ گی۔ کاش میں تمہارے لئے وہ سب کر پاتا جو اور لوگ اپنی محبوباؤں کے لئے کرتے ہیں۔"

اب بتائیے جو شخص شادی کے بعد اپنی بیوی کو ایسے خط لکھنے لگے اس کے بارے میں کیا رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ ایسا شخص کتنا unpredictable ہو سکتا ہے۔

۱۹۶۰ء میں گایتری جی نے پہلی لڑکی کو جنم دیا وہیں مین پوری میں۔ ان کی طبیعت خاصی خراب رہی۔ لڑکی کی صحت بھی ٹھیک نہ رہی۔ وہ جلدی ہی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ لیکن یہ حضرت اُن دنوں بھی مین پوری جاکر اپنی بیوی اور بچی کی دیکھ بھال نہ کر سکا۔

کملیشور کو ۱۹۶۰ میں ٹیلی ویژن میں ملازمت مل گئی اور وہ دہلی چلا آیا لیکن یہاں بھی زیادہ دیر نہ ٹک سکا۔ اسی سال ملکہ ایلزبتھ ہندوستان آئیں۔ دہلی کو ملکہ کے استقبال کے لئے سجایا جا رہا تھا۔ بات جارج پنجم کے بُت کو سنوارنے کی تھی۔ معاملہ اس کی ناک پر اٹک گیا۔ کملیشور کے اندر کے ادیب کو ایک کہانی کا موضوع مل گیا۔ اس نے 'جارج پنجم کی ناک' کے عنوان سے ایک کہانی لکھ ڈالی۔ کہانی چھپی تو پوچھ تاچھ شروع ہوئی۔ معلوم ہوا کہ دہلی ٹیلی ویژن میں کام کرنے والے ایک ادیب کملیشور نے یہ کہانی لکھی تھی۔ سارا دفتر حرکت میں آ گیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ کملیشور کو نوکری سے نکالنے کا نوٹس دے دیا جائے۔ پیشتر اس کے کہ سرکار اسے نکالتی کملیشور نے خود استعفیٰ دے دیا اور پھر وہیں کا ہو گیا جو اس کا اصلی مقام تھا یعنی ترک سواد۔ لیکن ٹیلی ویژن میں کی گئی contribution تو آخر مسلمہ تھی ہی۔ چنانچہ اس نے contract Basis پر کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک تو آزادی قائم رہی' دوسرے آمدنی بڑھ گئی۔ اِنہی دنوں یعنی ۱۹۶۲ میں گایتری جی کے ہاں مین پوری میں دوسری لڑکی پیدا ہوئی۔ نام مانو رکھا گیا۔ اور پھر جانے کیسے کملیشور کو خیال آیا کہ اب اسے اپنی بیوی اور بچّی کو اپنے پاس ہی رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ نائی والان میں ایک مختصر سا مکان کرائے پر لیا اور گایتری اور مانو کو اہلِ دلی بنا دیا۔

کچھ عرصہ نائی والان میں قیام پذیر رہنے کے بعد کملیشور ساؤتھ ویسٹرن ایکسٹینشن ایریا میں اپنے دوست موہن راکیش کے پاس چلا آیا۔ اب ایک ہی گھر میں دو فیملیز رہنے لگیں۔ موہن راکیش اور اس کی ماں' کملیشور' گایتری اور ان کی بچی۔ ایک ہی رسوئی گھر میں دونوں کا کام چل جاتا تھا۔ دونوں دوست بڑے مست تھے۔ دونوں کی گاڑھی چھنتی تھی۔ لیکن جب دونوں کملیشور کے بھائی اور ان کے بچّے آ جاتے تھے اُن دنوں ایک رسوئی میں گذارہ کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ پھر دونوں دوستوں نے ایک اور مکان کرائے پر لے لیا۔ اوپر کے حصے میں راکیش اور انیتا رہنے لگیں کیونکہ پشپا الگ ہو گئی تھیں۔ نچلے حصے میں کملیشور اور اس کا مختصر سا کنبہ رہتا تھا۔ ان دنوں بحیثیت ادیب کملیشور نے اپنا اچھا خاصا مقام بنا لیا تھا اور اس کی تحریریں عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ چنانچہ اسے 'ساریکا' کو ایڈٹ کرنے کا پیش کش کی گئی لیکن راج کمل والے اوم پرکاش چاہتے تھے کہ کملیشور 'نئی کہانیاں' ایڈٹ کرے۔ اوم پرکاش خود کملیشور سے بات نہیں کر پا رہے تھے۔ ڈرتے تھے کہ اگر کملیشور نے انکار کر دیا تو سبکی ہوگی۔ چناں چہ اوم پرکاش نے یہ کام موہن راکیش کے ذمّے لگایا۔ وہ اُن دنوں شملہ میں تھا۔ اوم پرکاش کملیشور کو شملہ لے گئے۔ وہیں موہن راکیش کے کہنے پر اس نے نئی کہانیاں'

کی ایڈیٹرشپ آخر منظور کرلی اور 'ساریکا' کے جنرل مینیجر مسٹر رائے کو تار سے مطلع کردیا کہ اس نے 'نئی کہانیاں' جوائن کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

لیکن 'ایک چکر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں' والی بات۔ حضرت یہاں بھی نہیں ٹکے۔ 'نئی کہانیاں' بھی آخر چھوڑ دی اور ایک بار پھر فری لانسنگ شروع کردی اور ٹیلی ویژن کے لئے کام کرنا شروع کردیا۔ یہ زمانہ کملیشور کا خاصا تخلیقی زمانہ تھا۔ سمندر میں کھویا ہوا آدمی، دکھوں کے رشتے، یدھ، بیان، دہلی میں ایک موت وغیرہ اسی زمانے کی تخلیقات ہیں۔

موہن راکیش کے بعد جب چندرگپت ودیالانکار 'ساریکا' سے آگئے تو ایک بار پھر 'ساریکا' کی آفر کملیشور کو دی گئی۔ جو سہولیات اس نے مانگی وہ سب اسے دے دی گئیں اور ایک دن کملیشور اُس دہلی کو جس نے اس کے ساتھ پورے چھ سال نباہ کیا تھا، اچانک چھوڑ کر بمبئی آگیا۔ کہتے ہیں دہلی بے وفا ہے۔ کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔ تاریخ خود اس بات کی گواہ ہے۔ لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ کچھ لوگوں نے بھی دہلی سے بڑی بے مروتی کا سلوک کیا ہے۔ دہلی نے اپنی باہیں پھیلا کر جن کا سواگت کیا ہے وہ بھی وقت پڑنے پر اسے چھوڑ گئے۔ کملیشور نے بھی تاریخ کے ایک ایسے ہی سانحے کو دہرایا تھا۔ کملیشور دہلی کو چھوڑ تو گیا لیکن وہ اسے بھلا نہیں سکا۔ آج بھی اسے غالب اور ذوق کی دہلی یاد آتی ہے۔ اور آج بھی وہ مغلیہ خاندان کے آخری شہنشاہ کو بڑی محبت سے یاد کرتا ہے جو ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کا ایک مجاہد تھا۔ وارڈن روڈ پر صوفیہ کالج لین میں اسے وہی فلیٹ ملا جس میں موہن راکیش اور چندرگپت ودیالانکار رہ چکے تھے۔ خاصا بڑا فلیٹ تھا لیکن اس میں سامان تو کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ روز کے بعد گایتری بھی مانو کو ساتھ لیکر بمبئی آگئی۔ وہ کافی دنوں تک خود کو اکیلی محسوس کرتی رہی۔ دھیرے دھیرے کچھ سامان جُٹایا۔ کملیشور دونوں کو باہر گھمانے لے جاتا اور ان کا دل بہلانے کے بھی جتن کرتا لیکن فتح گڑھ اور مین پوری کی دھرتی میں پروان چڑھی گایتری بمبئی کی سنگ لاخ دھرتی میں اپنی جڑیں نہ گاڑ سکی۔ یہی حال کملیشور کا بھی تھا لیکن وہ اپنی بات اپنی بیوی سے کہتا نہیں تھا۔ وہ خود ہی تو بمبئی میں آیا تھا۔ کسی نے مجبور کر کے تھوڑی بھیجا تھا اسے۔ دونوں کے من کی حالت ایک جیسی تھی۔ گایتری اپنی حالت بیان کردیتی تھی، کملیشور چھپا لیتا تھا۔ سمندر کی لہریں، ناک بوس عمارتیں قدم قدم پر بکھری رنگینیاں! کوئی بھی چیز ان دونوں کو نہ لبھا سکی۔ کملیشور تو دھیرے دھیرے 'ساریکا' کی ذمے داریوں میں اُلجھ کر مصروف ہوگیا۔ لیکن گایتری کافی عرصے تک اُکھڑی اُکھڑی سی رہی۔ اُن دنوں کملیشور کے دوستوں کا سلقہ بھی بہت چھوٹا تھا۔ راج بیدی، گردھاری لال وید، دھرم ویر بھارتی، لے دے کے یہی تو دوست تھے جن سے اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا اور جو اس کے دکھ سکھ کے شریک تھے۔

گایتری کو اب لگ بھگ دس سال ہوگئے ہیں بمبئی میں رہتے ہوئے، لیکن وہ ابھی تک یہاں

کی زندگی سے سمجھوتہ نہیں کر سکی۔ بمبئی کی زندگی کے بارے میں بات کرتے ہوئے اس نے بڑے سے بڑا زبردست کومنٹ کیا

"بمبئی کی زندگی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے بھابھی ؟"

"ذاکر صاحب یہ بڑا کرُوال شہر ہے۔ کوئی کسی کے دکھ درد کو نہیں پہچانتا۔ مصیبت کے دنوں میں کوئی ساتھ نہیں دیتا۔" پھر گایتری نے اپنا ہی ایک واقعہ سنایا۔

سن ۷۴ میں کملیشور Slip Disc کے چکر میں پھنس گیا۔ یہ کتنی اذیت ناک بیماری ہے اس کا اندازہ مجھے اپنے کچھ دوستوں کو یہ کرب بھگتتے ہوئے دیکھ کر ہو چکا ہے۔ کئی ہفتوں تک کملیشور بے حد تکلیف میں رہا۔ شروع شروع میں دوست آتے رہے۔ حال چال پوچھتے رہے۔ پھر نوبت آئی کہ ٹیلیفون پر خیریت پوچھنے لگے اور باوجود وعدہ کرنے کے گھر نہ آئے۔ پھر دھیرے دھیرے ٹیلی فون پر پوچھنا بھی کم ہوتا گیا اور اس دوران اتنے بڑے اجنبی شہر میں گایتری اکیلی کملیشور کو سنبھالتی رہی۔ یہ واقعہ سنانے کے بعد اس نے کہا۔

"اس شہر میں آپ کو آپ کے دوست جب ملتے ہیں جب انہیں کوئی کام ہو، ورنہ مدتوں گذر جاتے ہیں دوستوں کی شکل دیکھے ہوئے۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ جوں جوں انسان ترقی کرتے کرتے اپنی عمارتوں کی منزلیں اونچی کرتا کرتا آسمان تک پہونچنے کی کوشش کرتا جا رہا ہے، دھرتی سے اس کا تعلق ٹوٹتا جا رہا ہے۔ ایک بہت بڑی عمارت میں سولھویں منزل کے ایک فلیٹ میں رہتا ہوا ایک کنبہ جب باہر بالکونی میں کھڑے ہو کر نیچے سڑکوں پر پیدل چلتے ہوئے لوگوں کو دیکھتا ہے تو اسے لگتا ہے جیسے چیونٹیوں کی ایک کبھی ختم نہ ہونے والی قطار آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی ہے۔ اتنی اونچائی سے دیکھنے والے آدمی کو انسان اور چیونٹی میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بالکونی کے باہر گملوں میں بڑے خوبصورت سدا بہار پودے اگا کر انہیں دن میں کئی بار سینچتا ہے ان کے پتوں پر دوائی چھڑکتا ہے۔ کبھی کبھی روئی کے نرم گالوں سے ان پر جمی گرد کے ذرّوں کو بھی صاف کرتا ہے لیکن اس کے اپنے فلیٹ میں کام کرتی ہوئی اس لڑکی کی طرف اس کا دھیان نہیں جاتا جس نے کمرے کے فرش کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنے سے اپنے گھٹنے بھی زخمی کر لئے ہیں اور اس کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی مسکراہٹ مر گئی ہے اور اس کی چولی اور اس کی اسکرٹ کئی جگہوں سے پھٹ رہی ہے۔ وہ اس پل پل سسکتی ہوئی زندگی سے بے نیاز ہے اور اس کی تمام تر توجہ بالکونی میں رکھے پودوں پر مرکوز ہے جن سے سماج کو مجموعی طور پر کوئی فائدہ نہیں۔

دنیا میں بڑے بڑے شہروں کے بسنے کی رفتار کے ساتھ ساتھ عام نوکروں کے دلوں کے اندر بسی ہوئی چھوٹی چھوٹی دنیا بھی اجڑتی جا رہی ہیں۔ ایک نیا شہر بستا ہے تو نہ جانے کتنی ہزار چھوٹی چھوٹی معصوم

دنیاؤں کی موت ہو جاتی ہے۔

بمبئی کی زندگی میں گایتری کو محسوس ہوا کہ اس خوبصورت جزیرے میں اس کے پاس کوئی ایسا بھی ہونا چاہیئے جس سے وہ مین پوری اور فتح گڈھ اور پھر الہ آباد کی باتیں کر سکے اور یہ بات یاد رکھ سکے کہ ان سات جزیروں کو جنہیں ایک دوسرے سے جوڑ کر ایک بہت بڑا بمبئی شہر بن گیا ہے، ایک آٹھواں جزیرہ بھی ہے، اس کا اپنے ماضی کا ٹاپو جس میں وہ سب لوگ جی رہے ہیں جن سے اسے اتھاہ محبت اور خلوص اور پیار ملا ہے۔ وہ جب تک بمبئی میں رہے گی اپنے اندر کے آٹھویں جزیرے کو آباد رکھے گی اور جب کملیشور کے بھائی صاحب کا لڑکا امیت جسے سب پیار سے پپو کہتے تھے، اس کے پاس بمبئی میں آ گیا تو گایتری کو لگا کہ اس کا اور کملیشور کا ماضی اپنی پوری تابناکی سے زندہ ہو گیا۔ امیت کا کملیشور سے بڑا ہی لگاؤ تھا۔ گایتری اور کملیشور کی زبردست خواہش کے باوجود اس نے تعلیم میں زیادہ دلچسپی نہ لی اور بڑی مشکل سے دسویں پاس کر سکا۔ جس روز امیت بمبئی سے گیا گایتری کملیشور اور مانو سب بے حد اداس ہوئے۔

اس دوران میں کملیشور کی ماتا جی کا بھی انتقال ہو گیا۔ وہ ان دنوں الہ آباد میں کملیشور کے بڑے بھائی کے پاس رہتی تھیں۔ ماں کی موت سے کملیشور کو بڑا صدمہ ہوا لیکن اس سے بھی زیادہ صدمہ گایتری کو ہوا کیونکہ زیادہ عرصہ تو اسی نے ماں کے ساتھ گذارا تھا جس نے اسے ہمیشہ اپنی لڑکی سمجھا اور بے حد پیار دیا۔ اب بھی گایتری جب کملیشور کی ماں کا ذکر کرتی ہے تو اس کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ کملیشور کو اپنی ماں سے جتنی محبت تھی گایتری کو اس سے اتنی ہی عقیدت تھی۔

عوام سے کملیشور کا جو رشتہ ان تمام گذشتہ سالوں میں جڑتا ہوا تھا وہ روز بہ روز مضبوط ہوتا جا رہا تھا۔ احساس اور خلوص کا یہ رشتہ جو اب تک صرف اس کے اپنے ملک کے لوگوں سے ہی قائم ہو تا رہا تھا اس میں ایک اور مضبوط کڑی جڑ گئی جب اسے مارٹن لوتھر کنگز فونڈیشن نے

"The Role of Inteluctuals in arousing the people of the country" کے سلسلے میں بیرونی ممالک کا دورہ کرنے کے لئے مدعو کیا۔ یہ اس کا پہلا فارین ٹور تھا اور وہ بہت خوش تھا۔ وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ بنگلہ دیش کے عوام نے آزادی کی جد و جہد میں کس بے جگری سے حصہ لیا تھا اور اس قومی جہاد میں بنگلہ دانشوروں نے کتنا بڑا رول ادا کیا تھا۔ ایک بڑی ہی روشن مثال اس کے سامنے تھی۔ ملکوں کی آزادی کی جد و جہد میں دانشور اور ادیب اور فنکار کتنا اہم رول ادا کرتے ہیں، دنیا کی تاریخ اس کی گواہ ہے اور ان کے ساتھ برسر اقتدار قوتیں کیا سلوک کرتی ہیں، تاریخ کے اوراق میں اس کی بھی گواہیاں ملتی ہیں۔ دانشور قوموں اور ملکوں کو آزاد کراتے ہیں اور وہی ملک اور قومیں ان کی سوچ پر پہرے بٹھاتے ہیں اور ان کے ہاتھ سے قلم چھین لیتے ہیں اور ان کی آنکھوں پر پٹی

باندھ دیتے ہیں۔ ایسا ہی ہوا ہے دنیا میں اور شاید ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

کملیشور نے اپنے اس دعوت نامے کا ذکر کرتے ہوئے بڑے شرارت آمیز انداز میں بتایا کہ ہوائی اڈے پر اس کے دوستوں کے علاوہ اس کے بھائی اور بھابھی بھی اسے سی آف کرنے آئے ہوئے تھے۔ گایتری بھی موجود تھی لیکن وہ بے چاری ایک طرف خاموش کھڑی تھی اور اس کی باری ہی نہ آرہی تھی کہ وہ بھی اس سے کوئی بات کر سکے۔ کملیشور بھی اس کی اس مجبوری کا مزہ لے رہا تھا۔ بے چاری کو مشکل سے لمحہ بھر ملا سکا کملیشور سے بات کرنے کو۔ من میں بہت سی باتیں تھیں لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ پائی۔

"ارے کچھ تو بولو، ہم تو تین مہینوں کے لئے باہر جا رہے ہیں۔" کملیشور نے شرارت سے کہا۔

گایتری اب بھی خاموش تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ ایک اور صاحب کملیشور کے قریب بڑھ رہے تھے تو جلدی سے اس کے کان میں کہا۔

"بے وفائی مت کر دینا مجھ سے۔"

یہ کہتے ہوئے اسے پسینہ آگیا اور کملیشور کا ایک بھرپور قہقہہ گونجا۔ لیکن یہ کسی کو معلوم نہ ہوا کہ میاں بیوی میں کیا بات ہوئی تھی۔

"کیا ردعمل ہوا اس بات کا تم پر یار؟" میں نے پوچھا۔

"سارا مزہ ہی کرکرا ہو گیا۔ جب بھی کسی ملک میں کوئی خوبصورت عورت ملتی اور اس سے قربت کا موقع ملتا، گایتری کی کپکپاتی آواز ذہن میں گونجنے لگتی۔

"تم جیسے گئے تھے ویسے ہی لوٹ آئے نا؟"

"گھر کے بدھو جو ٹھہرے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"لگتا ہے مبالغہ سے کام لے رہے ہو۔"؟

"ارے نہیں یار۔ ایک بار تو ــــ Electric Quilt میں ساتھ لیٹی لڑکی سے بھی زیادتی نہ کر سکا۔ پہلو بدل کر اس کے قریب ہو رہا تھا کہ گایتری جی کہنے لگیں "بے وفائی مت کر دینا مجھ سے" میں چت لیٹ گیا۔"

"لڑکی کیا سمجھی ہوگی؟"

"یہی کہ بے چارہ کام کا نہیں۔"

ہم دونوں نے بڑا بھرپور قہقہہ لگایا۔ اسی لمحے گایتری چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئیں۔

"کیا ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب کوئی پنجابی لطیفہ سنا رہے تھے۔"

کملیشور بَری ہو گیا اور الزام میرے سر دھرا گیا۔

ان تین مہینوں میں کملیشور دنیا کے بہت سے ممالک میں ہو کر آیا جن میں مصر، الجیریا، اٹلی، فرانس انگلینڈ، بیلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک، ناروے، پولینڈ، ویسٹ جرمنی، یوگوسلاویا، آسٹریا، گریس شامل ہیں۔ مقصد یہی تھا کہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ کسی ملک کے عوام کو اُبھارنے کے لئے دانشور کیا رول ادا کر سکتے ہیں اس کے بعد ہی کملیشور نے 'کالی آندھی' اور 'آگامی اتیت' ناول لکھے۔ ان دونوں ناولوں کو فلمایا جا چکا ہے اور دونوں فلمیں بڑی کامیاب رہی ہیں۔

سن ۷۶ میں کملیشور کو ماریشس میں دوبارہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار تو یوم آزادی کے موقع پر جن دنوں ہولی کا تہوار تھا۔ گایتری اور مانو بھی ساتھ گئیں۔ گایتری کا یہ پہلا فارین ٹور تھا۔ گایتری بھابھی نے اپنے اس بیرونی دورے کا بڑا لطف لے کر ذکر کیا۔

"وہاں سے کیا لائی تھیں آپ؟"

"چھوٹے چھوٹے پودے جو میں نے باہر برآمدے میں سجا رکھے ہیں۔"

ان میں ایک پان کے پتّے کی بیل بھی تھی۔ اس کا ایک پتّہ گایتری بھابھی نے توڑ کر مجھے کھلایا تھا۔ مانو بھی اس پر سے بہت خوش ہوئی تھی۔

دوسری بار کملیشور اگست ۷۶ میں دوسری ورلڈ کنونشن آف ہندی کے سلسلے میں ماریشس گیا تھا۔ جہاں ہندی کے ادیبوں کی خاصی بھیڑ تھی۔ لیکن اس بار وہ اکیلا ہی گیا تھا اور وہاں جا کر اسے اپنی مارچ کی وزٹ کا دھیان آتا رہا جب گایتری اور مانو بھی ساتھ تھیں۔ دراصل کملیشور کو مانو کا اوبسیشن obsession ہے۔ وہ جب تک دن میں کئی بار مانو سے پیار نہ کر لے اس کی تسلی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مانو کے بچپن کے دنوں میں کملیشور اپنے ذاتی مسئلوں کے کارن اور نامساعد اقتصادی حالات کی وجہ سے اس کی طرف بالکل دھیان نہیں دے پایا تھا۔ بچے کا پیار اس کی زندگی کی ایک بہت بڑی محرومی ہے۔ اب وہ اس محرومی کو پورا کرنے کے لئے بہانے تلاش کرتا رہتا ہے اور ایک پُرلطف بہانہ جو اس نے ان دنوں تلاش کر رکھا ہے وہ ایک پڑوسی گورے چٹے، گول مٹول بچّے چینٹو سے دل بہلانا ہے۔ وہ صبح سویرے ساتھ کے فلیٹ سے نکل کر کملیشور کے گھر آ جاتا ہے۔ پہلے گایتری کے پاس پہنچتا ہے پھر کملیشور کے پاس۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتے ہیں۔ شاید کوئی پرانے سنسکار ہوں۔

اُس روز چینٹو کے جسم پر سُرخ سُرخ نشان تھے۔ لگتا تھا کہیں کوئی انفیکشن ہو گیا تھا۔ گایتری بھابھی اسے اپنی گود میں لٹائے مرہم لگاتی رہی اور وہ اس طرح آرام سے پڑا رہا جیسے سنسار بھر کا سکھ

مل رہا ہو۔ پھر وہ گھنٹوں اسی گھر میں گذار کر تھوڑی دیر کے لئے چلا جاتا ہے اور جب مانو اسکول سے واپس آتی ہے تو اسے خود اس کے فلیٹ سے اٹھا کر لے آتی ہے۔ چنٹو نے کملیشور کے گھر میں بچے کے پیار کی جو کمی تھی اسے بڑی خوبصورتی سے پورا کر دیا ہے۔ مجھے لگتا ہے اگر حالات ایسے ہی رہے تو یہ خوبصورت گول مٹول بچہ اپنے اصلی ماں باپ کو بھی بھلا بیٹھے گا۔

میں نے جو پانچ سات دن کملیشور کے ساتھ گذارے اور اس کے گھر میں رہا اور اسے مختلف اوقات اور مختلف ماحول میں دیکھا تو مجھے لگا کہ کملیشور کی زندگی اب ایک سالم زندگی نہیں رہی، کئی خانوں میں تقسیم ہو گئی ہے یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اب وہ ایک ہی زندگی میں کئی زندگیاں جی رہا ہے۔ وہ ایک بڑے معیاری ہندی پرچے کا ایڈیٹر ہے۔ ایک کامیاب فلم اسٹوری رائٹر ہے۔ ایک اعلیٰ درجے کا کہانی و ناول نگار ہے اور ایک بہت اچھا شاوند اور ایک بہت ہی شفیق باپ ہے۔ اس نے دریا گنج سے بمبئی کا جو طویل سفر پچھلے پندرہ برسوں میں کیا ہے اس کے لئے بہت سے موڑوں میں سے گذرنا پڑا ہے اور ہر موڑ پر اس نے اپنے کچھ نشان چھوڑے ہیں۔ اس طویل سفر میں اس کی شریکِ حیات گایتری نے جس عزم اور حوصلے سے اس کا ساتھ دیا ہے اور وہ کس طرح آج بھی اسے سنبھالے ہوئے ہے اس کا اندازہ مجھے ان دنوں میں بڑی شدت سے ہوا جو میں نے کملیشور کے ساتھ گذارے ہیں۔ بقول کملیشور کے، "اگر کوئی مرد کسی عورت سے کوئی زیادتی کرتا ہے تو سب لوگوں کی ہمدردی اسے حاصل ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر ایک یا ایک سے زیادہ عورتیں کسی مرد سے زیادتی کرتی ہیں تو وہ کسی سے نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ اس سے اس کی مردانگی پر حرف آتا ہے۔ کملیشور کے ساتھ لگتا ہے عورتوں نے واقعی بہت زیادتیاں کی ہیں۔ اگر انہوں نے اس سے زیادتیاں نہ کی ہوتیں تو وہ ایسی کہانیاں کبھی نہ لکھ پاتا۔ جو آج بھی صرف ہندی ادب کا نہیں بلکہ کسی بھی زبان کا قابل قدر سرمایہ مانی جا سکتی ہیں۔ ہاں گایتری جی نے کملیشور سے جو زیادتی کی ہے وہ اس سے کوئی اور عورت نہ کر سکتی تھی۔ انہوں نے اسے زندگی کے وار سہنے پر مجبور کئے رکھا اور اسے زندگی اور انسانوں اور ان کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں اور غموں سے الگ نہ ہونے دیا۔ انہوں نے اسے زندگی کے ساتھ جکڑے رکھا اور اُن کے چہرے پر ہر لمحہ کھیلتی ہوئی مسکراہٹ اس بات کی گواہ ہے کہ کملیشور کی اپنی زندگی کے ٹکڑے پہلے ہی ہو گئے ہوں لیکن اس نے زندگی کی عظمت اور سالمیت کو پوری طرح برقرار رکھا ہے۔ زندگی کی تعمیری قدریں آج بھی اس پر فخر کر سکتی ہیں۔ وہ آج بھی بمبئی میں اپنے گھر کی بیٹھک میں لگی دھندلی تصویروں پر سے گرد جھاڑ رہا ہے کہ وہ ماضی کے اُن لمحوں کو زیادہ سے زیادہ روشن کرے۔ اور ایک خوشگوار مستقبل کے حصول کے لئے پُر عزم جد و جہد جاری رکھے جس کا آغاز اس کے مرحوم بڑے بھائی سدھارتھ نے اپنے بابا کی نئی تصویر بنا کر کیا تھا اور پُرانی تصویر کی

جگہ نئی تصویر سجا دی تھی۔ کملیشور پچھلے پچیس برسوں سے اپنی اسی جد و جہد میں مصروف ہے اور مصروف رہے گا جب تک کہ مین پوری کے چھوٹے سے قصبے میں دیکھے ہوئے اس کے خوابوں کی تعبیر نہیں مل جاتی۔

کملیشور کی اپنی زندگی بھی بذات خود ایک تحریک ہے۔

اس کی ازدواجی زندگی اور ادبی زندگی بالکل دو متوازی تحریکوں کی طرح چل رہی ہیں۔ ایک اس کے گھر کے اندر چلنے والی تحریک کی غماز ہے۔ دوسری تحریک وہ ہے جو اس کا قلم اور اس کا ذہن اور اس کی تخلیقات چلا رہی ہیں۔ ان دونوں میں اگر کہیں بھی کوئی اختلاف ہو جاتا یا کراس کرنٹ (Cross Currant) چلنے لگتی تو دونوں کو نقصان ہوتا۔ ایک طرف اس کی گھریلو زندگی میں انتشار آ جاتا اور دوسری طرف اس کی ادبی زندگی کو نقصان پہنچتا۔ چونکہ یہ دونوں تحریکیں متوازی انداز سے چل رہی ہیں اس لئے ان میں کہیں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا اور دونوں گاڑیوں کے مسافر بخیریت اپنا اپنا سفر جاری کئے ہوئے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کملیشور کی ہندی ادب کو سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس نے اس میدان میں نئے نئے لکھنے والوں کو لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی یہ کوشش تب سے جاری ہے جب سے اس نے نئی کہانیاں کو ایڈٹ کرنا شروع کیا تھا۔ اس زمانے میں لکھنے والوں کے کچھ نئے نام جو ہندی ادب میں آئے اور جنہوں نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنا ایک مخصوص مقام پیدا کر لیا اُن میں گیان رنجن، دودھ ناتھ سنگھ، مہندر بھلہ، گیری راج کشور، گنگا پرشاد جوہل اور رویندر کالیہ قابل ذکر ہیں۔ کملیشور کا یہ کارنامہ بڑا ہی قابل تعریف ہے کہ اس نے جہاں بھی کہیں ذہانت کی چنگاری دیکھی اسے فوراً شعلہ بنا دیا۔ ادب میں ڈھک ڈھک کر جلنے سے دھواں تو پیدا ہو سکتا ہے لیکن روشنی نہیں۔ جس ماحول میں ہم جی رہے ہیں وہاں دھواں پہلے ہی اتنا زیادہ ہے کہ اس میں مزید کسی اضافے کی ضرورت نہیں۔ حبس اور دھواں اور گھٹن تو وہ روایات ہیں جن میں کملیشور خود پروان چڑھا تھا اور جس کے خلاف اس نے آواز اٹھائی تھی اس لئے اسے تو روشنی کی ضرورت تھی اور الاؤ کی ضرورت تھی اور مشعلوں کی ضرورت تھی اور جب اسے کہیں بھی کوئی ایسا شخص نظر آیا جو اس کام کا اہل تھا اس نے اسے اپنے قافلے میں شامل کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ سفر پر چلا تھا تو اکیلا تھا اور آج اس کے ساتھ ایک پورا کارواں ہے اور اس کارواں کے ہر ایک فرد کو منزل کی چاہ ہے۔ اس نے امیر کارواں بننے کی کوشش نہیں کی۔ اور یہی اس کا بہت بڑا کام تھا۔ ورنہ تو لوگ صرف قافلہ سالار کو ہی پہچانتے اور قافلے والوں سے بے نیاز ہو جاتے۔ شخصی اقتدار اور شہرت کا یہ جو موہ ہے وہ ہر ایک تحریک کے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

جب یہ موہ سیاست میں آجاتا ہے تو آمریت کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور ادب میں آجائے تو شخصیت پرستی بن جاتا ہے۔ آمریت اور شخصیت پرستی جمہوری قدروں سے قطعی منافی ہے۔ اس لئے ایک ایسا ادیب جو جمہوری قدروں کا پرستار ہو اور انہی قدروں کا پیامبر ہو ایسی قوتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا جن کا مقصد ذاتی ملکیت ہو۔ ادب میں ذاتی ملکیت نام کی کوئی شے نہیں اور نہ ہی اس کی گنجائش ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ ادیب میں اپنی ایک انا ہے اور وہ زندگی بھر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ جب بھی کسی شخص میں ادیب بننے کی صلاحیت جاگنے لگتی ہے تو خدا اسکے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہہ دیتا ہے

'تم بہت بڑے ادیب ہو، دنیا کے کسی ادیب کو خاطر میں نہ لانا'۔

اور ادیب تمام زندگی خدا کے دیے ہوئے اس حکم کی تعمیل کرتا رہتا ہے اور اپنے خلاف ایک محاذ پیدا کرتا رہتا ہے جس کی وجہ سے کبھی کبھی اس کی اپنی ذہنی اور ادبی ترقی بھی رک جاتی ہے۔

کسی نے ایک بڑا خوبصورت سوال کیا تھا ایک بار۔

"اتنی تخریبی قوتوں کے باوجود دنیا کیسے قائم ہے؟"

جواب اس سے بھی زیادہ دلچسپ تھا:

"جب تک شیروں میں تساہل ہے، اور سانپ اپنے بلوں میں دبکے بیٹھے ہیں اور پنڈت آپس میں لڑتے جھگڑتے رہیں گے، دنیا قائم رہے گی"۔

ایسا کسی مذہبی کتاب میں لکھا ہے۔ چونکہ میں زیادہ مذہبی آدمی نہیں اس لئے مجھے ٹھیک حوالہ یاد نہیں لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہاں پنڈت کا مطلب ودوان لوگوں، دانشوروں، ادیبوں شاعروں اور لیکھکوں سے ہے۔ اور یہ قبیلہ کبھی آپس میں مل کر نہیں بیٹھتا۔ یہ لوگ اپنے الگ الگ ازم لے کر نئے نئے نعرے لگاتے ہیں اور اس آپسی ٹکراؤ سے ادب کو نئے نئے موڑ ملتے ہیں اور ادب میں نئی قدروں کا اضافہ ہوتا ہے اور نئے لکھنے والے لوگ سامنے آتے ہیں۔

کملیشور نے سامانتر تحریک چلا کر کچھ اسی قسم کا کام کیا ہے۔ میرا اپنا نظریہ ہے (شاید اس سے کچھ لوگوں کو اختلاف بھی ہو) کہ ہندی کا پندرہ روزہ میگزین 'ساریکا' اور سامانتر تحریک بھی ایک دوسرے کے معاون اور مددگار ہیں۔ جیسے سامانتر تحریک ایک آل انڈیا تحریک ہے اسی طرح ساریکا بھی ایک طرح سے سارے ہندوستان کا پرچہ ہے اور اس میں سبھی زبانوں کے ادیب لکھتے ہیں۔

یہ امر بڑی دلچسپی کا باعث ہے کہ سامانتر تحریک کی داغ بیل سن ۷۰ میں ڈالی گئی تھی اور اس کی پہلی کانفرنس بھی بمبئی ہی میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہر سال دسمبر کے آخر میں اس تحریک کی کانفرنس آرگنائز کی جاتی رہی۔ دوسری کانفرنس کانپور (یو۔پی) میں، تیسری مانڈو (مدھیہ پردیش) میں، چوتھی کالی کٹ (کیرل) میں، پانچویں

فن اور شخصیت

راج گیر (بہار) میں اور چھٹی کانفرنس انجر (کچھ) میں دسمبر ۷۶ میں ہوئی۔ ان کانفرنسوں میں سبھی نئے لکھنے والے ادیب شامل ہوتے ہیں اور مختلف زبانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ڈیلی گیٹس اپنا کرایہ خرچ کرکے کانفرنس میں شریک ہوتے ہیں۔ صرف میزبان اسٹیٹ ان کے کھانے پینے کا انتظام کرتی ہے۔ ان کانفرنسوں میں کوئی مصنوعی پن نہیں ہوتا، کوئی آڈمبر نہیں ہوتا۔ اس کا افتتاح کرنے کے لئے کسی سیاسی لیڈر کو نہیں بلایا جاتا۔ اور نہ ہی اس کے اختتام پر کسی ایسی شخصیت کو مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ کانفرنس خالص ادبی ہوتی ہے اور اس میں دانشور اکٹھے ہوکر لکھنے والوں کے مسئلوں اور ان علاقوں کے ادبی مسئلوں پر بات چیت کرتے ہیں جن سے ادیبوں کا سیدھا تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً کچھ کے علاقے میں Intensive Study in Villages پر رپورٹ پبلش کی گئی۔ ادیبوں کے لئے یہ بہت ہی اچھا موضوع تھا۔ سامانتر تحریک کی کانفرنسوں میں شامل ہونے والے ادیب اپنی اپنی کہانیاں بھی پڑھتے ہیں جنہیں بعد میں کتابی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس وقت میرے سامنے اس قسم کا کوئی مجموعہ نہیں ہے ورنہ میں ان کہانیوں اور ان کے تخلیق کرنے والوں کے بارے میں کچھ لکھتا۔

'ساریکا' اور 'سامانتر تحریک' کی وساطت سے جو نئے ہندی ادیب سامنے آئے ان میں ابراہیم شریف، کاشی ناتھ، جتندر بھاٹیہ، سدھا اروڑہ، مدھوکر سنگھ، سُدیپ، دامودر سدن، رام اروڑہ، پرویدلانی، منیش رائے یادو، دُھرم کیتو، جواہر سنگھ، پربھو جوشی، عالم شاہ خان، سہاش پنت اور ہمانشو جوشی جیسے دوستوں کے نام قابل ذکر ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ دوسری زبانوں کے بھی کچھ نئے لکھنے والے اپنے اپنے روشن پیغام اور فن اور تکنیک کے نئے نئے تجربے لے کر آئے اور 'ساریکا' نے ان سب کا استقبال کیا۔ پچھلے پانچ سات برسوں میں دوسری زبانوں کے جو ادیب سامنے آئے ان کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اپنے اس جائزے میں سبھی نام شامل کرسکا ہوں لیکن جو نام مجھے یاد ہیں اور جن زبانوں میں وہ لکھتے ہیں ان کا ذکر کررہا ہوں۔

اڑیا میں ڈاکٹر کے۔ پی۔ مصرا اور شانتنو آچاریہ

تامل میں شوری راجن

آسامی میں نوارن ورما

پنجابی میں رام سروپ انکھی اور جسونت سنگھ وردھی

ملیالم میں ٹی واسوین نایر اور کنج عبداللہ

بنگلہ میں سمتوش بسو

تیلگو میں ایلشور نکلیشور، پچیری بنڈراجو اور جوالا مکھی

مراٹھی میں بابوراؤ باگل، دیا پوار، ارجن ڈانگے، نام دیو ڈوسال اور ستیش کالسیکر

گجراتی میں چندر کانت بخشی اور راجیہ سورتی

کچھی میں شمبھو بھائی پاندی، تمبو پاندھی اور روپا ریلی

ڈوگری میں چھتر سال اور ہاوم گوسوامی

کشمیری میں ہری کشن کول اور علی محمد لون

اتنی ڈھیر ساری زبانوں کے نئے ادیبوں کو ایک مرکز پر لے آنا کملیشور کا ایک قابل ستائش کارنامہ ہے۔

کملیشور سے جب میری بات ہوئی اور میں نے پوچھا کہ سارا نتر تحریک کا سب سے بڑا مقصد کیا ہے، تو کملیشور نے ایک سلجھے ہوئے ادیب کی طرح جواب دیا:

"انڈین لٹریچر کے کانسپٹ (Concept) کو واضح کرنا"

"آپ لوگوں کو اس کی ضرورت کیوں پڑی؟" میں نے پوچھا۔

"سب زبانوں کے ادب کے علاوہ ایک ہندوستانی ادب بھی ہے۔ دراصل اسی ادب کی بنیادی قدریں سبھی زبانوں کا احاطہ کئے ہوئے ہیں"

"بھائی اپنی بات ذرا اور صاف کرو"

"ہندی، آسامی، پنجابی، اردو، ڈوگری، کشمیری کا ادیب اپنی زبان کا ادیب ہوتے ہوئے ہندوستانی بھی ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے ذہن میں یہ بات صاف ہو کہ مجموعی طور پر سبھی ادیبوں نے ہندوستانی کلچر اور تہذیب اور روایات کو سلامت رکھنے کے لئے بھی جدوجہد کرنی ہے"۔

"یہ جو تھرڈ ورلڈ کے لٹریچر کی آجکل بات ہو رہی ہے، اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"ترقی پذیر ملکوں کے کلچرل ورثے کو زندہ رکھنے اور مضبوط بنانے کے لئے یہ ایک بہت اہم قدم ہے۔" یہ تھا کملیشور کا جواب۔

مجھے اندازہ ہوا کہ کملیشور کی نظر صرف ہندوستان کی مختلف زبانوں کے فن کاروں پر نہیں بلکہ اس کی نظریں اس ادب کا بھی جائزہ لینے کو بے قرار ہیں جس کی تخلیق دوسرے ممالک میں ہو رہی ہے۔ کوئی بھی ادیب جب کوئی کہانی یا ناول لکھتا ہے تو بنیادی طور پر اس کے سامنے وہی کردار ہوتے ہیں جو کہ اس کے ارد گرد سانس لے رہے ہیں۔ وہی مسئلے ہوتے ہیں جو اس کے کرداروں کو خاص سچویشنز (situations) میں پیش آتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے ٹریٹ منٹ (Treatment) سے ایک ٹاپیکل (Topical) موضوع کو بھی اتنا مضبوط اور جاندار بنا دیتا ہے کہ اس کی اپیل ہمہ گیر ہوتی ہے۔ بہت سے مشہور وار ناولز (War Novels) ٹاپیکل ہونے کے باوجود آج ہمہ گیر شہرت کے مالک ہیں کیونکہ انہیں تخلیق کرنے والوں کے ذہن میں صرف ان کا ملک اور اس ملک کے سپاہی اور اس ملک کی آزادی ہی نہیں تھی بلکہ ان کے سامنے بہت وسیع دنیا کا ایک ہارا ہوا

انسان تھا جسے زندگی سے محبت ہے اور جو امن اور سکون اور آزادی سے جینا چاہتا ہے۔ اسی لئے تو 'For whom the Bell tolls' کا آغاز ہیمنگ وے نے جان ڈن کی ان سطور سے کیا تھا:

Any man's death diminishes me,
becaouse I am involved in Mankind;
and therefore never send to know for whom the bell tolls;
It tolls for thee.

بمبئی کے ساتوں جزیروں کو ملا کر ایک کر دینے والے سمندر کی طرح بمبئی شہر بھی بہت وسیع اور عمیق ہے اور اس شہر کی خشکی میں بھی ایک سمندر ہے فلم انڈسٹری کا سمندر، جس کی اوپر کی سطح کبھی ایکدم خاموش ہو جاتی ہے اور کبھی اس میں لاکھوں طوفانوں کی گھن گرج پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی لہروں میں کئی چھوٹی بڑی کشتیاں الجھ کر اپنا وجود ہی کھو دیتی ہیں۔ جس طرح بمبئی شہر نے غریب سے غریب اور امیر سے امیر انسان کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے، اسی طرح وہاں کی فلم انڈسٹری نے بھی کئی چھوٹے بڑے فن کاروں اور ادیبوں اور ایکٹروں اور ایکٹریسوں اور اس سے وابستہ سیکڑوں لوگوں کو اپنے حلقے میں لے لیا ہے۔ اور اکثر لوگوں نے اس سمندر کے پانیوں میں نہ صرف اپنی شخصیت، وقار اور قدریں ہی تحلیل کر دی ہیں بلکہ اپنے فن کو بھی ان کے حوالے کر دیا ہے۔ میرے سامنے ایسے کتنے ہی ادیب اور شاعر ہیں جو فلم انڈسٹری کے سمندر کی لہروں کو اپنے وجود کے اوپر اوڑھ کر سو گئے ہیں۔ اب وہ کبھی کبھار ہی ادب کے لئے لکھتے ہیں اور دوسروں کو احساس دلاتے ہیں کہ وہ اب بھی کئی برس پہلے والے فنکار اور شاعر ہیں؛ ورنہ تو وہ اکثر وہ کچھ لکھتے ہیں جس کا تعلق نہ ادب سے ہوتا ہے نہ فن سے، صرف سستی قسم کی تفریح سے ہوتا ہے جو سستے قسم کے آدمیوں کو ہی مرغوب ہوتی ہے۔ کچھ ادیب ایسے بھی ہیں جو الجبرے کے ایک فارمولے کے مطابق فلموں کے لئے لکھتے ہیں اور ادب کو اسی فارمولے میں فٹ کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے بظاہر کئی بہت ہی کامیاب ادیب ہیں جنہیں فلمی ادیب کہا جا سکتا ہے۔ روایات، قدروں اور اصولوں کے ادیب نہیں۔ ان کے فلمی ادب کے کارن ان میں سے کسی کا بھی نقصان ہوتا ہو اس سے انہیں کوئی سروکار نہیں اور فلم انڈسٹری کے ایکس پینڈ (Expend) ہونے سے ایسے ادیبوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے اور اسی حساب سے ان کا فنی معیار بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن اب بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جنہیں اپنی فنی ذمہ داری کا احساس ہے اور وہ اس بات میں بھی یقین رکھتے ہیں کہ فلم انڈسٹری صرف ایک ٹکسال گھر نہیں بلکہ ایک

فن کدہ بھی ہے۔ اس گروہ میں گنتی کے کچھ ادیب، کچھ ڈائریکٹر، کچھ ایکٹر اور کچھ میوزک ڈائریکٹر بھی ہیں۔ یہ گروہ بہت بڑی اقلیت میں ہے اور اسی لئے آرٹ فلمیں بھی بہت ہی تھوڑی تعداد میں بنتی ہیں۔

ادیبوں کے اس چھوٹے سے گروہ سے تعلق رکھنے والا ایک ادیب کملیشور بھی ہے جسے فلمی دنیا میں آئے زیادہ برس نہیں ہوئے لیکن اس نے اپنی فنی ریاضت اور اپنی تخلیقوں کے معیار سے اپنے لئے ایک مخصوص مقام پیدا کر لیا ہے۔ جب کملیشور نے فلمی دنیا میں دلچسپی لینا شروع کیا تھا اس وقت بمبئی میں ایک ادارہ فلم فورم کے نام سے بنا تھا جو صرف آرٹ فلمز ہی دکھاتے تھے۔ اس فورم سے تعلق رکھنے والے ارون کول اور باسو چیٹرجی تھے۔ اسی زمانے میں جہانگیر آرٹ گیلری اور سماوار ریسٹورنٹ میں اس فورم سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اکٹھا ہوتے تھے۔ اور ان میں پینٹر بھی تھے ادیب بھی تھے اور نئے ڈھنگ کی فلمیں بنانے کا ارادہ رکھنے والے ڈائریکٹر بھی تھے۔ خوب طویل بحثیں ہوتی تھیں۔ موضوع صرف آرٹ ہوتا تھا اور اس سے تعلق رکھنے والے دوسرے شعبے۔ ان بحثوں میں بنگال کے مرنال سین بھی شامل ہوتے تھے اور پونہ فلم انسٹی ٹیوٹ سے ٹریننگ لیکر آئے ہوئے نئے نئے ڈائریکٹر بھی شرکت کرتے تھے۔ منی کول، کمار شاہنی اور ونے شکلا کے نام قابل ذکر ہیں۔ کملیشور اسی گروپ سے متاثر ہوا اور فلم انڈسٹری میں جو قدریں یہ گروپ لانا چاہتا تھا کملیشور بھی ذہنی طور پر انہی سے مطابقت رکھتا تھا۔ شاید اسی لئے جب کملیشور نے فلمی دنیا میں قدم رکھا تو وہ بھٹکا نہیں۔ اس کے سامنے جو ایک سوچا سمجھا ہوا راستہ تھا وہ اسی پر چلا۔ اس نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا کیونکہ اس کے سامنے مقصد روپیہ اکٹھا کرنا نہیں فن کی خدمت کرنا تھا۔

انہی دنوں باسو نے راجندر یادو کے ناول 'سارا آکاش' پر فلم بنائی جس کے اسکرپٹ پر کملیشور نے کام کیا۔ پھر اس کے ناول "بدنام بستی" کو فلمایا گیا۔ اسی زمانے میں شیوّن سہانے "پھر بھی" فلم بنائی۔

"لیکن تمہیں دراصل کس فلم سے کمرشیل بریک ملا۔؟" میں نے کملیشور سے سوال کیا۔

"کمرشیل بریک مجھے شکتی سامنت کی فلم "امانش" سے ملا جس کا سکرپٹ میں نے لکھا تھا۔"

"رجنی گندھا" سے تمہارا کیا تعلق تھا؟"

"رجنی گندھا کی کہانی منّو بھنڈاری کی تھی۔ باسو چیٹرجی نے جب اس فلم پر کام کرنا شروع کیا تو اس نے کہا یہ فلم نہیں چلے گی۔"

"پھر؟"

"اس فلم میں میری ایک طرح سے Indirect involvement ہے۔ میں نے باسو کے ساتھ بیٹھ کر ایک ایک سین کو لکھا اور اس پر گھنٹوں بحث کی۔"

"یہ فلم تو خاصی کامیاب تھی۔"

"یہ ایک اچھی آرٹ فلم ثابت ہوئی۔"

"گلزار کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ایک سلجھا ہوا ڈائریکٹر ہے جو فن کو تفریح پر ترجیح دیتا ہے۔ اس نے میرے ناول 'کالی آندھی' کو 'آندھی' کے فلمی نام سے فلمایا اور کامیابی سے فلمایا۔"

"لیکن وہ تو ایک Controversial فلم ہو گئی تھی؟"

"اس لئے کہ فلم میں سیاست گھس آئی تھی۔" کملیشور نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"مجھے تمہاری فلم موسم بہت پسند ہے۔"

"یہ فلم گلزار نے میرے ناول 'آگامی اتیت' پر بنائی تھی اور مجھے خود بھی یہ فلم پسند ہے۔"

"بی آر چوپڑہ کے لئے بھی تم نے کچھ لکھا ہے؟"

"تمہاری قسم، گھڑی کے دو ہاتھ، پتی پتنی اور وہ۔ چوپڑہ صاحب کی ان فلموں پر میں نے کام کیا ہے۔"

"شکتی سامنت، گلزار اور بی آر چوپڑہ کے علاوہ اور کن پروڈیوسروں یا ڈائریکٹروں کے لئے اسکرپٹ لکھ رہے ہو۔"

"میں آج کل سنیل دت، وجے آنند، رامانند ساگر، دیو آنند اور کے۔ کے۔ مہاجن کیلئے لکھ رہا ہوں۔"

"سنیل دت کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

"یہ اس لئے پوچھ رہے ہو کہ وہ تمہارا بھائی ہے؟"

"اس لئے بھی پوچھ رہا ہوں۔"

"سنیل دت بے حد پُر اخلاق اور مہذب آدمی ہے اور حساب کتاب کا بہت کھرا ہے۔"

"تو تمہیں میرا بھائی پسند ہے؟"

"ہاں۔"

"اور بھابھی؟" میں نے پوچھا۔

"نرگس بھابھی کا جواب نہیں۔ کون ہے جو اس کی عزت نہیں کرتا۔"

"وہ بھی تو سبھی کی عزت کرتی ہے۔"

"شاید اسی لئے سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ کل صبح ٹیلی فون پر تمہاری جو بات نرگس بھابھی سے ہو رہی تھی اس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ تمہاری کتنی عزت کرتی ہے۔"

"اسی لئے میں گلٹی محسوس کر رہا ہوں کہ سنیل کے گھر ٹھہرنے کی بجائے میں تمہارا مہمان کیوں بنا۔"

"تم وہاں چلے جاتے تو پھر میں اور گایتری گلٹی محسوس کرتے۔"

اور اسی لمحہ اپنا نام سن کر گایتری بھابھی ہمارے قریب آگئی۔

"کملیشور جب مجھے الجھانا چاہتا ہے تمہارے نام کی آڑ لے لیتا ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"ذاکر صاحب یہ بڑے ہشیار آدمی ہیں، آپ ان کو نہیں جانتے۔" گایتری نے معصوم مسکراہٹ کا اجالا پھیلاتے ہوئے کہا۔

"اور یہ بتاؤ کہ تم گایتری کو کتنا جانتے ہو؟" کملیشور کا سوال مجھ سے تھا۔

"تم سے زیادہ" میں نے زور سے ہنستے ہوئے کہا اور پھر کملیشور کا اور میرا اور گایتری کا ایک ملا جلا قہقہہ گونجا جس کی گواہی ممابردت کی شرارت بھری مسکراہٹ دور ہی دور سے دے رہی تھی۔ ہمیں معلوم بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کب چپ چاپ آگیا تھا اور دور بیٹھا ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

لیکن مجھے محسوس ہوا کہ میں نے صرف کملیشور کی بات کا جواب دینے کے لئے کہہ دیا تھا ورنہ میں گایتری کو کملیشور سے زیادہ کہاں جانتا ہوں۔ اسے تو شاید کملیشور بھی پوری طرح سے نہیں جانتا۔ اسے بھی یہ معلوم نہیں کہ وہ اپنے دل کے اندر اس کے لئے، اور اس کی جدوجہد کے لئے، اور اس کے خوابوں کی تکمیل کے لئے، آرزوؤں اور دعاؤں کے کتنے چراغ جلائے ہوئے ہے اور یہی چراغ ایک نئے دور اور ایک روشن مستقبل کی گواہی دیتے ہیں۔

میں نے جو قریب قریب ایک ہفتہ کملیشور کے ساتھ گذارا اس کے دوران لگا کہ وہ تو اب گھر میں صرف سونے آتا ہے، ایک دو بجے سے پہلے نہیں۔ لیکن رات کا کھانا گھر ہی میں کھاتا ہے کیونکہ گایتری تھکی آنکھوں سے انتظار کرتی رہتی ہے۔ دوشاییں میں بھی اس کے ساتھ تھا جب ایک پروڈیوسر اور ڈائرکٹر اس سے سن اینڈ سینڈ میں ایک میٹنگ کرنے والے تھے۔ کہانی کا عنوان تلاش کیا جا رہا تھا اور عجیب و غریب عنوان سجھائے جا رہے تھے۔ مجھے لگا فلم انڈسٹری میں کتنے Unimaginative لوگ بستے ہیں۔ پھر معاملہ ایک بات پر اٹک گیا۔ ڈائرکٹر چاہتا تھا کہ مکالموں میں کسی اور کا نام دیا جائے حالانکہ لکھنے کا سارا کام کملیشور خود کر رہا تھا۔ اس نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور میٹنگ ٹوٹ گئی۔ ڈائرکٹر نے بیئر میں وسکی ملا کر پینے کے بعد بڑی بے تحاشہ حرکتیں کی تھیں۔ دو بجے جب ہم لوگ گھر پہنچے تو گایتری معمول کی طرح انتظار کر رہی تھی اور اس کے بعد ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔ پھر ایک رات دوبارہ وہی بات ہوئی لیکن اس روز پروڈیوسر اور ڈائرکٹر نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور کملیشور کی ہر شرط مان لی تھی۔ ان کا اصرار تھا کہ کھانا ہوٹل میں ہی کھایا جائے۔ کھانا منگوایا گیا۔ کملیشور نے کچھ دیر انکار کرنے کے بعد کھانا شروع کیا۔ میں نے تو کھانا کھا لیا اور کملیشور ایک ہی چپاتی نے کر اسے توڑتا رہا۔ دو بجے کے قریب گھر لوٹے تو گایتری

بنا کھائے انتظار کر رہی تھی۔

"کھانا کھاؤ۔" اس نے کہا۔

"لیکن کھانا تو ہم لوگ کھا آئے ہیں، اب دوبارہ کھاؤ گے؟"

"میں نے تو ایک ہی چپاتی کھائی تھی، کھانا تو اب گھر میں کھاؤں گا۔"

اس نے گایتری کے ساتھ کھانا کھایا اور میں کھانے کی میز پر بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔

یہ ہے آجکل کملیشور کی زندگی کا پیٹرن۔ رات بہت دیر سے گھر لوٹنا، تھکن اور انتظار سے ہاری ہوئی گایتری کے ساتھ کھانا کھانا اور ماتو کے بارے میں پوچھنا کہ وہ کب سوئی اور اس نے کب کھانا کھایا تھا۔ پھر صبح سویرے اٹھ کر فلمی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ٹیلی فون پر ہر روز کی مصروفیات طے کرنا۔ بنا ناشتہ کئے گھر سے نکل جانا اور پھر اس وقت لوٹنا جب دوسری صبح کا آغاز ہو چکا ہو۔

کملیشور اپنے گھر میں اجنبی بن گیا ہے۔ مجھے لگا کہ جیسے گھر سے اسے کبھی موہ ہوا ہی نہیں۔ جتنا بے نیاز وہ اس وقت تھا جب اس کی شادی نہیں ہوئی تھی اُتنا ہی بے نیاز وہ شادی کے بیس سال کے بعد اب بھی ہے۔ گایتری نے پچھلے تمام اتنے برسوں سے اسے زندگی سے جکڑے رکھا ہے لیکن وہ اسے گھر سے نہیں باندھ سکی۔ اگر گھر کا نام صرف کچھ دیواریں، کچھ چھتیں، کچھ دروازے ہیں تو کملیشور کا واقعی ایک بہت ہی اچھا خوبصورت اور صاف گھر ہے، لیکن اگر گھر کا تصوّر اس کے علاوہ بھی کچھ ہے تو پھر وہ ایکدم بے گھر ہے اور ایک سنیاسی کی طرح اپنے جسم پر بھبھوت ملے ایک وسیع اور حدود سے بے نیاز دنیا میں گھوم رہا ہے جہاں سیکڑوں گایتریاں اپنے اپنے کملیشوروں کو گھر سے باندھنے میں مصروف ہیں اور اپنی تھکی ہوئی آنکھوں میں دن رات کی کشمکش کی سرخی لئے اس پربھات کا انتظار کر رہی ہیں جب ان کے اپنے کملیشور ایک بار پھر اپنے گھروں کی دہلیز پر کھڑے ہو کر کہیں گے۔

"لو ہم آ گئے ہیں۔"

اور انہیں لگے گا جیسے ایک روشنی سے بھرپور مینار ان کے سامنے کھڑا سارے گھر بار کو منوّر کر رہا ہے، اور ان کی مانگوں میں سیندور کی لکیر آسمان میں پھیلی کہکشاں کی طرح چمک اٹھے گی۔

(جاں نثار اختر نمبر کے بالمقابل)

541

کشمیری لال ذاکر ——— چنڈی گڑھ

عزیز از جان صابر !

جان نثار اختر نمبر ابھی ابھی ملا ہے۔ صرف اسے ایک نظر دیکھا ہے۔ زندہ باد۔ کیا کارنامہ کیا ہے تم نے۔ میں اس کے لئے تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔

تفصیل سے اپنی رائے کچھ روز کے بعد بھیجوں گا۔ تم نے اختر صاحب کو زندہ جاوید کر دیا۔

تمہارا بھائی ذاکر

فن اور شخصیت کا جاں نثار نمبر ۳ جون ۱۹۷۶ء کو چھپ کر آگیا تھا۔ اسے دیکھ کر اختر صاحب بے حد خوش تھے اور انہوں نے بھوپال اور بمبئی کے جن دوستوں کو اپنے دستخط کے ساتھ نمبر دیا تھا وہ یہ ہیں:۔

ڈاکٹر ظ انصاری، علی سردار جعفری، کرشن چندر، ڈاکٹر راہی معصوم رضا، باقر مہدی، فضیل جعفری، عزیز قیسی، ڈاکٹر کشور سلطانہ، مدہوش بلگرامی، اقبال مجید، اصغر علی انجنیر، ڈاکٹر عبدالستار دلوی، علی عباس امید، اختر سعید خاں، پروفیسر شفیقہ فرحت، جہاں قدر چغتائی، یوسف ناظم، واجدہ تبسم، نوشاد، خیام، جے دیو، جاوید اختر اور فہمیدہ راہی وغیرہ۔

کشمیری لال ذاکر صاحب کا یہ خط ۹ر اگست ۱۹۷۶ء کو موصول ہوا تھا جسے اختر صاحب نے جسلوک اسپتال میں دیکھ کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا۔ مگر افسوس کہ وہ ۱۸ر اگست کو اپنے بے شمار دوستوں اور مداحوں کو رنجیدہ کر کے اس دنیا سے سدھار گئے۔

محمد طفیل ——— مدیر نقوش (لاہور)

جناب! آداب

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں سلام کرنے کو جی چاہتا ہے، ادب کے رشتے سے، اُن میں سے ایک آپ بھی ہیں۔

میں نے آپ کے دو نمبر دیکھے۔ مہندر ناتھ نمبر اور جاں نثار اختر نمبر۔ دونوں خوب تھے۔ ایک نمبر کرشن چندر پر ساحر نے پیش کیا تھا۔ وہ بھی مجھے بہت عزیز ہے۔ ایسی شمعیں ضرور جلایئے۔ ادب میں بڑا اندھیرا ہے۔

آپ نے ایک بار بڑا دھمکی آمیز خط لکھا تھا۔ پھر وہ سلسلہ منقطع کر دیا۔ (بہر حال میں تو اس سلسلے میں بالکل ہی بے قصور تھا، تفصیل کیا عرض کروں)۔

آج کل آپ کے بھائی کہاں ہیں؟ ان سے کبھی اچھی خاصی دوستی تھی۔ پھر ان کا اتہ پتہ نہ ملا۔ کہاں ہیں، کیسے ہیں؟ ۔ لیجئے نقوش بھی حاضر ہے۔

محمد طفیل

★

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ——— دھلی

عزیزم۔ اختر نمبر سب سے بڑا تحفہ ہے جو ایک دوست اپنے شاعر کی خدمت میں پیش کر سکتا تھا نہایت اچھے مضامین جمع کئے ہیں۔ رات گئے تک پڑھتا رہا۔ خاموشی اور تنہائی میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آنسو دل کی بن آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں خوش رکھے۔ تم نے حقِ دوستی ادا کر دیا۔ یہ اختر کے نظریۂ شعر، فن اور شخصیت پر سب سے پہلی اور مستند کتاب ہے۔

صابر تم نے خط لکھا لیکن یہ نہ لکھا کہ اختر کے اہلِ خاندان پر اور خود تمہارے اوپر کیا گذری؟ خدیجہ اور بچیاں کیسی ہیں ع گشتہ جدا ز دیدہ دداماں چگونہ؟

تمہارا شریکِ غم۔

خواجہ احمد فاروقی

★

ڈاکٹر محمد حسن ——— دھلی

مکرمی تسلیم۔ نوازش نامہ ملا۔ جان نثار اختر۔ فن اور شخصیت اس سے قبل مل چکا تھا۔ میں اس کی رسید بھیجنے ہی والا تھا کہ جان نثار صاحب کے انتقال کی خبر ملی۔ آپ نے واقعی ان کی یاد میں

تاج محل بنا دیا۔
میں ضرور عصری ادب کے اگلے شمارے میں اس خوبصورت یادگار پر تبصرہ کروں گا۔ یہ پرچہ پریس میں ہے۔ اس کے بعد والے شمارہ میں تبصرہ شامل ہوگا۔ خاکسار محمد حسن

★

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ـــــــ دہلی

برادرم صابر دت صاحب۔ جاں نثار نمبر آپ نے بہت عمدہ نکالا اور بہت بر وقت نکالا۔

ع این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

خدا آپ کو توفیق دے اور آپ ایسے اچھے نمبر اردو کے اعلیٰ ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں نکالتے رہیں۔
گوپی چند نارنگ

★

ڈاکٹر قمر رئیس ـــــــ دہلی

برادرم صابر دت صاحب مکرم
آپ کا ۹ اکتوبر کا نوازش نامہ ملا۔ فن اور شخصیت کا جاں نثار اختر نمبر بھی مل گیا تھا۔ افسوس اس کا ہے کہ کچھ شعبہ کی نئی ذمہ داریوں اور کچھ نجی پریشانیوں کی وجہ سے اس شاندار نمبر کے بارے میں اپنے تاثرات نہیں لکھ سکا۔ اس میں دو رائیں نہیں ہیں کہ اردو کے ادبی رسائل کی تاریخ میں اس سے زیادہ شاندار اور جامع خصوصی نمبر کسی ایک شاعر کے بارے میں اب تک نہیں نکلا ہے۔ یہ آپ کا ایسا کارنامہ ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔

حال ہی میں یونیورسٹی لائبریری کے لئے میں نے اس کی دو کاپیوں کا آرڈر دیا تو اردو بازار میں کہیں بھی دستیاب نہیں ہو سکا۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا یہ ایڈیشن ختم ہو گیا؟

ہم لوگ عنقریب ایک ادبی رسالہ نکال رہے ہیں، جنوری یا فروری میں اس میں اس پر تبصرہ کروں گا اور تفصیلی۔
قمر رئیس

★

ضمیر نیازی ـــــــ کراچی

محترمی صابر دت صاحب۔ آداب
آپ کو غالباً یاد نہ ہو لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بمبئی کے قیام کے دوران جناب سے شرفِ ملاقات

حاصل کر چکا ہوں۔ یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد میرے ایک کرم فرما کے توسط سے "فن اور شخصیت" کا مہندر ناتھ نمبر ملا۔ گذشتہ سال جولائی میں جاں نثار نمبر بھی انہی کرم فرمانے ارسال فرمایا۔ جاں نثار نمبر پر انگریزی کے ہفت روزہ اخبار میں تبصرہ لکھ چکا ہوں۔ آپ پوچھیں گے کہ بغیر فرمائش کے کس لئے، تو جناب والا مہندر اور جاں نثار دونوں سے تعلقات تھے اور دونوں نمبر آپ نے ایسے نکالے کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہا۔

پاکستانی ادب میں بھی جاں نثار نمبر پر تبصرہ شائع ہوا ہے۔ یہ اطلاعاً عرض ہے۔

اسمر بیان

★

شہزاد منظر ——— کراچی

مکرمی۔ تسلیم

"فن اور شخصیت" کا اتنا شاندار جاں نثار اختر نمبر شائع کرنے پر مبارکباد قبول ہو۔ میں نے اس پر دوماہی "پاکستانی ادب" میں تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔ مجی سبط حسن پاکستانی ادب کا وہ شمارہ شائع ہوتے ہی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

ہندوستان سے "فن اور شخصیت" جیسا ضخیم، معیاری اور وقیع جریدہ کا شائع ہونا بلاشبہ قابل صد مبارکباد ہے۔ اس پرچے نے اپنا نیا معیار قائم کیا ہے۔ اس سے قبل ہم صرف پاکستانی ضخیم اور وقیع جرائد شائع کرنے کی روایت رکھتے تھے۔ لیکن یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہندوستان سے بھی 'فن اور شخصیت' جیسا معیاری اور ضخیم جریدہ شائع ہو رہا ہے۔

میں نے اس سے قبل 'فن اور شخصیت' کا مہندر ناتھ نمبر بھی 'افکار' کے دفتر میں دیکھا تھا۔ (صرف دیکھا تھا پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا) اور اب جاں نثار اختر نمبر دیکھا۔ واقعی آپ نے اتنا وقیع نمبر شائع کر کے اردو کی ادبی صحافت میں ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ مستقبل میں ادبی تاریخ لکھتے وقت 'فن اور شخصیت' کے تمام شماروں کو سامنے رکھنا ضروری ہو گا لیکن افسوس، میں 'فن اور شخصیت' کا کوئی بھی شمارہ حاصل نہ کر سکا۔ سبط حسن نے جاں نثار اختر نمبر صرف تبصرے کے لئے دیا تھا۔ تبصرے کے بعد تقاضا کر کے اسے واپس لے لیا۔ (اتنا اچھا شمارہ کون اپنے پاس رکھنا نہیں چاہے گا؟)۔ یہاں جاں نثار اختر نمبر قیمتاً حاصل کرنے کا بھی کوئی معقول انتظام نہیں، ورنہ میں اسے ضرور خرید لیتا۔ میں اس کے لئے آپ کے پاس روپیہ بھی نہیں بھیج سکتا کیوں کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ابھی تک روپے بھیجنے کا کوئی انتظام نہیں ہے اس لئے بس دل مسوس کر رہ گیا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ فیض احمد فیض اور سعادت حسن منٹو پر بھی خصوصی شمارے شائع کر رہے

ہیں کہ فن اور شخصیت کے مستقل مطالعے کا کوئی ذریعہ نکالیں گے۔؟

اپنے بارے میں صرف اتنا بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں بھی ایک ادیب اور صحافی ہوں اور اس وقت پیپلز پارٹی کے اخبار 'مساوات' (کراچی) میں اسسٹنٹ ایڈیٹر ہوں۔ میرے ادبی مقالات کا مجموعہ "اردو ادب میں جدیدیت کے رجحان"، ناول "اندھیری رات کا تنہا مسافر" اور افسانوں کا مجموعہ "ندیا! کہاں ہے تیرا دیس" زیرِ طبع ہیں۔ پاکستان کے تقریباً تمام ادبی جرائد میں میرے افسانے اور مقالات شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اپنے بارے میں لکھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ پاکستان کے جرائد ہندوستان نہیں جاتے اس لئے ہو سکتا ہے کہ آپ میرے نام سے واقف نہ ہوں۔

شہزاد منظر

★

شاذ تمکنت ——— حیدرآباد

برادر عزیز صابر دت۔

جاں نثار بھائی کی زندگی ہی میں نمبر مل گیا تھا۔ سوچا تھا کہ آرام سے مزے لے لے کر پڑھ لوں، تب انہیں خط لکھوں اور آپ کو مبارکباد لکھ بھیجوں —— اب ان کے بعد جیسے جی بجھ کر رہ گیا ہے۔

واقعی آپ نے بہت وقیع کام کیا ہے۔ شاید یہ کہوں تو بیجا نہ ہو کہ آپ ہندوستان کے محمد طفیل ہیں جو ایسے شخصیات نمبر نکال رہے ہیں۔

آپ کو خط لکھنے کے لئے اپنے آپ کو کس طرح آمادہ کیا ہے وہ دل ہی جانتا ہے۔ بمبئی میں میرا قیام جاں نثار بھائی کے ہاں اکثر رہتا تھا اور آپ وہاں روز ہی آتے تھے۔ اس طرح آپ کو خط لکھتے ہوئے تمام ASSOCIATIONS یاد آ رہے ہیں۔

آپ کے نمبر میں اچھے اور اوسط درجے کے سبھی مضامین شامل ہیں مگر عمدہ تحریریں زیادہ ہیں۔ نام بہ نام تفصیل کے ساتھ لکھتا لیکن آپ کا پرچہ بڑی احتیاط و احترام کے ساتھ احباب میں گھوم رہا ہے۔ فہرست میرے سامنے نہیں ہے۔

شاذ تمکنت

★

وارث علوی ——— احمدآباد

آپ تو جانتے ہیں میری رائیں ہمیشہ کٹ کھنی اور دو ٹوک ہوا کرتی ہیں۔ مہندر ناتھ نمبر اور جاں نثار نمبر دونوں سوائے کاغذ کی بربادی کے کچھ نہیں۔ اس میں آپ کا قصور کتنا ہے میں نہیں کہہ سکتا۔ آپ اپنی

کوشش کر چکے اور پرچے کی ترتیب و طباعت اس کوشش کی کامیابی کا ثبوت ہیں۔ پرچہ اگر ناکامیاب ہے تو اردو قلم کاروں کی بے توجہی اور تنقیدی دیوالیہ پن کی وجہ سے۔ جاں نثار اختر ایسے شاعر نہیں ہیں کہ نقاد ان پر ایک مضمون لکھ کر EXHAUST ہو جائے۔ آپ مجھ سے کہئے میں تین چار اور مضامین جاں نثار پر لکھ سکتا ہوں۔ لیکن ہمارے نقادوں کا یہ عالم ہے کہ انہیں دیباچوں میں جو کچھ لفاظیاں کرنی تھیں کر چکے، پھر کہنے کو کچھ نہ رہا۔ چنانچہ آل احمد سرور، سردار جعفری، خواجہ احمد فاروقی، ظ انصاری، محمد حسن اور باقر مہدی کے پیلیٹن لفظ، دیباچوں اور تبصروں کے اقتباسات با نمبر ہیں ان کی طباعتِ ثانی نے یہ بات ثابت کر دی کہ ان حضرات کے پاس جاں نثار کی شاعری پر بات کرنے کے لئے کوئی تازہ پہلو یا نیا زاویہ نہیں ہے۔ ان کے مضامین شائع کرنے کا مقصد یا تو یہ تھا کہ نمبر بڑے ناموں سے محروم نہ رہے، یا پھر یہ کہ جاں نثار پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب ایک جگہ جمع ہو جائے۔ صاف بات ہے نمبر اس مقصد کے لئے نہیں تھا۔ اگر بڑا نام تازہ چیز لیکر نہیں آتا تو نمبر میں اس کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے تھی اور بڑے نقادوں کو بھی سوچنا چاہیے تھا کہ اگر وہ جاں نثار پر کوئی تازہ چیز نہیں لکھ سکتے تو بطور نقاد کے وہ چند ایسی حدود میں قید ہیں جنہیں ہر بڑا نقاد لانگ جاتا ہے۔ مثلاً ہر نقاد دیباچہ اور تعریف لکھ سکتا ہے، لیکن بڑا نقاد وہی ہوتا ہے جو تعریف نویسی سے بلند ہو کر بڑے یا اہم شاعر کی شاعری کے ہر پہلو پر بے تکان گفتگو کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

نئے نقادوں کے مضامین میں ایک خوف ملتا ہے کہ کہیں وہ جاں نثار کی اتنی تعریف نہ کر بیٹھیں کہ حلقۂ یاراں میں مواخذہ ہو کہ ایک جدید نقاد ایک روایتی اسلوب والے ترقی پسند شاعر کی قصیدہ خوانی کیسے کرنے لگا۔ ایسا خوف دل کی بات زبان پر آنے نہیں دیتا۔ لوگ شاعر کی تعریف کرتے وقت بھی شاعر کی طرف نہیں، لوگوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ اچھی تنقید اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب نقاد اس شاعری کی دل کھول کر داد دیتا ہے جو اس کے دل کو چھوتی ہے۔ لوگ ڈرتے ہیں کہ کہیں غلط شاعر کا غلط کلام ان کے دل کو چھو نہ جائے۔ اپنی ناقدانہ شخصیت اور اپنا ذوق سخن فنکار سے زیادہ اہم ٹھہرا ہے۔ یہ ادب اور آرٹ کی طرف غلط رویّہ ہے۔

بعض خاکے اچھے ہیں۔ خصوصاً وہ خاکہ جو میرے مضمون کے ساتھ ہی شامل ہے، خوب ہے۔ میرے پاس نمبر نہیں اس وجہ سے نام یاد نہیں آ رہا۔ شاید نمبر کا سب سے طویل اور سب سے خوبصورت خاکہ وہی ہے۔

تصویریں اچھی ہیں لیکن بہتر ہو سکتی تھیں۔ مجھ جیسے پھٹیچر لوگوں کی تصویریں شائع نہ ہوں تو کوئی بات نہیں لیکن جن لوگوں کی تصویریں آن بان سے شائع ہوتی ہیں، ان کے پھٹیچر مضامین پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ فاروقی اور باقر مہدی اور عمیق حنفی جیسے لوگوں کی تصویریں ان کے مرنے کے بعد ہی شاید ہم شائع کریں گے۔

نمبر میں آپ نے مجھے شامل کیا اسے میں اپنی عزت افزائی سمجھتا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ نہایت عجلت میں لکھے گئے مضمون کو آپ نے پسند کیا۔ میں اپنی طرف سے آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ آپ آئندہ بھی جو کچھ خدمت

مجھ سے لینا چاہیں میں بخوشی سر انجام دوں گا، کہ آپ جیسے پر خلوص انسانوں کے رسالوں کی قلمی معاونت کو میں باعثِ افتخار سمجھتا ہوں۔

وارث ہملوی

★

پرکاش پنڈت ـــــــــ دہلی

برادرم تسلیم

جاں نثار اختر نمبر کے بارے میں کیا عرض کروں۔ کاش اختر صاحب زندہ ہوتے اور جان پاتے کہ ان کے فن اور ان کی شخصیت کے بارے میں ان کے ہم عصر ادیبوں اور قارئین کی کتنی اچھی اور اونچی رائے ہے۔

مخلص

پرکاش پنڈت

★

سریندر ناتھ ورما ـــــــــ شملہ

ڈیر صابر آداب

تمہارا خط موصول ہوا۔ فن اور شخصیت کا جاں نثار نمبر بھی مل گیا۔ شکریہ ا نمبر نہایت ہی شاندار اور ایک یادگار دستاویز ہے۔ اردو ادب کے تئیں تمہاری خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تمہارا ہی دل گردہ ہے کہ تم اتنی بڑی ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیتے ہو اور نہایت کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انہیں سر انجام بھی دیتے ہو اور وہ بھی آج کے دور میں جب کہ اردو ادب کی خدمت کرنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔

اعجاز صدیقی کا ردِ عمل کچھ عجیب سا تھا۔ فن اور شخصیت کے جاں نثار اختر نمبر کو انہوں نے "منحوس" کے لقب سے یاد کیا۔ میں نے ان کو ایک خط میں اپنا اعتراض لکھ بھیجا تو جواب میں انہوں نے اپنے اس جملے کو حق بجانب قرار دیا ہے۔ اس کا ذکر جناب آل احمد سرور سے ہوا تو انہوں نے اعجاز صاحب کے اس ردِ عمل کو تنگ دلی سے تعبیر کیا۔ واقعی ان جیسے بزرگ اور تجربہ کار ادیب، شاعر اور مدیر سے اس قسم کے جملے کی ہرگز امید نہ تھی۔

مخلص

سریندر ناتھ ورما

★

پریم وار برٹنی ـــــــــ چنڈی گڑھ

یار صابر دت

جاں نثار اختر نمبر خوب ہے۔ تمہاری محنت کی داد نہ دینا کفر ہوگا۔ اختر نمبر کے لئے جو کچھ کر سکا ضرور کرونگا

ظ انصاری صاحب نے جاں نثار اختر نمبر پر بیکار تبصرہ کیا ہے۔ خدا جانے وہ کس کامپلکس کے شکار ہیں اور اپنی فرسٹریشن خواہ مخواہ ہر کس و ناکس پر کیوں جھاڑ رہے ہیں۔ کیا علمیت کے معنی یہی ہیں کہ سب کو جاہل سمجھا جائے؟

تمہارا
پریم ور بٹنی

★

ڈاکٹر ذکیہ انجم ـــــــــ دھلی

جناب!

جاں نثار اختر نمبر ملا۔ جس حسنِ ترتیب سے آپ نے یہ پرچہ نکالا ہے، جتنا خوبصورت اس کا سرورق ہے اس کے لئے جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔ میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

★

عابد علی خاں ـــــــــ مدیر "سیاست" حیدرآباد

عزیزم سلام علیک
جاں نثار اختر نمبر کے سلسلے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ ادبی ٹرسٹ بکڈپو سے فن اور شخصیت کی پانچ جلدوں کا آرڈر دیا گیا تھا لیکن آپ نے نہیں بھجوایا۔ یہاں آصف علی کے پاس کچھ جلدیں آئی تھیں، ہم نے اردو اکیڈمی کے لئے خرید لیں۔ براہ کرم ایک کاپی بذریعہ وی پی روانہ کیجئے۔ مجھے پاکستان بھیجنا ہے۔

مخلص عابد علی خان

★

غیاث احمد گدی ـــــــــ جھریا

برادرم تسلیمات
مہندر ناتھ نمبر تو نہیں البتہ جاں نثار اختر نمبر دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بلا مبالغہ یہ نمبر اردو جرائد کی دنیا میں بے مثال قرار دیا جائے گا اور اس کے لئے آپ کو جتنی بھی مبارکباد دی جائے کم ہے۔

آپ اس نیک قدم کے لئے بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اردو میں ایک ہندی ادیب کے فن و شخصیت سے متعلق خصوصی شمارہ شائع کرنے جا رہے ہیں۔ اس طرح نہ صرف دونوں زبانوں کی آپ خدمت کر رہے ہیں بلکہ ایک خوشگوار روایت کے آغاز کا سہرا بھی آپ کے سر بندھتا ہے۔

غیاث

گوکل کرشن اشکؔ —— روہتک (ہریانہ)

برادرم آداب!

بھائی تم ایسا خوبصورت آدمی جاں نثار اختر ایسے خوبصورت شاعر اور شخص پر پرچہ شائع کرے گا تو لازمی طور پر خوبصورت ہوگا۔ رائے کی ضرورت ہی کہاں رہتی ہے۔

گوکل
اشک

*

حامد حسن حامد —— لاہور

پیارے بھائی جوئنددر!

جاں نثار اختر نمبر میں آپ کی تصویر دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ اب بوا پسی ڈاک اپنی فوٹو بطور خاص مجھے بھیجئے میرے البم کے لئے، جو آپ کے دستخطوں سے میرے نام ہو۔

مجھے آپ کے شائع کردہ یہ نمبر دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی ہے جو حسن طباعت، میٹر اور گیٹ اپ کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے۔ میں ایسے ضخیم اور عظیم الشان نمبر شائع کرنے پر آپ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

حامد حسن حامد

*

پاکستانی ادب —— کراچی

"فن اور شخصیت" ان معنوں میں قطعی منفرد جریدہ ہے کہ وہ ہر چھ ماہ کے بعد کسی نہ کسی مشہور ادیب کی شخصیت اور فن کے بارے میں خصوصی شمارہ پیش کرتا ہے۔ مرنے کے بعد کسی مشہور ادیب و شاعر کے بارے میں خصوصی شمارہ شائع کرنا رسم میں شامل ہو چکا ہے۔ لیکن کسی ادیب کے بارے میں اس کی زندگی میں اس کے شایان شان نمبر شائع کرنا ہمیشہ مشکل کام رہا ہے۔ "فن اور شخصیت" نے ایک نئی روایت کی ابتدا کی ہے جس کے لئے وہ یقیناً لائق ستائش ہے۔ اس نے اس سے قبل مہندر ناتھ پر ایک ضخیم شمارہ پیش کیا تھا۔ اب اس نے جاں نثار اختر کی شخصیت اور فن کے بارے میں تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ایک اور خصوصی شمارہ پیش کیا ہے جو اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

'فن اور شخصیت' کے مدیروں نے جاں نثار اختر کی زندگی میں ہی ان کے بارے میں خصوصی شمارہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا جس کی خود جاں نثار اختر نے اجازت دے دی تھی لیکن یہ شمارہ جاں نثار اختر

کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ جاں نثار اختر نے شرط عائد کی تھی کہ اس میں جہاں دوست ادیبوں کے مضامین ہوں وہاں مخالف نظریہ رکھنے والوں کے مضامین بھی شامل کئے جائیں تاکہ ہر ایک کو کھل کر کہنے کی آزادی ہو ورنہ یہ نمبر "قصیدہ" ہوکر رہ جائے گا اور بالغ تحقیق سامنے نہیں آئے گی۔ جاں نثار اختر کا خیال تھا کہ فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ آج کے دور میں جب کہ ہر ادیب صرف اپنی تعریفیں اور قصیدے سننے کا عادی ہو چکا ہے، ان کی جانب سے اپنے مخالفین سے مضامین لکھوانے کی اپیل نہ صرف حیرتناک ہے بلکہ ناقابلِ یقین ہے۔

لیکن مدیر صابر دت نے جاں نثار اختر کی درخواست پر عمل کیا اور ایسے "جدیدیوں" سے بھی ان کے بارے میں مضامین لکھوائے جو آخر دم تک ان کے مخالف رہے۔ ان میں ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی، باقر مہدی، فضیل جعفری اور مغنی تبسم وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان ادیبوں میں باقر مہدی وغیرہ نے ہمیشہ جاں نثار اختر کو ان کے ترقی پسند بلکہ اشتراکی خیالات کی وجہ سے ہدفِ ملامت بنایا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ترقی پسند نقادوں نے انہیں کبھی صفِ اول کے شاعروں میں شمار نہیں کیا اور نہ انہیں ترقی پسند ادب میں شایانِ شان مقام دیا۔ انہوں نے یہ باور کرانے کی بھی کوشش کی کہ جاں نثار اختر زندگی کے آخری دور میں ترقی پسندوں سے الگ ہو گئے تھے، اس لیے ان کی شاعری میں نئی تازگی اور جان آ گئی تھی۔ حالانکہ ایسی بات نہ تھی۔ جاں نثار اختر زندگی کے آخری لمحوں تک ترقی پسندوں کے ساتھ رہے اور ترقی پسند ہونے پر فخر محسوس کرتے رہے۔

اس شمارے کی نگراں قرۃ العین حیدر نے جاں نثار اختر کے بارے میں بے حد عمدہ مقالہ لکھا ہے اور بڑی اچھی اور کھری باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً ان کا خیال ہے کہ کسی شاعر یا فنکار کی زندگی میں جو کام ہوتا رہے وہ اچھا ہے۔ لیکن اس میں مبالغہ نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمارے ہاں یا تو حد سے زیادہ مدح خوانی کا دستور ہے، یا کیچڑ اچھالنے کا۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ میری ناچیز رائے میں کسی بقیدِ حیات ناول نگار، افسانہ نویس اور شاعر پر پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت اتنی آسانی سے نہیں ملنی چاہیئے جو آج کل یونیورسٹیوں سے مل جاتی ہے۔ جب تک ایک فنکار کا سارا سرمایۂ حیات سامنے نہ ہو، ایک دانشور اس کے بارے میں کیا فیصلہ کر سکتا ہے؟

اس شمارے میں جن مشاہیر ادبا، شعراء، ناقدین اور ممتاز فلمی شخصیتوں نے جاں نثار اختر کی شخصیت اور فن کے بارے میں اپنے خیالات و تاثرات کا اظہار کیا ہے، اس کی فہرست بہت طویل ہے۔ اتنی طویل کہ اس مختصر سے تبصرے میں پیش کرنا ممکن نہیں۔

یہ درست ہے کہ جاں نثار اختر کو ان کی زندگی میں جو مقام حاصل ہونا چاہیئے تھا اور انہیں جتنی مقبولیت حاصل ہونی چاہیئے تھی اتنی حاصل نہیں ہوئی لیکن آنے والا دور یقیناً ان کے ادبی مرتبے اور خدمات کا از سرِ نو جائزہ لے گا اور انہیں تاریخِ ادب میں جائز مقام دے گا۔ جاں نثار اختر اتنے غیر معروف بھی نہیں تھے کہ انہیں تاریخِ ادب میں مقام دلانے کے لئے مہم شروع کی جائے۔ تاریخِ ادب میں عموماً دیکھا گیا ہے کہ ایک

جیسی صلاحیت رکھنے والے دو شاعروں میں سے ایک کو فوری طور پر ادب میں مقام حاصل ہو گیا اور دوسرے کا تاریخ ادب میں ذکر تک نہیں آیا (یا آیا تو بہت دنوں کے بعد آیا) عصری ادب اور ادیبوں کے بارے میں غور کرتے وقت عموماً ناقدین سے غلطیاں اور کوتاہیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اس سے ہونہار شاعر کی عظمت میں کمی نہیں ہوتی۔ جاں نثار اختر کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہے۔

ظ۔ انصاری نے اپنے مقالے میں انکشاف کیا ہے کہ ــــ "تاریخ وار ان کا کلام دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ کئی نظمیں کئی شاعرانہ ترکیبیں، مصرعے اور قطعے ایسے ہیں جو اختر کے کلام سے ہو کر ہم عصر شعرا کی زبان تک پہنچے ہیں مثلاً مجاز کی نظم "آوارہ" جب مشہور ہوئی تو اس سے کئی سال پہلے ۱۹۳۸ میں اختر کی نظم "بیزاری" میں محفوظ تھی۔ فیض کی وہ غزل "تم آئے ہو نہ شب انتظار گذری ہے" کم و بیش دس سال پیشتر "بار گذری ہے" کی ردیف میں اختر کے ہاں موجود ہے۔ جذبی اور سردار جعفری کے ہاں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ ان کی نظمیں عزم، بیزاری، تلخ نوائی، اداس شام، تجربہ، مراجعت، زندگی، مراحل، غزلوں اور قطعوں کے کئی مصرعے جوں کے توں یا کسی قدر تبدیلی کے ساتھ ہمیں ان کے ہم عصروں کے ہاں مل جاتے ہیں اور کئی سال کے وقفے سے ملتے ہیں۔"

ظ۔ انصاری کے اس حوالے کے بعد کیا یہ مزید ثابت کرنے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ جاں نثار اختر کس پائے کے شاعر تھے؟ ادارۂ فن اور شخصیت نے جس انداز سے جاں نثار اختر نمبر پیش کیا ہے اس کے لئے وہ یقیناً مبارکباد کا مستحق ہے۔　　(شہزاد منظر)

★

اردو بلٹز (ہفت روزہ) ــــــــ بمبئی

"فن اور شخصیت" کہنے کو رسالہ ہے جو سال میں ایک ورنہ دو بار برآمد ہونے کا ارمان رکھتا ہے۔ لیکن کسی ایک ادبی شخصیت کا بھرپور جائزہ اور مکمل کتاب شمار ہونے کے قابل ہے۔ پہلا شمارہ افسانہ اور ناول نگار مہندر ناتھ کے لئے وقف تھا۔ اڈیٹر صابر دت نے اسے خود کفیل بنانے میں دن رات ایک کر دیا۔ پرچہ تیار ہوا تو مہندر ناتھ دنیا سے سدھار چکے تھے۔ دوسرا شمارہ خود جاں نثار اختر کے سائے میں پروان چڑھا۔ ادھر وہ نکلا، ادھر اختر بزم ہستی سے نکل گئے۔ اب تیسرے شمارے کے لئے اڈیٹر کو مرحوم ادیبوں میں سے کسی کو (غالباً منٹو کو) انتخاب کرنا پڑے گا۔ زندہ وجود اتنا عالیشان مزار تعمیر کرا لینے سے ذرا گھبراتے لگے ہیں۔

"فن اور شخصیت" کے چھ سو (۶۰۰) صفحات کی قیمت صرف ۲۵ روپے شاید اسی سبب رکھی جا سکی کہ اُن کے اولین صفحوں پر اڈیٹر کے علاوہ اور گن کر ۲۵ سرپرستوں کے نام درج ہیں مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ "یک در گیر و محکم گیر" نام گھٹا کر صفحے کم کیے جا سکتے تھے۔ رسالے کی معنویت میں کچھ فرق نہ آتا۔ معنویت اب بھی گنتی کے صرف چند مضامین کی بدولت قائم ہے: وارث علوی جو کئی برس سے کٹ کھنے

مضمون لکھنے میں نامور ہیں، اپنی وضع کا ایک تفصیلی جائزہ دے گئے ہیں۔ باقر مہدی کر جیتے جی اختر مرحوم کے ہم نشینوں اور قدر شناسوں میں تھے، موضوع سے انصاف نہ کرنے کے باوجود اور بجنبل ہیں۔ بمل کرشن اشک نے اپنے اشعار سے موازنہ کا ایک انوکھا موقع نکال لیا ہے۔ اصغر علی انجینیر عموماً اردو ادب پر نہیں لکھتے لیکن یہاں ان کا جاں نثار سے تفصیلی انٹرویو کئی پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی، عمیق حنفی، محمد حسن اور راشد آذر کے مضامین مختصر اور کارآمد ہیں۔ ان سطروں کا لکھنے والا لفظوں کے خرچ میں نہایت بخیل ہو کر بھی، یہاں جاں نثار اختر کے شاعرانہ سفر کا سراغ لگانے میں فیاضی برت گیا ہے۔ چونی لال (سی، ایل) کاوش نے بے تکلفی میں جگہ بہت گھیر لی۔ بات کم کہی۔

چھ سو صفحے ہیں کہیں ایسا ایک ورق نہ ملا جس کے ذریعے موضوعِ سخن (اختر مرحوم) کی زندگی اور کارناموں کی تاریخ وار تفصیلات (BIODATA) کا علم ہو جاتا۔ یہ کام اڈیٹر نے پڑھنے والوں کی فرصت اور فراست پر چھوڑ دیا ہے۔ حیف!

(ظ۔ انصاری)

★

روزنامہ انقلاب ـــــــــ بمبئی

"فن اور شخصیت" کا یہ دوسرا اشارہ ہے۔ مہندر ناتھ نمبر کی اشاعت کے تھوڑے ہی عرصے بعد ۶۰۰ صفحات کا ضخیم، وضیع اور ایسا نفیس نمبر شائع کرنا کارنامے کے قرب و جوار کی چیز ہے۔ صابر دت، فن اور شخصیت کے اجراء سے پہلے صرف ایک قطعہ گو شاعر کی حیثیت سے چند مخصوص محفلوں اور مشاعروں میں پائے جاتے تھے۔ لیکن اب ایک ایڈیٹر اور وہ بھی ایک بھاری بھرکم رسالے کے ایڈیٹر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ "فن اور شخصیت" کے دونوں نمبر ہندوستان بھر میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ مہندر ناتھ نمبر کے مقابلے میں جاں نثار اختر نمبر ہر حیثیت سے بہتر اور پُروقار ہے۔ قرۃ العین حیدر نے جو اس خوبصورت نمبر کی نگراں ہیں، اپنے مضمون "چند باتیں" میں ترقی پسندی، جدیدیت، تنقید، عام شاعری اور ادبی رویوں کی منتقلی پر جہاں کئی باتیں لکھی ہیں، وہیں دبے دبے لفظوں میں اس نمبر کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے: "ان حالات میں ایک نفیس اور ترقی پذیر شاعر کی بازیافت اور تفصیلی تعارف میں سمجھتی ہوں اس نئے اُردو رسالے کے کارنامے ہیں"۔ قرۃ العین کے یہ چند الفاظ نہ صرف اس نمبر کیلئے "صداقت نامے" کی حیثیت رکھتے ہیں، جاں نثار اختر کی بھی شعری صلاحیتوں اور ادبی نفاست اور ان کی ترقی پذیری کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس نمبر کے لکھنے والوں کی تعداد "لاتعداد" ہے۔ لیکن ۶۳ لکھنے والوں نے جاں نثار اختر کی شاعری، شخصیت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھرپور نہیں تو کم سے کم کھل کر ضرور لکھا ہے۔ تنقیدی مضامین کبھی حرفِ آخر نہیں ہوتے بلکہ بحث و مباحثہ کے دروازے کھولتے ہیں۔ "صبح نو کا شیدائی" اور "غزل کا مزاج داں" کے عنوانات کے تحت اکثر مضامین میں متضاد رایوں کا اظہار ہوا ہے۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کی بھی

بحث چھڑی ہے۔ لیکن ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ جاں نثار اختر زندہ، پُرگو اور قادر الکلام شاعر ہیں۔

مرحوم جاں نثار اختر نے اپنی وفات سے صرف چند سال پہلے از سرِ نو شعر و ادب کو اپنا مشغلہ بنایا۔ ایک طویل عرصے کے بعد ان کے تین مجموعے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے۔ گھر آنگن، خاکِ دل اور پچھلے پہر۔ ساتھ ہی ساتھ ان کی ایک ضخیم اور قابل قدر تالیف "ہمارا ہندوستان" بھی شائع ہوئی۔ فلموں میں بھی ان کے گیت اور گانے مقبول ہوئے۔ "گھر آنگن" کی اشاعت نے خاص طور پر سب کو چونکا دیا۔ اس میں گھر آنگن کا سوامی کا ایک علیحدہ باب ہے۔ جاں نثار اختر کی ان ادبی کاوشوں اور نشاۃ ثانیہ کا ہر طرف سے خیر مقدم کیا جا رہا تھا۔ اور فن اور شخصیت کا یہ نمبر ان کے شاعرانہ قد و قامت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس نمبر میں چھپے ہوئے بیانات، خطوط، مضامین، نظمیں اور نوٹ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ جاں نثار اختر اپنی شعری صلاحیتوں، بزرگی، شرافت، ملنساری، رواداری اور صلح جو طبیعت کی وجہ سے ہر حلقے میں مقبول تھے۔ میں شخصی طور پر اس نمبر کے اس باب کو جس کا عنوان "آئینہ خانہ" ہے بہتر سمجھتا ہوں۔ اس باب میں جاں نثار اختر کی شخصیت پوری طرح بے نقاب ہے۔ "آئینہ خانہ" کے مضامین معلوماتی جذباتی و تاثراتی ہیں۔ ان سب مضامین سے بے حد محبت خلوص اور یگانگت کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ اختر سعید خاں اور جہاں قدر چغتائی کے مضامین خاص طور پر بہت اچھے ہیں۔ عصمت چغتائی، اختر الایمان، واجدہ تبسم، فکر تونسوی کے مضامین بہت دلچسپ و دلپذیر ہیں۔ لیکن ان چند ناموں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی مضامین صرف باقی کے مضامین ہیں۔ زہرہ جمال اور پرکاش پنڈت کے مضامین میں بھی دل کو چھو لینے والی باتیں ہیں۔

خطوں کا ذکر کیا جائے تو اس نمبر کے لکھنے والوں کی تعداد تقریباً ۸۰ ہے۔ سب نامور ادیب اور نقاد ہیں ان سب سے مضامین حاصل کرنا معمولی بات نہیں اور اگر صابر دت سے اُن کی اس محنت اور تندہی کے بارے میں چند توصیفی لفظ نہ کہے جائیں تو بڑی زیادتی ہوگی۔ (حیرت ہے کہ چند تعلیم یافتہ لوگ بھی ان ادبی پرچوں کے نمبروں کو موت و زیست کا ذمہ دار گردانتے ہیں)۔

"فن اور شخصیت" کا جاں نثار اختر نمبر اردو رسالوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ ۲۵ روپے قیمت بظاہر زیادہ نظر آتی ہے لیکن آپ مکتبہ جامعہ جائیں گے تو اس سے کم درجے کی چیزیں آپ کو اس سے بھی زیادہ قیمت میں ملیں گی۔

(یوسف ناظم)

★

روزنامہ **اردو ٹائمز** ـــــ بمبئی

مدیر فن اور شخصیت، صابر دت پر یہ الزام ہے کہ وہ جس شخصیت پر اپنے رسالے کا خاص نمبر نکالتے ہیں وہ موت کے آہنی شکنجوں میں جکڑ جاتا ہے۔ پہلے مہندر ناتھ رخصت ہوئے اور اب جاں نثار اختر۔

جاں نثار اختر نمبر جو جاں نثار اختر کے فن، شخصیت، لہجہ، فکر، نظر اور نظریہ ہی نہیں، جدید غزل

کے رجحانات، ترقی پسندی کی حقیقت اور غزل میں اشاریت کی اہمیت سے متعلق ایک اہم اور تاریخی دستاویز بھی ہے، بقول اعجاز صدیقی (مدیرِ شاعر) جاں نثار کے لئے منحوس ثابت ہوا۔

ڈاکٹر ظ انصاری کی نظر میں ـــ کوئی شخص اتنا شاندار مقبرہ بنوانے کے لئے تیار نہیں ہوگا۔

۶۰۰ صفحات پر مشتمل جاں نثار اختر نمبر میں شامل مضامین، انتخاب مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام، پیغامات و تاثرات یعنی سرورق سے آخر تک ہر چیز دیدہ زیب ہے اور اس کے ہر لفظ میں خلوص و محبت حقیقت بیانی اور قدردانی کا سمندر موجزن ہے۔ اسے دیکھ کر بجا طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ صابر دت اپنے رسالہ کے خاص نمبر کے لئے جس شخصیت کا انتخاب کرلیں، موت اس سے جیت ہی نہیں سکتی، وہ امر ہو جاتا ہے۔

اس نمبر کے ہر ورق بلکہ ہر لفظ میں جاں نثار سانس لیتے اور مسکراتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ انکے کلام کا جو انتخاب اس میں شامل ہے وہ ان کے دل کی دھڑکنوں سے مزین ہے۔ اسے دیکھنے کے بعد بھی کوئی شخص جاں نثار کو مُردہ کہے تو اس کی تعزیت کرنے کو جی چاہتا ہے۔

ترقی پسند اور غیر ترقی پسند، دونوں ہی قسم کے ادیب اپنے اپنے رشحاتِ قلم کے ساتھ اس انجمن میں شریک ہوئے ہیں۔ کسی نے ان کی ترقی پسندی اور اشتراکیت کو ابھارا ہے، کسی نے نعرہ بازی کی مذمت کی ہے اور جاں نثار کے فن، اسلوب کی جدت اور اشاریت کو اُبھارا ہے۔ مگر دونوں ہی مطمحِ نظر کے ادیبوں کے یہاں جاں نثار کی بے پناہ شاعرانہ خصوصیت اور صلاحیت کا اقرار ملتا ہے۔

جاں نثار نے صابر دت کے نام اپنے خط میں لکھا تھا . . . .

"میں جانتا ہوں کہ خصوصی نمبر آج تک قصیدہ ہی نکلے ہیں یا نکلوائے گئے ہیں جو صرف ردی کی ٹوکری کے لائق ہوتے ہیں۔ میرے نمبر میں اگر میرے خلاف بھی کچھ لکھا جائے تو ضرور شائع کرو اور فیصلہ پڑھنے والوں پر چھوڑ دو۔"

صابر دت نے اس حکم کی تعمیل، ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی اور وارث علوی جیسے غیر ترقی پسند ادیبوں کے مضامین شامل کرکے کی ہے جس میں ترقی پسند تحریک کی مخالفت ہے لیکن جاں نثار کے آرٹ اور ان کے لہجے کی انفرادیت کا لوہا مانا گیا ہے۔

اس نمبر کے ہر ورق میں جاں نثار گنگناتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں ـــ اگر مقبرے کی تعریف یہی ہے تو اس کا خواہاں ہر شاعر و ادیب ہوگا۔

اعجاز صدیقی کے قول میں نسائیت اور زنانہ پن ہے۔ "نحوست" اور نظریہ کا غیر صحتمند تصور مردوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔ چاہے وہ ترقی پسند ہو یا توہم پرست۔

اس نمبر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ قاری کو کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس سے کوئی بات جبراً منوانے

کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جاں نثار اختر ترقی پسند شاعر تھے۔ ترقی پسند ادیبوں کے منشور پر ان کے بھی دستخط تھے، مگر اس نمبر کا ہر ورق یہ احساس دلاتا ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ خود کہتے ہیں :-

"ترقی پسند تحریک نے باوجود بہت کچھ دینے کے اس تک کوئی بڑا شاعر پیدا نہیں کیا۔ یوں تو ہم آپ سبھی بڑے شاعر ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو دو چار چار نظموں کے سوا ہمارا سرمایہ ہے ہی کیا۔ ابھی ہمیں انتظار کرنا پڑے گا کہ ترقی پسند تحریک کوئی ایسا عظیم شاعر پیدا کرے جسے ہم غالب اور اقبال کے مقابل رکھ سکیں۔"

اس کی وجہ بھی جاں نثار اختر ہی کے لفظوں میں سنیئے :-

"عوام ہر اس ادب کو رد کر دیتے ہیں جو سیاسی سوجھ بوجھ تو دے لیکن جمالیاتی جذبے کو تسکین نہ بخشے۔"

یہی وجہ ہے کہ جاں نثار اختر نے ترقی پسندی کی نعرہ بازی کے حصار کو توڑا، داخلی دنیا کے عناصر حسیت اور کیفیت کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا جس سے ان کی شاعری کی کائنات وسیع ہو گئی اور انہوں نے اردو شاعری کے مزاج کو انقلابی حد تک متاثر کیا۔ بقول باقر مہدی :-

"شاید ہی کسی اردو شاعر نے اپنی شاہراہ کو چھوڑ کر پرانی پگڈنڈی کو اتنے والہانہ پن سے اپنایا ہو گا۔"

کیفی اعظمی کا یہ قول کہ جاں نثار اختر کا موجودہ لہجہ ان کے پرانے لہجے کی ترقی ہے انحراف نہیں، صداقت پر نہیں بلکہ جدیدیت سے رقابت پر مبنی ہے۔

اس نمبر میں صابر دت نے بے پناہ خوبیوں کو سمیٹ لیا ہے جیسے 'آئینہ خانہ' کے عنوان سے اُن کی شخصیت سے متعلق مضامین ہیں، یہ صفیہ اختر کے مضمون سے شروع کیا گیا ہے اور خدیجہ اختر پر ختم۔

ان تمام خوبیوں کے باوجود، صابر دت جاں نثار کے دیرینہ رفیق اور ہم مسلک و ہم مشرب علی سردار جعفری، ڈاکٹر ظ انصاری، کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس سے کوئی نیا مضمون نہیں لکھوا سکے ہیں اور برائے خانہ پُری پرانے مضامین کو شامل کیا ہے جس میں ان کی شخصیت اور فن کے ایک پہلو کو ابھارا گیا ہے۔

(شمیم طارق)

★

سنگیت چترا کی دلکش پیشکش

وہی بات

(ایسٹمین کلر)

★ پریکشت ساہنی - شبانہ اعظمی - امول پالیکر - متھن چکرورتی

پروڈیوسر: پران مہوترہ - کے کے مہاجن
ڈائریکٹر: وِنے شکلا
میوزک: جے دیو

ایگزیکیٹو پروڈیوسر
ہرشو بھائی شاہ

نغمات
نقش لائلپوری

افسانہ، سکرین پلے، مکالمے
کملیشور

جاری کردہ: سنگیت چترا 58 ویسٹ ولیو - ایس وی روڈ - سانتا کروز - بمبئی ۵۴
فون نمبر: 579556 / 532197

اظہار کی چوتھی کتاب

ایڈیٹر باقر مہدی

- ایک باپ بکاؤ ہے ــــ راجندر سنگھ بیدی
- کہانی کا تجزیہ ــــ گوپی چند نارنگ
- گوشۂ انور سجاد ــــ مشہور پاکستانی افسانہ نگار انور سجاد کے سات منتخب افسانے، ایک غیر مطبوعہ افسانہ، ایک ٹی وی ڈرامہ، دو مضامین۔ انور سجاد کا فن: افتخار جالب اور باقر مہدی کی نظر میں۔
- گوشۂ وارث علوی ــــ بیباک جدید ناقد وارث علوی کے چار غیر مطبوعہ مضامین۔ وارث علوی کا ادھورا خاکہ ــــ پیارے دقیانوسی ــــ باقر مہدی۔
- بازیافت ــــ عزیز احمد کے بارے میں۔ قرۃ العین۔ عزیز احمد کی دو منتخب کہانیاں۔
- ماؤزے تنگ ــــ اصغر علی انجینئر۔ ماؤ کی چند نظموں کے ترجمے۔ ابراہیم رنگا۔
- مضامین ــــ انا الحق بنام حرف حق۔ دیوندر اسر
  جدیدیت کی نئی تعریف۔ ایک نئے امریکی ناقد کی نظر میں۔ ترجمہ ن۔ ا۔ ناظر
- نئی کہانیاں ــــ انور عظیم، عوض سعید، قمر احسن اور انور قمر۔
- سفر نامہ ــــ ایران کا سفر۔ فارسی شاعری کی نئی روپ ریکھا۔ ڈاکٹر نیر مسعود۔
- ورق ورق ــــ ڈاکٹر ظ۔ انصاری، ساقی فاروقی اور عادل منصوری کی نظمیں غزلیں۔
- غزلیں۔ تبصرے۔ متعدد تصویریں۔ بہترین کتابت و طباعت۔

اشاعت: ستمبر/اکتوبر • قیمت بیس روپے

تقسیم کار **مکتبہ جامعہ** بمبئی، دہلی، حیدرآباد، علی گڑھ

قوم پھر ہمّت سے آگے بڑھنے لگی ہے

1975-76ء

بجلی کی پیداوار میں اضافہ

★ 7,97,640 لاکھ یونٹ بجلی پیدا کی گئی، پہلے کبھی اتنی بجلی تیار نہیں ہوئی۔ ایک دن میں 2,600 لاکھ یونٹ بجلی تیار کرنے کا نیا ریکارڈ۔

★ 25 نئے بجلی گھروں میں 1,800 میگاواٹ بجلی تیار کی گئی۔ ان میں سے 20 بجلی گھروں میں ستمبر 1975ء اور مارچ 1976ء کے درمیانی عرصے میں بجلی تیار ہوئی۔

★ اس سال مزید 20,50,000 ہیکٹر رقبہ زمین کے لئے سینچائی کی سہولتیں میسّر آنے کی توقع ہے۔

★ 6,356 دیہات میں بجلی مہیا کی گئی، جس سے بجلی والے دیہات کی گنتی 1,74,079 ہو گئی۔ 40,000 واٹ پمپ سیٹ چالو کئے گئے۔

76/89

قوم پھر ہمت سے آگے بڑھنے لگی ہے

1975-76ء

نوجوانوں کی بہبود کے نئے اقدامات

★ کنٹرول نرخوں پر ضروری اشیاء 90 + 10 ہوسٹلوں میں بہم پہنچائی جا رہی ہیں، جس سے 9,56,000 سے زیادہ طلبار مستفید ہو رہے ہیں۔

★ چھپائی کے سفید کاغذ کی رعایتی داموں پر فراہمی کے سبب نصابی کتابوں اور کاپیوں کے نرخوں میں کمی ہوئی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں کتابوں کے 88,600 بنک کام کر رہے ہیں۔

★ 216 صنعتوں اور 103 ٹریڈوں کو اپرنٹس شپ اسکیم کے دائرۂ کار میں لایا جا چکا ہے۔

★ اپرنٹس بھرتی کرنے کی اسکیموں کے تحت 18,800 سیٹوں کا اضافہ کیا گیا جس سے ان کی کُل تعداد 1,33,900 ہو گئی۔ 1,28,900 سیٹیں پُر کی گئیں ہیں جن میں سے 28,000 سیٹیں (20 فیصد سے زیادہ) شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ قبیلوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کے افراد کو دی گئی ہیں۔

76/91

With Best

Compliments

FROM

KARNAL

صرف یہی کافی نہیں کہ آپ پڑھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ کیا پڑھتے ہیں۔ نئی ہند پاکٹ بکس حاضر ہیں جو زبان و ادب میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہیں۔

آئینے اکیلے ہیں (ناول)
کرشن چندر ۳/-

نازک خیالیاں (طنز و مزاح)
کنہیا لال کپور ۲/۵۰

مہارانی (سچی داستانیں)
دیوان جرمنی داس ۴/-

پراسرار قاتل (جاسوسی ناول)
کرنل رنجیت ۴/-

نازو انداز (شعر و شاعری)
مرتبہ: پرکاش پنڈت ۲/۵۰

ہماری دیگر مطبوعات

دو روپے قیمت کی کتابیں:-

ایک معمولی لڑکی (ناول) بلونت سنگھ
عورت اور آبشار ″
خلش ″ امرتا پریتم
بندگی ″ ہنس راج رہبر
یاد ″ پرل بک
فسانۂ عجائب ″ رجب علی بیگ سرور
فرانس کے عظیم ناول (افسانے) مرتبہ: رانگے راگھو
روس کے عظیم ناول ″ ″ ″
انگریزی کے عظیم ناول ″ ″ ″
پلنگ ″ اوپندر ناتھ اشک
گستاخیاں (طنز و مزاح) کنہیا لال کپور
بک رہا ہوں جنوں میں ″ پرکاش پنڈت
فلمی قاعدہ ″ کرشن چندر
جان پہچان (سوانح) } نریش کمار شاد
افسانہ نگاروں سے انٹرویو }
میری سنو (اخلاقیات) خلیل جبران

انمول موتی (اخلاقیات) مرتبہ: بانس ہنس
گلکاریاں (شاعری) فراق گورکھپوری
قتل کا راز (جاسوسی ناول) کرنل رنجیت
چھ لاشیں ″ ″

ڈھائی روپے قیمت کی کتابیں:-

پیار ایک خوشبو (ناول) کرشن چندر
پہلگام کا بدنام ″ ″
میلی چاندنی ″ گلشن نندہ
محبت اور قتل کے پُراسرار مقدمے } پرکاش پنڈت
برتھ کنٹرول (جنسیات) ڈاکٹر لکشمی نارائن
میاں بیوی کے جنسی تعلقات } ″ ″

تین روپے قیمت کی کتابیں:-

آنکھ کی چوری (ناول) کرشن چندر
سات ہندوستانی ″ خواجہ احمد عباس
دو بوند پانی ″ ″

رات اندھیری ہے (ناول) مہندر ناتھ
ہجر و وصال (شاعری) مرتبہ: پرکاش پنڈت

چار روپے قیمت کی کتابیں:-

نرملا (ناول) پریم چند
چنبل کی چمیلی ″ کرشن چندر
عجیب آدمی ″ ″
بڑی بڑی آنکھیں ″ اوپندر ناتھ اشک
جھیل کے اُس پار ″ گلشن نندہ
کالے کوس ″ بلونت سنگھ
ٹیڑھی اُنگلیاں (جاسوسی ناول) کرنل رنجیت
خونی کنگن ″ ″
بھیانک مورتی ″ ″
خون کے چھینٹے ″ ″
موت کے بیوپاری ″ ″
یادوں کی برات (سوانح) جوش ملیح آبادی
آپ بیتی ″ خاں عبدالغفار خاں

فارم نمبر ۴ بابت ملکیت وغیرہ

۱۔ مقام اشاعت:۔ ۱۵ چھیرا بلڈنگ، مادھو داس پاستہ روڈ، دادر ۱۴۔۔۔۴۰

۲۔ میعاد اشاعت: ششماہی ۔ ۳۔ پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر، مالک: صابر دت۔ قومیت: ہندستانی

پتہ: ۱۵ چھیرا بلڈنگ، مادھو داس پاستہ روڈ۔ دادر، بمبئی ۱۴۔

میں صابر دت مالک "فن اور شخصیت" اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست و صحیح ہیں۔

دستخط (صابر دت) پبلشر

21 سال کی
عمر سے پہلے
شادی نہ کیجئے
قانون اس کی مُمانعت کرتا ہے۔
davp 76/678

کملیشور نمبر
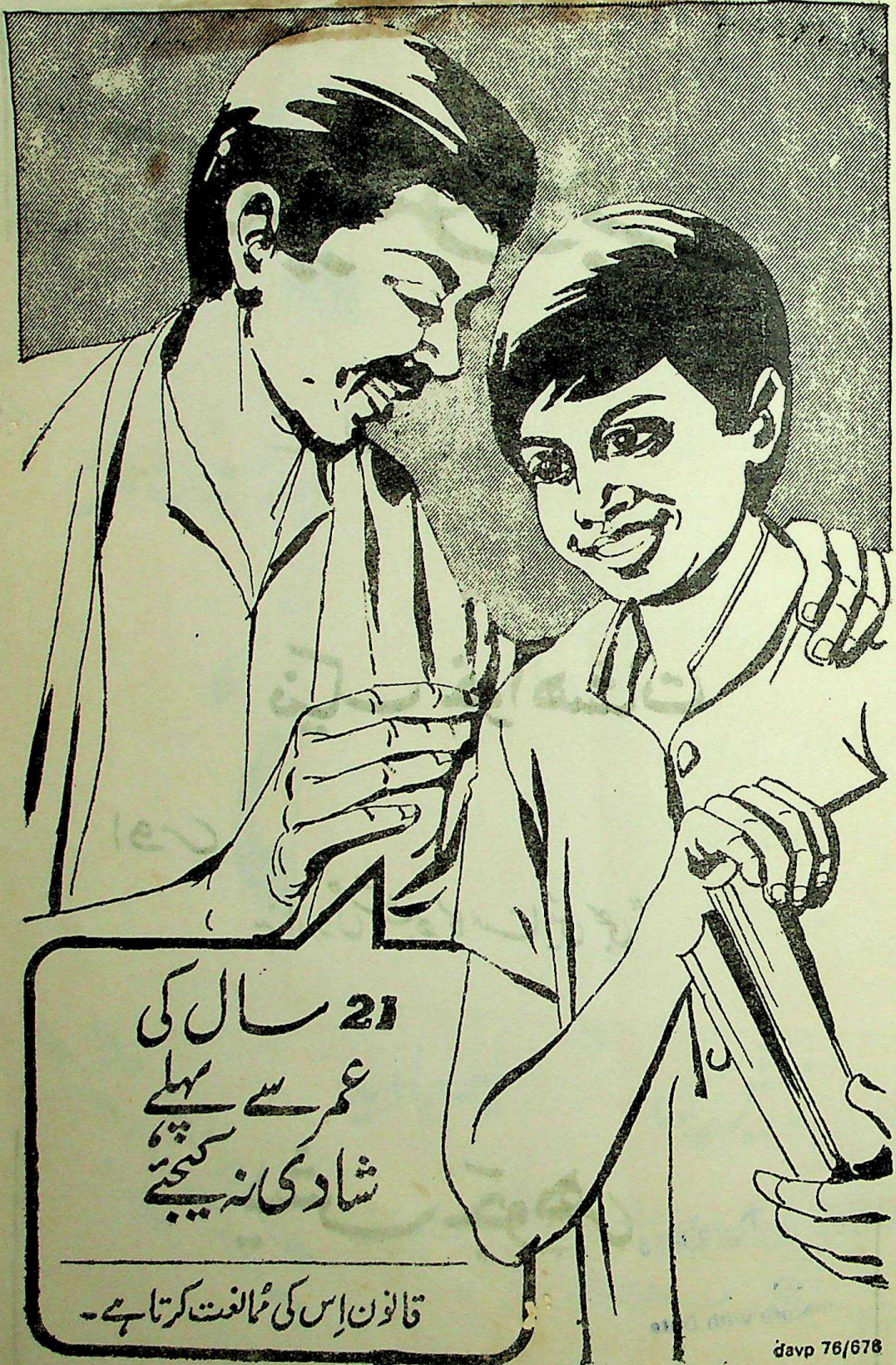
کے لئے

نیک خواہشات

اور

ہزاروں "شبھ کامنائیں بھی"

یش جوہر

جیسی کامیاب اور یادگار فلم کے بعد سپّی فلمز

کی اگلی پیشکش

ڈائرکٹر — رمیش سپّی *

رائٹر — سلیم جاوید *

اداکاران: ششی کپور۔ امیتابھ

پروین بابی۔ ہیما مالنی

FANN AUR SHAKHSIYAT

BOMBAY—400 003

KAMLESHWAR

NUMBER

Compliments

of

SALIM JAVED

Regd. No. 2[illegible] 75